اقبال اور گوئٹے

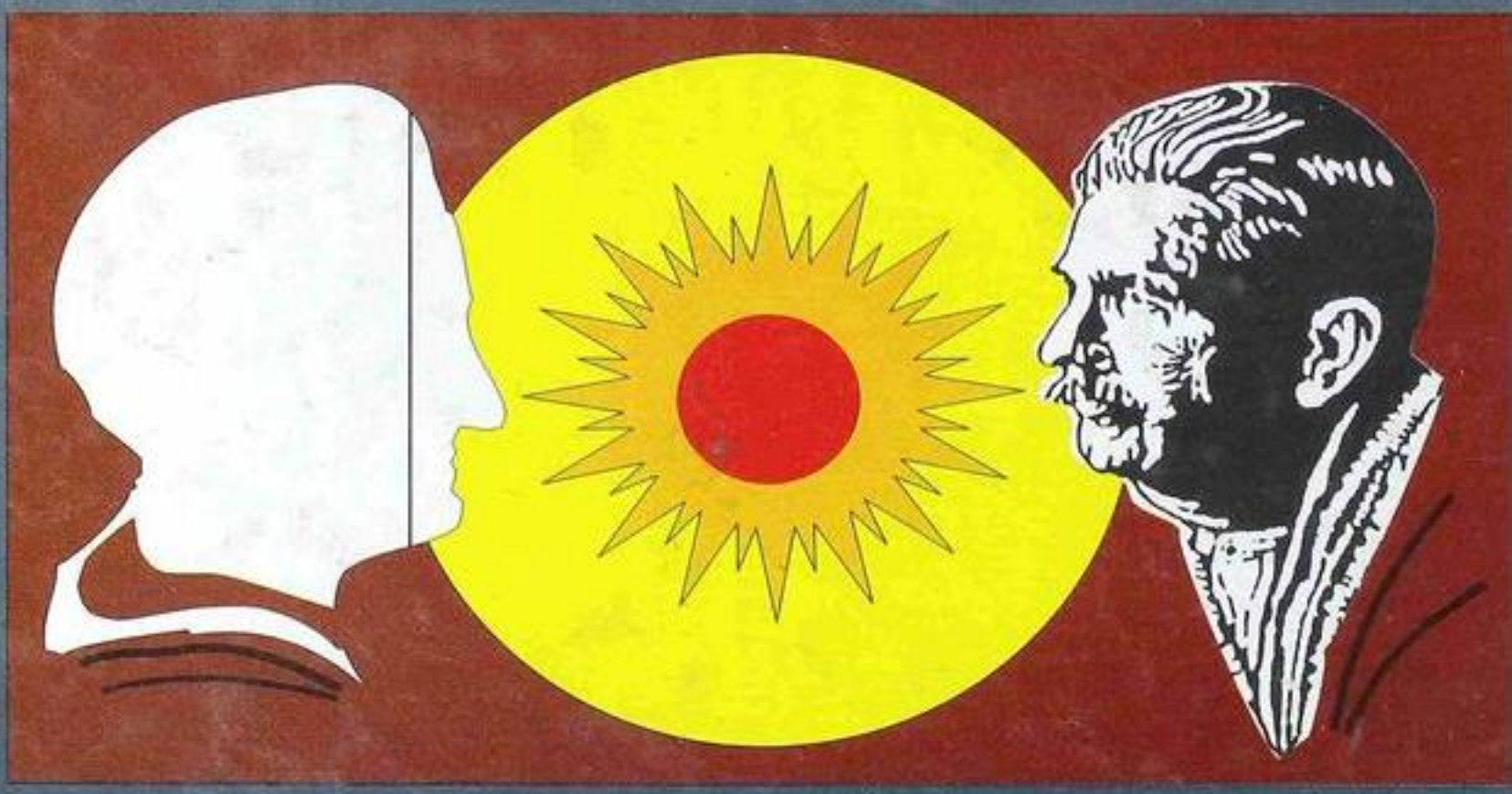

مرتبہ

محمد اکرام چغتائی

اقبال اور گوئٹے

مرتبہ

محمد اکرام چغتائی

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

اقبال اکادمی پاکستان، لاہور

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

ناشر

محمد سہیل عمر

ناظم

اقبال اکادمی پاکستان

چھٹی منزل، ایوان اقبال، لاہور

Tel: [+92-42] 6314-510

Fax: [+92-42] 631-4496

Email: iqbalacd@lhr.comsats.net.pk

Website: www.allmaiqbal.com

☆

شریک ناشر

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

☆

ISBN 969-416-292-0

اشاعت اول	۲۰۰۱ء
تعداد	۵۰۰
قیمت	۳۰۰/- روپے
طابع	سگما پریس، راولپنڈی

فہرست مضامین

حصہ اول

پیش گفتار	محمد اکرام چغتائی	۱
قارئین اقبال کے لئے گوئٹے کی اہمیت	ممتاز حسن	3
گوئٹے، اقبال کی نظر میں	ممتاز حسن	10
اقبال اور گوئٹے	سید نذیر نیازی	15
اقبال اور گوئٹے	عبدالمالک آروی	20
حکمت گوئٹے اور فکر اقبال	سید وحیدالدین	38
اقبال اور گوئٹے	جگن ناتھ آزاد	58
اقبال اور گوئٹے	ڈاکٹر حاتم رامپوری	69
اقبال اور گوئٹے	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی	88
گوئٹے اور اقبال	محمد اشرف خان اشرف	97
اقبال اور گوئٹے	شیخ حبیب اللہ	109
اقبال اور گوئٹے	ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی	127
اقبال اور گوئٹے	سید افتخار حسین شاہ	138
اقبال اور گوئٹے	مقبول حسین ہاشمی	154
اقبال اور گوئٹے	محمد حیات خان سیال	160
گوئٹے اور اقبال (منظوم مکالمہ)	خمار (بی۔اے آنرز)	173
اقبال، گوئٹے اور نٹشے	سید وحیدالدین	180
اقبال، حافظ اور گوئٹے کے حوالے سے	ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ	204
اقبال، حافظ اور گوئٹے	غلام نبی خیال	212
ابلیس۔ اقبال اور گوئٹے کی نظر میں	ڈاکٹر حامدی کاشمیری	226
اقبال کی نظر میں غالب... گوئٹے کا ہمنوا	ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ	233

حصہ دوم

گوئٹے کا پیغام	فیض احمد فیض	245
گلشن ویمر کا نواسنج، گوئٹے	حسین صدیقی	258
گوئٹے پر حافظ کی شاعری کا اثر	عباس درویش	264
گوئٹے (انسان اور شاعر)	ملک محمد باقر نسیم رضوانی	271
جان ولف گانگ گوئٹے	شیر جنگ	278
غالب اور گوئٹے	حاجی لق لق	291
جرمنی کا مشرقی شاعر... گوئٹے	ممتار حسن	297
فاؤسٹ	حنیف ہاشمی	312
گوئٹے اور فاؤسٹ	محمود بریلوی	331

فاؤست (مقدمہ)	ڈاکٹر سید عابد حسین	341
گوئٹے... اس کا فلسفہ	فضل حمید	368
دیباچہ (اردو ترجمہ "فاؤسٹ")	محمد عبدالقیوم باقی	384
غم نصیب	محمد ہادی حسین (مترجم)	387
ورتھر کی داستان غم (ابتدائیہ)	ڈاکٹر ریاض الحسن	391
ایران و ہندوستان کا اثر	ڈاکٹر ریاض الحسن	437
جرمنی کی شاعری پر (ریمی)....(دیباچہ)		
ولہیلم مائسٹر (مقدمہ)	ڈاکٹر سید عابد حسین	483
ایران و ہندوستان کا اثر	ممتاز حسن	485
جرمنی کی شاعری پر (ریمی)....(پیش لفظ)		
خدا، روح اور گوئٹے	محمد اسحاق امرتسری	495
گوئٹے کی چند نظمیں	نامعلوم الاسم	499
دیوان مغرب	نامعلوم الاسم	503
گوئٹے، اٹلی میں	منصور احمد	505

حصہ سوم

پیغام مشرق.... "مغربی دیوان" کا جواب	چوہدری محمد حسین	509
پیام مشرق	سید سلیمان ندوی	523
پیام مشرق	مولانا محمد اسلم جیراجپوری	525
پیام مشرق	غلام رسول مہر	548
پیام مشرق	ڈاکٹر آر۔ اے۔ نکلسن مترجم: ڈاکٹر عبداللہ چغتائی	554
پیام مشرق	ڈاکٹر عبداللہ چغتائی	571
پیام مشرق	ڈاکٹر عبدالشکور احسن	575
پیام مشرق	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی	605
پیام مشرق (ایک مطالعہ)	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	610
پیام مشرق پر ایک نظر	ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ	621
پیام مشرق.... اقبال کا فارسی دیوان	رحیم بخش شاہین	633

حصہ چہارم

دیباچہ پیام مشرق (چاپ اول 1923م)	ترجمہ: ڈاکٹر محمد ریاض	671
نظری بہ دیوان شرقی	دکتر شجاع الدین شفا	679
اقبال و گوتہ	دکتر سید محمد اکرم "اکرام"	703
حافظ، گوتہ و اقبال	دکتر سید محمد اکرم "اکرام"	725

محمد اکرام چغتائی

پیش گفتار

مختلف النوع تحریروں کے عمیق مطالعہ کے کئی پہلو ہیں۔ ان میں ایک کا تعلق تقابل یا موازنہ سے ہے، جس کے تحت فکری یا ہیئتی سطح پر مماثلات یا تضادات کو منظر عام پر لایا جاتا ہے اور ان کی روشنی میں نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ اس انداز کے تقابلی مطالعات موضوعی بھی ہوتے ہیں اور شخصی بھی۔ بعض ناقدین اس طرز مطالعہ کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے، کیونکہ ان کے خیال میں ماحول، طبائع اور دیگر عوامل کو سامنے رکھتے ہوئے مماثل یا متضاد پہلوؤں کو طشت از بام کرنے کی یہ کوشش سعیٔ لاحاصل ہے اور اس کے حاصلات بھی دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہیں۔ اس طبقہ خیال کے پیش کردہ دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے اس بات کی تردید مشکل ہے، لیکن پھر بھی نوع انسانی کی فکری، علمی اور ادبی تاریخ ایسے تقابلی مطالعات سے بھری پڑی ہے اور اسے ارباب علم و دانش کا مرغوب ترین موضوع گردانا جاتا ہے۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو شخصی حوالے سے ایسے موازنی مطالعے کو زیادہ مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اس ضمن میں کچھ ایسی علمی اور تخلیقی شخصیات کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے، جو اپنے تہذیبی پس منظر، طبعی خصائص، فکری روایات اور جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے خاصی مختلف ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کے مشترک عناصر کی تلاش و تخصیص کا عمل جاری ہے۔

اردو ادب کے حوالے سے ایسے مطالعات کا اہم ترین حصہ علامہ محمد اقبال (1877ء-

1938ء) اور جرمنی کے معروف شاعر اور تخلیقی فنکار گوئٹے (1749ء - 1832ء) کے افکار و نظریات اور شعری مآخذ سے تعلق رکھتا ہے۔ بغور دیکھا جائے تو یہ ان دو شخصیات کے حوالے سے مشرق و مغرب کے اتصال کی دلچسپ داستان اور انہیں ایک دوسرے کے قریب تر لانے کی شعوری کوشش ہے۔ مشرق و مغرب کے ذہنی فاصلوں کو کم کرنے کا آغاز باقاعدہ طور پر اٹھارویں صدی عیسوی کے ربع آخر سے شروع ہو گیا تھا اور تقریباً ان دو صدیوں میں ارباب دانش نے ان دو خطوں کے ذہنی بُعد کو دور کرنے کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ دور حاضر کی روز افزوں سائنسی اور تکنیکی ترقیوں نے زمینی فاصلوں کو ناقابل یقین حد تک کم کر دیا ہے اور اس سے عالمگیریت جیسے تصورات نے جنم لیا ہے۔ اس صورت حال میں اقبال اور گوئٹے جیسی تخلیقی شخصیات کا تقابلی مطالعہ عالمگیری تصورات کو فروغ دینے میں مد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ اقبال نے تو اپنی عمر کے آخری حصے میں واشگاف الفاظ میں اپنے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اسلام کا اصل کام یعنی مشرق و مغرب کا اتصال ہی ان کا عقیدہ ہے۔(۱)

گوئٹے کا آبائی مسکن جرمنی تھا اور اسے یورپ کے ان ممالک میں شامل کیا جا سکتا ہے، جنہوں نے سوداگروں کے بھیس میں دور دراز علاقوں کو زیر نگیں لانے کے عمل میں حصہ نہیں لیا۔ برصغیر پاک و ہند پر اپنا سیاسی تسلط جمانے کے لئے بعض مغربی اقوام (برطانوی، فرانسیسی، پرتگالی اور ولندیزی) برسوں آپس میں نبرد آزما رہیں اور بالآخر خونریز جنگوں کے بعد انگریز فتح یاب ہوئے۔ انتظام و انصرام پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے بعد انگریزوں نے یہاں کے تعلیمی نظام میں جو تبدیلیاں کیں، ان کا مقصد مقامی پڑھے لکھے لوگوں پر اپنی تہذیبی، علمی اور فکری برتری کا سکہ جمانا تھا۔ انیسویں صدی عیسوی کے ربع ثانی میں فاتحین نے یہاں جو تعلیمی اور لسانی پالیسیاں متعارف کرائیں، انہوں نے تعلیم یافتہ طبقہ کی سوچ اور فکر کو رفتہ رفتہ متاثر کرنا شروع کیا۔ برطانوی نوآبادیاتی نظام کے زیر اثر یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ اور اہل علم و دانش انگریزی زبان ہی سے واقف ہوئے اور جرمن سمیت دیگر اقوام مغرب کے علمی اور ادبی خزینوں کی جانب متوجہ نہ ہو سکے۔ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر تک یہی صورت حال رہی اور اگر اس دوران میں کہیں کہیں ان اقوام کے ادبی مشاہیر کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے تو وہ براہ راست نہیں، بلکہ بعض انگریز مصنفین اور ناقدین ادب کی تحریروں کی

وساطت سے ان کا حوالہ آیا ہے۔ ایسی علمی شخصیات میں ایک گوئٹے بھی ہے' جسے جرمنی میں وہی مقام حاصل ہے' جو انگلستان میں شیکسپیئر کو دیا جاتا ہے' لیکن یہ عجیب بات ہے کہ انگریزوں نے اپنے ملک میں گوئٹے کے تخلیقی کارناموں پر تحقیق و تنقید کے لئے علیحدہ ادارے قائم کئے' رسائل کا اجراء کیا(2)' اس کی حیات' تصانیف اور افکار پر اتنی کتابیں اور مضامین لکھے کہ ان کی الگ سے فہارس مرتب ہو چکی ہیں(3)' لیکن انگریزی اہل قلم نے گوئٹے سے اتنی گہری دلچسپی کے باوجود برصغیر میں اسے متعارف کرانے سے گریز کیا اور یہاں کے ارباب علم و دانش اس کی تخلیقی کاوشوں سے ناآشنا رہے۔

انگریز حاکموں اور تعلیمی ماہروں نے برصغیر میں گوئٹے یا اس پایے کے مغربی مصنفین کو عمداً پردہ گمنامی میں رکھا۔ معاصر شواہد سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر تک کم و بیش یہی صورت حال رہی۔ اس دور میں سیاسی حالات پرسکون رہے' عامتہ الناس میں تعلیمی برکات کا شعور پیدا ہوا اور مختلف درس گاہوں سے زیور تعلیم سے آراستہ ہو کر ایسے افراد علم و ادب کے افق پر نمودار ہوئے' جو انگریزی ادب کے ساتھ ساتھ عالمی ادب کے شہ پاروں سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ ان علمی ہستیوں میں سے بعض نے اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان کا رخ کیا اور وہاں انہیں جرمنی سمیت دیگر یورپی ممالک کے علمی اور ادبی سرمایہ تک رسائی حاصل ہوئی۔ برصغیر کے یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے گوئٹے کی تخلیقات کو انگریزی تراجم کے ذریعے پڑھا اور پھر اس کی شخصیت اور ادبی سرگرمیوں کا اپنی تحریروں میں اجمالی یا تفصیلی طور پر ذکر کیا یا اس کے متعلق مضامین سپرد قلم کئے۔ ایسے مقامی عالموں میں شمس العلماء ڈاکٹر جیون جی جمشید جی مودی' رابندر ناتھ ٹیگور' عبداللہ یوسف علی' صلاح الدین خدا بخش اور عبدالرحمن بجنوری کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر تو پہلے ہندوستانی عالم ہیں' جنہیں 1889ء میں فرانکفورٹ میں گوئٹے کے آبائی گھر کو دیکھنے کا موقع ملا۔ انہوں نے بعد میں گوئٹے پر اپنے ایک مضمون میں اس گھر کے کچھ حصوں کے بارے میں تفصیل فراہم کی(4)۔ بلاشبہ ان عالموں کی تحریریں اہم ہیں اور ان کے مطالعہ سے گوئٹے کے سوانح اور تصنیفات کے بارے میں اساسی معلومات حاصل ہوتی ہیں' لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ نہ صرف برصغیر پاک و ہند میں بلکہ پورے ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں علامہ اقبال واحد شاعر اور مفکر ہیں' جنہوں نے تخلیقی سطح پر اپنی شاعری اور نثر میں گوئٹے کو

بعض ناقدین نے اقبال کی اسی نظم کے تجزیاتی مطالعہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ متذکرہ صدر شعر کا مصرعہ ثانی میتھیو آرنلڈ کی ایک نظم "میموریل ورسز" (اپریل 1850ء) سے ماخوذ ہے(10) اور کچھ مؤرخین ادب اس کو اقبال کی نظم "داغ" کا ماخذ قرار دیتے ہیں(11)۔ اقبال کے اس ایک مصرعہ کے حوالے سے گوئٹے اور غالب کے مابین سوانحی اور فکری مماثلات پر بھی خامہ فرسائی کی گئی ہے اور ان کی روشنی میں بعض دور از کار نتائج بھی برآمد کئے گئے ہیں(12)۔ ان عمیق مطالعات کے علی الرغم یہ شعر اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اس وقت اقبال کے ذہن میں گوئٹے اور غالب سے متعلق کچھ مماثل پہلو ضرور موجود تھے اور انہی کے پیش نظر مؤخر الذکر کو گوئٹے کا "ہم نوا" ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ مشرق و مغرب کے ان دو عظیم شاعروں کے تقابل سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اقبال اس نظم کی اشاعت (1901ء) سے قبل گوئٹے کی حیات و افکار کا گہرا مطالعہ کر چکے تھے اور اس کے لئے انہوں نے انگریزی مصادر ہی سے استفادہ کیا۔

1905ء کے اواخر میں اقبال نے بغرض اعلیٰ تعلیم انگلستان کے لئے رخت سفر باندھا۔ ان کے قیام یورپ کی مدت تین برس پر محیط ہے۔ 1908ء کی ابتدا (22 جنوری) ہی میں انہوں نے انگلستان سے پرنسپل گورنمنٹ کالج (لاہور) کو اپنا استعفیٰ بھجوا دیا اور چند ماہ بعد خود بھی واپس آ گئے۔ ان تین سالوں میں اقبال کا بیشتر وقت انگلستان ہی میں گذرا۔ یہاں انہیں تصنیف و تالیف اور تحقیق و مطالعہ کے وسیع ذرائع میسر آئے۔ اقبال کے اس دور حیات کا واحد ماخذ عطیہ فیضی (1877ء - 1967ء) کی کتاب "اقبال" سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال کے قریبی احباب میں سے بعض جرمن بھی شامل تھے اور وہ ان سے جرمن فلسفہ اور ادب پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس عرصے میں اقبال نے جرمن زبان پڑھنا شروع کر دی ہو اور اس کے ساتھ ہی گوئٹے کی اہم تالیفات خاص طور پر "فاؤسٹ" کا مطالعہ کیا ہو۔ جرمن زبان و ادب سے اقبال کا خصوصی لگاؤ اس وقت مزید مستحکم ہوا، جب وہ ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنے جرمنی گئے۔ وہ پہلے اپنی جرمن زبان کو بہتر بنانے کے لئے چند ماہ ہائیڈل برگ ٹھہرے اور پھر اپنے مقالہ خصوصی سے متعلقہ ضروری رسمی کارروائیوں کو پورا کرنے کے لئے میونخ چلے گئے۔ جرمنی میں اقبال کا قیام زیادہ طویل نہیں، لیکن یہ ان کی شخصیت اور ان کے طرز فکر کی نئی راہیں متعین کرنے کا باعث ہوا۔ اسی دور میں انہیں

متعارف کرایا۔ اگر اردو زبان و ادب کے حوالے سے دیکھا جائے تو بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس زبان میں گوئٹے شناسی کی روایت اقبال کی مرہون منت ہے اور ان کے معاصرین، متبعین اور ماہرین نے گوئٹے پر اب تک جو کچھ لکھا ہے یا اس کی معروف ترین کتب کو اردو میں منتقل کیا ہے، وہ سب اقبال کی مساعی کا نتیجہ ہے۔

اقبال کا گوئٹے سے ذہنی تعلق کب قائم کیا؟ بظاہر ایسے شواہد دستیاب نہیں، جن کی بنیاد پر اس سوال کا کوئی حتمی جواب دیا جا سکے۔ قرین قیاس یہی امر ہے کہ فلسفے سے خصوصی دلچسپی رکھنے کے باعث اقبال جرمن فلسفیوں اور ان کے افکار و نظریات سے بخوبی آگاہ تھے۔ مزید یہ کہ بعض انگریز نقادان ادب (مثلاً میتھیو آرنلڈ) کی تحریروں کے ذریعے اقبال بلا واسطہ طور پر گوئٹے سے واقف ہوئے ہوں گے۔ اس ضمن میں ان کے استاد تھامس آرنلڈ (سنہ وفات 1930ء) کی صحبتوں کا بھی اثر ہو گا، کیونکہ یہ معروف برطانوی مستشرق جرمن ادب کی تحریک مشرقی اور اس کے زیر اثر تخلیق ہونے والے شعری سرمائے پر گہری نظر رکھتا تھا۔ ان قیاسات کے باوصف یہ بات بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ اقبال فارغ التحصیل ہونے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں زاید عارضی اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے شعبہ انگریزی سے منسلک ہوئے (16 اکتوبر 1902ء) اور 31 مارچ 1903ء تک یہی مضمون پڑھاتے رہے[5]۔ اسی کالج میں وہ جون تا اکتوبر 1905ء تک بطور اسسٹنٹ پروفیسر فلسفہ پڑھاتے رہے[6]۔ اس دوران میں جب شیخ عبدالقادر رخصت پر انگلستان چلے گئے تو ان کی جگہ اقبال چند ماہ کے لئے اسلامیہ کالج میں بھی انگریزی زبان و ادب کا درس دیتے رہے[7]۔ ایک نوجوان اور باصلاحیت استاد کی حیثیت سے اقبال ایسی انگریزی تحریروں سے ضرور واقف ہوں گے، جن میں گوئٹے کی شخصیت اور فن پر اظہار خیال کیا گیا ہو۔

اقبال کی شاعری میں گوئٹے کا واضح اشارہ پہلی بار اس نظم میں کیا گیا ہے جو "غالب" کے عنوان کے تحت لاہور کے ادبی ماہنامہ "مخزن" (بابت اپریل 1901ء) میں اشاعت پذیر ہوئی تھی۔ اس میں گوئٹے کا نام تو نہیں لیا گیا، لیکن اس میں مشارٌ الیہ اس کا مدفن یعنی وا مار ہے جہاں وہ آرام کی نیند سو رہا ہے۔ متعلقہ شعر درج ذیل ہے۔

آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر[8] میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

جرمن فلاسفہ اور ادباء (بشمول گوئٹے) کی نگارشات تک رسائی حاصل ہوئی اور ان کا براہ راست یا انگریزی تراجم کے توسط سے گہرا مطالعہ کیا۔

عطیہ فیضی کی کتاب کے علاوہ اقبال کے قیام جرمنی کا دوسرا مستند ماخذ وہ مکتوبات ہیں' جو انہوں نے ہائیڈل برگ میں مقیم اپنی دوست ایما ویگے ناسٹ (1879ء - 1964ء) کو جرمن اور انگریزی دونوں زبانوں میں تحریر کئے(13)- ان ستائیس خطوط میں سے چار ایسے خط (بابت 1913ء' 1914ء' 1931ء اور 1932ء) ہیں' جن کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مراسلہ نگار اور ایما کی گفتگوؤں کا محور و مرکز گوئٹے اور اس کی تصنیف "فاؤسٹ" ہی تھا۔ ان دنوں ایما ہائیڈل برگ کے ایک نجی مدرسے میں معلمہ تھی اور غالباً غیر ملکیوں کو جرمن زبان پڑھاتی تھی۔ ان خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گوئٹے کو عالمی ادب میں بلند مقام دلانے والی کتاب "فاؤسٹ" کے مرکزی کرداروں اور اس کے ادبی محاسن سے کماحقہٗ واقف تھی اور اقبال کو اس کے جن حصوں کی تفہیم میں دقت پیش آتی تھی' وہ انہیں پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتی تھی۔ انہی باہمی مباحث کا یہ نتیجہ تھا کہ جب کبھی اقبال کی اپنے جرمن احباب سے "فاؤسٹ" پر گفتگو ہوتی تھی تو وہ ایسے فکر انگیز نکات بیان کرتے تھے کہ جرمن بھی ورطۂ حیرت میں پڑ جاتے تھے۔(14)-

1908ء میں یورپ سے واپسی کے بعد اقبال ذہنی اور جذباتی ناآسودگی کا شکار رہے - وہ یہاں کے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے میں دشواری محسوس کرتے تھے۔ چند سالوں کے بعد جب قلب و ذہن کے اندر چلنے والی تیز ہواؤں کا شور قدرے کم ہوا' تو وہ پھر دل جمعی اور طمانیت سے اپنی تخلیقی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔ اس عرصے میں وہ بعض ایسے معلومہ اور غیر معلومہ فکری' نظریاتی اور روحانی تجربات سے گزرے کہ ان کی سوچ کے دھاروں نے نیا رخ اختیار کر لیا۔ تقریباً ایک عشرے تک ان کی جرمن زبان و ادب یا گوئٹے سے گہری وابستگی کا واضح ثبوت نہیں ملتا۔ ان کے اس دور کی صرف ایک یادگار تصنیف ہے' جو درحقیقت ان کی ڈائری ہے' جس کے ابتدائی صفحہ پر 27 اپریل 1910ء کی تاریخ درج ہے اور یہ ان کی وفات کے بعد منظر عام پر آئی(15)- بظاہر اس ڈائری پر اقبال نے یورپ سے اپنی واپسی کے دو سال بعد کا سن لکھا ہے' لیکن اس کے مندرجات کے بغور جائزے سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ وہ اپنے قیام یورپ کے دوران میں گاہے بگاہے مختلف

موضوعات کے بارے میں اپنے خیالات کو قلم بند کرتے رہے۔ ممکن ہے' اقبال کو اپنے منتشر افکار اور حاصلات مطالعہ کو اس مختصر پیرائے میں بیان کرنے کا خیال گوئٹے کی اسی طرز کی کتاب کو دیکھ کر آیا ہو۔ گوئٹے کی یہ کتاب اس کی وفات کے ایک سال بعد 1833ء میں مرتب ہوئی(16)۔ اقبال کو یہ کتاب بے حد پسند تھی اور اس کا ایک انگریزی ترجمہ ان کے زیر مطالعہ رہتا تھا' جو اب بھی ان کے نجی کتاب خانہ میں موجود ہے(17)۔ گوئٹے اور اقبال کی ان دونوں تصانیف کے موازنہ سے ان کی فکری مشابہتوں کے متعدد پہلو سامنے آتے ہیں۔

اقبال نے اپنی ڈائری میں نو بار گوئٹے کا ذکر کیا ہے اور اس کے بے کراں تخیل کے مقابلے میں اپنے محدود تخیل کا اعتراف' اس کی اندروں بینی اور فطرت انسانی کے عمیق مطالعہ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں گوئٹے کی تصنیف "فاؤسٹ" کو پوری نسل انسانی کے تجربات کا نچوڑ اور اس تصنیف کے مرکزی کردار کو انسانیت کا مجسم اظہار قرار دیا ہے۔ اقبال کے ان شذرات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے گوئٹے کی اس تصنیف کا کس قدر گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس کی تخلیقی حسن کاریوں اور فکری بلند پروازیوں کو سمجھنے میں وہ اپنی تمام ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کم از کم جنگ عظیم اول تک اقبال کا مطالعہ "فاؤسٹ" تک ہی محدود تھا اور وہ اس کی تخیل لامحدودیت کے اسیر رہے۔ اپنی پہلی شعری تصنیف "اسرار خودی" 1915ء کے دیباچے میں بھی' جسے طبع دوم میں حذف کر دیا گیا' انہوں نے "فاؤسٹ" ہی کا حوالہ دیا ہے(18)۔

پہلی جنگ عظیم نے متحارب ممالک میں جو قیامت برپا کی اور وسیع پیمانے پر تباہ کاریوں کی جو داستان رقم کی' اس سے عالمی سطح پر تمام شعبہ ہائے زندگی بری طرح متاثر ہوئے۔ اہل فکر و نظر کے قلب و ذہن پر بھی ان ہولناک بربادیوں کے گہرے اثرات مرتب ہوئے اور اس کے اختتام پر وہ اس کے محرکات' مختلف عوامل اور عالمگیر سطح پر رونما ہونے والی دور رس تبدیلیوں پر غور کرنے لگے۔ انہی مفکرین کی طرح اقبال نے بھی اپنی تجزیاتی بصیرت اور وجدان سے اس صورت حال کا بالاستیعاب جائزہ لیا۔ ان کے اخذ کردہ نتائج میں ایک تو یہ تھا کہ اس جنگ عظیم اور نپولین کی جنگوں نے یورپی ممالک میں جو حالات پیدا کر دیئے تھے' ان میں خاصی مشابہت پائی جاتی ہے۔ وسیع تباہی' بے امنی اور عدم اطمینانی کی اس فضا سے دلبرداشتہ ہو کر گوئٹے نے ذہنی طور پر ہجرت اختیار کی اور وہ مشرق کے علمی اور ادبی

شاہکاروں کے مطالعہ سے اپنے فرار پسندانہ رجحانات کی شدت کو کم کرتا رہا۔ گوئٹے کے اس میلان طبع کا ثمر "دیوان غربی و شرقی" کی صورت میں سامنے آیا' جسے اس کی اہم ترین تصانیف میں شمار کیا جاتا ہے(19)۔ اقبال کے اسی احساس نے انہیں مغرب کو مخاطب کرنے کی تحریک دی۔ مزید برآں اقبال کے خیال میں جنگ عظیم اول نے قدیم روایات سمیت بہت کچھ تباہ کر دیا اور اب ملبے کے انہی ڈھیروں سے ایک نئی دنیا جنم لے گی' جس کے مدھم سے خد و خال کے پیش نظر انہوں نے مغرب کو حیات بخش پیغام پہنچانے کا ارادہ کیا۔ اس پیغام رسانی کے لئے انہوں نے گوئٹے ہی کی ذات کا سہارا لیا اور اس کے جواب میں "پیام مشرق" تالیف کی۔

"پیام مشرق" کے سرورق پر عنوان کے تحت اقبال نے خود قوسین میں "در جواب شاعر المانوی گوئٹے" لکھا ہے' لیکن اس عبارت سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ گوئٹے کا وہ کونسا "سوال" ہے' جس کا یہ منظوم "جواب" دیا گیا ہے۔ اس بات کی صراحت دیباچے کی پہلی سطر ہی سے ہو جاتی ہے' جس میں "پیام مشرق" کی تصنیف کا محرک گوئٹے کا "مغربی دیوان" بتایا گیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے قبل اقبال نے اپنے بعض مکتوبات میں اپنے احباب کو مطلع کیا کہ وہ گوئٹے کے "مغربی دیوان" کا جواب لکھ رہے ہیں۔ اس سلسلہ کا پہلا مکتوب سید سلیمان ندوی کے نام 1919ء میں لکھا گیا۔ دیگر خطوط میں بھی اس بات کو دہرایا گیا ہے (20)۔ یہ پہلا موقع ہے کہ اقبال نے گوئٹے کے اس "دیوان" کا ذکر کیا ہے' کیونکہ اس سے قبل انہوں نے اپنی نثری تحریروں میں صرف "فاؤسٹ" ہی کا حوالہ دیا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ گوئٹے کی اس شعری تصنیف سے ناواقف ہوں' لیکن اس کا اولیں حوالہ بہت بعد میں دیا گیا۔ بہرکیف اقبال نے اپنے "جواب" (یعنی "پیام مشرق") کا "سوال" گوئٹے کے "مغربی دیوان" ہی کو قرار دیا ہے۔ حیرت ہے کہ اقبال کے "جواب" کی اشاعت کو پون صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے' لیکن ابھی تک اس کے "سوال" کی کھوج نہیں لگائی گئی اور نہ اس سوال و جواب کا کوئی جامع تقابلی مطالعہ ہی کیا گیا ہے۔

"پیام مشرق" اقبال کا تیسرا فارسی مجموعہ ہے' لیکن حسب سابق اس کا دیباچہ بھی اردو زبان میں لکھا گیا۔ بعض اقبال شناسوں کی رائے میں یہ پہلی اردو تحریر ہے' جس میں گوئٹے اور ان کے پیروکار شعراء کے حوالے سے جرمن ادب کی مشرقی تحریک کا بالاختصار جائزہ لیا گیا

ہے اور یوں اردو داں طبقہ کو اس موضوع سے متعارف کرانے کا سہرا اقبال کے سر ہے۔ مختلف موضوعات میں اقبال کی اولیات کی بحث سے قطع نظر اگر اس دیباچے کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے اور اس کے مندرجات کا معاصر جرمن اور انگریزی مآخذ سے موازنہ کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس کی ابتدا میں اقبال نے جن جرمن مصنفین (ہائنے پول ہورن اور بیل شوسکی) کا ذکر کیا ہے' ان کی اصل تحریریں اس وقت انہیں دستیاب نہیں تھیں اور بامر مجبوری انہیں اپنی یادداشت یا تحریر کردہ اقتباسات سے استفادہ کرنا پڑا' جو انہوں نے اپنے قیام یورپ کے دوران میں نقل کر لئے تھے۔ علاوہ ازیں گوئٹے سمیت مشرقی تحریک کے دیگر جرمن علمبرداروں سے متعلق اقبال کی فراہم کردہ تمام معلومات آرتھر ریمی کی انگریزی کتاب(21) سے اخذ کردہ ہیں' بلکہ دیباچے کے تقریباً دس صفحات کے تقابلی مطالعہ سے تو ترجمہ کا گمان ہوتا ہے۔ اس کتاب سے وسیع استفادہ کے بعد اقبال نے اس موضوع کو وقت کی قلت اور متعلقہ منابع کی نایابی کے باعث اس امید پر تشنہ چھوڑ دیا کہ اگلی نسل کا کوئی نوجوان اسے آگے بڑھائے گا۔ اس کے بعد دیباچہ کے آخری تین صفحات میں جنگ عظیم اول کے بعد "انسانی ضمیر" میں برپا ہونے والے "حیرت انگیز انقلاب" کی آہٹ کو محسوس کیا ہے اور ایک نئی دنیا کے ظہور میں آنے کی نوید سنائی ہے۔ درحقیقت یہی وہ محسوسات ہیں جو "پیام مشرق" کی تخلیق کا محرک ثابت ہوئے۔ یہاں یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہو گا کہ اقبال نے گوئٹے کی جس کتاب یعنی "دیوان" کے جواب میں یہ کتاب تحریر کی ہے' اس کی تصنیف کا پس منظر بالکل مختلف ہے۔ اقبال کے اپنے الفاظ میں "اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی' مذہبی اور ملی حقائق کو پیش نظر لانا ہے' جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے"' جبکہ اس کے برعکس گوئٹے کا محرک موضوعاتی نہیں بلکہ مکمل طور پر شخصی ہے۔ پینسٹھ سال کی عمر میں وہ ایک تیس سالہ شادی شدہ خاتون ماریانے فان ولیمر کے عشق میں گرفتار ہوا' ہائیڈل برگ جیسے رومان پرور ماحول نے عشقیہ جذبات میں تلاطم پیدا کر دیا اور رہی سہی کسر "دیوان حافظ" کے مطالعہ نے پوری کر دی' جس کا پہلا جرمن ترجمہ انہی دنوں (1812ء) میں شائع ہوا تھا۔ بنیادی طور پر یہی وہ محرکات ہیں جو "دیوان" کی تخلیق کا باعث ہوئے۔ گوئٹے نے ابتدا ہی میں مشرق کی جانب اپنی ذہنی "ہجرت" کا خوبصورت انداز میں ذکر کیا ہے اور پھر جا بجا فارسی الفاظ' تراکیب' محاورات اور استعارات

بھی استعمال کئے ہیں' بلکہ اس کے ایک حصہ "زلیخا نامہ" میں اپنے لئے "حاتم" اور اپنی محبوبہ ماریانے کے لئے "زلیخا" نام رکھا ہے۔ ان التزامات نے پوری کتاب میں مشرقی فضا تو پیدا کر دی ہے' لیکن شاعر کا فنی کمال یہ ہے کہ اس نے مشرق کی شعری روایات و تمثیلات کے پیرائے میں اپنی مغربیت کی روح کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور اپنی تمام تر مشرقیت کے باوصف اس کا طرز احساس ایک مغربی شاعر کے لبادے میں ملبوس رہتا ہے۔ اس نے اپنی قلبی وارداتوں اور کیفیتوں کو قلم بند کیا ہے اور انہیں مشرق کی شعری روایات کی آمیزش سے کہیں کہیں دو آتشہ بنا دیا ہے' لیکن اس میں ایسے کسی پیغام کا شائبہ تک نظر نہیں آتا' جو وہ اہل مشرق کو پہنچانا چاہتا ہو۔

"پیام مشرق" کا پہلا ایڈیشن مئی 1923ء میں اشاعت پذیر ہوا' لیکن اس سے چند ماہ قبل چوہدری محمد حسین لاہور کے ایک ادبی مجلّہ میں اس پر مفصل تعارفی تبصرہ لکھ چکے تھے (23)۔ اس کتاب کی اشاعت اول میں سرورق کے ذیلی عنوان کے علاوہ دو مقامات پر گوئٹے کے لئے مختلف القابات (مثلاً پیر مغرب' شاعر المانوی اور نکتہ دان المنی) استعمال کئے ہیں اور ایک نظم کے عنوان میں اس کا اصل نام بھی دیا گیا ہے۔ ابتدا میں "پیش کش" کے عنوان کے تحت امیر امان اللہ خان' فرمانروائے افغانستان کے نام جو انتسابی اشعار کہے گئے ہیں' ان میں ضمناً اقبال نے گوئٹے کا ذکر کیا ہے اور انتہائی خوبصورت شاعرانہ انداز میں اس کے ساتھ اپنا موازنہ کیا ہے۔ گوئٹے سے اقبال کے اس تقابلی رجحان کی ایک جھلک ان کی ڈائری کے بعض شذرات میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ اقبال کی یہ شعری عظمت کا ثبوت ہے کہ انہوں نے جہاں بھی گوئٹے کا ذکر کیا ہے' اس کی تخیلی بلند پروازی کو خراج تحسین پیش کیا ہے' بلکہ اسے اپنے سے بہتر شاعر قرار دیا ہے۔ "پیام مشرق" کے ان ابتدائی اشعار میں اقبال نے گوئٹے سے اپنا موازنہ کرتے ہوئے شعری محاسن کے علاوہ بعض دیگر عوامل کی نشاندہی بھی کی ہے' جو گوئٹے کو بہتر مقام دلانے میں معاون ثابت ہوئے۔ یہ اشعار درج ذیل ہیں:

پیرِ مغرب شاعرِ المانوی
آں قتیلِ شیوہ ہائے پہلوی
بست نقشِ شاہدانِ شوخ و شنگ
داد مشرق را سلامے از فرنگ

در جوابش گفتہ ام پیغامِ شرق
ماہ تابے ریختم بر شامِ شرق
تا شناسائے خودم خود بیں نیم
با تو گویم او کہ بود و من کیم
او زا فرنگی جواناں مثل برق
شعلہ من از دمِ پیرانِ شرق
او چمن زادے چمن پروردۂ
من دمیدم از زمین مردۂ
او چو بلبل در چمن "فردوس گوش"
من بصحرا چوں جرس گرم خروش
ہر دو دانائے ضمیر کائنات
ہر دو پیغام حیات اندر ممات
ہر دو خنجر صبح خند، آئینہ فام
او برہنہ من ہنوز اندر نیام
ہر دو گوہر ارجمند و تاب دار
زادۂ دریائے ناپیدا کنار
اوز شوخی در تنِ قلزم تپید
تا گریبانِ صدف را بر درید
من بہ آغوش صدف تابم ہنوز
در ضمیر بحر نایابم ہنوز
آشنائے من زمن بیگانہ رفت
از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہِ خسروی او را دہم
تخت کسریٰ زیرِ پائے او نہم(22)

س اڈیشن طباعت میں صرف ایک ایسی نظم ہے، جس کے عنوان میں گوئٹے کا نام درج ہے، اور اس میں اس کی پیر عجم، یعنی مولانا جلال الدین رومی کی جنت میں ملاقات بطرز مکالمہ کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ اقبال کی ڈائری کے بعض شذرات اور اس دور کے مراسلات (بالخصوص بنام ایما ویگے ناسٹ) سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے گوئٹے سے شدید متاثر ہونے کا سبب "فاؤسٹ" میں شیطان کا کردار ہے، جس میں ماورائی تخلیقی ندرت پائی جاتی ہے۔ اس نظم میں بھی گوئٹے اپنا "قصہ پیمان ابلیس و حکیم" ہی بیان کرتا ہے اور مولانا اسے داد تحسین پیش کرتے ہیں۔ اس نظم کے تحت اقبال نے ایک تشریحی حاشیہ بھی دیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر گوئٹے کے تصور شیطان کی اہمیت کے معتقد تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اس ڈرامے (یعنی "فاؤسٹ") میں شاعر نے حکیم فوسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کے امکانی نشو و نما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے گئے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمال فن خیال میں نہیں آ سکتا۔"

"پیام مشرق" کے پہلے ایڈیشن میں متذکرہ صدر دو حوالوں کے علاوہ گوئٹے پر بالواسطہ طور پر اور کچھ نہیں لکھا گیا۔ بعض جرمن اقبال شناسوں کا خیال ہے کہ اس کا ابتدائی حصہ ("لالۂ طور" مشتمل بر رباعیات) ہیئتی اعتبار سے "دیوان" سے مماثلت رکھتا ہے، لیکن وہ بھی ان دونوں تصانیف میں کوئی اور مشابہ پہلو تلاش نہیں کر سکے۔ ویسے بھی اس کتاب میں ایسی کوئی نظم موجود نہیں، جو براہ راست "دیوان" سے ماخوذ ہو یا فکری اور ہیئتی لحاظ سے گوئٹے کی اس تصنیف کے زیر اثر لکھی گئی ہو۔

"پیام مشرق" کی اشاعت سے قبل اور بعد میں متعدد رسائل و اخبارات کے مدیران اور اہل علم اصحاب کی جانب سے اتنی پذیرائی ہوئی کہ چند ماہ کے مختصر عرصے میں اس کا پورا ایڈیشن فروخت ہو گیا۔ فوراً اس کے دوسرے ایڈیشن کی تیاریاں شروع ہو گئیں، لیکن اقبال اس کے من و عن اشاعت مکرر نہیں چاہتے تھے، بلکہ اس میں ترامیم و اضافات کا ارادہ رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے طبع اول کے مطبوعہ متن ہی میں حک و اصلاح کا عمل شروع کیا اور اضافہ شدہ منظومات کو اپنے قلم سے لکھ کر مناسب جگہوں پر چسپاں کر دیا۔ نظر ثانی اور اضافوں سمیت یہ ایڈیشن 1924ء میں شائع ہو گیا اور اس کے بعد آج تک اس کتاب کے جتنے ایڈیشن طبع ہوئے ہیں، وہ اس طبع ثانی کا عکس یا نقل ہیں۔

اقبال نے "پیام مشرق" کی اس اشاعت دوم میں گوئٹے کے حوالے سے دو نظموں کا اضافہ کیا ہے۔ ان میں ایک تو "دیوان" ہی کی نظم کا جواب ہے اور دوسری کا مرکزی خیال گوئٹے کی ایک پرانی نظم سے اخذ شدہ ہے۔ اول الذکر کا عنوان "حور و شاعر" ہے، جس میں آسمانی اور زمینی مخلوق کے مکالمہ کو منظوم کیا گیا ہے۔ یہ نظم اقبال کے نظریہ حیات کی بھرپور عکاسی کرتی ہے، جس میں جہد مسلسل لازمی عنصر ہے اور بے حرکتی اور ٹھہراؤ سم قاتل۔ دوسری نظم "جوئے آب" ہے، جو بقول اقبال، گوئٹے کی ایک پرانی نظم کا "ایک نہایت آزاد ترجمہ" ہے۔ گوئٹے کی اس نظم کا عنوان Mahomets Gesang (نغمہ محمدؐ) ہے، جو دراصل اس کے حضور اکرمؐ کے حالات و واقعات پر مبنی پانچ ایکٹ کے ڈرامہ کا حصہ تھی۔ اس ڈرامہ کا نام "محمدؐ" رکھا گیا اور یہ نامعلوم وجوہ کے باعث مکمل نہ ہو سکا۔ گوئٹے نے اس ڈرامہ میں ایکٹوں کے درمیانی وقفوں کے لئے کئی نظمیں لکھی تھیں، جن کو مختلف کرداروں نے سٹیج پر آ کر پڑھنا تھا۔ شومئی قسمت سے سوائے اس نظم کے بقیہ تمام منظومات ضائع ہو گئیں۔ گوئٹے نے اس کی نوک پلک درست کر کے اسے الگ سے 1774ء میں شائع کرا دیا۔ اس نظم میں حضور اکرمؐ کی ذات اقدس کو ایک ایسے دریا سے تشبیہ دی گئی ہے، جس کا منبع پہاڑوں کی تنگ گھاٹیاں ہیں، سنگلاخ چٹانوں کا سینہ چیرتا ہوا تیز بہاؤ کے ساتھ آگے بڑھتا ہے، میدانی علاقوں میں آ کر پھیل جاتا ہے اور بالآخر اپنی بے کراں وسعتوں کے ساتھ سمندر میں جا گرتا ہے۔ حضور اکرمؐ کی ذات بابرکات بھی اسی دریا کی مانند ہے، جو دیار عرب کے ایک چھوٹے شہر سے ظہور پذیر ہوا اور پھر پھیلتے پھیلتے پوری کائنات کو اپنے دامن شفقت میں سمیٹ لیا۔ رواں دواں بحر بے کنار کی اس تشبیہ نے اقبال کو بے حد متاثر کیا اور انہوں نے اسی کو مرکزی خیال بنا کر "جوئے آب" جیسی معرکۃ الآرا نظم کہہ ڈالی، جس میں "المانی شاعر نے زندگی کے اسلامی تخیل کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔"

"پیام مشرق" کے بعد اقبال کی کئی فارسی اور اردو شعری تخلیقات سامنے آئیں، لیکن ان میں کوئی نظم، حتیٰ کہ کوئی ایسا شعر بھی دکھائی نہیں دیتا، جس پر "دیوان" کے اثر کا گمان ہوتا ہو۔ علاوہ ازیں ان کی نثری تحریروں اور مراسلوں کا بھی یہی حال ہے، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اقبال نے اپنی عمر کے آخری پندرہ سالوں میں گوئٹے کو بالکل فراموش کر دیا۔ درحقیقت اقبال تمام عمر گوئٹے کی تصنیف "فاؤسٹ" کے تخلیقی حصار سے باہر نہیں نکل

سکے۔ نجی گفتگوؤں اور ملاقاتوں میں موقع و محل کی مناسبت سے انہوں نے اس کتاب پر مختصر مگر جامع انداز میں تبصرہ کیا' جس سے ان کے وسیع اور گہرے مطالعہ کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے(23)- اقبال نے اس دور میں بھی اپنی تصانیف میں "فاؤسٹ" کو پیش نظر رکھا ہے' مثلاً "خطبات" میں قصہ ہبوط آدم کا ذکر' بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ "جاوید نامہ" کا ابتدائی حصہ بعنوان "تمہید آسمانی" گوئٹے کی اسی کتاب کے Prologue in Heaven کے تتبع میں لکھا گیا(24)- ان ظاہری حوالوں کے ساتھ ساتھ فکر اقبال کے بعض ایسے پہلو ہیں' جن پر گوئٹے کے اثرات نمایاں ہیں۔ معروف جرمن اقبال شناس خاتون پروفیسر آنیماری شمل نے راقم کی انگریزی کتاب کا جو پیش لفظ تحریر کیا ہے' اس میں ایسے فکری اثرات کا اجمالاً ذکر کیا ہے' مثلاً اقبال کا تصور مرد مومن جو نطشے کے "فوق البشر" سے مماثل نہیں' بلکہ اسے گوئٹے کے "فاؤسٹین آئیڈیل" کی تجسیم قرار دیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں انسان و کائنات' فوقیت عشق بر عقل' عشق کی الہامی قوت کی توصیف اور کوشش پیہم سے کائنات کی تسخیر اور لافانیت کی منزل تک رسائی اقبال کے ایسے افکار ہیں' جن پر گوئٹے کے اثرات کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ ان سب سے بڑھ کر اقبال کا تصور شیطان ہے' جس پر "فاؤسٹ" کے ایک مرکزی کردار میفسٹو کی گہری چھاپ ہے۔ اسلامی ادب میں ابلیس اور ابتدائے آفرینش سے اس کے منفی کردار پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اسے بدی اور ظلمت کی علامت قرار دیا ہے' لیکن بعض طبقوں نے اس کے مثبت پہلوؤں کا بھی ذکر کیا ہے' مثال کے طور پر ابلیس کے موحد ہونے کا اعتراف یا اس کے وجود سے دنیاوی رنگینیوں کا قائم و دائم رہنا یا اس کے خلاف تگ و دو میں انسان کی تعمیر شخصیت(25)- اقبال ان تمام تصورات ابلیس سے واقف تھے' لیکن اس راندہ درگاہ کی جو تصویر کشی یا اس بدنام زمانہ کے کردار کی مثبت جہات کو گوئٹے نے جس خوبصورت تخلیقی پیرائے میں بیان کیا ہے' اس سے اقبال عمر بھر متاثر رہے۔ گوئٹے نے "فاؤسٹ" میں میفسٹو کو "برادر ابلیس" کی حیثیت سے پیش کیا اور اس کے کردار کے منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں کا خاکہ کھینچا ہے جس کا اقبال کے تصور ابلیس پر گہرا اثر پڑا ہے -(26)

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے کہ اردو ادب میں جو کمزور سی گوئٹے شناسی کی روایت پائی جاتی ہے' وہ اقبال ہی کی مرہون منت ہے۔ وہ ایام جوانی سے عمر کے آخری حصے تک "فاؤسٹ"

کی شعری اور فکری خوبیوں کے معترف رہے اور ان کے بعض نمایاں افکار پر اس کے گہرے اثرات بھی مرتب ہوئے۔ بعد ازاں گوئٹے کی شرق پسندی بالخصوص اسلامی مشرق سے اس کے غیر جانبدارانہ طبعی لگاؤ کے باعث اقبال ذہنی اور جذباتی طور پر اس کے مزید قریب ہو گئے۔ ان دونوں عوامل نے ایک ایسی راہ متعین کر دی تھی، جس پر عالمی ادب کے شائقین یا ارباب فکر و دانش بہ آسانی گامزن ہو سکتے تھے، لیکن اقبال کو فوت ہوئے ساٹھ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا، لیکن ابھی تک اقبال کی قائم کردہ اس شعری روایت کو کسی نے آگے نہیں بڑھایا، البتہ اتنی خوش آئند پیش رفت ضرور ہوئی کہ اقبال ہی کے زیر اثر ان کے بعض معاصرین نے گوئٹے کی حیات و تصانیف میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ ان دنوں یہ اصحاب جوانی کی منازل طے کر رہے تھے اور ان میں سے کچھ جرمن دانش گاہوں کے تربیت یافتہ تھے۔ ان اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کسی حد تک جرمن سمیت مغربی زبانوں سے واقف قلم کار شعر و شاعری کے بجائے ترجمہ کے شعبے میں زیادہ سرگرم رہے۔ ان افراد میں پہلا نام محمد ہادی حسین (م - 1982ء) کا ہے، جنہوں نے گوئٹے کے مقبول ترین ناول "نوجوان ورتر کے آلام" (بزبان جرمن، 1774ء) کا "غم نصیب" کے عنوان کے تحت ترجمہ کیا۔ اس کی ابتدائی چند اقساط "پیام مشرق" کی اشاعت (1923ء) سے قبل "رسالہ ہزار داستان" (لاہور) کے شماروں میں طبع ہو چکی تھیں (نومبر 1922ء بعد)۔ یہ قسطیں 1926ء میں اختتام پذیر ہوئیں اور تقریباً ربع صدی بعد ان تمام قسطوں کو خاصی ترامیم کے ساتھ "دل نادان" کے زیر عنوان شائع کیا گیا (کراچی، 1953ء)۔ مترجم نے اپنی ایک قسط کے ابتدائیہ میں اقبال کی "پیام مشرق" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کتاب کی وجہ سے ہندوستان میں لوگ گوئٹے کے نام سے متعارف ہوئے(27)۔ ہادی حسین کے بعد دوسرا نام ڈاکٹر سید عابد حسین (م - 1928ء) کا ہے۔ انہوں نے "فاؤسٹ" کے حصہ اول کا ترجمہ کیا، جو 1931ء میں طبع ہوا۔ اقبال کے مکتوبات بنام سید نذیر نیازی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ترجمے میں اقبال کی مشاورت اور تعاون شامل تھا، بلکہ ان کی خواہش تھی کہ اگر مترجم "فاؤسٹ" کے حصہ دوم کا ترجمہ بھی کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں، تو وہ ان کی معاونت کے لئے تیار ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں اس حصے کے بعض حصوں کی تفہیم ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ شاید اسی وجہ سے ڈاکٹر موصوف دوسرے حصے کو اردو میں منتقل نہ کر سکے، حالانکہ اس دوران میں انہوں

نے گوئٹے کے ایک ناول و لیلم مائسٹر (Wilhelm Meister) کے حصہ اول کا تین جلدوں میں اردو ترجمہ شائع کرایا (نئی دہلی 1958ء - 1959ء)- ڈاکٹر عابد حسین نے "فاؤسٹ" کے حصہ اول کے ترجمہ کے ساتھ ایک مفصل اور پر از معلومات تعارف بھی قلم بند کیا' جس کے مطالعہ سے گوئٹے کے فنی کمالات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اقبال کے انہی ہم عصر اہل علم میں ممتاز حسن (م - 1974ء) کا نام بھی شامل ہے۔ انہوں نے بہت سے انگریزی اور اردو مقالات سپرد قلم کئے' جن میں اقبال کی شاعری پر گوئٹے کے اثرات کا عالمانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ انہیں جرمن زبان و ادب سے خصوصی لگاؤ تھا اور ان کی بیشتر تحریریں اس تعلق کی ترجمان ہیں۔ جرمن ادبیات اور گوئٹے کی تخلیقات کو مقبول عام بنانے میں ان کی خدمات کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ 1950ء کی دہائی میں انہوں نے "دیوان" کی کچھ منظومات کا اردو ترجمہ کیا تھا' جو "ادبی دنیا" (لاہور) میں قسط وار شائع ہوتا رہا(28)- گوئٹے شناسی کے حوالے سے اقبال کے پیروکاروں میں آخری نام ڈاکٹر ریاض الحسن (م - 1982ء) کا ہے۔ انہوں نے گوئٹے کے ناول "ورتر" کا اردو ترجمہ "ورتھر کی داستان غم" کے عنوان کے تحت کیا جو 1933ء میں الہ آباد سے شائع ہوا اور اس کا ایک نسخہ اقبال کو بھی ارسال کیا۔ مترجم دو بار (1930ء اور 1935ء) اقبال سے مل چکے تھے اور ان ملاقاتوں کا مرکزی موضوع گوئٹے اور جرمن ادبیات و فلسفہ تھا۔ اس ترجمہ کا جو دوسرا ایڈیشن کراچی سے طبع ہوا (1967ء)' اس کے شروع میں مترجم نے ایک طویل مقدمہ لکھا' جس میں گوئٹے اور اس کے ناول کے بارے میں مفید معلومات درج کی گئی ہیں۔ مترجم نے جا بجا بعض جرمن مآخذ سے بھی استفاد کیا ہے(29)-

ان چاروں اصحاب علم نے عہد اقبال میں اپنے شعور کی آنکھ کھولی۔ یہ ان کی خوش بختی تھی کہ انہیں اقبال کی صحبت یا مشاورت کی سعادت نصیب ہوئی اور پھر انہوں نے اس مشعل کی روشنی کو پھیلانے کی سعی کی' جو اقبال نے روشن کی تھی یعنی جرمن ادب پر اسلامی مشرق کے اثرات اور اس تناظر میں گوئٹے کی شعری خدمات کا جائزہ۔ مقام افسوس ہے کہ متذکرہ بالا چار علمی ہستیوں کے علاوہ اردو ادب میں گوئٹے شناسی کی روایت کو کسی نے آگے نہیں بڑھایا۔ "فاؤسٹ" کے حصہ اول کے چند شعری اور نثری تراجم ضرور شائع ہوئے یا اس کے پلاٹ کی بنیاد پر کئی ڈرامے لکھے گئے' لیکن وہ اعلیٰ ادبی معیار سے عاری ہیں۔ ان عالموں کے ادبی منظر سے روپوش ہوتے ہی اقبال کی یہ روایت بھی دم توڑ گئی اور اب دور

دور تک اس کے احیاء کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔ اقبال نے "پیام مشرق" کے دیباچہ میں آنے والی نسلوں سے ایک امید وابستہ کی تھی اور لکھا تھا: "(جرمن ادب میں) مشرقی تحریک کی پوری تاریخ لکھنے اور جرمن اور ایرانی شعراء کا تفصیلی مقابلہ کر کے عجمی اثرات کی صحیح وسعت معلوم کرنے کے لئے ایک طویل مطالعہ کی ضرورت ہے' جس کے لئے نہ وقت میسر ہے نہ سامان۔ ممکن ہے کہ یہ مختصر سا خاکہ کسی نوجوان کے دل میں تحقیق و تدقیق کا جوش پیدا کر دے۔" اب تقریباً پون صدی گزر گئی ہے' لیکن اقبال کی یہ دلی خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ ایسی مفصل تاریخ یا عمیق تقابلی مطالعہ تو دور کی بات ہے' ابھی تک گوئٹے کے "دیوان" کا کوئی کامل اردو ترجمہ نہیں ہو سکا' جس کے جواب میں اقبال نے "پیام مشرق" تصنیف کی تھی۔ اسی طرح اقبال کی پسندیدہ ترین تالیف "فاؤسٹ" کا حصہ دوم بھی کسی باصلاحیت اردو مترجم کا منتظر ہے۔ ان دونوں تراجم سے نہ صرف اقبال سے متعلق مطالعات میں اضافہ ہو گا بلکہ ان سے روح اقبال کو بھی طمانیت حاصل ہو گی۔

گوئٹے کی ولادت (1749ء) اور وفات (1832ء) کی مناسبت سے جرمنی کے علاوہ جرمن بولنے والے دیگر علاقوں اور یورپ کے بیشتر ممالک میں متعدد علمی تقریبات اور سیمینار منعقد ہوئے' جن میں گوئٹے کے متخصصین اور محققین نے شرکت کی اور اس کے سوانحی' شعری اور فکری پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے گرانقدر مقالات پیش کئے۔ انہی مواقع پر گوئٹے سے مخصوص اداروں اور ناشروں نے اس کی تخلیقات کے دیدہ زیب ایڈیشن شائع کئے۔ اخبارات اور ادبی جرائد نے خصوصی اشاعتوں کا اہتمام کیا۔ گوئٹے کی پیدائش اور رحلت کے حوالے سے اب تک چار بار ایسی علمی مجالس انعقاد پذیر ہو چکی ہیں (1849ء' 1899ء' 1932ء اور 1949ء) اور ان اجتماعات میں پیش کردہ تحقیقی و تنقیدی مطالعات کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں(30)۔ یورپ کے علاوہ دنیا کے بیشتر ممالک میں گوئٹے کی یاد میں تقریبات منعقد ہوئیں' لیکن یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ اس حوالے سے برصغیر پاک و ہند کے شائقین ادب اور علمی ادارے بالکل خاموش رہے' حتیٰ کہ اقبال کی زندگی میں دو دفعہ (1899ء اور 1932ء) اور ان کے انتقال (1938ء) کے بعد ایک بار (1949ء) گوئٹے کے سال ولادت و انتقال کو عالمی سطح پر منایا گیا' لیکن اس برصغیر میں کسی ایسی تقریب کا سراغ نہیں ملتا' جو گوئٹے کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے منائی گئی ہو۔ یہ ممکن ہے شخصی

طور پر ایسا کوئی اہتمام کیا گیا ہو' لیکن اجتماعی طور پر اس ضمن میں کچھ نہیں ہوا۔

گوئٹے سے متعلق انہی تقریبات کی روایات کو جاری رکھتے ہوئے 1999ء میں اس کی دو سو پچاسویں سالگرہ منائی گئی۔ جرمنی میں تو اس سال کو گوئٹے کے نام سے موسوم کیا گیا اور قومی سطح پر اس کو بڑے تزک و احتشام سے منایا گیا' جس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ جرمنی کے اتحاد نو (1989ء) کے بعد گوئٹے کے حوالے سے یہ پہلی تقریب تھی۔ جرمنی کے علاوہ دنیا کے دوسرے ممالک نے بھی مقدور بھر گوئٹے سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور یہ امر قدرے اطمینان بخش ہے کہ اس دفعہ برصغیر نے گوئٹے کے بارے میں اپنی سابقہ سرد مہری اور غفلت کو ترک کر دیا اور یہاں کے بعض علمی اداروں' دانش گاہوں اور انجمنوں نے محافل علمیہ برپا کیں اور ان کے شرکاء نے جرمنی کے اس عظیم شاعر اور مفکر کو اپنے علم و دانش کی روشنی میں ہدیہ تبریک پیش کیا۔

راقم نے گوئٹے کے اسی دو سو پچاسویں سال پیدائش کے موقع پر "اقبال اور گوئٹے" کے زیر عنوان ایک منصوبے کا آغاز کیا۔ ابتدا میں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ یہ منصوبہ اس قدر پھیل جائے گا۔ تخلیقی اور قلبی سفر میں شوق طولانی داستان کا باعث ہوتا ہے' لیکن ایسے علمی اور تخلیقی کاموں میں متعلقہ ماٰخذ کی دستیابی اور معلومات کی فراہمی سے تجویز کردہ یا زیر کار موضوع میں اتنی وسعتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ بسا اوقات انہیں سلیقہ مندی سے سمیٹنا دشوار نظر آتا ہے۔ یہ منصوبہ بھی اسی صورت حال کا شکار ہوا ہے اور درمیانے سائز کی ایک جلد کے بجائے پھیلتے پھیلتے تین جلدوں تک جا پہنچا۔ بالعموم ہمارے ہاں کے کتاب خانے انگریزی منابع سے بھرے پڑے ہیں اور اگر اس کے علاوہ کسی اور یورپی زبان (جرمن' فرانسیسی وغیرہ) کی کتابوں یا رسالوں کی ضرورت آن پڑے' تو سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اختیار کردہ موضوع کی ایک شخصیت جرمن تھی' اس لئے فن تحقیق و تنقید کے اساسی تقاضوں کے پیش نظر جرمن ماٰخذ تک رسائی لازمی تھی۔ یہ کمی کچھ تو راقم کے جرمن بولنے والے علاقوں کے مسلسل سفروں نے اور بقیہ بعض جرمن علم دوست احباب کے مثالی تعاون نے پوری کر دی۔ ان مصادر کے حصول نے راہ تحقیق کا سفر آسان بنا دیا' لیکن اس کے ساتھ ہی اس راستے کی مسافتوں کو بھی بڑھا دیا۔

یہ منصوبہ چار زبانوں پر مشتمل ہے اردو' فارسی' انگریزی اور جرمن۔ ان تمام زبانوں پر

اقبال کو کامل دستگاہ حاصل تھی۔ اول الذکر تینوں میں ان کی شعری تخلیقات اور نثری تحریریں موجود ہیں، آخر الذکر میں ان کے چند مکتوبات (بنام ایما ویگے ناسٹ) ہی دستیاب ہیں، لیکن ان کی بعض مطبوعہ اور غیر مطبوعہ (مخزونہ اقبال میوزیم) تحریروں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جرمن مآخذ سے بخوبی استفادہ کر سکتے تھے اور متعلقہ عبارتوں کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی مہارت بھی رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں فارسی کے لئے ایک حصہ مختص کرنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ گوئٹے کے "دیوان" کا اصل محرک "دیوان حافظ" تھا، جس کا جرمن ترجمہ پڑھ کر اس نے اپنی قلبی وارداتوں کو مشرقی پیرائے میں بیان کیا۔ بعینہ اقبال نے گوئٹے کے جواب میں "پیام مشرق" لکھی، جو فارسی میں ہے۔ اس کے باوجود کہ ان دونوں تصانیف کے تخلیقی محرکات میں بعد المشرقین ہے، پھر بھی ان میں یہ قدر مشترک ہے کہ گوئٹے فارسی ادب کے ایک کلاسیکی شاہکار سے متاثر ہوا اور اقبال نے گوئٹے کو اسی زبان میں جواب دیا۔

"اقبال اور گوئٹے" کے اس منصوبے کے بعض نمایاں پہلو درج ذیل ہیں :

1- اقبال اور گوئٹے کے تقابلی مطالعہ میں جن ظاہری مشابہ امور کو بہ تکرار بیان کیا جاتا ہے، ان میں وسعت پیدا کی جائے اور کچھ ایسے فکری، شعری اور ہیئتی پہلوؤں کو بھی سامنے لایا جائے، جو ان دونوں شعراء کی ذہنی قربتوں کو مزید واضح کرتے ہیں۔

2- دنیا کے مختلف حصوں میں گوئٹے شناسی کی روایت کے تصنیفی آثار ملتے ہیں اور انہیں سلیقے سے مدون بھی کیا گیا ہے، لیکن برصغیر پاک و ہند میں ابھی تک کسی شخص یا ادارے نے ایسی کوشش نہیں کی۔ اقبال نے اس خطے میں گوئٹے کو متعارف کرانے میں بنیادی کردار ادا کیا، لیکن ان سے قبل یا ان کے اپنے دور میں جن اصحاب علم نے گوئٹے کو اپنی تنقید و تحقیق کا موضوع بنایا، ان کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ مزید یہ کہ اقبال کے پیروکاروں نے گوئٹے پر جو کچھ تحریر کیا ہے، وہ بھی لائق توجہ ہے۔ چنانچہ اقبال سے پہلے، ان کے معاصر دور اور ان کے بعد برصغیر کے انگریزی اور اردو رسائل وغیرہ میں گوئٹے سے متعلق جو مضامین اور تراجم شائع کئے گئے، ان کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ایسی منتشر قلمی رشحات کی جمع آوری سے اس امر کا بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکے گا کہ برصغیر پاک و ہند نے گوئٹے شناسی کی عالمی روایت کی ترویج یا اسے مستحکم کرنے میں کیا رول ادا کیا۔

3- اس میں گوئٹے سے متعلق صرف اردو اور انگریزی تحریروں ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا' بلکہ جرمن اور فارسی کے بعض اہم مصامین' تراجم اور تبصروں کو بھی شامل کیا گیا ہے' تاکہ ان زبانوں کے عام قارئین بھی زیر نظر موضوع سے متعارف ہو سکیں۔

4- اقبال اور گوئٹے کی حیات و تصانیف کے بارے میں معتبر مصادر سے استفادہ کیا گیا ہے اور بوقت ضرورت انکی خود نوشت تحریروں کی نقول پیش کی گئی ہیں۔ بیشتر مقامات پر تصانیف اقبال کے مطبوعہ متن کے بجائے اقبال میوزیم میں محفوظ ان کی بیاضوں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

5- گوئٹے کی مشرقی علوم و فنون' ادب بالخصوص اسلامی تاریخ اور بلند پایہ شعری تخلیقات سے گہری دلچسپی اور وسعت مطالعہ سے متعلق بنیادی معلومات فراہم کی گئی ہیں' تاکہ اس وسیع تناظر میں اقبال کی شاعری اور افکار کا مطالعہ کیا جا سکے۔

یہ منصوبہ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ جلد اول بزبان انگریزی (مطبوعہ اقبال اکادمی پاکستان' لاہور' 1999ء' صفحات 117) زیر عنوان Goethe, Iqbal and the Orient شائع ہوئی۔ اس میں گوئٹے کی مشرق شناسی اور عصری شہادتوں سے اس کے پس منظر' اقبال کی گوئٹے سے ذہنی وابستگی کا آغاز اور اس کے ارتقائی مراحل' اقبال کی گوئٹے شناسی کی روایت کی اگلی نسلوں تک منتقلی جیسے مباحث شامل ہیں۔ زیر بحث امور کے استناد کے لئے اردو کے علاوہ جرمن اور انگریزی کے معتبر مآخذ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ آخر میں گوئٹے کی خود نوشت تحریروں سمیت چند ایسی تصاویر کے عکس دیئے گئے ہیں' جو اس کی مشرق سے دلچسپی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

جلد دوم کا ملاً انگریزی اور جرمن تحریروں کا مجموعہ ہے (1999ء' صفحات 695)۔ اس کا عنوان Iqbal and Goethe ہے' اور اسے اقبال اکادمی پاکستان (لاہور) نے ادارہ ادبیات پاکستان (اسلام آباد) کے اشتراک سے طبع کرایا۔ پیش لفظ معروف جرمن مستشرق اور ماہر اقبالیات پروفیسر آنیماری شمل نے لکھا ہے۔ درج بالا جلد اول کو اس کتاب کے مفصل تعارف کی حیثیت سے شامل کیا گیا ہے' لیکن اس کے بعض حصوں کو تبدیل کر دیا گیا ہے اور اس کے اول و آخر اور بیچ بیچ میں بھی اضافے کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد کتاب چار حصوں میں

منقسم ہے۔ حصہ اول میں اقبال، گوئٹے اور حافظ سے متعلق جانے پہچانے اقبال شناسوں کے مقالات یکجا کئے گئے ہیں، جن میں پروفیسر آنیماری شمل، ممتاز حسن، بشیر احمد ڈار اور سید وحید الدین کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ حصہ دوم میں گوئٹے کی مشرق شناسی اور "دیوان" پر پانچ مضامین ہیں، جن کے لکھنے والوں میں عبداللہ یوسف علی، معروف پارسی سکالر شمس العلما ڈاکٹر جیون جی جمشید جی مودی اور سید وحید الدین شامل ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ عبداللہ یوسف علی کا یہ پہلا مضمون ہے، جو انگلستان کے مجلّہ میں شائع ہوا (1906ء) اور پہلی بار اسے مکمل صورت میں دوبارہ شائع کیا گیا ہے(31)۔ حصہ سوم میں پروفیسر حمید احمد خان کے مضمون کے علاوہ اقبال کی گوئٹے سے متعلق نثری تحریریں (مثلاً شذرات فکر اقبال مع جرمن ترجمہ)، فارسی منظومات (مثلاً جوئے آب، حور و شاعر اور جلال و گوئٹے) کا متن مع جرمن و انگریزی تراجم، دیباچہ "پیام مشرق" کا جرمن اور انگریزی ترجمہ، "پیام مشرق" پر آر۔ اے۔ نکلسن کا مضمون (جرمنی کے رسالہ "اسلامیکا" بابت 1925ء میں طبع ہوا)، اور پروفیسر آنیماری شمل کے "پیام مشرق" کے جرمن ترجمہ پر تین مستشرقین (یوہان فیوک، یان رپکا اور یوہان کرسٹوف بیورگل) کے پرمغز تبصرے شامل کئے گئے ہیں۔ آخر میں ان ذیلی عنوانات کے تحت جدید ترین معلومات اور ماخذ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ پہلے گوئٹے کی حیات و تصانیف کو زمانی ترتیب سے درج کیا گیا ہے اور پھر گوئٹے سے متعلق عمومی فہارس کتب اور بین الاقوامی رسائل کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد گوئٹے کی مشرق شناسی کے ماخذ کی فہرست، "دیوان" کی طباعتیں اور ترجمے (بلحاظ زمانی ترتیب) اور "دیوان" سے متعلق مقالات و کتب کی جامع فہرست شامل ہے۔ اس حصے کے آخر میں اقبال کی گوئٹے سے متعلق خود نوشت تحریروں کے عکس اور گوئٹے کی ولادت سے وفات تک کی تصاویر (زمانی ترتیب کے ساتھ) مع توضیحات دی گئی ہیں۔

اس منصوبے کا زیر نظر حصہ سوم بھی چار حصوں پر مشتمل ہے اور اس میں اردو اور فارسی مضامین کو جمع کیا گیا ہے۔ یہ تمام مطالعات اور تراجم مختلف کتابوں اور رسالوں سے جمع کئے گئے ہیں۔ حصہ اول کا مرکزی موضوع اقبال اور گوئٹے ہی ہے، لیکن کہیں کہیں اس تقابلی جائزے میں کسی تیسری شخصیت (مثلاً نطشے، حافظ اور غالب) کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ حصہ دوم گوئٹے کی شعری اور نثری تخلیقات کے مطالعات یا ان کے جزوی تراجم سے

متعلق ہے۔ حصہ سوم میں "پیام مشرق" کے عالمانہ جائزوں اور تبصروں کو جگہ دی گئی ہے' جبکہ آخری حصے میں "پیام مشرق"' "دیوان" اور اقبال' گوئٹے اور حافظ کے تقابلی مطالعات کے بارے یں فارسی مقالات کو جمع کیا گیا ہے۔

تین جلدوں پر مشتمل اس جامع منصوبے کی تکمیل میں بیشتر ملکی اور غیر ملکی احباب نے تعاون کیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ان کی علمی استعانت کے بغیر یہ موضوع جامعیت اور ہمہ گیریت سے عاری ہوتا۔ غیر ملکی اصحاب علم و دانش کا شکریہ تو متذکرہ صدر دونوں انگریزی جلدوں کے تعارف میں ہو چکا ہے۔ یہاں صرف ان علم پرور شخصیات یا اداروں کا ذکر مقصود ہے' جنہوں نے زیر نظر جلد کی تدوین اور اشاعت میں ہاتھ بٹایا۔ سب سے پہلے تو اقبال اکادمی پاکستان (لاہور) کے ناظم جناب سہیل عمر کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ انہوں نے نہ صرف اس منصوبے کو اپنے اشاعتی پروگرام میں سرفہرست رکھا' بلکہ اسے "گوئٹے ایئر" (Goethe 1999 Year) کے اختتام سے قبل شائع کرنے کے لئے مالی دشواریوں کو بھی حائل نہیں ہونے دیا۔ اکادمی کے جملہ اراکین بالخصوص یہاں کے کتب خانہ اور اقبال آرکائیوز کے نگہبانوں نے نایاب اور کمیاب کتب اور دستاویزات فراہم کیں' جن کی دستیابی سے برسوں کا کام مہینوں اور مہینوں کا کام دنوں میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اقبال میوزیم (لاہور)' اقبال کے نجی ذخیرۂ کتب (مخزونہ گورنمنٹ اسلامیہ کالج' سول لائنز' لاہور)' پنجاب پبلک لائبریری (لاہور) اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری (لاہور) کے محافظوں اور کتابداروں کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے' کیونکہ ان کے اشتراک کے بغیر بہت سے متعلقہ ماخذ تک رسائی ناممکن تھی۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی (اسلام آباد) کے شعبہ اقبالیات کے سربراہ جناب ڈاکٹر صدیق شبلی اور وائس چانسلر جناب پروفیسر انوار حسین صدیقی کا تہہ دل سے ممنون ہوں' جن کی مساعی سے زیر نظر جلد طبع ہو رہی ہے۔ آخر میں اپنے قریبی دوست جناب سجاد اختر کھوکھر کی خدمت میں خصوصی کلمات تشکر پیش کرنا ہیں' جنہوں نے اس منصوبے کے ابتدائی مرحلوں میں ایسی آسائشیں فراہم کر دیں کہ بعد میں اس راستے کی مشکلات کا احساس تک نہیں ہوا۔

حواشی

1- مکتوب اقبال بنام ڈاکٹر ظفر الحسن' بابت 19 مارچ 1933ء۔ (غیر مطبوعہ' مخزونہ کتاب خانہ اقبال اکادمی پاکستان' لاہور)۔ اس خط کا متعلقہ اقتباس درج ذیل ہے :

''ممالک اسلام میں بیداری کی لہر دوڑ رہی ہے' خصوصاً ممالک عرب میں۔ یورپ میں باوجود سیاسی انہماک کے اسلام کے متعلق بے انتہا دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔ ہسپانیہ کے عربی الاصل لوگوں میں ایک نیا قومی شعور پیدا ہو رہا ہے۔ وسطی یورپ میں اسلام کے متعلق دلچسپی بالخصوص بڑھ رہی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام کا اصل کام یعنی مشرق و مغرب کا Synthesis انہیں ممالک سے شروع ہو گا۔ افسوس میرے پاس روپیہ نہ تھا' ورنہ ان ممالک کا سفر بھی کرتا۔''

2- مثلاً :

(i) Publications of the English Society, No. 1-14

London (1886-1912). (New Series. Vol. 1 ff) London (upto vol. 9) Cambridge

(upto vol. 16) Cardiff 1924--.

(ii) Catherine W. Proescholdt - Obermann : *Goethe and his British Critics.*

The Reception of Goethe's Works in British Periodicals, 1779 to 1855.

Frankfurt a. M. etc.: Peter Lang, 1992.

(iii) John Hennig: *Goethe and the English Speaking World*, Frankfurt a. M. etc.:

Peter Lang, 1988.

3- دیکھئے :

(i) Jean - Marie Carré: *Bibliographie de Goethe en Angletere.*

Paris 1920 (pp. xii, 176),

(ii) Alexander John Dickson: *Goethe in England 1909 - 1949.*

A bibliography, 1951 (pp. vii, 48, Publications of the English Goethe

Society, NS. 19)

-4 تفصیل کے لئے رک: راقم کی انگریزی کتاب "اقبال اور گوئٹے" لاہور: اقبال اکادمی 1999ء، ص 395

-5 گورنمنٹ کالج لاہور میں اقبال کے تقرر وغیرہ سے متعلق پوری فائل پنجاب گورنمنٹ سول سیکرٹریٹ میں محفوظ تھی، جو خوش قسمتی سے ڈاکٹر جہانگیر خان کے ہاتھ لگ گئی اور انہوں نے اس کے بعض حصوں کو شائع کرا دیا، دیکھئے:

Appointment to and Resignation from Government Service of

Shaikh Muhammad Iqbal by Dr. M. Jehangir Khan

(in: Journal of the Research Society of Pakistan, Vol. xiv,

No. 4 (Oct. 1977), pp. 1-22)

برسوں یہ فائل ڈاکٹر موصوف کی تحویل میں رہی۔ ان کی وفات کے بعد اسے اقبال اکادمی کے سپرد کر دیا گیا اور یہ آج کل یہیں اقبالیات سے متعلقہ آرکائیوز میں محفوظ ہے۔

-6 رک:

Some New Facts on Iqbal's Appointment as Professor of Philosophy.

By Mohammad Yusuf Abbasi.

(in: Journal of the Research Society of Pakistan, *ibid*. pp. 35-40)

فراہم کردہ معلومات لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ دستاویزات سے حاصل کی گئی ہیں۔

-7 رک: کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ از ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور 1965ء، ص 326-337-341 نیز نوٹ 3۔

-8 برسوں بعد اقبال نے یہی ترکیب "پیام مشرق" کی ایک غزل کے آخری شعر میں استعمال کی ہے:

صبا بہ گلشن ویمر سلام ما برساں
کہ چشم نکتہ وراں خاک آں دیارا فروخت

(پیام مشرق، طبع اول، 1923ء، ص 144۔ دیگر طباعتیں، ص 155)

اقبال نے مولانا گرامی کے نام اپنے ایک مکتوب (بابت 28 جنوری 1915ء) میں یہی فارسی شعر نقل کیا ہے جس میں "گلشن ویمر" کے بجائے "مولد حافظ" مرقوم ہے۔ (رک: مکاتیب اقبال بنام گرامی مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، کراچی 1939ء، ص 102۔ نیز مکتوب اقبال مہاراجہ کشن پرشاد شاد (بابت 28 دسمبر 19149ء) در: اقبال بنام شاد، مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، لاہور 1986ء، ص 116)

9- رک : ابتدائی کلام اقبال۔ مرتبہ ڈاکٹر گیان چند' حیدر آباد دکن 1988ء' ص 119-120

10- ڈاکٹر صدیق جاوید نے اپنے ایک مضمون میں اس نظم کے تخلیقی ماخذ کی نشاندہی کرتے ہوئے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے' دیکھئے : مجلہ "اقبال" جلد 37 شمارہ 1-2 (جنوری - اپریل 1990ء)' ص 39-76' بالخصوص ص 44- 46, 57

11- ڈاکٹر محمد صادق کا انگریزی مضمون بعنوان Iqbal's Borrowings from English Poets دیکھئے

Journal of the Research Society of Pakistan, Vol. xiv, No. 4

(Oct. 1977), p. 24; Twentieth Century Urdu Literature,

Karachi: Royal Book Co. 1983, p. 75

12- رک : یوسف حسین خان کی کتاب "غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات" نئی دہلی 1979ء ص 19 - 20- ڈاکٹر محمد اکرم شاہ صاحب نے اپنے ایک مضمون میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے جو اسی کتاب میں شامل ہے۔

13- اقبال یورپ میں از ڈاکٹر سعید اختر درانی' طبع ثانی' لاہور 1999ء

14- مکتوب اقبال مرتبہ سید نذیر نیازی' کراچی' 1957ء ص 30 (مراسلہ اقبال بنام سید نذیر نیازی' بابت 14 اگست' 1930ء)۔

15- مرتبہ ڈاکٹر جاوید اقبال' لاہور 1961ء۔ طبع دوم' نظر ثانی شدہ' لاہور 1992ء۔ پہلے Stray Thoughts عنوان رکھا گیا' لیکن بعد میں دوسرے لفظ کو Reflections سے تبدیل کر دیا گیا۔ اب تک اس کے دو اردو ترجمے شائع ہو چکے ہیں' بعنوان "شذرات فکر اقبال" از ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (لاہور' 1973ء) اور "بکھرے خیالات" از ڈاکٹر عبدالحق' دہلی 1975ء۔

16- اس کتاب کا جرمن عنوان Maximen und Reflexionen ہے' جس کا انگریزی ترجمہ لندن سے 1893ء میں طبع ہوا تھا۔

17- اس کا عنوان ہے: Critisms, Reflections and Maxims of Goethe - مطبوعہ لندن' بلا تاریخ۔ رک : اقبال کے نجی ذخیرہ کتب کی بیانیہ فہرست (بزبان انگریزی) مرتبہ محمد صدیق' لاہور' 1983ء۔

18- متعلقہ اقتباس یہ ہے : "انیسویں صدی کے مشہور جرمن شاعر گوئٹے کا ہیرو فوسٹ جب انجیل یوحنا کی پہلی آیت میں لفظ کلام کی جگہ لفظ عمل پڑھتا ہے ("ابتدا میں کلام تھا۔ کلام خدا کے ساتھ اور کلام ہی خدا تھا") تو حقیقت میں اس کی دقیقہ رس نگاہ اسی نکتے کو دیکھتی ہے جس کو ہندو حکما نے صدیوں پہلے

دیکھا تھا۔"

19- جرمن عنوان "West Oestlicher Divan" ہے اور یہ شٹ کارٹ سے 1819ء میں طبع ہوا۔ دا عمار کے گوئٹے میوزیم میں اس کا جو نسخہ محفوظ ہے' اس کے شروع میں گوئٹے نے اپنے قلم سے "الدیوان الشرقی للمولف الغربی" لکھا ہے۔ اس کے عنوان کا صحیح ترجمہ تو "دیوان شرقی و غربی" ہے' لیکن بالعموم اسے "دیوان شرقی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اقبال نے اس کے لئے "مغربی دیوان" اور "دیوان مغربی" کے عنوانات استعمال کئے ہیں۔

20- کلیات مکاتیب اقبال مرتبہ مظفر حسین برنی' جلد دوم' نئی دہلی 1991ء' ص 201, 354, 356 اور 439۔

21- رک:

Arther F. J. Remy: The Influence of India and Persia on the Poetry

of Germany. Columbia University, 1901

اس کتاب کی عکسی طباعت نیویارک سے 1966ء میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر ریاض الحسن نے مفید حواشی کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ کیا تھا' جو کراچی کے پاک جرمن فورم کی جانب سے چھاپا گیا (1973ء)۔

22- "پیام مشرق" کی جو قلمی بیاض اقبال میوزیم (لاہور) میں موجود ہے' اس میں چند ایسے اشعار بھی ہیں جن کو اقبال نے حذف کر دیا' لیکن صرف ایک شعر ایسا ہے' جو حذف شدہ نہیں' لیکن مطبوعہ متن میں اسے شامل نہیں کیا گیا۔

ترجمہ : مغرب کا گرو' المانوی شاعر۔ وہ پہلوی اداؤں کا مارا ہوا۔ اس نے شوخ و شنگ حسیناؤں کا تصور باندھا۔ مغرب سے مشرق کو سلام بھیجا۔ میں نے اس کے جواب میں مشرق کا پیغام کہا ہے۔ یورپ کے جھٹپٹے پر چاندی چھڑکا دی۔ یہ تو ہے کہ میں خود شناس ہوں' خود پرست نہیں۔ تجھے بتاتا ہوں وہ کون تھا اور میں کون ہوں۔ وہ بجلی ایسے فرنگی جوانوں میں سے۔ میرا شعلہ مشرق کے بوڑھوں نے دھونکا۔ وہ چمن کا بیٹا' بہار کا پالا ہوا۔ (اور) میں ایک بانجھ زمین سے اگا۔ وہ چمن میں بلبل کی طرح کانوں کی جنت۔ میں صحرا میں جرس کے مانند شور مچاتا ہوا فریادی۔ دونوں ہی کائنات کا بھید جاننے والے' دونوں موت کے بیچ زندگی کا پیغام۔ دونوں صبح کی طرح جگر جگر کرتے آئینہ فام خنجر۔ وہ کھلا ہوا اور میں ابھی نیام میں ہوں۔ دونوں موتی' انمول اور چمکیلے۔ بیکراں سمندر کے پیدا کئے ہوئے۔ وہ سمندر کی تہہ میں کھل کے تڑپا پھڑکا۔ یہاں تک کہ صدف کا گریبان چاک کر دیا۔ میں ابھی صدف کے آغوش میں الجھا ہوا چمک رہا ہوں۔ اب تک سمندر کے باطن میں ہوں' ان دیکھا! میرا آشنا بھی مجھ سے انجان گذر گیا۔ وہ میرا شراب خانے سے

خالی پیالہ نکل آیا۔ میں اسے خسرو کا جاہ و جلال پیش کرتا ہوں۔ اس کے قدموں تلے کسریٰ کا تخت رکھتا ہوں۔

(پیام مشرق، تسہیل از احمد جاوید، لاہور۔ اقبال اکادمی 1992ء، ص 5-11)

23- اقبال کے ایک قریبی ساتھی مولانا غلام رسول مہر بیان کرتے ہیں کہ دوران سفر بمبئی میں سیٹھ ہاشم اسماعیل سے ملاقات ہوئی (5 جنوری 1932ء) میزبان کی بیوی جرمنی کی فارغ التحصیل خاتون تھی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد اس نے اقبال کو "فاؤسٹ" کا ایک نسخہ بھیجا اور اس پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی۔ اقبال نے یہ شعر لکھا۔

کلام و فلسفہ از لوح دل و فرو شستم
ضمیر خویش کشادم بہ نشتر تحقیق

اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ گوئٹے کو اس نتیجے پر پہنچنا چاہئے تھا، لیکن نہ پہنچ سکا۔ (گفتار اقبال مرتبہ رفیق افضل، لاہور 1969ء ص 126)

اسی طرح اقبال کے ایک اور رفیق کار چوہدری محمد حسین کا کہنا ہے کہ "زبور عجم" کی اشاعت پر اقبال نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ کاش! گوئٹے اس کتاب کو پڑھ سکتا۔ (اقبال چوہدری محمد حسین کی نظر میں مرتبہ حنیف شاہد، لاہور 1975ء ص 147-161)

24- "جاوید نامہ" (قلمی، مخزونہ اقبال میوزیم، لاہور) میں اس حصے کا عنوان صرف "تمہید" ہے۔ انہی دنوں اقبال بذریعہ خط (14 اگست 1930ء) سید نذیر نیازی سے استفسار کرتے ہیں کہ کیا ڈاکٹر عابد حسین " فاؤسٹ" کے اس حصے کا ترجمہ کر چکے ہیں یا نہیں۔ (رک : مکتوبات نیازی، کراچی 1957ء، ص 40)

25- "اقبال اور گوئٹے" (لاہور1999ء، نیز ص 116-117 نوٹ 202-207)

26- اس موضوع پر تفصیل کے لئے دیکھئے : راقم کی متذکرہ بالا انگریزی کتاب ، ص 116,112 اور 124- (نوٹ نمبر 203,187 اور 236) مزید مطالعے کے لئے رک : انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (انگریزی)، طبع جدید، لائیڈن، جلد سوم (1971ء)، ص668 - 669 ، جلد نہم (1997ء)، ص 406-409- نیز دیکھئے :

Satan (Collection of Articles), New York: Sheed and Ward, 1952.

27- رسالہ ہزار داستان (لاہور)، اگست 1925ء، ص 25

28- ممتاز حسن کے یہ تراجم ابھی تک ان کی تحریروں کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں کئے گئے۔

29- حال ہی میں اس ترجمہ کا ایک خوبصورت پیپر بیک ایڈیشن شائع کیا گیا ہے (اسلام آباد : الحمرا، 2000ء)

30- رک: راقم کی انگریزی کتاب "اقبال اور گوئٹے" ص 63-64' نوٹ نمبر 3

31- عبداللہ یوسف علی کے سوانح حیات پر جو انگریزی کتاب کوالالمپور سے شائع ہوئی ہے (1994ء' طبع ثانی اسلام آباد' 2000ء' پیپر بیک)' اس کے مؤلف ایم۔ اے۔شریف نے آخر میں عبداللہ یوسف علی کے بعض مضامین کا انتخاب شائع کیا ہے۔ اس حصے کا پہلا مضمون یہی ہے' لیکن اسے مکمل صورت میں شائع کرنے کے بجائے اس کی تلخیص دی گئی ہے۔ حال ہی میں عبداللہ یوسف علی کی انگریزی تحریروں کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے (مرتبہ محمد حنیف شاہد' لاہور' 2000ء) جس میں اس مضمون کو شامل نہیں کیا گیا۔

حصّہ اول

قارئین اقبال کے لئے گوئٹے کی اہمیت	ممتاز حسن	3
گوئٹے، اقبال کی نظر میں	ممتاز حسن	10
اقبال اور گوئٹے	سید نذیر نیازی	15
اقبال اور گوئٹے	عبدالمالک آروی	20
حکمت گوئٹے اور فکر اقبال	سید وحیدالدین	38
اقبال اور گوئٹے	جگن ناتھ آزاد	58
اقبال اور گوئٹے	ڈاکٹر حاتم رامپوری	69
اقبال اور گوئٹے	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی	88
گوئٹے اور اقبال	محمد اشرف خان اشرف	97
اقبال اور گوئٹے	شیخ حبیب اللہ	109
اقبال اور گوئٹے	ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی	127
اقبال اور گوئٹے	سید افتخار حسین شاہ	138
اقبال اور گوئٹے	مقبول حسین ہاشمی	154
اقبال اور گوئٹے	محمد حیات خان سیال	160
گوئٹے اور اقبال (منظوم مکالمہ)	خمار (بی۔اے آنرز)	173
اقبال، گوئٹے اور نٹشے	سید وحیدالدین	180
اقبال، حافظ اور گوئٹے کے حوالے سے	ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ	204
اقبال، حافظ اور گوئٹے	غلام نبی خیال	212
ابلیس۔ اقبال اور گوئٹے کی نظر میں	ڈاکٹر حامدی کاشمیری	226
اقبال کی نظر میں غالب... گوئٹے کا ہمنوا	ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ	233

ممتاز حسن

قارئینِ اقبال کے لئے گوئٹے کی اہمیت

گوئٹے ایک شاعر اور مفکر کی حیثیت سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ ایک تو وہ دل بستگی ہے' جو خود گوئٹے کو مشرقی دنیا سے عموماً اور عالم اسلام سے خصوصاً تھی اور دوسری وہ عقیدت جو ہمارے سب سے بڑے شاعر اور مفکر اقبال کو گوئٹے اور اس کے کلام سے تھی۔

یورپ کی ساری ادبی تاریخ میں کوئی شخص شاید ہی ایسا ملے گا' جس نے مشرق اور مغرب کے باہمی تعلق کو گوئٹے کی سی بصیرت اندوز نگاہ سے دیکھا ہو۔

جہاں انگلستان کا مشہور استعمار پرست شاعر رڈیارڈ کپلنگ مشرق اور مغرب کو ایک دوسرے سے بالکل الگ تصور کرتا اور ان کا آپس میں ملنا ناممکن سمجھتا ہے' وہاں انسان دوست گوئٹے کہتا ہے:

"جو شخص اپنے آپ کو جانتا اور دوسروں کو پہچانتا ہو' وہ یہ بھی آسانی سے سمجھ سکے گا کہ مشرق اور مغرب ایک دوسرے سے قطعاً جدا نہیں ہیں۔"

گوئٹے کی طبیعت یورپ کی سیاسی بدامنی اور روحانی افلاس سے بیزار ہوتی تو اس کا تخیل مشرق کی پرامن اور پرسکون فضا کی طرف پر پھیلانے لگتا۔ چنانچہ "دیوان شرقی" کی پہلی نظم "ہجرت" کے پہلے بند کے شعر ہیں:

"شمال' جنوب اور مغرب ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں' تخت و تاج پاش پاش ہونے

کو ہیں، سلطنتیں لرز رہی ہیں۔ آؤ ہم مشرق کی پاک فضاؤں کی طرف چلیں اور پیران شرق کی صحبت سے فیض یاب ہوں۔"

گوئٹے نے قرآن، سیرت رسولؐ اور تعلیمات اسلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ قرآن سے بہت متاثر تھا۔ قرآن کی دوسری سورت یعنی سورۂ بقرۃ کے شروع کی آیات کو قرآن کا خلاصہ اور اسلام کی تعلیم کی روح سمجھتا تھا۔ اس کتاب میں اس کے لئے مقناطیسی کشش تھی۔ ایک مقام پر اس نے کہا ہے کہ "اگرچہ اس کتاب کے مطالعے سے قاری پر عمل اور ردِ عمل دونوں کیفیتیں طاری ہوتی ہیں، لیکن وہ بار بار ہمیں اپنی جانب کھینچتی ہے اور بالآخر ہمیں اس کی عظمت کے سامنے سر جھکا دینا پڑتا ہے۔"

جہاں تک سیرت رسولؐ کا تعلق ہے، گوئٹے کی نظم "نغمہ محمدؐ" جو اس نے اپنی جوانی کے زمانے میں لکھی تھی، رسولؐ کی ذات سے محبت اور عقیدت کا ایک ایسا نمونہ پیش کرتی ہے، جس کی نظیر اردو، فارسی اور عربی کے نعتیہ کلام میں بھی مشکل سے ملے گی۔ اقبال نے اس نظم کا فارسی میں آزاد ترجمہ کیا ہے، جو "جوئے آب" کے عنوان سے "پیام مشرق" میں شامل ہے۔

محمدؐ عربی کو نوع انسان کی فلاح و بہبود کی جو فکر ہر وقت دامن گیر رہتی تھی اور انسان کی خدمت کے لئے وہ جس طرح بے قرار رہتے تھے، اس کی ایک دلکش تصویر ہمیں گوئٹے کی نظم میں ملتی ہے۔ اقبال کا ترجمہ ہے:

صد جوئے دشت و مرغ و کہستان و باغ و راغ
گفتند "اے بسیط زمیں با تو سازگار
ما را کہ راہ از تنک آبی نہ بردہ ایم
از دستبرد ریگ بیاباں نگاہ دار
وا کردہ سینہ را بہ ہوا ہائے شرق و غرب
در بر گرفتہ ہمسفران زبون و زار
زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
با صد ہزار گوہر یک دانہ می رود

رسولؐ کی ساری زندگی میں تخلیقی جدوجہد کا جو بے قرار جذبہ مسلسل طور پر کارفرما تھا،

اس کا پرتو اقبال کے ترجمے کے اس شعر میں ملتا ہے:

بے تاب و تند و تیز و جگر سوز و بے قرار
در ہر زماں بہ تازہ رسید از کہن گذشت

گوئٹے کے "دیوان شرقی" کو جو اس کے اواخر ایام حیات کی یادگار ہے' دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس پر قرآن اور اسلام کا کس قدر گہرا اثر تھا۔ وہ کہتا ہے:

"مشرق بھی خدا کا گھر ہے اور مغرب بھی۔"

کیا یہ **للہ المشرق والمغرب** کا ترجمہ نہیں ہے؟ اسی طرح جب گوئٹے لکھتا ہے کہ:

"خداوندا! جب میں کسی کام میں ہاتھ ڈالوں' یا جب میں شعر کہوں تو سیدھے راستے کی طرف میری رہنمائی کر۔"

تو کیا ہمیں **اھدنا الصراط المستقیم** کی آیت یاد نہیں آتی؟

گوئٹے نے خدا اور انسان کے تعلق کو خالص اسلامی نقطہ نگاہ سے دیکھا اور اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ اسلامی تعلیمات کی اساس مخلوق کی طرف سے خالق کی مکمل اور غیر مشروط اطاعت پر ہے۔ چنانچہ "دیوان شرقی" کا ایک شعر ہے:

"اگر اسلام کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیں تو ہم یقیناً اسلام ہی میں جیتے اور اسلام ہی میں مرتے ہیں۔"

اسلام کو اس سے بڑا خراج عقیدت کسی غیر مسلم نے شاید ہی پیش کیا ہو!

یہی وہ ذہنی اور روحانی تعلق ہے' جو گوئٹے کو مشرق اور اسلام سے تھا اور جس کی وجہ سے اس کی شخصیت اور ادبی کارنامہ پاکستان کے لئے اہم ہے۔

اردو میں گوئٹے سے متعلق کتابیں موجود ہیں۔ قاضی عبدالودود نے بنگالی میں دو جلدوں میں کتاب لکھی ہے۔ اردو میں ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر عبدالقیوم خاں باقی نے یکے بعد دیگرے "فاؤسٹ" کے حصہ اول کے ترجمے کئے ہیں۔ فضل الرحمان نے "فاؤسٹ" کے حصہ دوم میں سے "ہیلینا" کو لے کر ایک منظوم ڈرامے کے قالب میں ڈھالا ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے "فاؤسٹ" کی کہانی ناول کے پیرائے میں لکھی ہے۔ "ورتھر" کے دو ترجمے اردو میں موجود ہیں۔ ایک ریاض الحسن کا ہے جو ایک عرصہ ہوا "نوجوان ورتھر کی داستان غم" کے نام سے چھپا تھا۔ دوسرا ہادی حسین کا ہے' جو "دل ناداں" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

"ولہیلم مائسٹر" جلد اول و دوم دونوں کا ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین نے اردو میں کیا' جو آج سے تین چار سال پہلے ہندوستان میں چھپا تھا۔ "دیوان شرقی" کی چند نظموں کا ترجمہ بھی اردو میں کیا جا چکا ہے' جو لاہور کے ادبی مجلّے "ادبی دنیا" میں شائع ہوا تھا۔

"فاؤسٹ" کا ترجمہ سندھی زبان میں بھی ہو چکا ہے' جسے جیٹھ مل پرسرام نے کیا ہے۔ گجراتی کے مشہور ادیب سید عظیم الدین منادی نے "دیوان شرقی" کے منتخب اشعار کا ترجمہ گجراتی میں کیا ہے' جو پاکستان جرمن فورم کی طرف سے کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

یہ ہے ایک مختصر سا تذکرہ ان تصانیف کا' جو گوئٹے سے متعلق مختلف پاکستانی زبانوں میں موجود ہیں۔ پاکستان میں گوئٹے کی ادبی شخصیت سے دلچسپی بڑھ رہی ہے اور اس وسیلے سے جرمن زبان اور ادب اور خود جرمنی پر بھی زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ اس ساری دلچسپی کا اصل سرچشمہ اقبال کا کلام ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اگر اقبال کو گوئٹے سے عقیدت نہ ہوتی' تو شاید ہم یورپ کے اس عظیم الشان مصنف سے کماحقہٗ روشناس نہ ہو سکتے۔

اقبال اور گوئٹے میں ایک سے زیادہ خصوصیات مشترک ہیں۔ دونوں زندگی کو آفاقی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اور دونوں ظواہر سے گزر کر حقائق تک پہنچتے ہیں۔ نوع انسان دونوں کی نگاہ میں ایک غیر منقسم اور ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ نہ مشرق مغرب سے جدا ہے' نہ شمال جنوب سے۔ اقبال کی شخصیت پر' جو بجائے خود مشرق و مغرب کا ایک غیر معمولی امتزاج ہے' دو بڑے ارتقائی اثرات ہیں' ایک مشرقی اور دوسرا مغربی' یعنی رومی اور گوئٹے۔ اقبال نے ان دونوں کے متعلق کہا ہے:

نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

"کتاب" کا اشارہ "مثنوی روم" اور "فاؤسٹ" کی طرف ہے۔

"پیام مشرق" میں "جلال و گوئٹے" کے عنوان سے جو نظم ہے اس میں اقبال نے دونوں کی حقیقت بینی اور روحانی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ گوئٹے مولانا روم کو "فاؤسٹ" پڑھ کر سناتا ہے اور مولانا اس کی بصیرت کی داد دیتے ہیں:

نکتہ دان المنی را در ارم
صحبتے افتاد با پیر عجم
شاعرے کو ہمچو آں عالی جناب

نیست پیغمبر ولے دارد کتاب
خواند بر داناے اسرار قدیم
قصہ پیمان ابلیس و حکیم
گفت رومی اے سخن را جاں نگار
تو ملک صید استی و یزداں شکار
فکر تو در کنج دل خلوت گزید
ایں جہان کہنہ را باز آفرید
سوز و ساز جاں بہ پیکر دیدۂ
در صدف تعمیر گوہر دیدۂ
ہر کسے از رمز عشق آگاہ نیست
ہر کسے شایان ایں درگاہ نیست
"داند آں کو نیک بخت و محرم است
زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است"

نظم کا آخری شعر خود مولانا کا ہے۔

نظم کے حاشیئے میں اقبال نے "فاؤسٹ" کے متعلق مندرجہ ذیل نوٹ لکھا ہے :

"نکتہ دان المنی سے مراد گوئٹے ہے' جس کا ڈراما "فوسٹ" مشہور و معروف ہے۔ اس ڈرامے میں شاعر نے حکیم فوسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کے امکانی نشو و نما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمال فن خیال میں نہیں آ سکتا۔"

اقبال کو "فاؤسٹ" سے گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ جب ڈاکٹر عابد حسین نے "فاؤسٹ" کے پہلے حصے کا ترجمہ شائع کیا' تو اقبال نے خواہش ظاہر کی کہ ڈاکٹر صاحب کتاب کے دوسرے حصے کا ترجمہ بھی کریں اور اس سلسلے میں ان کی مدد بھی کرنی چاہی۔

اقبال کی تصانیف میں گوئٹے کا ذکر اکثر آتا ہے اور اس کے اقوال بھی جا بجا ملتے ہیں۔ خطبات "تشکیل جدید افکار اسلامیہ" میں ایک سے زیادہ مرتبہ گوئٹے کا ذکر آیا ہے۔ ایک جگہ اقبال کہتے ہیں :

"قرآن کا سب سے بڑا مقصد انسان کے دل میں ان ازلی روابط کا احساس پیدا کرنا ہے، جن کے ذریعے اس کا رشتہ خدا اور کائنات سے استوار ہوتا ہے۔"

اس کے بعد وہ ایکرمان کے مکالمات سے اسلام کے متعلق گوئٹے کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

"غور کیجئے۔ یہ تعلیم ہرگز ناکام نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنے سارے نظام ہائے فکر سے جتنی مدد چاہیں، لے لیں، اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے اور ہم کیا کوئی بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

اگرچہ اقبال کے نزدیک گوئٹے کی سب سے بڑی تصنیف "فاؤسٹ" ہے، مگر خود ان کی شاعری "دیوان شرقی" سے زیادہ متاثر ہوئی۔ یہاں تک کہ اقبال کا شاہکار "پیام مشرق" جو بعض نقادوں کی نظر میں ان کا سب سے بڑا فنی شاہکار ہے، "دیوان شرقی" کے جواب میں لکھا گیا۔

"پیام مشرق" کے دیباچے میں اقبال نے جرمن ادب کی تحریک مشرقیت کا مجملاً تذکرہ کیا ہے اور اس تحریک پر گوئٹے نے جو اثر ڈالا ہے، اس کی طرف بھی مختصر اشارے کئے ہیں۔ "پیام مشرق" کی پہلی نظم میں انہوں نے گوئٹے کا ذکر جس جذباتی خلوص اور انتہائی عقیدت مندی سے کیا ہے، وہ دنیا کے ادب میں اپنی نظیر آپ ہے:

پیر مغرب شاعر المانوی
آں قتیل شیوہ ہائے پہلوی
بست نقش شاہدان شوخ و شنگ
داد مشرق را سلامے از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغام شرق
ماہ تابے ریختم بر شام شرق
تاشناسائے خودم، خود بیں نیم
با تو گویم او کہ بود و من کیم
او ز افرنگی جواناں مثل برق
شعلہ من از دم پیران شرق

او چمن زادے، چمن پروردۂ
من دمیدم از زمین مردۂ
او چو بلبل در چمن "فردوس گوش"
من بصحرا چوں جرس گرم خروش
ہر دو دانائے ضمیر کائنات
ہر دو پیغام حیات اندر ممات
ہر دو خنجر صبح خند، آئینہ فام
او برہنہ، من ہنوز اندر نیام
ہر دو گوہر ارجمند و تاب دار
زادۂ دریائے ناپیدا کنار
او ز شوخی در تہ قلزم تپید
تا گریبان صدف را بر درید
من بہ آغوش صدف تابم ہنوز
در ضمیر بحر نایابم ہنوز

حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے نہ صرف ہمیں گوئٹے سے روشناس کیا ہے، بلکہ پاکستان اور جرمنی کے درمیان سب سے بڑا ثقافتی رابطہ اقبال اور اس کا کلام ہے۔

(صحیفہ (لاہور)، اقبال نمبر، حصہ دوم (1974ء)، ص 140-145- نیز : اقبال اور مشاہیر، مرتبہ طاہر تونسوی، دہلی : مکتبہ نعیمیہ، 1981ء، ص 209-215، بعنوان "اقبال اور گوئٹے"۔ مقالات ممتاز (ڈاکٹر ممتاز حسن) مرتبہ شان الحق حقی، کراچی : ادارہ یادگار غالب، 1995ء، ص 443-449- صحیفہ اقبال، مرتبہ یونس جاوید، لاہور : بزم اقبال، 1986ء، ص 62-67)

ممتاز حسن

گوئٹے --- اقبال کی نظر میں

اقبال کے دل میں گوئٹے کے لئے بڑی قدر تھی۔ جس انداز سے انہوں نے اس کا اظہار کیا ہے' اس کو ایک فراخ دل اور وسیع النظر انسان ہی کر سکتا ہے۔ گوئٹے کے متعلق پہلا شاعرانہ حوالہ ان کی اس نظم میں ملتا ہے جو انہوں نے اردو اور فارسی کے عظیم شاعر غالب پر کہی ہے۔ غالب کو خطاب کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں :

آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے(1)

جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ خود اقبال غالب کو اپنے سے برتر تصور کرتے تھے' تو اس موازنہ کی اہمیت اور واضح ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ "پیام مشرق" میں ان کا یہ شعر:

صبا بہ گلشن ویمر سلام ما برساں
کہ چشم نکتہ وراں خاک آں دیار افروخت(2)

خود اقبال نے لکھا ہے کہ "پیام مشرق" کی تصنیف کا محرک گوئٹے کا "مغربی دیوان" ہے۔ "پیام مشرق" کے دیباچے میں آگے چل کر انہوں نے "دیوان" کا تذکرہ قدرے تفصیل سے کیا ہے اور جرمن ادب کی مشرقی تحریک کی مختصر مگر نہایت دلچسپ تاریخ بیان کی ہے۔ اگرچہ گوئٹے کا "دیوان" اقبال کی اس تصنیف کا محرک ہوا جسے بیشتر نقاد اس کا سب سے بڑا کارنامہ تصور کرتے ہیں۔ لیکن اقبال گوئٹے کے "فوسٹ" (Faust) کو "دیوان" سے

مشکل سمجھتے ہیں، کیونکہ اس کے حصہ دوم میں علم کیمیا سے متعلق بہت سی اصطلاحات ملتی ہیں اور کچھ ایسی تلمیحات اور اشارات بھی ہیں، جن سے مغرب کے لوگ مانوس نہ تھے اور جن کو صحیح طور پر صرف مشرق کے لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ جرمنی کے قیام کے دوران میں مجھے بہت سے مواقع ملے۔ جب میں نے ان اصطلاحات کی تشریح و توضیح کی، تو اس سے میرے جرمنی کے سامعین بہت متاثر ہوتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ گوئٹے کی نگاہ وسیع تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اگر کسی نے گزشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا، تو خود کو مہذب اور تربیت یافتہ کہلانے کا مستحق نہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ہر جرمن ان اصطلاحات اور اشارات سے واقف ہو جاتا، جس کو گوئٹے نے مشرقی ادب سے منتخب کیا تھا۔ ہمارے لئے یہ اصطلاحات روزمرہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بہرحال "فوسٹ" کے ان ابواب کے ہضم کرنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ جس آسانی کے ساتھ میں نے ان اصطلاحات کی وضاحت کی، اور اس پر اہل جرمنی کو واقعتاً حیرت تھی۔

اس ضمن میں "پیام مشرق" کی دو نظمیں قابل ذکر ہیں۔ پہلی نظم "حور و شاعر" ہے۔ یہ نظم "مغربی دیوان" کے "خلد نامہ" کے ابتدائی اشعار سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ دوسری نظم کا عنوان "جوئے آب" ہے، جو گوئٹے کی نظم "نغمہ محمدؐ" کا ترجمہ ہے۔ اس نظم پر بھی اقبال نے نوٹ لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "جوئے آب" گوئٹے کی مشہور نظم موسوم بہ "نغمہ محمدؐ" کا ایک نہایت آزاد ترجمہ ہے۔ اس نظم میں جو "دیوان مغربی" سے پہلے لکھی گئی تھی، المانی شاعر نے زندگی کے اسلامی تخیل کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ اصل میں یہ ایک مجوزہ اسلامی ڈرامے کا جزو تھی، جس کی تکمیل اس سے نہ ہو سکی۔ اس ترجمے سے صرف گوئٹے کا نقطہ نگاہ دکھانا مقصود ہے۔"

اقبال کے خطوط میں گوئٹے، "مغربی دیوان" اور "پیام مشرق" سے متعلق بہت سے حوالے ملتے ہیں۔ ان میں سے دو بہت دلچسپ ہیں۔ ایک خط مورخہ 17 جولائی 1909ء ہے جو انہوں نے مس فیضی کو، (جو اب بیگم عطیہ فیضی رحیمین ہیں) لکھا تھا، جس میں انہوں نے اپنا تین یورپی شعرا سے موازنہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "بائرن، شیلے اور گوئٹے کو اپنے معاصرین سے داد نہ ملی۔ فن شعر میں میں ان کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا، لیکن یہ سوچ کر محسوس کرتا ہوں کہ کم از کم اس معاملے میں ان کے دوش بدوش ہوں۔"

دوسرا خط انہوں نے 10 اکتوبر 1919ء کو لکھا اور جو سید سلیمان ندوی کے نام ہے۔ اس خط میں اقبال افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کے مشاغل انہیں اپنے فن پر زیادہ وقت صرف کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "آرٹ (فن) غایت درجہ کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات موجودہ حالات میں میرے لئے ممکن نہیں' جرمنی کے دو بڑے شاعر بیرسٹر تھے یعنی گوئٹے اور او ہلنڈ۔ گوئٹے تھوڑے دنوں پریکٹس کے بعد ویمر کی ریاست کا تعلیمی مشیر بن گیا اور اس طرح فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کا اسے پورا موقع مل گیا۔ او ہلنڈ تمام عمر مقدمات پر بحث کرتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت تھوڑی نظمیں لکھ سکا اور وہ کمال پورے طور پر نشو و نما نہ پا سکا' جو اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔"

"اسلام میں مذہبی افکار کی تشکیل جدید" پر اقبال کی جو تقریریں ہیں' اس میں گوئٹے کا تین بار حوالہ دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے گوئٹے کی اسلام پسندی کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کا خاص مقصد انسان کے دل میں ان گوناگوں رشتوں کا بلند تر احساس پیدا کرنا ہے جو خالق اور کائنات کے درمیان قائم ہے۔ قرآنی تعلیمات کے اس اہم پہلو کے پیش نظر گوئٹے نے اسلام کا بحیثیت ایک تعلیمی قوت کے مطالعہ کرنے کے دوران میں ایکرمان سے کہا "دیکھئے ایسی تعلیم کبھی بے اثر نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنے نظام کے ماتحت اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہم کیا کوئی بھی اس کے آگے نہیں جا سکتا۔"

"تشکیل جدید" میں اقبال ذات خداوندی سے بحث کرتے ہوئے گوئٹے کا قول نقل کرتے ہیں۔ اقبال کا بیان ہے کہ "وجود خداوندی" خود اپنی ذات کے مختلف جلووں کی مسلسل نقاب کشائی میں مشغول ہے نہ کہ کسی نصب العین کی تلاش میں۔ انسان کی خلش ناتمام سے مراد ہے جستجو اور اس جستجو میں ناکامی کا بھی امکان ہے۔ جستجوئے خداوندی کا مقصد ہے' وجود خداوندی کے غیر محدود تخلیقی امکانات کا لازوال حصول' جو سارے عمل کے دوران میں اپنی "کلیت" کو باقی رکھتا ہے۔

آخر میں مختلف قرآنی قصص کی معنویت و اہمیت پر بحث کے دوران میں وہ "فوسٹ" کو قصے کے انداز بیان کی مثال پیش کرتے ہیں۔ اقبال کے خیال میں تاریخی قصص کے بیان سے قرآن کا "کوئی تاریخی مقصد نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آفاقی اہمیت کا کوئی اخلاقی یا فلسفیانہ نکتہ پیش کیا جائے۔ اس مقصد کو یوں حاصل کیا گیا ہے کہ قرآن میں کردار

اور مقامات کے نام جو کسی مخصوص تاریخی واقعہ کا رنگ پیدا کر کے معنی کو محدود کر دیں، حذف کر دیئے گئے ہیں اور ان تفصیلات سے جن کا تعلق دوسرے خیالات سے ہے، گریز کیا گیا ہے۔ قصص کو بیان کرنے کا یہ طریقہ عام ہے۔ غیر مذہبی ادب میں یہ طریقہ عمومیت سے پایا جاتا ہے۔ اس کی مثال "فوسٹ" کا قصہ ہے جسے گوئٹے کی فطانت نے بالکل نئے معنی بخش دیئے ہیں۔"

اب "پیام مشرق" کے انتساب کے متعلق کچھ عرض کرنا باقی ہے۔ یہ نذرانہ عقیدت اس پایہ کا ہے جس سے بڑھ کر کسی بڑے آدمی نے کسی اور بڑے آدمی کو نہیں پیش کیا:

پیر مغرب شاعر المانوی

آں قتیل شیوہ ہائے پہلوی

بست نقش شاہدان شوخ و شنگ

داد مشرق را سلامے از فرنگ

در جوابش گفتہ ام پیغام شرق

ماہ تابے ریختم بر شام شرق

تا شناسائے خودم، خود بیں نیم

با تو گویم او کہ بود و من کیم

او ز افرنگی جواناں مثل برق

شعلہ من از دم پیران شرق

او چمن زادے چمن پروردۂ

من دمیدم از زمین مردۂ

او چو بلبل در چمن "فردوس گوش"

من بصحرا چوں جرس گرم خروش

ہر دو دانائے ضمیر کائنات

ہر دو پیغام حیات اندر ممات

ہر دو خنجر صبح خند آئینہ فام

او برہنہ من ہنوز اندر نیام

ہر دو گوہر ارجمند و تاب دار
زادۂ دریائے ناپیدا کنار
او ز شوخی در تہ قلزم تپید
تا گریبان صدف را بر درید
من بہ آغوش صدف تابم ہنوز
در ضمیر بحر نایابم ہنوز

(مطبوعہ در : مجلّہ "شعور" (کراچی)، شمارہ ساتواں (1959ء)- نیز : علامہ اقبال (ممتاز حسن کی نظر میں) مرتبہ ڈاکٹر محمد معز الدین، لاہور 1981ء، ص 68-73- مقالات ممتاز (ڈاکٹر ممتاز حسن) مرتبہ شان الحق حقی، کراچی : ادارہ یادگار غالب، 1995ء، ص 437-442)

سید نذیر نیازی

اقبال اور گوئٹے

(سخنے چند)

میں گوئٹے (1) کا ذکر نہیں کروں گا' نہ کرنا چاہئے' اس لئے کہ اقبال کو مغرب میں کوئی ہم نوا ملا تو گوئٹے۔ گوئٹے سے اقبال کو ایک طبعی مناسبت تھی۔ گو یہ مناسبت بجائے خود ایک جداگانہ موضوع ہے اور میرے نزدیک بڑا تفصیل طلب۔ پھر بھی دو باتیں ہیں جن کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ ارض ہند و پاک میں مسلمان' گوئٹے سے آشنا ہوئے تو اقبال کی بدولت۔ وہ ابھی یورپ نہیں گئے تھے کہ انہوں نے مرزا غالب کے مزار کی شکستہ حالی اور ویرانی کو دیکھتے ہوئے بہ افسوس کہا:

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر(2) میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے(3)

یہاں جو بات قابل غور ہے وہ اجڑی ہوئی دلی اور گلشن ویمر کا تقابل ہے جس سے ایک کی بے قدری اور دوسرے کی قدردانی کا اظہار ہوتا ہے' اور جس کا تکرار آگے چل کر "پیام مشرق" میں پھر ہوا۔ گو اب ان کا اشارہ غالب کی بجائے اپنی ذات کی طرف تھا:

پیر مغرب شاعر المانوی(4)
آں قتیل شیوہ ہائے پہلوی
بست نقش شاہدان شوخ و شنگ

داد مشرق را سلامے از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغام شرق
ماہ تابے ریختم بر شام شرق
او چمن زادے چمن پروردۂ
من دمیدم از زمین مردۂ
او ز افرنگی جوانان مثل برق
شعلہ من از دم پیران شرق
ہر دو خنجر صبح خند آئینہ فام
او برہنہ من ہنوز اندر نیام(5)

ان اشعار سے ہمارا ذہن اس دوسری بات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ جس طرح غالب کے افکار کا مطالعہ ابھی تک گوئٹے کے افکار کی رعایت سے نہیں ہوا' بعینہٖ اقبال اور گوئٹے کو باہم جو مناسبت ہے' اس پر بھی کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ ذرا ان الفاظ پر غور فرمایئے :

ہر دو خنجر صبح خند آئینہ فام
او برہنہ' من ہنوز اندر نیام

یہاں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ان دو گراں قدر اہل فکر' بلکہ یوں کہئے' رازداران حیات نے انسان کے مرتبہ و مقام کا جو تصور کیا اور پھر زندگی کی گہرائیوں میں اتر کر اسے جس طرح حیات فرد اور جماعت حتیٰ کہ تہذیب و تمدن کی دنیا میں پھیلاتے ہوئے انسانیت کبریٰ کا خواب دیکھا' اس کا پہلو بہ پہلو مطالعہ بڑا معنی خیز ہے۔ گوئٹے کے ہم وطن تو اسے بڑی حد تک اجاگر کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں' لیکن جہاں تک اقبال کا تعلق ہے اس باب میں صرف ایک نہیں کئی پہلوؤں سے تعبیر و ترجمانی کا کام ابھی باقی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہیں کہ فکر اقبال کی تیغ جوہردار ہنوز "اندر نیام" ہے۔ پھر ایک اور غور طلب بات یہ ہے کہ ہم نے اپنا رشتہ مغربی تہذیب و تمدن سے جوڑا یا اس سے چند در چند اثرات قبول کئے تو انگریزوں کی غلامی اور محکومی کی بدولت۔ ہم انگریزوں کے زیر نگیں تھے' ہمارا نظام تعلیم انگریزی تھا' ہماری معاشرت بدلی' اس میں مغربی رنگ پیدا ہوا تو انگریزوں کی تقلید میں۔ ہم نے فکر حاضر

اور جدید علوم و فنون کی تحصیل کی تو انگریزی کی وساطت سے۔ تاریخ اور تہذیب و تمدن کے بارے میں کوئی نقطہ نظر قبول کیا تو وہی جس کی تلقین انگریزوں نے کی۔ ہم نے انگریزی پڑھی، انگریزی ادب سیکھا، انگریزی ادب سے ہمارے ادب نے نہایت گہرا اثر قبول کیا۔ نظم و نثر بدل گئی، نئے نئے اسلوب قائم ہوئے، الفاظ کی درآمد شروع ہو گئی اور یہ انگریزی الفاظ ہمارے دل و دماغ پر چھا گئے اور ہماری زبان کا ایک حصہ بن گئے۔ اس لئے ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ہند و پاک کے مسلمانوں پر اگر کسی مغربی شاعر کا اثر ہوتا تو سب سے زیادہ انگریز شاعروں، بالخصوص شیکسپیئر(6) کا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ یوں پڑھنے کو شیکسپیئر کس نے نہیں پڑھا؟ ہم شیکسپیئر کے قائل ہیں اور ہم سے کہیں بڑھ کر خود اقبال۔ شیکسپیئر کی عظمت فن، لازوال اور عدیم المثال شاعری کے اعتراف میں اقبال نے جو نظم لکھی ہے اس سے بڑھ کر شیکسپیئر کی تعریف میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس نظم کے آخری شعر پر غور فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے:

حفظ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں کر نہ سکے گی کوئی پیدا ایسا(7)

اس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی کو رازداران فطرت کی ضرورت ہے، مگر ان سے کہیں بڑھ کر اس کے صورت گروں کی مثلاً گوئٹے اور اقبال کی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اگرچہ شیکسپیئر کو ہم سب نے پڑھا ہے۔ ہمارے دل میں اس کی بڑی قدر ہے۔ برعکس اس کے گوئٹے کا شاذ ہی اس طرح مطالعہ کیا گیا جیسے شیکسپیئر کا۔ بایں ہمہ شیکسپیئر ہمارا غیر ہے، ہم میں سے نہیں ہے۔ گوئٹے ہم میں سے ہے اور محض اقبال کی بدولت۔ اس ذرا سی بات کا لحاظ رکھ لیا جائے تو اقبال نے جس مثالی انسان کا تصور پیش کیا، مغرب میں اس کی تھوڑی بہت جھلک ملے گی تو گوئٹے ہی کے افکار مثلاً "فاؤسٹ" میں۔

"فاؤسٹ" کا اردو ترجمہ 1930ء - 1931ء میں انجمن ترقی اردو کے ایما سے جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی میں راقم الحروف کے رفیق شفیق ڈاکٹر سید عابد حسین(8) نے براہ راست جرمن سے کیا۔ یہ ترجمہ نثر میں تھا اور صرف حصہ اول تک محدود۔ میں شاید اس کا ذکر اقبال سے کر چکا تھا یا شاید یہ ترجمہ بابائے اردو کی طرف سے ان کی خدمت میں پہنچ گیا تھا۔ واقعہ کچھ بھی ہو، 14 اگست 1931ء(9) کے ایک عنایت نامے میں انہوں نے مجھ سے

استفسار فرمایا۔ "عابد صاحب سے یہ بھی پوچھئے کہ "فاؤسٹ" میں Prolegomena in Heaven کا کیا ترجمہ انہوں نے کیا ہے"۔ اس استفسار کی ضرورت غالباً "جاوید نامہ" کے سلسلے میں پیش آئی' جو ان دنوں زیر ترتیب تھا۔ "جاوید نامہ" میں بھی تمہید آسمانی کے عنوان سے' جو ایک طرح سے اس جرمن عنوان کا فارسی ترجمہ ہے (10)' ایک قطعہ موجود ہے۔ اس کے کچھ دنوں بعد جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور باتوں باتوں میں "فاؤسٹ" کا ذکر آیا تو فرمایا: "عابد صاحب اس کے دوسرے حصے کا ترجمہ کیوں نہیں کرتے' ان کا ارادہ ہو تو میرے پاس چلے آئیں' میں ان کا ہاتھ بٹاؤں گا۔"(11)

پھر ارشاد ہوا: "دوسرا حصہ مشکل ہے۔ اس میں نجوم اور کیمیاگری کی متعدد اصطلاحات ہیں۔ ایسے ہی کچھ اشارات اور تلمیحات' جن سے اہل مغرب تو بہت کم مانوس ہیں لیکن جن کو ہم اہل مشرق بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔" فرمایا: "قیام جرمنی میں مجھے بارہا موقع ملا کہ اس قسم کی اصطلاحات' اشارات اور تلمیحات کی تشریح کروں۔ میرے جرمن مخاطبین جب میری تشریحات سنتے' تو انہیں بڑا تعجب ہوتا۔ گوئٹے کی نظر بہت وسیع تھی۔ اس کا قول تھا کہ جس کسی نے دنیا کی کم از کم ایک ہزار برس کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا' اسے کون شائستہ اور مہذب کہے گا۔ اب یہ تو ممکن نہیں تھا کہ عام طور پر پڑھے لکھے جرمن ان سب اصطلاحوں اور تلمیحوں سے باخبر ہوتے جو گوئٹے نے مشرقی ادب سے اخذ کیں۔ ہمارے ہاں تو یہ اصطلاحیں اور تلمیحیں روزمرہ کی چیز ہیں۔ مجھے "فاؤسٹ" کے ان حصوں کے سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ جرمنوں کو البتہ بڑا تعجب ہوتا کہ میں ان مقامات کی شرح جو انہیں ازحد مشکل نظر آتے' کس آسانی سے کر رہا ہوں۔"

حواشی

1- گوئٹے (28 اگست 1749ء - 22 مارچ 1832ء) دیکھئے مضمون "اقبال کا مطالعہ" کا حاشیہ نمبر 1۔

ناول نویس اور ڈرامہ نگار جس نے مشرقی ادب کو المانوی ادب میں جگہ دی۔

2- "میں نے کہا ہے اقبال ابھی یورپ نہیں گئے تھے لہٰذا گوئٹے کا مطالعہ انہوں نے انگریزی کی وساطت سے کیا ہو گا۔ جرمن زبان سے ناواقفیت کے باعث انہوں نے وائمر (Weimar) کو ویمر لکھا۔ یہ شاید ضرورت شعری

کا تقاضا بھی تھا مگر آگے چل کر جرمن سے واقفیت کے باوجود انہوں نے نظم و نثر میں ہمیشہ ویسر ہی لکھا تا آنکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں وائسر نے اقبال کی بدولت ویسر کی شکل اختیار کی" (مصنف)

3- "بانگ درا" ص 26-

4- گوئٹے مراد ہے۔

5- "کلیات اقبال فارسی" ص 186-

6- شیکسپیئر (1564ء - 1616ء) معروف انگریز شاعر اور ڈراما نگار۔

7- "بانگ درا" ص 251

8- ڈاکٹر سید عابد حسین (1896ء - 1979ء) ایک مستند ادیب' ڈراما نگار اور نقاد' گوئٹے کے ڈرامے "فاؤسٹ" کے مترجم

9- یہ خط 14 اگست 1930ء کو لکھا گیا۔

10- "لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اقبال نے تمہید آسمانی لکھی تو Prolegomena in Heaven کے زیر اثر" (مصنف)

11- "دوسرے حصے کا ترجمہ شاید ابھی تک نہیں ہوا۔ باتھ بنانے کا معاملہ ایک حد تک اگلی سطروں میں واضح ہو جائے گا" (مصنف)

(اقبالیات نذیر نیازی مرتبہ عبداللہ شاہ ہاشمی' لاہور : اقبال اکادمی پاکستان' 1996ء' ص 179-182' 190-191)

عبدالمالک آروی

اقبال اور گوئٹے

گوئٹے (۱) اپنی نسلی خصوصیت اور مخصوص چلن کے لحاظ سے ممتاز طور پر جرمن تھا۔ اسی طرح جس طرح والٹیر فرانسیسی اور سقراط یونانی تھا۔ جرمنی کے مشہور شہر فرینکفرٹ میں پیدا ہوا۔ سیاسی اور تاریخی طور پر اس شہر کو جرمنی سے وہی علاقہ ہے' جو لندن کو انگلستان اور اڈنبرا کو اسکاٹ لینڈ سے۔ گوئٹے کے ماں باپ دونوں عوامی سطح سے بلند تھے۔ دنیا میں ذہنی لحاظ سے جو اکابر ہوئے ہیں' وہ عموماً (گرچہ ہمیشہ نہیں) معقول اور اچھی حالت میں رہنے والے والدین کی پیداوار ہیں۔ گوئٹے نے مارقوس انطونیس کی طرح اپنی ڈائری میں بہت شکریہ کے ساتھ ان مواہب اور اوصاف کو قلمبند کیا ہے' جو اس کو اپنے والدین سے ورثہ میں ملے۔ باپ سے اس نے عقل کی مردانہ وار متانت اور تمام چیزوں میں نظم و ترتیب کی شدید محبت حاصل کی۔ ان سے اس نے زیادہ قیمتی اوصاف حاصل کئے۔ روح کی تازگی' خوش مزاجی' لطف کی صلاحیت' فکر و خیال کی صفائی' زبان کی روانی' خدا پر توکل' ماضی کی پریشانیوں اور مستقبل کی تشویش سے دائمی پرہیز اور حال کے مشغلہ پر ہمت ورانہ گرفت۔

گوئٹے کو ماں باپ کے ظل عاطفت ہی میں لاطینی اور یونانی زبانوں کی روایاتی تعلیم ملی۔ شروع ہی میں وہ فرانسیسی' انگریزی اور بالخصوص اطالوی زبانوں سے واقف ہو گیا۔ اس کے باپ کو اطالوی زبان سے خاص لگاؤ تھا۔ اس کے بعد بیٹا بھی اس کو مخصوص طور پر ترجیح دینے لگا' گوئٹے نے اطالوی زبان کی تحصیل محض اس کی ادبیات کے لئے نہیں کی تھی' بلکہ قدیم و

جدید آرٹ کے کاموں کے سلسلہ میں' اطالیہ ان کاموں کا مخزن اور گہوارہ رہا ہے۔ ان زبانوں کی ابتدائی تعلیم ہی نے گوئٹے کی ذہنی نشو و نما میں بڑی مدد پہونچائی۔

سترہ برس کی عمر میں گوئٹے کو لیپزگ یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ اس کے باپ نے اس کے لئے اس پیشہ کا انتخاب کیا تھا۔ اس نے خود ہی اپنی ذہانت کی رہبری میں اسے پسند نہیں کیا تھا۔ لیپزگ میں بہ حیثیت ایک شاعر' ایک ادیب' ایک فلسفی' ایک سائنس دان اور ایک فن کار کے اس کا مقدر کافی طور پر نمایاں ہونے لگا۔

گوئٹے کی افتاد طبع گہرے طور پر بھری پُری اور انسانی ہمدردی کے ہر ایک سروکار سے نازک طور پر پوری طرح اثر پذیر تھی۔ اس پر اجتماعی کششوں اور ذاتی دلربائیوں نے اکادمی کے خطبات اور تنقیدی تقریروں کی بہ نسبت زیادہ زور دار عمل کیا' قانون کے تصور مجرد کی افسردگی اور بیگانہ احساس پابندی کے علاوہ فلسفہ' عمومی تاریخ' علم التشریح' آرٹ جو کچھ مزہ لینے اور حاصل کرنے کا موقعہ ملا' یا خواہش نے دعوت دی' اس کو گوئٹے نے سیکھا اور حاصل کیا۔

گوئٹے کی تعمیر سیرت میں اس کی طبیعت کی فوری اور مستعد اثر پذیری کو بڑا دخل ہے۔ اس کی طبیعت کا اوٹھان تھا کہ وہ ہر شخص سے کچھ سیکھتا اور ہر شے سے ربط پیدا کرتا۔ وہ خود کہتا ہے کہ "حال" کا اس پر بہت قوی اثر ہوا کرتا۔ گوئٹے کی زندگی میں نہ کام کی دشواری نظر آتی ہے اور نہ جینے کے لئے کسی قابل لحاظ نزاع کی ضرورت۔ اس کی زندگی حاسدوں کی چشم بد سے محفوظ تھی۔ دوستی' عشق' داخلی احساس اور اچھے مشاغل' ہر اعتبار سے اس کی زندگی کامیاب ہوئی۔

یہاں تک تو بچپن کے ماحول' طبیعت کی افتاد' اخلاقی تربیت' اکادمیائی تعلیم' اعلیٰ تحصیل علم اور پیشہ کے انتخاب کے لحاظ سے گوئٹے اور اقبال میں ایک خاص مماثلت پائی جاتی ہے' لیکن جو چیز گوئٹے کو اقبال سے بہت زیادہ متمایز بنا دیتی ہے' وہ اس کا جمالیاتی ذوق اور نسائیات کے باب میں اس کی اخلاقی کمزوری ہے۔ دونوں شاعروں میں اس مقام پر پہونچ کر ایک غیر معمولی فرق پایا جاتا ہے۔ اقبال کی ساری زندگی میں اس نوع کا کوئی اشارہ بھی ہمیں نہیں ملتا' حالانکہ اپنی حساس فطرت کے لحاظ سے اقبال گوئٹے سے کسی طرح کم نہ تھے۔ پھر بھی نسائیات اور نسائی جمال و دل ربائی کے لحاظ سے وہ بالکل "رواقی" معلوم ہوتے ہیں۔ ان

کے یہاں ہمیں اس باب میں افلاطونی عشق کا بھی پتہ نہیں ملتا' حالانکہ دانتے' گوئٹے' شیلے' کیٹس سبھی نسائیات کے جمالیاتی اثر سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ گوئٹے کا ذوق نسائیات ہمیں عربی زبان کے مشہور عشقیہ شاعر ابن ربیعہ اور اردو کے بہت دل جلے اور عاشق مزاج استاد سخن مومن خاں کی یاد دلاتا ہے۔

گوئٹے کی داستان محبت بڑی لمبی اور دلچسپ ہے۔ سب سے پہلے اس کو لیپزگ میں ایک زمیندار کی لڑکی اناکیتھرینا سے محبت ہوئی' لیکن یہ عنفوان شباب کا ایک ناقابل لحاظ معاملہ تھا اور دونوں طرف سے ہنسی خوشی اور معصومانہ طور پر گیا گذرا۔ گوئٹے کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ شادی کا خواب دیکھ سکتا' محبوبہ بھی اس کے لئے انتظار کھینچنے کی زحمت گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ بلیکی نے گوئٹے کی داستان محبت شروع کرنے سے قبل نہایت ہی بلیغ انداز میں لکھا ہے "ایک شاعر کے لئے ایک حسین عورت بہت ناقابل رد دلکشی پیش کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کچھ تو جیسا کہ عام لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے' اس وجہ سے کہ وہ ایک مرد ہے اور وہ ایک عورت' ان میں ایک صریحاً دوسرے سے ممتاز بھی اور دوسرے کا تکملہ بھی' ایک حد تک یہ بھی وجہ ہے' اور زیادہ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک شاعر ہے جس میں دونوں باتیں ہیں۔ وہ دیکھتا بھی ہے تیزی سے اور محسوس بھی کرتا ہے' گہرے طور پر اور ادراکی مخلوقات کی دنیا میں وہ واضح طور پر خدا کے جمیل ترین صنعت پارہ کے حسن کی تصویر کشی کرتا ہے۔" اس لئے کسی آدمی کو برا نہ ماننا چاہئے۔ اگر میں صاف صاف کہوں کہ گوئٹے ہمیشہ عشق میں مبتلا ہوا کرتا تھا اور یہ کہ میں اس بات کو اس کے چلن میں ایک عظیم الشان وصف سمجھتا ہوں' اگر وہ ایسا کرتا تو وہ نصف آدمی بن سکتا اور نہ اس شاعر کا دسواں حصہ' جو وہ تھا۔"

اس کے بعد بلیکی نے گوئٹے کی داستان محبت شروع کی ہے۔ گوئٹے کا اولین مشہور عالم عشقیہ معاملہ فریڈریکا کے ساتھ تھا' جو اسٹراس برگ کے قرب میں ایک پہاڑی گاؤں سیسیم کے ایک پادری کی لڑکی تھی۔ یہ اقرار کر لینا مناسب ہے کہ عشق و محبت کے اس معاملہ میں گوئٹے کا دامن جو اس وقت اسٹراس برگ میں طالب علم تھا اور قانون کی سند کے لئے تیاری کر رہا تھا' بدنامی کے داغ سے پاک نہیں۔ ہر انگریز نے بلا کافی تحقیقات کے لیکن پھر بھی فیصلہ کن انداز سے ذہن نشین کر لیا ہے کہ گوئٹے نے اس دلکش نوجوان خاتون کے ساتھ

بہت ہی شرمناک طریقہ سے بے وفائی کی' اس کو چاہئے تھا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کر لیتا اور یہ کہ ایک لائق مخلوق کو غیر شریفانہ انداز سے چھوڑ کر اچھا ہوا کہ اس جنس کے ایک کمتر درجہ کے نمونہ سے اس کو واسطہ پڑا جس کے ساتھ ازدواجی مشقتوں میں وہ آگے چل کر گرفتار ہوا۔ میں ایک حد تک اس الزام کو مانتا ہوں' لیکن پوری طرح نہیں۔ اس سنگین الزام پر ایک غیر ہیجانی فیصلہ صادر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے (چونکہ دوسرے الزامات چنداں اہمیت نہیں رکھتے) ہم لوگوں کو یہ ذہن میں رکھ لینا چاہئے کہ اس لگاوٹ کے وقت شاعر ایک نوجوان تھا' محض ایک طالب علم' جیسا کہ کہا جاتا ہے آکسفورڈ میں ابھی اس نے بی۔ اے بھی نہیں کیا تھا۔ ابھی نہ تو اس کا پیشہ متعین ہوا تھا نہ اس کی حیثیت۔ اس خامکاری کی حالت میں وہ پادری کی لڑکی پر عاشق ہو گیا' جیسا کہ اس وقت ایک گوئٹے اور ایک پرنس ہی عاشق ہو سکتا تھا اور پادری کی لڑکی اس کی محبت میں گرفتار ہوئی۔ یہ محبت بوسہ بازی کی حد اور تین ماہ کے محبت آمیز نامہ و پیام کی مدت تک امتداد پذیر ہوئی جس کے بعد عام طور پر جیسا کہ ہوتا ہے' ایسے معاملات کی قدرتی ترقی کے ساتھ شادی کا انجام پانا ضروری تھا اور ایسا کیوں نہ ہوا؟ محض اس وجہ سے کہ گوئٹے اس وقت لڑکا تھا۔ پختہ کار انسان نہ تھا۔ اس کو توقع نہ تھی کہ وہ اپنے والدین کو اس تعلق کے لئے رضامند کر سکے گا یا وہ اپنے تئیں اس رضامندی سے آزاد بھی نہیں کر سکتا تھا' جب تک کہ ذریعہ معاش کے لئے وہ خود کو روح و جسم کے ساتھ قانونی پیشہ میں نہ لگا دیتا' جس کو اس نے ذہنی خودکشی کا فعل سمجھا ہو گا اور اس نے پوشیدہ طور پر اس کو نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہو گا۔ ہمیں ذہن میں یہ بھی رکھ لینا چاہئے کہ گوئٹے گو چند سال کا لڑکا تھا' لیکن ذہن کے لحاظ سے وہ پختہ کار انسان تھا۔ اس کی تعمیر میں انتہائی حسیت کے ساتھ ٹھنڈے دل سے مطالعہ کرنے کی غیر معمولی قوت ممزوج تھی اور گو وہ کتنا ہی شدید طریقہ سے تشنہ محبت ہو' وہ ہیجان کا ایسا بندہ نہ تھا کہ یہ نہ سمجھ سکتا کہ جلدی بازی کی اور بلا اچھی طرح سوچی سمجھی ہوئی نوجوانوں کی شادیاں' جو ابھی دنیا میں کوئی جماؤ بھی نہیں رکھتے' اکثر ساری زندگی کی مصیبتوں کی تخلیق کا سبب ہوئی ہیں' جس کے مقابلہ میں اس سے باز آ جانے کی تکلیف وزن میں بہت کم ہے۔

گوئٹے کی محبت کی دوسری داستانیں مثلاً شارلاٹ کے ساتھ جو "ورتھر" کی بہت ہی مشہور ہیروئن ہے' لی لی' وان سٹین اور کرسچینا ولپس کے ساتھ جو آخر میں اس کی جائز بیوی

بن گئی' بہت مشہور ہیں۔ شارلاٹ کے ساتھ اس کا عشق ایک ایسا معاملہ ہے' جس کی وجہ سے اس پر الزام کا ایک پرتو بھی نہیں پڑتا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد جب نوجوان شاعر فرینکفرٹ سے ویتسلر میں آیا تاکہ شاہی ایوان عدالت میں وکالت کر سکے' طبعی خوش ادائی' زندہ دلی اور گھریلو حسن سیرت کے مجموعی ربط نے جس کا شارلاٹ صوفیہ ہنرٹیابف کی سیرت میں ظہور ہوا' جو ہنری آدم بف کی نیلگوں چشم' سنہری زلف والی لڑکی تھی' شاعر کے خیال پر دل ربایانہ اثر ڈالا' لیکن اس حسینہ کے ساتھ آغاز محبت کے لطیف وجدان نے حساس شاعر کے اعصاب میں تحریک ہی پیدا کی تھی کہ اس کو پتہ چلا کہ وہ خاتون ایک دوسرے معزز آدمی سے منسوب ہے۔ اس انکشاف نے شادی کا خیال ہی ختم کر دیا' لیکن یہ جوش اس آسانی کے ساتھ ختم نہیں ہو سکتا تھا' شعلہ عشق میں مبتلا ہونے والے ایک انسان کے لئے ایسے حالات قطع تعلق کا سبب بن جاتے ہیں یا بعض دردناک اور بہت ہی خراب حادثہ کا' لیکن جرمن طبیعت بہت مہربان' محتاط اور مدہم ہوتی ہے' اس لئے ساری باتیں پہلے کی طرح ہوتی رہیں۔ دلہا نے نہ کوئی رقابت دکھائی' نہ دلہن نے فہم سلیم میں کوئی کمی۔ "باد پیما" عاشق بھی اپنے اوپر قابو رکھے ہوا تھا اور ان احساسات کو سختی سے دبائے ہوئے تھا' جن کی پرورش کرنا ذلت انگیز بات تھی' لیکن گوئٹے رواقی نہ تھا' اس لئے اس نے آخر میں مناسب سمجھا کہ اس فضا ہی کو تیاگ دے اور ناقابل دفع درد و اذیت کو ایک کیفیت آفریں ناول میں پیش کرے۔ اس کے بعد گوئٹے کو لی لی سے لگاؤ ہو گیا' شاعر کے عشقیہ تصانیف میں اس کا یہی نام ہے۔ یہ محبت بہ حیثیت مجموعی مختلف قسم کی تھی اور گو اس میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کو قلیل ترین درجہ میں بھی ذلت انگیز کہا جائے لیکن اس واقعہ سے شاعر کی سرشت پر لاابالی پن اور بے اعتمادی کا داغ پڑ جاتا ہے جس کے لئے وہ معافی کی یا کم از کم عورتوں سے توقع نہیں کر سکتا۔ این ایلزبتھ شونمان جس کے ساتھ فریڈریکا کی طرح شادی کی منزل تک پہونچانے والا تعلق پیدا ہو چکا تھا' فرینکفرٹ کے ایک دولتمند ساہوکار کی لڑکی تھی۔ لڑکی بڑی حسین' شائستہ اور اپنے انداز کے لحاظ سے بڑی موہنی تھی۔ گوئٹے کے خاندان سے اس کا خاندان کچھ اونچا بھی تھا۔ دونوں میں کچھ باہمی محبت ہوئی لیکن دونوں کے والدین اس اتحاد کے مخالف ہو گئے۔ بلیکی نے محبت کے اس اختتام کی بہت سی توجیہیں کی ہیں' اس میں اہم ترین گوئٹے کا سفر ویمر اور دس سالہ درباری زندگی تھی۔ یہاں گوئٹے کا احساس محبت جس

کے بغیر ہمارا شاعر زندہ نہیں رہ سکتا تھا' شارلاٹ وان سٹین کی موہنی صورت' شائستہ اور دل پذیر اداؤں سے ایک بار پھر ابھرنے لگا۔ یہ گرانڈ ڈیوک کے ایک درباری کی بیوی تھی۔ آج تک گوئٹے کی محبت کا مرکز سولہ یا سترہ سالہ لڑکیاں رہا کی ہیں' لیکن شارلاٹ وان اسٹین عمر کے لحاظ سے اس سے چھ سال بڑی تھی۔ وہ اعلیٰ حیثیت کی خاتون تھی۔ حسین' مہربان' عاقلہ' شائستہ' نسوانی' جس کو جرمنی کے ترقی پذیر ادب سے مناسبت تھی' ایک وفادار بیوی' ایک اچھی ماں' ایک مستقل دوست اور ہر صورت سے دلکش تھی۔ گوئٹے پر اس نے بڑا اثر ڈالا۔ گوئٹے اس وقت لی لی کے ساتھ اختلال پذیر ربط کے سوگ میں تھا۔ اس نے اس کو ایک روحانی آسودگی بخشی۔ ویمر کے سرکاری انتظامی امور اس کو فرینکفرٹ کی مختصر قانونی مشغولیت سے کمتر درجہ میں ناپسندیدہ معلوم ہوئے۔ یہاں شارلاٹ کی صحبت میں اس کی خستگی کم ہو جاتی اور اس کے الم ناک لمحات تسلیوں سے خوشگوار بن جاتے۔ گوئٹے کی عمر اس وقت چالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ وہ ویمر کے انتظامی امور سے دبا ہوا تھا' لیکن شارلاٹ کی موجودگی اور اس کے دلربایانہ انداز و ادا سے وہ مسرور تھا۔ شادی کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔ اس اثنا میں اس نے دو برس کے لئے رومہ کا سفر کیا۔ وہاں فطرت اور آرٹ کے ساتھ اس کے عشرت پسند رابطہ نے اس کے ذہن و قلب پر غیر معمولی اثر کیا۔ اب اس میں زیادہ وسعت اور زیادہ قوت پیدا ہو چکی تھی۔ اس وقت ایک تنہا عورت' خواہ شارلاٹ وان اسٹین جیسی شائستہ خصال سہی' اس پر شاہانہ اقتدار حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب دوبارہ وہ ملے' تو ان میں وہ جوش اور امنگ نہ تھی' جو وداع کے وقت پائی جاتی تھی۔ پہلے ان کے روابط سست پڑے اور اس کے بعد کھلم کھلا بے اطمینانی کا اظہار ہونے لگا۔ گوئٹے کے پاس اس کا کوئی تشفی بخش جواب نہ تھا۔ اب گوئٹے افلاطونی عشق سے اکتا چکا تھا۔ وہ اسی گوشت پوست کی دنیا کی محبت اور ولولہ میں مبتلا ہو چکا تھا۔ وہ ایک دن ویمر کے پارک میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک چھوٹی سی خوبصورت حسینہ نظر آئی' جس کے پورے گول چہرہ' سرخ ہونٹ' شفاف چھوٹی ناک اور لمبی سنہری زلف نے گوئٹے کو بے حد متاثر کیا۔ یہ کرسچینا ولپیس تھی۔ اس ناگہانی ملاقات نے ازدواجی پیمان وفا کی صورت اختیار کر لی اور ویمر کا یہ وزیر اعظم اس غریب حسینہ کا باضابطہ شوہر بن چکا' اس کے لئے نہ کسی پادری کو رسم ادا کرنے کی ضرورت ہوئی اور نہ کسی اقرار نامہ پر دستخط کی۔ اطالیہ کے تازہ سفر نے اس کے خیالات میں نمایاں

تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ قدرتی طور پر اس کے بعد شارلاٹ وان اسٹین سے تعلق ختم ہو گیا گو اس میں برہمی کی کوئی وجہ نہ تھی' چونکہ اس سے محض افلاطونی عشق تھا اور وہ ایک بیاہی عورت تھی' لیکن یہ حادثہ ناگہانی اور زور کا جھٹکا بے رحمانہ تھا۔ جرمن قوم نے بھی شاعر کی اس حرکت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا' کیونکہ اس نے نہ صرف اپنے مرتبہ سے بہت ہی نیچے درجہ کی لڑکی سے ازدواجی تعلق پیدا کیا بلکہ اس نے اجتماعی رسوم و رواج سے بھی انحراف کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس شادی کے متعلق جرمنی یا انگلستان میں جو کچھ کہا جاتا ہے قابل اعتنا نہیں۔ نسائیات' حسن پرستی اور عشق مزاجی کے سلسلہ میں گوئٹے پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے سامنے سوقفلس' چاسر' شیکسپیئر اور بڑی بڑی ذہین ہستیوں کی نجی زندگی کے کارنامے موجود ہیں۔ یہ مرمریں پتھر پر نیلے داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

گوئٹے ایک بڑے ممتاز عہدہ پر فائز تھا۔ سرکاری ملازمت اور دربار کے بعد وہ وزیر اعظم ہوا۔ اس حیثیت سے وہ سیاسی ہونے سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ جرمن سیاسیات میں وہ ایک آزاد خیال انسان تھا' یہاں تک کہ پرجوش محبان وطن نے اس کو نپولین کی فطری قابلیت کے سامنے اظہار عقیدت کرنے پر سخت مورد عتاب بنایا اور کبھی معاف نہ کیا۔ انہوں نے اس کے انداز کو غلامانہ اور بزدلانہ سے تعبیر کیا' لیکن وہ یہ فراموش کر گئے کہ ایک شاعر' ایک فلسفی اور عالمگیر درد مند انسان کی حیثیت سے اپنے وسیع قلب میں سنگین دشمنی اور ناقابل مصالحت نفرت کی پرورش نہیں کر سکتا تھا' جو حب وطن کے سلسلہ میں تنگ نظروں میں بحرانی جوش کے زمانہ میں پائی جاتی ہے۔

گوئٹے نے اپنی ویمر کی سرکاری زندگی کے زمانہ میں ان تمام علوم سے دلچسپی لی' جو اس کے عوامی فریضہ کے شعبہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ معدنیات' طبقات الارض' نباتات اور علم تشریحات ہیں۔ ان تمام علوم میں اس نے ایک سطحی مشاہدہ اور ایک ہمدرد شاعر ہی کی حیثیت سے دلچسپی نہیں لی' بلکہ ان کی فنی' علمی اور اصطلاحی قدروں سے وہ آشنا ہوا' خاص کر علم نباتات اور عظمیات میں اس کی اہلیت اور عمق نظر کا' ان شعبوں کے فاضلوں نے اعتراف کیا۔

گوئٹے پیشہ وارانہ اصطلاح میں اثینیہ کے افلاطون' ہالینڈ کے اسپنوزا اور ہینوور (جرمنی) کے لیبنز کی طرح فلسفی نہ تھا لیکن جن لوگوں نے اس کی زندگی اور "فاسٹ" کا مطالعہ کیا

ہے انہوں نے سمجھا ہو گا کہ کلیات سے بحث کرنے اور مابعدالطبعی مشکلات کے درمیان اپنا راستہ نکالنے میں وہ فلسفی تھا۔ ہم اسکاٹ یا برنس یا بائرن سے اس کا موازنہ کریں' ہم دیکھیں گے کہ کس واضح طور پر اور بعض حیثیت سے اپنی شاعری کے لئے مضرت رساں طور سے وہ فلسفی تھا۔ جس طرح ایک شاعر فلسفی کی حیثیت سے افلاطون اپنے ملک کے جمالیاتی اور مابعدالطبیعاتی عناصر کی مخصوص نیابت کرتا ہے' اسی مخصوص انداز سے "فاسٹ" کا مصنف فلسفی شاعر کی حیثیت سے اپنی قوم کی خدمات انجام دیتا ہے۔

دینیات کو فلسفہ سے قریبی تعلق ہے۔ دوسرے گہرے انسانی معاملات کی طرح اس علم سے بھی گوئٹے نے ساری زندگی سرگرم دلچسپی لی۔ گوئٹے کے خمیر میں کسی سخت عقیدہ پرستی کو روکنے کے لئے کافی تشکک موجود تھا۔ دوسری طرف جیسا کہ انگلستان کے اندر بعض سائنس دانوں میں فیشن ہو گیا ہے کہ وہ خدا کا انکار کر بیٹھے ہیں۔ گوئٹے ایسا آزاد بھی نہ تھا۔ وہ خدا پر دنیا کے اخلاقی ماحول پر اور آخرت پر پورا یقین رکھتا تھا۔ وہ انجیل کو خدا کی وحی کی حیثیت سے تسلیم کرتا تھا' جس میں خدا نے خود کو پُرمعنی طور پر اخلاقی دنیا میں نمایاں کیا' جس طرح اس نے یونانی آرٹ میں جمالیاتی حیثیت سے اپنے کمالات کا الہام کیا تھا۔ وہ دینی عقیدہ پسندوں کی طرح خدا کا فطرت سے علیحدہ ہونا نہیں سن سکتا تھا' بلکہ کالرج اور جیمس حواری کی طرح اس کا عقیدہ تھا کہ سچا مذہب ہر اچھے اور حقیقتاً حسین چیز کے ساتھ عقیدت و نیابش رکھنا اور خود کو دنیا کے من مانے رسوم' غیر مفید فکر و آرا اور احمقانہ رواجوں سے بے داغ رکھتا ہے جو سب سے زیادہ محبت کرتا ہے' وہ سب سے زیادہ عبادت کرتا ہے اور خدا کی عبادت وہی سب سے زیادہ اچھی طرح کرتا ہے جو خدا کے مقصد کو اپنے ہی شعبہ عمل میں بڑھانے کا آرزومند ہو اور دوسرے اہل عمل کو ان کے کاموں میں تقویت پہنچائے' یقیناً عمل ہمیشہ محبت کے ساتھ' نفرت کے ساتھ نہیں' اس کا شاندار نصب العین' قاعدہ اور کلمہ امتیاز ہی تھا۔ انگریزوں نے اس بیجا حد تک وسیع اصطلاح میں اس پر خود غرضی کا جو عمومی الزام لگایا ہے' اس کی ہلکی سی بنیاد بھی ہمیں نظر نہیں آئی۔ وہ کبھی اقدامی کارروائی نہیں کرتا۔ وہ کبھی بغض کی پرورش نہیں کرتا۔ جہاں اس کی امداد مفید ہوتی' وہ ہمیشہ امداد دینے کے لئے مستعد رہتا۔ ہر واسطہ کے لحاظ سے وہ صرف ایک بڑا انسان اور نمایاں نظر نہیں آتا بلکہ اچھا' خوش باش' بھائیوں جیسا' مہربان' شفقت نواز' بشریت کا حامل اور پورے

طور سے پرلطف انسان تھا۔

گوئٹے کے فلسفہ' سیاسیات' مذہبیات اور سرشت کے متعلق جو کچھ بلیکی نے لکھا ہے' وہ بڑی حد تک اقبال پر بھی صادق آتا ہے۔ فلسفی کی حیثیت سے گوئٹے کوئی خاص نظام حیات پیش نہیں کرتا اور اسی لئے وہ افلاطون' اسپنوزا اور لیبنز کی طرح پیشہ ور فلسفی نہ تھا۔ اس کے برعکس اقبال کا فلسفیانہ مرتبہ بڑا تھا۔ انہوں نے فلسفہ خودی پیش کر کے اپنا مرتبہ بہت بلند کر دیا۔ فلسفہ خودی میں نطشے کے مافوق البشر کی ایک جھلک ملتی ہے' اس لئے اقبال کے اکثر نقادوں کو دھوکہ ہو گیا۔ سرعبدالقادر' پروفیسر شریف' ڈاکٹر سنہا بھی اس باب میں غلط نتیجہ پر پہونچے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اس نظریہ کے اسلامی ماخذوں پر نظر نہیں ڈالی۔ یہ قطعی طور پر فلسفہ اشراقی اور تصوف بالخصوص رومی اور حلاج کے تصور بشریت پر مبنی ہے۔

گوئٹے کے سیاسی رجحانات پر چونکہ اخلاق اور شاعری کا گہرا اثر تھا' اس لئے اقبال کی طرح وہ بھی اس باب میں ناکام رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کو سرکار برطانیہ میں نہ کوئی بڑا عہدہ مل سکا' نہ وہ قوم کے بڑے لیڈر بن سکے۔ دینیات کے لحاظ سے البتہ گوئٹے اور اقبال میں تھوڑا سا فرق ہے۔ گوئٹے مسیحیت کے کلیات کا قائل تھا' اقبال فروعی مسائل میں بھی اسلامی مسلک سے تجاوز کرنا نہیں چاہتے' ہاں والٹیر اور نطشے کی طرح انہوں نے مذہب نما عناصر کی دھجیاں اڑائی ہیں۔ وہ رسمی اسلام کی بیگانہ روح زندگی کے قائل نہ تھے' قانون دان کی حیثیت سے گوئٹے اور اقبال دونوں ناکام رہے۔ شاعری اور قانون دونوں میں غالباً بُعد المشرقین ہے' فرق صرف یہ ہے کہ اقبال شاعری کے سوا دوسرے کاموں میں بھی نہ جم سکے۔ اس کے برعکس گوئٹے سرکاری ملازمت یہاں تک کہ وزیر اعظم کی حیثیت سے بھی بہت کامیاب رہا۔ سائنس کی قابلیت نے اس کو زندگی کی اس دوڑ میں بھی تاریخی کامرانی بخشی۔ اس منصبی فوز و فلاح' ترقی اور عظمت میں اس کی اس طبعی پسندیدگی کو بھی بڑا دخل ہے جو چیزوں کے نظم و ترتیب کے باب میں اس کو اپنے باپ سے ورثہ میں ملی تھی۔ وہ بڑی دیانت' انہماک اور ولولہ سے اپنے منصبی فرائض انجام دیتا رہا۔ گو اس نے اس کے شاعرانہ حال پر ناخوشگوار اثر ڈالا' یہاں تک کہ وہ اکتا کر دو سال کے لئے رومہ چلا گیا اور فطرت اور آرٹ کے ساتھ دل بہلاتا رہا۔

زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے بھی گوئٹے اور اقبال میں ایک قریبی مماثلت پائی جاتی ہے۔ جرمنی' اسکاٹ لینڈ اور انگلستان کے بڑے بڑے شعرا' شیلرو برنس' ورڈزورتھ' والیٹر اسکاٹ' کالرج و ساؤتھی' بائرن و ٹینیسن اسی کے عہد میں پیدا ہوئے اور ابھی وہ زندہ ہی تھا کہ شیلر اور والیٹر اسکاٹ دنیا سے رخصت بھی ہو گئے۔ اقبال کا عہد بھی اس اعتبار سے بڑا ہی رنگین اور شاعرانہ تھا۔ اردو کے بڑے بڑے ممتاز شعرا' اصغر و فانی' حسرت و جگر' جوش و سیماب اسی عہد مسعود کی پیداوار ہیں۔ اقبال کے شاعرانہ پیغام نے اردو میں ایک خاص اسکول کی صورت اختیار کر لی ہے اور ان کے متبعین کا سلسلہ کشمیر' پنجاب' سندھ سے لے کر یو۔ پی' بہار اور بنگالہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اقبال کی شخصیت' اخلاق اور طرز تپاک کے متعلق ڈاکٹر سنہا نے جو کچھ لکھا ہے' اس کی جھلک گوئٹے کی زندگی میں بھی ہمیں نظر آتی ہے۔ بلیکی اور ڈاکٹر سنہا اپنے ہیرو کی شخصیت کی تمثیل کے لحاظ سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

قبل اس کے کہ گوئٹے کے "دیوان مغربی" اور اقبال کے "پیام مشرق" کا موازنہ کیا جائے' گوئٹے کی شاعری پر ایک مجمل تنقید ضروری ہے۔ میتھو آرنلڈ نے گوئٹے کو "موجودہ عہد کا سب سے بڑا شاعر اور زمانہ کا سب سے بڑا نقاد" بتایا ہے۔ بلیکی کہتا ہے کہ "یہ دونوں باتیں حقیقت سے بہت قریب ہیں' خاص کر دوسرا ٹکڑا"۔ ہیوارڈ کا فیصلہ ہے کہ گوئٹے نے سرزمین جرمنی کی ساری صورت ہی بدل دی' جرمنی ہی کی نہیں بلکہ اور ممالک کی بھی۔ میڈم ڈی اسٹیل کہتی ہیں کہ عظیم الشان شعرا میں اس کے صحیح مقام کی تعیین کا دعویٰ کئے بغیر ہم یہ اعلان کرنے میں حیص بیص نہیں کرتے کہ وہ تربیت یافتہ ذہن کا شاندار ترین نمونہ تھا' جس کا کبھی دنیا میں ظہور ہوا"۔ بلیکی کی تاریخی تعیین کے مطابق گوئٹے نے 1814-15ء میں اپنا "دیوان مغربی" لکھا۔ جرمنی اور یورپ کے دوسرے ممالک میں مشرقی تحریک کا آغاز اقبال کی رائے میں 1812ء میں ہوا تھا جبکہ وان ہیمر نے خواجہ حافظ کے دیوان کا پورا ترجمہ شائع کیا۔ گوئٹے نے بھی جرمن' انگریز' فرانسیسی اور دوسرے یورپی شعرا' علما اور مستشرقین کی طرح مشرقی شاعری بالخصوص فارسی سے دلچسپی لی' چنانچہ اپنے آپ کو ایک مقام پر عالم خیال میں ایک ایرانی شاعر تصور کرتے ہوئے جس کو جرمنی میں جلا وطن کر دیا گیا ہو' وہ لکھتا ہے "اے فردوسی! اے جامی! اے سعدی! تمہارا بھائی زندان غم میں اسیر

شیراز کے پھولوں کے لئے تڑپ رہا ہے"(2)- اقبال کے بیان کے مطابق گوئٹے خواجہ حافظ کے علاوہ اپنے تخیلات میں عطار' سعدی' فردوسی اور عام اسلامی لٹریچر کا بھی مرہون ہے۔

ڈاکٹر اقبال نے گوئٹے کے "مغربی دیوان" کا جواب لکھا۔ یہ کتاب 1923ء میں "پیام مشرق" کے نام سے چھپی۔ گوئٹے کے "مغربیوں" نے اقبال کی شاعری کا انداز بدل ڈالا۔ ابھی تک انہوں نے جو مختصر نظمیں کہی تھیں' وہ انگریز شعرا کے تتبع و تقلید کا نتیجہ تھیں۔ انہوں نے اس محاکات کے بعد ہندوستان اور امت اسلامیہ کے متعلق بعض تخلیقی نظمیں بھی لکھیں۔ انہوں نے مشرقی و مغربی علوم و فلسفہ سے متاثر ہو کر "اسرار خودی" لکھی' لیکن گوئٹے کے مطالعہ نے ان کی شاعری کا نہج ہی بدل ڈالا۔ "پیام مشرق" اور "ضرب کلیم" میں جو چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں اور ان میں انہوں نے زندگی و کائنات کے بے شمار مسائل پر جو مختصر مگر جامع تنقیدیں کی ہیں' وہ ہمیں بلیکی کی "گوئٹے کی دانائی" کی یاد دلاتی ہیں۔ اقبال گوئٹے کی طرح اپنے ان تصانیف میں شاعر سے زیادہ حکیم اور پیغام بر نظر آتے ہیں' وہی عمق' تجربہ اور وزن جو گوئٹے کی تنقیدوں میں ہے' ہمیں اقبال کے یہاں بھی نظر آتا ہے۔ میتھو آرنلڈ کے نظریہ کے مطابق جس طرح گوئٹے ہر عہد کا سب سے بڑا نقاد ہو سکتا ہے' اسی طرح اقبال کو بھی ہر زمانہ میں ایک عظیم الشان نقاد کی حیثیت سے دیکھا جائے گا۔

گوئٹے اور اقبال دونوں کے یہاں بہت سے مشترک موضوع ہیں' جن پر دونوں نے فلسفیانہ اور ناقدانہ انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ ذیل میں دونوں شعرا کی فکر و احساس کا موازنہ کیا جاتا ہے۔

زندگی

گوئٹے کہتا ہے "انسان کی اعلیٰ صفت جہاں تک ممکن ہو سکے' خارجی حالات پر حکمرانی کرنا اور جہاں تک کم ممکن ہو' اپنے کو ان کی محکومیت کے حوالہ کرنا ہے۔ زندگی ہمارے سامنے وہی حیثیت رکھتی ہے جس طرح ایک معمار کے سامنے ایک عظیم الشان معدن' وہ معمار کے نام کا اہل اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ وہ اس قدرتی اسباب کے ماتحت ہونے والے ذخیرہ سے بہت ہی کفایت شعاری' مناسبت اور پائداری کے ساتھ ایک ایسی شکل تیار کر لیتا ہے جس کا نمونہ اس کی روح ہی میں خلق ہو جاتا ہے۔ ساری چیزیں جو ہم سے خارج ہیں' نہیں بلکہ میں اضافہ کر سکتا ہوں' ساری چیزیں جو ہم میں داخل ہیں صرف عناصر

کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن ہماری فطرت کے انتہائی داخلی مقبرہ میں تخلیقی قوت موجود ہوتی ہے جو ان (منتخب مواد) سے وہ چیز پیدا کرتی ہے جو ان کو بننا ہے اور جو (تخلیقی قوت) ہمیں نہ سونے دیتی، نہ آرام لینے دیتی ہے، جب تک ایک یا دوسرے یعنی خارجی یا داخلی طور پر یہ تخلیق منظر شہود پر نہ آ جائے۔

اب دیکھئے اقبال کیا فرماتے ہیں:

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست؟
گفتامئے کہ تلخ تر اوتکوتر است
گفتم کہ کرمک است و زگل سربروں زند
گفتا کہ شعلہ زاد مثال سمندر است
گفتم کہ شر بہ فطرت خامش نہادہ اند
گفتا کہ خیرا و نہ شناسی ہمیں شر است
گفتم کہ شوق سیر نہ بردش بہ منزلے
گفتا کہ منزلش بہ ہمیں شوق مضمر است
گفتم کہ خاکی است و بہ خاکش ہمی دہند
گفتا چو دانہ خاک شگافد گل تراست

ان اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ "میں نے ایک بلند نظر انسان سے پوچھا کہ زندگی کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ یہ ایک ایسی شراب ہے کہ اس کی تلخ تر قسم بھی اچھی ہی ہے۔ میں نے کہا یہ ایک کیڑا ہے جو مٹی سے پیدا ہو گیا ہے۔ اس نے کہا نہیں بلکہ سمندر (ایک جانور جس کی پیدائش آگ سے ہوتی ہے) کے مثل آگ سے اس کا جنم ہے۔ میں نے کہا کہ اس کی فطرت خام میں شر کا مادہ ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اس کے خیر کی معرفت حاصل نہ کرنا ہی شر ہے۔ میں نے کہا اس کا شوق سیر کسی منزل پر اسے نہ لے گیا۔ اس نے کہا کہ اس کی منزل تو شوق میں چھپی ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ وہ خاکی ہے اور آخرکار خاک میں ملا دی جاتی ہے۔ اس نے کہا کہ دانہ جب خاک کو چیر ڈالتا ہے تو گل تر بن جاتا ہے۔"

گوئٹے کی آخری سطور میں وہ تصور موجود ہے جس کی طرف اقبال نے اپنے آخری شعر میں اشارہ کیا ہے۔

بائرن

ایک ایسی طبیعت کے ساتھ جو اس کو ہمیشہ لامتناہیت کی طرف لے جاتی تھی' وہ رکاوٹ جو اس نے تین وحدتوں کی پابندی و تعظیم کے ذریعہ جو اس نے اپنے اوپر عائد کی' وہ اس کو اچھی طرح زیب دیتی ہے۔ کاش وہ یہ بھی جان لیتا کہ کس طرح اخلاقی ضبط سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ اس کو تباہ ہونا تھا اس لئے ایسا وہ نہیں کر سکتا تھا اور یہ کہنا مناسب ہے کہ وہ اپنے ہی بے لگام مزاج کی وجہ سے برباد ہوا۔

لیکن وہ اپنے متعلق بہت تاریکی میں تھا۔ وہ اپنے زمانہ میں متکبرانہ انداز سے جیا اور نہ اس کو پتہ چلا اور نہ اس نے سوچنے کی زحمت گوارا کی کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اپنے لئے سب کچھ روا رکھتے ہوئے اور دوسروں کی کوئی چیز سے درگزر نہ کر کے لازمی طور پر اس نے خود کو ایک خراب حیثیت میں مبتلا کر دیا اور دنیا کو اپنا دشمن بنا لیا۔ بہت شروع ہی میں اس نے اپنی کتاب "انگریزی بھاٹ اور اسکاٹ لینڈ کے تبصرہ نگار" کے ذریعہ ممتاز علمی آدمیوں کو آزردہ بنا دیا۔ اس انداز پر جمے رہ کر وہ ایک قدم اور پیچھے سرک گیا۔ اپنے بعد کے تصانیف میں وہ مخالفت اور نکتہ چینی کا رستہ اختیار کئے رہا' نہ مذہب اس کے حملہ سے محفوظ رہا' نہ حکومت اس ناعاقبت اندیشانہ چلن نے اس کو انگلستان سے ملک بدر کر دیا اور کسی وقت اس کو یورپ ہی سے بھاگنا پڑتا۔ ہر جگہ اس کے لئے تنگیاں تھیں اور بہت ہی مکمل شخصی آزادی کے ساتھ اس نے خود کو محدود دائرہ کے اندر مقید کر لیا۔ یہ دنیا اس کے لئے ایک قید خانہ نظر آنے لگی۔ اس کا سفر یونان اس کے اختیاری فیصلہ کے ماتحت نہ تھا۔ دنیا کے ساتھ اس کی غلط فہمی نے اس کو وہاں سے بھگا دیا۔ ایک ممتاز انسان کی شخصی تباہی نہ صرف موروثی اور حب وطنی چیزوں کو نظر انداز کرنے کے سبب ہوئی' بلکہ اپنے انقلابی رجحان کے ذریعہ جس میں مستقل ذہنی اضطراب شامل تھا' اس نے اپنی فطری صلاحیت کو ابھرنے نہ دیا۔ اس کے علاوہ اس کی متواتر نفی اور نکتہ چینی اس کی اعلیٰ تصنیفات کے لئے بھی مضر ثابت ہوئی' کیونکہ شاعر کی بے اطمینانی نہ صرف قاری پر برا اثر ڈالتی ہے بلکہ ساری مخالفت کا انجام نفی ہوتا ہے اور نفی کوئی شے نہیں' اگر ہم کسی برے کو برا کہیں تو ہمیں حاصل کیا ہوتا ہے؟ لیکن جب ہم کسی اچھے کو برا کہیں تو ہم بہت زیادہ فتنہ کے مرتکب ہوں گے۔ وہ جو ٹھیک کام کرے گا کبھی لعن طعن نہیں کرے گا' برائی کئے جانے پر اپنے کو پریشانی میں نہیں

ڈالے گا' بلکہ خود اچھا کام کرتا جائے گا کیونکہ تخریب کسی بڑے نقطہ کا نام نہیں' بلکہ تعمیر ہے اور اسی میں انسانیت کو اصلی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ لارڈ بائرن بھی ایک انسان ہی تھے۔ ایک انگریز' طبقہ امرا کے ایک فرد' ایک بڑی فطری صلاحیت کے انسان' ان کے اچھے اوصاف انسان سے خصوصی تعلق رکھتے ہیں' ان کی بری باتیں انگریز اور طبقہ امرا کے ایک فرد ہونے سے ان کی فطری صلاحیت کا مقابلہ' مقدار کے لحاظ سے ان چیزوں سے نہیں ہو سکتا۔ سارے انگریز ایسے ہی ہوتے ہیں' اس میں کوئی طعن نہیں۔ ایسا کہنا بالکل صحیح ہے۔ بہت سے اقسام کی بدحواسی اور جماعتی جوش ان کے خیالات کو سکون کے ساتھ پختہ نہیں ہونے دیتا' لیکن عملی انسان کی حیثیت سے وہ بڑے ہوتے ہیں۔

اس طور سے لارڈ بائرن خود اپنے اوپر یا دنیا پر ایک دانشمندانہ عکس نہیں ڈال سکتا تھا' مگر جہاں وہ کوئی تخلیق کرتا ہے کامیاب ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ شعر کہنے پر مجبور تھا اور جو چیز اس سے نکلی' خاص کر اس کے دل سے بہت خوب تھی' اس نے اپنی بہتیری چیزیں پیش کیں جیسا کہ عورتیں اپنے بھولے بھالے بچے پیش کرتی ہیں' بلا اس کا خیال کئے ہوئے اور بلا یہ جانے ہوئے کہ کیسے یہ کیا گیا۔

وہ ایک بڑی فطری صلاحیت' پیدائشی صلاحیت کا انسان تھا اور ہم نے اس سے زیادہ کسی میں سچی شاعرانہ قدرت نہیں دیکھی۔ خارجی چیزوں کے سمجھنے اور گذرے ہوئے مواقع میں سما جانے کے لحاظ سے وہ اتنا ہی بڑا تھا جتنا شیکسپیئر' لیکن ایک خالص فرد کی حیثیت سے شیکسپیئر اس سے بزرگ تر ہے۔ بائرن اس کو محسوس کرتا تھا اور اسی وجہ سے وہ شیکسپیئر کے متعلق زیادہ نہیں کہتا' گو ساری عبارتیں اس کو حفظ ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی ارادی طور پر وہ اس کا منکر ہو جاتا' کیونکہ شیکسپیئر کی بشاشت اس کا سنگ راہ ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ اس اعتبار سے وہ کسی طرح اس کا مد مقابل نہیں۔ پوپ کا وہ انکار نہیں کرتا کیونکہ اس سے اس کو ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں' اس کے برعکس وہ اس کا تذکرہ کرتا ہے اور جہاں تک ہو سکتا ہے اس کا احترام کرتا ہے۔ چونکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ پوپ کے مقابلہ میں اس کی آب و تاب زیادہ نمایاں ہے۔ ایک انگریز امیر کی حیثیت سے اس کا بلند مرتبہ بائرن کے لئے مضرت رساں تھا' کیونکہ فطری صلاحیت کا ہر انسان خارجی دنیا سے پست ہو جاتا ہے اور اس وقت یہ احساس اور بھی سنگین ہو جاتا ہے جبکہ ایسی خاندانی شرافت کے ساتھ ایک عظیم

الشان خوش قسمتی بھی مستلزم ہو' ایک خاص اوسط طبقہ فطری صلاحیت کے لئے بہت زیادہ مناسب حال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بڑے بڑے فنکاروں اور شاعروں کو متوسط طبقہ میں پاتے ہیں۔ لامتناہیت کی طرف بائرن کا طبعی میلان' نیچے گھرانہ اور کمتر وسائل کے ساتھ اس قدر خطرناک نہ ہوتا لیکن چونکہ وہ ہر خیال کو عمل میں پیش کر سکتا تھا' اس لئے اس کو بے شمار ناگوار مواقع میں گھرے رہنا پڑا۔ اس کے علاوہ ایک اتنے بلند مرتبہ کا آدمی' دوسروں کے مرتبہ سے' خواہ کیسا ہی ہو' وہ کس طرح ہیبت اور تعظیم کا اثر لے سکتا تھا' جو اس نے محسوس کیا وہی بولا۔ اس نے اس کو دنیا کے ساتھ ایک ناقابل اختتام جدال میں مبتلا رکھا۔

اگر لارڈ بائرن کو زور دار پارلیمانی تقریروں کے ذریعہ اپنے چلن کے سارے مخالفانہ عنصر کو کام میں لانے کا موقع ملتا' تو وہ شاعر کی حیثیت سے زیادہ خالص ہوتا' لیکن چونکہ پارلیمان میں وہ کبھی بولتا نہ تھا' وہ اپنے سرپرستوں کے خلاف اپنے سارے احساسات اپنے ہی اندر جذب رکھتا تھا اور ان احساسات سے خود کو آزاد کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی کہ وہ ان کو شاعرانہ صورت میں پیش کرے' اس لئے میں بائرن کی شاعری کے بڑے حصہ کو نفی کے کارناموں سے تعبیر کروں گا' ایسی تقریریں جو پارلیمان میں ہونی چاہئیں تھیں اور ان کو اس عنوان کے تحت لا کر ان کی وقعت بڑھانا ہے' گھٹانا نہیں ہے۔

اب اقبال کی تنقید پر ایک نظر ڈالئے:

مثال لالہ و گل شعلہ از زمیں روید
اگر بہ خاک گلستان تراور از جامش
نبود در خور ٹبعش ہوائے سرد فرنگ
تپید پیک محبت ز سوز پیغامش
خیال او چہ پریخانہ ے بنا کرد است
شباب غش کند از جلوۂ لب بامش
گذاشت طائر معنی نشیمن خود را
کہ سازگار تر افتاد حلقہ دامش

گوئٹے نے بائرن کی زندگی کے جن گوشوں پر شرح کے ساتھ نظر ڈالی ہے' اقبال ان پر ایک مجمل نگاہ ڈالتے ہیں۔ گوئٹے کی طرح اقبال بھی بائرن کی شدت احساس' بے لاگ اظہار

خیال اور شعلہ انگیز طرز تنقید کے قائل ہیں۔ وہ اس کے حسرت ناک انجام کو بھی پیش کرتے ہیں، لیکن فرق صرف اس قدر ہے کہ گوئٹے اس کی بربادیوں کو خود اس کے حد سے بڑھے ہوئے احساس اور بے لگام، غیر مدبرانہ اور کھلم کھلا نکتہ چینیوں کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اقبال اس کے لئے بائرن کو نہیں بلکہ خود یورپ ہی کو سزاوار ملامت سمجھتے ہیں۔ بائرن کے شاعرانہ کمال، جوش اور فطری صلاحیت کے دونوں یکساں قائل ہیں۔ اقبال کی تنقید یا تفریظ کا خلاصہ یہ ہے:

"اگر بائرن کے جام سے باغ میں ایک قطرہ ٹپک پڑے تو اس سے بجائے لالہ و گل زمین سے شعلہ پیدا ہو، یعنی اس قدر اس کے کلام میں گرمیاں ہیں، یورپ کی سرد ہوا اس کی طبیعت کے ناموافق تھی۔ اس کے پیغام کے سوز سے محبت کا قاصد تڑپ اٹھا۔ اس کے خیال نے کیسا پری خانہ بنایا کہ جوانی اس کو لب بام پر دیکھ کر غش کھا جاتی ہے، یعنی اس کی شاعرانہ قدرت نے ایسے خیالات کی تخلیق کی جیسے ایک قصر بلند پر ایک حور وش بیٹھی ہو اور جوان اس کو دیکھے اور غش کھا کر گر پڑے۔ بائرن کے افکار شعری ہمارے اندر یہی جوش و شدت پیدا کر دیتے ہیں۔ بائرن کی شاعری میں معنی آفرینی کا یہ عالم ہے کہ اب معنی کا کوئی پہلو باقی نہ رہا کہ کوئی اس کو پیش کر سکے کیوں کہ طائر معنی خود ہی اپنے نئے نشیمن سے اتر کر اس کے حلقہ دام میں گرفتار ہو گیا۔"

عشق

دشمنی اور بدخواہی تماشہ بیں کو محض اس سطح میں محدود کر دیتی ہے، جس کو وہ دیکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی حساس رہتا ہے، لیکن جب لطف و محبت کے ساتھ زیرکی مربوط ہو جاتی ہے، تو مشاہد انسانوں اور عالم کی محض چولی سے درے ہو جاتا ہے اور مسرت آفریں اثرات کے ماتحت بلند مسائل کو حل کرنے کی توقع کر سکتا ہے۔

گوئٹے نے عشق و محبت پر ایک مجمل رائے دی ہے۔ اقبال کسی قدر اس کی وضاحت کرتے ہیں، لیکن مقصد اور پیغام کے لحاظ سے دونوں میں بالکل ہم آہنگی ہے۔

فکرم چو بہ جستجو قدم زد
در دیر شد و در حرم زد

در دشت طلب بسے دویدم
دامن چوں گردباد چیدم
پویاں بے خضر سوئے منزل
بردوش خیال بستہ محمل
جویائے مے و شکستہ جامے
چون صبح بہ باد چیدہ دامے
پیچیدہ بہ خود چو موج دریا
آوارہ چو گردباد صحرا
عشق تو دلم ربود ناگاہ
از کار گرہ کشود ناگاہ
آگاہ زہستی و عدم ساخت
بتخانہ عقل را حرم ساخت
چوں برق بہ خرمنم گذر کرد
از لذت سوختن خبر کرد
سرمست شدم زپا فتادم
چوں عکس زخود جدا فتادم
خاکم بہ فراز عرش بردی
زاں راز کہ بادلم سپردی
واصل بہ کنار کشتیم شد
طوفان جمال زشتیم شد
جز عشق حکایتے نہ دارم
پروائے ملامتے نہ دارم
از جلوۂ علم بے نیازم
سوزم، گریم، تپم، گدازم

میرا خیال جب تلاش میں نکلا تو دیر میں بھی گیا اور حرم میں بھی، صحرا میں بھی بگولے

کی طرح مارا پھرا اور جستجوئے منزل میں موج دریا کی طرح بھی پیچ و تاب کھاتا رہا۔ یہاں تک کہ تیری محبت نے میرا دل چھین لیا۔ اس نے مجھے ہستی اور نیستی کی معرفت سکھائی' عقل کے بتکدے کو حرم بنا ڈالا' یہ محبت بجلی کی طرح میرے خرمن زندگی پر گری اور مجھے لذت سوز سے آشنا کیا' یہاں تک کہ میں آپے سے باہر ہو گیا' سایہ کی طرح اپنے وجود سے ایک علیحدہ ہستی بن گیا' محبت نے جو راز مجھے بتایا اس سے میری خاک کا مرتبہ عرش کی بلندی تک پہونچا' میری کشتی ساحل سے آ لگی' میری برائیاں طوفان جمال میں متبدل ہو گئیں' اب عشق ہی عشق مجھ میں ہے' مجھے نہ کسی کی ملامت کی پرواہ ہے اور نہ کسی علم کی ضرورت' میں محبت میں جل رہا ہوں' روتا ہوں' لوٹ رہا اور گھل رہا ہوں۔

اب آپ پیچھے مڑ کر گوئٹے کی فکر ورائے پر بھی ایک نظر ڈالیں "جہاں محبت میں انسان بہت بلندی حاصل کر لیتا ہے اور مسرت آفریں اثرات کے ماتحت بلند مسائل کو حل کرنے کی توقع کر سکتا ہے۔"

حواشی

1- گوئٹے کی زندگی کے حالات انگریزی میں مسٹر لیوس' اورائے ہیوارڈ نے لکھے ہیں۔ ہیوارڈ "فاسٹ" کا فاضل مترجم ہے۔ گوئٹے کی سوانح حیات کے متعلق ڈونیزر کی کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی میکملن نے شائع کیا ہے۔ گوئٹے نے بھی اپنی خود نوشت سوانح عمری مرتب کی ہے اور اس میں اپنی کمزوریوں کا اعتراف کیا ہے۔ میرے سامنے اسکاٹ لینڈ کے ایک فن کار اور ادیب جے۔ ایس۔ بلیکی کی کتاب "گوئٹے کی دانائی" ہے۔ اس میں مصنف نے بڑے دل ربایانہ انداز میں گوئٹے کے چلن کا اندازہ لگایا ہے۔ نسائیات کے باب میں اس کی اخلاقی روش پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں' ان کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

2- "پیام مشرق" مقدمہ۔

(اقبال کی شاعری از عبدالمالک آروی' بدایوں 1950ء' ص 148-174)

سید وحید الدین

حکمت گوئٹے اور فکر اقبال

حافظ، گوئٹے اور اقبال عالمی ادب کے تین بڑے ستون ہیں۔ گوئٹے نے اپنے وطن کی طوائف الملوکی سے بیزار ہو کر ایرانی آب و ہوا میں توانائی و تازگی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ پیر مغرب کا یہ سفر فرار کی صورت نہیں رکھتا تھا بلکہ اس نے حافظ ہی کے سائے میں الفت و محبت کے کوچے کی سیر کی۔ گل و بلبل اور شمع و پروانہ کے علائم کے ذریعے حکمت کے موتی بکھیرے۔ مگر ایران میں مستقل قیام نہیں کیا اور نہ مشرقی مزاج کو اپنے اوپر پورے طور پر مسلط ہی ہونے دیا۔ اپنی عمر کے آخری زمانے میں اس نے جب اس کی ایک خوبصورت نظم، جس کا عنوان ہے "بروقت نیم شب" ایک محفل میں ترنم کے ساتھ سنی اور پھر اسی کی فرمائش پر اسی خوش الحان آواز میں اپنے دیوان کی چند نظمیں سنیں تو وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ آج مجھے یہ چیزیں بہت اجنبی معلوم ہوتی ہیں اور نہ آج مجھے اس محبت کی لَو جلاتی ہے جو کبھی مجھے بے قرار کرتی تھی۔ اس کے برعکس اس کا "ترانہ نیم شب" اس کو اپنی زندگی کا ایک حصہ معلوم ہوا۔ اس کو احساس ہوا کہ مشرقی داستانیں اور محبت کی وہ پرانی نوک جھونک ایک ایسے دور کی کہانی ہے جس کو وہ عبور کر گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب کوئی شاعر کسی ایک عالم کیفیت میں خود کو سمو دیتا ہے تو خواہ اس کو محسوس ہو یا نہ ہو، اس دنیا سے تعلق اس کی شخصیت کا ایک جزو بن جاتا ہے۔ شعوری سطح پر ہو یا غیر شعوری سطح پر، وہ اس کو متاثر کرتا رہتا ہے۔ گوئٹے کی اپنی قومی حدود سے پرے روحانی سفر کے بغیر اس کی

آفاقیت اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتی تھی اور یہ گوئٹے ہی ہے جس نے عالمی ادب کا تصور پیش کیا اور کہا: "اب قومی ادب کچھ معنی نہیں رکھتا کیوں کہ عالمی ادب کا دور شروع ہونے کو ہے۔"

اب رہا اقبال کا حافظ اور گوئٹے سے تعلق تو یہ اپنی خاص نوعیت رکھتا ہے۔ گوئٹے نے خواہ مشرقیت کو خیرباد ہی کیوں نہ کہہ دیا ہو' حافظ کے ساتھ اس کا رویہ کبھی سلبی نہیں رہا۔ اس کے برعکس اس مزاج کے خلاف ابتدا ہی میں اقبال نے آواز بلند کی تھی اور گو وہ حافظ کی فضیلت بحیثیت ایک شاعر کے ہمیشہ تسلیم کرتے رہے لیکن حافظ "صہبا گسار" کے تعلق سے ان کے پاس حقیقت میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ وہ ان کے شعور زیست کو خواب آور سمجھتے ہیں' لیکن اس کے باوجود وہ اپنی شاعرانہ تقلید میں حافظ کے اسلوب بیان سے پورا استفادہ کرتے رہے اور ان کے شاعرانہ کمال کے کبھی منکر نہ رہے۔ حافظ کی شاعرانہ ادا اور فکری لہجہ بھی اگر اقبال کے پاس ملتا ہو تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ یہاں دو مختلف عوالم سے ہم کو سابقہ ہے۔

گوئٹے اور اقبال کے تعلق پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ وہ اس "نکتہ دان المنی" کی ہمہ گیر شخصیت اور اس کی حکمت سے متاثر رہے اور اس کے فن کی فضیلت کا اعتراف جگہ جگہ کیا۔ گوئٹے گو ایک ایسے ملک میں پیدا ہوا' جہاں فلسفیانہ نظام اپنی پوری بلندی کے ساتھ سامنے آتا ہے اور گوئٹے کے ہمعصر ہیگل جیسا فلسفی اور پیشرو کانٹ جیسے مفکر بھی رہے ہیں' لیکن اس کے باوجود گوئٹے نے فلسفے کی بحیثیت ایک نظام فکر کے کبھی آبیاری نہیں کی۔ اس کے برعکس اس کے جوانمرگ دوست شلر نے کانٹ کا غائر مطالعہ کیا تھا اور کانٹ کے اخلاقی تصورات پر ایک نہایت جامع و لطیف تنقید کی اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ شلر نے نہیں بلکہ گوئٹے نے ایک ایسا فلسفیانہ اور حکیمانہ ڈراما لکھا جس کے متعلق اقبال نے کہا تھا کہ اس نے:

> "قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کے امکانی نشو و نما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمال فن خیال میں نہیں آ سکتا۔"

گو شلر نے کچھ نہایت پُرمغز فلسفیانہ نظمیں لکھیں' لیکن پھر بھی حکمت کے وہ انمول موتی جو ہم کو گوئٹے کے پاس ملتے ہیں' ان سے شلر کا دامن خالی ہے۔

گوئٹے کے برعکس اقبال فلسفے کے باقاعدہ طالب علم رہے۔ مغرب کے فلسفے کا بغائر مطالعہ کیا اور اپنے "خطبات" میں اپنی فلسفیانہ صلاحیت کا بہت اچھا نمونہ پیش کیا اور اپنی شاعری میں بھی حکیمانہ خیالات کو بہت ہی کامیابی کے ساتھ شعر کا جامہ پہنایا' جس کا سب سے مکمل اظہار "جاوید نامہ" میں ملتا ہے۔ گوئٹے تو شاکی تھا کہ جرمن نقاد بلاجھجک خود کو زندگی کے تاثرات کے حوالے نہیں کرتے بلکہ ہر جگہ "تصور" کے جویا رہتے ہیں اور اس طرح زندگی کو اپنے تصورات کی گہرائی سے اور مشکل بنا دیتے ہیں۔ اس نے 6 مئی 1827ء میں ایکرمان سے بات چیت کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ جرمن نقاد میرے پاس آتے اور پوچھتے ہیں کہ وہ کون سا تصور ہے جو میرے "فاؤسٹ" میں صورت پذیر ہوا۔ گویا کہ میں خود اس قابل ہوں کہ اس کو بیان کر سکوں۔ اور پھر آگے چل کر کہا کہ وہ بھی کچھ عجیب چیز ہوتی کہ میں زندگی کی اس بوقلمونی اور رنگارنگی کو جس کا "فاؤسٹ" میں اظہار ہوا ہے' کسی کم مایہ تصور کے ذریعے متعین کرنے کی کوشش کرتا۔ ہاں جب کسی تصور کا اظہار پیش نظر رہا تو میں نے اس کے لئے چھوٹی نظموں کا انتخاب کیا جن میں کوئی وحدت مل سکے۔ گوئٹے صرف یہ چاہتا تھا کہ زندگی کے تلاطم اور تاثرات کی ہمہ ہمی کو کسی تصور کے تابع کئے بغیر اظہار میں لائے۔ اس کے برعکس اقبال کے پاس کچھ بنیادی تصورات ہیں جن کی روشنی میں وہ سوچتے ہیں اور جن سے ان کی شاعرانہ تخلیقات لازمی طور پر متاثر ہوئیں۔

اس سلسلے میں جو دو مقالے پیش ہیں۔ ان میں سے ایک تو انگریزی میں اس سمینار میں پیش کیا گیا تھا جو اقبال انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے منعقد کیا گیا تھا' یہ اب مناسب کمی و بیشی کے ساتھ اردو میں پیش کیا جا رہا ہے۔ دوسرا ایک لیکچر ہے جو اقبال انسٹی ٹیوٹ کی دعوت پر دیا گیا۔ اس سے پہلے میں نے دو لیکچر دیئے تھے ان کی یہاں مزید وضاحت کی گئی ہے۔ خاص طور پر گوئٹے اور اقبال کے عالم فکر کو سمجھنے میں شاید یہ دو مقالے کچھ نہ کچھ معاون ثابت ہوں۔

جو کچھ میں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں' ان سب کا سہرا اصل میں میرے محترم دوست آل احمد سرور کے سر ہے۔ اگر وہ ان افکار کو قابل توجہ نہ سمجھتے تو شاید میں ان پر خامہ فرسائی کرنے کی جرأت کبھی نہ کر سکتا۔ کیوں کہ میں تو اصل میں مغربی فکر کا باقاعدہ طالب علم رہا ہوں اور عمر کے ساتھ ساتھ اسلامیات میں دلچسپی بھی بڑھتی گئی' لیکن اقبال کی

فکر اور ان کی شاعری پر میں نے شاید وہ توجہ نہ دی ہو جو ہمارے اردو کے نقاد اور اقبال شناسوں کا حصہ ہے۔ اس لئے امید ہے کہ اگر ان کو میرے افکار کچھ اجنبی معلوم ہوں اور ان کے معیار پر پورے نہ اترتے ہوں تو مجھے معذور سمجھیں۔ بہرصورت علمی دیانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی جو کچھ سوچے برملا اس کا اظہار کرے اور اس معصومیت کا شکار نہ ہو جو آج کل اقبالیات پر مسلط ہے۔ ہم نے اقبال کا ایک امیج (Image) قائم کر لیا ہے اور اپنے ہی تصور میں ان کو مقید کر لیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی سرچشمہ اقبال کی فکر کا ہو سکتا ہے تو صرف قرآن کریم یا وہ بزرگ ہیں جن کو ہم نے اسلامی فکر کا قابل تسلیم ترجمان مانا ہے۔ مغربی فکر اس قابل نہیں ہے کہ وہ اسلامی فکر کو متاثر کر سکے۔ ہم یہ آسانی کے ساتھ بھول جاتے ہیں کہ مغربی فکر اور مغربیت دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ آخرالذکر ایک سماجی تصور ہے جس کا ظہور نوآبادیاتی استحصال سے پیدا ہونے والی شکست خوردہ ذہنیت کا مرہون منت ہے۔ جب کہ مغربی فکر مغربی انسان کی کائنات کے مقابل رد عمل کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کی بنیادیں بھی روحانی ہیں۔ کیوں کہ مغربی فکر کے دو اہم سرچشمے ہیں۔ ایک تو یونانی فکر اور دوسرے عیسائیت جس کو اس کے ابراہیمی ورثے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یونانی فکر پر بھی وہ سقراطیس کے زیر اثر مادیت کا بحیثیت فلسفیانہ نظام کے آغاز ہوا لیکن وہ یونانی فکر پر مسلط نہ ہو سکی اور ان دو چشموں سے جس فکر کی آبیاری ہو' اس کا اثر قبول کرنا اسلامی فکر کے لئے باعث ننگ نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس مغربی فکر کے مقابل تنقیدی شعور ہر وقت بیدار رہے اور کسی سطح پر بھی احساس کمتری کا شکار ہو کر اپنی مخصوص ثقافتی حیثیت سے دست بردار نہ ہونے پائے۔ اقبال نے ضرور بڑی حد تک توازن کو برقرار رکھا ہے۔ جو تجزیہ میں نے شاعر مشرق کی فکر کا کیا ہے' وہ چونکہ عام تصور سے بالکل مختلف ہے اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ اگر ہمارے بعض اقبال شناسوں کو گراں گزرے۔ بہرصورت :

سپردم بتو مایہ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

حکمت گوئٹے اور اس کے رموز

گوئٹے کو دنیا ایک آفاقی انسان کی حیثیت سے جانتی ہے' جس کی نظر حقیقت کے کسی ایک گوشے تک محدود نہ تھی بلکہ مختلف عوالم فکر و حیات سے یکساں وابستہ رہی۔ وہ ایرانی سرزمین سے بھی خود کو اتنا آشنا محسوس کرتا تھا جتنا اپنے پیدائشی خطے سے یا ایطالیہ کی سرزمین سے۔ اس لئے ایک وقت جب ایلیٹ (T. S. Elliot) جیسے ناقد و شاعر نے گوئٹے کو اپنے زمانے' اپنی زبان اور اپنی ثقافت تک محدود جانا تو یہ کچھ کم اچنبھے کی بات نہ تھی۔ ہمارے لئے بہرصورت گوئٹے نے نسلی' قومی اور ثقافتی حدود کو عبور کرنے میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے اور اپنی ثقافتی چوکھٹ سے باہر قدم رکھا ہے۔ یہ شاعر مشرقی فضا میں بہت آسانی سے سانس لیتا ہے اور ایرانی تخیل کے سرمائے سے فیضیاب ہونے میں اپنا کوئی ہمسر نہیں رکھتا۔ یہی نہیں بلکہ سرچشمہ اسلام سے بھی بہت کچھ فیض حاصل کیا ہے اور ایسے زمانے میں پیغمبر اسلام کی تعریف کے گن گائے جب کہ صلیبی جنگوں کی یادیں ابھی تازہ تھیں۔ وہ کسی بھی حیثیت سے مقامی ذہنیت سے مقید قرار نہیں دیا جا سکتا۔ قومی تعصب و نفرت سے وہ قطعاً" بے گانہ تھا۔ اس نے صاف لفظوں میں کہا ہے "قومی نفرت سب سے زیادہ قوت و شدت' تہذیب کی سب سے نیچی منزل پر اختیار کرتی ہے لیکن ایک ایسی منزل بھی ہوتی ہے جہاں یہ بالکل ناپید ہو جاتی ہے اور جہاں آدمی ایک طرح سے قوموں سے بالا ہو جاتا ہے اور ہمسایہ قوم کی مسرت اور غم میں اسی طرح شریک ہوتا ہے جیسے یہ اسی کا اپنا ہو۔ تہذیب کی یہ منزل میری فطرت کے عین مطابق ہے اور میں نے یہ ساٹھ برس کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی اس میں مضبوطی سے قدم جما لئے تھے۔"

ایکرمان کے روبرو' اس تعلق سے اس نے یہ فکر انگیز خیالات ظاہر کئے ہیں: "شاعر بحیثیت ایک انسان اور ایک شہری کے اپنے ملک سے ضرور محبت رکھتا ہے لیکن اس کی شاعرانہ صلاحیتوں اور اس کے شاعرانہ اثر و نفوذ کا اصلی وطن تو خیر کی' عظمت کی اور جمال کی دنیا ہے' جو کسی خاص احاطے یا قوم تک محدود نہیں رہ سکتی اور اسی کو شاعر اپنے قابو میں کرتا ہے اور صورت بخشتا ہے جہاں کہیں بھی وہ اس کو پاوے۔" عمر کی رفتار اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی اور اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ شام زندگی میں جوان مرا۔

عمر کے ساتھ اس میں پختگی آتی گئی لیکن اس نے شباب کی دلچسپیوں کو پیچھے نہیں چھوڑا۔ وہ عمر کے ہر موسم کی کیفیت کو اپنے اندر سموئے آگے بڑھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کسی عظیم فلسفی یا کسی بڑے شاعر کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ہر تخلیق خواہ فکری ہو یا شاعرانہ' یکساں اہمیت کی حامل ہے۔ اطالوی فلسفی کروچے کے الفاظ کو اپناتے ہوئے گوئٹے کے متعلق اسی طرح کہہ سکتے ہیں جس طرح اس نے ہیگل کے نظام فکر کے متعلق کہا ہے کہ اس میں کچھ تو زندہ ہے اور کچھ مردہ۔ کچھ تو ایسی باتیں ہیں جو دائم زندہ رہیں گی اور کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں جو زندہ نہیں رہ سکتیں۔ خاص طور سے اس کی سائنسی تحقیقات قابل گرفت ہوتی رہی ہیں لیکن زندہ عنصر اس کی شاعرانہ تخلیقات میں غالب ہے اور مرور زمانہ سے وہ زیادہ متاثر نہیں ہو سکتا۔

گوئٹے تو جیسا کہ ساری دنیا جانتی ہے' ایک ہمہ جہتی انسان تھا لیکن ہم نے صرف اس کی ایک جہت پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے اور یہ اس کی صوفیانہ جہت ہے۔ گوئٹے بلاشبہ عمل کا دھنی تھا۔ اس نے عمل کو اپنے بزرگ ہم عصر شلے سے کچھ کم اہمیت نہ دی' لیکن ایسی مثالیں کچھ کم نہیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ولولہ عمل اور دھیان و مراقبے سے لگاؤ ایک دوسرے کو خارج نہیں کرتے۔ یہ قانون تخالف (Polarity) ہے جس کو گوئٹے نے نیچر اور انسان میں یکساں کارفرما پایا اور اسی کی وجہ سے گوئٹے میں ہمت پیدا ہوئی کہ وہ ایسے وقت میں جب کہ اس کی قوم ایک نازک دور سے گزر رہی تھی اپنے قدم کو اکھڑنے نہ دے' لیکن صوفیانہ جہت ایک مخصوص معنی میں ہمارے پیش نظر ہے اور اس کو ہم نے زندگی اور حقیقت کے غیر عقلی عناصر کے شعور کے مترادف قرار دیا ہے۔ وسیع تر معنی میں وہ عالم غیب کا شعور ہے اور یہ شعور ہے کہ جس دنیا کو ہم جانتے ہیں' وہ عالم غیب سے پیوست ہے۔ گوئٹے نے "فاؤسٹ" میں اپنے ہی خیالات کی ترجمانی ایک دوسرے حکیم کی زبانی کی ہے: "یہ بات نہیں ہے کہ عالم ارواح اب وا نہیں رہا۔ یہ تمہارا دل اور تمہارے حواس ہیں جو اس کو تمہاری نظر سے محجوب رکھتے ہیں اور وہ بند اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا دل مردہ ہو گیا ہے۔" حق تو یہ ہے کہ جب دنیا ہی میں ہم لگے رہے تو جو کچھ اس سے پرے ہے' وہ ہم سے اوجھل ہو گیا اور ہم پر غفلت کا پردہ پڑ گیا۔ ظاہر ہے کہ گوئٹے نے صوفیانہ واردات و احوال کا کوئی نظریہ ہم کو نہیں دیا لیکن تاریخ و حیات کے ایسے عناصر

جو عقلی طور پر ناقابل توجیہہ ہیں' ان سے آگہی اور ان کا تجربہ ضرور دیا ہے۔ اس کی سب سے بہتر مثال ہم کو اس کی سوانح حیات میں ملتی ہے جس کو اس نے شاعری و صداقت کا نام دیا ہے۔ کوئی تعجب نہیں اگر روڈولف اوٹو نے مذہب کے متعلق اپنے نظریئے کی تشکیل میں اس سے پورا فائدہ اٹھایا ہو۔ اپنی مشہور کتاب "تصور قدس" میں اوٹو نے گوئٹے کے ان بیانوں کی طرف اشارہ کیا ہے' جہاں وہ اپنے دیمونی تصور (Daemonic) کا اظہار کرتا ہے۔ ہم کو یہاں کسی مذہب یا صوفیت کے مخصوص نظریئے سے بحث نہیں ہے بلکہ بحث ہے تو شعور غیب سے اور ان تاریک قوتوں سے جو زندگی میں برسرعمل ہوتی ہیں اور جو تعقلات کی حد بندی کو ٹھکرا دیتی ہیں۔

اوٹو نے گوئٹے کے نہ صرف ان بیانات کا حوالہ دیا ہے جو اس کی اپنی سرگذشت میں پائے جاتے ہیں بلکہ ایکرمان کے ساتھ مکالمات کا بھی۔ گوئٹے کے مطابق ان سِرّی قوتوں کی کارفرمائی کی اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے تصور سے ماورا' عقل و فہم کی رسائی سے باہر ہے اور اسی لئے ناقابل فہم ہے اور اسی لئے وہ ناقابل بیان ہے۔ گوئٹے کے الفاظ میں :
"دیمونی عنصر وہ عنصر ہے جو فہم کی گرفت میں نہیں آ سکتا۔ وہ تاریک اوقات میں اپنی رونمائی کو منتخب کرتا ہے۔" پھر وہ آگے چل کر کہتا ہے : "شاعری ابتدا سے انتہا تک ایک دیمونی عنصر کو پوشیدہ رکھتی ہے اور اس کی غیر شعوری کشش اسی کی مرہون منت ہے۔" بریں بنا وہ تعقلات سے غیر متاثر رہتی ہے۔ اس کا اثر سب سے زیادہ موسیقی میں اجاگر ہوتا ہے کیوں کہ موسیقی فہم کی دسترس سے باہر ہے۔ اسی لئے اس کا اثر ایسا غالب ہوتا ہے کہ اس کا احاطہ کوئی آدمی نہیں کر سکتا۔ دوسرے الفاظ میں گوئٹے یہاں ایسے راز حقیقت سے آشنا نظر آتا ہے جو بنیادی طور پر غیر عقلی عناصر کی کارفرمائی کو ظاہر کرتا ہو۔ وہ انسان میں بھی' نیچر میں بھی اور تاریخ کے واقعات میں بھی رونما ہوتا ہے۔ ایک جگہ گوئٹے اور زیادہ واضح الفاظ میں اپنے نقطہ نظر کو ظاہر کرتا ہے : "گو کہ دیمونی عنصر ہر شے میں خواہ وہ جسمانی ہو یا غیرجسمانی اپنا اظہار پاتا ہے۔ جانوروں میں خاص طور پر حیرت ناک طریقے پر ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کا سب سے گہرا اور حیرت ناک تعلق انسان سے ہی ہے۔ یہاں وہ ایک ایسی قوت کا روپ اختیار کرتا ہے جو نظام اخلاقی کے مغائر نہ سہی لیکن اس کے بیچ میں کچھ اس طرح دخل انداز ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لئے تانے بانے کا کام کرتے معلوم ہوتے ہیں

لیکن جب ایکرمان نے گوئٹے سے پوچھا کہ کیا میفسٹو کو اسی قسم کی قوت قرار دیا جا سکتا ہے تو گوئٹے نے اس کا نفی میں جواب دیا کیوں کہ اس کے کردار کی نوعیت حد سے زیادہ سلبی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دیمونی قوت نہ صرف سلبی حیثیت رکھتی ہے بلکہ اثباتی بھی۔ اس لئے اوٹو نے صحیح طور پر کہا ہے کہ گوئٹے کی یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ دیمونی قوت کی آگہی کو خود اس کے اپنے تصور یزدانی سے کس طرح مطابق کرے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ گوئٹے کا دیمونی تصور قوت شر کے مساوی نہیں۔ ایسی قوت جو انسان کی تباہی کا سبب ہو سکے اور جس کو مذہب میں شیطان کے رمز سے تعبیر کیا گیا ہے بلکہ یہ قوت اپنے عمل میں لازماً نہ شر کی حامل ہوتی ہے نہ خیر کی۔ وہ ایسا غیر عقلی عنصر ہے جو قابل فہم نہیں اور جس کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے کیوں کہ آدمی کے کئے سے وہ کالعدم نہیں ہو جاتی۔ ہم جانتے ہیں کہ گوئٹے نے حقیقت یزدانی کے متعلق کسی متعین اور ایجابی بیان سے ہمیشہ کنارہ کشی کی اور شاید وہ سینٹ ٹامس کی طرح اس کا قائل تھا کہ ہم آسانی کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کیا نہیں ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ خدا کیا ہے یا اپنشدوں کے الفاظ میں ہم "نیتی نیتی یہ نہیں یہ نہیں" سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ایکرمان نے گوئٹے سے سوال کیا کہ یزدانی قوت اور دیمونی قوت کا کیا تعلق ہے جب کہ دونوں میں کوئی مطابقت نظر نہیں آتی تو اس نے یہ جواب دیا: "اے عزیز، ہم تصور یزداں کے متعلق کیا جان سکتے ہیں اور ہمارے محدود تعقلات وجود برتر کے متعلق کیا کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ اگر ہم سو ناموں سے بھی اس کو یاد کریں تو بھی اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے اور اس کی لامحدود صفات کا لحاظ کرتے ہوئے ہم نے جو کچھ کہا وہ کچھ بھی نہ ہو گا۔" گوئٹے کے جواب میں اوٹو کو گریز نظر آیا لیکن جیسا کہ گوئٹے نے بارہا کہا ہے کہ الفاظ ناقابل اظہار حقیقت کے بیان میں بے بس ہیں اور جب فاؤسٹ کی محبوبہ گریٹش کو اس کی خاموشی اس بارے میں گراں گزرتی ہے تو فاؤسٹ کہتا ہے کہ "اس کے پاس کوئی نام نہیں ہے جو ہمہ محیط خیر الحافظین کو بیان کر سکے جس کا صرف تاثر ہو سکتا ہے۔ لیکن جس کو نام نہیں دیا جا سکتا کیوں کہ نام ایک آواز ہے اور ایک ایسا بخار ہے جو سماوی نور کو دھندلا کر دیتا ہے۔"

یہ ایقان کہ زبان ماورا کے تجربے کے لئے ناکافی ہے، گوئٹے کے ذہن میں پختگی کے ساتھ جاگزیں تھا۔ گوئٹے کی اس خصوصیت کا جوزف پیپر (Josef Pieper) نے اپنی ایک

چھوٹی سی کتاب "گوئٹے کی خاموشی" میں بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے۔ چینی حکیم لاتسے (Laotse) کے اس قول کی طرف اشارہ کرنے کے بعد "کہ جو جانتا ہے وہ کہتا نہیں" پیپر ہماری توجہ ایک خط کی طرف مبذول کرتا ہے جو گوئٹے نے اپنے مرنے سے ایک ہفتے قبل لکھا تھا اور جس میں اس نے لکھا تھا "ہمارے ایقانات کا احسن حصہ الفاظ میں مقید نہیں ہو سکتا۔"

گوئٹے کی یہ خاموشی مہاتما بدھ کی اس خاموشی سے مماثلت نہیں رکھتی جو انہوں نے خدا کے وجود سے متعلق اختیار کی تھی۔ یہ کوئی ایسا سکوت نہیں ہے جو ہر طرح سے مکمل ہو بلکہ ایسا سکوت ہے جو الفاظ کو ایک محدود دائرے میں برسر عمل ہونے کی اجازت دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس آگہی کی طرف بھی نشان دہی کرتا ہے کہ الفاظ ایسی بات جو اَن کہی رہ جاتی ہے' اسی کے واسطے سے اپنے منشا کو قابل اظہار بناتے ہیں۔ یہ سکوت خدا کے متعلق صوفی روایت سے بالکل ہم آہنگ ہے جہاں خدا کے متعلق کہا گیا ہے "برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم" اس لئے عالم زمانی میں ابدیت کے دخول کے لئے رات کو دن کے مقابلے میں گوئٹے نے مناسب رمز مانا ہے اور اس کے خیال میں حامل عظمت و جلال جو چیز بھی ہو گی اس کی جمالیاتی اہمیت اتنی زیادہ ہو گی جتنی کہ ماورائی۔ گوئٹے کے الفاظ میں "جلالی کیفیت بہت آسانی کے ساتھ شفق اور رات کے دوران پیدا ہوتی ہے جب کہ صورتیں ایک دوسرے میں مل جاتی ہیں اور وہ دن سے خائف رہتی ہیں جو اشیا کو ایک دوسرے سے جدا کرتا اور ان میں فرق پیدا کرتا ہے۔"

اب گوئٹے کی فکر کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور یہ ہے اس کا خیال کہ جمال الٰہی اور رحمت تامہ کی تعبیر عورت ہی کے کنائے میں کی جا سکتی ہے اور اسی کو اس نے نسائیت ابدی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس خصوصیت سے وہ محی الدین ابن عربی کا ہم نوا بن جاتا ہے۔ مسلمان صوفیہ عورت کی ماورائی جہت سے ناواقف نہ تھے۔ فرانسیسی محقق کوربیں (H. Corbin) نے جس طرح ابن عربی کی تعبیر کی ہے' وہ بہت سی حیثیتوں سے نزاعی بن سکتی ہے لیکن اس کی ضروری خدمت یہ ہے کہ اس نے شیخ اکبر کی ایک اہم خصوصیت کی طرف ہماری توجہ دلائی۔ کوربیں کہتا ہے کہ صوفی عورت کی ماورائی حقیقت میں وہ رحمان و رحیم کی صفات ایک ساتھ متجلی پاتا ہے۔ یہاں نسائیت اور رجولیت ایک دوسرے کے مقابل اضدادی کیفیت نہیں رکھتے بلکہ عورت کا تصور انفعالی و فعالی دونوں

جہتوں پر حاوی ہے۔ اس کے مقابل رجولیت دونوں جہتوں میں سے صرف ایک کو ظاہر کرتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ گوئٹے کی زندگی محبت کی واردات سے مالا مال تھی اور اواخر عمر تک وہ محبت کے کرب و بے چینی سے بے گانہ نہیں رہا۔ کیا تعجب کی بات ہے کہ خلّاقی کے لئے سب سے مناسب تمثال اس نے نسائیت ابدی میں ڈھونڈی جس کے ذریعے نجات ممکن ہوتی ہے اور جو آدمی کو غم ایام سے چھٹکارا دلاتا ہے۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ ابن عربی نے عورت کو جو ماورائی مقام عطا کیا ہے وہ خود عشق و محبت کی ان واردات کی ترجمانی کرتا ہے جن کا تجربہ ان کو مکہ مکرمہ میں ہوا اور جس کا اظہار انہوں نے "ترجمان الاشواق" میں شاعرانہ طور پر کیا ہے۔ مولانا رومی بھی ابن عربی کے ہم زبان و ہم خیال معلوم ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

پرتو حق است او معشوق نیست
خالق است آں گویَا مخلوق نیست

اب ہم دیمونی عناصر سے بھی قطع نظر کر لیں جو گوئٹے کے نزدیک دنیا میں برسرعمل رہتے ہیں، تو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ اس نے ہم کو ایسے عناصر کی طرف توجہ دلائی ہے جو ناقابل فہم و ذکا ہیں۔ مثال کے طور پر "فاؤسٹ" کے ڈرامے میں اس نے پرانے اساطیری قصے کا سہارا لیا ہے تاکہ اسرار حیات سے متعلق اپنے رویئے کا اظہار کرے۔ پہلے حصے میں خیر و شر کی کشمکش شخصی سطح پر ظاہر ہوتی ہے اور پھر یہ شخصی سطح کونیاتی منزل کا رخ اختیار کرتی ہے۔ پہلے حصے میں ہم "فاؤسٹ" کو علم اور اس کے بلند بانگ دعووں سے بالکل مایوس پاتے ہیں۔ اب وہ ان تمام اقدار کو جن پر آدمی جان کی بازی لگا دیتا ہے، حقیر مانتا ہے۔ خواہ وہ محبت کی بے خودی ہو یا امید کا سہارا ہو یا ایمان کی تسلی اور سب سے زیادہ وہ صبر کو پھٹکارتا ہے۔ یہاں غالب کے وہ اشعار یاد آتے ہیں جہاں دنیا سے بے دلی کا اظہار کچھ اس طرح سے کیا گیا ہے کہ غالب واقعی اس عظیم شاعر کا ہم نوا معلوم ہوتا ہے جو وا نمار میں خوابیدہ ہے:

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم

در دیک ساغر غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

اس بے دلی کے نتیجے کا اس پر ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ وہ باطنی قوتوں میں اپنی تشفی ڈھونڈتا ہے(۱)۔ میفسٹو کا ظہور اس کی اپنی خواہش کے جواب میں ہوتا ہے۔ پہلے حصے میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں وہ ہم کو ہوس و گناہ، محبت و معصومیت اور آلام حیات سے روشناس کراتے ہیں۔ میفسٹو کا کردار یہاں ایک عام شیطان کے روپ میں نہیں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ایسا شیطان نہیں ہے جس کا کام آدمی کو بہکانا ہو اور جو ماورائے تاریخ منزل پر آدمی کے سقوط کا باعث بنا۔ شیطان نے سانپ کے روپ میں آدمی کو بہکایا اور انجیل کے بیان کے مطابق آدمی کو علم کے درخت کا پھل کھانے پر مائل کیا، جس کے نتیجے میں وہ اس قابل ہوا کہ خیر و شر میں امتیاز کر سکے۔ یہاں علم سے حصول کے ساتھ ہی اس کی معصومیت ہاتھ سے جاتی رہی لیکن اس لغزش سے وہ اس قابل بھی ہوا کہ خیر و شر میں امتیاز کرے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس علم سے وہ جنت سے نکالا گیا تاکہ دنیا میں ٹھوکریں کھاتا اور بھٹکتا پھرے اور ابتلا و دکھ اس کا مقدر بن گئے۔ گوئٹے کا میفسٹو قرآنی تصور سے بہت ہم آہنگ نظر آتا ہے کیوں کہ شاعر مغرب نے اس کو 'لا' کا علمبردار قرار دیا ہے اور وہ خدا کے مقابل اپنا اثبات ایک غیر مذبذب "نہیں" سے کرتا ہے اور یہ جذبہ بغاوت اس کی خودپرستی کا نتیجہ ہے۔ اسی کبر کے نتیجے میں وہ خود کو آدم سے برتر سمجھتا ہے اور آدمی کی برتری کا انکار کرتا ہے۔ اب اپنے تجربے کی منزل میں جب اس کو آلام حیات سے سابقہ پڑتا ہے تو وہ بلا شبہ اس قابل ہوتا ہے کہ خیر و شر میں تمیز کرے لیکن اس کا علم ناکافی ہوتا ہے اور اس کا راستہ خطاؤں اور لغزشوں سے پٹا ہوتا ہے۔ اس کا علم اس کو دور تک نہیں لے جا سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ صرف علم کافی نہیں۔ علم تو ابلیس کو بھی تھا۔ اب اس کو دوسرے اصول کی ضرورت ہے اور وہ محبت ہے۔ خواہ وہ محبت جنس کی منزل پر اپنا اظہار کرے یا وہ ماورائی قوت کی حیثیت سے آدمی کو تباہی سے بچا کر نجات کا راستہ بتائے۔ یہاں بہرصورت وہ اجنبیت اور بیگانگی جو اس کے علم نے پیدا کی تھی، اس پر غلبہ پا لیتا ہے اور محبت کے واسطے سے وہ بالآخر خدا سے اپنا رشتہ پھر سے جوڑ لیتا ہے، لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لئے اس کو بڑے کٹھن اور صبر آزما دور سے گزرنا ہوتا ہے۔

فاؤسٹ میفسٹو کے بہکاوے میں ایسا کام کر جاتا ہے جس کا خمیازہ اس کو بھگتنا ہوتا

ہے۔ کیا تعجب کہ پہلا حصہ ایک حزنیہ کی شکل اختیار کرے اور فاؤسٹ گناہ میں آلودہ ہو جائے اور دکھ سے نجات کی کوئی صورت نظر نہ آئے۔

گوئٹے کے تصور خدا میں ایسے عناصر ملتے ہیں جو نظری سطح پر ہم آہنگ نہیں لیکن جو اس کے بنیادی اصول تخالف (Polarity) کی عکاسی کرتے ہیں' جو یکساں طور پر فکر اور وجود دونوں سطح پر کارفرما ہے۔ ایک طرف تو وہ اسپنوزا کے نام نہاد ہمہ اوستی فلسفے سے مسحور رہا اور اس کے نتیجے میں ایسے ماورائی خدا کا تصور جو باہر سے دنیا کو حرکت میں لاتا' متنفر رہا۔ خدا اور نیچر اب اس کے سامنے دو اجنبی قوتیں نہیں بلکہ خدا نیچر میں اور نیچر خدا میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اسپنوزا کے برعکس اس کا نیچر کا تصور اقلیدسی تصورات کے تابع نہیں بلکہ وہ ایک زندہ' متحرک اور متنفس حیات کو ظاہر کرتا ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہی ہیں کہ اس کا خدا کا تجربہ کسی نظریئے کی جو ہر صورت میں بقول اس کے بے رنگ ہوتا ہے' عکاسی نہیں کرتا کیوں کہ زندگی نظریئے کے مقابل ہری بھری ہوتی ہے۔ پھر بھی اس سطح پر ہم اس کو ہمہ اوستی کہیں تو اس کو ایک حیاتیاتی ہمہ اوستی نقطہ نظر کا ترجمان قرار دینا ہو گا جو شاعرانہ تخیل کے تحت پروان چڑھا ہے۔

ایک دوسری سطح پر گوئٹے ایسی صفت ربانی کی طرف رجوع ہوتا ہے جو مذہبی آگہی سے زیادہ قربت رکھتی ہے۔ "دیوان" کے یہ الفاظ ہم کو نامانوس نہیں' جہاں کہا گیا ہے "اگر اسلام سپردگی ہے خدا کے آگے' تو ہم سب جیتے بھی اسلام میں ہیں اور مرتے بھی اسلام میں" اور اس خوبصورت نظم میں جس کا عنوان "الوہیت" ہے وہ ایک نامعلوم اور برتر قوت کو سلام کرتا ہے' جس کا ہم صرف گمان کر سکتے ہیں "سلام ہو اس نامعلوم اور برتر وجود پر جو صرف ہمارے گمان میں آ سکتی ہے۔" اور گوئٹے نے اسی شعور غیب کا اظہار اس نظم میں کیا ہے جو Marienbader Elegie کے نام سے موسوم ہے(2)- جب وہ اپنی عمر کے آخری زمانے میں ایک نوخیز کی محبت میں گرفتار تھا جہاں وہ یہ کہتا ہے کہ ہمارے سینے میں ایک ایسا تلاطم بپا ہوتا ہے جس کے تحت ہم خوشی خوشی جذبہ احسان کے ساتھ ایک ایسی غیبی قوت کے سامنے سرنگوں ہوتے ہیں جو ہم سے برتر اور ہم سے زیادہ پاک ہے' جو بے نام ہی رہتی ہے اور اسی جذبے کا نام احساس قدس ہے۔

تصور الوہیت کی صوفیانہ آگہی سے قطع نظر گوئٹے نے صوفیانہ مزاج کو بھی اپنانے کی

کوشش کی ہے۔ چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ صوفی نہ صرف خواہشات کو ترک کرتا ہے بلکہ ترک تعلقات پر زور دیتا ہے' ترک دنیا اور ترک عقبیٰ اس کا شعار بن جاتے ہیں۔ گوئٹے کے "فاؤسٹ" میں بھی ہم کو اس کی گونج سنائی دیتی ہے۔ "چھوڑو' چھوڑو کنارہ کش ہو جاؤ۔" یہ ایسی صدا ہے جو ہر وقت آدمی کے کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔ گوئٹے نے اس کا اظہار اپنی سوانح عمری کے سولھویں باب میں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے "ہم کسی ایک جذبے سے ایک وقت دستبردار ہو جاتے ہیں لیکن دوسرے ہی لمحہ ایک دوسرے جذبے کو خود پر مسلط کر لیتے ہیں۔ ہم ایک جذبے کو دوسرے جذبے کی جگہ رکھ دیتے ہیں اور اس طرح مختلف مصروفیتیں' میلانات اور ہمہ قسم کے شوق کو یکے بعد دیگرے آزماتے رہتے ہیں۔ بالآخر معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ کھوکھلا ہے۔"

لیکن بہت کم ایسے لوگ ہوتے ہیں جو جزوی دستبرداری سے خود دستبردار ہو جاتے ہیں۔ ان کی دستبرداری کچھ جزوی نہیں ہوتی بلکہ کُلّی۔ وہ پھر ایسے تصورات کی طرف رجوع ہوتے ہیں جو دائمی ہیں' جن کو تغیر چھوتا تک نہیں' لیکن ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔

گوئٹے بلا شبہ صاحب عمل تھا جیسا کہ اس کی ساری زندگی سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ہر قسم کے کاموں میں مصروف رہتا۔ خواہ اس کا تعلق وائمار کے دربار سے ہو یا باہر کی دنیا سے۔ اور اس نے بقائے روح پر اپنے ایقان کو عمل پیہم کے واسطے حاصل کیا۔ وہ ایسی زندگی کا تصور نہیں کر سکتا تھا خواہ اس کا تعلق اس دنیا سے ہو یا اس دنیا سے' جہاں عمل کے لئے کوئی گنجائش نہ ہو۔ اقبال کا تصور بقائے روح بہت کچھ گوئٹے کا مرہون منت ہے گو کہ اقبال کا میدان عمل بہت محدود تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ہم یہ کبھی جان نہیں سکتے کہ زندگی کی ایک دوسری منزل پر عمل کی کیا نوعیت ہو گی۔ صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایں جہانی عمل اور آنجہانی عمل میں ایک مماثلت ضرور ہو گی گو کہ ان کی نوعیت جدا کیوں نہ ہو۔ بہرحال گوئٹے تو ایک شاعر تھا۔ وہ تخلیقی تخیل کی دنیا میں رہتا تھا اور عملیت پر اتنے اصرار کے باوجود دھیان و گیان کے لمحات سے ناآشنا نہ تھا۔ ایک لطیف نظم میں جس کا عنوان ہے:

"آنسوؤں سے تسلی" وہ ایسے آدمی کا نقشہ کھینچتا ہے جو چاندنی رات میں بیٹھا چاند پر نظر جمائے آنسو بہا رہا ہے۔ دوست احباب آتے اور دلاسا دینے کی کوشش کرتے اور یہ معلوم کرنا چاہتے کہ اس کے اضطراب کا سبب کیا ہے۔ اس کا جواب صرف اتنا ہے "دن تو کام کے

لئے ہے، تم مجھے اپنے حال پر چھوڑو اور رات میں تو رونے دو۔" اپنی خود نوشت سوانح میں تمنا کی خصوصیت یہ بیان کرتا ہے کہ اس کا مقصود ہمیشہ ناقابل رسا ہوتا ہے۔ یہ بات دل چسپی سے خالی نہیں کہ گوئٹے یہاں مولانا رومی کی صدائے بازگشت بن جاتا ہے:

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزو است

ہم نے اس سے پہلے دیکھا ہے کہ گوئٹے عمل کو کتنی اہمیت دیتا ہے، یہاں تک کہ اس نے انجیل یوحنا کے ترجمے میں کلمے کی جگہ عمل کو داخل کر دیا ہے۔ جہاں یہ لکھا تھا کہ "ابتدا میں کلمہ تھا" وہاں کلمہ کی جگہ لفظ عمل نے لے لی۔ عمل کی گوئٹے کے پاس اس سے کم مابعد الطبیعیاتی اہمیت نہیں جتنی کہ شٹے کی فکر میں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ گوئٹے عمل کو اخلاقی تحدیدات میں نہیں دیکھتا اور نہ کانٹ کے تصور عمل سے متاثر ہے جو بالکلیہ اخلاقی ہے اور جس کا منشا تکمیل فرائض ہے۔ جب عمل کا یہ ہمہ گیر تصور ہو تو تعجب نہیں کہ گوئٹے نے انسان کے عمل پیہم کی صلاحیت میں بقائے روح کی ضمانت دیکھی۔

گوئٹے کہتا ہے کہ "آدمی کے لئے بقائے روح کو ماننا ہی ہو گا۔ یہ اس کی تمنا ہے اور یہ اس کی فطرت کے عین مطابق بھی ہے۔ جب میں لگاتار کام کئے جاتا ہوں تو قدرت مجبور ہے کہ مجھ کو وجود کی دوسری صورت عطا کرے۔ ایسے وقت جب میں موجودہ صورت کو مزید سنبھالنے کے قابل نہ رہوں۔" اس کے نزدیک "مابعد الموت کی زندگی کی منزل ہمارے موجودہ عمل کے تسلسل ہی کی شکل میں تصور کی جا سکتی ہے۔ دائمی مسرت میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی، اگر وہ مجھے نئے مسائل اور نئی مشکلات کو عبور کرنے کے مواقع سے محروم کر دے۔" بقائے روح گوئٹے کے نزدیک ایسی حقیقت نہیں جس کا ہر شخص دعویدار ہو سکتا ہو بلکہ وہ صرف اپنے عمل کی قیمت پر منحصر ہوتی ہے۔ پھر وہ کہتا ہے کہ ہم ایک ہی شکل میں باقی نہیں رہتے۔ یہاں اقبال کے نقطہ نظر کی گوئٹے سے مماثلت بالکل بیّن ہے کیوں کہ اقبال کے نزدیک بھی آدمی بقا کا صرف امیدوار ہے، وہ دعوے دار نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ اقبال اپنے خیالات میں یہاں پیر مغرب کے افکار سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں "عمل ہی سے آدمی تخریب ذات کی مزاحمت کر سکتا ہے اور مستقبل کے لئے اپنے کو تیار کر سکتا ہے۔ شخصی بقائے روح ہمارا حق نہیں۔ وہ شخصی جدوجہد ہی سے حاصل ہو سکتی

ہے۔ آدمی تو بس اس کا امیدوار قرار دیا جا سکتا ہے۔" (خطبات صفحہ 119) لیکن جیسا کہ فلسفہ مغرب کے مشہور مورخ ونڈل بانٹ (Windelband) نے اس سلسلے میں وضاحت کی ہے "شخصیت کے تحفظ کا دار و مدار صرف عمل پر نہیں ہوتا بلکہ نیت پر بھی ہوتا ہے۔" گوئٹے خود کہتا ہے' صرف حسن عمل ہی نہیں' Verdienst بلکہ نیت کی استواری بھی تحفظ شخصیت کے لئے ضروری ہے۔ آخر عمر میں بقائے شخصیت کے ایقان نے گوئٹے کے ذہن میں زیادہ قطعیت اختیار کی تھی' جیسا کہ اس کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے: "جب آدمی پچھتر سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ موت پر دھیان نہ دے۔ مجھے اس کا خیال بالکل مضطرب نہیں کرتا کیوں کہ اس کا پورا ایقان ہے کہ ہماری روح ایسی ذات ہے جو ناقابل تخریب ہے اور وہ ازل تا ابد برسر عمل رہتی ہے' اس کی مثال آفتاب کی ہے جو صرف دنیاوی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے لیکن اصل میں وہ کبھی ڈوبتا نہیں بلکہ بلا انقطاع تسلسل فروزاں ہی رہتا ہے۔" (صفحہ 18)

Eckermann : Gespraeche mit Goethe.

F. A. Brockhaus, Wiesbaden, 1859. p. 18

گوئٹے کی فکر کی یہ خصوصیت جس سے وہ ایک جہت سے دوسری جہت کی طرف بہ آسانی رجوع ہوتا ہو' اس سے بخوبی عیاں ہوتی ہے کہ وہ ایک طرف تو عمل کو بہت سراہتا ہے اور دوسری طرف آخر عمر میں سکون کی بھی قدر و قیمت سے بے گانہ نہیں رہا۔ اس نے ایک پُراثر چھوٹی سی نظم چھوڑی ہے جس کا عنوان ہے "رہ نورد کا نغمہ شب" جہاں یہ خیالات ملتے ہیں "آہ میں تگ و دو سے تھک گیا ہوں۔ آخر اس تمام کرب و مسرت کا کیا مطلب ہے۔ اب تو سکون آ جائے اور میرے سینے میں سما جائے۔" یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ایسے زمانے میں یہ نظم لکھی گئی جب وہ سراپا جدوجہد تھا۔ یہ نظم ایک شکارگاہ کے دو منزلہ چوبی مکان کی دیوار پر 1780ء میں لکھی تھی اور پھر جب اپنی بیاسویں سال گرہ خاموشی سے منانے کا اسے خیال ہوا' تو اسی مقام پر اس کا گزر ہوا اور اپنی اس نظم کو دیکھ کر بے ساختہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح شباب کے زمانے سے ہی ایک عمل کا ولولہ اسے مضطرب رکھتا ہے تو دوسری طرف سکون کی طلب اس کے اندر جاگزیں تھی۔

گناہ، ابتلا اور نجات مذہبی شعور کے اہم اجزا رہے ہیں۔ گوئٹے کے "فاؤسٹ" میں بھی ان مذہبی لمحات کا غالب حصہ رہا ہے اور 'کیا ہے' اور 'کیا چاہئے' کی کشمکش اس کے ڈرامائی احاطہ فکر میں نمایاں ہے۔ یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کانٹ کی طرح گوئٹے کے تصور میں دنیا کی خصوصیت یہ ہے کہ جو ہونا نہ چاہئے وہ ہوتا ہے اور ہماری زندگی اسی دنیا میں گزرتی ہے لیکن جب جو نہیں چاہئے وہ ہوتا ہے تو انسان پر یاس کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی انسانی کوششوں کی ناتمامیوں کی آگہی کے ساتھ ہماری فکر ایک نیا رخ اختیار کرتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ شر بھی خدا کے ہاتھ میں ایک ایسا آلہ بن جاتا ہے جس کے ذریعے خیر غلبہ پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے حصے میں شر کا غلبہ ہے اور دوسرے حصے میں رحمت الٰہی برسر عمل ہو جاتی ہے اور اپنے سہارے سے انسان کی نجات کی ضامن ہوتی ہے۔ جب پہلے حصے میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ آدمی نے سب کچھ کھو دیا اور شیطانی قوت غالب آگئی تو دوسرے حصے میں اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔ قرآن حکیم میں بھی اس سیاق میں "مکر" کا بہت ہی معنی خیز لفظ استعمال کیا گیا ہے اور خدا کو "خیرالماکرین" کہا ہے۔ اس تصور کو اگر اس کے پس منظر میں نہ رکھا جائے تو بہت بڑی غلط فہمی کا باعث ہو سکتا ہے۔ مکر اصل میں خدا کی حکمت عملی ہے جو شیطان کی چال کو اسی کی چال کے ذریعے ناکام بناتی ہے۔ آدمی اسی وقت آگے بڑھتا ہے جب وہ دکھ اور مصیبت کے ساتھ آگے بڑھے۔ یا یوں کہو کہ جنت کا راستہ دوزخ سے گزرتا ہے اور دوزخ بھی اب تزکیہ نفس کے راستے میں ایک منزل کا کام دیتی ہے۔ فاؤسٹ کے تعلق سے یہاں ہم کو یاد رکھنا ہو گا کہ گناہ خدا کی نافرمانی کا عالم ایزدی کے خلاف کوئی بغاوت کی شکل اختیار نہیں کرتا ہے۔ ایسی بغاوت جو ازل میں آدمی کے سقوط کا باعث بنی۔ یہاں تو انسانی جذبے کی ہماہمی ہے جو اپنی جگہ تو بالکل جائز لیکن حالات کا شکار ہو جاتی ہے اور رسوم و رواج کی مزاحمت کی بنا پر اپنا واجبی مقام حاصل نہیں کر سکتی۔ اسی لئے اس سے ایسے اعمال سرزد ہو جاتے ہیں جن سے اخلاقی اوامر کی نفی ہوتی ہے۔ اس طرح ایک المیہ بنتا ہے۔ دراصل جس کو ہم المیہ کہتے ہیں وہ کسی ایک شخص واحد کی موت سے نہیں بنتا بلکہ اس موت سے جس کو ہم اپنے ذہن میں ناحق اور ناواجبی سمجھتے ہیں۔ وہ عالم غیب کے فیصلوں کے خلاف ناراضگی (Resentment) کے جذبے کی انسان میں تحریک پیدا کرتی ہے۔ یہاں یہ محسوس ہوتا ہے کہ جن کو مرنا ہے وہ مرتے نہیں، جن کو جینا ہے وہ جیتے

نہیں۔ اسی بنا پر پہلے حصے میں جو حزنیہ حالات اور اخلاقی تقاضوں کی عدم ہم آہنگی سے پیدا ہوتا ہے' وہ دوسرے حصے میں اپنی کوششوں سے نہیں بلکہ فضل الٰہی کی مداخلت سے انسانی نجات کا باعث بنتا ہے۔

فاؤسٹ کی نجات ہو جاتی ہے اور شر کی قوتیں اس پر غلبہ پا نہیں سکتیں کیوں کہ گوئٹے کے نزدیک "جب آدمی سعی پیہم میں لگا رہتا ہے اور محبت کا غیبی فیضان اس کے دل کو فروزاں کرتا ہے تو سعادت سرمدی اس کے حصے میں آئے بغیر رہ نہیں سکتی۔" اور حزنیہ ربانی طربیہ (Divine Comedy) میں بدل جاتا ہے۔ گوئٹے نے اپنے آخری زمانے میں ایکرمان سے بات چیت کرتے ہوئے کہا تھا کہ "یہ تصور ہمارے مذہبی تصورات سے بالکل ہم آہنگ ہے کیوں کہ ان کے مطابق صرف ہم اپنی کوششوں سے ابدی سعادت پا نہیں سکتے جب تک کہ رحمت الٰہی شامل نہ ہو۔"

صوفیانہ شعور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ وقتی لمحات میں ابدیت کا سراغ لگاتا ہے۔ گوئٹے نے لمحے میں ابدیت کو پایا' تغیر میں ثبات کو۔ اس کے نزدیک شعور و لاشعور دو ایسی حالتیں نہیں رہیں جن میں سے ایک کا ہونا دوسرے کو کالعدم کرتا ہو بلکہ وہ ایک دوسرے میں مل کر ایک ایسی حالت بھی پیدا کرتی ہیں جس کو اس نے لاشعوری شعور کا نام دیا ہے۔ یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ کس طرح شاعر نے لمحہ (Augenblick) میں ابدیت کو دیکھا۔ لمحہ تسلسلی زماں کے ایک جزو کی حیثیت سے یا ایک آن (Instant) کی حیثیت سے گزر جاتا ہے' لیکن اس لمحے کی قیمت جوں کی توں رہتی ہے اور وہ گم نہیں ہوتی۔ ہر آن میں یہ ضروری نہیں کہ کوئی قیمت پنہاں ہو لیکن جو لمحہ قیمتی یا قدر بردار ہوتا ہے وہ وقتی نہیں ہوتا بلکہ فیصلہ کن اہمیت (Momentous) رکھتا ہے۔ اسی طرح سے وہ ایک معنی خیز نظم میں جس کا عنوان "ورثہ" ہے' بہت خوبصورتی سے کہتا ہے "ماضی میں نکاؤ ہے' مستقبل پیش بیں نظر میں زندہ ہے' لمحہ حاضر خود ابدیت ہے۔" اس لئے گوئٹے کے نزدیک ماضی و حال دونوں میں ایسی خصوصیت ہے جو گزرتی نہیں' گو ہم گزر جاتے ہیں۔

غیب و شہود کے مابین حرکت دائم جو حافظ کا حصہ ہے اور جس میں ریوکرٹ نے حافظ کی کشش کا راز دیکھا ہے' وہ صرف شاعرانہ تخیل کا پیدا کردہ نہیں بلکہ اس ایقان کا نتیجہ ہے کہ عالمِ ظاہر عالمِ غیب میں پیوست ہے اور ایک کا دوسرے میں پیوست ہونا انسانی جذبے کی

زبان میں بخوبی اظہار پاتا ہے۔ مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی جدائی کے کرب و شوق اور وصل کے اضطراب سے شروع ہوتی ہے۔ ایسا وصل جو کبھی حقیقت تھا اب فراق میں تبدیل ہو گیا ہے۔ صوفیانہ جذبہ تو یہ ہے کہ محبت میں خود کو کھونے سے آدمی کھو نہیں جاتا بلکہ کھو کر خود کو پاتا ہے اور ایک نئی شخصیت سے سرفراز ہوتا ہے۔ اسی تاثر کا اظہار گوئٹے نے ایرانی صوفی شاعروں سے ماخوذ تمثالات سے دیا ہے۔ یہ ایک پروانے کی موت ہے جو وہ شمع کی لَو پر والہانہ گر کر ایک نئی زندگی حاصل کرتا ہے۔ ایک بے پایاں شوق اس کو اس پر مجبور کرتا ہے کہ اپنے کو جلا ڈالے۔ موت کے واسطے ہی سے موت پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ بقول گوئٹے یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ صرف حکمت والے ہی اس کو جان سکتے ہیں کہ موت کی قربانی سے زندگی کیوں کر حاصل ہوتی ہے اور کس طرح مر کر ہم ایک حیات برتر کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ ابتلا اور کرب سے ہی ہم زماں کے راستے سے گزر کر ماورا کی طرف پہنچ سکتے ہیں۔ گوئٹے کے نزدیک "جب تک تم میں یہ ولولہ نہ ہو کہ مرو اور نئی زندگی کے مستحق بنو تب تک تمہاری حیثیت اس زمین پر ایک مہمان حزیں کی ہو گی۔"

بلاشبہ گوئٹے کا یہ ایقان کہ کثرت مظاہرہ کو وحدت تھامے ہوئے ہے' اس کا سب سے خوبصورت اظہار ایک نظم میں جو اس کے "دیوان" میں شامل ہے' ملتا ہے اور جو صوفیانہ رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ اس کے دو بندوں کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

"سرو کی شباب یافتہ بالیدگی میں اے بالا قامت حسین میں تجھی کو دیکھتا ہوں اور جھیل کی پاکیزہ موجوں میں اے خوبرو میں تجھ ہی کو پاتا ہوں۔"

"جو کچھ میں جانتا ہوں ظاہر سے اور جو کچھ میں پہچانتا ہوں باطن سے۔ اے معلم باکمال تیرے ہی واسطے جانتا ہوں اور جب میں اللہ کے سو ناموں کا ذکر کرتا ہوں' ہر ایک نام میں تیری ہی گونج سنتا ہوں۔"

یہاں مجاز و حقیقت کچھ اس طرح پیوست ہو گئے ہیں کہ بے ساختہ حافظ کی یاد آتی ہے جس نے کہا تھا:

ندیم و مطرب و ساقی ہمہ اوست
خیال آب و گل در رہ بہانہ

گوئٹے نے خالص مشرقی انداز کو اپنی ایسی نظموں میں بھی نباہا ہے جو اس کے "مشرقی'

مغربی دیوان" کے احاطے سے باہر ہے مثلاً اس کی ایک نہایت خوبصورت نظم کا عنوان ہے "قربت محبوب"۔ اگر یہ نظم خواجہ حافظ کی یا کسی دوسرے فارسی شاعر کی ہوتی تو اس کی تعبیر میں مجاز سے زیادہ حقیقت کا گمان ہوتا۔ کیا معلوم گوئٹے کے شعور میں حقیقت و مجاز کا یہ امتزاج ہمیشہ رہا ہو۔ اس نظم میں اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ نیچر کے مختلف مناظر مجھے اپنے محبوب ہی کی یاد دلاتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے :

"مجھے تیرا ہی خیال آتا ہے جب سورج کی کرنیں دریا میں منعکس ہوتی ہیں۔ مجھے تیرا ہی خیال آتا ہے جب چاند کی جھلملاہٹ چشموں میں نقش کاری کرتی ہے' مجھے تیرا ہی خیال آتا ہے جب راستے میں خاک اڑتی دکھائی دیتی ہے' مجھے تیرا ہی خیال آتا ہے جب اندھیری رات میں کسی تنگ پگڈنڈی پر راہرو کے قدم لڑکھڑاتے ہیں اور میں تجھ ہی کو سنتا ہوں جب موجیں شور کرتی اٹھتی ہیں۔ ہاں جب سارا عالم سوتا ہے تو میں تیری آواز سننے کے لئے صحرا کا رخ کرتا ہوں' میں تیرے ہی پاس ہوں خواہ تو کتنا ہی دور کیوں نہ ہو' سورج اب ڈوبنے کو ہے اور تارے جلد چمکنے کو ہیں' کاش تو یہاں ہوتا۔"

آخر میں ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ گوئٹے کا وہ نقش حیات جو اس نے اپنے ذہن میں قائم کیا تھا' کسی بندھے ہوئے نظام میں مقید نہیں کیا جا سکتا اور نہ وہ فکر کے روایتی تصورات و تعقلات میں اپنا اظہار پا سکتا ہے۔ اگر اس کے بعض شاعرانہ تخلیقات ایسی صوفیت کی غمازی کرتے ہیں' جن کا محور ہمہ اوستی ہے تو اس کے پاس کچھ تخیلات بھی ہیں جو کچھ کم اہم نہیں اور جن سے ایک ایسے فعالی نظریہ حیات کی عکاسی ہوتی ہے' جہاں شخصیت کو بہت سراہا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ شخصیت کا حصول ہی فرزندان ارض کی اعلیٰ ترین مسرت کا ضامن ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے پاس ایسے تخیلات بھی ملتے ہیں جن سے ایسی ماورائی اور غیبی قوت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے جو ہمیشہ بے نام رہے گی۔ خود ایک فارسی شاعر نے کہا ہے :

بنام او کہ آں نامے ندارد
زہرنامے کہ خوانی سربرآرد

ہم نے تو گوئٹے کی ہمہ جہتی شخصیت کے اس پہلو کو اپنے مقالے کا موضوع بنایا ہے جو

خود ہمارے صوفیانہ شعور زیست سے قریب ہے۔ بلا شبہ گوئٹے کی صوفیانہ آگہی کا سب سے اکمل اظہار ان سطور میں ملتا ہے جو "فاؤسٹ" کے آخر میں درج ہیں اور جن کا مرکزی خیال یہ ہے۔ ہر آنی جانی مٹنے والی چیز اس حقیقت کی ایک مثال ہے جو خود انمٹ ہے۔

حواشی

1. ڈاکٹر سید عابد حسین نے اپنے ترجمے "فاؤسٹ" میں لکھا ہے کہ میفسٹوکلیز (Mephistocles) ابلیس نہیں ہے بلکہ اس کا نائب ہے اور اس لئے اس کو انہوں نے شیطان کا نام دیا ہے تاکہ ابلیس سے امتیاز ہو سکے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ سرچشمہ شر نہیں ہے بلکہ شر کی ایک جہت کو ظاہر کرتا ہے جس کا تعلق انکار محض سے ہے لیکن گوئٹے نے اس کو ایسی انفرادیت بخشی ہے کہ اسی کے نام سے اس کو موسوم کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے ہم نے اصل نام برقرار رکھا ہے۔ میفسٹو اسی کے نام کا مخفف ہے۔

2. جب گوئٹے نے کچھ دن کے لئے جرمنی کے ایک شہر مارین باد میں قیام کیا تو اس کا سامنا ایک سترہ سالہ لڑکی الرکے (Ulrike) سے ہوا۔ اس کی محبت نے اس کو بقول شاعر "در ورطہ سودا نہاد"۔ اگر وہ مجاز میں حقیقت کا پہلو ڈھونڈ نہیں نکالتا اور اپنی شاعرانہ تخلیق کا سہارا نہیں لیتا تو ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتا۔ اسی بھونچالی تجربے کا نتیجہ وہ لافانی نظم ہے جس کا ایک بند اوپر نقل ہوا ہے۔ یہ نظم ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے: "جب درد والم سے آدمی کو چپ لگ جاتی ہے تو خدا نے مجھے اس حالت میں وہ قوت عطا کی کہ میں کہہ سکوں جو مجھ پر بیت رہی ہے۔" اس وقت گوئٹے کی عمر چوہتر سال کی تھی۔

(حکمت گوئٹے اور فکر اقبال از پروفیسر وحید الدین، سری نگر: اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی 1984ء، ص 5-32)

جگن ناتھ آزاد

اقبال اور گوئٹے

گوئٹے کا زمانہ اٹھارویں صدی کا زمانہ تھا اور یہ وہ دور تھا جب سارے یورپ میں عقلیت اور استدلال کے ہاتھوں مذہب کی دھجیاں اڑائی جا رہی تھیں۔ عقلیت پسندی کا یہ طوفان دراصل ایک منفی نوعیت کا طوفان تھا اور یہ ایک تعصب کے رد عمل کے طور پر ظہور پذیر ہوا تھا۔

عقلیت پسندی کے اس طوفان کے مقابلے میں دو فلسفی کانٹ (1724ء - 1804ء) اور روسو (1712ء - 1778ء) کہسار بن کے ابھرے۔ کانٹ کے بارے میں تو اقبال کا یہ فقرہ کہ اس کی کتاب نے استدلالیوں کے سارے کام کو ملیا میٹ کر دیا' پہلے ہی نقل کیا جا چکا ہے۔ روسو کا کارنامہ بھی کچھ کم وقیع نہیں۔ اس نے بھی استدلال کے مقابلے میں وجدانی یقین کی برتری کا احساس دلایا اور یہ نقطہ نگاہ پیش کیا کہ یورپ کا جدید ترین تمدن ہی جسے سائنسی ترقی پر بڑا ناز ہے' یورپ کے تمام دکھوں اور مسائل کی جڑ ہے۔ اس لئے بچاؤ کا واحد راستہ یہی ہے کہ انسان فطرت کو واپس لوٹے۔ انسان فطرتاً" آزاد اور امن پسند واقع ہوا ہے' لیکن اس نے شہری تہذیب کی زنجیروں میں اپنے آپ کو جکڑ کر اپنی زندگی کو وبال بنا لیا ہے۔

گوئٹے روسو کے اس نظریئے سے بہت متاثر ہوا اور اس نظریئے کے ساتھ ہی ساتھ جرمنی میں جو رومانی تحریک چلی تھی' گوئٹے اس میں شامل ہو گیا۔ رومانی تحریک نے وجدانی یقین' جذبے اور احساس کی شدت پر زور دیا۔ اس تحریک کا مقصد دراصل جذبے اور شدت

احساس کے ذریعے سے انسان کے لئے تہذیبی اور سماجی بندھنوں سے آزادی حاصل کرنا تھا' لیکن سماجی بندھنوں سے آزادی انسان کے لئے خطرناک بھی تو ثابت ہو سکتی ہے۔

دہر میں عیش دوام آئیں کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامان شیون ہو گئیں

گوئٹے پر یہ نکتہ فاش ہوا تو اس نے رومانی تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی اور آزادی فطرت کے عوض قوانین فطرت کی جانب راغب ہوا اور اسے اس پابندی ہی میں انسانی سربلندی نظر آئی۔ اس سلسلے میں وہ یونانیوں کے فن سنگ تراشی سے بہت متاثر ہوا' جس میں فطرت کے ازلی ضابطے کی ایک طرح سے پابندی موجود تھی۔ اس کے خیال میں عیسائیت کی اخلاقی تہذیب اور قدیم جمالیاتی تہذیب کے امتزاج کی بدولت محدود قومیت سے بلند تر عالمگیر انسانیت کا جو احساس پیدا ہوتا ہے' اسے دنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں کو اپنی منزل مقصود بنانا چاہیے۔

گوئٹے کی یہ ذہنی کشمکش اس کے ڈرامے "فاؤسٹ" میں موجود ہے۔ ڈرامے کے شروع میں فاؤسٹ ایک عظیم عالم کی حیثیت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ فاؤسٹ اپنی ساری توجہ علم کی تحصیل میں صرف کرتا ہے' لیکن اس کا دل نامطمئن رہتا ہے۔ وہ عشق اور فطرت کے حسن سے بے خبر ہے۔ تمام عمر وہ علم ہی کے ذریعے سے فطرت کے راز جاننے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے' لیکن اس کی یہ کوشش رائیگاں جاتی ہے۔ آخرکار فاؤسٹ پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ محض علم اور عقل کی بدولت انسان حقیقت کو نہیں پا سکتا۔ یہ اصل میں عقلیت پسندی کے خلاف گوئٹے کے اپنے دور کی بغاوت ہے' جو اس نے فاؤسٹ کی شخصیت میں پیش کی ہے۔

فاؤسٹ کو ایک ایسی زندگی کی تلاش تھی جو محض خیالی تصورات کا مرقع نہ ہو۔ اور جس میں وہ فقط سوچتا ہی نہ رہے' بلکہ احساس مروت حاصل کرے اور ذہنی طور پر اطمینان سے رہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ اول اول جادو کا سہارا لیتا ہے اور اس میں کسی حد تک اپنے لئے تسکین کا سامان پاتا ہے' لیکن یہ تسکین عارضی ثابت ہوتی ہے۔ پھر وہ روح ارضی کو بلاتا ہے' لیکن اس کی ناپختگی کے باعث روح ارضی اس سے کنارہ کر جاتی ہے۔ چنانچہ وہ ناامید ہو کر مرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ وہ محض ایک کیڑے کی زندگی بسر نہیں

کرنا چاہتا اور کہتا ہے کہ ایک حقیر زندگی بسر کرنے سے تو مر جانا بہتر ہے' لیکن ایسٹر کی ایک صبح اس کے دل میں محبت اور گداز کے خوابیدہ سوتوں کو بیدار کر دیتی ہے اور وہ اس حقیقت کو پا لینے کے لئے جو ساری دنیا پر حکمران ہے' بیتاب ہو جاتا ہے اور اس خیال سے کہ وہ اس حقیقت کو نہیں پا سکتا' وہ ایک بار پھر مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی عالم میں وہ بائیبل کا سہارا لیتا ہے اور اس میں پڑھتا ہے۔

"ابتدا میں کلام تھا۔ کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام ہی خدا تھا۔"

یہ پڑھتے ہی وہ اس فکر میں غرق ہو جاتا ہے کہ کیا لفظ "کلام" صحیح طور پر "کلام الٰہی" کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ چنانچہ لفظ "کلام" کو موزوں نہ پا کر وہ اس کی جگہ "خیال" یا "قوت" کا لفظ رکھنا چاہتا ہے اور انجام کار اس کی جگہ "عمل" کا لفظ رکھ دیتا ہے اور یوں پڑھتا ہے۔

"ابتدا میں عمل تھا۔ عمل خدا کے ساتھ تھا اور عمل ہی خدا تھا۔"

اقبال کے نزدیک فاؤسٹ کا یہ انداز فکر دراصل قدیم ہندو حکما کے نظریہ عمل ہی کا پرتو ہے۔ اپنے اس خیال کی وضاحت کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں:

"ہندو قوم کے دل و دماغ میں عملیات اور نظریات کی ایک عجیب طریق سے آمیزش ہوتی ہے۔ اس قوم کے موشگاف حکما نے قوت عمل کی حقیقت پر نہایت دقیق بحث کی ہے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انا کی حیات کا یہ مشہود تسلسل جو تمام آلام و مصائب کی جڑ ہے' عمل سے متعین ہوتا ہے یا یوں کہئے کہ انسانی انا کی موجودہ کیفیات اور لوازمات اس کے گزشتہ طریق عمل کا لازمی نتیجہ ہیں اور جب تک یہ قانون عمل کرتا رہے گا' وہی نتائج پیدا ہوتے رہیں گے۔ انیسویں صدی کے مشہور جرمن شاعر کا ہیرو فاؤسٹ جب انجیل یوحنا کی پہلی آیت میں لفظ "کلام" کی جگہ لفظ "عمل" پڑھتا ہے۔

"ابتدا میں کلام تھا' کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام ہی خدا تھا" تو حقیقت میں اس کی دقیقہ رس نگاہ اسی "نکتہ" کو دیکھتی ہے' جس کو ہندو حکما نے تقدیر کی مطلق العنانی اور انسانی حریت اور بالفاظ دیگر جبر و اختیار کی گتھی کو سلجھایا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ فلسفیانہ لحاظ سے ان کی جدت طرازی داد و تحسین کی مستحق ہے اور بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ ایک بہت بڑی اخلاقی جرأت کے ساتھ ان تمام فلسفیانہ نتائج کو بھی قبول کرتے ہیں جو اس قضیے سے پیدا ہوتے ہیں یعنی یہ کہ جب انا کا تعین عمل سے ہے' تو انا کے پھندے سے نکلنے کا

ایک ہی طریق ہے اور وہ ترک عمل ہے۔ یہ نتیجہ انفرادی اور ملّی پہلو سے نہایت خطرناک تھا اور اس بات کا مقتضی تھا کہ کوئی مجدد پیدا ہو' جو ترک عمل کے اصل مفہوم کو واضح کرے۔ بنی نوع انسان کی تاریخ میں شری کرشن کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائے گا کہ اس عظیم الشان انسان نے ایک نہایت دلفریب پیرائے میں اپنے ملک اور قوم کی فلسفیانہ روایات کی تنقید کی اور اس حقیقت کو آشکار کیا کہ ترک عمل سے مراد ترک کُلّی نہیں ہے کیونکہ عمل اقتضائے فطرت ہے اور اسی سے زندگی کا استحکام ہے' بلکہ ترک عمل سے مراد یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتائج سے متعلق دل بستگی نہ ہو۔ شری کرشن کے بعد شری رام نوج بھی اسی راستے پر چلے' مگر افسوس ہے کہ جس عروس معنی کو شری کرشن اور شری رام نوج بھی بے نقاب کرنا چاہتے تھے' شری شنکر کے منطقی طلسم نے اسے پھر محجوب کر دیا اور شری کرشن کی قوم ان کی تجدید کے ثمر سے محروم ہو گئی۔"

فاؤسٹ دراصل عمل ہی کو حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ بناتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ گوئٹے کے نزدیک کائنات میں ایک ابدی حسن کارفرما ہے' جو انسان کو مادی زندگی کی پستیوں سے روحانی زندگی کی بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ ان روحانی بلندیوں کی جھلک سچے عاشق کو اپنی محبوبہ میں نظر آتی ہے۔ فاؤسٹ کے کردار کے ذریعے سے گوئٹے نے یہ بات اپنے قاری کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ اگر انسان ابلیس کے زیر اثر پست نفسیاتی خواہشات میں الجھ کر نہ رہ جائے' تو وہ اس مجازی عشق کے ذریعے سے عشق حقیقی تک پہنچ سکتا ہے۔ اقبال کے یہاں بھی ابلیس کا تصور گوئٹے کے تصور ابلیس سے مختلف نہیں۔ آدم کی پیدائش کو گوئٹے کا میفسٹو اور اقبال کا ابلیس دونوں ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔ میفسٹو فاؤسٹ کو اپنے دام فریب میں الجھا کر اسے جادو کی شراب پلاتا ہے' جس کے اثر سے فاؤسٹ جوان ہو جاتا ہے اور جادوگروں کے معمل میں ایک حسین و جمیل دوشیزہ پر عاشق ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد فاؤسٹ گرجا گھر سے واپس آتی ہوئی لڑکی گر یٹشن کو اپنا دل دے بیٹھتا ہے۔ گر یٹشن اس پر دل و جان سے فدا ہو جاتی ہے۔ فاؤسٹ گر یٹشن کی ماں کو اپنے رستے سے ہٹانے کے لئے اسے گر یٹشن ہی کے ہاتھ سے زہر کھلوا دیتا ہے اور میفسٹو کے ساتھ مل کر اس کے بھائی کو قتل کر دیتا ہے۔ گر یٹشن اپنے نوزائیدہ بچے کو تالاب میں غرق کر دیتی ہے اور اسے اس جرم میں قید کر دیا جاتا ہے۔ جیل خانے میں وہ اپنی موت کا

انتظار کرتی ہے۔ گوئٹے نے اس ساری تفصیل میں میفسٹو کا کردار اور آدم کے ساتھ اس کا تعلق انتہائی فن کارانہ طریقے سے بیان کیا ہے۔ انسان کی تخلیق گوئٹے کے میفسٹو اور اقبال کے ابلیس دونوں کو ناگوار ہے۔ نظم "تسخیر فطرت" کا حصہ بہ عنوان "انکار ابلیس"(1) اقبال کے نظریہ ابلیس کے اسی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔

گوئٹے کے مذکورہ ڈراما "فاؤسٹ" کا اقبال کی نظر میں کیا مقام ہے۔ یہ "پیام مشرق" کی نظم "جلال و گوئٹے" سے ظاہر ہے۔ اس میں گوئٹے کے کمال فن کا اعتراف رومی کرتے ہیں۔ کسی فنکار کے اعتراف فن کا یہ انداز اعتراف کرنے والے کی اپنی عظمت کی دلیل ہے اور یہ انداز ہمیں اقبال کے یہاں اکثر نظر آتا ہے(2)- اس مختصر سی نظم کا انتخاب شاید اس کے تاثر کو کم کر دے، اس لئے یہ مکمل صورت میں یہاں پیش کی جا رہی ہے۔

نکتہ دان المنی را در ارم(3)
صحبتے افتاد با پیر عجم
شاعرے کو ہمچو آں عالی جناب
نیست پیغمبر ولے دارد کتاب(4)
خواند بر دانائے اسرار قدیم
قصہ پیمان ابلیس و حکیم(5)
گفت رومی اے سخن را جاں نگار
تو ملک صید استی و یزداں شکار(6)
فکر تو در کنج دل خلوت گزید
ایں جہاں کہنہ را باز آفرید
سوز و ساز جاں بہ پیکر دیدۂ
در صدف تعمیر گوہر دیدۂ
ہر کسے از رمز عشق آگاہ نیست
ہر کسے شایان ایں درگاہ نیست
داند آں کو نیک بخت و محرم است
زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است (رومی)

اس نظم کے ساتھ ہی گوئٹے کے ڈراما "فاؤسٹ" کا نثر میں ذکر کرتے ہوئے آپ کہتے ہیں:

"اس ڈرامے میں شاعر نے حکیم فوسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کے امکانی نشو و نما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمال فن خیال میں نہیں آ سکتا۔"

یہ اقبال کی طرف سے گوئٹے کے اعتراف فن کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ انہوں نے گوئٹے کے دیوان کے جواب میں "پیام مشرق" لکھی اور اس میں نظم و نثر دونوں میں گوئٹے کی شاعری کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس خراج تحسین میں انہوں نے گوئٹے کے ساتھ اپنی فکری مماثلت کا ذکر بڑے والہانہ انداز سے کیا ہے اور اس فرق کو بھی نظر انداز نہیں کیا جو انہیں اپنے اور گوئٹے کے ماحول میں نظر آیا:

پیر مغرب شاعر المانوی
آں قتیل شیوہ ہائے پہلوی
بست نقش شاہدان شوخ و شنگ
داد مشرق را سلامے از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغام شرق
ماہ تابے ریختم بر شام شرق
تا شناسائے خودم خودبیں نیم
با تو گویم او کہ بود و من کیم
او ز افرنگی جواناں مثل برق
شعلہ من از دم پیران شرق
او چو بلبل در چمن "فردوس گوش"
من بہ صحرا چوں جرس گرم خروش
ہر دو دانائے ضمیر کائنات
ہر دو پیغام حیات اندر ممات

ہر دو خنجر صبح خند، آئینہ فام
او برہنہ، من ہنوز اندر نیام
ہر دو گوہر ارجمند و تابدار
زادہ دریائے ناپیدا کنار
اوز شوخی در تہ قلزم تپید
تا گریبان صدف را بر درید
من بہ آغوش صدف تا بم ہنوز
در ضمیر بحر نایابم ہنوز

اور اگرچہ انہوں نے قدم قدم پر اپنے نظریات مغربی مفکرین کے مقابلے میں پیش کئے ہیں اور مغربی فلسفے کو فرنگی شیشہ گری اور فرنگی بتکدہ وغیرہ کے نام سے یاد کرتے ہوئے جا بجا فلسفہ مغرب کی نارسائی کی طرف اشارے کئے ہیں مثلاً

مے از میخانہ مغرب چشیدم
بجان من کہ درد سر خریدم
شتم بانکویان فرنگی
ازان بے سوز تر روزے ندیدم

یا

کہا اقبال نے شیخ حرم سے
تہ محراب مسجد سو گیا کون
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون

یا

اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں
سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

یا

پڑھ لئے میں نے علوم شرق و غرب

روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

لیکن مغربی علم فکر و فن کے چشموں سے انہوں نے اپنی پیاس بجھائی ہے۔ ان کا ذکر بڑی کشادہ دلی اور احسان مندانہ انداز سے کیا ہے :

خرد افروز مرا درس حکیمان فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظراں

ابھی اقبال کی طالب علمی کا زمانہ تھا کہ پروفیسر آرنلڈ جو گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے استاد تھے' ملازمت سے سبکدوش ہو کر واپس لندن چلے گئے۔ اقبال کے دل میں انہوں نے جو ذوق علم کا بیج بویا تھا' وہ ابھی تک پوری طرح برگ و بار نہیں لایا تھا۔ اقبال کو اس بات کاشدت سے احساس تھا کہ پروفیسر آرنلڈ کے چلے جانے سے ان کا علم فلسفہ مغرب ادھورا رہ گیا ہے۔ چنانچہ اپنے اس درد و کرب کا اظہار آپ نے اس نظم میں کیا جو انہوں نے آرنلڈ کی یاد میں "نالۂ فراق" کے عنوان سے کہی۔

ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا
آئینہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا
نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو تھا
آہ! کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا

ابر رحمت دامن از گلزار من برچید و رفت
اندکے برغنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

طالب علم کی یہ خواہش انہیں کسی پہلو قرار نہیں لینے دیتی' چنانچہ پروفیسر آرنلڈ کو کلیم ذروۂ سینائے علم کہنے کے بعد تحصیل علم کا ذوق یوں بیان کرتے ہیں :

توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

صرف یہی نہیں بلکہ عمر کے ہر حصے میں اپنے نظریاتی اختلاف کے باوجود وہ مغربی علوم کا ذکر ایک طالب علمانہ خلوص سے کرتے رہے ہیں اور اس کی مثالیں کلام اقبال کے علاوہ مثلاً

خرد افروز مرا درس حکیمان فرنگ (پیام مشرق)
علوم تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں (بال جبریل)

ان کی نثری تحریروں میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ اصل میں اقبال کے نظام فکر کی تصویر نطشے کے اس جملے میں دیکھی جا سکتی ہے۔

"انسان کی عظمت اس میں ہے کہ وہ ایک پل ہے نہ کہ منزل" (بقول زردشت) اور اقبال کے فکر و نظر نے جس فن کارانہ کمال کے ساتھ مشرق و مغرب کے درمیان ایک پل کا کام دیا ہے' وہ ہمارے مشرقی ادب کا متاع گراں بہا اور لازوال سرمایہ ہے۔

اقبال گوئٹے کے سوانح نگار بیل شوسکی کے حوالے سے لکھتے ہیں :

"بلبل شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آئی تھی۔ اس کو کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ شاید میری روح ہی حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے۔ وہی زمینی مسرت' وہی آسمانی محبت' وہی سادگی' وہی عمق' وہی جوش و حرارت' وہی وسعت مشرب' وہی کشادہ دلی اور وہی قیود و رسوم سے آزادی غرض کہ ہر بات میں ہم اسے حافظ کا مثیل پاتے ہیں۔ جس طرح حافظ لسان الغیب اور ترجمان اسرار ہے' اسی طرح گوئٹے بھی ہے اور جس طرح حافظ کے بظاہر سادہ الفاظ میں ایک جہان معانی آباد ہے' اسی طرح گوئٹے کے بے ساختہ پن میں بھی حقائق و اسرار جلوہ افروز ہیں۔ دونوں نے امیر و غریب سے خراج تحسین وصول کیا۔ دونوں نے اپنے اپنے وقت کے عظیم الشان فاتحوں کو اپنی شخصیت سے متاثر کیا (یعنی حافظ نے تیمور کو اور گوئٹے نے نپولین کو) اور دونوں عام تباہی اور بربادی کے زمانے میں طبیعت کے اندرونی اطمینان و سکون کو محفوظ رکھ کر اپنی قدیم ترنم ریزی جاری رکھنے میں کامیاب رہے۔"

"بانگ درا" میں آپ گوئٹے کو غالب کا ہم نوا قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں :

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

ویمر میں گوئٹے کے علاوہ ہرڈر' شلر اور او ہلنڈ بھی رہتے ہیں لیکن اقبال ویمر کا ذکر گوئٹے ہی کے تعلق سے کرتے تھے۔ اور "پیام مشرق" میں اپنے اس شعر ؎

صبابہ گلشن ویمر پیام ما برساں
کہ چشم نکتہ وراں خاک آں دیار فروخت

کے حاشیہ پر ویمر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "جرمنی میں ایک شہر ہے جہاں گوئٹے نے اپنی زندگی کا بہت سا حصہ بسر کیا اور بعد انتقال وہیں دفن ہوئے۔"

گویا گلشن ویمر کے ساتھ اقبال کا تعلق خاطر گوئٹے کی وجہ سے ہے ہرڈر' شلر اور او ہلنڈ کی وجہ سے نہیں۔

حرف آخر

اقبال ایک وسیع المطالعہ شاعر تھے اور یورپ کے ان مفکرین کے علاوہ بھی مشرق و مغرب کا شاید ہی کوئی مفکر ہو جس کی تحریروں اور افکار کا انہوں نے بغور مطالعہ نہ کیا ہو اور یہ مطالعہ انہوں نے انتہائی فراخ دلی سے کیا' لیکن اس کے باوجود انہوں نے حقیقت کو اوروں کی نظر سے نہیں بلکہ اپنی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی۔

میان آب و گل خلوت گزیدم
زافلاطون و فارابی بریدم!
نہ کردم از کسے در یوزۂ چشم

حواشی

1- نوری ناداں نیم سجدہ بہ آدم برم

(پیام مشرق)

2- "جاوید نامہ" میں بھرتری ہری کے کلام کی داد اس کی ایک روشن مثال ہے۔ بھرتری ہری کے بارے میں اقبال جو کچھ خود کہنا چاہتے ہیں' وہ رومی کے منہ سے کہلواتے ہیں۔

3- اسی انداز فکر کے باعث یہ میرا خیال ہے کہ "جاوید نامہ" کا تصور اس کی تصنیف سے مدتوں پہلے علامہ اقبال کے ذہن میں پرورش پا رہا تھا۔

4- یہی خیال اقبال نے کارل مارکس کے بارے میں پیش کیا ہے لیکن وہاں پیش نظر مفہوم مختلف ہے۔

آں کلیم بے تجلی آں مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

5- فاؤسٹ۔

6- بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند

فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

(رومی)

(مجلّہ "احساس" (پشاور یونیورسٹی) جلد 2 شمارہ 11-12 (اقبال نمبر)' خصوصی شمارہ 8' ص 37-43- اقبال اور مغربی مفکرین' لاہور: مکتبہ عالیہ' 1987ء' ص 182-189- رسالہ "قاشیں" (اسلام آباد' کشمیر)' مارچ 1984ء- مغرب--اقبال کی نظر میں از جگن ناتھ آزاد' در: رسالہ "اردو" (کراچی) جلد 65 شمارہ 1' بابت جنوری تا مارچ 1989ء' ص 202-209' آخری قسط)

ڈاکٹر حاتم رامپوری

اقبال اور گوئٹے

اقبال پر نطشے اور گوئٹے کے اثرات ضرور ہیں لیکن ان اثرات سے متعلق گفتگو کرتے وقت ہمارے تنقید نگاروں نے کہیں تو اجمالی اشاروں سے کام لیا ہے اور کہیں غلو اور غلط فہمی کے شکار ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کے بہت بعد تک یورپی مفکرین کا بے ضرورت ذکر بھی فیشن میں شامل تھا' اس لئے بعضوں نے عقیدت مندی کے جذبے کے تحت اقبال کا قد بلند کرنے کی نیت سے بہت سے انگریز اور جرمن مفکرین کے نام گنوائے ہیں اور بعض انگریزی ادب سے ناآشنا قاری پر دھونس جمانے کی خاطر ان ناموں سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ اقبال کا نام آتے ہی بہت سے بلند بانگ ناقد بھی بے سوچے سمجھے یہ کہہ دیتے ہیں کہ اقبال کی فکر تو نطشے اور گوئٹے سے مستعار ہے اور پھر کس حد تک یہ اثرات ہیں' اس کی نشاندہی سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ یہ خوش فہمی یا غلط فہمی اسی وقت سے پائیدار ہوتی چلی گئی ہے' جب اقبال کی زندگی میں ہی "اسرار خودی" کے انگریزی ترجمے پر لندن کے ادبی جریدوں میں تبصرے شائع ہونا شروع ہوئے۔ انگریزی داں تبصرہ نگاروں کے سامنے چونکہ اسلامی تعلیمات سے ابھرتے ہوئے انسان کی شباہت بہت واضح نہیں تھی اور ٹھیک اس کے برعکس نطشے کے فوق البشر اور گوئٹے کے "فاؤسٹ" کی بڑی دھوم تھی' اس کے علاوہ خود اقبال نے ان دونوں جرمن دانشوروں سے اپنی عقیدت مندیوں کا اظہار بزبان خود کیا تھا' لہٰذا اردو کے بڑے ناقدین کے پاؤں بھی اس ضمن میں پھسل گئے اور انہوں نے بالاستیعاب

مطالعے کئے بغیر یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ اقبال کے انسان کامل کا تصور نطشے اور گوئٹے کا رہین منت ہے یا تن آسانی سے کام لیتے ہوئے اس موضوع پر گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی' حالانکہ اقبال نے اسی زمانے میں نکلسن کے ایک خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ "اسرار خودی" کی اشاعت سے برسوں قبل انہوں نے "انسان کامل" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا' جو شائع بھی ہوا تھا۔ بعد میں اسے انہوں نے اپنے تحقیقی مقالے میں ضم کر لیا۔ اقبال نے اسی خط میں یہ اعتذاریہ بھی پیش کیا ہے کہ اس زمانے میں ان کے کانوں میں نطشے یا گوئٹے کی تعلیمات کی بھنک تک نہ پڑی تھی' تصورات کی مماثلت یا مغائرت اتفاقیہ طور پر بھی ہوتی ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ بعد میں یورپ کے سفر میں اقبال کو ان دونوں فنکار دانشوروں کو براہ راست پڑھنے کا موقع بھی ملا اور اقبال متاثر بھی ہوئے اور اپنی اثر انگیزی کا برملا اظہار بھی کیا' لیکن متاثر ہونا اور بات ہے اور کسی سے مستعار لینا اور بات۔ اقبال کی فکر پر دنیا کے اکثر و بیشتر عظیم فنکاروں اور دانشوروں کی پرچھائیاں ملتی ہیں' لیکن کسی کی حیثیت اقبال کے سامنے ایسی نہیں ہے کہ اسے مستعار کہا جائے بلکہ وسیع مطالعے کے لازمی نتیجہ کے طور پر عالمگیر سطح پر عظیم فنکاروں کے یہاں ایسے سائے اور پرچھائیوں کا وجود ناگزیر ہے اور یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ تمام عظیم انسانوں کی فکر میں فطری طور پر کچھ نہ کچھ مشابہت تو ملتی ہی ہے۔ لہٰذا اقبال سے متعلق یہ کہنا کہ اقبال کی فکر مستعار ہے' سراسر ناانصافی اور بددیانتی ہے۔ اقبال کی فکر کا ایک مخصوص سانچہ اور ڈھانچہ ہے اور وہ قطعاً" منفرد ہے۔ اگر دوسرے مفکرین کے اثرات ملتے بھی ہیں تو اقبال کے تخلیقی رویئے اور اس کے ذہن کے کیمیاوی عمل سے گزر کر اسی کے تصورات کا ناگزیر حصہ اور جزو لاینفک بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس کی فکر کا بنیادی اور مرکزی محور اسلامی الٰہیات ہے اور اس کی تاویل و تشریح میں بہت سے فکری دھارے آ کر ملتے ہیں' لیکن یوں ملتے ہیں جیسے کوئی چھوٹی سی آبجو کسی سمندر میں گر جائے اور اپنا وجود کھو کر سمندر بن جائے۔ اقبال کا اسلامی تصور بھی خالصتاً" انفرادی عرفان کا حامل ہے جس میں شعریت' رومانیت' تجدید' تخلیق اور اجتہاد کے عناصر شامل ہیں۔ اقبال کا ہر تصور شعر بن گیا ہے اور اس کے تمام اشعار میں حیات کے تازہ خون کی چھکار موجود ہے۔ جہاں کہیں اقبال کے تصورات شاعری سے دور جا پڑے ہیں' اقبال کا انداز پھس پھسا کر رہ گیا ہے۔ بہرحال

اقبال گوئٹے سے متاثر ہیں اور آئیں ہم ان اثرات کا تجزیہ کر کے اس کے تناسب کا سراغ لگائیں۔

گوئٹے کی شہرہ آفاق تصنیف "فاؤسٹ" سے خود نطشے بھی متاثر ہے۔ دراصل فاؤسٹ ہو یا ڈون جون' ڈون کویک زوٹ ہو یا سوپرمین یہ سب کے سب کردار مخصوص حالات اور تاریخی عوامل کی پیداوار ہیں۔ نشاۃ ثانیہ کی فکری' تہذیبی اور مذہبی عقائد کی کشمکش میں انسان کی شخصیت کے سنورنے اور بکھرنے کی متضاد کیفیات سامنے آئیں اور اسی زمانے میں ادب میں ایک رومانی تحریک بھی شروع ہوئی' جس میں نئے زمانے کے تازہ تقاضوں سے نبرد آزما ہونے والے ایک ہیرو کا تصور پیش کیا جانے لگا۔ اس ہیروئی توانائی پسندی (Heroic Vitalism) کا خاتمہ اس وقت ہوا جب نطشے کا سوپر مین ہٹلر کی صورت میں سامنے آیا اور دنیا لرزہ براندام ہو گئی۔ اس کے فوراً بعد' اسپینگلر کے یہاں سے ہیروئی توانائی پسندی کا رجحان تبدیل ہونا شروع ہوا اور قوت کی مرکزیت کے خوف نے لامرکزیت کا رخ کیا۔بقول ڈاکٹر عالم خوند میری :

> "مغرب میں سب سے پہلے نشاۃ ثانیہ کے علم برداروں نے انسانی نفس اور انسانی عقل کی خود مختاری کا اعلان کیا۔ دانتے کے "طربیہ خداوندی" میں انسان اپنے وجود کی تلاش کرتا ہوا پایا جاتا ہے اور خود دانتے انسانی عشق کو حقیقت کے عرفان کا ایک وسیلہ بنا دیتا ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے ہیروئی ادب میں پہلی بار انسان ایک نبرد آزما اور زور آزما وجود کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور ڈان کویک زوٹ کی صورت میں سہی لیکن ماحول کے خلاف لڑتا ہے اور اپنے محدود وسائل کی پرواہ کئے بغیر فتح و شکست سے بے نیاز اپنی لڑائی جاری رکھتا ہے۔"

اس دور کے آرٹ میں ہمیں عام طور پر انسانی عظمت کی تصویر نظر آتی ہے۔ مائیکل اینجلو کے تاریخی نقش (تخلیق آدم) میں انسان پہلی بار ایک تاریخی ہیرو کی حیثیت سے سامنے آتا ہے اور پورے جوش و خروش اور جلال کے ساتھ ابھرتا ہے۔ رفائل نے اپنے فن میں ایتھنز کا شکوہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ دور سائنس کے آغاز کا دور تھا۔ بیکن نے ماضی کے مردہ علوم کے خلاف بغاوت کی اور تسخیر جہات پر زور دیا۔ "علم ایک قوت ہے" کے مقولے نے انسان کو اپنے لامحدود امکانات سے آشنا کیا۔ شیکسپیئر کے المیوں میں نئی دنیا کی

بشارت کا نقشہ ابھرا۔ بقول سنتیانا "شیکسپیئر کی نظروں سے خدا اوجھل ہو گیا ہے اور انسان سامنے آگیا ہے اور رفتہ رفتہ اس دور میں انسان اور خدا کے درمیان اطاعت اور نافرمانی کا رشتہ باقی رہ گیا۔ ایک مثلث جس کے تین اضلاع' انسان خدا اور ابلیس رہ گئے۔ اس کی مزید صراحت فرانسیسی مصنف جولیس چیکس روئی کی زبانی سنئے :

"(۱) کسی بزرگ و برتر ہستی یا مرد فقیر کا تصور صدیوں سے انسانوں کے ذہن میں پرورش پاتا رہا ہے اور عہد بہ عہد بدلتے ہوئے تیور کو اس نے اپنی ذات میں سمو لیا ہے۔ یہ مختلف ادوار کے فلسفیوں اور فنکاروں کے یہاں متعلقہ عہد کے ثقافتی اور تاریخی تقاضوں کی دھند اپنے چہرے پر لپیٹتا ہوا آج تک زندہ ہے اور رہتی دنیا تک انسانوں کے ساتھ ساتھ یہ تصور بھی زندہ رہے گا۔ یہ کیتھولک کٹرّ پن اور مغربی عقل پرستی کی چکیوں میں پس جانے کے بعد بھی ہزاروں سال سے انمٹ ہے۔ Jaochion Offiore کی پیش گوئیوں کی وجہ سے اس نے از سر نو توانائی حاصل کر لی ہے اور ان پیش گوئیوں کی تلخیص ہے :

"ارواح پاک کی حکومت کا اعلان" مغربی جرمنی کو یہ فخر ہے کہ اس نے ہمیشہ ہمیں یہ یاد دلانے کی کوشش کی ہے کہ انسانوں کی نجات بغیر کسی غیر معمولی ہستی کی مداخلت اور تعاون کے ناممکن ہے۔ ہر جگہ کساد بازاری ہے۔ جنون و خبط انسانوں کا شعار بن گیا ہے۔ ساتھ گناہ کبیرہ کے داغ ہماری پیشانیوں پر موجود ہیں' جن کی حیثیت بس ایک نقاب سے زیادہ نہیں۔ بھٹکتی ہوئی کشتیوں پر سوار ہو کر اور احمقوں کے جہازوں میں اڑ کر انسان طفلانہ کج رویوں میں بری طرح منہمک ہے۔ لہٰذا اب اس کائنات کو' جس کے اندر مغالطے اور ہوس رانیوں کے سوا کچھ بھی نہیں "بے وجود ہونے دو" ایک رومانی دنیا کو عالم وجود میں آنے دو' جہاں روح کا ارتفاع ہو گا "مطمئن رہو اور منزہ رہو" اس خطاب نے اپنے دامن میں صدیاں سمیٹ لی ہیں۔ پندرہویں صدی عیسوی میں بھی اسی طرح متضاد تمناؤں کے ساتھ یہ نعرہ بلند ہوا تھا اور اس نے زاہدوں اور بادشاہوں کی حیات طیبہ کے خد و خال پیش کئے تھے لیکن عہد وسطیٰ میں عبادت گزار لوگوں کے ساتھ ساتھ ہم طالبان دنیا کو بھی پاتے ہیں۔ یہاں امنگوں کا تلاطم اور ہوس کی شدتیں بھی موجود ہیں۔

سرداری کا خبط بھی ہے اور میدان کارزار کا احترام بھی۔ خطرپسندی کی تعلیمات یہاں تک پہنچتی ہیں کہ جنگ کا میدان عبادت خانوں کا بدل ہو جاتا ہے۔ فتح یابی کے لئے محض لڑنا ہی ناگزیر نہیں' بلکہ عظیم قربانیوں کے لئے یقین محکم کی رفاقت ضروری ٹھہرتی ہے..... غرض ان طویل صدیوں میں "فاتح" اور "فقیر" کے تصورات ہم دوش سفر ہیں اور انہیں صدیوں کے درمیان دور جدید کا انسان ابھرتا رہا ہے..... نشاۃ ثانیہ میں جسم اور روح کی یہ کشاکش اور بھی شدت اختیار کر لیتی ہے۔ عقل اور جذبہ حصول اقتدار باہم دست و گریبان نظر آتے ہیں۔ عقل کائنات پر حکمرانی کرنے کے رموز کے انکشافات کی پاسداری کرتی ہے اور جسم کی توانائی پوری کائنات کو اپنے قانون کے زیر نگیں کرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ چودھویں اور پندرھویں صدی سے قریب کوئی دوسرا عہد ہمارے عہد سے ہم آہنگ نہیں ہے..... نشاۃ ثانیہ کے اسی زریں عہد میں ذات بے ثبات اپنے اندر بھرپور یقین پیدا کر لیتی ہے بلکہ خدا سے برگردد ہو کر خود اپنی خدائی کا اعلان کر دیتی ہے۔"

یہ طویل اقتباس اس لئے پیش کرنا پڑا کہ آپ اقبال' نطشے اور گوئٹے کے فکری رشتے کو آسانی سے سمجھ سکیں۔ "فاؤسٹ" کی روایت جرمنی میں کم و بیش ساڑھے چار سو سال قبل سے موجود ہے۔ اس کی ابتدا ایک مجوسی کی کہانی سے ہوئی جس میں قوائے فطرت کو معبود قرار دیا گیا تھا۔ فاؤسٹ ایک تاریخی شخصیت ہے' جو فطرت کے راز ہائے سربستہ معلوم کرنے اور تسخیر جہات کے عزائم اور عمل کے لئے معروف ہے۔ وہ ساحری اور ٹونا ٹوٹکا سے بھی بخوبی واقف تھا۔ اس کے اندر تمام ساحرانہ صلاحیتیں موجود تھیں' حالانکہ ایسی کہانی جرمنی میں اس سے قبل سے موجود تھی لیکن سولھویں صدی میں فاؤسٹ نامی ایک شخص موجود تھا اور اس میں چند غیر معمولی صفات بھی تھیں۔ اس سے متعلق اتنی روایات عوام میں عام ہوئیں کہ رفتہ رفتہ اصل فاؤسٹ کی شخصیت پس پشت پڑ گئی۔ کرسٹوفر مارلو نے اس کہانی کو بحسن و خوبی منظوم ڈرامے میں پیش کیا مگر صحیح معنوں میں گوئٹے نے فاؤسٹ کو فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا' ورنہ اس سے قبل اسے عموماً ایک مسخرہ جادوگر کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا۔ گوئٹے کا فاؤسٹ دنیا کا ایک مثالی کردار ہے جو بے حد پروقار اور حقیقی ہے۔ اس کا ابلیس بھی بے حد جاندار ہے۔

نطشے کے "فوق البشر" گوئٹے کے "فاؤسٹ" اور اقبال کے مرد مومن کے اندر بھی بعض تشابہ موجود ہے۔

دراصل ہیروئی توانائی پسندی کی رومانی تحریک کا خاتمہ نطشے کے ساتھ ہوا۔ صدیوں سے دانشوروں اور فنکاروں نے ایک نیک خو' مضبوط' باعمل' فقیرانہ مزاج کے حکمران کا خواب دیکھا تھا جو نطشے کے یہاں آ کر خدا ناآشنا ہی نہ ہوا بلکہ اس نے تمام قدروں کو متبادل کر کے خود کو خدا بنا لیا۔ نطشے کے زیر اثر ہٹلر کا وجود وحشت اور بربریت کی تجسیم بن کر سامنے آیا' تب جا کر اس تحریک نے دم توڑا۔ یہ عین ممکن ہے کہ اقبال نے ابتداً انسان کامل کا تصور اسلامی تاریخ' خلفائے راشدین کی پروقار شخصیات اور رسول عربیؐ کی ذات گرامی سے متاثر ہو کر پیش کیا ہو' لیکن یورپ کے سفر سے واپسی کے بعد نطشے اور گوئٹے کے زیر اثر اقبال نے اپنے اس تصور کی رنگ آمیزی مزید دلچسپی اور نئے عزم کے ساتھ کی' کیونکہ اس تصور کے بھیانک نتائج اور ہیروئی توانائی پسندی کے سیاق و سباق سے اقبال کا باخبر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اقبال کا مرد مومن اس تحریک کی تکمیل اور معراج کی حیثیت رکھتا ہے اور اقبال کے لئے مغربی روایت ناقص تھی بلکہ خود اسلامی تاریخ ایسی شخصیات کا حسین البم ہے جن کے اندر جسمانی قوت' اولوالعزمی' نیکی' انسانی ہمدردی' قوت تسخیر' یقین محکم اور عمل پیہم کے ساتھ ساتھ بے پناہ روحانی قوت بھی موجود تھی اور ہیروئی توانائی پسندی کے تمام ہیرو روحانی قوت سے عاری ہیں بلکہ رومانی جذباتیت کے شکار ہیں۔ اقبال نے انسان کامل یا مرد مومن کا جو تصور پیش کیا ہے' وہ وحشت اور بربریت کا غماز نہیں بلکہ شعلہ و شبنم' روحانیت اور جسمانیت' رحم و کرم اور جنگ و جدال' ہمدردی اور محبت' عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کا امین ہے۔

اقبال نے بجائے خود گوئٹے کے "فاؤسٹ" کے بارے میں لکھا تھا کہ "گوئٹے نے انسان کے امکانی نشو و نما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمال فن خیال میں نہیں آ سکتا۔"

اقبال اور گوئٹے دونوں انسانی عظمت کے متلاشی ہیں۔ گوئٹے اپنے تصورات کی تجسیم "فاؤسٹ" کے کردار میں کرتا ہے اور اقبال عظمتوں سے متعلق اپنے تمام خیالات کو مرد مومن کی پیکر تراشی میں۔

"(2)فاؤسٹ' گوئٹے کا شاہکار ہے' جس کے بطون میں اس اطالوی فنکار نے اپنا فلسفہ حیات بحسن و خوبی سمو دیا ہے۔ فاؤسٹ کی دیرینہ حکایت گوئٹے کے یہاں نئی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ ایک حکیم نکتہ داں' زاہد خشک' انسان دوست انسان ہے جو سوابیا کا باشندہ ہے۔ اسے جادو کا علم بھی حاصل ہے۔ اس کے چچا نے اس کے لئے خاطر خواہ جائیداد چھوڑی ہے' لیکن فاؤسٹ اپنی بدعنوانیوں اور بے اعتدالیوں سے اسے برباد کر دیتا ہے۔ وہ سکون اور طہارت قلبی کے لئے مضطرب ہے۔ اس کی روح میں ایک خلش ہے۔ اس خلش سے وہ بے چین ہے لہٰذا وہ ابلیس سے معاہدہ کر لیتا ہے کہ وہ محض چوبیس گھنٹوں تک بے اعتدال زندگی گزارے گا اور اس کے عوض اپنی روح ابلیس کے پاس گروی رکھ دے گا لیکن ابلیس کے مکر و فریب سے وہ اپنے تقدس مآب بڑھاپے کو ہمیشہ کے لئے شر سے شرابور جوانی سے تبدیل کر لیتا ہے اور اپنی روح ابلیس (Mephistopheles) کے حوالے کر دیتا ہے۔"

فاؤسٹ ایک متبحر عالم ہے' لیکن اس کا علم اسے اس کی جہالت کا احساس دلاتا ہے۔ وہ جتنا زیادہ مطالعہ کرتا ہے' اتنا ہی اس کی تشنگی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور کافی مطالعے کے باوجود خود کو تاریکیوں میں محصور پاتا ہے۔ وہ فقہ' قانون' فلسفہ' الٰہیات کے علاوہ فن ساحری میں بھی طاق ہے۔ فاؤسٹ کو میفو شفلس زندگی کے تمام چوراہوں پر بھکاتا ہے۔ کرب و اضطراب سے پُر زندگی کو فاؤسٹ ایک کتے کی زندگی کے مترادف سمجھتا ہے۔ اسے اپنی گمراہی کا شدید احساس ہے۔ اس طرح وہ نیک بننے کی آرزوؤں اور اپنی تر دامانیوں کے خوف کا متحیر پیکر ہے۔ وہ اپنے حال پر قانع نہیں اور مستقبل سے خائف ہے۔ جب وہ اپنی روح کی سیاہی سے گھبرا کر کچھ ساحرانہ کلمات بولتا ہے' اس وقت اس کی روح حاضر ہو کر اس سے پوچھتی ہے کہ اسے کس بات کا خوف ہے اور کس لئے ہراساں ہے؟ فاؤسٹ اسے اپنا حال زار بتاتا ہے۔اسی درمیان واگنر آ جاتا ہے جس کے ساتھ فاؤسٹ Easter Holiday کے موقع پر چلا جاتا ہے۔ واپسی میں فاؤسٹ کے ساتھ ایک کالا کتا لگ جاتا ہے' جو بعد میں ابلیس یعنی میفو شفلس کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور فلسفیانہ مباحث کے بعد فاؤسٹ کو راضی کر لیتا ہے کہ وہ اپنی روح کو نئی زندگی کے عوض بیچ دے۔ اس اثنا میں فاؤسٹ دنیا کی ہر طرح کی رنگ رلیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔پھر اسے ایک نیک خو دوشیزہ مارگریٹ سے عشق ہو جاتا ہے اور اپنا راستہ صاف کرنے کے لئے وہ مارگریٹ کے بھائی کا قتل کر دیتا ہے۔ دوسرے

منظر میں فاؤسٹ مارگریٹ کو جرم طفل کشی میں قید خانے میں مقید دیکھتا ہے۔ اخیر میں وہ اپنے محبوب سے ملنے کی خاطر میفو سٹفلس سے گڑگڑاتا ہے' لیکن وہ اسے ترساتا ہے۔ کسی طرح وہ مارگریٹ کی دہکتی چتا میں داخل ہو جاتا ہے اور اسے آغوش میں لے کر محبت کی باتیں کرتا ہے۔ عشق کی آگ میں مارگریٹ کے لئے سلگائے گئے الاؤ میں فاؤسٹ اپنی اصلی حالت (یعنی تقدس مآب بڑھاپا) میں جل جاتا ہے اور محبت کا یہی والہانہ اقدام اس کی بخشش کا باعث بنتا ہے اور اسے میفو سٹفلس کے مکر و فریب سے نجات ملتی ہے۔

فاؤسٹ کی زندگی کا المیہ کرب' کشمکش اور نجات کے تصور پر ختم ہوتا ہے۔ ابلیس فاؤسٹ سے اس کا ایمان اور عقیدہ لے کر اس کے دامن میں دنیا کی ساری رنگینیاں بھر دیتا ہے۔ وہ بے جھجک شہزادیوں کے کمروں میں داخل ہوتا ہے۔ اب وہ بہترین خوبصورت نوجوان ہے' اس لئے خوب خوب لطف اندوز ہوتا ہے۔ پوری عمر شباب کی خوشہ چینی اور حسن کی رنگینیوں میں گزرتی ہے' لیکن اسے اس کا احساس گناہ مزید بے قرار کرتا رہتا ہے۔ وہ ہر بار گناہ کرتا ہے اور ہر بار پچھتاتا ہے۔ اسے اپنے تقدس کی طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ تب وہ دیوانہ ہو جاتا ہے اور ابلیس سے لڑتا ہے۔ اپنی نیک چلنی اور اپنے بڑھاپے کی بھیک مانگتا ہے..... وہ اپنے فعل کے اعتبار سے گناہ گار اور اپنے ضمیر کے اعتبار سے نیکو کار ہے۔ خیر و شر کا یہ عجیب و غریب مرقع ہے' جو بے حد فطری اور دلچسپ ہے۔

فاؤسٹ کے نزدیک حصول مقصد سے کہیں زیادہ اہم بات جستجوئے منزل ہے۔ وہ بجائے خود اپنے کردار کے متعلق یوں کہتا ہے کہ :

> "میں نے دنیا کا نہایت سرعت سے سفر کیا ہے۔ میں نے زہر تمنا کو گویا بالوں سے پکڑ کر کھینچ لیا ہے اور سیر ہو جانے پر چھوڑ دیا۔ جو نہیں مل سکا' اس کی پرواہ نہیں کی۔ میں نے ہر لمحہ کچھ نہ کچھ چاہا اور کچھ نہ کچھ پا لیا۔ تاہم اپنی جستجو برقرار رکھی۔ میں نے جوانی کو بگولے کی طرح گزارا اور اب احتیاطاً" اپنی رفتار سست کر دی۔"

فاؤسٹ کا کردار خیر و شر کا خوبصورت آمیزہ ہے۔ ابتداً وہ حد درجہ خدا ترس اور عبادت گزار ہے۔ زاہد خشک ہے' لیکن اس کی متجسس طبیعت اسے ابلیس سے سودا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اسے انسانیت کا بے حد احترام ہے اور ابلیس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ

انسانوں کا خون کرتا ہے۔ وہ جو کچھ پسند کرتا ہے' اسے عملی جامہ پہنانے سے قاصر ہے اور جو کچھ کرتا ہے اسے وہ خود پسند نہیں کرتا۔ انسانی نفسیات کی بہترین تاویل سے اس کا کردار عبارت ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین "فاؤسٹ" کے اردو ترجمے میں اس ذیل میں رقمطراز ہیں:

"گوئٹے نے فاؤسٹ میں روح انسانی کی جس کشمکش کا نقشہ کھینچا ہے اور اس کا جو حل بتایا ہے' وہ یہی ہے کہ اس کے زمانے کی رومانی روح' جسے ایک طرف علم و عرفان کی آرزو کھینچ رہی ہے تو دوسری طرف عملی زندگی اور مادی لذات کا شوق' اگر وہ اس کشمکش سے نجات پا سکتا ہے تو محض عقیدت اور محبت کے ذریعے سے۔ مگر اسے کٹھن منزلوں سے گزرنا ہے۔ بدنی زندگی کی تشکیل اس طرح سے کرنا ہے کہ قوت کے ولولے اور خدمت کے جذبے میں توازن پیدا ہو۔ اگر روح انسانی خلوص سے اپنے امکان بھر کوشش کرے تو تائید الٰہی اس کی عقیدت کو محبت کا جلوہ دکھا کر عالم حقیقت میں پہنچا دے گی..... گوئٹے نے روحانی ترقی کا زینہ دکھایا ہے مگر اس کے لئے تائید ایزدی بھی ضروری ہے۔"

فاؤسٹ ہمیں یہ درس دیتا ہے کہ اپنے اچھے دنوں میں اپنی بری حالت کے تصور پر رحم کھا کر اپنی کوششوں سے خود کو سنوارنا چاہئے اور جہد مسلسل میں نجات کا راز پوشیدہ ہے' خواہ یہ کوشش غلط ہی کیوں نہ ہو لیکن جب کسی موڑ پر جذبہ محبت اور عقیدت کا سامنا ہوتا ہے تو غلط کوشی بھی سلامت روی بن جاتی ہے۔ فطرت کی خوش نصیبی ہمیشہ ہمیں دعوت عمل دیتی ہے اور ہمارے در پر دستک دے کر کہتی ہے کہ "کبھی مایوس مت ہونا۔" اسی اصول پر عمل پیرا ہو کر فاؤسٹ خود کو امر بنا لیتا ہے۔ فرانسیسی نقاد چیکس روئی' گوئٹے کے اس رویئے کو عیسائیت کے خلاف تصور کرتے ہوئے اپنی کتاب "فوق البشر" میں نطشے کے مقابلے میں وہ گوئٹے کو ترجیح دیتا ہے اور فاؤسٹ کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے رقمطراز ہے:

"گوئٹے اور فاؤسٹ کے بنیادی مسائل یہ ہیں کہ انسان کے بدترین دشمن' یعنی وسواس اور تشکیک کے ساتھ شدید جنگ کی جائے۔ میفوسٹفلس کا پیکر اسی تشکیک کا مظہر ہے جو ابتدائے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں عقائد کا موضوع سخن رہا ہے۔ دراصل یہ انسان کا اپنا دل ہی تو ہے جو اپنی مریضانہ حرکات کے ذریعہ شبہات کی موہوم دنیا تخلیق کرتا رہتا ہے۔ کیا ہم اس سے محض تائید ایزدی کی وجہ

سے نجات حاصل کر سکتے ہیں؟ یا مزید روشنی حاصل کرنے کے لئے ہمیں عمل پیہم سے کام لینا ہو گا؟ یا یہ تاریکی ہمارا مقدر ہے؟ گوئٹے اس سوال کا جواب دیتے وقت لوتھر اور ایراسمس دونوں کے بین بین ایک راہ نکالتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر مستقل عمل پیہم کی بڑی اہمیت ہے تو عقیدے کی بھی کم اہمیت نہیں ہے' کیونکہ اس سے جذبہ عمل کو سہارا ملتا ہے۔ انسان کا مطالعہ یہ ہے کہ وہ کیا ہے؟ لیکن اگر کوئی اپنے وجود پر بھروسہ کرتا ہے تو محض اس بنا پر کہ وہ جہد للبقا کے ذریعے خود کو متعارف کرتا ہے اور یہی جہد مسلسل ذریعہ نجات بھی ہے۔"

فاؤسٹ کی پوری تصویر کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ خود نطشے کا فوق البشر بھی فاؤسٹ کا ہی ترمیم شدہ ایڈیشن ہے۔ گوئٹے اخلاقی حفظان صحت کی تعلیم دیتا ہے اور اس کے لئے کوشاں نظر آتا ہے کہ تشدد آمیز توانائی کو اخلاقی قدروں سے مزیّن کیا جائے اور ذات کے متجاوز عناصر کو مذہب کے تابع کیا جائے اور زندگی کے کچھ خطرناک کھیلوں کو زندگی سے خارج کیا جائے۔ جہاں نطشے کو محض غیر معمولی کھیل ہی پسند ہیں' وہاں گوئٹے ذرا محتاط ہے اور وہ فرد کی انتہا پسندیوں کے پس منظر میں معاشرے کا بھی خیال رکھتا ہے لیکن پھر بھی فاؤسٹ کے ذہن سے تمام تر انتہا پسندیوں کو خارج کرنے کی بجائے گناہ سے ثواب اور ثواب سے گناہ کی طرف مراجعت کا عمل دکھایا ہے اور وہ بھی اس امر کا معترف نظر آتا ہے کہ انتہا پسندیوں کے خمیر ہی سے عظیم ترین انسان پیدا ہوتے ہیں۔ اس ذیل میں وہ امتیاز خیر و شر کو برتتا تو ہے لیکن دونوں کو انسانی جبلت کا ناگزیر عنصر تصور کرتے ہوئے کھل کر کھیلنے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے البتہ اخیر میں اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ گناہ گار انسان تمام آسائشوں کے باوجود اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتا جب تک وہ محبت اور عقیدت کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنے جرم کی سزا کے طور پر خود کو آگ میں نہ ڈال دے' لہٰذا فاؤسٹ کی تمام برائیوں کے پس منظر میں نیکی اور محبت کا جذبہ موجود ہے جو انجام کار سامنے آتا ہے۔ ٹالسٹائی کے "جرم و سزا" کا انجام بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

اقبال کو گوئٹے کی فنکاری سے اس قدر لگاؤ کیوں ہے۔ دراصل اقبال کے لئے اس کے ملک و قوم کے مسائل بھی نشاۃ ثانیہ کے مسائل سے مماثل ہیں اور اقبال بھی اپنے عہد کی زندگی کو اپنی ذات میں جذب کئے ہوئے ہے۔ وہ بھی ملت بیضا کی عمرانیات پر بالخصوص اور

بنی نوع بشر کی تاریخ پر بالعموم گہری نظر رکھتا ہے اور نئے حالات سے پیدا شدہ زندگی کے نئے تقاضوں سے نمٹنے کے لئے اس کے ذہن میں انسان کی مختلف شبیہیں ابھرتی ہیں اور معدوم ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا وہ جس انسان کی تلاش میں ہے وہ نہ تو تشکیک کا شکار ہے اور نہ شتر بے مہار کی طرح ہر گلی کوچے میں دندناتا پھرتا ہے۔ اس میں حد درجہ انانیت بھی ہے اور ضبط نفس کا ملکہ بھی۔ اس کے سامنے ایک واضح نصب العین ہے' جہاں فرد کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے لیکن معاشرے کو کسی موڑ پر نظر انداز کرنے کی گنجائش نہیں۔ اقبال کا مرد مومن بھی رومانی ہے لیکن اس کی رومانیت بہت جلد روحانیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ ابلیس کو نفرت اور حقارت سے دیکھنے کی بجائے اسے قصہ آدم کی رنگینی کا موجب قرار دیتا ہے اور "خواجہ اہل فراق" سے ڈرتا نہیں بلکہ اسے تو انسان کی ذہنی نشو و نما کے مراحل کا ایک توانا چوکیدار تصور کرتا ہے' جو ہر لحہ مرد مومن کو گناہوں سے چوکنّا رکھتا ہے اور ایک لحہ کے لئے بھی خواب غفلت میں پڑے رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ نطشے اور گوئٹے دونوں ابلیس کے شر سے بے تحاشا خائف ہیں' لیکن مرد مومن سے ابلیس بجائے خود خائف نظر آتا ہے۔ مرد مومن کی سرشت میں فقیرانہ شان اور قلندرانہ مستی ہے۔ وہ بھی طوفانوں سے کھیلنے کا عادی ہے لیکن عصمت دری کے لئے کسی معصوم دوشیزہ کے بھائی کا قتل نہیں کرتا اورنہ خود کو خدا بناتا ہے بلکہ وہ اگر تلوار اٹھاتا ہے تو امن کی خاطر' جنگ کرتا ہے تو حق کی فتح کے لئے' کسی سے پیار کرتا ہے تو خدا کی خوشنودی اور انسانیت کی بہبود کے لئے' کسی سے نفرت کرتا ہے تو اس لئے کہ مقتول انسانیت کا دشمن ہے۔ مرد مومن ایک بندہ مولا صفات ہے جس کے اندر بے پناہ طاقت' حوصلہ' قوت عمل' جذبہ تسخیر' پندار' خودی' خودنگری' خدا پرستی' انسان دوستی' شجاعت' دلیری اور بانکپن سب کچھ ہے' لیکن وہ کسی موڑ پر شک و شبہ کا شکار نہیں۔ فاؤسٹ انسانی نفسیات کا زندہ مرقع ہے' لیکن مرد مومن کی نفسیات مثالی ہے۔ اس کے اندر شر کی چنگاریاں اگر موجود بھی ہیں تو وہ سطح پر نظر نہیں آتیں۔ وہ زندگی کا سارا زہر پی کر پختہ ترین ہو چکا ہے اور مجسم ایمان ہے' جس میں کہیں سے کوئی دراڑ نہیں ہے۔

فاؤسٹ کی ساری الجھنوں کا سبب اس کی جستجو کی خلش اور چبھن ہے اور اس کی تمام معذوریاں ابلیس کی زیرکی کے تحت ہیں' جسے اخیر میں وہ عشق کی ایک ہی جست سے طے

کرتا ہے اور یہ اقدام عقل بے بس کا روگ نہیں۔

چونکہ اقبال کے یہاں بھی وہی عقل معتبر ہے جو وجدان کی سرحدوں کو چھو سکے ورنہ:

عقل بڑی عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بیچارہ نہ ملا نہ زاہد نہ حکیم

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا اور کچھ نہیں

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

علم کا مقصود ہے پاکی عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفت قلب و نگاہ

اقبال کو بھی گوئٹے کی طرح عقل مشتبہ نظر آتی ہے' خدا ناآشنا اور خودی ناآشنا۔ عقل گمراہی کا موجب ہے لہٰذا اقبال نے گوئٹے سے اس ضمن میں اثرات قبول کئے ہیں' لیکن یہ تصورات اسلامی تصوف میں بھی موجود تھے۔ البتہ گوئٹے نے اس کی اثر انگیزی میں اپنی فنکاری سے اضافہ کیا ہے ورنہ "پیام مشرق" تو "در جواب دیوان شاعر المانوی گوئٹے" ہے۔ اقبال نے "پیام مشرق" میں فاؤسٹ کی تشکیک پسندی کو دور کیا ہے۔

اقبال کو گوئٹے کے انسان کی یہ نفسیاتی مصوری بہت پسند ہے لیکن اسے گوئٹے کا یہ

خیال بے حد پسند ہے کہ چالاکی اور مکر و فریب ابلیس کا شعار ہے اور آدم کی نجات عشق میں ہے۔ عاشق کے سامنے زیرکی بے معنی ہے۔ محض عقل سے زندگی کا سفر طے نہیں کیا جا سکتا، بلکہ عقل تو ابلیس کے دام میں گرفتار کر لیتی ہے۔ اگر اس پر عشق کا پہرہ نہ ہو۔

"جلال و گوئٹے" کے عنوان سے کل آٹھ اشعار پر مشتمل ایک چھوٹی سی فارسی نظم ملاحظہ ہو، جس میں گوئٹے سے متعلق اقبال کے تاثرات بہت واضح ہیں:

نکتہ دان المنی را در ارم
صحبتے افتاد با پیر عجم
شاعرے کو ہمچو آں عالی جناب
نیست پیغمبر ولے دارد کتاب
خواند بر دانائے اسرار قدیم
قصہ پیمان ابلیس و حکیم
گفت رومی اے سخن را جاں نگار
تو ملک صید استی و یزداں شکار
فکر تو در کنج دل خلوت گزید
ایں جہان کہنہ را باز آفرید
سوز و ساز جاں بہ پیکر دیدۂ
در صدف تعمیر گوہر دیدۂ
ہر کسے از رمز عشق آگاہ نیست
ہر کسے شایان ایں درگاہ نیست
"داند آن کو نیک بخت و محرم است
زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است"

(رومی)

گوئٹے رومی کی نگاہ میں (یعنی اقبال کی نظر میں) اس لئے پیغمبر بے کتاب ہے کہ اس نے "قصہ پیمان ابلیس و حکیم" کے وسیلے سے انسان کو "ملک صید" اور "یزداں شکار" کی شکل میں پیش کر کے فکر و نظر کے لئے ایک نئی دنیا کے دروازے کھول دیئے ہیں اور نہ

صرف یہ کہ اس نے انسانی وجود میں "سوز و ساز جان" کی کربناکی کا صحیح مطالعہ پیش کیا ہے' بلکہ اس نے "عشق و محبت" کی شکل میں وجود سے موتی چن لئے ہیں اور گوئٹے کی طرح سب کا مقدور نہیں کہ وہ عشق کے اسرار و رموز سے واقف ہو' کیونکہ عشق کی درگاہ ہر کس و ناکس کے لئے نہیں کھلتی۔ خوش نصیب اور محرم راز لوگ ہی اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ "زیرکی زابلیس و عشق از آدم است۔"

اقبال گوئٹے کے تمام شکوک و شبہات کو دور کرتا ہے اور اسے حیات کی تازہ شاہراہوں کے پتے بتاتا ہے' لیکن اس کی فنکارانہ عظمت کا تہہ دل سے قائل ہے۔ اپنا اور گوئٹے کا موازنہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

او چمن زادے' چمن پروردۂ
من دمیدم از زمین مردۂ
او چو بلبل در چمن "فردوس گوش"
من بصحرا چوں جرس گرم خروش
ہر دو دانائے ضمیر کائنات
ہر دو پیغام حیات اندر ممات
ہر دو خنجر صبح خند' آئینہ فام
او برہنہ' من ہنوز اندر نیام
ہر دو گوہر ارجمند و تاب دار
زادۂ دریائے ناپیدا کنار
او ز شوخی در تہہ قلزم تپید
تا گریبان صدف را بر درید
من بہ آغوش صدف تابم ہنوز
در ضمیر بحر نایابم ہنوز

یعنی یہ کہ گوئٹے "چمن زادۂ" اور "چمن پروردہ" ہے اور میں مردہ زمین سے اٹھا ہوں۔ گوئٹے کی حیثیت ایسے بلبل کی ہے' جس کی ہر چہکار فردوس گوش ہے اور میں صحرا میں ایک "جرس گرم خروش" کی حیثیت رکھتا ہوں۔ ہم دونوں ضمیر کائنات کے شناور ہیں اور موت

میں بھی ہمیں زندگی نظر آتی ہے۔ دونوں آئینے کی طرح چمکتے ہوئے خنجر ہیں۔ فرق یہ ہے کہ گوئٹے خنجر برہنہ ہے اور میں اب تک "اندر نیام" ہوں۔ دونوں دریائے ناپید کنار کے گوہر تابدار ہیں، لیکن وہ اپنی شوخی طبع کے بل بوتے پر سمندر کی تہوں میں تپ چکا ہے تا کہ صدف کا گریباں چاک کر سکے اور میں ابھی آغوش صدف میں پروان چڑھ رہا ہوں اور ابھی میں نے ضمیر بحر کو نایاب نہیں پایا ہے۔ اس عقیدت مندانہ اظہار میں اقبال کا قد گوئٹے کے سامنے جو نامعلوم ہوتا ہے، لیکن یہ اقبال کی طبعی شرافت اور احترام فن کا لازمی نتیجہ ہے ورنہ آگے چل کر اسی نظم میں اقبال نے معلّمانہ انداز اختیار کر لیا ہے اور گوئٹے کے فاؤسٹ کی تمام الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ مختلف مواقع کے محض چند اشعار "فاؤسٹ" کے پس منظر میں میرے دعوے کی دلیل کے طور پر کافی ہوں گے :

زندگی جہد است و استحقاق نیست
جز بعلم انفس و آفاق نیست
گفت حکمت را خدا خیر کثیر
ہر کجا ایں خبر را بینی بگیر

گوئٹے کا فاؤسٹ ابتدا میں طاعون سے مرنے والی مالن اور پادری کی موت پر سنک جاتا ہے اور ابلیس کے دام فریب میں آ جاتا ہے اور ساری زندگی شر میں شرابور رہتا ہے، لیکن اقبال کے پاس اس مسئلے کا حل جذباتیت نہیں بلکہ زندگی عمل سے عبارت ہے اور یہ کوئی ذاتی حق نہیں ہے، بلکہ انفس و آفاق کا صحیح ادراک ہی زندہ رہنے کی دلیل ہے۔ خدا کے حکم کے مطابق ساری حکمت کا خزانہ خیر کثیر میں پوشیدہ ہے، لہٰذا جس موڑ پر جہاں کہیں نیکی ممکن ہو، اسے عملی جامہ پہنانے سے ہی زندگی پختہ تر ہوتی ہے۔

فاؤسٹ کو بھی سرداری اور سربلندی کا خبط ہے، جسے وہ ابلیس کے ہاتھوں اپنی روح فروخت کر کے بھی حاصل کرنا چاہتا ہے، لیکن اقبال کے یہاں اس کے طریقے جداگانہ ہیں :

سروری در دین ما خدمت گری است
عدل فاروقی و فقر حیدری است

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند

در شہنشاہی فقیری کردہ اند
در امارت فقر را افزودہ اند
مثل سلماں در مدائن بودہ اند
حکمرانے بود، سامانے نہ داشت
دست او جز تیغ و قرآنے نہ داشت

خودی تعمیر کن در پیکر خویش
چو ابراہیم معمار حرم شو

اقبال نے فاؤسٹ کی دینداری سے الحاد اور ابلیس پرستی کی طرف مراجعت کے اسباب کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسے جذبات کی تادیب کے اشارے کئے ہیں۔

فاؤسٹ نامرادیوں اور ناکامیوں سے گھبرا کر ہوس پرستی کو اپنی بے راہ عقل اور کمزور ارادے کی وجہ سے اپنا لیتا ہے لیکن بقول اقبال آدمی اگر خدا کی تلاش کرے تو وہ یقیناً ملے گا کیونکہ وہ بجائے خود آدم کی تلاش میں ہے:

گدائے جلوہ رفتی بر سر طور
کہ جان تو ز خود نامحرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن
خدا ہم در تلاش آدمے ہست

"پیام مشرق" کا بنظر غائر مطالعہ ہم پر یہ حقیقت منکشف کر دینے کے لئے کافی ہے کہ اقبال کے ذہن میں "پیام مشرق" کی تکمیل تک فاؤسٹ کی ان تمام کج رویوں پر نگاہ ہے اور اس نے قدم قدم پر گوئٹے کے تمام شکوک و شبہات کا خاطر خواہ جواب دینے کی کوشش کی ہے اور فکری اعتبار سے اقبال کا قد گوئٹے سے بلند ہے، البتہ فنکار گوئٹے ابلیس اور فاؤسٹ کی حنا بندی میں عظیم تر ہے کیونکہ اس میں اس کا خلاقانہ ذہن ایک نئی دنیا کی تعمیر بہت ہی فنکارانہ انداز میں کرتا ہے، لیکن مومن بھی خوب ہے۔

اقبال اور گوئٹے میں جہاں تک مشابہت کی بات ہے، وہ میرے خیال میں عقل و عشق اور عمل پیہم، جستجو اور درد و داغ جستجو کی حد تک ہے، ورنہ دونوں کے یہاں معیار خیر و شر

جداگانہ ہے اور دونوں کے سوچنے کا انداز بھی قطعی جداگانہ ہے۔

گوئٹے کا فاؤسٹ عقیدے کے اعتبار سے عیسائی ہے اور تائید ایزدی کا منتظر ہے۔ اس کے اندر خدمت کا جذبہ بھی بے حد شدید ہے۔ وہ حد درجہ جذباتی اور رومانی ہی نہیں' متلون مزاج بھی ہے۔ ابتدا اس کا تقدس اور وسیع مطالعہ اسے انسانوں سے دوستی کرنا سکھاتا ہے' لیکن موت کے چند جھٹکوں سے متزلزل ہو کر وہ بالو کی دیوار کی طرح ابلیس کی آغوش میں بیٹھ جاتا ہے اور تاعمر نفسیاتی مریض کی سی زندگی گذارتا ہے۔

اقبال اور گوئٹے کی مشابہت یا مغائرت کا سوال حیات و کائنات سے متعلق ان دونوں دانشور فنکاروں کے نظریات کے تطابق یا تضاد کا سوال ہے۔ گوئٹے نے اپنے شاہکار "فاؤسٹ" میں اپنے عہد کے ضمیر کی تجسیم فاؤسٹ کی پیکر تراشی میں کی ہے اور متعلقہ عہد کے مزاج کے تذبذب کو مجسم کر دیا ہے۔ اقبال کی شاعری میں بھی ایک پیکر ابھرتا ہے' جسے انسان کامل یا مرد مومن سے وہ موسوم کرتا ہے۔ یہ بھی عصری تقاضوں کے تحت منصۂ شہود پر آتا ہے' لیکن دونوں کے مزاج میں کوئی ہم آہنگی نہیں۔ فاؤسٹ حقیقی زندگی کا مظہر ہے یعنی یہ کہ وہ اسی طرح کا ہے جس طرح کی زندگی ہے' لیکن مرد مومن کی زندگی کا آغاز فاؤسٹ کے سفر کے اختتام سے ہوتا ہے۔ مرد مومن ایک جہان تازہ کے نئے امکانات اور حیات کی تمام امکانی گذرگاہوں کا مسافر ہے۔ فاؤسٹ گناہوں میں الجھا ہوا ابلیس کا آلہ کار ہے' لیکن مومن کے سامنے ابلیس ایک "ہمدم دیرینہ" کی حیثیت سے ابھرتا ہے۔ فاؤسٹ اپنی ذات کی تلاش میں امتیاز خیر و شر کی طنابیں توڑ دیتا ہے اور اپنی بے عنان آرزوؤں کا شکار ہو جاتا ہے۔ مرد مومن کے پختہ عزائم' اس کی خود اعتمادی' اس کی وسعت فکر و نظر' اس کی روحانی قوت' اس کا جذبہ قرب الٰہی' اس کی قوت تسخیر' اس کا جذبہ عمل' اس کی اطاعت اور اس کا عشق رسولؐ' اس کی فراست اور اس کا لامتناہی شعور' اس کی بے باکی اور اس کا قلندرانہ پن' اس کی درویشی' بے نیازی اور اس کا فقر' اس کی مستحکم خودی' اس کا جذبہ نیابت الٰہی اور اشتیاق دیدار حق' اس کی شاہینی اور اس کا سوز و ساز' اس کی بے اطمینانی اور اس کا دروغ داغ و جستجو' اس کے ہنگامے اور ذوق نمو' اس کی خدا ترسی اور بت شکنی' اس کی بے نیازی اور اس کے بے لوث اعمال اسے ابلیس سے خائف کرنا تو درکنار "یزداں بکمند آور" کی ترغیب دیتے ہیں اور وہ علی الاعلان کہتا ہے کہ :

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

فاؤسٹ کی نگاہیں انسانی دکھوں پر اجمالی طور پر ہیں' جبکہ مرد مومن کی نگاہیں حد درجہ جز رس اور نکتہ آفریں ہیں۔ وہ سیاست' مدنیت' مذہب' تہذیب' تاریخ' عمل' عقیدہ' ایمان' ایقان' حکومت' بغاوت' فقیری' امیری' اہرمن و یزداں' معاشیات و عمرانیات' غرض زندگی کے تمام پہلوؤں پر بھرپور نگاہ رکھتا ہے اور اس کا دائرہ عمل ہمہ محیط ہونے کے ساتھ ساتھ حد درجہ وسیع بھی ہے۔

اگر ہیروئی توانائی پسندی کے خمیر سے ابھرے ہوئے فاؤسٹ کی ادبی اور تاریخی عمر تقریباً ساڑھے چار سو برس ہے تو مرد مومن کی تاریخی عمر چودہ سو سالہ عظیم الشان اسلامی تاریخ کے زیر و بم پر محیط ہے اور اس کا اندروں خانہ ساز ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی ذات کی تعمیر و تشکیل میں اقبال نے دوسرے تمام کرداروں کو مدنظر رکھا ہو' لیکن اس کا خمیر خالصتاً" اسلامی ہے اور مثالی کرداروں کی بھیڑ بھاڑ میں اپنے نمایاں قد کی وجہ سے یہ آسانی سے پہچانا جاتا ہے۔ فاؤسٹ راہ کی نیرنگیوں میں کھویا ہوا ایک دوزخی انسان ہے جسے یزداں طلبی بھی ستاتی ہے اور اخیر میں اپنے گناہوں کے کفارہ کے طور پر محبت کی آگ میں جل کر جنت کا حقدار بنتا ہے اور مرد مومن معصوم اور بے گناہ ہے اور جنت اس کا ادنیٰ مقام ہے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح سے اسلام آخری اور مکمل مذہب ہے اور تمام نوع بشر کے لئے یکساں مفید ہے' ٹھیک اسی طرح دنیا کے دانشوروں اور فنکاروں کے یہاں پائے جانے والے مثالی اور تخلیقی کرداروں کے درمیان مرد مومن اپنے آپ میں مکمل اور ہمہ جہت اور ابدی کردار ہے' جو ہر زمانے میں یکساں مفید اور دلچسپ ہے۔ فاؤسٹ کا ابتدائی تقدس اگلے زمانے کے لوگوں کے تقدس کی نشاندہی کرتا ہے اور تقدس سے گناہ کی طرف مراجعت عصر حاضر کا غماز ہے۔ پھر گناہ سے محبت اور عبودیت کا سفر آئندہ کے لئے ایک بشارت ہے' لیکن مرد مومن کا کردار زمانے کے ان مفروضوں سے بے نیاز ہی نہیں بلکہ تینوں زمانوں کو اپنے آپ میں ضم کئے ہوئے ہے اور لافانی ہے۔ لہٰذا اقبال کے بارے میں جو لوگ بہت آسانی سے یہ فتویٰ صادر کر دیتے ہیں کہ اقبال کے خیالات تو نطشے اور گوئٹے سے ماخوذ ہیں' وہ اقبال کے ساتھ انصاف کرنے سے رہے' خود اپنے ساتھ انصاف نہیں کر

پاتے۔ ایسی غلط فہمی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اقبال نے نطشے اور گوئٹے کی بے حد تعریفیں کی ہیں اور ان دونوں کے یہاں بھی انسان کی پیکر تراشی ملتی ہے۔ اسی لئے بڑی آسانی سے یہ بات کہہ دی جاتی ہے اور اس پر دھیان نہیں دیا جاتا کہ اقبال نہ صرف نطشے اور گوئٹے کی شان میں رطب اللسان ہے بلکہ حلاج' بھرتری ہری' کارل مارکس' گوتم بدھ' رام کرشن' ہیگل' برگساں' کانٹ' گرونانک' مزدک اور دیگر اکابرین کی شان میں بھی اس نے عقیدت مندانہ اظہار خیال کیا ہے۔ مولانا روم کو تو اس نے اپنا مرشد ہی بنا رکھا ہے' لیکن صاحب نظر نقاد سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ مرید ہندی ہر جہت سے پیر رومی سے بڑا دانشور ہے۔ یہ تو اقبال کی عظمت ہے کہ اس نے ہر عظیم مفکر اور فنکار کو خراج تحسین پیش کیا ہے' کیونکہ اس نے ان سب کا براہ راست مطالعہ کیا ہے اور متاثر بھی ہوا ہے۔

ورنہ حقیقت حال تو یہ ہے کہ اقبال ہر لحہ "تراشیدم و پرسیدم و شکستم" کے اصول پر عمل پیرا رہا ہے اور اقبال کو اپنی عفت قلب و نگاہ کا شدید احساس بھی ہے' اسی لئے وہ بیساختہ کہتا ہے اور بجا کہتا ہے کہ :

میان آب و گل خلوت گزیدم
ز افلاطون و فارابی بریدم
نہ کردم از کسے در یوزۂ چشم
جہان را جز بچشم خود نہ دیدم

حواشی

1. ماخوذ از "تصور بشر اور اقبال کا مرد مومن" صفحہ 72- راقم الحروف
2. ماخوذ از "تصور بشر اور اقبال کا مرد مومن" صفحہ 96 - 97- راقم الحروف

(اقبال آشنائی۔ مظفر پور (بہار)' 1982ء' ص 132-156)

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

اقبال اور گوئٹے

اقبال، گوئٹے کے قدر شناس اور اس سے بے حد متاثر تھے۔ ماحول اور پس منظر کے اختلافات کے باوجود اقبال اور گوئٹے دونوں یک گونہ باہمی روابط کے حامل تھے۔ دونوں شاعر اور ایک خاص پیغام کے مبلغ بھی تھے۔ دونوں زندگی کی سعادتوں اور عظمتوں کے علم بردار تھے۔ دونوں اپنی زندگی کی توانائیاں بلند تر اور پاکیزہ تر مقاصد کے حصول میں صرف کرتے رہے۔ اقبال نے کہا:

زندگی جوئے روان است و رواں خواہد بود
ایں مئے کہنہ جوان است و جواں خواہد بود

گوئٹے کا قول ہے کہ زندگی کے ہاتھوں بیعت ہو چکا ہوں، جو بذات خود ایک مقصد جلیل ہے!

کر کے بیعت حیات کے ہاتھوں
حامل مقصد جلیل ہوں میں

گوئٹے کا نظریہ حیات وحدۃ الوجودی نقطہ نظر سے رنگا ہوا تھا۔ اقبال بھی قیام کیمبرج کے زمانے میں وحدۃالوجود کی طرف مائل تھے، لیکن بعد ازاں اس سے منحرف ہو گئے۔ فلسفہ وحدۃ الوجود اخلاقی اقدار کے تمام پہلوؤں پر منفی طور سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اخلاقی ذمہ داریوں کے بارے میں اقبال کے جو گہرے احساسات "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی"

میں ظاہر ہوئے اور جو اقبال کے سارے کلام میں جاری و ساری ہیں' ان کے ساتھ وحدۃ الوجود کا نباہ ہونا ذرا دشوار سی بات ہے۔

اقبال اور گوئٹے دونوں کے یہاں انسانی شخصیت کے ارتقا کا راستہ مستقل اور مسلسل تخلیقی جدوجہد سے ہو کر گزرتا ہے۔ دونوں کی حیثیت مشرق اور مغرب کے درمیان رابطے کے پل کی سی ہے۔ اقبال نے مغرب کو مشرق سے اور گوئٹے نے مشرق کو مغرب سے گلے ملانے کی کوشش کی ہے۔ اس عمل کے دوران میں دونوں نے اپنی شناخت برقرار رکھی' اگرچہ بالآخر اقبال زیادہ مشرقی رہے اور گوئٹے نسبتاً کم تر مغربی ثابت ہوئے۔ اقبال مغربی سائنس' ٹیکنالوجی اور مادی ترقیات کے قدر شناس ضرور تھے' لیکن سماجی و معاشی نظام میں مغرب کی وطنیت' نسلیت' سرمایہ داری' ملوکیت سے کم کم اور فسطائیت یا اشتراکیت و اشتمالیت سے بہت ہی کم متاثر ہو سکے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ نسلی' جغرافیائی' لسانی اور اقتصادی تفرقے اس انسانی وحدت کے تصور کو پارہ پارہ کر دیں گے' جس سے ان کی گہری وابستگی ہے۔ وہ معاشی مسئلے کا بڑا گہرا شعور رکھتے تھے اور اس بات پر مصر تھے کہ روزی کا مسئلہ حل ہونا چاہئے' لیکن وہ نہایت پر زور طریقے سے اس حقیقت کا اعلان بھی کرتے تھے کہ انسان صرف روٹی کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ کارل مارکس کو ایک باطل پیغمبر گردانتے تھے' جس کا مذہب صرف مساوات شکم کے اصول پر مبنی ہے۔

اقبال انسان کے نظام حیات میں ایک انقلاب کے خواہاں تھے۔ اگرچہ ذہنی و روحانی تشریق نو کا عمل ان کے نزدیک بنیادی اہمیت رکھتا ہے' تاہم معاشی مسائل کے بارے میں بھی ان کے کلام میں بڑی بے تابی و بے قراری کا اظہار ہوا ہے' مثلاً "بال جبریل" میں ایک جگہ وہ یہاں تک کہہ گئے ہیں :

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

ان کا یہ نعرہ انتہائی غم و غصے کا مظہر ہے اور قنوطیت کا یہ احساس ایک عارضی دور گزراں ہی کہا جا سکتا ہے۔ گوئٹے کو اشتراکی انقلاب کی ہنگامہ خیزی سے کبھی دوچار ہونا نہیں پڑا' لیکن عوامی جبر و تشدد کا کوئی ایسا مظاہرہ جو تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کو تہہ و بالا کر دے' اسے ہرگز گوارا نہ ہوتا۔ جس طرح انقلاب فرانس کا ہنگامہ گوئٹے کے لئے بیزار کن

تھا' اسی طرح اشتراکی جنونیوں کے ہنگامے بھی اسے راس نہ آتے!

گوئٹے عالمی شہریت کا حامی تھا۔ اس کی روح کسی جغرافیائی یا سیاسی حدود میں مقید نہیں کی جا سکتی تھی۔ اگرچہ یورپ کے باہر اس نے کبھی سفر نہیں کیا اور اس کے تفریحی و سیاحتی دورے صرف جرمنی' اٹلی اور سوئٹزر لینڈ تک ہی محدود رہے' لیکن وقت و مقام کے قیود و حدود اس کے لئے بے معنی تھے۔ اس کے ذہن کی حیرت انگیز آفاقیت' نیز اس کی فراخ دلی اور وسیع النظری' نے اسے اقبال کا "مردِ آفاقی" بنا دیا تھا۔ نپولین ایک جرمن سمجھتے ہوئے اس سے ملا تھا' لیکن جب اسے دیکھا تو حیرت سے بولا "ارے تم تو انسان ہو!"

مشرق سے گوئٹے کی اتنی دلی عقیدت' مغرب سے اس کی مایوسی اور بیزاری کا نتیجہ تھی۔ مغرب پیہم بد نظمی اور ہنگاموں میں مبتلا ہو کر انسانی ہمدردی کی گرم جوشی سے محروم تھا.... گوئٹے کے ذہن و مزاج کی ثقافتی بنیاد اقبال کے مقابلے میں وسیع تر تھی۔ وہ مغرب و مشرق کی کئی زبانیں جانتا تھا۔ خصوصاً عربی و فارسی زبان و ادب کے بارے میں اس کی دلچسپی حیرت انگیز تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنے مشرقی مد مقابل شخصیت (اقبال) سے کہیں زیادہ تاریخ و ثقافت کے بند خزانوں کو کھولا ہے۔ وہ ایک سائنس دان بھی تھا اور اس شعبے میں اس کا یادگار کارنامہ فطرت کے بارے میں اس کا جدید نظریہ یعنی عالم فطرت میں "اصول وحدت" کی دریافت ہے' جس سے اس کے عہد کے عظیم ترین سائنس دان بھی متاثر ہوئے۔ اس نے نیوٹن کے نظریہ الوان (Theory of Colours) کو چیلنج کیا۔ اس نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ حکومت کی اعلیٰ انتظامی ذمہ داریاں سنبھالنے میں صرف کیا اور پریوی کونسلر' نیز زراعت' جنگلات' معدنیات اور تعلیم کے شعبوں میں وزارت کے مناصب پر فائز رہا۔ وہ حکومت کے جن عہدوں پر فائز ہوا' ان سب کو اس نے نئی آب و تاب بخشی اور نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ انتظامی امور اور گوناگوں فوجی و سیاسی مہمات میں انہماک کے باوجود وہ سائنسی تحقیقات' اپنے لافانی آرٹ اور عاشقانہ وارداتوں کے لئے بھی وقت نکال لیتا تھا۔

گوئٹے کی زندگی میں خواتین کی بڑی اہمیت تھی۔ اس کے معاشقے بھی متعدد اور مطلق غیر رسمی نوعیت کے تھے۔ گوئٹے کی نگاہ عالم فطرت اور کائنات کے ہر حسین' نفیس اور نازک پہلو میں ایک نسائی اصول کی جھلک دیکھ لیتی تھی۔ اس نسائی اصول کا سب سے زیادہ دلکش

مظاہرہ اس کے نزدیک نسوانی حسن و جمال میں نمایاں ہوا۔ گوئٹے کے نزدیک عورت ہی انسانی نجات کی بشارت تھی۔ "فاؤسٹ" کے اختتامی منظر میں جب شر اور خیر کی قوتیں فاؤسٹ کی روح پر قبضہ جمانے کے لئے کوشاں تھیں' تو اس کی محبوبہ مارگریٹ ہی کے ذریعے اسے نجات ملی۔ الغرض گوئٹے کے لئے دنیا اور آخرت میں عورت کی محبت ہی واحد نجات دہندہ تھی۔ "فاؤسٹ" کے اختتامیہ پر اسی تصور کا اظہار بہترین الفاظ پر ہوا ہے :

"ہر شے عارضی اور فانی ہے..... عورت کی روح ہی دنیا اور آخرت میں ہماری رہنمائی کرتی ہے!"

نسل انسانی کے لئے یہی اس کا امید افزا پیغام ہے۔ اقبال کا پیغام بھی' اگرچہ ابدی قانون کے وسیلے سے نہیں ادا ہوا' تاہم آفاقی نوعیت کا ہے اور ہمارے لئے قطعی طور پر تسلی بخش بھی!

آنچہ بودست و نباید زمیاں خواہد رفت
آنچہ بایست و نبود است ہماں خواہد بود

جہاں تک خواتین کا تعلق ہے' اقبال اسے تخلیقی عمل کی علامت قرار دیتے ہیں اور تشکیل حیات و بقائے نسل انسانی کا ضامن بھی! جہاں تک اقبال کی زندگی کا تعلق ہے' اگرچہ عورت نے ماں کے روپ میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کیا اور گوئٹے اپنی ماں کا بہت زیادہ رہین منت ہے' تاہم اقبال نے ماں کی یاد میں جو شاہکار نظم لکھی ہے' اس کی کوئی مثال گوئٹے کے کلام میں نہیں ملتی۔

گوئٹے اور اقبال دونوں بیرسٹر تھے' لیکن گوئٹے کو قانون سے کم تر دلچسپی تھی اور جلد ہی وہ اس پیشے سے دست بردار ہو گیا۔ گوئٹے 83 برس جیا' جب کہ اقبال صرف 63 سال! گوئٹے کی جسمانی صحت بھی بہتر رہی۔ اقبال اپنے لباس اور رہن سہن میں قلندرانہ بے نیازی برتتے تھے' لیکن گوئٹے اس کے برعکس تھا۔ بحیثیت فنکار دونوں زندگی سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ دونوں فن برائے فن نہیں بلکہ فن برائے حیات کے قائل تھے۔ دونوں کو اپنے تخلیقی آمد والے لمحات کا منتظر رہنا پڑتا تھا' اگرچہ گوئٹے نسبتاً بسیار نویس اور زود گو تھا۔ دونوں غیر تخلیقی اوقات میں چھٹی مناتے تھے۔ گوئٹے اور اقبال دونوں امریکہ کی آزادی اور غیر روایتی انداز کے قدر دان تھے اور مستقبل کی دنیا کے لئے اس کی رہنمائی کے متوقع

بھی!

رومی کے بعد اقبال سب سے زیادہ گوئٹے سے متاثر ہوئے۔ اقبال گوئٹے سے کہیں زیادہ معاشرے اور قوم کے بارے میں تعلق خاطر رکھتے تھے۔ یہ کہنا مناسب ہو گا کہ گوئٹے کی تخلیقات غالب اور حافظ کی طرح اس کی شخصی انفرادیت کی رہین منت تھیں' جبکہ اقبال کے نظریات انسانیت اور فرد کے ارتقا کے ساتھ ایک مثالی معاشرے کی تخلیق سے بھی وابستہ تھے۔ فرد و جماعت کے حقوق و مفادات میں اعتدال و توازن اقبال کے مد نظر تھا۔ اقبال کے نزدیک فرد جماعت سے وابستگی کے بغیر نشو و نما نہیں پا سکتا۔ اسی طرح مثالی معاشرہ عظیم افراد کی عظیم قربانیوں کے بغیر تعمیر نہیں ہو سکتا۔ افراد کو فوری مفادات کی قربانی جماعت اور معاشرے کے عام مفاد کے لئے دینی پڑتی ہے۔ اسی ایثار و خدمت پر فرد و جماعت دونوں کے فروغ کا انحصار ہے۔

اقبال کو جس بات نے گوئٹے کی طرف مائل کیا' وہ گوئٹے کا انسانی شخصیت کے ارتقا سے والہانہ لگاؤ تھا۔ اس کے علاوہ مشرق اور مشرقی ادبیات سے گوئٹے کی دلچسپی بھی اقبال کے لئے باعث کشش بن گئی۔ پھر اسلام اور پیغمبر اسلامؐ اور قرآن مجید سے گوئٹے کی عقیدت نے اقبال کو اور زیادہ متاثر کیا اور گوئٹے سے مزید قرب اور لگاؤ کا باعث ہوا۔ گوئٹے ایک جگہ کہتا ہے:

"اگر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ انسان مرضی مولا کے سامنے جھک جائے یا راضی برضائے الٰہی ہو جائے تو گویا ہم سب اسلام ہی میں جیتے اور مرتے ہیں!"

محض اسی قول سے گوئٹے کی اسلامی روح کی اس قدر شناسی کا ثبوت ملتا ہے' جو خود مسلمانوں میں بھی عام نہیں ہے۔ گوئٹے کا یہ قول محض اس کی اسلام شناسی کی دلیل نہیں بلکہ درحقیقت گوئٹے کی قلبی و ذہنی کیفیت اور اس کے وجود کا ایک حصہ ہے۔

جب گوئٹے اپنی زندگی کے سب سے بڑی المیے سے دوچار ہوا' یعنی جب اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کی خبر سنی' تو اس نے ایک سچے مومن کے پرخلوص جذبہ عبودیت سے کہا: "میں جانتا تھا کہ میرا بیٹا لافانی نہیں ہے۔" اس کے دیوان کا یہ شعر بہت مشہور ہے جس میں اس نے قرآن کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ صلاح الدین خدا بخش کے الفاظ میں گوئٹے نے اسلام کا خلاصہ اور اس کی تعلیم کی روح دوسری سورۃ میں پالی' جو یوں شروع

ہوتی ہے : **الم ذالک الکتاب لا ریب فیہ' ھدی للمتقین.... واولئک ھم المفلحون**
اور اسی طرح گوئٹے یکے بعد دیگرے قرآنی سورتیں نقل کرتا جاتا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کی مدح میں اس کا قصیدہ "نغمہ محمدؐ" ان عظیم ترین قصائد میں سے ہے' جو آنحضرت صلعم کی شان میں کسی مسلم یا غیر مسلم نے لکھے ہوں گے اور یہی وہ چیز ہے جو گوئٹے کو کسی بھی یورپی مصنف کے مقابلے میں ہم سے قریب تر کر دیتی ہے۔ اگرچہ ہم پاکستان میں جرمن زبان و ادب کے مقابلے میں انگریزی زبان و ادب کی روایات میں پرورش پاتے رہے' لیکن یہی ایک سبب ہے' جس نے گوئٹے کو پاکستان میں شیکسپیئر سے زیادہ مقبول بنا دیا ہے۔ گوئٹے کے زیر اثر اقبال نے ایک سے زیادہ نظمیں کہی ہیں۔ عام شعرا اکثر اپنے متقدمین سے متاثر ہوئے ہیں اور اپنے معاصرین سے بھی کسی نہ کسی طرح متاثر ہوتے ہیں' لیکن ہر فنکار کی انفرادیت اس کے کلام میں جھلکتی ہے اور اسے منفرد بناتی ہے۔ ہومر نے ورجل کو متاثر کیا اور ورجل نے دانتے کو' شیکسپیئر نے تقریباً اپنے تمام ڈراموں کی کہانیاں قدما سے اخذ کی ہیں۔ گوئٹے بھی شیکسپیئر کا رہین منت ہے۔ اگرچہ دونوں میں خاص فرق یہ ہے کہ گوئٹے کے یہاں فلسفہ حیات ملتا ہے' جبکہ شیکسپیئر کے یہاں اس کا فقدان ہے۔ اتفاق سے گوئٹے نے "فاؤسٹ" کا قصہ ورثے میں پایا ہے' جس طرح وارث شاہ کو ہیر رانجھا کی کہانی ورثے میں ملی تھی' لیکن اصل چیز تو فنکار کا اسلوب اور فن ہے۔ موضوع و مافیہ کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔

مرحوم پروفیسر شریف نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ڈیکارٹ (Descartes) نے کئی کئی صفحات غزالی کی تصانیف سے بغیر حوالے نقل کر لئے ہیں۔ جب ہم نطشے کے "مرد برتر" (Uebermensch) اور اقبال پر اس کے اثر کا ذکر کرتے ہیں' تو اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ "مرد برتر" کا لفظ گوئٹے کے "فاؤسٹ" میں بھی ملتا ہے اور "انسان کامل" کا تصور عبدالکریم جیلی جیسے مسلم صوفیہ سے ماخوذ ہے' جس پر اقبال نے ایک مقالہ لکھا تھا' جو سر رچرڈ ٹمپل کے جرنل The Indian Antiquary کے 1910ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ یہاں اس امر کی وضاحت کا موقع تو نہیں' لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقبال کے فکر و فن پر رومی اور گوئٹے ہی کے اثرات خاص طور پر پڑے ہیں' اگرچہ ان کے مابین بنیادی قسم کے فرق بھی پائے جاتے ہیں۔

اقبال پر گوئٹے کے اثرات "پیام مشرق" میں واضح نظر آتے ہیں۔ "پیام مشرق" پر گوئٹے کے دیوان "West-oestlicher Divan" (مشرقی مغربی دیوان) کا فیضان نمایاں ہے، جس کا ترجمہ جرمنی میں اینی ماری شمل نے Botschaft des Ostens کے نام سے کیا ہے، لیکن "پیام مشرق" کے علاوہ بھی کئی اور نظمیں ہیں جن میں گوئٹے کے اثرات کا سراغ ملتا ہے۔ مثلاً "بانگ درا" میں ایک نظم "ایک شام (ہائیڈل برگ میں)" کے عنوان سے ہے، جو دریائے نیکر کے کنارے لکھی گئی تھی۔ "خاموش ہے چاندنی قمر کی" یہ اور اس کے ساتھ پانچ اور نظموں کے تراجم جرمن زبان میں مرحوم Otto von Glasenapp نے کئے تھے۔ گوئٹے کی نظم "The Wanderer's Night Song" کا ترجمہ غالباً کالرج نے یوں کیا ہے:

Over all hill tops

in ease

In all tree tops

Thou feelest

Hardly a breath

The little birds are silent,

Wait but a while, soon,

Thou too shalt rest.

اس نظم میں گوئٹے کی نظم "آوارہ گرد کا نغمہ شبانہ" کے آہنگ کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اس عنوان سے اس نے دو نظمیں لکھی ہیں۔

"آوارہ گرد کا نغمہ شبانہ"

چوٹی چوٹی پہ کہسار کی ہے سکوں
اور درختوں کی شاخیں ہیں یوں دم بخود
جیسے ان میں کوئی سانس باقی نہیں
اور جنگل میں معصوم ننھے پرندے بھی خاموش ہیں
ٹھہر، ایک پل کے لئے تو ٹھہر!

مجھے بھی سکوں جلد مل جائے گا!!

دونوں نظموں میں رات کی خموشی اور شاعر کے دل کی بے قراری کا اظہار ہوا ہے۔ دونوں میں ایک قسم کی رومانی افسردگی پائی جاتی ہے، لیکن دونوں کا خاتمہ ایک پرسکون لے پر ہوا ہے۔

اقبال کی نظم ہائیڈل برگ میں لکھی گئی تھی اور اس شہر حسن و رومان کے سحر آفریں فضا میں ڈوبی ہوئی ہے۔ جہاں گوئٹے اپنی محبوبہ سے ملا تھا اور جہاں اقبال نے اپنی زندگی کے کچھ بہترین رومانی ایام گزارے تھے۔ اسی دور کی ایک اور نظم "حقیقت حسن" ہے، جو بقول ڈاکٹر ریاض الحسن، گوئٹے کی نظم "Vier Jahreszeitens" (چہار موسم : چو ماسا) سے ماخوذ ہے۔

گوئٹے کے دیوان کا یہ شعر (انگریزی ترجمہ) :

The God belongs the East

The God belongs the West

لله المشرق والمغرب کا ترجمہ ہے۔ اسی طرح گوئٹے کی اس دعا میں **اهدنا الصراط المستقيم** کا ترجمہ ہے (انگریزی ترجمہ) :

When I do business

or write poetry

Keep me, O Lord, on the Straight Path

گوئٹے کہتا ہے (انگریزی ترجمہ) :

Two graces give our

breathing worth,

To draw air in, then send it forth

That with a power to cramp and tighten

This to expand us, and to brighten

سعدی کی "گلستان" کے ان الفاظ کا ترجمہ ہے :

"ہر نفسے کہ فرومی رود، ممد حیات است و چوں برمی آید مفرح ذات"

یہ تمام مثالیں "Talisman" سے ماخوذ ہیں جو "مغنی نامہ" (گوئٹے) میں شامل ہیں۔ ایک مثال گوئٹے کی ایک اور شاہکار نظم "Buch Suleika" "کتاب زلیخا" سے ماخوذ ہے۔ اس کتاب کے افتتاحی مصرعوں کا ترجمہ درج ذیل ہے (انگریزی ترجمہ):

In Thousand forms mayst

Then attempt Surprise

Yet all beloved, once straight I know thee

یہاں اس فارسی شعر کا ترجمہ ہے:

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

اگر اس کے دیوان کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو اس قسم کی بہت سی مثالیں اس کے کلام میں ملیں گی، لیکن ایک خاص بات اس ضمن میں یہ ہے کہ جب وہ مشرقی ادبیات سے کوئی نکتہ یا خاص تصور اخذ کرتا ہے تو اسے بڑی فنکارانہ مہارت سے نئے اور حسین تر اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک جرمن شاعر ہائینے (جس نے گوئٹے کے "دیوان" کو مغرب کی طرف سے مشرق کے لئے ایک حسین گلدستہ قرار دیا ہے) کہتا ہے کہ گوئٹے کے اشعار اس قدر مکمل، مترنم، پر لطف اور فصیح و بلیغ ہیں کہ گوئٹے کا "دیوان" اس کے بہترین کارناموں میں سے ہے۔ اقبال نے ایک شعر میں گوئٹے کو غالب کا ہم نوا قرار دیا ہے:

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے
(بانگ درا، ص 26)

اس سلسلے میں اقبال کا یہ شعر بھی بہترین خراج تحسین ہے:

صبا بہ گلشن ویمر پیام ما برساں
کہ چشم نکتہ وراں خاک آں دیار افروخت

(فروغ اقبال، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 1996ء، ص 148-157)

وزیر زادہ محمد اشرف خاں اشرف

گوئٹے اور اقبال

اقبال اور گوئٹے کے بعض حالات و طبائع میں بہت حد تک یگانگت و مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان دونوں عظیم المرتبت و اولوالعزم شعرانے قانون کو بطور پیشہ اختیار کیا اور دونوں نے قانونی موشگافیوں سے بالکل قطع تعلق کر کے شعر و سخن میں زندگی کا لطف اٹھایا۔ گوئٹے کی آزاد شاعرانہ طبیعت قانون کی کڑی پابندی سے یکسر متنفر ہو چکی تھی(1) اور علامہ اقبالؒ باوصف اپنی فطری ذہانت ایک کامیاب بیرسٹر کی حیثیت سے نہ چمک سکے اور اپنے آخری ایام میں ہمہ تن شعر و سخن میں منہمک ہو گئے تھے۔ ان دونوں تلامیذ الرحمان نے لسان الغیب خواجہ حافظؒ کے وجد آفرین و کیف آور سرمدی نغموں سے نہ صرف لطف اٹھا کر اپنی روحوں کو بالیدگی اور دلوں کو وجدان بخشا' بلکہ ان کی دلنشیں تراکیب و اسالیب بیان کو بھی اپنے اپنے کلام میں جا بجا اختیار کیا۔ ان دونوں شعرا کو قدرت نے اپنے افکار و شاہکارات مجتمع کرنے کے مواقع بخشے اور طویل عمریں عنایت کیں۔ اقبال سن مسنون(2) کو پہنچ کر اس دار فانی سے رحلت کر گئے اور گوئٹے تیراسی سال کا تھا جب کہ اس کا تن خاکی سپرد خاک وسیمر ہوا(3)۔

ان دونوں مشاہیر کا انجام بالخیر ہوا اور اپنے آخری لمحات میں بھی اپنی عظمت کا ثبوت بہم پہنچا گئے۔ اقبال کی نسبت کہا جاتا ہے کہ موت سے دس منٹ پہلے انہوں نے یہ بے نظیر قطعہ کہ دیا تھا:

سرود رفتہ باز آید کہ ناید

نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

اور گوئٹے کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ موت سے ذرا پہلے اس کے لب پر یہ آخری الفاظ جاری تھے "کچھ اور روشنی"۔ ہمیں یہاں کرشن کے اس قول کو نہیں بھولنا چاہئے کہ "موت کا وقت تمام زندگی کی عادات کا نتیجہ ہوتا ہے۔"

بائرن کے تخیلات کو ان دونوں مشاہیر شعرا نے اپنے اپنے نغمات شیریں میں سراہا ہے۔ اقبال کی رائے بائرن کے متعلق تو ہم آگے بیان کر آئے ہیں۔ گوئٹے نے 1823ء میں بائرن سے جب کہ وہ جنیوا چلا گیا تھا' ایک نظم لکھی تھی۔

ان دونوں مشاہیر شعرا نے اپنے اپنے بہترین شاہکارات و نغمات کلام الٰہی سے اخذ کئے ہیں۔ اقبال کے بارے میں ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ انہوں نے فرقان حمید سے بہت فائدہ اٹھایا ہے اور قرآنی قصص' انکار ابلیس و اغوائے آدم کو زبان شعر میں ادا کیا ہے۔ گوئٹے انجیل مقدس سے بہت حد تک فیضیاب ہوا ہے۔ چنانچہ اس کا بہترین ڈرامہ "فاؤسٹ" جس میں اس نے اپنا کمال فن دکھایا ہے' کلام الٰہی کا مرہون منت ہے جیسا کہ اس نے اپنی خود نوشت سوانحعمری میں اعتراف کیا ہے۔ اگر اقبال نے گوئٹے کے کمال فن کا اعتراف کیا ہے تو موخر الذکر نے شیکسپیئر کے کمال کے آگے نہ صرف زانوئے ادب تہہ کیا ہے' بلکہ اس نے اپنے کئی نغمات شیریں کی تاسیس انگلستان کے اس مایہ ناز شاعر کے افکار پر رکھی ہے۔ چنانچہ شیکسپیئر کی عظمت کے آگے سرنگوں ہوتے وہ خود لکھتا ہے :

"شیکسپیئر کی عظمت کو جرمنوں نے دوسری اقوام عالم سے زیادہ تسلیم کیا ہے۔ بلکہ اس کی اپنی قوم سے بھی زیادہ۔ ہم لوگوں نے اس کے معاملہ میں اتنا انصاف کیا ہے کہ ہم نے خود اپنے ساتھ نہیں کیا ہے۔ مشاہیر نے اسے بہترین صورت میں پیش کرنے کی سعی بلیغ کی ہے اور میں نے خود ہمیشہ اس کی پرزور تائید کی ہے۔ میں نے بوضاحت ان تاثرات کو بیان کیا ہے جو اس غیر معمولی دماغ کے مجھ پر پڑ گئے ہیں اور اس کی تصانیف پر کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے' جو پسند عام ہو گئی ہے۔"

ان دونوں مشاہیر نے اپنے اپنے قدما سے استفادہ حاصل کیا ہے۔ اقبال نے حافظ و

سعدی اور مرشد رومی کے فیض سے عروس سخن کو آراستہ کیا تو گوئٹے نے شیکسپئر، ہومر اور سپائینوزا کے مطالعہ سے وسعت نگاہ حاصل کی۔

ان دونوں مفکرین نے اپنی تعلیمات میں عملی زندگی کی تلقین کی ہے۔ اقبال نے تو ہمیں صاف صاف کہہ دیا ہے ۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

چنانچہ زیر نظر تصنیف میں "جہان عمل" کے تحت وہ لکھتے ہیں :

ہست ایں میکدہ و دعوت عام است اینجا
قسمت بادہ بہ اندازۂ جام است اینجا(۸)
اے کہ تو پاس غلط کردۂ خود می داری
آنچہ پیش تو سکون است خرام است اینجا
ما کہ اندر طلب از خانہ بروں تاختہ ایم
علم را جاں بدمیدیم و عمل ساختہ ایم

گوئٹے رقم طراز ہے کہ آدمی صرف غور و فکر سے اپنے آپ کو پہچان نہیں سکتا ہے بلکہ خود شناسی عمل سے آ جاتی ہے۔ اگر ڈرامہ "فاؤسٹ" کی نسبت کسی کا یہ اظہار ہے کہ انیسویں صدی کا سب سے بڑا ادبی شاہکار ہے تو میرا یہ کہنا کہ بیسویں صدی میں مثنوی "اسرار خودی و رموز بے خودی" لکھ کر علامہ اقبال نے اپنا شاہکار دنیا کے سامنے پیش کیا، جو یورپ کے شعرا و ادبا سے بھی خراج تحسین حاصل کر چکا ہے ،مبالغہ آمیز نہ ہو گا۔

ان دونوں خوش نصیب شعرا کی اپنے اپنے وقت کے شہزادگان نے قدر و منزلت کی۔ گوئٹے کو ڈیوک آف ویمر نے اپنا وزیر اعظم بنایا تو اقبال نے اپنی زندگی کے چند ایام شیش محل بھوپال میں گذارے۔

اقبال نے گوئٹے کے ساتھ اپنا موازنہ کیا ہے اور کیا خوب کیا ہے۔ جس کو یہاں درج کرنا خالی از دلچسپی نہ ہو گا:

پیر مغرب شاعر المانوی
آں قتیل شیوہ ہائے پہلوی

بست نقش شاہدان شوخ و شنگ
داد مشرق را سلامے از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغام شرق
ماہ تابے ریختم بر شام شرق
تاشناسائے خودم، خود بیں نیم
با تو گویم او کہ بود و من کیم
او ز افرنگی جواناں مثل برق
شعلہ من از دم پیران شرق
او چمن زادے، چمن پروردۂ
من دمیدم از زمین مردۂ
او چو بلبل در چمن "فردوس گوش"
من بصحرا چوں جرس گرم خروش
ہر دو دانائے ضمیر کائنات
ہر دو پیغام حیات اندر ممات
ہر دو خنجر صبح خند، آئینہ فام
او برہنہ، من ہنوز اندر نیام
ہر دو گوہر ارجمند و تاب دار
زادۂ دریائے ناپیدا کنار
او ز شوخی در تہ قلزم تپید
تا گریبان صدف را بر درید
من بہ آغوش صدف تابم ہنوز
در ضمیر بحر نایابم ہنوز

گوئٹے کے کمال فن کا اعتراف

زیر نظر تصنیف "پیام مشرق" میں علامہ اقبال نے المانوی شاعر اعظم کے کمال فن کا

اعتراف کیا ہے اور اس کا ذکر جہاں کہیں بھی آیا ہے' نہایت عقیدت(5) اور احترام کے ساتھ لیا ہے۔ دیگر مشاہیر و فلاسفہ پر چوٹ کرتے ہوئے وہ دریغ نہیں کرتے۔ جیسا کہ حکیم نطشے (6) اور افلاطون(7) یونان کا انہوں نے مضحکہ اڑایا ہے' لیکن گوئٹے کے افکار نہ صرف ان کو پسند آئے بلکہ اس کی نظموں کو خود ترجمہ کر کے انہوں نے اپنے مجموعہ کلام میں شامل کر لیا ہے۔ چنانچہ زیر نظر تصنیف میں گوئٹے کے بہترین ادبی شاہکار کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں "اس ڈرامے میں شاعر نے حکیم فوسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کے امکانی نشو و نما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمال فن خیال میں نہیں آ سکتا"(8)۔

پاکستان و ہندوستان اور ایران کے شعراء میں جہاں تک میرا علم ہے اقبال مرحوم نے ہی مغرب کے اس مفکر اعظم کے افکار سے ان ممالک کو اسی طرح روشناس کرایا ہے' جس طرح کارلائل نے انگلستان کو اس سے متعارف کرایا تھا۔

گوئٹے کے کمال فن کا نہ صرف علامہ اقبال گرویدہ ہیں بلکہ ایک عالم عقیدت کے لئے بے شمار خوشنما پھول اس شاعر کے ہمہ گیر تخیل کی نذر کر چکے ہیں۔ کارلائل جیسا عالم و فاضل شخص بھی اس عظیم المرتبت المانوی کے افکار پر والہ و شیدا تھا' لیکن سب سے بڑھ چڑھ کر گوئٹے کے نغمات کی اگر کسی شخص نے تعریف کی ہے' تو وہ اس کا ہم عصر اور ہم وطن شاعر غزل گوہائنا ہے۔ وہ لکھتا ہے :

> "اس وقت اقوام عالم سیاسی امورات میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ جب یہ سیاسی بحران اتر جائے اور ہم سب جرمن' برطانوی' ہسپانوی' فرانسیسوی اور اطالوی مل کر کسی سبزہ زار میں جا کر نغمہ سرائی کریں اور بلبل کو اپنا منصف قرار دیں تو مجھے یقین کامل ہے کہ اس عام مقابلہ میں گوئٹے کا نغمہ ہی مستحق انعام و اکرام قرار دیا جائے گا۔"

علامہ اقبال کی نظم "جوئے آب" گوئٹے کے دلکش زمزمہ موسوم بہ "نغمہ محمدؐ" کا آزاد ترجمہ ہے۔ اس نظم کے بارے میں خود گوئٹے رقم طراز ہے۔ "اس ڈرامے کے خاکے نے میرے دماغ کو اپنی طرف بہت مدت تک لگا رکھا کیونکہ میں حسب عادت لکھنے سے پہلے اس خیال کو نشو و نما پانے کا موقعہ دے رہا تھا کہ فطانت ایک اعلیٰ کردار اور قوی دماغ کے ساتھ

بنی نوع آدم پر جس حد تک اثر انداز ہو سکتی ہے اور وہ جن فوائد و نقصانات کی متحمل ہو سکتی ہے' کو منتہائی طریق پہ ظاہر کروں۔"

گوئٹے کا ہمہ گیر تخیل

گوئٹے کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے نہ صرف شعر و سخن کے میدان ہی میں اپنے اشہب تخیل کو دوڑایا ہے' بلکہ دیگر علوم و فنون پر بھی سیر حاصل تبصرہ جات کئے ہیں۔ خصوصاً اپنے وقت کی دنیائے سائنس میں اس کے انکشافات کی سب سے زیادہ قدر و منزلت کی جاتی تھی۔ نباتات و جمادات و حیوانات میں اس کے انکشافات کو ایک زمانہ تسلیم کرتا ہے۔(9)

گوئٹے کو اپنے دیگر علمی کارناموں پر ناز تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے ایک دوست کو اپنے شعر و سخن کی نسبت یہ رائے ظاہر کی تھی۔ "جو کچھ میں نے بحیثیت ایک شاعر حاصل کیا ہے' میں اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا۔"

لیکن مرزا اسد اللہ خاں غالب کی طرح جنہوں نے اپنے تمام اوقات کو فارسی شعر و ادب کی خدمت میں گزارا۔ بالآخر اردو کے شاعر ہی کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ گوئٹے کا نام بھی آج دنیا میں صرف اس کے بے نظیر نغمات شیریں کی وجہ سے زندہ جاوید ہے۔

یہاں ہمیں اس امر کو بھولنا نہیں چاہئے کہ گوئٹے کے جوہر پنہاں کیا تھے اور انہیں عیاں کرنے کے لئے بہت سی سہولتیں بہم تھیں' جو اقبال کو نصیب نہ ہوئیں۔ یہاں تک کہ اپنے افکار عالیہ کے اظہار کے لئے انہیں فارسی غیر ملکی زبان کی طرف رجوع کرنا پڑا۔

ادب برائے ادب کے بارے میں گوئٹے کا مطمح نظر

علامہ اقبال کا مطمح نظر ہم آگے بیان کر چکے ہیں۔ علامہ مرحوم نے اس بحث پر صرف چند اشعار کے ذریعہ اپنے خیالات کو جامہ اظہار پہنایا ہے' لیکن گوئٹے نے نہ صرف اپنے اشعار میں اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے بلکہ ایک دلچسپ ڈرامہ بعنوان "ادب برائے ادب کے متعلق اظہار حقیقت" لکھ کر اپنے افکار کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔ تفصیلات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ بہت حد تک اس مسئلہ پر گوئٹے کے افکار اقبال کے

تخیلات سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ گوئٹے خود رقم طراز ہے :

"جو شخص کسی نصب العین کو مدنظر رکھ کر کوشش کرتا ہے اس کی محنت بار آور ہوتی ہے، لیکن جو شخص ادب کے خیال سے سعی کرتا ہے وہ اپنے کام میں بالکل ناکامیاب رہتا ہے۔ اگر آرٹ کے نکتہ نگاہ سے اس کا کام معیار پر پورا نہ اترے۔"

"احیائے ادب" کے بارے میں گوئٹے لکھتا ہے :

"وہ دور ادب حقیقت میں بہت غنیمت ہے، جس میں ماضی کی بڑی بڑی تصانیف روشنی اور اشاعت عام میں لائی جاتی ہیں۔ کیونکہ اس سے ایک نیا اثر پیدا ہوتا ہے۔"

گوئٹے کے قومی تعصّبات و امتیازات نسلی

جرمن قوم کی سرشت ہی میں یہ چیز داخل ہے کہ وہ امتیازات نسلی و قومی سے بالاتر نہیں جا سکتی ہے۔ اس کی یہ کور بینی دنیا کے امن و امان کو کئی بار تہ و بالا کر چکی ہے اور کئی مرتبہ اس نے خون کی ندیاں بہا دی ہیں اور آج اقوام عالم کے سامنے ایک بیدست و پا اپاہج کی طرح اس شریر قوم کے بچے انصاف کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ حیرت کا مقام ہے کہ جرمن قوم کا مایہ ناز شاعر اعظم گوئٹے کا طائر فکر بھی باوصف اپنی فطری ذہانت و فطانت قومی اور مذہبی تعصّبات سے بالا تر پرواز نہ کر سکا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے "مسلمانوں کی طرف سے کافروں کی توہین اور ہماری قوم کے غلاموں کے ساتھ ان کا ناروا سلوک اس قابل ہے کہ ہم ان سے نفرت کریں اور انہیں تختہ دار پر لٹکا دیں۔" ملاحظہ ہو اس مفکر اعظم کا قومی اور مذہبی تعصب جس کے افکار پر مغربی دنیا کو ناز ہے۔

علیٰ ہذا القیاس۔ علم و ادب اور دیگر اصناف فنون لطیفہ کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "کاش ادب عالیہ کی بنیادیں یونانی اور رومن لٹریچر کی سطح ہی پر کھڑی کر دی جاتیں۔ چینی، ہندی اور قدیم مصری ادبیات بجز استعجاب انگیز ہونے کے اور کچھ نہیں۔ دنیا کو ان سے روشناس کرنا قابل قدر ہے، لیکن ان سے ہمارے اخلاقی نظام اور فنون لطیفہ کے کلچر کو کسی قسم کی استعانت نہیں مل سکتی۔"(10)

گوئٹے کے ان فرسودہ خیالات کے برعکس اقبال زیر نظر تصنیف "پیام مشرق" کے

دیباچہ میں لکھتے ہیں :

"اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالا تر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو' قابل احترام ہے۔"

بقول حافظ : بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

بایں ہمہ بعض متعصب نقاد آنکھوں پر تعصب کی پٹی باندھ کر اقبال کی شاعری کو صرف فرقہ وارانہ قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ شاعر مشرق ببانگ دہل کہہ گیا ہے :

من اول آدم بے رنگ و بوئم
ازاں پس ہندی و تورانیم من

ایسے اشخاص کو بقول اقبال اور کیا کہا جا سکتا ہے :

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں' تو بھی تو دلدار نہیں

گوئٹے کے بعض قابل قدر افکار عالیہ

گفت حکمت را خدا خیر کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر (اقبال)

جس طرح اقبال نے اپنے کوزہ "لالہ طور" میں اسرار زندگی کا ایک بحر بے کنار بند کر دیا ہے' اسی طرح گوئٹے اپنے افکار میں حقائق و معارف حیات کے لئے بے بہا موتی رولتا ہے اور کہیں کہیں اس کے تخیلات ہمارے مذہب اسلام کے ارشادات سے ملتے ہیں۔ مثلاً حدیث شریف میں آیا ہے کہ اعمال کا دار و مدار صرف نیتوں پر ہے(۱۱)۔ ہر شخص کے لئے اس کی نیت کا عوض مقرر ہے۔ گوئٹے اس آئین کو یوں پیش کرتا ہے۔ "انسان کے افعال میں جیساکہ فطرت کے افعال میں اصل شے جو لائق توجہ ہے' وہ صرف نیت ہے۔"

میرے علم میں اس حدیث شریف کی بہترین مثالیں ہمیں چنگیز خاں' ہلاکو خاں' صلاح الدین ایوبی اور رچرڈ ثانی کی زندگیوں میں ملتی ہیں۔ ان چاروں جابر اشخاص نے ابن آدم کا خون پانی کی طرح بہا دیا ہے۔

لیکن دنیا کے سامنے اول الذکر ہر دو اشخاص بے رحم قتال و قصاب ہیں تو موخر الذکر بہادروں کے کارنامے ان کی اپنی اپنی قوم کے لئے سرمایہ فخر ہیں۔ اور وہ "مرد غازی" و "شیر دل" کے القاب سے تاریخ میں یاد کئے جاتے ہیں۔ یہاں فرق صرف نیت کا ہے۔ چنگیز خاں اور ہلاکو خاں نے اپنے حرص و ہوا کی آگ کو بجھانے کے لئے اپنی خونچکاں تلواروں کو بے نیام کر کے متمدن ممالک پر ڈاکہ ڈال کر خون کی ندیاں بہا دیں تو غازی صلاح الدین ایوبی اور رچرڈ شیر دل نے اپنی اپنی قوم اور ملک کی حفاظت اور مدافعت میں اپنے گھوڑوں کے پاؤں کے نیچے ہزاروں گردنیں روند ڈالیں۔

گوئٹے ہمیں تلقین کرتا ہے کہ ہم اپنی خواہشات' مصروفیتوں اور کوششوں کو متوازن رکھیں۔ ورنہ ہماری مثال نباتات کے ان پودوں کی سی ہو گی جنہیں ماہرین علم نباتات نامکمل قرار دیتے ہیں۔(12)

بعض مقامات پر شیکسپیئر(13) کے تخیلات سے گوئٹے کے افکار ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ مثلاً شیکسپیئر اس سے صدیوں پہلے جذبہ احسان فراموشی کی مذمت کرتے ہوئے کہہ گیا ہے۔

"چل چل اے باد خنک زمستان! تجھ میں اتنی سردی نہیں جتنی ایک احسان فراموش انسان میں ہوتی ہے۔" گوئٹے اسی خیال کو اپنے رنگ میں یوں کہتا ہے:

"احسان فراموشی ایک قسم کی کمزوری ہے۔ میں نے آج تک کسی اصلی قابلیت کے ایسے مالک کو نہیں دیکھا' جو احسان فراموش ہو۔"

مناظر قدرت کی نسبت اظہار خیال کرتے ہوئے المانوی حکیم حیات اپنی سوانحعمری موسوم بہ "شاعری اور حقیقت"(14) میں لکھتا ہے:

"زندگی کی تمام مسرتوں کا انحصار مناظر قدرت کی باقاعدگی پر ہے۔ تبدل روز و شب اور تغیرات بہار و خزاں اور گل و ثمر اور ایسی دیگر بار بار آنے والی نعمتیں ہیں' جن سے ہمیں صحیح معنوں میں متمتع ہونا چاہئے۔ کیونکہ ہماری خاکی زندگی کی مسرتوں کے یہی سرچشمے ہیں۔ اگر ہم مادر فطرت کے ان مناظر سے قطع تعلق کر کے مستفید نہ ہوں۔ تو پھر نہایت برے تاثرات ہم پر حاوی ہو جاتے ہیں اور ہم زندگی کو اجیرن سمجھنے لگتے ہیں۔"

اپنی خود نوشت سوانحعمری میں گوئٹے نے جہاں مختلف احساسات اور جذبات کو بلند انداز

میں بیان کیا ہے' وہاں فطرت انسانی کے حقائق کو نہایت لطیف پیرایہ میں بے نقاب کیا ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر وہ لکھتا ہے :

"رفاقت' محبت اور اخوت۔ کیا انہیں خود نہیں سمجھا جا سکتا ہے؟"(15) ان جذبات کی تشریح کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اپنے ایک محب کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے :

"ہم نوجوان عورتوں سے محبت ان کی صورت اور سیرت کے لئے کرتے ہیں' لیکن نوجوان مردوں سے ان کے شاندار مستقبل کی وجہ سے الفت کی جاتی ہے۔"

تاثرات مذاہب کی بابت گوئٹے نے جو کچھ لکھا ہے' وہ حرف بحرف صحیح ہے۔ وہ لکھتا ہے : "تمام مذاہب اپنے عہد اولیں میں اپنے پورے شباب پر ہوتے ہیں۔ اس لئے بانیان مذاہب کے وقتوں کی طرف رجوع کرنا مفید اور مسرت بخش ہوتا ہے کیونکہ ان اوقات میں ہر ایک چیز اپنی تر و تازگی اور خالص روحانیت میں ہمیں نظر آیا کرتی ہے۔"

گوئٹے کے مندرجہ ذیل الفاظ جو اس نے اپنی خود نوشت کتاب زندگی کے خاتمہ پر درج کئے ہیں' اتنے شاندار ہیں کہ انہیں آب زر سے بھی لکھا جائے تو کم ہے۔

"وقت کے گھوڑوں کو غیبی فرشتے تازیانہ لگا رہے ہیں اور وہ ہماری منزل قسمت کی طرف زندگی کی گاڑی کو تیزی سے چلا رہے ہیں۔ ہمیں صرف لگام کو جرأت اور مضبوطی سے تھامے رہنا ہے اور پہیوں کو کبھی دائیں کبھی بائیں' کہیں سنگ راہ سے تو کہیں نشیب و فراز سے بچانا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی قسمت اسے کہاں لئے جا رہی ہے۔ جب اسے یہ یاد نہیں کہ وہ کہاں سے آیا ہے۔"(16)

حواشی

1- Laws are a fatal heritage and like a disease they trail from generation to generation (Goethe)

2- سن مسنون اس عمر کو کہتے ہیں جس کو پہنچ کر رسول اللہ صلعم عالم جاودانی کو سدھارے تھے یعنی 63 سال کی عمر۔

3- گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے

(بانگ درا)

4- بقدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

(غالب)

5- صبا بہ گلشن ویمر سلام ما برساں
کہ چشم نکتہ وراں خاک آں دیار افروخت

6- نطشے کے بارے میں پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ نطشے کے افکار کو باطل قرار دیتے ہوئے علامہ نے فرمایا ہے۔

7- راہب دیرینہ افلاطوں حکیم
از گروہ گوسفنداں قدیم

8- گوئٹے کے اس مشہور ڈرامے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اس کا آغاز تب کیا تھا جب کہ وہ سٹراس برگ دارالعلوم میں ایام شباب میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اور تب جا کر ختم کیا جس وقت وہ اپنی عمر کے بیاسیویں سال سے گذر رہا تھا یعنی اپنی موت سے صرف ایک سال پیشتر۔ اس ڈرامہ کا پہلا حصہ عام فہم انداز میں بیان کیا گیا ہے اور دوسرا حصہ تمثیلات و صنائع و بدائع سے لبریز ہے۔

9- کہا جاتا ہے کہ گوئٹے نے (Intermaxillary) ہڈی کا انکشاف کیا اور اسے (Science of Morphology) کا بانی بھی مانا گیا ہے۔

10- حالانکہ یہ اظہار رائے خلاف حقیقت ہے۔ سید عباس حسینی ایم اے ناول کا تذکرہ کرتے ہوئے یونانی ادب کے بارے میں بحوالہ Encyclopaedia Britannica لکھتے ہیں۔ "سکندر سے پہلے مغربی ادب یونان کی پیداوار ہونے پر بھی مشرقی ادب سے متاثر ہے۔ لیکن سکندر کے بعد کا محض نقالی ہے۔ یونانی شاعر کا ادبی چشمہ خشک ہو گیا تھا اور تیسری صدی سے نئی مفتوح قوم نے جس کا مرکز خیال سکندر تھا۔ اس تخیل کا اظہار جو کہ رزمیہ نظموں میں درج تھا' کی جگہ ناول کو کیا۔ یعنی ہماری مشرقی مے یونان میں دو آتشہ بن کر مغرب کے میخانوں میں پہنچی اور تشنہ کاموں کو سیراب کیا۔ پنج تنتر بدپائی کی کہانیاں ہم سے لی گئیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ موسوچیاں فرانسیسی محقق و عالم مصر کا کہنا ہے کہ رومان یونان میں مشرق سے آیا اور وہیں سے اطالیہ و ہسپانیہ میں پھیلا۔ چنانچہ Arbiter اور Petronules کے اکثر قصص مشرقی زبانوں میں سے لئے گئے ہیں۔

11- **الاعمال بالنیات**۔ Richard Coenr-de-Lion

Incomplete plants -12

Blow, Blow thou winter wind -13

Thou art not so unkind,

As man's ingratitude

Poetry and Truth -14

"Friendship, love and brotherhood -15

Are they not self understood?" (Goethe)

جہاز عمر رواں ہے سوا نشیبے ہیں -16

سوار خاک ہیں بے اختیار نشیبے ہیں

The wheel of destiny moves towards a goal.

(اقبال اور گوئٹے مصنفہ وزیر زادہ محمد اشرف خاں اشرف' لاہور : ملک دین محمد اینڈ سنز' 1958ء' ص 87-105- لاہور : قریشی پبلشرز' 1958- دہلی : ادارۂ دنیائے ادب' بلا تاریخ۔)

شیخ حبیب اللہ

اقبال اور گوئٹے

علامہ اقبال کو قدرت نے ذہن رسا عطا فرمایا تھا۔ ان کا مطالعہ ناقابل فہم طور پر وسیع تھا۔ علامہ متعدد زبانوں کے ماہر تھے۔ ہندی' یورپی' ایشیائی اور سب سے بڑھ کر فلسفہ یورپ پر عبور حاصل تھا۔ اسلامیات اور اس کے ادب سے واقفیت کلی تھی۔ کلام پاک کے اسرار و غوامض پر بڑی گہری و عمیق نظر تھی۔ مثنوی مولانا روم کے آپ گرویدہ تھے اور مولانا روم کو اپنا پیر تصور کرتے تھے۔

علامہ اقبال نے کلام پاک سے کسب نور کیا' تو بصیرت افروز مضامین الہام ہونے لگے' جو ساری دنیا کے لئے شمع ہدایت ہیں۔ ان ہی کی زبانی سنئے :

خاوراں از شعلہ من روشن است
آں خنک مردے کہ در عصر من است
از تب و تابم نصیب خود بگیر
بعد ازیں ناید چومن مرد فقیر
گوہر دریائے قرآں سفتہ ام
شرح رمز صبغۃ اللہ گفتہ ام
عشق من از زندگی دارد فراغ
عقل از صہبائے من روشن دماغ

ہم چونے نالیدم اندر کوہ و دشت
تا مقام خویش برمن فاش گشت
حرف شوق آموختم واسوختم
آتش افسردہ را افروختم
دارم اندر سینہ نور لاالہ
در شراب من سرور لا الہ
پس بگیر از بادۂ من یک دو جام
تا درخشی مثل تیغ بے نیام

مشرق و مغرب کے انداز فکر میں نئی روح میرے افکار نے پھونکی ہے' کیوں کہ میں نے کلام پاک کے جواہر پاروں کو واشگاف کیا ہے۔ کلام پاک محض روحانیت کی تعلیم نہیں ہے' بلکہ اس میں تمام مسائل دنیوی کا حل موجود ہے۔ ایسا کون سا موضوع ہے جس پر کلام پاک نے دلائل و براہین کے ذریعہ محاکمہ نہیں کیا ہے۔ افسوس کہ ہم لوگوں کی نظر ان حقائق و معارف پر پڑتی نہیں۔ پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ہم اسرار حیات سے واقف ہو پائیں' میری سنو۔ کیوں کہ میرے بعد کوئی دانائے راز آنے والا نہیں :

کھول کے کیا بیاں کروں سر مقام مرگ و عشق
عشق ہے مرگ باشرف مرگ حیات بے شرف
صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بہ جیب ایک کلیم سر بکف

مجھے قدرت نے سطوت آہ صبح گاہی سے نوازا ہے۔ اس لئے میرے کلام میں مخرب اخلاق باتیں نہیں۔ میرے دل میں نور لاالہ کی ضوفشانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرا کلام الہامی نطق و کلام کا حامل ہے۔ میرے افکار و تخیل کی آفاق گیری اسی نور کا صدقہ ہے۔ اگر میرے کلام سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو تو گوہر دریائے قرآن کو حاصل کرو :

بر خور از قرآں اگر خواہی حیات
در ضمیرش دیدہ ام آب حیات
صد جہاں باقی است در قرآں ہنوز

اندر آیاتش یکے خود را بسوز

گوئٹے کا علامہ اقبال نے غائر مطالعہ کیا اور تحقیق و ریسرچ کے بعد پتہ چلا کہ وہ اسلامیات سے بے حد متاثر تھا۔ ہر چند اس نے کلام پاک کا تحقیقی مطالعہ نہیں کیا' مگر گوئٹے نے ایرانی ادبیات سے بے پایاں خوشہ چینی کی اور بڑی فراخ دلی سے اس کا اعتراف بھی کیا۔ ابلیس سے متعلق بھی گوئٹے کے خیالات اسلامی ہیں' ناقص ہی سہی۔ علامہ اقبال رقم طراز ہیں :

"ابتدائے شباب ہی سے گوئٹے کی ہمہ گیر طبیعت مشرقی تخیلات کی طرف مائل تھی۔ سٹراس برگ میں جہاں وہ قانون کے مطالعہ میں مصروف تھا' اس کی ملاقات جرمن لٹریچر کی مشہور اور قابل احترام شخصیت ہرڈر سے ہوئی جس کی صحبت کے اثرات کو گوئٹے نے خود اپنے سوانح حیات میں تسلیم کیا ہے۔ ہرڈر فارسی نہ جانتا تھا لیکن چوں کہ اخلاقی رنگ اس کی طبیعت پر غالب تھا' اس لئے سعدی کی تصانیف سے اسے نہایت گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ 'گلستاں' کے بعض حصوں کا اس نے جرمن زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ خواجہ حافظ کے رنگ سے اسے چنداں لگاؤ نہ تھا۔ اپنے معاصرین کو سعدی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتا ہے : "حافظ کے رنگ میں ہم بہت کچھ نغمہ سرائی کر چکے۔ اس وقت سعدی کے تلمذ کی ضرورت ہے"..... 1812ء میں فان ہمر نے خواجہ حافظ کے دیوان کا پورا ترجمہ کیا اور اسی ترجمے کی اشاعت سے جرمن ادبیات میں مشرقی تحریک کا آغاز ہوا۔ گوئٹے کی عمر اس وقت 65 سال کی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جبکہ جرمن قوم کا انحطاط ہر پہلو سے انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ ملک کی سیاسی تحریکوں میں عملی حصہ لینے کے لئے گوئٹے کی فطرت موزوں نہ تھی اور یورپ کی عام ہنگامہ آرائیوں سے بے زار ہو کر اس کی بے تاب اور بلند پرواز روح نے مشرقی فضا کے امن و سکون میں اپنے لئے ایک نشیمن تلاش کر لیا۔ حافظ کے ترنم نے اس کے تخیلات میں ایک ہیجان عظیم برپا کر دیا۔ جس نے آخرکار "مغربی دیوان" کی ایک پائیدار اور مستقل صورت اختیار کی مگر فان ہمر کا ترجمہ گوئٹے کے لئے محض ایک محرک ہی نہ تھا بلکہ اس کے عجیب و غریب تخیلات کا ماخذ بھی تھا۔ بعض بعض جگہ اس کی نظم خواجہ کے اشعار کا آزاد

ترجمہ معلوم ہوتی ہے اور بعض جگہ اس کی قوت تخیل کسی خاص مصرع کے اثر سے ایک نئی شاہ راہ پر پڑ کر زندگی کے نہایت دقیق اور گہرے مسائل پر روشنی ڈالتی ہے۔ گوئٹے کا مشہور سوانح نگار بیل شوسکی لکھتا ہے :

"بلبل شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی۔ اس کو کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ شاید میری روح ہی حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے۔ وہی زمینی مسرت' وہی آسمانی محبت' وہی سادگی' وہی عمق' وہی جوش و حرارت' وہی وسعت مشرب' وہی کشادہ دلی اور وہی قیود و رسوم سے آزادی۔ غرض کہ ہر بات میں ہم اسے حافظ کا مثیل ہی پاتے ہیں۔ جس طرح حافظ لسان الغیب و ترجمان اسرار ہے' اسی طرح گوئٹے بھی ہے اور جس طرح حافظ کے بظاہر سادہ الفاظ میں ایک جہان معنی آباد ہے' اسی طرح گوئٹے کے بے ساختہ پن میں بھی حقائق و اسرار جلوہ افروز ہیں۔ دونوں نے امیر و غریب سے خراج تحسین وصول کیا۔ دونوں نے اپنے اپنے وقت کے عظیم الشان فاتحوں کو اپنی شخصیت سے متاثر کیا (یعنی حافظ نے تیمور کو اور گوئٹے نے نپولین کو) اور دونوں عام تباہی اور بربادی کے زمانے میں طبیعت کے اندرونی اطمینان و سکون کو محفوظ رکھ کر اپنی قدیم ترنم ریزی جاری رکھنے میں کامیاب رہے۔

"خواجہ حافظ کے علاوہ گوئٹے اپنے تخیلات میں شیخ عطار' سعدی' فردوسی اور عام اسلامی لٹریچر کا بھی ممنون احسان ہے۔ ایک آدھ جگہ ردیف و قافیہ کی قید سے غزل بھی لکھی ہے۔ اپنی زبان میں فارسی استعارات بھی (مثلاً گوہر اشعار' تیر مژگاں' زلف گرہ گیر) بے تکلف استعمال کرتا ہے۔ بلکہ فارسیت کے جوش میں امرد پرستی کی طرف اشارات کرنے سے بھی احتراز نہیں کرتا۔ دیوان کے مختلف حصوں کے نام بھی فارسی مثلاً مغنی نامہ' ساقی نامہ' عشق نامہ' تیمور نامہ' حکمت نامہ وغیرہ..... عجمی تصوف سے اسے مطلق دلچسپی نہ تھی' اور گو اسے یہ بات معلوم تھی کہ مشرق میں خواجہ حافظ کے اشعار کی تفسیر تصوف کے نقطہ نگاہ سے کی جاتی ہے۔ وہ خود تغزل محض کا دلدادہ تھا اور کلام حافظ کی صوفی تعبیر سے اسے کوئی ہمدردی نہ تھی۔"

علامہ اقبال کو افسوس تھا کہ گوئٹے نے مولانا روم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ چوں کہ وہ عاشق مزاج تھا' اس لئے مولانا روم کا روح پرور فلسفہ اس کی فہم سے بالا تر تھا اور وہ اسے گنجلک تصور کرتا تھا۔ ہر چند کلام پاک کے جرمن زبان میں متعدد ترجمے ہو چکے تھے۔ مگر اس نے مطالعہ کی زحمت گوارا نہیں کی اور بقول اقبال "عام اسلامی لٹریچر پر مدار کرتا تھا" یہ حضرت بڑے دل پھینک تھے۔ اس لئے تغزل عشقیہ سفلی مرغوب تھا۔ ان کی جرأت آموز' نگار طلب فطرت کی کیفیت دیکھئے کہ اسی سال کی عمر میں ایک سولہ سالہ لڑکی پر مفتوں ہو گئے۔ اس کی جدائی میں اشک بار رہتے اور عشقیہ اشعار پڑھتے تھے۔ اور اقبال کیا تھے؟ مرد مومن اور ولی اللہ ۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

علامہ اقبال رقم طراز ہیں :

"مولانا روم کے فلسفیانہ حقائق و معارف اس کے نزدیک مبہم تھے' لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نے رومی کے کلام پر غائر نگاہ نہیں ڈالی۔ کیوں کہ جو شخص سپونوزا (ہالینڈ کا ایک فلسفی جو مسئلہ وحدت الوجود کا قائل تھا) کا مداح ہو اور جس نے برونو (اٹلی کا ایک وجودی فلسفی) کی حمایت میں قلم اٹھایا ہو' اس سے ممکن نہیں کہ رومی کا معترف نہ ہو۔

غرض کہ "مغربی دیوان" کی وساطت سے گوئٹے نے جرمن ادبیات میں عجمی روح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بعد کے شعرا پلاٹن' روکرٹ اور بوڈن سٹاٹ نے اس مشرقی تحریک کو جس کا آغاز گوئٹے کے دیوان سے ہوا' تکمیل تک پہنچایا۔"

جو بھی ادب عظیم احیا پذیر ہوا ہے' وہ نزول قرآن کے بعد ہوا ہے۔ مفکرین اور دانش وران یورپ نے قرآن پاک کے ایک ایک لفظ پر غور و فکر کیا ہے۔ انہوں نے صاف صاف دیکھ لیا کہ قرآن کا منتہائے نظر عالم گیر مفاد عامہ اور عالم گیر اجتماعیت ہے۔ قرآن کے نزدیک رنگ و نسل آیات اللہ ہیں اور ان میں تفریق حرام ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ شعوب و قبائل خدا نے بنائے ہیں اور ان کا باقی رہنا فرض ہے' اور جو کوئی بھی انہیں مٹانا چاہے' وہ راندہ درگاہ ہے۔ یورپ کے دانشوران قرآن پاک کے گرویدہ تھے۔ شیکسپیئر کے ڈرامے قرآنی تمثیلات کے مرہون منت ہیں۔ مثلاً کنگ لیئر' ایاگو کا کردار وغیرہ۔

علامہ اقبال نے ثابت کر دیا ہے کہ یورپی اہل نظر نے اسلامیات اور ایرانیات کے مے خانوں سے جرعہ کشی کی ہے۔ لکھتے ہیں :

"روکرٹ عربی' فارسی' سنسکرت تینوں زبانوں کا ماہر تھا۔ اس کی نگاہ میں فلسفہ رومی کی بڑی وقعت تھی اور اس کی "غزلیات" زیادہ تر مولانا روم ہی کی تقلید میں لکھی گئی ہیں۔ چوں کہ السنہ شرقیہ کا عالم تھا' اس لئے اس کی مشرقی نظم کے مواخذ بھی وسیع تر تھے۔ مخزل الاسرار عالم نظامی' بہارستان جامی' کلیات امیر خسرو' گلستان سعدی' مناقب العارفین' عیار دانش' ہفت قلزم وغیرہ جہاں جہاں سے حکمت کے موتی ملتے ہیں' رول لیتا ہے۔ بلکہ اسلام سے پہلے کی ایرانی روایات و حکایات سے بھی اپنے کلام کو زینت دیتا ہے۔"

اب شان نزول "پیام مشرق" ملاحظہ فرمایئے :

"پیام مشرق' کے متعلق جو 'مغربی دیوان' سے سو سال بعد لکھا گیا ہے' مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظرین خود اندازہ کر لیں گے کہ اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی' مذہبی اور ملّی حقائق کو پیش نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ اس سے سو سال پیشتر جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوام عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس لئے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں' ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی' جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے جس کا ایک دھندلا سا خاکہ آئن سٹائن اور برگساں کے تصانیف میں ملتا ہے۔"

جہان نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمارخانہ
وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

جو تھا نہیں ہے نہ ہو گا یہی ہے اک حرف محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ

اچھا اب سنئے "اقبال اور گوئٹے" کی کہانی، خود ان ہی کی زبانی:

پیر مغرب شاعر المانوی
آں قتیل شیوہ ہائے پہلوی
بست نقش شاہدان شوخ و شنگ
داد مشرق را سلامے از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغام شرق
ماہ تابے ریختم بر شام شرق
تاشناسائے خودم، خود بیں نیم
با تو گویم او کہ بود و من کیم
او ز افرنگی جواناں مثل برق
شعلہ من از دم پیران شرق
او چمن زادے، چمن پروردۂ
من دمیدم از زمین مردۂ
او چو بلبل در چمن "فردوس گوش"
من بصحرا چوں جرس گرم خروش
ہر دو دانائے ضمیر کائنات
ہر دو پیغام حیات اندر ممات
ہر دو خنجر صبح خند، آئینہ فام
او برہنہ، من ہنوز اندر نیام
ہر دو گوہر ارجمند و تاب دار
زادۂ دریائے ناپیدا کنار
او ز شوخی در تہ قلزم تپید
تا گریبان صدف را بر درید

آشنائے من زمن بے گانہ رفت
از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہ خسروی اورا دہم
تخت کسریٰ زیر پائے او نہم
او حدیث دل بری خواہد زمن
رنگ و آب شاعری خواہد زمن
کم نظر بے تابی جانم نہ دید
آشکارم دید و پنہانم نہ دید
فطرت من عشق را در برگرفت
صحبت خاشاک و آتش در گرفت
حق رموز ملک و دیں برمن کشود
نقش غیر از پردۂ چشمم ربود
برگ گل رنگیں زمضمون من است
مصرع من قطرۂ خون من است
لالہ و گل از نوایم بے نصیب
طائرم در گلستان خود غریب

پیر مغرب گوئٹے نے جسے ایرانی عروس ادب کی عشوہ طرازیوں اور شیریں سخنی نے گرویدہ کر دیا تھا اور جو سراپا قتیل افکار شعرائے ایران تھا' مست و بے خود ہو کر اپنے عاشقانہ جذبات سے مغلوب ہو کر شاہدان شوخ و شنگ تخلیق کئے اور پھر ان ہی شاہدان لالہ رخوں کو اپنی زبان کے لباس فاخرہ میں بطور تشکر مشرق کی خدمت میں پیش کیا۔ میں بھی اس تحفہ کے بدلے میں مشرق کا پیغام جاں فزا مغرب کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ مگر۔

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے درد مند کا طرز کلام اور ہے

میرے خامہ رنگیں نگار نے وہ پیکران خوب رو تخلیق کئے کہ لطف بہاراں کا منظر پیدا ہو گیا اور اہل یورپ اس کی لطافت و نزاکت و جبروت سے مبہوت ہو کر رہ گئے۔ قارئین

کرام اب ذرا سنئے گوئٹے کیا تھا اور میں کیا ہوں! وہ افرنگی دانش وروں میں برق پاش اور میں پیران مشرق کی نوازشوں کا شعلہ جوالا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ وہ چمن زادہ اور چمن پروردہ تھا یعنی اس کے قدر دان موجود تھے، مگر میں زمین شور میں نوا سروش ہوں۔ یہاں کہاں ہم نفس میسر۔ وہ یورپی علمی گل زار میں بلبل شیریں سخن کی طرح فردوس گوش اور میں صحرا میں گرم خروش طرب آشائے گوش نہیں ۔

عطا ہوا خس و خاشاک ایشیا مجھ کو

میرا مفسر، میرا مترجم اور میرا رازداں کہاں! ہم دونوں (اقبال اور گوئٹے) دانائے راز کائنات ہیں۔ دونوں کا پیغام مردہ دلوں کے لئے آب حیات ہے۔ دونوں خنجر صبح خند و آئینہ فام۔ البتہ وہ شمشیر براں اور میں نیام کے اندر مستور۔ یعنی گوئٹے کے مداح و رمز شناسوں نے اس کی شہرت کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجا دیا۔ مگر میرا ترجمان دور دور تک نظر نہیں آتا۔ ہم دونوں دریائے ناپیدا کنار کے لولو و مرجان ہیں۔

اس نے اپنی شوخیاں تہ قلزم حاصل کیں اور صدف نگاری کی۔ میں ظلمت کدہ میں پوشیدہ و گم نام نادانوں کی وجہ سے ہوں۔ خزف پسندوں کی نظروں میں لعل و گہر کی کوئی قیمت نہیں۔ افسوس! میرے راز داں ابھی پیدا نہیں ہوئے :

کتنے بے تاب ہیں جوہر مرے آئینے میں
کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں
اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ سینوں میں جو رکھتے ہیں وہ لالے ہی نہیں

قارئین آتے ہیں اور سطحی نظر سے میرے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی لئے میرے جوہر ادراک کا احاطہ کر نہیں پاتے اور آخرکار میرے خمستان سے تشنہ کام جاتے ہیں :

چہ پرسی از مقامات نوایم
ندیماں کم شناسند از کجایم

ارے بھئی! میرے کلام کی رمز شناسی کیوں کر عام ہو سکتی ہے؟ جب کہ لوگوں کو یہ تک معلوم نہیں کہ میں کس پایہ کا حکیم نکتہ رس ہوں۔ پھر بھی میں اس دشت میں نغمہ سرا ہوں۔

کشادم رخت خود را اندریں دشت
کہ اندر خلوتش تنہا سرایم

یعنی

ملا محبت کا سوز مجکو تو بولے صبح ازل فرشتے
مثال شمع مزار ہے تو تری کوئی انجمن نہیں ہے

میں گوئٹے اور اہل یورپ کو شکوہ خسروی حاصل کرنے کا راز بتاتا ہوں۔ وہ راز جس کے ذریعہ وہ تخت کسریٰ کو اپنی ٹھوکروں سے دو نیم کر پائیں۔ افسوس! مجھ سے حدیث دلبری کی خواہش کی جاتی ہے' رنگ و آب شاعری طلب کی جاتی ہے۔ ایسی شاعری ۔

ہم نے ان کے سامنے اول تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا' دل رکھ دیا سر رکھ دیا

مگر

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کی نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

نادانوں کو یہ نہیں معلوم کہ میرے دل میں کیسا طوفان بپا رہتا ہے۔ وہ میرے ظاہر کو دیکھتے ہیں۔ باطن کو نہیں دیکھتے۔ میری فطرت نے تو راز عشق کو پا لیا ہے۔ خس و خاشاک کی میرے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔ حق نے رموز ملک و دیں مجھ پر واشگاف کر دیئے ہیں۔ فروعات کی میری نظروں میں کوئی وقعت نہیں۔ میری شاعری میرا خون جگر ہے اور میری معنی آفرینی سے برگ گل میں رعنائی' زندگی اور نمو ہے۔

مگر افسوس! چمن میں نہ باد بہاری' نہ بلبل' نہ گل چیں۔ لالہ و گل (خواص و عوام) میری باتوں کی اصلیت کو سمجھتے ہی نہیں۔ میں وہ طائر ہوں جو اپنے گلشن میں بھی غریب الوطن ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے کلام میں مسلسل یہ ہدایت کی ہے کہ میری شاعری کی حقیقی روح کو پہچاننے کی کوشش کرو۔ فرماتے ہیں :

"مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے۔ مگر اقوام شرق کو یہ محسوس کر لینا چاہئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی

قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے **ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتّٰی یغیروا ما بانفسھم** کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنے فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔"

کلام و پیام اقبال کے .... "بہ آں رازے کہ گفتم پے نہ بروند۔" نکتہ کے اسرار و غوامض کو نہ مشرق نے سمجھا نہ مغرب نے۔ کم از کم اردو' فارسی داں علما کو لازم تھا کہ اسی پہلو کو اجاگر کرتے۔ اقبال کو اپنی زندگی ہی میں اپنے مبصرین سے شکایت تھی :

بہ چشم من جہاں جز رہ گذر نیست
ہزاراں رہ رو و یک ہم سفر نیست
گذشتم از ہجوم خویش و پیوند
کہ از خویشاں کسے بے گانہ تر نیست

اس جہان رہ گزر میں جادہ پیما ہوں۔ منزل دور' زندگی آنی فانی' ہزار ہا رہرو نظر آتے ہیں' مگر ہم سفر راز داں کوئی نہیں۔ میرے خویش و پیوند یعنی مبصرین کلام اقبال بہت ہیں' مگر میں ان سے دامن بچا کر نکل جاتا ہوں' کیوں کہ یہ تو اور بھی بے گانہ تر ہیں :

سبوئے خانقاہاں خالی از مے
کند مکتب رہ طے کردہ را طے
ز بزم شاعراں افسردہ رفتم
نوا ہا مردہ بیروں خیزد ازنے

خانقاہوں کو جاؤ تو وہاں بھی خالی ایاغی۔ مکاتب کو جاؤ تو وہاں بھی کوئی جدت و تنوع نہیں۔ وہی گھسی پٹی راہ پر گام زن۔ طے کردہ راہوں کو طے کر رہے ہیں۔ شاعروں کی مجلس کو جاؤ تو وہاں بھی مردنی چھائی ہوئی ہے :

شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سر مست نہ خوابیدہ نہ بے دار

جب علامہ اقبال نے "اسرار خودی" لکھی تو ایشیا تو نہیں' یورپی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ ہندوستان اور اس پیمانہ کا پرسوز و طرب ناک غزل خواں!

صفت برق چمکتا ہے مرا فکر بلند
کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمت شب میں راہی

ڈاکٹر نکلسن پر وجد کا عالم طاری ہو گیا اور آپ نے "اسرار خودی" کا ترجمہ انگریزی میں کر ڈالا اور اقبال کو لازوال کر دیا۔ لیکن چوں کہ اسلامیات کے ماہر نہ تھے' اس لئے افکار اقبال کا احاطہ کرنے میں ٹھوکر لگی اور مغالطہ کا شکار ہو گئے اور اقبال کے فلسفے کو نطشے سے ماخوذ سمجھا۔ علامہ کو اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا پڑا۔ لکھتے ہیں:

"شفیع کے نام آپ نے جو مکتوب تحریر فرمایا ہے' اس سے مجھے یہ معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی کہ "اسرار خودی" کا ترجمہ انگلستان میں قبول عام حاصل کر رہا ہے' لیکن انگریزی تنقید نگاروں نے سطحی تشابہ اور تماثل سے جو میرے اور نطشے کے خیالات میں پایا جاتا ہے' دھوکا کھایا ہے اور غلط راہ پر پڑ گئے ہیں۔ "دی ایسٹمنیم" والے مضمون میں جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں' وہ بہت حد تک حقائق کی غلط فہمی پر مبنی ہیں' لیکن اس غلط فہمی کی ذمہ داری صاحب مضمون پر عائد نہیں ہوتی۔ اس نے اپنے مضمون میں میری جن نظموں کا ذکر کیا ہے' اگر اسے ان کی صحیح تاریخ اشاعت کا بھی علم ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ میری ادبی سرگرمیوں کے نشو و ارتقا سے متعلق اس کا زاویہ نگاہ بالکل مختلف نظر آتا۔

"وہ انسان کامل سے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے غلط بحث کر کے میرے انسان کامل اور جرمن مفکر کے 'فوق الانسان' کو ایک ہی فرض کر لیا ہے۔ میں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل 'انسان کامل' کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا اور یہ وہ زمانہ ہے جب نہ تو نطشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا' نہ اس کی کتابیں میری نظروں سے گزری تھیں۔ یہ مضمون "انڈین انٹی کورین" میں شائع ہوا اور جب 1908ء میں' میں نے ایرانی الٰہیات پر کتاب لکھی تو اس مضمون کو اس میں شامل کر لیا گیا۔"

اب بتلایئے کہ علامہ کے کلام کے مفاہیم و مطالب' عرفان و بصیرت کے مفسر کیا نظر

آتے ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ نے یورپی ادب و فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ مگر ایشیائی فلسفہ کے سامنے انہیں یورپی فلسفہ ناقص نظر آیا۔ علامہ نے برملا اعلان کیا کہ انہوں نے مے خانہ رومی سے جرعہ کشی کی اور بصیرت حاصل کی :

چوں رومی در حرم دادم اذاں من
ازو آموختم اسرار جاں من
بہ دور فتنہ عصر کہن او
بہ دور فتنہ عصر رواں من

رومی سے اسرار حیات کا علم حاصل کرنے کے بعد میری ذات میں شعور و آگہی کا جام آتشیں خود بہ خود پیدا ہو گیا اور پھر میں :

نہ از ساقی نہ از پیمانہ گفتم
حدیث عشق بے باکانہ گفتم
شنیدم آنچہ از پاکان امت
ترا باشوخی رندانہ گفتم

میں نے یورپ کے افکار کی نقالی نہیں کی بلکہ پاکان امت سے نور بصیرت حاصل کیا اور پھر حدیث عشق کو شوخی رندانہ کے ذریعہ دنیا کے سامنے پیش کیا اور انقلاب رونما کر دیا :

بہ جاں ہا آفریدم ہائے و ہو را
کف خاکے شمردم کاخ و کورا
شود روزے حریف بحر پرشور
ز آشوبے کہ دادم آب جو را

ارغنون ہستنی میں نغمہ شیریں میں نے پیدا کیا اور یہ حلاوت ایک نہ ایک دن' آب جو کو بحر بے کراں کر کے چھوڑے گی۔

اگر علامہ کے کلام کو یورپی زبانوں میں منتقل کر دیا جائے' تو ثابت ہو جائے گا کہ علامہ کا فلسفہ نادر روزگار ہے :

دریں گلشن نہ دارم آب و جاہے
نسیم نے قباہے نے کلاہے

مرا گل چیں بد آموز چمن خواند
کہ دادم چشم نرگس را نگاہے

میرے قدر دان کہاں؟ نکتہ چیں موجود ہیں' کیوں کہ میں نے عدیم المثال فلسفہ کی بنیاد ڈالی ہے۔ کیا روشن بصیرتی پیدا کرنا زوال شاعری ہے۔ کوئی جرم ہے۔ مگر میں چوں کہ گل و بلبل کی شاعری نہیں کرتا' مجھے نادان بد آموز چمن کا خطاب دیتے ہیں :

دو صد دانا دریں محفل سخن گفت
سخن نازک تر از برگ سمن گفت
ولے بامن بگو آں دیدہ ور کیست
کہ خارے دید و احوال چمن گفت

سینکڑوں دانش ور آئے اور اپنا کلام پیش کیا۔ بڑی دل آویزی اور لطافت سے تکلم آرائی کی۔ مگر ذرا بتاؤ تو سہی وہ کون دانا ہے' جس نے میری طرح حقائق و معارف کو بے حجاب کر کے انقلاب بے پایاں برپا کر دیا؟ میں نے جس انداز دل برانہ سے نغمہ سرائی کی ہے' کیا دنیا کے کسی دانا' مفکر و فیلسوف نے کی ہے؟

جو کہ کنار کے خوگر تھے ان غریبوں کو
میری نوا نے دیا ذوق جذبہائے بلند

علامہ اقبال نے ابلیس کو بطور علامت اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ جو کچھ بھی لکھا ہے' وہ قرآنی روشنی کے عین مطابق ہے۔ جب ابلیس انسان کی خاطر راندۂ درگاہ ہوا تو اس نے نعرہ لگایا تھا :

ہم تو ڈوبے ہیں صنم' تم کو بھی لے ڈوبیں گے

ابلیس نے اپنی خودی کی ظلمت کو ملیا میٹ ہونے نہیں دیا اور خدا سے التجا کی کہ تو نے مجھے اس مٹی کے پتلے آدم کے لئے مردود کر دیا۔ اب مجھے آزادی عطا فرما اور میری ریشہ دوانیوں کی راہ میں سنگ گراں مت ہو۔ تو دیکھ لینا کہ میں تیرے چہیتوں کو جہنم رسید کرتا ہوں کہ نہیں۔ میں تیری جنت کو ویران کر کے چھوڑوں گا۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہوا :

"جا ابلیس تجھے پوری آزادی دی جاتی ہے۔ مگر یاد رکھ میرے سچے بندوں کا تو بال بیکا نہ کر سکے گا۔"

ابلیس نے مونچھ پر تاؤ دے کر کہا' اچھا ہم اس چیلنج کو قبول کرتے ہیں :

خضر بھی بے دست و پا' الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم' دریا بہ دریا' جو بہ جو

میں داہنے سے' بائیں سے' آگے سے' پیچھے سے انسان پر حملہ آور ہوں گا۔ (قرآن)

ظاہر ہے ابلیس چھری کٹاری' تیغ و سنان کے ذریعے حملہ نہیں کرتا۔ وہ تو انسانوں کے ذہن میں اپنے زور خطابت کی سحرکاریوں سے عمل تنویم کا عالم پیدا کر دیتا ہے اور انسان حرکت مذبوحی کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ علامہ کے چند اشعار سنئے اور کلام پاک کا مطالعہ کیجئے :

نوری ناداں نیم سجدہ بہ آدم برم
او بہ نہاد است خاک من بہ نژاد آذرم
می تپد از سوز من' خون رگ کائنات
من بہ دو صرصرم من بہ غو تندرم

میں اور فرشتوں کی طرح نوری ناداں نہیں ہوں کہ آدم کی بالا دستی قبول کر لوں۔ وہ کہاں مٹی کا پتلا اور میں کہاں شعلہ جوالا :

میری وجہ سے کائنات میں رنگینی پیدا ہوتی ہے۔
میری قوت و جبروت کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔
میں بجلی کی کڑک' بادل کی گرج.... اور
طوفان بلاخیز ہوں!

ابلیس کی خطابت کی سحرکاریاں یعنی عمل تنویم

زندگی سوز و ساز بہ ز سکون دوام
فاختہ شاہیں شود از تپش زیر دام
کوثر و تسنیم برد از تو نشاط عمل
گیر زمینائے تاک بادۂ آئینہ فام
ہیچ نیاید زتو غیر سجود نیاز
خیز چو سرو و بلند اے بہ عمل نرم گام

اے آدم خاکی افسوس! تو کتنی نکمی زندگی بسر کر رہا ہے۔ سکون دوام اچھا، مسلسل سوز و ساز! سکون دوام نے تجھے بے حس کر دیا ہے۔ زیر دام فاختہ بھی قید غلامی سے عاجز آ کر شاہینی فطرت پیدا کر لیتا ہے اور پنجرہ توڑ کر نکل جاتا ہے۔ یہ کوثر و تسنیم کی نعمتوں نے تجھے نشاط عمل سے محروم کر دیا ہے۔ کیوں کہ تیری ذات میں "اپنی دنیا آپ پیدا کر" کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا ہے۔ دیکھ مینائے تاک میں بادۂ آئینہ فام تیرے سامنے ہے۔ بڑھا ہاتھ اور جام تھام لے۔ کیا تیری قسمت میں خوشامد ہی خوشامد ہے کہ ہمیشہ سجود نیاز میں پڑا رہتا ہے۔ توبہ! توبہ! یہ کیا زوال آدم خاکی ہے۔ چھوڑ اس خوشامدانہ سجدہ ریزی کو، اٹھ سر بلند کر اور چار دانگ عالم میں اپنی خودی کی عظمت کا ڈنکا بجا دے۔ ابلیس کی تسلی سنئے، جب جبرئیل اس کو سمجھاتے ہیں کہ:

کھو دیئے انکار سے تو نے مقامات بلند

ابلیس جواب دیتا ہے:

ہے مری جرات سے مشت خاک میں ذوق نمو
میرے فتنے جامہ عقل و خرد کے تار و پود
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزم خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو

مگر آج کل ابلیس دل گیر ہے، کیوں کہ اس دور کے انسان ؎

شایان دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

ہو چکے ہیں، اس لئے ابلیس خدا سے ملتجی ہے کہ باری تعالیٰ تیرے نیک بندے تو میری ذرا سی تھاپ سے ڈھیر ہو جاتے ہیں، میں لڑوں تو کس سے لڑوں:

اے خداوند صواب و ناصواب
من شدم از صحبت آدم خراب

اس لئے عطا فرما:

اے خدا یک زندہ مرد حق پرست
لذتے شاید کہ یابم در شکست

مگر اب ابلیس گھبرانے لگا ہے، کیوں کہ مردان حق پرست دنیا کے ہر گوشے میں نمودار

ہو رہے ہیں۔ حتیٰ کہ روس میں بھی حق پرستی شروع ہو گئی ہے۔ ابلیس کو خدا کا چیلنج یاد آ رہا ہے۔

"جا! میرے نیک بندوں کا تو بال بیکا نہ کر سکے گا!"

سراسیمہ ہو کر، لرزہ براندام ہو کر اپنی مجلس شوریٰ منعقد کرتا ہے تاکہ اپنے مشیروں کو چوکنا کر پائے۔

ابلیس کی سراسیمگی دیکھ کر ایک پیروکار اس کی ہمت افزائی کرتا ہے:

اس میں کیا شک ہے کہ محکم تر ہے ابلیسی نظام
پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں غلام
ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود
ان کی فطرت کا تقاضا ہے نماز بے قیام
یہ ہماری سعی پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملا ملوکیت کے برے ہیں تمام

اسی طرح کی لاف دانش دیگر مشیروں نے بھی کیں۔

ابلیس نے کہا۔ کور فہمو! تم کس خوش فہمی میں مبتلا ہو۔ مردِ مومن جو اللہ کی برہان ہے، اس کی قہاری و جباری کا تمہیں کوئی علم نہیں:

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحرگاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں میں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دل
الحذر! آئین پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں
توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسم شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات

جانتا ہے، جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنہ فردا نہیں اسلام ہے

ابلیس اشک بار ہو جاتا ہے اور رقت طاری ہو جاتی ہے اور بڑی دل سوزی سے کہتا ہے:

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

اس لئے میرے ساتھیو! میرے پیارو! دنیا کو حماقتوں میں مبتلا رکھو:

ابن مریم مر گیا یا زندہ جاوید ہے
ہیں صفات ذات حق، حق سے جدا یا عین ذات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
امت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
تم اسے بے گانہ رکھو عالم کردار سے
تا بساط زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

اور تم جانتے ہو، اس میں کامیابی کیوں کر حاصل ہو سکتی ہے؟

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

اب بتلایئے! یہ مسائل مختلفہ پر گوہر نشانی، یہ مباحث عارفانہ، یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ لطف تکلم، یہ مسائل تصوف، یہ پیشین گوئیاں، یہ واقعات عالم پر تنقید و تبصرہ و محاکمہ، یہ اولوالعزمی افکار عالیہ، یہ شاعری کی نکہت خلد بریں! کیا دنیا کے کسی شاعر، مفکر، مدبر اور فیلسوف میں نظر آتی ہے۔ یہ تو صرف اقبال کے بس کی بات تھی۔

یہ مرتبہ بلند ملا، جس کو مل گیا

(اقبال [redacted] کچھ مضامین، نئی دلی، انجمن ترقی اردو، 1979ء، ص 49-68)

ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی

اقبال اور گوئٹے

علامہ اقبال مشرق و مغرب کی جن ممتاز شخصیات سے متاثر ہوئے' ان میں گوئٹے ایک نمایاں نام ہے۔ اقبال نے گوئٹے کے ساتھ اپنی جس وابستگی کا اظہار کیا ہے' اس کے پیش نظر یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ اقبال مشرق میں مولانا روم سے اور مغرب میں گوئٹے سے متاثر ہوئے۔ گوئٹے اور اقبال کے ذہنی روابط کا بیان اور دونوں کا تقابلی مطالعہ ہی اس مقالے کا موضوع ہے۔

جرمن کا یہ عظیم مفکر شاعر فرانکفرٹ کے مشہور شہر میں پیدا ہوا۔ اس نے 83 سال کی طویل عمر پائی اور اس کا انتقال اقبال کی پیدائش سے 45 سال پہلے 1832ء میں ہوا۔ گوئٹے نے اپنی قانون کی تعلیم مکمل کر کے ملازمت کا آغاز ہی کیا تھا کہ وائی مار کے علم دوست ڈیوک کارل آوگسٹ سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اس نے گوئٹے کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی جو اس نے قبول کر لی اور گوئٹے اپنی آخری عمر تک وائی مار میں ہی مقیم رہا اور یہیں مدفون ہوا۔ وائی مار میں وہ مختلف عہدوں پر فائز رہا۔ ڈیوک نے دل کھول کر اس کی قدر افزائی کی۔ گوئٹے کو یہاں اتنی معاشی فراغت اور ذہنی آسودگی میسر آئی کہ وہ تقریباً ساٹھ سال تک اپنے علمی و ادبی مشاغل اور سائنسی تحقیقات میں مشغول رہا۔ گوئٹے کا گھر وسیع اور دل و دستر خوان کشادہ تھے' اس لئے یورپ کے ادیب و شاعران کی ملاقات کو آتے رہتے تھے۔ گوئٹے کی شہرت اس کی زندگی ہی میں ساری دنیا میں پھیل چکی تھی۔ یورپ کے

سربر آوردہ اہل قلم گوئٹے کے پرستاروں میں اور اکثر اس کے حلقہ احباب میں شامل تھے۔ انگلستان میں کارلائل جیسا شخص گوئٹے پر پُرمغز مقالے لکھ رہا تھا۔ کالرج اور شیلے اس کی شاعری کے انگریزی ترجمے کر رہے تھے۔ بائرن کو گوئٹے اپنا معنوی فرزند کہتا تھا (اور بائرن نے Manfred گوئٹے ہی کے نام لکھی)۔ گوئٹے کی اولیں سوانح عمری بھی ایک انگریز جارج ہنری لیوس نے لکھی۔

انگریز اہل قلم کی گوئٹے میں اس دلچسپی نے اس کے قارئین کا حلقہ وسیع کر دیا اور گوئٹے کا نام انگریزی کے توسط سے برصغیر پہنچا۔ گمان غالب یہی ہے کہ گوئٹے تک اقبال کی رسائی اول انگریزی کے ذریعے سے ہوئی ہو گی۔

ادب کے تقابلی مطالعے کو کچھ عرصے سے بین الاقوامی یک جہتی کو فروغ دینے کے لئے بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس میں کسی ایک ملک کے شاعر یا ادیب کا کسی دوسرے ملک کے شاعر یا ادیب سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ ان دونوں کے احوال و آثار، فکر و فن اور موضوعات و مطالب کا بڑی محنت سے مطالعہ کر کے مشترکہ نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ جس مقصد کے لئے یہ کاوش کی جاتی ہے اس کے نیک ہونے میں کوئی شبہ نہیں، لیکن اس مطالعے کے لئے صرف نیک نیتی کافی نہیں، کسی مشترک بنیاد کا ہونا بھی ضروری ہے۔ بعض اوقات یہ کاوشیں بالکل بے اثر رہتی ہیں اور اس ادبی مشن سے کچھ حاصل نہیں ہو پاتا۔ پابلو نرودا اور دین کار سے جب اقبال کا موازنہ کیا جائے گا، اس سے جو نتائج برآمد ہو سکتے ہیں، اس کے بارے میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن گوئٹے اور اقبال کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ اقبال اور گوئٹے کے روابط کی تاریخ اور ان روابط کے حدود بہت واضح ہیں۔ اس تعلقات کے ارتقا کی مکمل تاریخ ہمارے سامنے ہے۔

اقبال 1905ء - 1908ء تک اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں یورپ میں رہے، لیکن گوئٹے سے وہ سفر یورپ سے پہلے ہی متعارف ہو چکے تھے۔ انہوں نے مرزا غالب پر اردو میں جو نظم کہی، وہ اس تعارف کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے۔ اس میں اقبال، غالب کا گوئٹے سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

اس موازنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گوئٹے کے بارے میں علامہ کا علم سرسری معلومات سے کہیں زیادہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ گوئٹے کا مقابلہ کس اردو شاعر سے ممکن ہے۔ اس سطح پر گوئٹے کو روشناس کرانے کی اردو میں شاید یہ پہلی کوشش کی تھی' جو علامہ کے ذریعے 1905ء میں عمل میں آئی۔

1907ء میں علامہ جرمنی میں آئے۔ یہاں وہ 20 جولائی سے 5 نومبر تک رہے۔ ان کا قیام ہائیڈل برگ اور میونخ کے شہروں میں رہا۔ ہائیڈل برگ میں انہوں نے اپنی جرمن استاد اور دوست ایما ویگے ناسٹ کے ساتھ گوئٹے اور کچھ دوسرے جرمن شعرا کا مطالعہ کیا۔ اس وقت جرمن زبان میں اقبال کی استعداد کچھ زیادہ نہیں تھی۔ لیکن استاد کی مدد' اپنی ذہانت اور شاعرانہ ذکاوت کی بنا پر وہ بہت جلد بطن شاعر میں اتر گئے۔ گوئٹے کے "فاؤسٹ" کا دوسرا حصہ بعض اصطلاحات کی وجہ سے عام جرمن قارئین کے لئے بھی مشکل ہے لیکن اقبال نے جتنی جلدی اس کو سمجھا' اس پر ان کے جرمن احباب کو بھی حیرت ہوئی۔ اقبال کو جرمنی میں اپنے قیام کے دوران گوئٹے کو زیادہ پڑھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ ذہنی روابط کی مستحکم بنیاد اسی زمانے میں پڑی اور یہ روابط اقبال کی آخری عمر تک برقرار رہے۔

1908ء میں اقبال وطن واپس آئے اور ان کی پہلی شعری تصنیف مثنوی "اسرار خودی" 1915ء میں شائع ہوئی لیکن 1910ء میں اقبال نے اپنی یادداشتوں پر مبنی ایک بیاض مرتب کرنا شروع کی۔ اس بیاض کو ڈاکٹر جاوید اقبال نے Stray Reflections کے نام سے 1961ء میں شائع کیا۔ "شذرات فکر اقبال" اسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں اگر کوئی ایک شخصیت چھائی ہوئی نظر آتی ہے' تو وہ گوئٹے کی ہے۔ گوئٹے کے بارے میں اس کتاب میں آٹھ نواندراجات موجود ہیں۔ اقبال نے یہ اعزاز کسی اور شخصیت کو نہیں بخشا۔ ان اندراجات سے جہاں اقبال کی گوئٹے سے وابستگی کا پتہ چلتا ہے' وہیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال نے گوئٹے کا کس قدر گہرا مطالعہ کیا تھا۔

اقبال کی یہ خوش بختی تھی کہ ادبی زندگی کے اوائل ہی میں بعض عظیم مفکرین کے ساتھ ان کے ذہنی روابط قائم ہوئے اور بلا شبہ گوئٹے ان میں سے ایک تھا۔ اپنے شاعرانہ ارتقا میں گوئٹے کے اثرات کا اعتراف خود اقبال نے ان لفظوں میں کیا ہے :

"جب کسی عظیم ذہن سے ہمارا رابطہ قائم ہوتا ہے تو ہماری روح اپنے آپ کو

پالیتی ہے۔ گوئٹے کے تخیل کی بے کرانی سے آشنا ہونے کے بعد مجھ پر اپنے تخیل کی تنگ دامانی منکشف ہو گئی۔"

ایک اور اندراج میں اقبال نے گوئٹے کا شمار ان مفکرین میں کیا ہے' جس سے انہوں نے اشیا کی باطنی حقیقت تک پہنچنا سیکھا۔

گوئٹے کی ادبی تصانیف کی فہرست طویل ہے' لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں سے علامہ اقبال نے کس کس کا مطالعہ کیا تھا۔ اقبال کی تحریروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں گوئٹے کا ڈراما "فاؤسٹ" بہت پسند تھا۔ وہ اس کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔ اس کے بارے میں بیاض ہی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"گوئٹے نے ایک معمولی قصے کو لیا اور اس میں صرف انیسویں صدی ہی نہیں بلکہ نسل انسانی کے تمام تجربات سمو دیئے۔ ایک معمولی قصے کو انسان کے اعلیٰ ترین نصب العین کے ایک منظم و مربوط اظہار میں ڈھال دینا الہامی کارنامے سے کم نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے بے ہنگم ہیولیٰ سے ایک حسین کائنات تخلیق کر دی جائے۔"

گوئٹے کی دوسری کتاب جو اقبال کو بہت پسند تھی وہ West-oestli cher Diwan یا "دیوان غرب شرقی" ہے' جسے اقبال "دیوان مغربی" کہتے ہیں۔ 1923ء میں اقبال نے "پیام مشرق" کے نام سے اسی دیوان کا جواب لکھا۔ اس قسم کی جواب نویسی مشرق کی ایک معروف ادبی روایت ہے۔ شعرا نے مسلمہ شاہکاروں کے جواب لکھ کر جہاں اپنی قدرت کلام کا ثبوت بہم پہنچایا ہے' وہیں انہوں نے اس جواب کے ذریعے اس شاہکار کی عظمت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ فارسی کی ادبی تاریخ میں نظامی گنجوی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ انہوں نے پانچ شاہکار مثنویاں تحریر کیں۔ بے شمار شعرا نے "خمسہ نظامی" کا جواب لکھا۔ ان میں سے امیر خسرو' فیضی اور مولانا جامی قابل ذکر ہیں۔ اقبال نے اس قسم کے دو جواب لکھے ہیں۔ ایک تو انہوں نے چودھویں صدی عیسوی کے بزرگ صوفی شاعر شیخ محمود شبستری کی معروف مثنوی "گلشن راز" کا جواب "گلشن راز جدید" کے نام سے لکھا۔ اس میں اقبال نے شیخ کے وحدت الوجودی افکار کی تردید کی ہے اور اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ دوسرا جواب گوئٹے کے "دیوان" کا "پیام مشرق" کی صورت میں لکھا ہے۔ یہ جواب لکھ کر اقبال نے

پورے مشرق کی طرف سے ایک طرح کا فرض کفایہ ادا کیا ہے اور اسی بدولت انہیں گوئٹے کے مداحوں میں ایک منفرد اعزاز حاصل ہوا۔ "پیام مشرق" کے دور میں اقبال اور گوئٹے کے درمیان انتہائی ذہنی قربت نظر آتی ہے۔

اقبال گوئٹے سے متاثر تھے ان کے مقلد نہیں تھے' اس لئے "پیام مشرق" میں ان کے اثرات تو نظر آتے ہیں مگر تقلید کا نشان بھی نہیں ملتا۔ "پیام مشرق" میں گوئٹے کے دیوان کی کسی نظم کا ترجمہ نہیں ملتا صرف ایک نظم "حور و شاعر" میں عنوان کا اشتراک ضرور ملتا ہے کیوں کہ اس نام کی ایک نظم دیوان میں بھی موجود ہے۔ اسی میں گوئٹے کی نظم "حور و شاعر" کے درمیان ایک مکالمہ ہے اور یہ مکالمہ کافی طویل ہے۔ شاعر جنت میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ حور اس کو مجاہد و غازی سمجھ کر اس کے زخم دیکھنا چاہتی ہے تاکہ اس کے بعد اسے جنت میں داخلے کی اجازت دی جا سکے لیکن اقبال کی نظم "حور و شاعر" گوئٹے کی نظم سے بالکل مختلف ہے۔ اقبال نے خود بھی ایک ذیلی عنوان کے ذریعے وضاحت کر دی ہے کہ ان کی نظم گوئٹے کی نظم کے جواب میں ہے۔ اس نظم میں حور شاعر سے اس کی بے التفاتی کا گلہ کرتی ہے۔ شاعر جواب میں بہت کچھ کہتا ہے لیکن اس کے جواب کو ان دو شعروں میں سمیٹا جا سکتا ہے:

ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
دل عاشقاں بمیرد بہ بہشت جاودانے
نہ نوائے درد مندے نہ غمے نہ غمگسارے

"دیوان حافظ"..... گوئٹے کے دیوان کا سب سے بڑا محرک تھا' گو اقبال "اسرار خودی" میں حافظ کو مسترد کر چکے تھے لیکن "پیام مشرق" کی غزلیات پر کم از کم حافظ کے اسلوب کی گہری چھاپ نظر آتی ہے بلکہ غزلیات کے حصے "مئے باقی" کا عنوان بھی حافظ ہی کے ایک مصرعے سے ماخوذ ہے۔ حافظ کے ان اثرات کو قبول کر کے اقبال نے "پیام مشرق" کو گوئٹے کے "دیوان" سے ذرا قریب رکھنے کی کوشش کی ہے۔

"پیام مشرق" میں بھی اقبال نے گوئٹے کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اقبال نے یوں تو بہت سے مفکرین کے ساتھ ہم سفری اختیار کی ہے لیکن کچھ دور ان کے ساتھ

چل کر انہوں نے اپنا راستہ الگ کر لیا۔ جتنا کوئی انہیں پسند آیا' اس کی انہوں نے اتنی ہی تعریف کی۔ ایک زمانے میں وہ ہیگل کے نظام سے بہت مرعوب تھے لیکن ایک وقت آیا کہ انہیں ہیگل کا صدف گہر سے خالی نظر آیا۔ برگساں سے اقبال کی ہم آہنگی اپنی جگہ لیکن زناری برگساں ہونا انہیں پسند نہیں کیونکہ اس میں خودی کھونی پڑتی ہے۔ نطشے کا دل مومن مگر دماغ کافر ہے۔ کارل مارکس کلیم بے تجلی اور مسیح بے صلیب ہے۔ لیکن مغرب میں ایک گوئٹے ہے جس کی اقبال نے ہمیشہ تعریف کی ہے اور یہ تعریف "پیام مشرق" میں تو اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ پہلے خود عقیدت کے جذبات کا اظہار کیا' اسے پیر مغرب کہا' حکیم حیات کے نام سے یاد کیا۔ اقبال نے اس پر اکتفا نہیں کیا۔ مولانا روم کے منہ سے گوئٹے کی تعریف کرائی۔ یہ گوئٹے کی تجلیل کی انتہا ہے:

گفت رومی اے سخن را جاں نگار
تو ملک صید استی و یزداں شکار
فکر تو در کنج دل خلوت گزید
ایں جہان کہنہ را باز آفرید
سوز و ساز جاں بہ پیکر دیدہ
در صدف تعمیر گوہر دیدہ
ہر کے از رمز عشق آگاہ نیست
ہر کسے شایان ایں درگاہ نیست
"داند آں کو نیک بخت و محرم است
زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است"
(رومی)

1930ء میں اقبال کے خطبات Reconstruction of Religious Thought in Islam کے نام سے شائع ہوئے لیکن یہ فلسفیانہ تصنیف بھی گوئٹے کے ذکر سے خالی نہیں۔ اس میں اقبال نے گوئٹے کے دو اقتباس دیئے ہیں' ایک کا تعلق اسلام کے بارے میں گوئٹے کی مثبت رائے سے ہے' دوسرے میں وجود باری پر چند خوبصورت اشعار ہیں' جن کا اردو ترجمہ سید نذیر نیازی نے اس طرح کیا ہے:

اپنی ہی ذات کے بے پایاں تکرار میں
کیونکہ وہی سدا رواں دواں ہے
کتنی محرابیں ہیں جو بڑھ بڑھ اور مل مل کر
اتنے بڑے قالب کو سہارا دیتی ہیں
ہر شے سے زندگی کی محبت پھوٹ رہی ہے
بلند ترین ستارہ ہو یا حقیر ترین ذرہ
یہ ساری کشمکش اور ساری جدوجہد
ابدی سکون ہے' ذات خداوندی میں

غرض شاعری ہو یا فلسفہ' گوئٹے اقبال کے لئے ایک معتبر حوالہ بن گیا جس کا استعمال وہ بار بار کرتے ہیں۔

1932ء میں اقبال کی شاہکار تصنیف "جاوید نامہ" منظر عام پر آئی۔ اس میں گوئٹے کا کوئی براہ راست ذکر تو نہیں ملتا لیکن اس میں تمہید آسمانی اور تمہید زمینی کی تعمیر و تشکیل میں "فاؤسٹ" کے Prologues اقبال کے پیش نظر رہے ہیں۔ اقبال کی آخری تصنیف "ارمغان حجاز" میں ابلیس کی مجلس شوریٰ سے ذہن گوئٹے کے "فاؤسٹ" کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

اقبال کی تصانیف کے اس سرسری جائزے سے گوئٹے اور اقبال کے ذہنی روابط کی تاریخ اور اس کے حدود واضح ہوجاتے ہیں لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کی تربیت انگریزی نظام تعلیم میں ہوئی اور اس وقت انگریزوں کے اقتدار کا سورج نصف النہار پر تھا۔ دنیا کے اس حصے میں انگریز اور انگلستان ہی ہر معاملے میں حجت کا درجہ رکھتے تھے۔ پھر اقبال جرمنی کی طرف کیوں متوجہ ہوئے۔ اس کے مفکرین سے کیوں اتنا اثر لیا اور شیکسپئر کو چھوڑ کر انہوں نے گوئٹے کو کیوں مرکز توجہ بنایا؟ پہلے سوال کا جواب عہد اقبال کے سیاسی واقعات میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں انگلستان کے مقابلے میں جرمنی کی ابھرتی ہوئی قوت کو محکوم ہندوستان کے حق میں نیک فال سمجھا گیا۔ اس ملک سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر لی گئیں۔ جرمنی اور ترکیہ کے بڑھتے ہوئے تعاون اور روابط کی بدولت جرمنی نے مسلمانان ہند کے دل جیت لئے۔ جرمنی نے بھی اپنی خارجہ پالیسی میں "مسلم

انڈیا" کو بڑی اہمیت دی۔ وہ ان کی مزاحمتی تحریکوں کے ذریعے برطانوی سامراج کو پریشان کرنا چاہتا تھا۔ قیصر ولیم کے زمانے کی وزارت خارجہ کی دستاویزات میں ہندوستان مسلم انڈیا اور غیر مسلم انڈیا میں منقسم ملتا ہے جس کی کثرت سے اس زمانے میں یہ ترکیب ان دستاویزات میں استعمال ہوئی ہے' اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ ریشمی رومال کی تحریک میں مسلم انڈیا کے لئے جرمنوں کی حمایت کے واضح آثار نظر آتے ہیں۔ ان اسباب کی بنا پر برصغیر کے مسلمان جرمنی کے لئے اپنے دلوں میں ایک نرم گوشہ رکھتے تھے۔ اقبال کا تعلق بھی اس نسل سے تھا۔ جرمنی اور اس کے مفکرین کی طرف ان کا میلان بلاوجہ نہیں تھا۔

اقبال کی گوئٹے سے متاثر ہونے کی اولیں وجہ تو گوئٹے کا شاعرانہ کمال ہی ہو سکتا ہے۔ اقبال کو شیکسپیئر اور گوئٹے دونوں پسند تھے لیکن ان دونوں میں قابل ترجیح گوئٹے ہی تھا۔ اس کی وجہ خود اقبال نے Stray Reflections میں اس طرح بیان کی ہے :

Both Shakespeare and Goethe rethink the Divine thought of Creation. There is one important difference between them. The realist Englishman rethinks the individual; the Idealist German the Universe. His Faust is a seeming individual only. In reality he is humanity individualized.

اسلام کی جانب گوئٹے کا پسندیدہ رویہ بھی اقبال کی گوئٹے سے وابستگی کا ایک اہم سبب تھا۔ گوئٹے کی لائبریری واقع وائی مار میں آج بھی قرآن مجید کے متعدد نسخے اور تراجم' قرآن سے اس کے لگاؤ کا ثبوت ہیں۔ اس کے کلام میں اسلامی تعلیمات کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ اس کے "دیوان" کا آغاز جس نظم سے ہوتا ہے اس کا جرمن عنوان بھی "ہجرت" ہے۔

"دیوان" میں اس نے خدا کی وحدانیت' اس کے حضور تسلیم و رضا اور ایک پیغمبرؐ کی شفاعت پر بہت زور دیا ہے۔ اسلام کے بارے میں دیوان میں ایک جگہ گوئٹے لکھتا ہے :

If Islam means Submission to God.

We all live & die in Islam's dominion.

وہ زلیخا' مریم' خدیجہؓ اور فاطمہؓ کا شمار دنیا کی برگزیدہ ترین خواتین میں کرتا ہے۔

گوئٹے کا "دیوان" اسلام اور اسلامی تعلیمات کے ذکر سے بھرا پڑا ہے۔ "دیوان" کے اس پہلو کی بنا پر گوئٹے کو یہ لکھنا پڑا کہ اگر کوئی شخص اس "دیوان" کو پڑھ کر مجھ پر مسلمان ہونے کا شبہ کرے تو وہ اپنے اس شبہ میں حق بجانب ہو گا۔

گوئٹے نے اسلام پر باعتبار ایک تعلیمی قوت کے تبصرے کرتے ہوئے ایک بار اپنے سیکرٹری سے کہا:

"تم نے دیکھا اس تعلیم میں کوئی خامی نہیں۔ ہمارا کوئی نظام اور ہم پر کیا موقوف ہے کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

اس قول کو اقبال نے بھی اپنے "خطبات" میں نقل کیا ہے۔ گوئٹے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت سے بھی بہت متاثر تھے اور اس نے حضور اکرمؐ کو مرکزی کردار بنا کر ایک ڈراما بھی لکھنا شروع کیا تھا جسے وہ مکمل نہ کر سکا۔ Mahomets Gesang یا نغمہ محمدؐ اس کی باقیات میں سے ہے۔ اقبال نے "جوئے آب" کے نام سے اسی کا آزاد ترجمہ "پیام مشرق" میں شامل کیا ہے۔ اس خوبصورت نظم میں گوئٹے نے نبیؐ کے کردار کا موازنہ ایک رواں دریا کے کردار سے کیا ہے جو زمین کے لئے کیسی کیسی نعمتیں لے کر آتا ہے اور اس کا کردار کتنا انقلاب آفریں ہوتا ہے۔ یہ نظم بھی گوئٹے کی اسلام اور نبی اسلامؐ کے ساتھ اس کی وابستگی کی واضح دلیل ہے اور اقبال ایسے شخص سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے، کیوں کہ یورپ میں اسلام کے ساتھ تعصب جتنا عام رہا ہے، ہمدردی اتنی ہی شاذ رہی ہے۔

گوئٹے اول و آخر مغربی تھا۔ اس کے باوجود مشرق کی جو تجلیل اس کے ہاں ملتی ہے، اقبال کو اس نے بہت متاثر کیا۔ گوئٹے کا "دیوان" مشرق کے ساتھ اس کے عشق کا زندہ ثبوت ہے لیکن جس مشرق کے ساتھ گوئٹے کو عشق ہے، اس کے حدود مشرق وسطیٰ سے آگے نہیں بڑھے۔ ایک مختصر مدت کے لئے وہ ہندو اساطیر کا اسیر رہا لیکن وہ بہت جلد ہندوؤں کے دیوی دیوتاؤں سے بیزار ہو گیا اور ان پر اس نے کھل کھلا لعنتیں بھیجیں، البتہ عرب و عجم کی تعریف سے اس کا "دیوان" بھرا پڑا ہے۔ وہ کہتا ہے مشرق کس شان سے بحیرہ روم پر چھایا ہوا ہے۔ وہ واشگاف الفاظ میں کہتا ہے کہ مشرق کے شعرا، مغرب کے شعرا سے زیادہ عظیم ہیں۔ وہ مغرب سے بھاگ کر مشرق کی آغوش میں پناہ لینا چاہتا ہے۔

اسلام اور مشرق کے بارے میں گوئٹے کے نقطہ نظر کے علاوہ بعض مسائل پر دونوں

شاعروں میں اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ ان کے کچھ موضوعات مشترک ہیں۔ ان میں سے ایک موضوع زندگی کے امکانات کے بارے میں ہے۔ دونوں کا نقطہ نظر ایک ہے۔ اقبال سمجھتے ہیں کہ انسان اپنے عمل کے ذریعے اپنی تقدیر خود بناتا ہے۔ دنیا کھلے امکانات کے ساتھ اس کے سامنے موجود ہے' اس لئے انہوں نے ہر اس فلسفے اور عقیدے کی مخالفت کی جو انسان کو عمل کے نتائج کے بارے میں شک و شبہ میں ڈال دے۔ افلاطون کا نظریہ علم ہو یا عقبیٰ پرستی' منفی تصور تقدیر ہو یا وجودی تصوف' برگساں کا اندھا جوش حیات ہو یا نطشے کی تکرار ابدی' ڈارون کا حیاتیاتی جبر ہو یا کارل مارکس کا جبر تاریخ..... اقبال نے ان سب کو اسی بنیاد پر مسترد کیا کہ یہ سب نظریات انسان کو لذت عمل سے بیگانہ کرتے ہیں۔ ان سب مفکرین کے مقابلے میں گوئٹے انہیں اس لئے بھی عزیز ہے کہ اس نے حکیم فاؤسٹ اور شیطان کی عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کے امکانی نشو و نما کے تمام مدارج کی نشان دہی بڑی خوبصورتی کے ساتھ کی ہے۔

گوئٹے اور اقبال دونوں زندگی کے بارے میں ایک متوازن نظریہ رکھتے ہیں۔ دونوں زندگی کے مادی پہلو کے ساتھ ساتھ اس کے روحانی پہلو کی اہمیت سے بھی غافل نہیں ہیں۔ گوئٹے نے "دیوان" کے ذریعے مغرب کو اس کی بڑھتی ہوئی مادہ پرستی سے خبردار کیا ہے اور اس کے معاصر ہائینے کا "دیوان" پر یہ تبصرہ بالکل بجا ہے:

> "یہ دیوان ایک گلدستہ عقیدت ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے۔ اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے سے حرارت کا متلاشی ہے۔"

اقبال نے زندگی کے روحانی پہلو پر اپنے "خطبات" اور کلام میں بہت کچھ لکھا ہے۔ اقبال نے "خطبات" میں ایک بڑی پتے کی بات کہی ہے۔ علامہ فرماتے ہیں:

> "آج انسانیت کو تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ کائنات کی ایک روحانی تعبیر' فرد کی روحانی آزادی اور کلی اہمیت کے وہ بنیادی اصول جو روحانی بنیاد پر انسانی سوسائٹی کے ارتقا کا رخ متعین کر سکیں۔"

دونوں شاعر جدوجہد اور حرکت و عمل میں انسانی بقا کا راز دیکھتے ہیں۔ گوئٹے کے خیال میں زندگی کے ابدی تسلسل کا عقیدہ جدوجہد کے تصور کا لازمی نتیجہ ہے کیوں کہ اگر کوئی

شخص زندگی کے آخری لمحے تک مصروف عمل رہتا ہے' تو قدرت ایسی پختہ روح کو ایک خارجی شکل اور ایک دوسرا وجود دینے پر مجبور ہو جاتی ہے تاکہ وہ اس فرد کو جدوجہد میں زندہ رکھ سکے۔ اقبال کے نزدیک ذاتی بقا' ذاتی جدوجہد سے حاصل ہوتی ہے۔ انسان تو اس کا بس ایک امیدوار ہے۔

خیر و شر کے ازلی موضوع پر بھی اقبال گوئٹے سے مختلف ہیں۔ گوئٹے کے خیال میں زندگی میں خیر و شر کی دو قوتیں ہیں جو متضاد جہتوں پر عمل پیرا ہیں لیکن خدائی مقصد پورا کرنے میں دونوں ایک دوسرے سے تعاون کرتی ہیں۔ گوئٹے ماضی کی ثنویت پر یقین نہیں رکھتا لیکن وہ اس دنیا میں شر کی کارفرمائی سے بھی آنکھیں بند نہیں کرتا۔ اس کی رائے میں انسان کی بہترین خصوصیات خیر و شر کے عمل اور رد عمل سے ہی جنم لیتی ہیں۔

اقبال نے اس قسم کے خیالات کا اظہار کئی جگہ کیا ہے۔ "پیام مشرق" کی ایک مثال دیکھئے:

چہ گویم نکتہ زشت و نکوچیست
زباں لرزد کہ معنی پیچدار است
بروں از شاخ بینی خار و گل را
درون او نہ گل پیدا نہ خار است

گوئٹے اور اقبال دونوں سمجھتے ہیں کہ انسان کی شخصیت کے ارتقا اور اس کے حرکت و عمل کے لئے ابلیس کا وجود ضروری ہے۔ گوئٹے کے خیال میں ابلیس انسان کا ایسا ساتھی ہے جو اسے ہر لحظہ چوکنا رکھتا ہے کہ کہیں وہ سو نہ جائے یا سست نہ ہو جائے۔ یہی بات "بال جبریل" میں ابلیس' جبریل سے کہتا ہے:

ہے مری جرات سے مشت خاک میں ذوق نمو
میرے فتنے جامہ عقل و خرد کا تار و پو

گوئٹے اور اقبال ان مشابہتوں کے باوجود اپنی اپنی تہذیب کے نمائندے ہیں' اس تہذیب کے جس میں ان کی جڑیں پیوست ہیں۔ ان کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ انہوں نے اپنی اپنی جگہ مضبوط رہتے ہوئے بھی مشرق و مغرب کے درمیان ایک پل تعمیر کرنے کی کوشش کی۔

(مجلہ "اقبال" (لاہور)' جولائی 1988ء' ص 193-205)

سید افتخار حسین شاہ

اقبال اور گوئٹے

علامہ اقبال 16 جولائی 1914ء کو اکبر الہ آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"عام لوگ شاعرانہ انداز سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ کسی شاعر کی داد دینے کا بہترین طریق یہ ہے کہ اگر داد دینے والا شاعر ہو تو جس کو داد دینا مقصود ہو' اس کے رنگ میں شعر لکھے۔ یا بالفاظ دیگر اس کا تتبع کر کے اس کی فوقیت کا اعتراف کرے۔"(1)

علامہ نے اس خط میں کسی شاعر کے کلام کی داد دینے اور اس کی برتری تسلیم کرنے کا جو بہترین طریقہ بیان کیا ہے' اس کو راہ نما اصول بنا کر ہم یہ بات بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ علامہ اقبال ایک سخن شناس کی حیثیت سے گوئٹے کے کلام کی داد دینے والے تھے اور انہوں نے اس مقصد کی خاطر اس کے رنگ میں شعر کہے۔ علامہ کے کلام اور ان کے نثرپاروں میں اس بات کی بکثرت شہادتیں ملتی ہیں۔

اقبالیات کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کو اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں گوئٹے کی عظمت کا احساس ہو گیا تھا۔ چنانچہ 1901ء میں غالب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انہوں نے یہ فرمایا :

آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے(2)

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گوئٹے کی عظمت کا احساس بڑھتا گیا اور علامہ فراخ دلی سے اپنی زندگی کے ہر دور میں اپنے اس احساس کو مختلف صورتوں میں ظاہر کرتے رہے۔ علامہ اقبال کا وسیع مطالعہ اس احساس کو وسعت اور گہرائی بخشنے کا خاص طور پر محرک بنا۔ مشرقی ماحول میں ہوش سنبھالنے کی بدولت علامہ اقبال مشرقی روایات سے شروع ہی میں بخوبی آشنا ہو گئے تھے۔ 1905ء میں جب اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر دیار غیر میں پہنچے، تو تین سال کی طویل مدت میں انہوں نے مغرب کے ثقافتی سرمائے سے بالعموم اور جرمنی کے تہذیبی سرمائے سے بالخصوص کماحقہٗ آگہی حاصل کر لی۔ جرمن مفکرین میں سے کانٹ، ہیگل، نٹشے اور جرمن شعرا میں سے گوئٹے، شلر اور ہائینے کا خاص طور پر انہوں نے مطالعہ کیا۔ جرمنی افکار اور جرمنی ادب کے مطالعے نے زندگی کے متعلق ان کے نظریات کو بہت متاثر کیا، خاص طور پر گوئٹے کے افکار نے۔ اس پہلو کی رنگا رنگ جھلکیاں ہمیں ان کی اس ڈائری کے اوراق میں ملتی ہیں، جو انہوں نے، بقول پروفیسر محمد عثمان، جذباتی دور (1910ء) میں لکھی تھی اور جس کا ترجمہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی "شذرات فکر اقبال" کی صورت میں کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ایسے شذرات کی تعداد آٹھ بتائی ہے جن میں گوئٹے کا ذکر ملتا ہے، لیکن حقیقت میں مندرجہ ذیل نو شذرات ہیں:

(1) **اکتشاف: شذرہ نمبر 2-** جب کسی عظیم ذہن سے ہمارا رابطہ قائم ہوتا ہے تو ہماری روح اپنا اکتشاف کر لیتی ہے۔ گوئٹے کے تخیل کی بے کرانی سے آشنا ہونے کے بعد مجھ پر اپنے تخیل کی تنگ دامنی منکشف ہو گئی۔

(2) **ہیگل، گوئٹے، غالب، بیدل اور ورڈزورتھ: شذرہ نمبر 36-** میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے ہیگل، گوئٹے، مرزا غالب، عبدالقادر بیدل اور ورڈزورتھ سے کچھ استفادہ کیا ہے۔ ہیگل اور گوئٹے نے اشیا کی باطنی حقیقت تک پہنچنے میں میری راہ نمائی کی۔ بیدل اور غالب نے مجھے یہ سکھایا کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمو لینے کے باوجود اپنے جذبے اور اظہار میں مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھوں اور ورڈز ورتھ نے طالب علمی کے زمانے میں مجھے دہریت سے بچا لیا۔

(3) **جرمن قوم: شذرہ نمبر 44-** جرمن قوم کے روحانی نصب العین کی آئینہ دار گوئٹے کی "فاؤسٹ" ہے، نہ کہ وہ کتابیں جو گلیلیائی ماہی گیر کی تصانیف سمجھی جاتی ہیں

اور اہل جرمنی اس حقیقت کا پورا شعور رکھتے ہیں۔

(4) گوئٹے کا ڈرامہ "فاؤسٹ" : شذرہ نمبر 48- گوئٹے نے ایک معمولی قصے کو لیا اور اس میں صرف انیسویں صدی ہی نہیں بلکہ نسل انسانی کے تمام تجربات سمو دیئے۔ ایک معمولی قصے کو انسان کے اعلیٰ ترین نصب العین کے ایک منظم و مربوط اظہار میں ڈھال دینا الہامی کارنامے سے کم نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے بے ہنگم ہیولیٰ سے ایک حسین کائنات تخلیق کر دی جائے۔

(5) مصیبت کی اخلاقی قدر : شذرہ نمبر 87- کوئی مذہبی نظام مصیبت کی اخلاقی قدر کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ عیسائیت کے بانیوں کی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے صرف مصیبت کی حقیقت پر اپنے مذہب کی بنیاد رکھی اور دیگر عوامل کی اخلاقی قدر کو فراموش کر بیٹھے۔ تاہم حسین لیکن یک رخے یونانی نصب العین کی کمی پوری کرنے کے لئے بقول گوئٹے، بہترین تھا لیکن مصیبت کی رنگ آمیزی سے عاری تھا جس کی تلافی عیسائیت سے ہو گئی۔

(6) افلاطون اور گوئٹے : شذرہ نمبر 97- فطرت قطعی فیصلہ نہ کر سکی کہ افلاطون کو شاعر بنائے یا فلسفی۔ معلوم ہوتا ہے کہ گوئٹے کے بارے میں بھی وہ اسی قسم کے تذبذب میں مبتلا رہی ہو گی۔

(7) تشریح دماغ انسانی : شذرہ نمبر 108- اگر آپ انسانی دماغ کی تشریح و تجزیئے کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو آپ وونٹ، وارڈ، جیمز یا شاؤف سے رجوع کیجئے۔ لیکن انسانی فطرت کے بارے میں حقیقی بصیرت آپ کو صرف گوئٹے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

(8) شیکسپیئر اور گوئٹے : شذرہ نمبر 112- شیکسپیئر اور گوئٹے دونوں تخلیق کے تصور ابدی پر باز فکر کرتے ہیں لیکن ان کے درمیان ایک اہم فرق ہے۔ واقعیت پسند انگریز "انفس" کی باز فکر کرتا ہے اور عینیت پسند جرمن "آفاق" کی۔ گوئٹے کا "فاؤسٹ" محض برائے نام فرد ہے، در حقیقت وہ انسانیت کی تجسیم ہے۔

(9) گوئٹے اور بائینے : شذرہ نمبر 118- کوئی قوم اہل جرمنی کے برابر خوش نصیب نہیں۔ اس قوم میں بائینے جیسا شاعر اس وقت پیدا ہوا جب گوئٹے کی بھرپور نغمہ سرائی سے فضا معمور تھی۔ دو متصل بہاریں!

انیسویں صدی میں مغرب میں رہنے والے گوئٹے کا تخیل' اشیا کی باطنی حقیقت تک پہنچنے کی اس کی کوشش' انسانی فطرت کے بارے میں اس کی حقیقی بصیرت---- یہ سب پہلو بیسویں صدی کے مشرق میں بسنے والے اقبال کے لئے کیوں قابل توجہ بنے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم تاریخ کے اوراق الٹیں۔

اقوام عالم کی تاریخ کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں اٹھارویں صدی عیسوی کو روشن خیالی کا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں عقل کو فلسفے میں نمایاں حیثیت حاصل ہوئی اور ہر معاملے میں فیصلے کا انحصار عقل پر قرار دیا گیا۔ مذہبی عقائد کی معقولیت زیر بحث آئی۔ یہ صورت حال چونکہ مذہبی تعصب اور چرچ کی تنگ نظری کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی' اس لئے یورپ کے تمدنی ارتقا میں اس سے کوئی مثبت اضافہ نہ ہوا۔ اس صدی کے اختتامی سالوں میں کانٹ اور روسو نے معقولیت کی شان دار عمارت کو مسمار کر دیا جس سے مفکر اور ادیب خیال کے عقلی پہلوؤں کے بجائے جذبے' احساس اور آرزو کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جرمنی میں ہرڈر کی قیادت میں فن اور ادب کے متعلق نئے نظریات کی ترجمان ایک تحریک پیدا ہو گئی جس نے گوئٹے (1749ء تا 1832ء) کو بہت متاثر کیا۔ عقلیت پسندی میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ انسانی ذہن کو جامد سمجھ لیا جاتا ہے اور تاریخی ارتقا کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ ہرڈر نے اس نقطہ نظر کے خلاف آواز بلند کی۔ وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ جرمن فرانسیسی ثقافتی روایات زندگی کو ہر شعبہ میں اپنانے کے بعد بھی اپنا مخصوص قومی کردار باقی رکھ سکتے ہیں۔ دریں صورت ہرڈر کی عقلیت پسندی کے خلاف بغاوت دراصل فرانسیسی غلبے کے خلاف بغاوت تھی۔ اس نے قدیم جرمن لوک گیتوں کو حیات نو بخشی اور یہ ثابت کیا کہ تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے فرانسیسی اور جرمن چونکہ دو علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں' اس لئے دونوں کے ادب کو اپنی قومی امنگوں کا ترجمان ہونا چاہئے۔ گوئٹے اس ادبی ماحول میں روحانی تحریک سے وابستہ ہوا اور اس کے لئے فطرت اور انسانی جذبات قابل توجہ بن گئے۔

برٹرنڈ رسل اپنی تصنیف History of Western Philosophy میں یہ خیال پیش کرتا ہے: "جب جذبات کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو جائے' وہ انسانی زندگی میں معاشرتی قیود سے آزاد ہو جائیں' تو ان میں تخریبی رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔" معلوم ہوتا ہے

کہ گوئٹے کو رومانی تحریک یا جذبات کے متعلق اس معاشرتی حقیقت کا بہت جلد احساس ہو گیا۔ اٹلی کے سفر سے اسے اس پہلو کو سمجھنے میں بہت مدد ملی۔ رومانیت کے محض داخلی تقاضوں کی اہمیت اس کی نظر میں کم ہو گئی اور حسن کے خارجی مظاہر اور شواہد دیکھنے کی اسے بصیرت حاصل ہو گئی۔ وہ اس بات کا قائل ہو گیا کہ قانون قدرت کے مطابق فن کے مختلف مظاہر کو بھی چند ابدی اور بنیادی قدروں کا پابند ہونا چاہیئے۔

اس دور میں جرمنی میں مشرق شناسی کی ایک تحریک بھی چل رہی تھی جس کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ فارسی ادب کو جرمنی زبان میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ گوئٹے نے اسی تحریک کے زیر اثر 1816ء میں کلام حافظ پڑھ کر اپنا دیوان مرتب کیا۔ اس دیوان کے کئی حصے ہیں' مثلاً حافظ نامہ' زلیخا نامہ۔ گوئٹے کا یہی "دیوان" پڑھ کر علامہ نے اس کا جواب "پیام مشرق" کی صورت میں دیا۔

گوئٹے کی جملہ تصانیف میں سے "فاؤسٹ" کو سب سے زیادہ شہرت اور اہمیت حاصل ہے۔ علامہ اقبال بھی اپنی تحریروں میں اس کا ذکر کئی بار بہ نظر تحسین کرتے ہیں۔ گوئٹے کا "فاؤسٹ" وہ آئینہ ہے جس میں ہم دو قوتوں کا ازلی اور ابدی تصادم دیکھتے ہیں۔ ایک قوت کسی ضابطے یا قانون سے آشنا نہیں' دوسری قوت انسان کے اس رجحان کی ترجمانی کرتی ہے جس کے مطابق وہ داخلی تجربات کی روشنی میں صداقت کی تہہ تک پہنچنا چاہتا ہے اور اس سے سمجھوتے کا خواہاں ہوتا ہے۔ پہلی قوت کا ترجمان گوئٹے کا کردار ایگمنٹ (Egmont) ہے جو دن رات حرکت میں رہتا ہے' ماضی اور مستقبل سے بے نیاز اپنے خیال میں خوبصورت زندگی بسر کرتا ہے۔ حال سے لطف اندوز ہونا ہی اس کے لئے سب کچھ ہے۔ اس کے نزدیک زندگی کا واحد مقصد زندہ رہنا ہے۔ دوسری قوت کا نمائندہ گوئٹے کا ٹاسو (Tasso) ہے جو اپنے تصورات کی دنیا میں رہتا ہے اور جس کے لئے فطرت اور انسان کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ تصورات اور حقائق میں جب تصادم ہوتا ہے تو وہ سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ نتیجہ تباہی کی صورت میں نکلتا ہے۔ انٹونیو (Antonio) بحران میں ٹاسو کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ وہ تصورات کی دنیا سے نکل کر حقائق کی دنیا میں آئے۔

زندگی کو جس طرح فن کاروں کے فن پاروں اور نظریات کی ضرورت ہوتی ہے' اسی طرح باعمل لوگوں کے اعمال کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرد میں نظریات اور اعمال کے اعتبار سے

سمجھوتے کی یہ اعلیٰ و ارفع صورت گوئٹے کا وہ نصب العین ہے جسے اس نے "فاؤسٹ" میں پیش کرنا چاہا۔ فاؤسٹ ڈرامے کے آغاز میں ایک ایسا شخص ہے جو بہت بڑا عالم ہے، جس کی زندگی کا بیشتر حصہ حصول علم میں گزرا ہے، لیکن جسے سکون اور اطمینان حاصل نہیں ہو سکا۔ وہ انسانوں کی بھرپور اور متحرک زندگی سے بے خبر ہے، حسن فطرت اور عشق سے ناآشنا ہے۔ وہ ایک طویل مدت تک اسرار قدرت جاننے کے لئے کوشاں رہا۔ بالآخر اسے یہ معلوم ہوا کہ محض علم کے سہارے اعلیٰ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے۔ میفسٹو (Mephisto) سے ملنے سے پہلے فاؤسٹ زندگی کی ہر شے سے متنفر ہو چکا تھا۔ میفسٹو کے ساتھی اپنے گیت سے اسے پھر رنگ و بو اور خوشیوں کی دنیا میں لے آئے۔ ہر دم رواں رہنے والے قافلہ حیات کا یہ نصب العین ہے جو اقبال کا ابلیس اور گوئٹے کا میفسٹو آدم کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ بی۔ اے۔ ڈار اپنی مشہور تصنیف Iqbal and Post-Kantian Voluntarism میں لکھتے ہیں (ص 173-174):

"بدیں صورت اقبال اور گوئٹے دونوں کے نقطہ نظر سے اعلیٰ نصب العین نہ تو صرف گوشہ نشینی اور عالم خیال میں رہنا ہے اور نہ ہی صرف سرگرمیوں سے بھرپور زندگی بسر کرنا ہے بلکہ زندگی میں خیال، عمل اور محبت کا حسین امتزاج ہے۔ Mephisto، Faust اور Gretschen سب کو کائنات کی سٹیج پر اپنا اپنا کردار ادا کرنا ہے لیکن زندگی کا مکمل ڈراما تینوں قوتوں کے مکمل اشتراک عمل سے منظر عام پر آتا ہے۔ اقبال نے بہت ہی دل کش انداز میں اس خیال کو 'جاوید نامہ' کے ان اشعار میں پیش کیا ہے:

علم را بر اوج افلاک است رہ
تا ز چشم مہر بر کندد نگہ
چشم او بر واردات کائنات
تا بہ بیند محکمات کائنات
دل اگر بندد بہ حق، پیغمبری است
ور ز حق بیگانہ گردد، کافری است
علم را بے سوز دل خوانی شر است
نور او تاریکی بحر و بر است

قوتش ابلیس را یارے شود
نور نار از صحبت نارے شود
کشتن ابلیس کارے مشکل است
ز انکہ او گم اندر اعماق دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتہ شمشیر قرانش کنی

علم بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاہوتیاں
بے محبت علم و حکمت مردۂ
عقل تیرے بر ہدف ناخوردۂ
کور را بینندہ از دیدار کن
بو لہب را حیدر کرار کن"

اپنی اسی کتاب میں (ص 161 پر) بی۔ اے۔ ڈار علامہ کا یہ شعر بھی پیش کرتے ہیں "پیام مشرق":

گر از دست تو کار نادر آید
گناہے ہم اگر باشد ثواب است

اور پھر یہ سوال اٹھاتے ہیں: "کیا کسی کار گناہ کو تخلیقی اور جدت کا حامل ہونے کی وجہ سے کار ثواب قرار دینا مناسب ہے؟ وہ کون سی قوت ہے جو اس کی برائی کو اچھائی کا رنگ دے سکتی ہے، کم قیمت کو گراں قیمت بنا سکتی ہے؟" ان سوالات کے جوابات مصنف پھر خود ہی یہ دیتا ہے کہ اقبال اور گوئٹے کا ایمان ہے کہ عشق کی بدولت کار گناہ کار ثواب بن سکتا ہے۔ عشق یہ معجزہ دکھا سکتا ہے کہ پیتل کو سونا بنا دے۔ عشق کیا ہے؟ گوئٹے نے اس کا محدود مفہوم مدنظر رکھا اور اسے "ابدی نسوانیت" قرار دیا جس کی ترجمانی "فاؤسٹ" میں Gretschen کے کردار سے ہوتی ہے۔ یہ کردار ایک معزز اور معصوم خاتون کا ہے جسے Mephisto فاؤسٹ کی خاطر گمراہ کرتا ہے، لیکن جو بالآخر آسمانی محبت کی علامت بن جاتی ہے۔ Mephisto فاؤسٹ کو گوشت پوست، نفی اور تباہی کی دنیا میں پہنچاتا ہے، لیکن

Gretschen اسے عالم روحانی میں پہنچا دیتی ہے۔ گوئٹے نے Mephisto کو تضادات اور منفی رجحانات کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

"فاؤسٹ" میں علامہ کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ وہ اس کا اردو میں ترجمہ کرنے کے متعلق بھی اپنے بعض معاصرین کو مشورے دیتے رہے' مثلاً 15 جون 1927ء کو سراج نظامی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"'فوسٹ' (گوئٹے کا شاہکار) کا اردو ترجمہ' جہاں تک مجھے معلوم ہے' نہیں ہوا۔ البتہ ایک اور ڈرامہ 'شیطان کا غلام' کے نام سے مشہور ہے جو اسی روایت پر غالباً مبنی ہے۔ میرا ارادہ اس کے ترجمے کا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ 'فوسٹ' کا اردو ترجمہ آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے بہت سی فرصت کی ضرورت ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ 'فوسٹ' کے اردو ترجمے سے عام پبلک کچھ حظ نہ اٹھا سکے گی۔"(3)

علامہ اقبال نے 1928ء اور 1929ء میں جب جنوبی ہند میں مختلف لیکچر دیئے تو علامہ کی مصروفیات کی روئیداد ڈاکٹر عبداللہ چغتائی "ہم سفر" کے فرضی نام سے روزنامہ "انقلاب" میں شائع کرتے رہے۔ اس سلسلے میں 11 جنوری 1929ء کو "انقلاب" میں یہ الفاظ چھپے :

"دوپہر کا کھانا ہم نے سیٹھ ہاشم اسماعیل صاحب کے ہاں ان کے مکان پر کھایا۔ سیٹھ ہاشم اسماعیل کی اہلیہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ آپ مشہور سوداگر حاجی یوسف سبحانی کی صاحب زادی ہیں۔ سینئر کیمبرج کرنے کے بعد جرمنی میں دو سال علم طب کی تحصیل کر چکی ہیں۔ کھانا کھا چکے تو انہوں نے اپنی کتاب Goethe's Faust بھیجی اور کہلایا کہ اس پر ڈاکٹر صاحب اپنے ہاتھ سے اپنا کوئی شعر لکھ دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ شعر لکھا :

کلام و فلسفہ از لوح دل فرو شستم
ضمیر خویش کشادم بہ نشتر تحقیق

"یہ وہ نتیجہ ہے جس پر فوسٹ کو پہنچنا چاہئے تھا مگر وہ نہ پہنچا۔" (4)

"فاؤسٹ" سے علامہ کے گہرے لگاؤ کا ثبوت سید نذیر نیازی کے نام علامہ کے مکتوبات میں بھی ملتا ہے۔ 14 اگست 1930ء کو انہیں یہ مشورہ دیتے ہیں :

"سورتی صاحب سے ضرور مل لیجئے۔ وہ آپ کو تراجم کے متعلق (بالخصوص اصطلاحات کے تراجم کے متعلق) بہت مفید مشورہ دیں گے۔ عابد صاحب (ڈاکٹر سید عابد حسین) سے یہ

بھی پوچھئے کہ فاؤسٹ میں Prolegomena in Heaven کا کیا اردو ترجمہ انہوں نے کیا ہے؟" (5)

بقول نذیر نیازی Prolegomena in Heaven (تمہید آسمانی) کے بارے میں استفسار کی تقریب یہ تھی کہ 1927ء ہی سے "جاوید نامہ" کا تصور حضرت علامہ کے ذہن میں کام کر رہا تھا۔ اسی سال کی ایک ملاقات کا ذکر نذیر نیازی بدیں الفاظ کرتے ہیں :

"عابد صاحب نے جرمنی میں تعلیم پائی تھی اور "فاؤسٹ" کا ترجمہ اردو میں کر رہے تھے۔ جرمنی' جرمن قوم اور جرمن تہذیب کی باتیں ہونے لگیں' گوئٹے کی۔ گوئٹے سے حضرت علامہ کو جو فطری اور طبعی مناسبت ہے۔ فلسفہ میں' مذہب میں' زندگی میں۔۔۔ اور جس کا اظہار بالاخر "پیام مشرق" میں ہوا' اس سے گفتگو کا رخ شعر و شاعری کی طرف پلٹ گیا۔ عابد صاحب دراصل یہ معلوم کرنا چاہتے تھے' لیکن حضرت علامہ سے کلام کی فرمائش کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ مگر پھر معلوم نہیں کیسے حضرت علامہ ان کا مطلب سمجھ گئے۔ "زبور عجم" اس وقت مطبع میں تھی۔ حضرت علامہ نے از رہ عنایت اس کے بعض اشعار سنائے اور پھر فرمایا : میری یہ کتاب اہل مشرق کے لئے ہے' جس کا مطلب ایک طرح سے یہ تھا کہ جیسے "پیام مشرق" اہل مغرب کے لئے.....

"فاؤسٹ کے سلسلے میں بھی اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ عابد صاحب نے اس کے صرف ایک' یعنی پہلے' حصے کا ترجمہ کیا تھا' لیکن حضرت علامہ کا خیال تھا کہ دوسرے حصے کا ترجمہ بھی ہونا چاہئے' بلکہ ایک دفعہ مجھ سے فرمایا : دوسرا حصہ بہت کم لوگوں کی سمجھ میں آتا ہے۔ اس میں متعدد اصطلاحات کیمیا گری کی ہیں۔ بعض اسما اور مصطلحات بھی اسی طرح کے ہیں' جن کو اہل مشرق تو خوب سمجھتے ہیں' لیکن اہل مغرب بہت کم۔ فرمایا : قیام جرمنی میں اس موضوع پر گفتگو ہوتی تو میں ایسے متعدد مقامات کی تشریح کرتا جس پر خود جرمنوں کو بھی تعجب ہوتا۔ لہٰذا عابد صاحب چاہیں تو دوسرے حصے کے ترجمے میں میں ان کا ہاتھ بٹا سکتا ہوں۔ میں نے اس کا ذکر عابد صاحب سے کیا تو انہیں بے حد مسرت ہوئی۔ وہ چاہتے تھے حضرت علامہ کی خدمت میں حاضری کا موقع مل جائے تو حصہ ثانی کا ترجمہ بھی کر ڈالیں۔ مگر افسوس ہے کہ بعض موانع کی بنا پر اس دوسرے حصے کے ترجمے کی نوبت نہیں آئی۔" (6)

"فاؤسٹ" کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ گوئٹے دوسرے عظیم انسانوں کی طرح

اپنے دور کی پیداوار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنا دور بھی پیدا کرنے والا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدا میں اس نے رومانی تحریک کا ساتھ دیا لیکن جلد ہی اسے اس کی کمزوریوں کا احساس بھی ہو گیا اور اس نے اپنے لئے ایک نیا راستہ بنا لیا۔ وہ صرف جذبات اور احساسات کا شاعر نہ رہا۔ اس کے لئے یہ کائنات تصورات کی دنیا نہ رہی بلکہ ایک ایسا نظام بن گئی جو کسی اعلیٰ مقصد کے لئے قائم کیا گیا ہو۔ زندگی کوئی کھلونا نہیں' بلکہ فرد کے روحانی ارتقا کی ایک سٹیج ہے۔ "فاؤسٹ" سے گوئٹے نے اپنے معاصرین اور آئندہ نسلوں کو تبدیلی اور امید کا یہ پیغام پہنچایا ہے۔

علامہ اقبال بھی گوئٹے کی طرح اپنے عہد کی تخلیق ہی نہیں' اس کے خالق بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک الشعرا بہار کی زبان پر یہ الفاظ آئے تھے : "عصر حاضر خاصہ اقبال گشت۔"

علامہ اقبال بھی گوئٹے کی طرح اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں اپنے دور کی روایتی ادبی راہ پر چلتے رہے' لیکن قیام یورپ اور بعض دوسرے عوامل نے 1911ء کے بعد ان کے انداز فکر میں ایک نمایاں انقلاب پیدا کر دیا۔ جس شاعر نے اپنے متعلق یہ کہا تھا کہ "اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے" ایک مرد خود آگاہ بن گیا' ترجمان حقیقت کا فرض ادا کرنے لگا۔ گو گوئٹے (1749ء - 1832ء) اور اقبال (1877ء - 1938ء) دونوں کے ادوار میں تقریباً ایک صدی کا فرق ہے' دونوں کا تعلق مختلف ممالک سے ہے' مختلف مذاہب سے ہے' لیکن پھر بھی دونوں کی تخلیقات میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانوں کا تعلق خواہ قبل از تاریخ کے زمانے سے ہو یا عصر حاضر سے' مشرق سے ہو یا مغرب سے' عیسائیت سے ہو یا اسلام سے' اولاد آدم ہونے کی وجہ سے غم' خوشی اور غصے کے جذبات سب میں مشترک ہیں۔ ان کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے حرکات' مظاہر اور اثرات تاریخی اور جغرافیائی تقاضوں کی وجہ سے مختلف ہو سکتے ہیں' لیکن تحقیق کی نظر میں ان کی اصل ایک ہے۔ صداقت کی تلاش کا احساس بھی رنگ و نسل کے امتیازات اور قید زمان و مکاں سے آزاد ہے۔ خیر و شر' حق و باطل اور نیک و بد کے تصورات بھی روز ازل سے ہیں اور تابد رہیں گے۔ عظیم راہ نما اور عظیم مفکر چونکہ تعصبات سے بالا ہو کر انسان کے بنیادی جذبات و احساسات اور اس کی بنیادی ضرورتوں کو قابل توجہ سمجھتے ہیں اور انسانیت

کی نشو و نما کے ضامن معاشرے کے خد و خال کا تصور پیش کرتے ہیں' اس لئے ان کی منزل ایک ہونے کی وجہ سے ان کے انداز فکر اور طرز عمل میں مماثلت کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایسی ہی مماثلت کی ایک صورت دیکھ کر اقبال نے غالب کے متعلق یہ کہا تھا:

"گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے"

اور آج اقبال کے متعلق ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ گوئٹے غالب ہی کا ہم نوا نہیں تھا' اقبال کا بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کے شاعروں میں سے گوئٹے کو اقبال نے صرف قابل توجہ ہی نہیں سمجھا ہے بلکہ قابل ستائش بھی سمجھا ہے۔ "پیام مشرق" کے آغاز میں اس کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے:

پیر مغرب شاعر المانوی
آں قتیل شیوہ ہائے پہلوی
بست نقش شاہدان شوخ و شنگ
داد مشرق را سلامے از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغام شرق
ماہ تابے ریختم بر شام شرق
تاشناسائے خودم' خود بیں نیم
با تو گویم او کہ بود و من کیم
او ز افرنگی جواناں مثل برق
شعلہ من از دم پیران شرق
او چمن زادے' چمن پروردۂ
من دمیدم از زمین مردۂ
او چو بلبل در چمن "فردوس گوش"
من بصحرا چوں جرس گرم خروش
ہر دو دانائے ضمیر کائنات
ہر دو پیغام حیات اندر ممات
ہر دو خنجر صبح خند' آئینہ فام

او برہنہ، من ہنوز اندر نیام
ہر دو گوہر ارجمند و تاب دار
زادۂ دریائے ناپیدا کنار
او ز شوخی در تہ قلزم تپید
تا گریبان صدف را بر درید
من بہ آغوش صدف تابم ہنوز
در ضمیر بحر نایابم ہنوز

اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں گوئٹے کی عظمت کا اعتراف اقبال نے اپنی اس مختصر نظم میں کیا ہے جو "پیام مشرق" میں "جلال و گوئٹے" کے عنوان سے ہمیں بدیں صورت ملتی ہے:

نکتہ دان المنی را در ارم
صحبتے افتاد با پیر عجم
شاعرے کو ہمچو آں عالی جناب
نیست پیغمبر ولے دارد کتاب
خواند بر داناے اسرار قدیم
قصہ پیمان ابلیس و حکیم
گفت رومی اے سخن را جاں نگار
تو ملک صید استی و یزداں شکار
فکر تو در کنج دل خلوت گزید
ایں جہان کہنہ را باز آفرید
سوز و ساز جاں بہ پیکر دیدۂ
در صدف تعمیر گوہر دیدۂ
ہر کسے از رمز عشق آگاہ نیست
ہر کسے شایان ایں درگاہ نیست
"داند آن کو نیک بخت و محرم است

زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است"

(رومی)

اسی نظم کے ساتھ اقبال کے تحریر کردہ مندرجہ ذیل نوٹ کے ایک ایک لفظ سے گوئٹے کی ستائش کا ثبوت ملتا ہے:

"نکتہ دان المنی سے مراد گوئٹے ہے جس کا ڈراما 'فوسٹ' مشہور و معروف ہے۔ اس ڈرامے میں شاعر نے حکیم فوسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کے امکانی نشو و نما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمال فن خیال میں نہیں آ سکتا۔"

اقبال نے گوئٹے کی بعض نظموں کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ بڑے شاعر بالعموم دوسرے بڑے شاعروں کے کلام کا ترجمہ نہیں کرتے، استثنیٰ کی صورتیں علیحدہ ہیں۔ اصل کی فنی بلندی کو ترجمے میں قائم رکھنا دشوار ہوتا ہے۔ اقبال کو اس دشواری کا احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے "پیام مشرق" میں شامل نظم "جوئے آب" کے ساتھ یہ نوٹ لکھنا مناسب سمجھا:

"'جوئے آب' گوئٹے کی مشہور نظم موسوم بہ 'نغمہ محمدؐ' کا ایک نہایت آزاد ترجمہ ہے۔ اس نظم میں جو دیوان مغربی سے بہت پہلے لکھی گئی تھی، المانی شاعر نے زندگی کے اسلامی تخیل کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ اصل میں یہ ایک مجوزہ اسلامی ڈرامے کا جزو تھی، جس کی تکمیل اس سے نہ ہو سکی۔ اس ترجمے سے صرف گوئٹے کا نقطہ نگاہ دکھانا مقصود ہے۔"

'نغمہ محمدؐ' کا ایک بند یہ تھا:

See the rockborn stream!

Like the gleam

Of a star so bright!

Kindly spirits

High above the clouds,

Nourished him while youthful

In the copse between the cliffs,

Yound and fresh,

From the clouds he danceth

Down upon the marble rock ;

Then tow'rd heaven

Leaps exulting

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود
مانند کہکشاں بگریبان مرغزار
در خواب ناز بود بہ گہوارۂ سحاب
وا کرد چشم شوق بہ آغوش کوہسار
از سنگریزہ نغمہ کشاید خرام او
سیمائے او چو آئنہ بے رنگ و غبار
زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ میرود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ میرود

اقبال نے بعض ایسے موضوعات پر بھی نظمیں لکھی ہیں جن پر گوئٹے طبع آزمائی کر چکا تھا' مثلاً شاعر اور حور کے موضوع پر۔

بقول بی۔ اے۔ ڈار' اقبال اور گوئٹے دونوں کی نظموں میں فن کارانہ پیش کش' اسلوب کی عظمت اور قوت جدت کے پہلو نمایاں ہیں۔ دونوں شاعر ایک ہی جیسے احساسات رکھنے کی وجہ سے اپنے جذبات ایسے الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ جن میں مشابہت کے بہت سے آثار ملتے ہیں' مثلاً "فاؤسٹ" میں گوئٹے کہتا ہے :

Here stand I, ach, Philosophy

Behind me and Law and Medicine too,

And to my cost, Theology__

All these I have sweated through and through,

And now you see me a poor fool

As wise as when I entered school

اقبال "زبور عجم" میں کہتے ہیں :

دوستاں خرم کہ بر منزل رسید آوارۂ
من پریشاں جادہ ہاے علم و دانش کردہ طے!
چہ کنم چہ چارہ گیرم کہ زشاخ علم و دانش
نہ دمیدہ ہیچ خارے کہ بدل نشانم او را

ایک جیسے احساسات کے ساتھ ساتھ ایک جیسے روحانی تجربے کی نشان دہی فقیر سید وحید الدین اپنی نادر تصنیف "روزگار فقیر" (جلد اول) میں بالفاظ اقبال اس طرح کرتے ہیں :

"مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے متعلق ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ جب اس نے جرمن زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ پڑھا تو اس نے اپنے بعض دوستوں سے کہا کہ میں یہ کتاب پڑھتا ہوں تو میری روح میرے جسم میں کانپنے لگتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شاعر کو بھی ایک قسم کا الہام ہوتا ہے۔ اس لئے جب وہ کوئی الہامی کتاب پڑھتا ہے تو اپنی روح کو اس کی معنویت سے ہم آہنگ پاتا ہے اور اس کی طبیعت ایک خاص اہتزاز محسوس کرتی ہے۔ یہ چیز دوسرے لوگوں کو نصیب نہیں ہو سکتی۔"

میرا خیال ہے کہ گوئٹے کی شخصیت کا یہی وہ روشن پہلو ہے جس نے علامہ اقبال کو گوئٹے کا ہمیشہ کے لئے قدر دان اور مداح بنا دیا۔

حواشی

1- شیخ عطاء اللہ، مرتب "اقبال نامہ" (لاہور : شیخ محمد اشرف، 1951ء) 2 : 41 - 40

2- "بانگ درا" ("کلیات اقبال اردو")، 26 : 26

3- رفیع الدین ہاشمی، مرتب، "خطوط اقبال"، ص 180

4- "متعلقات خطبات اقبال" مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ (لاہور : اقبال اکادمی پاکستان، 1977ء) کے صفحہ 21 پر ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کے مضمون "علامہ اقبال کا جنوبی ہند کا سفر" میں یہ روئیداد اس طرح درج ہے : "..... وہاں ہمارے استقبال کے لئے سیٹھ اسماعیل کے صاحبزادے سیٹھ محمد موجود تھے جنہوں نے علامہ سے خط و کتابت کے

ذریعے پہلے طے کر لیا تھا..... ان کی اہلیہ جو پردہ کرتی تھیں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ جرمن خاتون تھیں۔ انہوں نے علامہ کے پاس گوئٹے کی مشہور تصنیف "فاؤسٹ" (جرمنی زبان میں) بھیجی کہ علامہ اس پر اپنا کوئی شعر بطو یادگار لکھ دیں۔ چنانچہ انہوں نے لکھا:

کلام و فلسفہ از لوح دل فرو شستم
ضمیر خویش کشادم بہ نشتر تحقیق

یہ شعر "زبور عجم" ("کلیات اقبال فارسی")' ص 506/114 سے ہے۔ نوٹ مدیر رسالہ "اقبال"۔

5- "مکتوبات اقبال" (لاہور: اقبال اکادمی' 1977)' ص 30

6- ایضاً' ص 32-34

(مجلّہ "اقبال" (لاہور)' جلد 8 شمارہ 40' اکتوبر 1981ء' ص 57-71)

مقبول حسین ہاشمی

اقبال اور گوئٹے

اقبال اور گوئٹے کے بعض حالات اور طبائع میں فاصلے، بُعد اور بعض دیگر جغرافیائی اختلافات کے باوجود کافی حد تک یگانگت اور مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں عظیم المرتبت شعرا نے قانون کا پیشہ اختیار کیا مگر دونوں نے اپنی بے پناہ فطری ذہانت و فطانت کے باوجود بھی قانونی موشگافیوں سے قطع نظر کر کے شعر و سخن سے لطف اٹھایا۔ دونوں شعرا نے طویل عمریں پائیں۔ علامہ اقبال مرحوم سن مسنون کو پہنچ کر دار فانی کو رخصت ہوئے اور گوئٹے تراسی سال کی عمر میں۔

مرتے وقت بھی دونوں مشاہیر اپنی عظمت اور بزرگی کا ثبوت دے گئے۔ اقبال نے اپنی موت سے چند منٹ پیشتر یہ بے نظیر قطعہ کہا تھا:

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد رروزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

اور گوئٹے کے متعلق مشہور ہے کہ موت سے چند لمحے پیشتر اس کے لبوں پر یہ آخری الفاظ جاری تھے۔ "کچھ اور روشنی۔"

انگلستان کے مشہور شاعر بائرن (Byron) کو دونوں مشاہیر شعرا نے سراہا ہے۔ اقبال

انگلستان کے تمام شعرا میں سے صرف لارڈ بائرن کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ ان کا تذکرہ موصوف کی کتاب "پیام مشرق" میں ہے۔ اقبال کے ان سے متاثر ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں انقلابی روح کار فرما ہے اور وہ خود بھی ہندی مسلمانوں میں انقلابی روح پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اسی طرح گوئٹے نے بھی بائرن کے بارے میں ایک نظم لکھی تھی۔

ایک اور بات جو ان عظیم المرتبت شعرا میں یکساں ملتی ہے' وہ یہ ہے کہ ان دونوں نے اپنے بہترین شاہکار و نغمات کلام الٰہی سے اخذ کئے۔ اقبال نے فرقان حمید سے بہت فائدہ اٹھایا اور قرآنی قصص انکار ابلیس و اغوائے آدم کو زبان شعر میں ادا کیا۔ گوئٹے انجیل مقدس سے بہت حد تک فیض یاب ہوا ہے۔ چنانچہ اس کا بہترین شاہکار ڈرامہ "فاؤسٹ" جس میں اس نے اپنا کمال فن دکھایا ہے' کلام الٰہی کا مرہون منت ہے۔

ان دونوں مشاہیر نے اپنے اپنے قدما سے کامل فائدہ حاصل کیا ہے۔ اگر اقبال نے حافظ و سعدی اور مرشد رومی سے فیض حاصل کیا ہے تو گوئٹے نے شیکسپئر' ہومر وغیرہ سے بصیرت حاصل کی۔ اقبال نے مولانا روم کے احسانات کے متعلق اپنے کلام میں بار ہا اشارہ کیا:

(الف) بیا کہ من ز خم پیر روم آوردم
مئے سخن کہ جواں تر ز بادہ عنبی است

(ب) مطرب غزلے بیتے از مرشد روم آور
تا غوطہ زند جانم در آتش بہ تبریزے

غزلیہ کلام میں اقبال نے سعدی اور حافظ سے بہت فائدہ اٹھایا ہے:

تنم گلے ز خیاباں جنت کشمیر
دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است

ادھر گوئٹے نے انگلستان کے مایہ ناز شاعر شیکسپئر کے افکار سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ چنانچہ وہ شیکسپئر کی عظمت کے سامنے سرنگوں ہوتے ہوئے لکھتا ہے:

"شیکسپئر کی عظمت کو جرمنوں نے دوسری اقوام عالم سے زیادہ تسلیم کیا ہے' بلکہ اس کی اپنی قوم سے بھی زیادہ ہم لوگوں نے اس کے معاملہ میں اتنا انصاف کیا ہے کہ ہم نے خود اپنے ساتھ نہیں کیا۔ مشاہیر نے اسے بہترین صورت میں پیش

کرنے کی کوشش کی ہے اور خود میں نے ہمیشہ اس کی پرزور تائید کی ہے۔ میں نے اس کے ان تاثرات کو بوضاحت بیان کیا ہے' جو مجھ پر پڑے ہیں اور اس کی تصنیفات پر کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے' جو پسند عام ہو گئی ہیں۔"

ان دونوں مفکرین نے اپنی تعلیمات میں عملی زندگی کی تلقین کی ہے۔ اقبال نے تو ہمیں صاف صاف کہہ دیا ہے:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

"پیام مشرق" میں "جہان عمل" کے تحت وہ لکھتے ہیں:

ہست ایں میکدہ و دعوت عام است اینجا
قسمت بادہ بہ اندازۂ جام است اینجا

اے کہ تو پاس غلط کردۂ خود می داری
آنچہ پیش تو سکون است خرام است اینجا

ما کہ اندر طلب از خانہ بروں تاختہ ایم
علم را جاں بدمیدیم و عمل ساختہ ایم

گوئٹے رقم طراز ہے کہ آدمی غور سے اور فکر سے ہی اپنے آپ کو پہچان نہیں سکتا' بلکہ خود شناسی "عمل" سے خود بخود آ جاتی ہے۔

اقبال نے گوئٹے کے ساتھ اپنا موازنہ کیا ہے' جسے پیش کرنا خالی از لطف نہ ہو گا:

پیر مغرب شاعر المانوی
آں قتیل شیوہ ہائے پہلوی
بست نقش شاہدان شوخ و شنگ
داد مشرق را سلامے از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغام شرق
ماہ تابے ریختم بر شام شرق
تاشناسائے خودم' خود بیں نیم
با تو گویم او کہ بود و من کیم

او ز افرنگی جواناں مثل برق
شعلہ من از دم پیران شرق
او چمن زادے، چمن پروردۂ
من دمیدم از زمین مردۂ
او چو بلبل در چمن "فردوس گوش"
من بصحرا چوں جرس گرم خروش
ہر دو دانائے ضمیر کائنات
ہر دو پیغام حیات اندر ممات
ہر دو خنجر صبح خند، آئینہ فام
او برہنہ، من ہنوز اندر نیام
ہر دو گوہر ارجمند و تاب دار
زادۂ دریائے ناپیدا کنار
او ز شوخی در تہ قلزم تپید
تا گریبان صدف را بر درید
من بہ آغوش صدف تابم ہنوز
در ضمیر بحر نایابم ہنوز

اقبال نے "پیام مشرق" میں گوئٹے کے کلام کو بہت زیادہ سراہا ہے اور اس کا نام نہایت عقیدت اور احترام کے ساتھ لیا ہے۔ وہ گوئٹے کے افکار سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور اس کی بعض نظموں کا ترجمہ اپنے کلام میں شامل کر لیا ہے۔ اس کے بہترین ادبی شاہکار ڈرامہ "فاؤسٹ" کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس ڈرامے میں شاعر نے حکیم فاؤسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کی امکانی نشو و نما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمال فن خیال میں نہیں آ سکتا۔"

دونوں شاعر "ادب برائے ادب" کے سخت مخالف اور "ادب برائے زندگی" کے حامی تھے۔ اقبال کی شاعری کا ایک نصب العین تھا اور وہ خودی کی مشعل جلا کر زندگی کی تیرہ و تار

راہوں میں ہماری رہبری کر گئے ہیں۔ وہ حیات انسانی کی دکھتی رگوں سے بخوبی واقف تھے اور ہماری زندگیوں میں ایک انقلاب عظیم لانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان شعرا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو صرف شعر برائے شعر کہتے ہیں' انہوں نے کیا خوب کہا ہے :

ز من گو شاعر رنگیں بیاں را
چہ سود از سوز اگر چوں لالہ سوزی

نہ خود را می گدازی ز آتش خویش
نہ شامے دردمندے برفروزی

گوئٹے کے افکار بھی اس مسئلہ پر بہت حد تک اقبال کے تخیلات سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

وہ لکھتا ہے :

"جو شخص کسی نصب العین کو مدنظر رکھ کر کوشش کرتا ہے' اس کی محنت بار آور ثابت ہوتی ہے۔ لیکن جو شخص ادب کے خیال سے سعی کرتا ہے اگر فن کے لحاظ سے اس کا کام معیار پر نہ اترے' تو وہ اپنے کام میں بالکل ناکامیاب رہتا ہے۔"

اپنے علم و فضل اور بزرگی کے ساتھ ساتھ گوئٹے بہت زیادہ متعصب ثابت ہوا ہے۔ دراصل جرمن قوم ہمیشہ سے متعصب چلی آ رہی ہے اور وہ کبھی بھی نسلی اور مذہبی تعصبات سے بالا تر نہیں جا سکتی۔ اسی تعصب اور تنگ نظری کے باعث دنیا کو کئی بار جنگ کے شعلوں میں دھکیل چکی ہے اور دنیا کے امن کو بارہا تہہ و بالا کر چکی ہے۔ گوئٹے بھی ان قومی خصوصیات سے بچ نہیں سکا۔ افسوس کہ جرمن قوم کا یہ مایہ ناز شاعر بھی اپنی فطری ذہانت کے باوجود تعصبات سے بالا تر نہ سوچ سکا۔

چنانچہ وہ لکھتا ہے :

"مسلمانوں کی طرف سے کافروں کی توہین اور ہماری قوم کے غلاموں کے ساتھ ان کا ناروا سلوک اس قابل ہے کہ ہم ان سے نفرت کریں اور انہیں تختہ دار پر لٹکائیں۔"

ذرا ملاحظہ ہو اس مفکر عظیم کا قومی تعصب اور تنگ نظری جس کے افکار پر مغربی دنیا اتنی نازاں ہے۔

اسی طرح وہ زندگی کے ہر شعبہ، کیا علم و ادب اور کیا دیگر اصناف فنون لطیفہ سب کے بارے میں متعصب اور تنگ نظر دکھائی دیتا ہے۔

ایک جگہ وہ لکھتا ہے:

"کاش کہ ادب عالیہ کی بنیادیں یونانی اور رومن لٹریچر کی سطح پر ہی رکھی جائیں۔ چینی، ہندی اور قدیم مصری ادبیات بجز استعجاب انگیز ہونے کے کچھ نہیں۔ دنیا کو ان سے روشناس کرنا قابل قدر ہے، لیکن ان سے ہمارے اخلاقی نظم اور فنون لطیفہ کی ثقافت کو کوئی مدد نہیں مل سکتی۔"

گوئٹے کے ان فرسودہ خیالات کے برعکس اقبال "پیام مشرق" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایک ایسی کوشش جس کا مقصد افراد اور اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالا تر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو، قابل احترام ہے۔"

بقول حافظ شیرازیؒ:

به بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

با ایں ہمہ متعصب ناقدین اپنی چشم بصیرت پر تعصب کی پٹیاں باندھ کر بڑے جوش سے لکھتے ہیں کہ اقبال کی شاعری صرف فرقہ وارانہ اور متعصب ہے۔

حالانکہ شاعر نے خود "پیام مشرق" میں کہا ہے کہ:

من اول آدم بے رنگ و بویم
ازاں پس ہندی و تورانیم من

صرف اسی میدان میں ان دونوں مفکرین میں اتنا اختلاف نظر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مسائل کے متعلق ان کے تخیلات میں کافی حد تک ہم آہنگی اور مماثلت پائی جاتی ہے اور ان کے افکار کافی حد تک ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

(اقبال شناسی اور مجلہ ساہی وال، مرتب ڈاکٹر سعادت سعید، لاہور: بزم اقبال، 1989ء، ص 147-141)

محمد حیات خاں سیال

اقبال اور گوئٹے

صبا بہ گلشن ویمر سلام ما برساں
کہ چشم نکتہ وراں خاک آں دیار افروخت

اقبال ایسے دور میں پیدا ہوئے جب اسلامی دنیا اپنی سیاست کھو بیٹھی تھی۔ اسلامی تہذیب و تمدن زندہ قوت نہ رہے تھے۔ ان کی پیدائش سے صرف بیس سال پہلے مغلیہ سلطنت کا ستارہ غروب ہو چکا تھا۔ دوسرے ممالک میں بھی یورپی طاقتیں مسلمانوں کو مغلوب کرنے میں کامیاب ہو چکی تھیں۔ ان نئی طاقتوں کی اہمیت کس بات میں پوشیدہ ہے؟ ہمارے زوال کے اسباب کیا ہیں؟ کیا ہم اپنا کھویا ہوا وقار بحال کر سکتے ہیں؟

1857ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد مسلمان مفکرین نے ان سوالات پر غور و فکر کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک طرف مذہبی دبستان تھا' جو مذہب کا مکمل احیا چاہتا تھا۔ دوسری طرف ترقی پسند دبستان' جو چاہتا تھا کہ ہماری زندگی اور افکار طرز مغرب میں ڈھل جائیں۔ اس دبستان کے رہنما سرسید احمد خان تھے۔ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ دونوں دبستان سچائی پر تھے' کیونکہ بحیثیت مسلمان ہی وہ اپنا کھویا ہوا وقار بحال کر سکتے تھے۔

علامہ اقبال نے ان حالات کا جائزہ لیا اور محسوس کیا کہ یہ بوجھ ان پر آن پڑا ہے کہ وہ اسلام کی مدافعت بھی کریں اور نئے تقاضوں کے مطابق تشریح بھی۔ چنانچہ انہوں نے مشرقی اور مغربی مفکرین کا گہرا مطالعہ کیا اور ان سے اثرات بھی قبول کئے۔ ایسے مفکرین میں رومی'

حافظ، نطشے، برگساں، ہیگل، شٹے اور گوئٹے کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مغربی مفکرین میں اقبال جرمن مفکر، شاعراور ڈرامہ نگار گوئٹے کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں۔ احترام کا لفظ اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ اقبال نے ارسطو، حافظ، نطشے وغیرہ کے بارے میں کہیں کہیں سخت لہجہ بھی استعمال کیا ہے، لیکن گوئٹے کا ذکر جہاں بھی آیا ہے اقبال نے ہمیشہ اچھے الفاظ میں یاد کیا ہے۔

گوئٹے سے اقبال کی شناسائی کا سراغ 1901ء کی ایک نظم "مرزا غالب" سے ملتا ہے جس میں غالب کو بلند خیالی میں گوئٹے کا ہم پلہ قرار دیا تھا:

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لب اعجاز پر
محو حیرت ہے ثریا رفعت پرواز پر
شاہد مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچہ دلی گل شیراز پر
آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لیکن قیام یورپ (1905ء-1908ء) کے زمانہ میں جرمن زبان سیکھنے کے بعد علامہ اقبال کو براہ راست گوئٹے کے مطالعے کا موقع ملا، تو وہ اس کے حسن آفریں تخیل اور فکری توازن سے بے حد متاثر ہوئے اور یہ تاثر دیر تک قائم رہا۔

"پیام مشرق" کی اشاعت (1923ء) سے تیرہ برس پہلے گوئٹے سے ان کے ذہنی روابط کا ثبوت ہمیں اس بیاض (Stray Reflections) سے ملتا ہے، جہاں آٹھ نو شذرات میں گوئٹے کا ذکر آیا اور ہر جگہ اقبال نے والہانہ انداز میں گوئٹے کی عظمت فکر و فن کو خراج تحسین ادا کیا۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (مترجم "شذرات فکر اقبال") لکھتے ہیں کہ "گوئٹے سے اقبال کی اس دلی عقیدت کا ایک خاص سبب اس کی مشرقیت اور اسلامیت ہے۔ گوئٹے نہ صرف حافظ کے رنگ تغزل کے شیدائی اور رومی کے عرفان و بصیرت کا دلدادہ تھا، بلکہ ذات رسالت مآبؐ کا رتبہ شناس بھی تھا۔ گوئٹے کی مشہور نظم "نغمہ محمدؐ" جس کا آزاد منظوم ترجمہ اقبال نے "پیام مشرق" میں "جوئے آب" کے عنوان سے کیا ہے، دنیائے ادب کا حسین ترین شاہکار

ہے۔"

گوئٹے کے متعلق بیاض میں درج چند شذرات ملاحظہ فرمایئے:

1- "جب کسی عظیم ذہن سے ہمارا رابطہ قائم ہوتا ہے تو ہماری روح اپنا اکتشاف کر لیتی ہے۔ گوئٹے کے تخیل کی بے کرانی سے آشنا ہونے کے بعد مجھ پر اپنے تخیل کی تنگ دامنی منکشف ہو گئی۔"

2- "میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے ہیگل، گوئٹے، غالب، بیدل اور ورڈز ورتھ سے بہت کچھ استفادہ کیا۔ ہیگل اور گوئٹے نے اشیا کی باطنی حقیقت تک پہنچنے میں میری رہنمائی کی۔ بیدل اور غالب نے یہ سکھایا کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمو لینے کے باوجود اپنے اظہار میں مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھوں اور ورڈز ورتھ نے طالب علمی کے زمانے میں مجھے دہریت سے بچا لیا۔"

3- "گوئٹے نے معمولی قصے کو لیا اور اس میں صرف انیسویں صدی ہی نہیں بلکہ نسل انسانی کے تمام تجربات سمو دیئے۔ ایک معمولی قصے کو انسان کے اعلیٰ ترین نصب العین کے ایک منظم و مربوط اظہار میں ڈھال دینا الہامی کارنامے سے کم نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے بے ہنگم ہیولیٰ سے ایک حسین کائنات تخلیق کر دی جائے۔"

4- "فطرت قطعی طور پر فیصلہ نہ کر سکی کہ افلاطون کو شاعر بنائے یا فلسفی۔ معلوم ہوتا ہے کہ گوئٹے کے بارے میں بھی وہ اسی قسم کے تذبذب میں مبتلا رہی ہو گی۔"

5- "آگر آپ انسانی دماغ کی تشریح و تجزیہ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو آپ ونٹ، وارڈ، جیمز یا شاوٹ سے رجوع کیجئے، لیکن انسانی فطرت کے بارے میں حقیقی بصیرت آپ کو صرف گوئٹے سے حاصل ہو سکتی ہے۔"

6- "گوئٹے کا فاوسٹ محض برائے نام فرد ہے۔ درحقیقت وہ انسانیت کی تجسیم ہے۔"

گوئٹے اور اقبال کی زندگی اور افکار کی یگانگت اور مماثلت کی مثالیں تلاش کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گوئٹے کا مختصر تعارف کرا دیا جائے۔ یہ جرمن شاعر، ڈرامہ

نگار' ناول نویس اور سائنس دان جان ولف گانگ وون گوئٹے 28 اگست 1749ء میں فرینکفرٹ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اپنے خشک مزاج قانون دان باپ کیپر گوئٹے سے حاصل کی۔ لاطینی' یونانی' انگریزی' عبرانی' فرانسیسی اور اطالوی زبان سیکھنے کے بعد سولہ سال کی عمر میں قانون کی تعلیم کے لئے لیپزگ گیا' جہاں اس کا زیادہ تر وقت رنگ رلیوں میں گذرا' مگر وہیں اسے فنون لطیفہ' ادب و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ ایک دفعہ بیمار ہوا اور اسی دوران میں اس کا رجحان مذہب اور اخلاقیات کی طرف ہو گیا۔ قانون کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد سائنس سے وابستگی پیدا کی۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کامطالعہ کیا اور ہرڈر کی تنقیدی تصانیف سے متاثر ہوا۔ روسو اور اسپینوزا کے اثرات بھی قبول کئے۔ گوئٹے کے تاریخی ڈرامے "گوتس" اور ناول "ورتھر کی داستان غم" کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔

مؤخرالذکر کتاب میں عشق کی ناکامی کے تجربے کو شدت اظہار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کادنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کی اشاعت کے بعد گوئٹے کو جرمنوں کی رومانی بغاوت کاعلمبردار تسلیم کیا جانے لگا۔

1775ء میں ڈیوک کارل اگسٹ نے گوئٹے کو اپنی ریاست ویمر میں آنے کی دعوت دی اور اسے زراعت' معدنیات' طبقات الارض کا وزیر بنا دیا گیا۔ 1786ء میں اٹلی چلا گیا۔ آخری عمر میں ڈرامہ اسٹیج کراتا رہا۔ گوئٹے کا شاہکار "فاؤسٹ" ہے' جس نے اسے ہومر' دانتے اور شیکسپیئر کا ہم پلہ بنا دیا۔ "فاؤسٹ" کا پہلا حصہ 1806ء میں شائع ہوا۔ دوسرا حصہ وفات سے کچھ عرصہ پہلے مکمل کیا۔ 1771ء میں اپنی خود نوشت سوانح عمری "شاعری اور سچائی" لکھنی شروع کی۔ 1819ء میں "دیوان مغرب" شائع کیا' جس پر فارسی شاعری اور حافظ کی غزل کا گہرا اثر ہے۔ کل تصانیف 140 جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ 23 مارچ 1832ء میں انتقال کیا۔

اقبال اور گوئٹے کے بعض حالات و طبائع میں بہت حد تک یگانگت و مماثلت ہے۔ ان دونوں عظیم مفکرین اور بلند پایہ شعرا نے قانون کو بطور پیشہ اختیار کیا اور دونوں نے قانونی موشگافیوں سے قطع نظر کر کے شعر و شاعری میں زندگی بسر کی۔ دونوں تلامیذ الرحمان نے خواجہ حافظ شیرازی کے کیف آور سرمدی نغموں سے لطف اٹھا کر اپنی روحوں کو بالیدگی بخشی۔ دونوں نے طویل عمر پائی اور اپنی عظمت کا ثبوت بہم پہنچا کر رخصت ہوئے۔ گوئٹے نے

آخری وقت کہا تھا "کچھ اور روشنی" اور علامہ اقبال نے یہ قطعہ کہا تھا۔

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

دونوں نے بائرن، شیکسپیئر اور حافظ کے تخیلات کو سراہا ہے۔ دونوں نے اپنے بہترین شاہکار کلام الٰہی سے اخذ کئے۔ علامہ اقبال نے قرآن سے استفادہ کیا اور گوئٹے بہت حد تک انجیل مقدس سے فیضیاب ہوا۔ ڈرامہ "فاؤسٹ" کلام الٰہی کا مرہون منت ہے۔ دونوں نے قدما سے استفادہ کیا اور اس کا صاف صاف اعتراف کیا۔

اقبال اور گوئٹے دونوں کے افکار و تعلیمات میں بہت حد تک ہم آہنگی پائی جاتی ہے مثلاً فن کے بارے میں گوئٹے کا نظریہ تھا کہ اس کی کسوٹی خواص اور ارباب ذوق کا حسن قبول ہے۔ عوام کی پسند اور ناپسند بے معنی ہے۔ شاعر اور فن کار کو نفع و نقصان سے بالا تر رہ کر فن کی بے لوث خدمت کرنی چاہئے۔ وہ "فاؤسٹ" میں ایک جگہ شاعر سے کہلواتا ہے۔

"جاؤ ہٹو اور اپنے لئے کوئی دوسرا غلام تلاش کرو۔"

گوئٹے کے نزدیک شاعری کا نصب العین یہ ہے کہ وہ انسانی معاشرت اور اس کے افراد کی زندگی میں ہم آہنگی اور سازگاری پیدا کرے۔ وہ "ادب برائے ادب" کا قائل نہ تھا۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے "جو شخص کسی نصب العین کو مدنظر رکھ کر کوشش کرتا ہے، اس کی محنت بار آور ہوتی ہے۔ لیکن جو شخص ادب کے خیال سے سعی کرتا ہے، وہ اپنے کام میں بالکل ناکامیاب رہتا ہے۔"

علامہ اقبال بھی فن کی افادیت کے قائل ہیں ؎

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
گر ہنر میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نائے میرود

گوئٹے کو اپنے علمی کارناموں پر ناز تھا اور شاعری کے بارے میں کہا تھا۔ "جو کچھ میں نے بحیثیت ایک شاعر حاصل کیا' میں اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا۔"

علامہ اقبال بھی شاعری کے متعلق اسی قسم کا نظریہ رکھتے ہیں ۔

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

گوئٹے کے نزدیک "عمل ہی زندگی کی نہ بدلنے والی اٹل حقیقت ہے اور حقیقی عمل وہ ہے جو بے حاصل نہ ہو۔" گوئٹے مسلسل اور پیہم جدوجہد کا قائل ہے' اس لئے کہ سکون اور تعطل موت کے مترادف ہیں۔ ذوق عمل میں انسانی ترقی کا راز مضمر ہے۔ فاوسٹ ایک جگہ کہتا ہے۔ "اگر میں کسی گریزاں لمحہ سے یہ کہوں ذرا ٹھہرا رہ' تو کتنا حسین ہے' تو وہ میری موت کی گھڑی ہونی چاہئے۔"

اقبال بھی عمل پر زور دیتے ہیں ۔:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

یقین محکم' عمل پیہم' محبت فاتح عالم

ان کے نزدیک جمود موت اور حرکت زندگی کا نام ہے :

حیات جاوداں اندر ستیز است

روح امم کی حیات کشمکش انقلاب

گوئٹے عمل پیہم اور مسلسل طلب کا قائل ہے مگر شرط یہ ہے کہ عمل صالح ہو اور طلب برحق۔ وہ خواہشات نفسانی کے لئے عمل اور طلب کو مذموم قرار دیتا ہے اور نیکی اور صداقت کی راہ میں لامتناہی جستجو اور جدوجہد کو حقیقی زندگی کا لازمہ سمجھتا ہے۔

گوئٹے کا تمام فلسفہ دو بنیادی تصورات پر قائم ہے' یعنی ترک اور عمل بے غرض۔ اس سلسلے میں وہ تصوف سے ضرور متاثر ہوا ہے' خواہ وہ یورپ کے صوفیا کی تعلیمات ہوں' خواہ حافظ شیرازی کا تصوف یا ویدانت کا فلسفہ اس کے نزدیک حیات انسانی کا کمال عشق ہے۔ انسانی کمال ایثار اور خواہشات نفسانی کے ترک پر منحصر ہے۔ اس سے عمل صالح اور نیکی کی

راہ میں کوشش کا ترک لازم نہیں آتا۔

گوئٹے بقائے روح کا قائل ہے اور عالم ارواح میں نہ صرف انسانی زندگی کے تسلسل پر یقین رکھتا ہے' بلکہ ارواح طیبہ اور ارواح خبیثہ دونوں کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ اس کائنات آب و گل کو راہ سفر میں زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کا نشیمن نہ یہ خاکداں ہے نہ یہ افلاک۔ اس کی منزل مقصود وہ ایک لامحدود فضائے روحی و معنوی کا متلاشی ہے۔ اقبال بھی انسان کو طاہر لاہوتی کہتا ہے:

جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

اقبال گوئٹے کی دو تصنیفات "دیوان مغرب" اور "فاؤسٹ" سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ "دیوان مغرب" میں مشرقیت اور اسلامیت ہے۔ چنانچہ اقبال نے 1923ء میں اس کے جواب میں "پیام مشرق" لکھی۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"پیام مشرق کی تصنیف کا محرک جرمن "حکیم حیات" گوئٹے کا مغربی دیوان ہے' جس کی نسبت جرمنی کا اسرائیلی شاعر ہائنا لکھتا ہے۔ "یہ ایک گلدستہ عقیدت ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے ..... اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے سے حرارت کا متلاشی ہے .....

1812ء میں فان ہمر نے خواجہ حافظ کے دیوان کا پورا ترجمہ شائع کیا اور اسی ترجمے کی اشاعت سے جرمن ادبیات میں مشرقی تحریک کا آغاز ہوا۔ گوئٹے کی عمر اس وقت 65 سال کی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جرمن قوم کا انحطاط ہر پہلو سے انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ ملک کی سیاسی تحریکوں میں عملی حصہ لینے کے لئے گوئٹے کی فطرت موزوں نہ تھی اور یورپ کی عام ہنگامہ آرائیوں سے بیزار ہو کر اس کی بے تاب اور بلند پرواز روح نے مشرقی فضا کے امن و سکون میں اپنے لئے ایک نشیمن تلاش کر لیا۔ حافظ کے ترنم نے اس کے تخیلات میں ایک ہیجان عظیم برپا کر دیا .....

بعض بعض جگہ اس کی نظم خواجہ کے اشعار کا آزاد ترجمہ معلوم ہوتی ہے اور بعض جگہ اس کی قوت تخیل کسی خاص مصرع کے اثر سے ایک نئی شاہراہ پر پڑ کر زندگی کے نہایت دقیق اور گہرے مسائل پر روشنی ڈالی ہے .....

خواجہ حافظ کے علاوہ گوئٹے اپنے تخیلات میں شیخ عطار' سعدی' فردوسی اور عام اسلامی لٹریچر کا بھی ممنون احسان ہے ..... اپنی زبان میں فارسی استعارات بھی ..... بے تکلف استعمال کرتا ہے ..... غرض کہ "مغربی دیوان" کی وساطت سے گوئٹے نے جرمن ادبیات میں عجمی روح پیدا کرنے کی کوشش کی۔"

"پیام مشرق" کے بارے میں علامہ اقبال رقم طراز ہیں۔ "پیام مشرق" کے متعلق جو "مغربی دیوان" سے سو سال بعد لکھا گیا ہے' مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ..... اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی' مذہبی اور ملی حقائق کو پیش نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ اس سے سو سال پیشتر کی جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے۔"

پیام مشرق کی نظم "حور و شاعر" کے جواب میں لکھی گئی۔ گوئٹے کا دوسرا شاہکار "فاؤسٹ" ہے جس سے اقبال متاثر ہوئے۔ نظم "جلال اور گوئٹے" سے متعلق ایک نوٹ میں ہے۔

> "نکتہ دان المنی سے مراد گوئٹے ہے۔ جس کا ڈرامہ "فوسٹ" مشہور و معروف ہے۔ اس ڈرامے میں شاعر نے حکیم فوسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کے امکانی نشو و نما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمال فن خیال میں نہیں آ سکتا۔"

گوئٹے کی قدر شناسی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ اقبال نے اپنے مرشد رومی اور گوئٹے کو یکجا جنت میں ہمکلام کر دیا اور رومی کی زبان سے گوئٹے کو "رمز شناس عشق" ہونے کی سند عطا کی:

نکتہ دان المنی را در ارم
صحبتے افتاد با پیر عجم
شاعرے کو ہمچو آں عالی جناب

نیست پیغمبر ولے دارد کتاب
خواند بر دانائے اسرار قدیم
قصہ پیمان ابلیس و حکیم
گفت رومی اے سخن را جاں نگار
تو ملک صید استی و یزداں شکار
فکر تو در کنج دل خلوت گزید
ایں جہان کہنہ را باز آفرید

خلیفہ عبدالحکیم "فکر اقبال" میں لکھتے ہیں:

"مشرق و مغرب میں بعض اکابر، صوفیا، حکما اور شعرا نے ابلیس کو المیہ کا ایک زبردست کردار بنا دیا۔ ملٹن کے "فردوس گم گشتہ" کی دینی نظم میں شیطان ایک زبردست کریکٹر ہے اور اس کی تشکیل میں ملٹن نے اپنی قوت تخیل کو پورے زوروں کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ گوئٹے کے حکیمانہ ڈرامے "فاؤسٹ" میں زندگی کے گہرے اسرار اور اس کی باطنی قوتوں کی گرہ کشائی کی کوشش کی گئی ہے لیکن اس ڈرامے کا محور بھی فاؤسٹ کے علاوہ ابلیس ہی ہے۔ اقبال جو ملٹن اور گوئٹے کا ہم پایہ اور روحانی بصیرت والا مفکر شاعر ہے، اس نے بھی ابلیس کی حقیقت کو کئی جگہ بیان کر کے اس تصور کو ایک نئے رنگ میں پیش کیا ہے۔ اقبال کے ہاں ابلیس کا تصور اس کے فلسفہ خودی کا ایک جزو لاینفک ہے۔ خودی کی ماہیت میں ذات الٰہی سے فراق اور سعی قرب و وصل دونوں داخل ہیں۔ اقبال کے فلسفہ خودی کی جان اس کا نظریہ عشق ہے اور عشق کی ماہیت آرزو، جستجو اور اضطراب ہے۔"

گوئٹے کے نزدیک یہ کائنات کسی اعلیٰ مقصد کے لئے تخلیق کی گئی ہے اور زندگی فرد کی امکانی نشو و نما کی ایک شکل ہے۔ "فاؤسٹ" میں یہی مسئلہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ذریعے گوئٹے اپنے معاصرین اور آئندہ نسلوں کو امید کا نیا پیغام دینا چاہتا تھا۔ اقبال کا تصور ابلیس بھی بہت کچھ اس سے مماثلت رکھتا ہے۔

گوئٹے کا میفسٹو (Mephisto) اور اقبال کا ابلیس آدم کے سامنے عمل پیہم کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ابلیس کی ملاقات سے پہلے حضرت آدمؑ کی زندگی بالکل بے عملی اور جمود کی

زندگی تھی۔ ابلیس ایک نئی دنیا کا ویژن دیتا ہے اور اس سے دلکش زندگی کا وعدہ کرتا ہے۔ نصیحت کرتا ہے کہ آنکھیں کھول اور مشاہدہ کر۔ بقا کا راز لامتناہی جدوجہد میں ہے۔ سکون و جمود موت کے مترادف ہیں:

زندگی سوز و ساز بہ ز سکون دوام
فاختہ شاہیں شود از تپش زیر دام
ہیچ نیاید ز تو غیر سجود نیاز
خیز چو سرو بلند اے بہ عمل ست گام
خیز کہ بنمائت مملکت تازہ
چشم جہاں بیں کشا بہر تماشا خرام
بازوئے شاہیں کشا خون تدروان بریز
مرگ بود باز را زیستن اندر کنام
تو نہ شناسی ہنوز شوق بہ میرد ز وصل
چیست حیات دوام سوختن ناتمام

(پیام مشرق)

"فاؤسٹ" میں بھی تقریباً ایسے ہی خیالات کا اظہار ملتا ہے۔ گوئٹے کے نزدیک ابلیس اس طاقت کا حصہ ہے' جو زندگی کی خوشیوں کو افشا کرتی ہے۔ اس کا مقصد اولیٰ انسان کے دل میں زندگی سے محبت اور تخلیقی فعالیت پیدا کرنا ہے:

تو بہ بدن جاں دہی شور بجاں من دہم
تو بہ سکون رہ زنی من بہ تپش رہ برم

وہ خالق کا ہم پلہ بننا چاہتا ہے۔ اقبال بھی کہتا ہے کہ ابلیس کے بغیر زندگی صحیح معنوں میں زندگی نہیں۔ وہ ایسی دنیا میں رہنا چاہتا ہے' جہاں یزدان و شیطان دونوں ہوں:

مزی اندر جہان کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

"فاؤسٹ" میں دراصل خیر و شر کا مسئلہ پیش کیا گیا ہے۔ فاؤسٹ کے ساتھ ابلیس بھی ہے۔ اگرچہ دونوں میں تضاد ہے لیکن دونوں ایک اکائی کا لازمی جزو ہیں۔ "پیام مشرق" میں

اقبال لکھتے ہیں :

چہ گویم نکتہ زشت و نکو چیست
زباں لرزد کہ معنی پیچ دار است
بروں از شاخ بنی خار و گل را
درون او نہ گل پیدا نہ خاراست

آدم اور شیطان دونوں کا اکٹھا رہنا ضروری ہے۔ اگر ان کی دوستی ختم ہو جائے تو "خیر" کا خاتمہ ہو جائے۔ فاؤسٹ ابلیس سے ملاقات کے بعد زندگی کی اعلیٰ صفات پیدا کرنے میں کامیاب ہوا' گویا قصہ آدم کو رنگیں کرنے والا ابلیس ہی ہے۔ ایک دفعہ رسول کریم صلعم نے فرمایا تھا کہ "ہر شخص کے ساتھ اس کا ایک شیطان بھی ہے۔" کسی نے پوچھا "کیا آپ کے ساتھ بھی ہے؟" آپؐ نے فرمایا۔ "ہاں۔ مگر میں نے اسے مسلمان کر لیا ہے۔" اقبال "جاوید نامہ" میں کہتے ہیں :

کشتن ابلیس کارے مشکل است
زانکہ او گم اندر اعماق دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتہ شمشیر قرآنش کنی
کور رابینندہ از دیدار کن
بو لہب را حیدر کرار کن

میفسٹو نے کوشش پیہم سے زندگی کے خاکے میں رنگ بھرا اور پھر اس کی زندگی بنی نوع انسان کی خدمت میں بسر ہوئی۔ اگر جہد مسلسل سے کام لیا جائے تو جرم اور گناہ بھی معاف ہو سکتے ہیں۔ اعلیٰ تخلیقی فعالیت اور عمل گناہ کو بھی مٹا دیں گے :

گر از دست تو کار نادر آید
گناہے ہم اگر باشد ثواب است

لیکن شر خیر میں کیونکر بدل سکتا ہے۔ اقبال اور گوئٹے دونوں کا نظریہ ہے کہ ایسا ممکن ہے اور محبت یا "عشق" سے ایسا معجزہ ممکن ہے۔ اقبال کے ہاں یہ محبت یا عشق صرف وہی نہیں' جو ایک مرد صنف نازک کے لئے رکھتا ہے بلکہ اس میں بے پناہ وسعت ہے :

به برگ لالہ رنگ آمیزی عشق
بجان ما بلا انگیزی عشق
اگر زیں خاکداں را واشگافی
درونش بنگری خونریزی عشق

اقبال عشق کو زندگی کی جان قرار دیتا ہے:

عشق کے مضراب سے نغمہ تار حیات
عشق سے نور حیات عشق سے نار حیات

اقبال نے گوئٹے کے ساتھ اپنا موازنہ کیا ہے۔ مناسب ہو گا کہ یہاں وہ اشعار درج کئے جائیں:

پیر مغرب شاعر المانوی
آں قتیل شیوہ ہائے پہلوی
بست نقش شاہدان شوخ و شنگ
داد مشرق را سلامے از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغام شرق
ماہ تابے ریختم بر شام شرق
تاشناسائے خودم، خود بیں نیم
با تو گویم او کہ بود و من کیم
او ز افرنگی جواناں مثل برق
شعلہ من از دم پیران شرق
او چمن زادے، چمن پروردۂ
من دمیدم از زمین مردۂ
او چو بلبل در چمن "فردوس گوش"
من بصحرا چوں جرس گرم خروش
ہر دو دانائے ضمیر کائنات
ہر دو پیغام حیات اندر ممات

ہر دو خنجر صبح خند، آئینہ فام
او برہنہ، من ہنوز اندر نیام
ہر دو گوہر ارجمند و تاب دار
زادۂ دریائے ناپیدا کنار
او ز شوخی در تہہ قلزم تپید
تا گریبان صدف را بر درید
من بہ آغوش صدف تابم ہنوز
در ضمیر بحر نایابم ہنوز

(مجلّہ "خیابان" (پشاور یونیورسٹی)، دانائے راز نمبر، شمارہ 9، بابت 1977ء، ص 57-67)

خمار بی۔ اے (آنرز)

گوئٹے اور اقبال

(منظوم مکالمہ)

میں ٹیبل لیمپ کی روشنی میں آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پاس ہی "ڈان" کی موٹی موٹی سرخیوں پر نظر پڑی..... وہی..... "برطانوی جہاز پر کمیونسٹوں کی بمباری"..... "امریکن بلاک اور اشتمالی بلاک میں تصادم"..... "تیسری عالمگیر جنگ کے خطرات"۔ اکتا کر میں نے "بال جبریل" اٹھائی۔ پھر سگریٹ جلایا اور وہ غزل جس کا مطلع ہے "افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر' کرتے ہیں خطاب آخر اٹھتے ہیں حجاب آخر".... گنگنانے لگا۔ سگریٹ کا دھواں بل کھاتا ہوا آسمان کی طرف اڑا جا رہا تھا اور ساتھ ہی میں بھی..... اور پھر.....؟

(گوئٹے اور اقبال آسمان پر نظر آتے ہیں۔ دونوں کی نگاہیں کرہ زمین کی جانب جمی ہوئی ہیں۔ گوئٹے دفعتاً" مضطرب ہو جاتا ہے)

گوئٹے: عزیز دوست! یہ کیسا ہے آج شور و فغاں؟
کہ تنگ و تار تھا یوں ہی یہ خاکدان جہاں
یہ چمنیاں نہیں یورپ کے کارخانوں کی
یہ اژدہے ہیں نکالے ہوئے سیاہ زباں
زمیں پہ پھر نئے فتنے ہیں سر اٹھائے ہوئے
یہ کن کی آہوں کا پھر سے اٹھ رہا ہے دھواں

ہنوز دم نہ لیا تھا زمین والوں نے
کہ آ رہا ہے بڑھائے ہوئے قدم طوفاں
ستارے کانپ رہے ہیں اٹھی افق پہ گھٹا
کدھر یہ بجلی گرے گی؟ لگے گی آگ کہاں؟
مگر یہ بات ہے کیا تو جو مسکراتا ہے
بتا بتا تو خدارا یہ کیا ہے راز نہاں؟

اقبال: عجیب چیز ہے واللہ! گردش دوراں
ہزار بھید بدلتا ہے یہ طلسم جہاں
بدل تو جاتے ہیں انداز میکشی لیکن
وہی ہے میکدہ، ساقی، وہی ہے پیر مغاں
جسے زمیں کی خلافت ملی وہی انساں
خدا کی بستی کو ظالم سمجھ رہا ہے دکاں
وہ جا رہے ہیں فرشتے کہاں! خبر ہے مجھے
نہیں ہیں عام بالا کے راز مجھ سے نہاں

گوئٹے: (فرشتوں کی طرف اشارہ کر کے)
کسی فرشتے سے پوچھیں تو اور بہتر ہے
وہ ایک پیکر نوری، وہ جا رہا ہے وہاں

اقبال: (فرشتے سے مخاطب ہو کر)
اے راز ہائے خدائی کے پاسباں یہاں

گوئٹے: (مضطربانہ آگے بڑھ کر)
بتا بتا کہ ہے بے ڈھب کیوں آج رنگ جہاں؟

عزرائیل: سلام تم پہ اے شمع ازل کے پروانو!
اگرچہ ہیں یہ خدائی کے راز ہائے نہاں
یہ چند روحیں جو زنبیل میں ہیں مری اسیر
سنو انہی کی زبانی زمین کے غم کا بیاں

(ایک روح کو حکم دیتا ہے)

پہلی روح: نہ پوچھو آہ نہ پوچھو ہمارے غم کا بیاں
فرنگیوں نے جہنم بنا دیا ہے جہاں

(زنبیل کی مقید روحیں شعر کے ختم ہونے پر کراہتے ہوئے "کورس" میں "اف الاماں الاماں" کی صدا بلند کرتی ہیں)

دوسری روح: روش روش پہ چمن میں ہیں خار گل کی جگہ
بہار کا تھا زمانہ بہار پر ہے خزاں
(اف الاماں۔ الاماں)

تیسری روح: دلوں کے آبلے ناسور بن کے بہہ نکلے
ہماری آنکھوں نے دیکھا ہے حشر ضبط فغاں
(اف الاماں۔ الاماں)

چوتھی روح: فلک نے بجلیاں برسائیں بام و در پہ وہ آہ
ستم وہ ٹوٹا کہ ظالم بھی خود ہیں نالہ کناں
(اف الاماں۔ الاماں)

عزرائیل: (طنز سے) کمال آدم خاکی کا سن لیا تم نے؟
نہیں زیادہ مناسب مرا قیام یہاں

(الاماں الاماں کا "کورس" آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے۔ گوئٹے اور اقبال اکیلے رہ جاتے ہیں۔ گوئٹے زمین پر نگاہ ڈالتا ہے اور پھر متاثر ہو کر تڑپ اٹھتا ہے)

گوئٹے: گھٹا کی گود میں تڑپی وہ دیکھ برق تپاں
وہ تیر آتش مضطر عذر اے طائر جاں
اجڑ رہا ہے عجب رنگ سے یہ باغ جہاں
وہ انقلاب ہے برپا کہ الاماں الاماں!

اقبال: اے ہم نفس! نہ ہو حیرت زدہ نہ مانگ اماں
اس انقلاب سے ہوتا ہے پیر دہر جواں
"تو بازمانہ ستیز" است کار زندہ دلاں

"تو بازمانہ بساز" ایں حدیث بے خبراں
اس آنے والی قیامت کی تھی خبر مجھ کو
میں جانتا تھا کہ کس سمت جا رہا ہے جہاں
یہ نفسی نفسی کے منظر نہ تھے نہاں مجھ سے
تھی ایک دھندلی سی تصویر گرچہ مجھ پہ عیاں

گوئٹے: (متاسفانہ انداز میں)
یہ نیم شب، یہ اداسی، یہ انجمن برہم
سسک رہا ہے چراغ حریم مغربیاں

اقبال: مرے رفیق فلک! یہ زوال لازم تھا
عبث ہے غم یہ ترا، ہے عبث یہ آہ و فغاں
وہ شمع جس سے تھیں روشن فرنگ کی آنکھیں
اسی کی لو نے جلایا ہے آج اس کا مکاں
لگائی ساز ہوس پر وہ چوٹ باطل نے
کہ تار کی طرح گویا تڑپ اٹھی رگ جاں

گوئٹے: نہ کر کنایہ میں باتیں اے عندلیب فلک
کر اپنا حال دل اے دوست صاف صاف بیاں

اقبال: دکھا ہی دوں مری آنکھوں نے جو بھی دیکھا ہے
سنا ہی دوں تجھے آ، آج راز کون و مکاں
وہ "کارل مارکس"(۱) مایوس المنی مجذوب
دماغ روشن و دل مردہ گرچہ شعلہ بیاں
وہ ساقی جس نے مے "لا" پلائی دنیا کو

.....

گوئٹے: (بات کاٹ کر)
مرے وطن کے جو میخانہ کا تھا پیر مغاں

اقبال: وہی کہ جس نے سکھائی ہے تشنہ سامانی
اسی کے زخمہ نے چھیڑا ہے آج ساز فغاں
تراشے جاتے ہیں ایسے صنم ہزار وہاں
فرنگ کیا ہے فقط کار گاہ شیشہ گراں
جدا ہو دیں سے سیاست تو دور چنگیزی
امم کی موت نہ ہو گر رفیق دل کی زباں
بنائے امن جہاں' بر حساب سود و زیاں
حیات نقش بر آب ایں خیال مغربیاں
جنون دیو ہوس ہے فرنگیوں کا جنوں
وجود شانہ ہستی پہ ان کا بار گراں
خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
ہے لا الہ فقط کچھ نہیں زمین و مکاں
یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
ہو لا الہ زباں پر بہار ہو کہ خزاں
اثر ہے ساغر لا کا یہ کیف ضعف یقیں
علاج ضعف یقیں لا الہ میں ہے نہاں
یقیں نہیں تو مقام خودی بھی دل سے نہاں
خودی نہاں تو خدا کا وجود وہم و گماں
فقط عصائے خودی ہی سے ٹوٹ سکتا ہے
کہ اک فریب نظر ہے طلسم کون و مکاں
سنان عشق سے گھائل نہیں دل افرنگ
جہان زیست میں سب ہیچ اس کے تیغ و سناں
خرد ہوئی ہے' میر سپاہ باطل کی
شکستہ صف ہیں محبت کے گر پہ لشکریاں
تباہ ضرب کلیمی سے ہونے والی ہے

طلسم و سحر خرد، یہ بہشت مغربیاں

گوئٹے: رہے گا غرب کہاں تک یوں مبتلائے عذاب
رہے گا طاری کہاں تک یہ اس پہ خواب گراں

اقبال: اٹھے گا خواب سے جس دم یہ چونک کر افرنگ
نہ یہ زمیں رہے گی نہ یہ فلک نہ جہاں
یہ حشر کیا ہے، نیا دور ہے ابھی باقی
ہے میری آنکھوں میں اس کی سحر بھی صاف عیاں
دیا ہے میں نے جوانان شرق کو وہ سوز
جو پھونک دے گا زمیں پر نظام مغربیاں
کریں گے اپنا جہاں آپ بالیقیں پیدا
جہاں لاکھوں ضمیر وجود میں ہیں نہاں
چمکنے کو ہے ستارہ زمین مشرق کا
مثال مہر ہر اک ذرہ ہو گا نور افشاں

گوئٹے: (اس کی نظر سرزمین مشرق کی طرف اٹھتی ہے۔ یکایک اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے)۔

اے راز دار حرم! یاد آ گئی اک بات
تجھے ہو اب تو، مبارک قیام "پاکستاں"

اقبال: زمانہ میری فغان سحر پہ ہنستا تھا!
مری زباں پہ جب آیا تھا نام پاکستاں
بدل دیا ہے میرے خواب کو حقیقت میں
یہ کارنامہ ہے جس کا وہ اور ہے انساں
نظر میں جس کی تھے ضرب کلیم کے انداز
وہ راز داں وہ خدا کی دلیل وہ شعلہ بیاں
وہ جس نے لاج محمدؐ کے نام کی رکھ لی

اسی کی ایک ادا ہے وجود پاکستاں
میں چاہتا ہوں کہ مومن سے پھر کہوں اک بار
ٹھہرنے پائے نہ یہ کاروان شوق یہاں
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
اے لاالہ کے وارث! تجھے ہے حکم اذاں
نگہ بلند کر اپنی ذرا ستاروں سے
کہ ہے ستاروں سے آگے بھی ایک اور جہاں
یہ عصر تو کوئی طوفاں ہے! یاد کر ناداں
تیرے سفینہ نے دیکھا ہے نوح کا طوفاں

(سگریٹ جلتے جلتے میری انگلیوں تک پہنچ گیا تھا۔ میں نیند سے چونک پڑا۔ نیند کی بے خبری میں "بال جبریل" کے چند اوراق الٹ گئے تھے۔ یکایک میری نظر اس شعر پر پڑی)

گئے دن، کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

اور سامنے دیوار پر قائد اعظم کی تصویر مسکرا رہی تھی!

حاشیہ

۱۔ کارل مارکس جو فلسفہ اشتمالیت کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ جرمنی یہودی تھا۔ اسی کی تعلیمات کا اثر ہے کہ انقلاب روس رونما ہوا۔

(روزنامہ "ڈان" (اردو) کراچی، اقبال نمبر، 29 اپریل 1949ء، ص 24)

سید وحید الدین

اقبال، گوئٹے اور نٹشے

گوئٹے اور نٹشے کا اقبال پر اثر ان کے فلسفہ کی تشکیل میں اتنا نمایاں نہیں جتنا کہ ان کے شاعرانہ تخیلات، جمالیاتی تجربہ اور انقلابی محرکات کی نشو و نما پر رہا ہے۔ یہ بات تو اقبال کے سرسری مطالعہ سے بھی واضح ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے تو یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جرمن ادب اور فلسفہ کا بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔ خاص طور پر کلاسیکی دور میں۔ جرمن ادب نے فلسفہ کو متاثر کیا اور جرمن فلسفہ نے ادب کو۔ گوئٹے خود فلسفیانہ مفکر اس معنی میں نہیں تھا کہ اس نے کسی نظام فکر کی داغ بیل ڈالی ہو، لیکن اسی کے ہم عصر شلر نے کانٹ کے فلسفہ کا بغائر مطالعہ کیا تھا اور کانٹ کی اخلاقیات پر اس نے جو تنقید کی ہے، اس کی اہمیت اب بھی باقی ہے۔ کانٹ کے افکار میں ایک خاص قسم کا تناؤ پایا جاتا ہے اور یہ تناؤ کسی طرح عبور ہونے نہیں پاتا۔ انسانی عقل (Understanding) جب ماورا کا علم حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے، تو خود ایسے تضادات میں پھنس جاتی ہے جن کے درمیان کوئی ہم آہنگی پیدا نہیں کی جا سکتی۔ یہ تناؤ اخلاقیات میں سب سے زیادہ الجھن میں ڈالتا ہے۔ فرض اور میلان کی کشمکش ہر وقت انسان کو مضطرب رکھتی ہے۔ جو مجھے چاہئے اور جو میں چاہتا ہوں، ایک دوسرے کے ساتھ ہر وقت متصادم ہوتے ہیں۔ اور اخلاقی فرض کی تکمیل اسی وقت ہوتی ہے جب ہم اپنے میلانات کو فرائض پر قربان کر دیں۔ لیکن شلر ایک شاعر تھا، وہ اس تناؤ اور تضاد کو قبول نہیں کر سکا۔ اس کے نزدیک کانٹ نے اخلاقی شعور کے

صرف ایک پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ اخلاقی شعور میں تناؤ کا پایا جانا ضروری نہیں۔ جس کو ہم حسن سیرت کہتے ہیں' وہ عبارت ہے فرض اور میلان کی ہم آہنگی سے۔ ایسا آدمی اس تناؤ کو عبور کر جاتا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے وہ وہی ہے جو اسے چاہئے۔ بہر صورت شلر نے ایسے انداز فکر کی طرف رہبری کی جس کا مرکز تضاد نہیں بلک ہم آہنگی ہے۔

اب ہم جب گوئٹے کے شعور اقدار کی طرف رجوع کرتے ہیں تو یہاں ایک دوسری دنیا نظر آتی ہے۔ اس کی زندگی کی داستان صاف بتاتی ہے کہ زندگی شاعری سے جدا نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے اس نے اپنی خود نوشت سوانح کو "شاعری اور صداقت" کا نام دیا ہے۔ وہ اس جہاں سے سرسری نہیں گزرا تھا بلکہ "ہر جا" اس کے لئے "جہان دیگر" تھا۔ گوئٹے فلسفیانہ فکر کے تنگ سانچوں میں اپنے کو محدود نہیں رکھتا۔ وہ ایک آفاقی شاعر ہے اور اس کے شاعرانہ تخیلات کا سرچشمہ بھی بہت وسیع ہے۔ وہ کالی داس کی شکنتلا کا بھی دلدادہ ہے اور حافظ کے نغموں سے بھی مسحور رہا ہے۔ رسول اللہؐ کی تاریخ ساز ذات اقدس کا بھی وہ بہت معترف ہے۔ اس نے "نغمہ محمدؐ" کے نام سے ایک شاندار نظم لکھی' جس میں رسول اللہؐ کو ایک کونیاتی قوت کی حیثیت سے پیش کیا ہے' جس کی متابعت میں کائنات کی قوتیں آگے بڑھتی ہیں۔ اس نے جہاں ٹھوکر لگائی' وہیں شہر آباد ہوئے اور تہذیبوں نے فروغ پایا۔ اقبال نے اسی کو پیش نظر رکھ کر اپنی نظم "جوئے آب" لکھی۔ کہنے کو تو یہ آزاد ترجمہ ہے لیکن اس میں اقبال کی انفرادیت صاف نمایاں ہے۔ اس کا ایک بند ہے:

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود
مانند کہکشاں بہ گریبان مرغزار
درخواب ناز بود بہ گہوارۂ سحاب
وا کرد چشم شوق بہ آغوش کوہسار
زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
درخود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

اقبال کی نظم "حور و شاعر" بھی گوئٹے کے شاعرانہ تخیل کی مرہون منت ہے' لیکن دونوں عظیم شاعروں کی شخصیت کا فرق صاف نظر آتا ہے۔ گوئٹے تو زندگی کے نت نئے تجربات اور حسین لمحات کی ابدیت میں کھو جاتا ہے' لیکن اقبال حور کے اس طعنہ پر کہ شاعر

رہ و رسم آشنائی سے بیگانہ ہے' اپنے شعور حیات کے اظہار کا ایک موقع پاتے ہیں :

چہ کنم کہ فطرت من بہ مقام در نسازد
دل نا صبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگاہ خوبروئے
تپد آں زماں دل من پے خوبتر نگارے
دل عاشقاں بہ میرد بہ بہشت جاودانے
نہ نوائے دردمندے' نہ غمے' نہ غمگسارے

لیکن گوئٹے کی بھی بیتاب روح کو کہیں قرار نہیں ملتا۔ وہ بے قراری اور بیتابی جو اقبال کے کلام میں ہم کو ملتی ہے' وہ گوئٹے کے پاس بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ گوئٹے کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک پورا انسان (Full man) تھا۔ عام آدمی بچپن سے جوانی کی طرف اور جوانی سے بڑھاپے کی طرف بڑھتا ہے۔ وہ ہر دور کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے' اپنے میں جذب نہیں کرتا۔ لیکن گوئٹے ایک دور سے دوسرے دور کی طرف اس طرح قدم بڑھاتا ہے کہ وہ پہلے دور کو بالکل اپنے پیچھے نہیں چھوڑتا۔ بڑھاپے میں بھی وہ جوانی کی بیتابیوں' خوابوں' اضطراب اور تمناؤں کو اپنے اندر اس طرح سمو لیتا ہے کہ جوانی بھی بڑھاپے کی ایک صفت معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کا بڑھاپا حسرتوں اور کھوئی ہوئی متاع پر نالہ و زاری سے عبارت نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ گوئٹے نے اپنی آخری عمر میں حافظ کا مطالعہ کیا اور اس کی سدا بہار شاعری سے اتنا متاثر ہوا کہ عشق و محبت کے نغمے اس کے قلم سے بے ساختہ نکلنے لگے۔ جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ بڑھاپے میں بھی اس کی تمنا بیدار تھی اور کسی کی محبت اسے مضطرب رکھتی تھی۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم گوئٹے کے آخری دور سے بحث کریں' اس کے سب سے زیادہ مؤثر دور کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ چونکہ گوئٹے مغربی فکر میں اس حیثیت سے نمودار نہیں ہوتا کہ اس نے حافظ کے دیوان کے مقابل خود ایک دیوان کی تخلیق کی اور مشرقیت میں اس طرح کھو گیا کہ مغربیوں کے لئے وہ ایک بیگانہ نظر آنے لگا۔ مغرب میں تو اس کی امتیازی شان اس کے ڈرامہ "فاؤسٹ" کی تخلیق میں ملتی ہے۔ "فاؤسٹ" میں اس نے اپنی تخلیق کا نچوڑ سمو دیا ہے اور فاؤسٹ کی شخصیت میں ہم کو بعض ایسے اجزا ملیں گے جن سے

بعد میں اقبال کی شاعری بہت متاثر ہوئی۔ اقبال کے خیال میں "شاعر نے حکیم فوسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں امکانی نشو و نما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمال فن خیال میں نہیں آ سکتا۔" "فاؤسٹ" کا ڈرامہ کیا ہے' انسانی کرب اور بے چینیوں کی ایک سرگذشت ہے۔ علم کی منتہی پر یہ بات کھلی کہ علم سے کچھ حاصل نہیں ہوا اور دنیا کے لیل و نہار اور انسانی مسرتیں بھی علم کی لاحاصل تلاش میں ہاتھ سے گئیں۔ یہی ایسے عناصر ہیں جو گوئٹے کی شاعری کو ایک دائمی حیثیت دیتے ہیں اور اس کو صف اول میں کھڑا کر دیتے ہیں۔

فاؤسٹ کی شخصیت ایک بلند ہمت انسان کی ہے' جو تن آسانی کو پسند نہیں کرتا' جو علم و حکمت کی جستجو میں لگا رہتا ہے' جو خالص مغربی معنوں میں معلم ہے۔ یعنی اس کا کام ہی یہ ہے کہ نئی نسل کو علم سکھائے اور حکمت و دانائی سے ان کو آراستہ کرے۔ لیکن ہماری ملاقات فاؤسٹ سے اس وقت ہوتی ہے جب اس کو علم و حکمت سے مایوسی ہوتی ہے اور اس کی شخصیت غالب کے شعور حیات کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہے:

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دین
لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم
درد یک ساغر غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

اس کا مطلب یہ ہے کہ خرد کی گتھیوں کو سلجھاتے ہوئے اس کے پاس دنیا کے اقدار و حسنات کے لایعنی ہونے کا شعور اجاگر ہو جاتا ہے اور اسی لئے وہ آسانی کے ساتھ راستہ سے بھٹک جاتا ہے۔ بالآخر اس کو نجات محبت میں ملتی ہے اور یہ احساس اس پر غالب ہوتا ہے کہ حقیقت مطلقہ آدمی کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور جمال الٰہی کی تعبیر کے لئے وہ ابدی نسائیت کے اشارہ اور رمز کا استعمال کرتا ہے' لیکن مرکز فکر گوئٹے کا یہی ہے کہ حقیقت تک راستہ نظری فکر کے ذریعہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ اس نے کسی جگہ لکھا ہے کہ نظریہ یا تھیوری بالکل خشک ہے اور زندگی کا درخت سرسبز و شاداب۔ فاؤسٹ کی قسمت اور اس کا حزنیہ مغربی انسان کا حزنیہ ہے اور اب یہ صرف مغربی انسان تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اپنی آفاقی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری خصوصیت گوئٹے کے پاس یہ ہے کہ وہ شخصیت کو

مرکزی حیثیت دیتا ہے۔ وہ انسان کو ایک فعال حقیقت کی شکل میں دیکھتا ہے۔ چنانچہ اس کی جھلک فاؤسٹ میں بھی جا بجا ملتی ہے۔ فاؤسٹ انجیل مقدس کو اٹھاتا ہے۔ اس کی نظر پہلے سینٹ جان کے ابتدائی جملے پر پڑتی ہے۔ "ابتدا میں کلمہ تھا" وہ سکوت کرتا ہے اور حیرانی سے پوچھتا ہے کہ "کلمہ" کو اتنا بلند مقام کیسے مل گیا۔ یہ ترجمہ اس کی تشفی کا باعث نہیں بنتا۔ شاید ترجمہ یہ ہوتا "ابتدا میں تصور تھا۔" مگر تصور میں خلاّقی کہاں سے آئی اور وہ زماں کا مقتدر کیسے ہو گیا۔ کیا ابتدا میں "قدرت" تھی لیکن پھر بھی تشفی نہیں ہوتی اور قدرت غیبی مدد کو آتی ہے۔ وہ لکھتا ہے "ابتدا میں عمل تھا۔" ہاں عمل ہی ایسی قوت ہے جو کائنات کے پیچھے کار فرما ہے۔ اس عملیت کے فلسفہ کو گوئٹے نے تو کوئی آخری شکل نہیں دی لیکن اس کی گونج ہم کو اقبال کے کلام میں سنائی دیتی ہے:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

لیکن کانٹ نے عمل کو صرف اخلاقی عمل تک محدود کر دیا تھا۔ شلے نے اس کو مابعدالطبیعاتی حیثیت دے دی۔ گوئٹے کے پاس عمل نہ بالکل اخلاقی معنی رکھتا ہے اور نہ مابعدالطبیعاتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب جو عملی اضطراب اور بے چینی کا مظہر ہے اور جو مشرقی مراقبہ اور بے عملی سے بیزار ہے' وہ اقبال کے یہاں بھی پوری طرح موثر ہو گئی ہے۔ یہاں عمل دراصل تاریخی عمل ہے۔ ایسا عمل جس سے تاریخ بنتی ہے۔ اگر ہم صوفیت پر اقبال کی تنقید کے غالب رجحان کو دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ وہ صوفیت کو تہذیب شکن اور حیات گریز سمجھتے ہیں۔ ہم کو یہاں اس سے بحث نہیں ہے کہ اقبال کی تنقید کس حد تک درست ہے بلکہ ہم کو صرف اس سے بحث ہے کہ ہم اقبال کی فکر کے محرکات کو سمجھیں۔ چنانچہ وہ نبی اور ولی کے مناصب میں بنیادی فرق دیکھتے ہیں۔ نبی کا تجربہ تاریخ میں دخل انداز ہوتا ہے۔ ولی کا تجربہ اس کی اپنی دنیا سے باہر مؤثر نہیں ہوتا۔ اب یہاں ایک اور بہت دلچسپ حقیقت ہمارے سامنے پیش آتی ہے۔ زمانہ موجودہ میں انتاجیت (Pragmatism) کے علمبرداروں نے یہی دعویٰ کیا ہے۔ صداقت وہی ہے جو مؤثر ہو (Truth is that which works) اور اگر صداقت صرف تصورات کی نسبتوں سے آگے بڑھ کر اپنے کو مؤثر نہیں کر سکتی تو پھر اپنے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہاں یہ عجیب بات

ہے کہ ایک طرف تو انتاجیت کی تحریک ہے جو بعض وقت تو بالکل سطحی نتائج پرستی کا نام بن جاتی ہے اور کبھی عمل پر زور ایک دوسری شکل اختیار کرتا ہے۔ عملیت فکر کا سب سے شاندار مظہر ہیگل کا فلسفہ تاریخ ہے۔ یہاں تصورات جامد نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنے اندر خود محرک بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ دنیا کو ہلا سکتے ہیں۔ گویا ہیگل کے الفاظ میں "تصورات کے بھی ہاتھ اور پیر ہوتے ہیں۔" اور اسی عملیت کا رجحان ہر سطح پر ہم کو کار فرما نظر آتا ہے۔ حتیٰ کہ الٰہیات میں بھی، خواہ وہ عیسائی الٰہیات ہو یا اسلامی، اس کی بازگشت ہمیں ملتی ہے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے علم کلام میں یہ بڑا اہم مسئلہ رہا ہے کہ ایمان کا عمل سے کیا تعلق ہے۔ اگر ایک گروہ نے عمل کو ایمان کے تابع کر دیا، تو دوسرے گروہ نے ایمان کو عمل کے۔ اقبال کے پاس عمل کی اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ ان کی الٰہیات کے تاریخی شعور میں بھی عمل کو تقدم حاصل ہے۔ ان کا پیر و مرد مجاہد ہے جو ایک نئی دنیا بنانے کے صرف خواب نہیں دیکھتا، بلکہ اپنے خوابوں کو حقیقت کا جامہ پہنانے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اس کے مقابل غالب کا تصور یہ ہے:

ہے خیال حسن میں بھی حسن عمل کا سا خیال

اقبال کے پاس عملیت گوئٹے یا کسی مغربی اثرات ہی کی مرہون منت نہیں ہے، بلکہ اگر اس کا سرچشمہ خود اسلامی تاثرات اور قرآن حکیم کی تعلیمات ہیں تو بھی ان کا اظہار مغربی افکار اور شعور حیات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا ہے۔ ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اسلام خود مغربی تہذیب کی نفی نہیں ہے اور نہ مغربی تہذیب اسلامی شعور حیات کی۔ جو اختلافات اور تضادات مغرب اور اسلام میں پیدا ہوئے ہیں، وہ ٹیکنالوجی کی حیرت ناک ترقی اور صنعتی انقلاب کا نتیجہ ہیں۔ اور جب مسلمان ملکوں میں بھی صنعتی انقلاب رونما ہو گا تو اسلامی معاشرہ کے سانچے میں، خواہ ہم اس کو مانیں یا نہ مانیں، مغربی سماجی اور معاشرتی مظاہر سے بہت زیادہ بُعد رکھتے نظر نہیں آئیں گے۔

اقبال نے "پیام مشرق" کا جو دیباچہ لکھا ہے وہ بہت معنی خیز ہے۔ اس میں انہوں نے

بتایا ہے کہ ابتدائے شباب ہی سے گوئٹے کی ہمہ گیر طبیعت مشرقی تخیلات کی طرف مائل تھی۔ شٹراس بورگ میں جہاں وہ قانون کے مطالعہ میں مصروف تھا' اس کی ملاقات جرمن ادب کی مشہور اورر قابل احترام شخصیت ہرڈر سے ہوئی' جس کی صحبت کے اثرات کو گوئٹے نے خود اپنی سوانح میں تسلیم کیا ہے' لیکن جیسا کہ خود اقبال نے لکھا ہے کہ ہرڈر کو حافظ کے تغزل سے کچھ دل چسپی نہ تھی۔ بلکہ سعدی کا اخلاقی پس منظر اس کے لئے زیادہ جاذب فکر تھا۔ گوئٹے کے لئے اہم واقعہ حافظ کے دیوان کا جرمن ترجمہ تھا' جس کو فان ہامر نے 1812ء میں شائع کیا۔ اور اس وقت گوئٹے کافی معروف ہو چکا تھا۔ لیکن یہ زمانہ جرمن قوم کے لئے بڑے انتشار کا تھا اور ایسے انتشار کے زمانہ میں گوئٹے کو حافظ کے ترجمہ نے ایرانی شعر و نغمہ کی ایک نئی دنیا سے روشناس کرایا۔ حافظ کے ترجمہ سے وہ اس طرح متاثر ہوا کہ اس نے اپنے دوست کی نوعمر بیوی سے معاشقہ کا آغاز کیا اور عشق و محبت اس کے لئے قال و قیل کی سرحد سے آگے بڑھ کر خود اپنی زندگی کی واردات بن گئے۔ بعض وقت تو وہ خود حافظ کے کلام کو اپنے اندر ایسا سمو لیتا ہے کہ اس کی نغمہ سرائی بھی حافظ کی غزل کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔ حافظ کی مشہور غزل ہے :

صبا بلطف بگو آں غزال رعنا را
کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ مارا

حافظ کے شعر کا حسن "بلطف بگو" میں ہے' کیوں کہ شاعر یہ نہیں چاہتا کہ وہ محبوب کے سامنے کوئی ایسی شکایت لے کر جائے جو اسے گراں گزرے۔ گوئٹے بھی بالکل اسی طرح سے اپنا شکوہ اپنے محبوب کے سامنے پیش کرتا ہے۔ حافظ کے شعور محبت میں خود کو کھو کر کہتا ہے :

"میرے محبوب کے پاس شتاب جا' ہاں کلام نرمی سے کرنا' کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی خاطر پر گراں گزرے۔ سات ہی ساتھ میرے غم کو چھپائے رکھنا۔"

Eile denn zu meinem Lieben,

Spreche sanft zu seinem Herzen;

Doch vermeid, ihn zu betrueben,

Und verbirg ihm meine Schmerzen.

(West-oestlicher Divan)

اقبال گوئٹے کے سوانح نگار بیل شوسکی کے الفاظ نقل کرتے ہیں :

"بلبل شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی۔ اس کو کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ شاید میری روح ہی حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے۔ وہی زمینی مسرت' وہی آسمانی محبت' وہی سادگی' وہی عمق' وہی جوش و حرارت' وہی وسعت مشرب' وہی کشادہ دلی' وہی قیود و رسم سے آزادی۔"

لیکن گوئٹے حافظ کے علاوہ ایران کے دوسرے بڑے شعرا سے بھی ناواقف نہ تھا۔ لیکن اسے روایتی تصوف سے دلچسپی نہ تھی' جس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ رومی کے متحرک تصوف سے متاثر نہ ہو سکا۔ اقبال نے اس پر تعجب کیا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو شخص اسپنوزا کے فلسفہ وحدت کا قائل ہو اور برونو سے متاثر ہو' وہ رومی کا معترف نہ ہو۔ لیکن اسپنوزا کے فلسفہ کی بنیاد بہت زیادہ مجرد عقل پر مبنی تھی' اور گو کہ جرمن رومانیت کے علم برداروں نے اسپنوزا کو خدا کا متوالا (God-intoxicated man) کہا تھا' پھر بھی وہ اسپنوزا کے فلسفے کی اصلی روح کو نہ پا سکے تھے۔ وہ اس قسم کا وحدت الوجودی نہیں تھا جس قسم کے مسلمان صوفیا رہے ہیں' بلکہ اس کے پیش نظر تو ایسی وحدت تھی جس کی اساس اقلیدسی تھی۔ خدا سے کائنات اس طرح وجود میں آتی ہے جس طرح مثلث سے اس کی خصوصیات۔

"پیام مشرق" گو کہ گوئٹے کے "مغربی دیوان" کے جواب میں لکھی گئی ہے' لیکن اصل میں اس کے محرکات اور موضوع بحث بالکل جدا ہیں۔ گوئٹے کا دیوان تو حافظ ہی سے زیادہ قریب ہے۔ "دیوان مغرب" کو بے شک مشرق کے شعور حیات کا جواب سمجھا جاتا ہے۔ اقبال کا مدعا کیا ہے؟ خود ان کے الفاظ میں : یہ "ان اخلاقی' مذہبی اور ملّی حقائق کو پیش نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔" اور ان کے نزدیک اس سے سو سال قبل کے جرمنی کی قریب قریب وہی حالت تھی' جو مشرق کی موجودہ حالت ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کا منشا گوئٹے کے نقش قدم پر چلنا نہیں تھا بلکہ گوئٹے کے افکار و تصورات کو نکتہ آغاز بنا کر اسلامی تہذیب کے مستقبل کا ایک جائزہ لینا تھا۔ یہاں

اقبال اپنے بنیادی تصور کی طرف اشارہ کرتے ہیں' جس کی بنیاد حکمت قرآنی ہے اور وہ یہ کہ "زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔" جس کا اشارہ قرآن حکیم نے ان سادہ اور بلیغ الفاظ میں کیا ہے: **ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتّٰی یغیروا ما بانفسھم۔**

لیکن حق تو یہ ہے کہ اقبال و گوئٹے کے عوالم بالکل جدا ہیں اور ان کی شخصیتیں بھی بالکل مختلف۔ گوئٹے کا فلسفہ سے تعلق بھی وہ نہیں ہے جو اقبال کا فلسفہ سے ہے اور نہ وہ ایسا شاعر ہے جس کے نزدیک شاعری پیغام کے پہنچانے کا ذریعہ ہو۔ اس کی دلچسپی انسان کی زندگی کی گہرائیوں سے ہے۔ اس کشمکش اور اضطراب سے ہے' جو اس کے بطون میں پایا جاتا ہے۔ اس کے پاس انسانی درد بھی ہے' محبت بھی ہے' ہجر و وصال کی کشمکش بھی ہے' حسن کا ذوق بھی ہے' نامانوس تہذیبوں کو اپنانے کی صلاحیت بھی ہے۔ وہ ہندوستان میں بھی اپنی شخصیت کو کھوئے بغیر یہاں کے حسن و جمال کو اپنے اندر سمو سکتا ہے۔ وہ ایران کی سرزمین میں بلبل و شیراز کے ساتھ ہم نوا ہو سکتا ہے۔ وہ عورت کا بھی پرستار ہے اور حافظ کی طرح اس کے عشق و محبت میں عمر مانع اور حائل نہیں ہوتی جیسا کہ حافظ کہتا ہے:

پیرانہ سرم عشق جوانے بسر افتاد
واں راز کہ در دل بنہفتم بہ در افتاد

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر
تا سحر گہ ز کنار تو جواں برخیزم

اس کے ساتھ گوئٹے کی ایک اور جہت ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ گوئٹے نے رنگ سے متعلق اپنا ایک مخصوص نظریہ پیش کیا تھا' جس کو علمائے طبیعیات نے تو قبول نہیں کیا لیکن جس نے ہمیشہ اپنی دلچسپی برقرار رکھی ہے۔ گوئٹے کو نباتیات سے بھی دل چسپی تھی۔ پودوں کی تبدیلیوں سے متعلق اپنے مقالہ میں اس نے نظریہ ارتقا کی جانب اہم قدم اٹھایا۔ گوئٹے کی دنیا ایک ایسے شخص کی دنیا ہے جس کی بوقلمونی ہر وقت اپنی کشش باقی رکھے گی۔ چنانچہ گوئٹے نے اپنے نظریہ رنگ کی ابتدا ایک نامعلوم صوفی کے خیال سے کی ہے۔

اس کو اس نے شعری جامہ بھی پہنایا ہے۔

"اگر ہماری آنکھ پہلے سے سورج نما نہ ہوتی تو پھر ہم کبھی بھی روشنی کا ادراک نہیں کر سکتے تھے اور اگر ہمارے اندر پہلے سے خدائی صفت نہ ہوتی تو خدا کی باتیں کبھی ہم کو مسرور نہ کر سکتیں۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ گوئٹے نیچر سے بالکل قریب تھا۔ وہ انسان کی ہر سطح سے مانوس تھا۔ ہاں اقبال کے پاس پیغمبرانہ جہت غالب ہے۔ وہ پیغام لے کر نکلے ہیں۔ وہ قوم میں ایک انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ایک نئی انسانیت اور ایک نئے انسان کا خواب دیکھتے ہیں۔ گوئٹے کا فلسفیانہ شعور کبھی بھی اپنے کو فلسفیانہ مباحث میں ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ اس کی فکر نے کبھی مربوط فلسفیانہ تعبیر کو پیش نہیں کیا۔ وہ تو زندگی کو پیش کرتا ہے۔ اب یہ ایک فلسفی کا کام ہے کہ وہ زندگی کی تعبیر کرے۔ گو کہ اقبال کی الٰہیات کا ایک کلیدی تصور ایسا ہے جس کا ماخذ ہم کو گوئٹے میں ملتا ہے۔ اقبال ہر انسان کو بہ حیثیت انسان کے بقا کا مستحق قرار نہیں دیتے۔ وہ لکھتے ہیں: "شخصی بقا محض تمنا ہے۔ وہ تم کو محض اسی وقت حاصل ہو گی جب تم اس کے لئے جدوجہد کرو۔" اور اس جدوجہد کے لئے تناؤ (Tension) کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔ اسی کے مماثل خیال کا اظہار گوئٹے نے ایکرمان (Eckermann) سے بات چیت کے دوران کیا تھا۔ "ہماری بقا کا تیقّن مجھے اپنے عمل کے تصور میں ملتا ہے، کیونکہ اگر میں آخر وقت تک اپنے کام میں بے تابانہ لگا رہوں تو قدرت پابند ہو جائے گی کہ مجھے وجود کی ایک دوسری شکل عطا کرے، جب موجودہ شکل روح کو سنبھالنے کے قابل نہ رہے۔"(1)

ہاں نٹشے کے پاس بھی پیغمبرانہ جہت غالب ہے۔ اسی لئے بعض حیثیتوں سے اقبال گوئٹے سے زیادہ نٹشے سے قریب نظر آتے ہیں، لیکن نٹشے ایک ایسا پیغمبر ہے جس کے پاس محکمات سے زیادہ متشابہات ہیں۔ اور متشابہات ہی میں اس کی بزرگی مخفی ہے۔ اس کے بنیادی تصورات جن کا اظہار "بقول زردشت" میں ہوا ہے، کبھی تو آدمی کو بہت بلندیوں تک لے جاتے نظر آتے ہیں اور کبھی اس کو وہ ایسے غار میں چھوڑ دیتے ہیں جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس لئے نٹشے نے خود کو اپالو (Apollo) کے مقابل پیش کیا، کیونکہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ سقراط سے جس فلسفہ کا آغاز ہوا ہے اور جس کو ڈیکارٹ نے جدید فلسفہ کے

روپ میں جاری و ساری رکھا' وہ ایسی فکر ہے جس کا معیار' وضاحت تصور ہے اور جس کی علامت روشنی ہے۔ لیکن نٹشے اپالو کا معترف نہیں بلکہ وہ اس کے مقابل ڈایونس کو پیش کرتا ہے' جو جذباتی عمق اور ہنگامہ کا پیکر ہے۔ اس طرح انسان کی گہرائیوں میں تاریکی ہے اور یہ تاریکی فلسفیانہ تعقلات کے ذریعہ کبھی بھی اپنی تعبیر حاصل نہیں کر سکتی۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ گوئٹے اور نٹشے دونوں شخصیتوں کے مقابل گو اقبال کا تعلق بہت ایجابی معلوم ہوتا ہے لیکن بہت جلد ان کے راستے بدل جاتے ہیں اور وہ بعض حیثیتوں سے گوئٹے کے مقابل نٹشے سے زیادہ قریب ہیں۔ ان کی شاعری نٹشائی چھاپ رکھتی ہے' لیکن ان کی پیغمبری اپنی اصل کو نہیں بھولتی اور خدا کا شعور بہر صورت ان کو نہیں چھوڑتا۔ اقبال کے پاس شیطان نے جو اس قدر اہمیت اختیار کی ہے' وہ بھی اسی وجہ سے ہے کہ ان کا رجوع الی اللہ ہونا اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ غیب کے شعور کو بالکل ترک کر دیں' جس کو وہ مقام کبریائی کہتے ہیں اور جس کا فقدان وہ نٹشے میں پاتے ہیں۔ وہ شعور غیب کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہ شیطان بھی ایک مذہبی تصور ہے' جس طرح گناہ ایک مذہبی تصور ہے۔ مذہبی عالم سے ہٹ کر نہ شیطان کا تصور کوئی معنی رکھتا ہے اور نہ گناہ کا تصور۔ ابلیس کو ہم خواہ کسی سطح پر سمجھنے کی کوشش کیوں نہ کریں اور اس کے رمز کو خواہ کسی حیثیت سے جاننے کی کوشش کیوں نہ کریں' یہ بات تو واضح ہے کہ ابلیس کو خدا کے خلاف ایک بغاوت کا ترجمان قرار دیا گیا ہے۔ خدا' ابلیس اور انسان ایک ہی عالم کے رموز ہیں۔ خدا خود ایک رمز ہے' اس حقیقت کا جو تعقل و بیان سے ماورا ہے۔ غالب کے الفاظ کو لے کر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خدا خود خدا نما ہے۔ یعنی خدا کو ہم اپنے انسانی اعتبارات سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کیا ہے۔ وہ حقیقت میں ان تمام انسانی صفات سے ماورا ہے' جو ہم اس کے ساتھ منسوب کرتے ہیں۔ لیکن اعتبارات کی دنیا میں خدا ایک انائے مطلق کی حیثیت رکھتا ہے اور ابلیس بھی ایک انا ہے' جو اس کے مقابل اسی کے فیصلوں کو چیلنج کرتا ہے۔ خدا اور ابلیس کے درمیان تنازع کا باعث انسان ہے۔ ان رموز کو اگر ہم غور سے سوچیں تو مذہبی شعور اور مابعد الطبیعاتی شعور کی بھول بھلیوں میں کھو جائیں گے۔ انسان قرآنی متن میں خلیفۃ اللہ علی الارض ہے یعنی زمین پر خدا کی نیابت کرتا ہے اور اس کی بزرگی اور فضیلت اس طرح ثابت کی گئی ہے کہ وہ ایسا علم رکھتا ہے جو شیطان کے پاس نہیں

ہے۔ وہ علم کیا ہے؟ وہ اسماء کا علم ہے' لیکن شیطان اس کی فضیلت کا منکر ہے' وہ خدا کا منکر نہیں۔ صرف انسان کی فضیلت کا منکر ہے۔ انسان کی فضیلت پر فرشتوں کو بھی شبہ ہوا تھا اور انہوں نے بھی اپنا نقطہ نظر اس طرح واضح کیا ہے کہ خدا سے بول اٹھے۔ "کیا تو ایسی ہستی کو پیدا کرتا ہے جو خون بہائے اور زمین پر فتنہ و فساد برپا کرے۔" خدا نے جواب دیا "میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

تاریخ مذاہب میں شیطان کا تصور اپنی خاص کشش رکھتا ہے۔ وہ بغاوت اور نفی کی قوت' جو اقبال شیطان میں دیکھتے ہیں اور بنظر استحسان دیکھتے ہیں نٹشے میں بھی اس کی جھلک ملتی ہے' لیکن نٹشے میں نفی کا پہلو غالب ہے۔ اقبال نے نٹشے کی تعبیر کچھ اس طرح کی ہے کہ جس سے خود ان کے افکار کا اظہار ہوتا ہے اور نٹشے کی بجائے خود کیا حیثیت ہے' اس سے ظاہر نہیں ہوتی۔ نٹشے انسان کی بلندیوں کا بہت گہرا شعور رکھتا ہے' جبکہ اقبال کے پاس ستاروں سے آگے بھی جہاں اور ہیں۔ نٹشے غیب کا کوئی شعور نہیں رکھتا۔ اس لئے نٹشے کو مجذوب فرنگی کہنا زیادہ صحیح نہیں ہے۔ نٹشے کی مجذوبیت دنیاوی عوامل کا نتیجہ ہے۔ اس کے زعم میں عیسائیت کے زیر اثر مغربی تہذیب میں بیماری کی علامتیں آ گئیں اور "ضعف" انفرادی اور اجتماعی طور پر پیدا ہو گیا۔ عیسائیت نے اصل میں قوت حیات کو سلب کر دیا اور زندگی سے گریز کا پرچار کر کے زندگی سے تہذیب کو محروم کر دیا۔ نٹشے اصل میں مغربی تہذیب پر تنقید کرتا ہے۔ وہ عیسائی شعور اقدار کا ناقد ہے' لیکن باوجود جزوی اشتراک کے اقبال کا نقطہ نظر روحانی ہے' جب کہ نٹشے روحانیت کا منکر ہے۔ اس کا دماغی انتشار تہذیبی انتشار کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنا کوئی ہم سخن مغرب میں نہیں پاتا' اس لئے ذہنی و جسمانی سطح پر وہ تعطل کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک ایسی بات ضرور ہے جس نے شاید اقبال کو نٹشے سے زیادہ قریب کر دیا ہے اور وہ اس کا یہ بانگ دہل پیغام ہے کہ "زندگی کے مقابل ہاں کہو اور مقدر کے مقابل خود ایک مقدر بن جاؤ۔ خطرات میں جینا سیکھو اور تن آسانی سے دور رہو۔" اقبال کے مطابق:

اگر خواہی حیات اندر خطرزی

اور کہتے ہیں:

خطر تاب و تواں را امتحان است

عیار ممکنات جسم و جان است

یہ اقبال کی تعلیم کا ایسا غیر فانی پیغام ہے جو مشرق کی سوئی ہوئی قوموں کے لئے ایک تازیانہ کا کام کر سکتا ہے۔ خاص طور پر جب ہم اقبال کا یہ نقطہ نظر بھی جانتے ہیں کہ "خانقاہی تصوف نے مسلمانوں کو سلا دیا ہے۔" اور مارکس کا بھی یہ نقطہ نظر ہے کہ مذہب ایک افیون ہے عوام کے لئے.... اس کی تائید صوفیانہ تعبیر اسلام سے بھی ہوتی نظر آتی ہے۔ اس لئے اقبال صوفیانہ اخلاق کے مقابل بھی' جس کا مرکز قناعت ہے' ایسے اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں کہ جہاں انسان جو کچھ بھی حاصل کرتا ہے' اس پر قانع نہیں رہتا۔ بلکہ اور مانگتا ہے!

وائے نادانی کہ تو ہی چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے

صوفیا کے نزدیک بھی ایک ایسا تصور کارفرما رہا ہے جس کو انسان کامل کا تصور کہا جاتا ہے۔ اس کے متوازی اقبال کے پاس مرد مومن کا تصور ہے اور نٹشے کے پاس فوق البشر کا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کے مرد مومن کا تصور کہاں سے ماخوذ ہے۔ مرد مومن مجاہد ہے۔ اس کی خودی کمال کو پہنچی ہوئی ہے' بلکہ ایسی خودی ہے کہ جو کارخانہ قدرت میں بھی مؤثر ہوتی ہے' لیکن یہ خودی بھی دو متضاد جہتیں رکھتی ہے۔ ایک طرف تو وہ ہر مزاحمت کو روندتی ہوئی آگے بڑھتی ہے' دوسری طرف اس کی خودی نازک و لطیف جذبات سے بھی عاری نہیں۔ پہلے تو وہ اتنی بلند ہوتی ہے کہ خدا خود اس کی حقیقت کو نظر انداز نہیں کرتا بلکہ اس کے اوامر میں انسان کی خودی کے ساتھ مطابقت پائی جاتی ہے۔ صوفیا کے پاس بھی ایک دوسری حیثیت سے اس قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ اگر اقبال یہ کہتے ہیں:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

تو صوفیا کے نزدیک بھی ایک حدیث قدسی کی بنا پر یہ تصور کارفرما ہے کہ بندہ اپنے نوافل سے خدا کا اتنا قرب حاصل کرتا ہے کہ خدا اس کی آنکھ بن جاتا ہے' جس سے وہ دیکھتا ہے۔ یعنی اس کی حیثیت خدائی آلہ کی ہو جاتی ہے۔ قرآن کی اس آیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ

یداللہ فوق ایدیھم: اقبال کہتے ہیں:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

لیکن مومن رقیق جذبات سے بیگانہ نہیں ہوتا' چنانچہ اقبال مومن کی شان یہ بتاتے ہیں:

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

نرم دم گفتگو' گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

لیکن نٹشے کے پاس یہ جہت نہیں ملتی۔ وہ عیسائیت کے اخلاق کو غلاموں کا اخلاق کہتا ہے اور صاحب اقتدار کے اخلاق کو خیر و شر کے امتیاز سے بالا قرار دیتا ہے۔ وہ تو اقدار کو بدل دینا چاہتا ہے۔ وہ اقدار کو منقلب (Transvaluation of values) کرنے کا قائل ہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں فلسفہ اقدار پر جو کچھ توجہ کی گئی ہے' وہ نٹشے کی بہت کچھ مرہون منت ہے۔ اس کی تنقید اقدار کی کمزوری کچھ ہی کیوں نہ ہو' اس سے یہ بات تو منکشف ہو گئی کہ اقدار کے بھی مختلف عوالم ہوتے ہیں اور ان مختلف عوالم کے لئے جگہ نکالنا ایک مکمل تہذیب کا فرض ہے۔ تمام اقدار کا ایک ساتھ تحقق نہیں ہو سکتا اور اقدار کی کش مکش سے ہی حزنیہ بنتا ہے اور موجودہ زمانہ میں اس بات پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے کہ ٹریجڈی میں خیر اور شر کی جنگ نہیں ہوتی بلکہ خیر اور خیر ہی آپس میں الجھ جاتے ہیں۔ موجودہ انسان کا بھی یہی حزنیہ ہے۔ اگر فرد اپنی ایک قدر رکھتا ہے اور ہم فرد کی آزادی کو قربان نہیں کر سکتے' تو یہ بھی صحیح ہے کہ جماعت جس کا فرد ایک جزو ہے' اپنے مطالبات رکھتی ہے۔ ایک صحت مند معاشرہ کی اسی وقت تشکیل ہو سکتی ہے' جب متضاد مطالبات میں کچھ ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر جمہوریت استبداد کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور استبدادیت اپنی منتہی کو پہنچ کر نراج میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اقبال جماعت کے بھی قائل ہیں اور فرد کو مابعدالطبیعاتی مقام دیتے ہیں۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

فرد می گیرد ز ملت احترام
ملت از افراد می یابد نظام
(رموز بے خودی)

لیکن ان کے خطبات میں فرد اور جماعت کے باہمی تعلق پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ "خطبات" میں تو ان کی توجہ کا مرکز فرد ہے یعنی انا خواہ وہ خدا کی انا ہو یا آدمی کی انا۔

نٹشے اور اقبال کے عوالم اس طرح ایک دوسرے کے بہت قریب بھی ہیں اور ایک دوسرے سے بہت دور بھی۔ اسی وجہ سے اقبال کی شاعری میں بھی ایسا ابہام پایا جاتا ہے جو کبھی ہم کو ایک قسم کی تعبیر کی طرف مائل کرتا ہے تو کبھی دوسری کی طرف۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم اقبال کے افکار کا نٹشے کے نقطہ نظر سے تجزیہ کریں گے یا نٹشے کے افکار کا اقبال کے نقطہ نظر سے۔

مغربی فکر میں نٹشے کا کیا مقام ہے؟ نٹشے کا کوئی نظام فکر نہیں تھا۔ ایسا نظام فکر جس کی مثال ہم کو جرمنی کے بڑے مفکرین جیسے کانٹ اور ہیگل میں ملتی ہے۔ نٹشے کی فکر کا منشا ان روایتی مسائل فلسفہ سے نپٹنا نہیں تھا' جن کا ذکر ہم کو تاریخ فلسفہ کے ابواب میں ملتا ہے۔ خدا سے ٹکراؤ بھی ہم کو نٹشے کے پاس جا بجا ملتا ہے اور ساتھ ہی جب ہم اس کے وجود کی نفی کا بڑی شدت سے ظاہر پاتے ہیں تو نٹشے کے پیش نظر روایتی وجود باری تعالیٰ کے دلائل نہیں ہوتے' جن کی تکذیب وہ ضروری سمجھے۔ یوں کہنا چاہئے کہ خدا ایک مابعدالطبیعاتی مسئلہ کی حیثیت سے نٹشے کی فکر میں پیش نہیں ہوتا بلکہ خدا پر عقیدہ رکھنے کا مغربی کلچر پر جو اثر ہوا ہے' اس کی بنیاد پر نٹشے اپنا نقطہ نظر پیش کرتا ہے۔ گویا خدا کوئی مابعدالطبیعاتی مسئلہ نہیں' بلکہ ثقافتی مسئلہ ہے۔ مغرب کے انحطاط کی اصل وجہ نٹشے خدا ہی کے عقیدے میں ڈھونڈتا ہے اور جس واسطے سے خدا کے عقیدے نے مغربی تہذیب میں نفوذ کیا ہے' اسی لئے وہ ضروری سمجھتا ہے کہ عیسائیت کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ خدا کے عقیدے کی نفی اصل میں عیسائیت کی نفی ہے اور اس شعور اقدار اور شعور اخلاق کی نفی ہے جس کی ترجمانی عیسائیت کرتی ہے۔ نٹشے کے نزدیک مغربی تہذیب بیمار ہے۔ اس کی قوت سلب ہو چکی ہے۔

اس کے اقدار اخلاقی ضعف کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے اگر نٹشے نے اپنے شاہکار "بقول زرتشت" کو اپنے خیالات کا ترجمان قرار دیا ہے تو یہ بھی ایک علامتی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ جو رقت قلب ہم کو اسرائیلی پیغمبروں میں ملتی ہے اور جس کی سب سے بڑی گونج جرمیا (Jeremiah) کے نوحہ میں ملتی ہے' اس کے برعکس نٹشے کا ہیرو اس قسم کے منفی جذبات سے مغلوب نہیں ہوتا۔ اس کا پیغمبر نوحہ نہیں کرتا' ہنستا ہے۔ وہ انسان کو ایک پل قرار دیتا ہے جس کو عبور کرنا ضروری ہے۔ نظریہ ارتقا کے زیر اثر وہ ایسے انسان کا خواب دیکھتا ہے جو موجودہ انسان کو عبور کر لے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نٹشے کو تاریخی زرتشت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے' بلکہ اس کا کردار علامتی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اور نٹشے کی سطح بالکل مختلف ہے۔ اقبال کا مرد مومن بھی مجاہد ہے مگر اخلاق و مذہب کا منکر ہونا تو کجا وہ اس میں زیادہ گہرائی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور خدا کی نفی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ خدا تو خودی کی منتہی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نٹشے کی ایک نفسیاتی سطح بھی ہے اور اس سطح پر نٹشے کی بصیرتوں کو بہت زیادہ موجودہ زمانہ میں اہمیت دی گئی ہے اور موجودہ فلسفہ زیست کی تحریک نٹشے کو اپنا امام مانتی ہے۔ فلسفہ زیست جس طرح کہ اس کا اظہار جرمن میں ہوا' وہ اس سے بالکل مختلف ہے جس سے ہم اس کے فرانسیسی ترجمانوں کے ذریعہ مانوس ہیں۔ سارتر (Sartre) کے پاس بھی خدا کا وجود نہیں ہے اور انسان کی آزادی اور خدا کا وجود اس کے نزدیک ہم آہنگ نہیں ہوتے۔ ہائی ڈیگر (Heideggar) کے یہاں بھی خدا کا وجود زیر بحث نہیں ہے۔ بہرصورت خدا کہیں مذکور نہیں ہوتا۔ لیکن جو ذہنی کیفیت ہم کو ہائی ڈیگر (Heideggar) کے پڑھنے سے ملتی ہے' وہ مذہبی کیفیت سے ملتی جلتی ہے۔ یہاں آدمی کی بے بسی کا بھی احساس ہے اور موت بھی اپنی ایک حقیقت رکھتی ہے اور ہر آدمی کی زندگی بقول ہائی ڈیگر موت کی طرف اپنا رخ کئے رہتی ہے۔ آدمی کو اس دنیا میں پھینک دیا گیا ہے اور آدمی کی کیفیت پھینکی ہوئی ہستی کی کیفیت ہے۔ اسی لئے اس کا بنیادی تاثر وحشت ہے۔ بقول غالب :

یک قدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

یعنی وحشت کوئی نفسیاتی کیفیت نہیں بلکہ مابعدالطبیعاتی حالت ہے' جو کاشف حقیقت ہے۔ نٹشے میں یہ منفی عوامل کارفرما نہیں ہیں۔ لیکن انسانی زندگی کے ایسے خصوصیات کا شعور ضرور ہے جو اس کو فلسفہ زیست کے بہت قریب کر دیتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے درد و کرب کا اس کو بخوبی احساس تھا اور یہ کہ انسان کا درد و کرب یہ ضروری نہیں کہ روایتی اور مانوس انداز میں اپنا اظہار پائے۔ بلکہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ظاہر میں ہم جس کو مسرت کا اظہار سمجھ رہے ہیں' وہ اصل میں دکھ اور درد کی کہانی ہو۔ یہاں یہ بھولنا نہیں چاہئے کہ نٹشے ابتدا میں شوپنہاور کے قنوطی فلسفہ سے بہت متاثر تھا گو کہ اس نے شوپنہاور کی قنوطیت کو قبولیت کا درجہ نہیں دیا۔ چنانچہ نٹشے نے ہنسی کی عجیب لیکن معنی خیز توجیہ کی ہے۔ پہلے تو وہ یہ پوچھتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ انسان ہی ایک ایسا جانور ہے جو ہنستا ہے اور پھر جواب دیتا ہے وہ ہنستا اس لئے ہے کہ وہ سب سے زیادہ غم کا مارا ہے۔ اس لئے اسے ہنسنے کی ضرورت ہوئی۔ گویا اس کے نزدیک ہنسی اظہار مسرت نہیں بلکہ غم اور دکھ کے خلاف ایک ردِ عمل ہے۔ اقبال کے پاس غم کا کیا مقام ہے؟ کیا اقبال بھی غم کو کوئی مابعدالطبیعاتی مقام دیتے ہیں؟ یہ تو ضرور ہے کہ ان کا مردِ مومن غم سے گریز نہیں کرتا بلکہ وہ ہر وقت خطرے کی زندگی مول لیتا ہے۔ "ہمیشہ خطرے میں جیو" ایک ایسا نعرہ ہے جو نٹشے اور اقبال دونوں کے پاس مشترک ہے۔ اور غالب کا یہ شعر:

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یارب اسے قسمت میں عدو کی

اقبال کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ غم کے مقابل ان دو عظیم شاعروں کے خیالات کا توارد قابل غور ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

شام جس کی آشنائے نالہ یارب نہیں
جلوہ پیرا جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں
کلفت غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے
زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے

اور گوئٹے نوا سرا ہے:

"جس نے کبھی روٹی بلا آنسو نہ کھائی ہو' جس نے کبھی درد بھری راتیں اپنے

بستر پر روتے نہ گذاری ہوں' وہ تم کو کیا جانے اے سماوی قوتو!"

جو خط اقبال نے پروفیسر نکلسن کو لکھا تھا' اس میں انہوں نے اپنی نظم "اسرار خودی" میں دیئے ہوئے ان مرحلوں کا ذکر کیا ہے جن سے خودی کو گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے تین درجے ہیں : (1) قانون کی اطاعت۔ (2) ضبط نفس جو خود شعوری کی سب سے مکمل صورت ہے۔ (3) نیابت الٰہی۔ ان کے نزدیک زمین پر ارتقا کی یہ آخری صورت ہے۔ انسان زمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔ وہ منشائے تخلیق ہے۔ اس میں مکمل ہم آہنگی حاصل ہوتی ہے۔ اقتدار اور علم کا کمال اس میں جمع ہوجاتا ہے۔ اس کی زندگی میں فکر و عمل' جبلت اور عقل ایک ہو جاتے ہیں۔ دوران ارتقا انسان کے کرب و بے چینی کا اسی میں جواز ملتا ہے۔ جتنا زیادہ ہم ارتقا میں آگے بڑھتے ہیں' اتنا ہی زیادہ ہم منزل مقصود سے قریب ہوتے ہیں۔ فی الوقت وہ صرف ایک نصب العین ہے۔ لیکن انسانیت کا ارتقا ایک ایسے نصب العینی نسل کی پیدائش کی سمت متحرک ہے' جو ایسے افراد پر مشتمل ہو گی جو اپنی مثال آپ ہوں گے۔ نٹشے کو بقول اقبال اس نصب العینی نسل کی کچھ جھلک ملی تھی۔ لیکن اس کی دہریت نے اس کے تصور کو مسخ کر دیا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ نٹشے کا انسان خدا کا متحمل نہیں ہوتا۔ وہ تو خدا کا نائب نہیں بلکہ خدا کا بدل ہے۔ اس کے برعکس اقبال کا انسان کامل مستقبل کا خواب ہے۔ یہاں کچھ ہم کو سیمویل الگزینڈر کے اس تصور کی جھلک ملتی ہے کہ انسانیت کا ارتقا ایسی خدائی صفت کے بروز (Emergence) کی طرف مائل ہے جو عمل ارتقا کا اصل منشا ہے۔ لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ اس عمل ارتقا میں خدا کا کیا مقام ہے۔ کیا وہ خود عمل ارتقا کا ایک جزو ہے یا اس سے باہر۔

نٹشے اور اقبال کے خیالات جہاں ایک دوسرے کے بہت قریب نظر آتے ہیں' وہاں وہ ایک ایسے بُعد کی نشاندہی بھی کرتے ہیں جس کو عبور نہیں کیا جا سکتا۔ نٹشے کے پاس ایک لامحدود سلبیت ملتی ہے اور لا کا غلبہ ہر وقت نٹشے کی فکر کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے نٹشے کے الفاظ میں : "میں نے کوئی نئے اصنام اختراع نہیں کئے ہیں۔" اصنام کو (یہ میرے نزدیک نصب العینی تصورات کے مترادف ہے) تہ و بالا کرنا ہی میرے ہاتھ کا کام ہے" اور اس کے برعکس وہ یہ بھی کہتا ہے :

"بہت سالوں کے بعد وہ کام کرنا میں نے اب پھر شروع کیا ہے جو ہمیشہ کرتا رہا ہوں

یعنی نئے تصورات کی تصویروں کا کسی دیواروں پر اتارنا۔" کارل یاسپرس (Karl Japers) نے نٹشے کے اس تضاد کی اچھی توضیح کی ہے۔ اس کے بقول نٹشے کے نزدیک نصب العینی تصورات کو اصنام کا نام دیا گیا ہے۔ جب ان کا تعلق صرف ماضی سے باقی رہ جائے اور وہ صداقت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب وہ مستقبل کی طرف راہنمائی کریں۔ نٹشے کا یہ معنی خیز جملہ توجہ کے قابل ہے: "جس عظمت کو خدا میں اب نہیں پاتا وہ کبھی نہیں پا سکتا۔ یا تو اس کو جھٹلانا پڑے گا یا اس کی تخلیق کرنی ہو گی۔" یاسپرس کا خیال ہے کہ کبھی تو نٹشے کی فکر تہی معلوم ہو گی اور کبھی انسانی گہرائیوں کو اپنی گرفت میں لے لے گی۔

انسان سے اس کو انتہائی کراہت بھی ہے۔ جس کا اظہار جتنی شدت سے اس کے الفاظ میں ہوا ہے' شاید کبھی نہ ہوا ہو گا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: "بلا شبہ اگر کوئی آدمی ایسا ہو جس نے ساری دنیا چھاننے میں اپنا وقت صرف کیا ہو۔ اس کو کبھی بھی کوئی ایسی صورت نہیں ملے گی جو انسانی صورت سے زیادہ قبیح ہو۔" نٹشے کا مرد مقدس (جس کا بیان "بقول زرتشت" میں ہے) بھی کبھی انسان سے محبت کرتا تھا' لیکن وہ اب انسان کے بجائے خدا سے محبت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے "اب میں آدمی سے محبت نہیں کرتا۔ آدمی بہت ہی نامکمل چیز ہے۔ انسان کی محبت مجھے تباہ کر دے گی"۔ نٹشے اس مرد مقدس کے برعکس دنیا ہی میں رہنا چاہتا ہے اور آدمی کی جیسے بھی وہ ہوں' خدمت کرنا چاہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ خدا کی محبت اصل میں اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ ہم کو بے کمالی کا احساس ہوتا ہے اور اسی لئے وہ ماورا میں اپنا مقام ڈھونڈتا ہے۔ بجائے اس کے کہ مستقبل کی خود تعمیر کرے۔ وہ کہتا ہے کہ "مذہب اصل میں بلند فطرت افراد کی غلط فہمی سے پیدا ہوتا ہے جو انسان کی قبیح صورت کا بار برداشت نہیں کر سکتے۔" اسی لئے اگر کسی کو انسان سے کراہت پیدا ہو تو وہ اس سے ایک خطرہ مول لیتا ہے اور اسی لئے نٹشے انسان کو کسی قیمت پر بھی قربان نہیں کرنا چاہتا۔ وہ یہ بھی کہتا ہے "میں آدمی سے بہرصورت محبت کرتا ہوں اور سب سے زیادہ اس وقت جب میں اس محبت کی تحریک کو اپنے سے دور کرنے کی کوششیں کرتا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ باوجود انسان کے تعلق سے ایک منفی نقطہ نظر اختیار کرنے کے اس کو اس کے امکانات کے ساتھ قبول کر لیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ انسان سے مطمئن ہے اور جہاں انسان کا نام آیا وہ خوش ہوا' لیکن نٹشے آگے بڑھ جاتا ہے۔ انسان اس کی منزل نہیں بلکہ

منزل کی طرف ایک اہم قدم ہے۔

زرتشت جیسا کہ ہم کہہ چکے کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا' بلکہ تاریخ سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ وہ ایک احتجاجی علامت ہے اور اس میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کا عیسائی شعور حیات منکر ہے۔ چونکہ وہ ایک علامت ہے اس لئے اس کی تعبیر بھی کئی سطح پر ہو سکتی ہے اور اس کی تعبیر میں بہت کچھ خامہ فرسائی ہو چکی ہے۔ سب سے پہلے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نٹشے خود زرتشت ہے اور اس کا سب سے پہلا وار اس بنیادی عیسائی تصور پر ہے' جس کا مرکز خدا ہے اور خدا کے ساتھ ہر قسم کے ماورا کا انکار ہے۔ فوق البشر ہی زمین کا مطلب و معنی ہے۔ نٹشے کہتا ہے: "میرے بھائیو! میں تمہیں قسم دلاتا ہوں' زمین کے وفادار رہو اور ان لوگوں کا کبھی یقین نہ کرو جو فوق الارضی امیدوں کی بات کرتے ہیں۔ یہ تم کو زہر پلاتے ہیں خواہ وہ اس کو جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں۔" ایک دلچسپ مکالمہ وہ ہے جو زرتشت اور اس پیرمرد کے درمیان ہوتا ہے جس نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے اور اب جنگل اور ویرانہ میں اپنا مامن بنا لیا ہے۔ زرتشت اس پیر مرد سے پوچھتا ہے کہ کیوں اس نے اس جنگل اور ویرانہ میں پناہ لی ہے۔ خود اس کا جواب دیتا ہے کہ وہ کبھی انسان کی محبت میں گرفتار تھا مگر اب وہ انسان کی محبت سے دست بردار ہو گیا ہے' کیونکہ انسان تو ایک نامکمل چیز ہے۔ وہ پیر مرد زرتشت کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ پھر انسان کی طرف نہیں لوٹے بلکہ جنگل ہی میں اپنا سہارا ڈھونڈے۔ بہتر تو یہ ہے کہ وہ جانوروں کا ساتھ دے اور اس کی طرح پرندوں میں پرند کی حیثیت سے رہنے لگے۔ اب پیر مرد صرف خدا کی حمد میں لگا رہتا ہے۔ جب زرتشت پیر مرد سے جدا ہو گیا تو اپنے آپ کہنے لگا کہ "یہ کس طرح ممکن ہے کہ پیر مقدس اب تک اس سے آگاہ نہیں کہ خدا کبھی کا چل بسا۔ شاید اس کی خبر اب تک جنگل میں نہیں پہنچی۔" اب اس کے مقابل اس تصور کو دیکھئے جو اقبال نٹشے کے متعلق پیش کرتے ہیں۔ نٹشے کی بلند ہمتی' اس کا شعور حیات' اس کے تصور اقدار' سب کا دار و مدار نفی غیب پر ہے۔ مقام کبریائی کا تو یہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اقبال نٹشے کے مقام کی تعبیر مولانا روم سے طلب کرتے ہیں - مولانا کے الفاظ ہیں:

درمیان ایں دو عالم جائے اوست
نغمہ دریں نہ اندر نائے اوست

اور اس کی بے راہ روی کی وجہ یہ تھی، اس کو صحیح رہ نما نہ ملا:

راہرو را کس نشان از رہ نداد
صد خلل در واردات اوفتاد
عاشقے در آہ خود گم گشتہ اے
سالکے در راہ خود گم گشتہ اے
آنچہ او جوید مقام کبریاست
ایں مقام از عقل و حکمت ماوراست
زندگی شرح اشارات خودی است
لا و الا از مقامات خودی است
او بہ لا درماند و تا الا نرفت
از مقام عبدہ بیگانہ رفت

اس کے بعد اقبال بڑی حسرت سے کہتے ہیں:

کاش بودے در زمان احمدے
تا رسیدے بر سرورے سرمدے

لیکن اقبال کا نٹشے اس شعور حیات کی ترجمانی نہیں کرتا جو نٹشے کے ساتھ مخصوص ہے اور جس کو ہم مغربی تہذیب کی تاریخ کے متن ہی میں رکھ کر سمجھ سکتے ہیں۔ نٹشے کا احتجاج ہے۔ مغرب کے خلاف اور عیسائیت کے خلاف۔ ماورائیت کے خلاف۔ نٹشے کوئی اخلاقی شعور نہیں رکھتا۔ بلاشبہ نٹشے کی فکر کے کچھ ایسے لمحات ہیں جو اقبال کے تصور انسان سے میل کھاتے ہیں۔ لیکن اس پر "لا" کا غلبہ ہے۔ لا کے ساتھ اس کو ہم "اللہ" کی منزل پر لانے کی کوشش کریں تو نٹشے نہیں رہتا۔ سینٹ ٹامس کے متعلق کہا گیا ہے کہ انہوں نے ارسطو کو بپتسما دینے کی کوشش کی۔ اس طرح اقبال کی بھی یہ کوشش ہے کہ نٹشے کو اسلام کے قالب میں دیکھیں۔ لیکن نٹشے کی ارضیت کسی قسم کی مصالحت کو قبول نہیں کرتی۔ وہ تو غیب کا سرے سے انکار کرتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم نٹشے پر سلبی حکم لگائیں۔ یہ کوشش ضرور کریں کہ نٹشے کی مخصوص حیثیت کا تحفظ رہے اور اس کی قلب ماہیت نہ ہو جائے۔ وہ ایک ثقافت کا ناقد ہے۔ وہ شعور حیات کی ایک خاص کیفیت کا علمبردار

ہے۔ اگر ہم اس کو اپنے افکار کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں تو ہم کو نٹشے کی مخصوص حیثیت سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ اس کی بلندی دنیا ہی کی بلندی ہے۔ اس کو انسان سے تو شکایت یہ ہے کہ اس نے زمین سے بے وفائی کی ہے اور ہماری کوشش یہ ہے کہ اس بے وفائی کو اور آگے بڑھائیں اور پھر سے نٹشے کو اس مقام پر لائیں جس کو اس نے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ نٹشے نے خود سختی سے متنبہ کیا ہے کہ مجھے وہ نہ سمجھو جو میں نہیں ہوں۔

جن مفکرین کو اقبال نے کلیدی اہمیت دی ہے اور جن کے خیالات و افکار سے وہ' خواہ مثبت طریقے سے خواہ سلبی طریقے سے' نپٹنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ان کی فکر کا ایک خاص پہلو ہے۔ مولانا روم سے اقبال نے راہ نمائی حاصل کی ہے۔ ان کے اتباع کو ایک کلیدی اہمیت دی ہے' لیکن جس رومی سے اقبال اپنی فکر کی تشکیل کرتے ہیں' وہ رومی کی ہمہ جہتی حیثیت نہیں ہے' بلکہ ایک خاص جہت ہے جس کا غلبہ ہم کو ان کی فکر میں ملتا ہے۔ اسی طرح جب وہ بار بار نٹشے کی طرف رجوع کرتے ہیں' اس کی فکر کو سراہتے ہیں اور اس کی کوتاہیوں کو مغربی ثقافت کے خلاف ایک شدید رد عمل سمجھتے ہیں۔ جس کی تلافی بھی ممکن ہوتی اگر اس کو مشرق سے روشنی ملتی۔ لیکن جس نٹشے سے وہ بحث کرتے ہیں وہ پورا نٹشے نہیں ہے۔ وہ صرف اس کا ایک پہلو ہے اور نٹشے کو اس کے سلبی اجزا سے علیحدہ کرنا اور اس کی سلبیت (Nihilism) کو ایک عبوری حیثیت دینا نٹشے کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ نٹشے بلاشبہ عیسائیت کا ناقد ہے لیکن وہ اس طرح کا ناقد نہیں ہے جس طرح اقبال نے بھی عیسائی اقدار کی تردید کی ہے۔ لیکن اقبال بہرصورت ایک مسلمان ہیں اور لا سے الا اللہ تک عبور ان کے لئے ایک فطری چیز معلوم ہوتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نٹشے کا "لا" ساز گار ماحول کا طالب تھا اور ایک ایسے راہنما کا طالب تھا جو اس کو لا سے الا اللہ تک لے جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لا سے الّا تک بہت بڑا فاصلہ ہے اور اس کو عبور کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ نٹشے کی بزرگی اصل میں اس کی منفی حیثیت میں ہی ملتی ہے۔ اگر ہم اس کے لا کو ایک عبوری حیثیت دیں تو پھر نٹشے' نٹشے نہیں رہتا۔ اس کی کائنات میں ماورا غائب ہے۔ وہ خدا کا انکار نہیں کرتا' جس طرح ایک عام منکر خدا کر سکتا ہے۔ وہ کسی دلیل سے وجود خدا کا بطلان نہیں کرتا' بلکہ یہ بطلان موجودہ انسان کے شعور کی تاریکیوں میں اپنی ایک اصل رکھتا ہے۔ خدا ایک صورت حال (situation) ہے جس کے خلاف وہ نبرد آزما

ہے۔ دنیا اس کو ماورا سے تہی نظر آتی ہے اور خدا کے نہ ہونے کو وہ بہت سنجیدگی سے قبول کرتا ہے۔ اس لئے نٹشے کی ارضیت یا اس کا یہ شعور کہ آدمی ایں جہانی ہے' ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا مقابلہ اس طرح نہیں کیا جا سکتا کہ ہم اس سلبیت کو ایک عبوری حیثیت دے دیں بلکہ اس سلبیت کو اپنے اندر سموتے ہوئے شعور ماورا کو ایک مقام دیں۔

ایک دلچسپ مثال نٹشے کے شعور اقدار کی جس کو اس نے جان بوجھ کر عیسائیت کے مقابل پیش کیا ہے' وہ ہمسایہ کی محبت سے متعلق اس کا سلبی رویہ ہے۔ عیسائیت کی پکار تو یہ ہے کہ "محبت کرو اپنے ہمسایہ سے" لیکن نٹشے ہمسایہ کی محبت کو خود اپنی محبت سمجھتا ہے۔ اس کا کہنا تو یہ ہے کہ "ہمسایہ کی محبت آدمی کو بلندی کی طرف نہیں لے جاتی۔" وہ ہمسایہ کی محبت کے مقابلہ میں دور کی محبت پر زور دیتا ہے۔ "محبت کرو' بُعد کی نہ کہ قرب کی۔ آنے والے کل کی نہ کہ گزرے ہوئے کل کی۔ اس فوق البشر کی جو ابھی ظاہر نہیں ہوا نہ کہ اس سایہ کی جو تمہارے ساتھ ہے۔" اس کا درد مستقبل کا درد ہے' لیکن ماضی کی کسک مستقبل کے امکانات کے لئے بے چین ہے۔ آدمی مستقبل کا حامل ہے۔

یہاں باوجود شدید اختلاف کے اقبال کی فکر اور نٹشے کے شعور میں قربت پیدا ہو جاتی ہے۔ دونوں ایک شاندار مستقبل کا خواب دیکھتے ہیں۔ انسان خود آنے والی اور بہتر نسل کا حامل ہے۔ کچھ تو نظریہ ارتقاء کے زیر اثر بھی دونوں اس کے قائل ہیں گو کہ دونوں نے اس کی تعبیر اپنے اپنے رنگ میں کی ہے۔ دونوں ایک برتر انسان کا خواب دیکھتے ہیں۔ ازدواجی رشتہ کے متعلق نٹشے کا مشہور قول ہے کہ "یہ دو ہستیوں کے مابین ایسا عہد ہے جس کا منشا ایک ایسی ہستی کو پیدا کرنا ہے جو دونوں سے بہتر ہو۔" اس کا مطلب یہ ہوا کہ اقبال اور نٹشے دونوں مستقبل کو ایک بلندی کی طرف متحرک دیکھتے ہیں۔ گو کہ نٹشے کے نظریہ دائمی تکرار سے اس میں ہم آہنگی پیدا کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اس کے باوجود دائمی تکرار کا نظریہ نٹشے کی نامکمل مابعد الطبیعاتی خیالات کا ایک حصہ ہے۔ اس پر کڑی نکتہ چینی اقبال نے اپنے "خطبات" میں کی ہے۔ ان کے نزدیک "دائمی تکرار ابدی تکون یا تغیر Becoming نہیں' بلکہ یہ وجود ہی کا قدیم تصور ہے جس نے تغیر و تکون کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔" بلاشبہ فوق البشر کا تصور (اسلامی تعبیر میں) آدمی کے امکانات کو اس کے موجودہ ظہور میں ختم ہونا نہیں مانتا' بلکہ ان امکانات کے نئے نئے مظاہر پیش نظر رکھتا ہے:

مردم از حیوانی و آدم شدم
پس چہ ترسم کہ زمردن کم شوم
رومی

حاشیہ

1- اس حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو پروفیسر شمل کی کتاب "Gabriel's Wing" ص 283 مطبوعہ 1963ء

(اقبال اور مغربی فکر، سری نگر: اقبال انسٹی ٹیوٹ، 1981ء، ص 7-36)

ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ

اقبال _____ حافظ اور گوئٹے کے حوالے سے

مشرق و مغرب کے یہ عظیم شاعر اگرچہ زمان و مکاں، دین و مذہب اور نسل و نژاد کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں، لیکن ان کے افکار و نظریات میں ایک قابل ملاحظہ ہم آہنگی اور مماثلت پائی جاتی ہے جس کی بہترین شہادت ہمیں علامہ اقبال کی کتاب "پیام مشرق" سے ملتی ہے جو انہوں نے گوئٹے کے "دیوان مغربی" کے جواب میں لکھی اور اس کے افکار سے استفادہ کا یوں اعتراف کیا:

صبا بہ گلشن دیمر سلام ما برساں
کہ چشم نکتہ وراں خاک آں دیار افروخت

گوئٹے اور اقبال دونوں اپنے ادوار کے پر آشوب تاریخی حوادث سے بہت متاثر ہوئے۔ گوئٹے اپنے دور کی سیاسی آشفتگی سے متنفر اور سخت پریشان تھا۔ نپولین کی شکست اور فرانس کے زوال کے بعد یورپ کے بہت سے ممالک ایک عجیب وحشت کا شکار ہو گئے تھے۔ روس کے سپاہی جرمنی میں تاخت و تاز کر رہے تھے۔ چنانچہ ان تمام علاقوں کی سیاسی، تمدنی اور اقتصادی زندگی بری طرح متاثر اور مجروح ہو رہی تھی۔ گوئٹے اس مسلسل پریشانی سے بہت وحشت زدہ تھا اور یورپی تمدن کے مستقبل کو مایوسی کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتا ہے:

"فرانس کی بد نصیبی کے نتیجے میں روس اب ایک عظیم ملک بن گیا ہے، جو

اپنی فطری خشونت اور وحشیانہ استبداد سے ہمیشہ متمدن یورپ اور انسانی ثقافت، فن اور تہذیب کے لئے خطرے کا باعث بنا رہے گا۔"

یہ مسلسل بے چینی اور پریشانی گوئٹے کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑے ہوئے ہے۔

علامہ اقبال کا زمانہ بھی استعمار، اضطراب اور آشوب کا زمانہ ہے، خصوصاً 1914ء سے 1918ء یعنی پہلی جنگ عظیم کا دور جہان سوزی اور آدم کشی کا ہولناک دور ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ انہی حالات میں اقبال "پیام مشرق" یعنی گوئٹے کا جواب لکھ رہے تھے۔

1919ء کے ایک خط میں سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

"فی الحال میں ایک مغربی شاعر کے دیوان کا جواب لکھ رہا ہوں جس کا تقریباً نصف حصہ لکھا جا چکا ہے۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کتاب کا آغاز پہلی جنگ عظیم کے دوران میں کر چکے تھے۔ "پیام مشرق" کی تصنیف کا محرک محض گوئٹے کا "دیوان مغربی" ہی نہ تھا، بلکہ درد ناک حالات کی وہ یکسانیت بھی تھی جو گوئٹے اور اقبال کو بیک صورت پیش آئی تھی اور جس نے دونوں حساس شاعروں کو نوع انسانی کے غم میں رلا دیا تھا۔ گوئٹے اور اقبال دونوں نے قومی تعصب اور نیشنلزم کے خلاف سخت آواز اٹھائی۔ گوئٹے کا زمانہ نیشنلزم کے آغاز کا زمانہ تھا اور اس کے ہولناک نتائج کو اس نے اچھی طرح سے درک کر لیا تھا۔

گوئٹے کی آفاقی اور ہمہ گیر طبیعت نے قومیت اور وطنیت کے پست تصور کو خطرناک قرار دیتے ہوئے انسانیت کی تکریم اور انسانی اخوت کو اپنا نصب العین بنایا۔ اس نے دسمبر 1814ء میں ایک خط میں لکھا:

"میں چاہتا ہوں اس دیوان کو آئینہ یا جام جہاں نما کی صورت دوں اور اس میں مشرق اور مغرب کو ایک دوسرے کے قریب لا کر دکھاؤں۔"

مئی 1815ء میں ایک خط میں تحریر کیا:

"میری آرزو اور مقصد یہ ہے کہ میں مشرق کو مغرب، ماضی کو حال اور ایرانی کو جرمن کے نزدیک کر دوں اور ان مناطق کے لوگوں کے طرز فکر، عادات اور رسوم کو ایک دوسرے سے آشنا کراؤں۔"

"مشرق و مغرب اللہ کے ہیں اور شمال و جنوب بھی۔"

گوئٹے نے اس عظیم مقصد کے لئے ایک "عالمی ادب" کا سہارا لیا۔ اس سلسلے میں وہ اگرچہ گوناگوں اقوام کے تمدن، طرز فکر اور مذہبی اختلافات سے دوچار ہوا لیکن بایں ہمہ اس نے اپنے سارے دیوان میں اس بنیادی نقطے پر مسلسل زور دیا کہ :

"مشرق اور مغرب ایک دوسرے سے جدا نہیں اور انہیں بہرصورت ایک دوسرے کے قریب ہونا چاہئے۔"

گوئٹے نے اس عالمی ادب کو وجود میں لانے کے لئے اس امر کی تاکید کی کہ باب ادب کو مکمل طور پر کھولنا چاہئے تاکہ مشرق کے عظیم الشان شعرا یعنی حافظ اور سعدی بھی اسی بزم میں شریک ہو سکیں۔ وہ ارباب دانش کو اس بات کی تلقین کرتا رہا کہ انہیں چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو قومیت کی چار دیواری میں محبوس نہ کریں بلکہ اپنی نظریں آفاقی بلندیوں پر رکھتے ہوئے تمام بنی نوع انسان کا احترام کریں۔

علامہ اقبال کے افکار کا بھی ایک نمایاں حصہ قومیت اور وطنیت کے پست تصورات کے خلاف جہاد پر مبنی ہے اور بنی نوع انسان کے احترام کی تعلیم کے لئے مختص ہے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں :

"وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو نسل و زبان اور رنگ سے بالا تر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کر دیا جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا، جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے امتیازات کو نہ مٹا دیا جائے گا، اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکیں گے اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندہ معنی نہ ہوں گے۔" :

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی
بندۂ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق
کفر و دین را گیر در پہنائے دل

دل اگر بگریزد از دل و اے دل

اقبال اور گوئٹے دونوں تعصبات سے متنفر اور وجدان کے مبلغ اور مفسر ہیں۔ دونوں اسلام کو ایک آفاقی اور جاودانی دین قرار دیتے ہیں۔ گوئٹے نے اسلام کے متعلق مغربی تعصبات کو دور کرنے کے لئے اپنے کلام یعنی "دیوان شرقی و غربی" میں جا بجا اسلام کی عظمت اور ابدیت کی تعریف کی ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

"اگر معنی اسلام اپنے امور اور ارادوں کو خدا کے سپرد کرنے کا نام ہے تو ہم سب مسلمان ہیں اور مسلمان ہی مریں گے۔"

قرآن پاک کے متعلق کہتا ہے:

"بعض لوگ قرآن کو قدیم اور بعض حادث تصور کرتے ہیں' مجھے اس راز کا علم نہیں اور نہ ہی میں اسے جاننا چاہتا ہوں کیوں کہ میرا تو یہی ایمان ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور مسلمان کے لئے بس اتنا ہی جاننا ضروری ہے۔"

گوئٹے نے اپنی نظم "نغمہ محمدؐ" میں اسلام کو ایک جامع' کامل اور متحرک دین قرار دیا ہے جس کا دامن غبار کہنگی سے پاک ہے اور وہ ہر دور کے جدید سے جدید تر تقاضوں کو پورا کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہے۔ گوئٹے اس نظم میں اسلام کے مقابل تمام ادیان و مذاہب کو محدود قرار دیتا ہے۔ نیز یہ کہ دین اسلام نے کس طرح پرانی رسوم و قیود کو توڑا' مال و دولت اور رنگ و نسل کے امتیازات کو نابود کیا۔ بندہ و آقا کی تمیز کو کالعدم قرار دے کر انسانیت کو مساوات اور حریت کے اصولوں سے روشناس کرایا' اقبال نے اس نظم کا "جوئے آب" کے نام سے نہایت خوبصورت انداز میں ترجمہ کیا ہے:

دریائے پر خروش ز بند و شکن گذشت
از تنگنائے وادی و کوہ و دمن گذشت
یکساں چو سیل کردہ نشیب و فراز را
از کاخ شاہ و بارہ و کشت و چمن گذشت
بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بے قرار
در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گذشت

اقبال لکھتے ہیں "گوئٹے نے اسلام پر بحیثیت ایک تعلیمی قوت کے تبصرہ کرتے ہوئے

ایکرمن سے کہا کہ تم نے دیکھا اس میں کوئی خامی نہیں' ہمارا کوئی نظام اور ہمیں پر کیا موقوف ہے کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

(تشکیل جدید الٰہیات' خطبہ اول' ص 13)

گوئٹے اور اقبال دونوں مغرب کی روحانیت سے محروم مادی فضا سے سخت متنفر اور گریزاں ہیں۔ گوئٹے کے لئے یہ غیر فطری ماحول ناقابل زیست بن گیا اور اس کے لئے اس ملک اور مسموم فضا میں دم لینا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ وہ یورپ سے فرار حاصل کر کے مشرق کی روشن اور پرروح وادیوں میں پناہ لینے کے لئے مجبور ہوا۔ اس حقیقت کی تائید میں ہائنا کہتا ہے:

"دیوان مغربی سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے سے حرارت کا متلاشی ہے۔"

مشرق کی جانب عزیمت کے سلسلے میں 1814ء میں گوئٹے نے اپنے دیوان کا سر آغاز "ہجرت" کے نام سے لکھا' جو مختصراً یوں ہے:

"شمال' مغرب اور جنوب پریشان اور آشفتہ ہیں' تخت و تاج برباد ہو رہے ہیں اور سلطنتوں کے پائے لرز رہے ہیں' تو اس دوزخ سے دور بھاگ جا اور دل انگیز مشرق کا رخ کر تاکہ وہاں روحانیت کی ٹھنڈی ہوا تجھ پر چلے' آکہ میں بھی اس راہ کا مسافر ہوں تاکہ مشرق کی پاک فضاؤں میں گم ہو جاؤں' آکہ میں بھی دیار مشرق کا مسافر ہوں تاکہ وہاں گڈریوں کے ساتھ ایک پاکیزہ اور صاف ستھری زندگی بسر کروں۔"

"اے حافظ! اس سفر دور و دراز میں اور ان وادیوں کے نشیب و فراز میں ہر جگہ تیرے آسمانی نغمے میرے ہم سفر ہیں اور میرے دل کے لئے موجب تسکین۔ اے حافظ مقدس! میری آرزو یہ ہے کہ میں سفر و حضر میں ہر جگہ تیرے ساتھ رہوں۔"

علامہ اقبال نے مغرب کی مادیت کو جس طرح مذموم ثابت کیا ہے' اسے یہاں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں عظیم شاعر فارسی ادب سے بے حد متاثر ہیں اور حافظ شیرازی دونوں کا نہایت پسندیدہ شاعر ہے۔ گوئٹے تو حافظ کا انتہائی شیفتہ تھا۔ بقول بیل شوسکی:

"بلبل شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی ہے' اس کو کبھی کبھی یہ بھی احساس ہوتا تھا کہ شاید میری روح ہی حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے۔"

علامہ اقبال پر فلسفہ حافظ کا جادو تو نہ چل سکا' لیکن اس کے اعجاز فن سے علامہ اقبال بے حد متاثر تھے۔ چنانچہ ایک خط میں اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ :

"جب میں حافظ کے رنگ میں ہوتا ہوں تو حافظ کی روح مجھ میں حلول کر آتی ہے۔"

"مئے باقی" کے عنوان سے "پیام مشرق" میں متعدد غزلیں علامہ نے حافظ کی پیروی میں کہی ہیں جو زبان اور بیان کے اعتبار سے بالکل رنگ حافظ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ یہ اہتمام البتہ انہوں نے خاص طور پر اس لئے کیا ہے کہ وہ گوئٹے کا جواب لکھ رہے تھے جو حافظ کا شیدائی' مرید اور مجذوب تھا اور کلام حافظ کو ابدیت کی طرح عظیم سمجھتا تھا۔

حافظ' گوئٹے اور اقبال تینوں آشفتہ اور پر اضطراب ادوار میں پیدا ہوئے' جن میں اقوام کا اخلاق پست اور عزائم محدود تھے' عیاری اور ریاکاری کا دور دورہ تھا۔ چنانچہ ان تینوں نے ماحول پر سخت تنقید کی ہے۔ گوئٹے اطمینان قلبی حاصل کرنے کے لئے مشرق کی طرف رخ کئے ہوئے ہے' حافظ گوشہ چمن میں نغمہ سرا ہے' البتہ اقبال اس آگ کا خلیل وار مقابلہ کرتا ہے۔

اقبال اور گوئٹے دونوں فلسفی شاعر ہیں۔ اقبال نے گوئٹے کو حکیم حیات کا نام دیا ہے اور وہ خود بھی حکیم حیات ہیں۔ انسانی زندگی کی مضمر صلاحیتوں کے اظہار کے لئے دونوں مفکر شاعر شیطان کے وجود کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ گوئٹے کے نزدیک انسانی فطرت کے حسن کی تکمیل شیطان کے بغیر ناممکن ہے۔ جب فاؤسٹ شیطان کو زجر و ملامت کرتا ہے' تو یہ جواب دیتا ہے :

"اے زمین کے بے بس فرزند! میری مدد کے بغیر تو کس طرح زندگی کے دن گزارتا' زندگی کے سوز و ساز اور ذوق و شوق کا سامان کہاں سے لاتا' اگر میں نہ ہوتا تو اس کرہ ارض کو چھوڑ کر بھاگ جاتا اور غاروں میں مارا مارا پھرتا یا الو کی طرح کسی پتھر پر بیٹھا کائی چاٹتا۔"

اقبال کے ہاں یہ مضمون مکرر بیان ہوا ہے۔ وہ خیر کے ارتقا اور تکامل کے لئے شر کو ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

مزی اندر جہانی کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

مکتب اقبال میں زندگی مسلسل تصادم ہے:

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید
ایں دو قوت از حیات آید پدید

اقبال اور گوئٹے دونوں زندگی کے دائمی ارتقا کے معتقد ہیں۔ گوئٹے نے اس خیال کو اپنی نظم "خلد نامہ" میں بیان کیا ہے۔ اقبال نے اس کا عمدہ اور آزاد ترجمہ "حور و شاعر" کے عنوان سے کیا ہے۔ شاعر بہشت میں حور کی طرف اس لئے متوجہ نہیں ہوتا کہ وہ ہمیشہ تازہ سے تازہ تر کی تلاش میں ہے کیونکہ زندگی نت نئے تقاضوں سے اپنا اظہار کرتی ہے:

چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروے
تپد آں زماں دل من پئے خوبتر نگارے
ز شرر ستارہ جویم، ز ستارہ آفتابے
سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

ان گوناگوں مناسبتوں اور مماثلتوں کی بنا پر علامہ اقبال اپنے اور گوئٹے کے درمیان ہم آہنگی کو "پیام مشرق" میں یوں بیان کرتے ہیں:

او ز افرنگی جواناں مثل برق
شعلہ من از دم پیران شرق
او چمن زادے، چمن پروردۂ
من دمیدم از زمین مردۂ
او چو بلبل در چمن "فردوس گوش"
من بہ صحرا چوں جرس گرم خروش
ہر دو دانائے ضمیر کائنات
ہر دو پیغام حیات اندر ممات

ہر دو خنجر صبح خند آئینہ فام
او برہنہ، من ہنوز اندر نیام

(مجموعہ مقالات "بین الاقوامی فکر اقبال سیمینار"۔ خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، لاہور 1996ء، ص 208-215)

غلام نبی خیال

اقبال، حافظ اور گوئٹے

حافظ شیرازی کے کلام کا شہرہ یورپ میں سب سے پہلے سترہویں صدی عیسوی میں پہنچا۔ 1690ء میں ٹامس ہائیٹر نے حافظ کی غزلوں کا لاطینی ترجمہ کیا اور اس کے بعد سر ولیم جونز نے 1770ء میں اس کی تیرہ غزلیات فرانسیسی زبان میں منتقل کیں اور لاطینی اور یونانی میں بھی ان کا ترجمہ کیا۔ انیسویں صدی شروع ہونے پر 1812ء میں جوزف وان ہمر پرگشتال نے جرمن زبان میں مکمل دیوان حافظ کا منظوم ترجمہ کیا، جو ایک ہزار سے زائد صفحات پر طبع ہوا۔ فی الحقیقت یہی ترجمہ حافظ وہ فن پارہ ہے جس نے ادبیات المانوی میں تحریک مشرقی کے محرکات پیدا کئے۔ اسی کے مطالعہ نے ممتاز جرمن شاعر گوئٹے کے فکر و خیال کے نئے جادوں اور اس کے شعوری اظہار کی نئی غزلوں کی نشان دہی کی اور اس طرح سے اس کا "دیوان مغربی" "West-oestlicher Divan" وجود میں آیا۔

1812ء میں گوئٹے کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھی لیکن اس کے سیماب صفت محسوسات اس پیرانہ سالی میں بھی نئی سرحدوں کی جستجو میں سرگرداں تھے اور اس کی بے قرار و مضطرب روح نئے خیالات کا منبع ڈھونڈ نکالنے کے لئے اسی طرح کوشاں تھی، جس طرح وہ عہد شباب کے آتشی دنوں اور شبنمی راتوں میں حسن و عشق کا جادو جگایا کرتا تھا۔ البتہ عمر کے اس مرحلے پر پہنچ کر گوئٹے میں یہ اہم تبدیلی رونما ہو گئی تھی کہ اس کا ذہن مغرب کے حیران کن طلسم کدوں، بے حس عجائبات اور بے جان پیکروں کا طواف کر کے

تنگ آ چکا تھا اور وہ احساس مغرب میں اظہار مشرق کا امتزاج پیدا کر کے اپنے فن میں ایک نیا لب و لہجہ پیدا کرنے کا خواہاں تھا۔ چنانچہ پرگشال کا یہی ترجمہ حافظ گوئٹے کے تصورات میں ایک انقلاب تازہ کا موجب بن گیا۔ اس نے ایسا محسوس کیا کہ اس فقط ایک دیوان میں ایک پوری اور نئی دنیا آباد ہے۔ اس طرح گوئٹے حافظ سے اس قدر متاثر ہوا کہ بعد میں اسے اپنی کئی نظمیں ایک ایسے لاشعور کی تخلیق معلوم ہوئیں جس نے بچپن ہی سے مشرقی فضاؤں کے شب و روز میں نشو و نما پائی ہو۔ دیوان مغربی میں شامل ایک نظم میں وہ حافظ کو بے حد محبت اور عقیدت سے یاد کرتا ہے۔ "مسرت فراق" (Bliss of Absence) عنوان کی ایک نظم کا مطالعہ کر کے بھی غیر شعوری طور پر محسوس ہوتا ہے کہ حافظ کے خیالات گوئٹے نے اپنی زبان میں پیش کئے ہیں۔ اس نظم کے تین بندیوں ہیں:

"اے جوان! آرزو کا رنگ اپنے ہاتھ میں لے' معشوق کی تصویر شب تنہائی میں کھینچ اور اس طرح تمام دن اس کو شعاع نظر کے ذریعہ اطمینان اور خوشی کا میٹھا رس پیتا رہ۔ اگرچہ محبت کے صحیح آداب کوئی بھی عاشق نہیں جانتا لیکن محبوب کا دیدار حاصل نہ ہو سکنے کی صورت میں دل کی مسرت ہر لحظہ بڑھتی ہی رہی ہے اور یہ پھول کبھی مرجھانے نہیں پاتا۔

فراق کی حالت میں' میں اپنے معشوق کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا اور یہی راز ہے میرے خوش و خرم اور اندوہ سے آزاد رہنے کا اور یہی ہے وہ جنت جس کا مقابلہ کوئی اور چیز نہیں کر سکتی۔ بن دیکھے معشوق کا آرزو مند رہنا' مجھے کیا معلوم کہ بعد میں ایک معصوم اور سچی فدائیت بن جاتا ہے اور یہی ہے وہ مقام جہاں شوق اپنی انتہائی سربلندی حاصل کر لیتا ہے۔

اے دوست! بادل بھی اس سبک سیری اور برق رفتاری سے آسمانی رفعتوں کو چھو نہیں سکتا جس سہولیت اور بے تکلفی سے کہ میرا دل ہجر و فراق کی حالت میں اڑتا اور پرواز کرتا ہے اور اس حسد یا رقابت کے جھگڑوں سے آزاد رہ کر اپنے محبوب سے پیار کرتا ہوں اور اس پیار میں اور کوئی بھی میرا شریک نہیں۔"

مغربی ماحول میں ساری زندگی گزارنے کے باوجود گوئٹے مشرقی فضاؤں کی نادیدہ وسعتوں میں اپنے تخیل اور فکر رسا سے پرواز کرنے کا متمنی تھا۔ اسے اس امر کا بھی یقین تھا کہ دنیائے مشرق ہی کی لطیف اور حیات بخش ہوائیں اس کے وجود فکری کو نئی تازگی اور برجستگی

عطا کر سکتی ہیں۔ اسی لئے کہتا ہے :

North and West and South are breaking

Thrones are bursting, kingdoms shaking,

Flee then, to the essential East,

Where on patriarch's air you'll feast!

گوئٹے کے ان محسوسات اور واردات نے جب "دیوان مغربی" کی شکل میں ایک پیکر کی صورت اختیار کر لی تو اس نے اس مجموعہ کلام کا نام بھی حافظ کے ساتھ بے پناہ عقیدت کی مناسبت کے لحاظ سے "دیوان" ہی رکھا۔ گوئٹے نے اس کے مختلف ابواب کے فارسی ہی میں عنوانات بھی مقرر کئے ہیں مثلاً حکمت نامہ' تیمور نامہ' ساقی نامہ' عشق نامہ' مغنی نامہ وغیرہ۔ مشہور اسرائیلی شاعر ہنری ہائینے کا کہنا ہے کہ "مغربی دیوان ایک گلدستہ عقیدت ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے ..... اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے سے حرارت کا متلاشی ہے۔"

گوئٹے کے ایک سوانح نگار بیل شوسکی نے گوئٹے کے فکر و خیال پر حافظ کے اثر کلی کی کیفیت یوں بیان کی ہے "بلبل شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی۔ اس کو کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ شاید میری روح ہی حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے۔ وہی زمینی مسرت' وہی آسمانی محبت' وہی سادگی' وہی عمق' وہی جوش و حرارت' وہی وسعت مشرب' وہی کشادہ دلی اور وہی قیود و رسوم سے آزادی۔ غرض کہ ہر بات میں ہم اسے حافظ کا مثیل پاتے ہیں۔ جس طرح حافظ لسان الغیب اور ترجمان اسرار ہے' اسی طرح گوئٹے بھی ہے اور جس طرح حافظ کے بظاہر سادہ الفاظ میں ایک جہان معنی آباد ہے' اسی طرح گوئٹے کے بے ساختہ پن میں بھی حقائق و اسرار جلوہ افروز ہیں۔ دونوں نے امیر و غریب سے خراج تحسین وصول کیا۔ دونوں نے اپنے اپنے وقت کے عظیم الشان فاتحوں کو اپنی شخصیت سے متاثر کیا (یعنی حافظ نے تیمور کو اور گوئٹے نے نپولین کو(۱)) اور دونوں عام تباہی اور بربادی کے زمانے میں طبیعت کے اندرونی اطمینان و سکون کو محفوظ رکھ کر اپنی قدیم ترنم ریزی جاری رکھنے میں کامیاب رہے۔"

عبدالرحمان طارق کا بھی یہی خیال ہے کہ "یہ کلام حافظ ہی کا پیدا کردہ ذوق و شوق تھا

جس کے تقاضے سے گوئٹے نے فارسی کے بعض دیگر ممتاز اساتذۂ شعر کے کلام کا بھی مطالعہ کیا۔ آخر عمر میں وہ قرآن مجید اور دیوان حافظ کا بکثرت مطالعہ کیا کرتا تھا۔ کلام اللہ کی روحانی، اخلاقی اور تعمیری عظمت کو تسلیم کرتا تھا۔ آخر ان چیزوں کی عقیدت و محبت نے ایسی نظموں یعنی "دیوان مغربی" کی صورت اختیار کی جن میں گوئٹے فی الواقع مشرق کے سینے سے روحانی حرارت کا متلاشی دکھائی دیتا ہے۔ گوئٹے نے بعض جگہ احادیث کے تراجم بھی کئے ہیں چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے کہ جنت میں صرف تین جانور داخل ہو سکیں گے ایک ابو ہریرہؓ کی بلی، دوسرے اصحاب کہف کا کتا اور تیسرے حضرت عیسیٰؑ کا گدھا.... وہ فلسفہ اور نفسیات کو شعر سے الگ نہیں ہونے دیتا اور اس لحاظ سے اس کا انداز مرزا غالب سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔" غالباً اسی لئے اقبال نے گوئٹے کو اپنے محبوب شاعر غالب کا ہم نوا قرار دے کر کہا ہے۔

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

دیوان حافظ نے گوئٹے کو وجدان بخشا اور اس نے "دیوان مغربی" تصنیف کیا۔ مغربی دیوان کے مطالعے سے اقبال کو فیضان حاصل ہوا اور اس نے "پیام مشرق" کی تخلیق کی۔ اقبال نے "پیام" کو "در جواب دیوان شاعر المانوی" کہہ کر خود ہی کہا ہے کہ "اس کی تصنیف کا محرک جرمن حکیم حیات گوئٹے کا مغربی دیوان ہے۔" عبدالرحمان طارق "پیام مشرق" کے اردو ترجمہ کے پیش لفظ میں کہتا ہے: "شاعر مشرق نے "پیام مشرق" کی بنیاد اسی احساس کے تحت رکھی تھی کہ مغرب کی سرد روحانیت کو مشرق کے سینہ گرم سے کچھ پرسوز نالے اور نغمے عطا کئے جائیں تاکہ وہ محض مادہ پرستی سے اجتناب کر کے اپنی روحانی زندگی کی تجدید و اصلاح بھی کر سکے۔ علامہ اقبال کو یورپ کی اس بڑھتی ہوئی روحانی تشنگی کا اندازہ یوں تو وہاں کے متعدد صاحب بصیرت مصنفین کی تحریروں سے ہوا لیکن ان کی خاص توجہ اور دلچسپی کا مرکز گوئٹے کا دیوان تھا جس کی بہت سی نظمیں مشرقی ادبیات اور خصوصاً فارسی ادبیات سے متاثر دکھائی دیتی ہیں۔" اس مجموعہ کے دیباچہ میں اقبال نے خود لکھا ہے کہ " اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی، مذہبی اور ملی حقائق کو پیش نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ اس سے سو سال پیشتر کی جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں

کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوام عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس لئے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں' ایک بہت بڑے تمدنی اور روحانی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔ جس کا ایک دھندلا سا خاکہ ہمیں حکیم آئن سٹائن اور برگساں کے تصانیف میں ملتا ہے۔ یورپ نے اپنے علمی' اخلاقی اور اقتصادی نصب العین کے خوفناک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے ہیں اور سایزینٹی (سابق وزیر اعظیم اطالیہ) سے "انحطاط فرنگ" کی دل خراش داستان بھی سن لی ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کے نکتہ رس مگر قدامت پرست مدبرین اس حیرت انگیز انقلاب کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے جو انسانی ضمیر میں اس وقت واقع ہو رہا ہے۔ خالص ادبی اعتبار سے دیکھیں تو جنگ عظیم کی کوفت کے بعد یورپ کے قوائے حیات کا اضمحلال ایک صحیح اور پختہ ادبی نصب العین کی نشو و نما کے لئے نامساعد ہے بلکہ اندیشہ ہے کہ اقوام کی طبائع پر وہ فرسودہ' ست روگ اور زندگی کی دشواریوں سے گریز کرنے والی عجمیت غالب نہ آ جائے جو جذبات قلب کو افکار دماغ سے متمیز نہیں کر سکتی..... مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوام شرق کو یہ محسوس کر لینا چاہئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی' جب تک اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو(2)۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے **ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا مابانفسھم** کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے' زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنی فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔"

"پیام" میں اقبال نے گوئٹے کے فن پر اپنی قدر شناسی کے موتی لٹائے ہیں۔ ایک جگہ وہ اس نکتہ دان المانوی کو باد صبا کے ذریعہ یہ سلام بھیجتا ہے:

صبا بہ گلشن ویمر سلام ما برساں
کہ چشم نکتہ وران خاک آں دیار افروخت

ایک اور مقام پر اقبال نے گوئٹے کی عظمت اپنے پیر رومی کی زبان سے تسلیم کروائی ہے۔ جب گوئٹے جنت میں مولانا روم سے ملاقی ہو کر اسے حکیم فاؤسٹ کا قصہ سناتا ہے:

نکتہ دان المنی را در ارم
صحبتے افتاد با پیر عجم
شاعرے کو ہمچو آں عالی جناب
نیست پیغمبر ولے دارد کتاب
خواند بر دانائے اسرار قدیم
قصہ پیمان ابلیس و حکیم

اور رومی گوئٹے کو ان الفاظ میں خراج تحسین ادا کرتا ہے:

فکر تو در کنج دل خلوت گزید
این جہان کہنہ را باز آفرید
سوز و ساز جاں بہ پیکر دیدۂ
در صدف تعمیر گوہر دیدۂ
ہر کسے از رمز عشق آگاہ نیست
ہر کسے شایان آں درگاہ نیست
داند آں کو نیک بخت و محرم است
زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم ست

اسی "فاؤسٹ" کا مطالعہ کر کے اقبال نے ایک بار کہا تھا کہ "اس سے بڑھ کر کمال فن خیال میں نہیں آ سکتا۔"

"دیوان مغربی" کی اشاعت سے کچھ عرصہ قبل گوئٹے نے "نغمہ محمدؐ" کے نام سے ایک مشہور نظم تخلیق کی تھی، جس میں اس نے زندگی کے اسلامی تخیل کی تشریح کرنے کی کوشش کی تھی۔ عیسائیت کا پیروکار ہونے کے باوجود گوئٹے اس فن پارے میں اسلام کی اس قدر تعریف و تحسین کرتا ہے کہ اس کے خیال میں یہ مذہب ایک ایسی رواں دواں، صاف و شفاف اور تر و تازہ آب جُو کی شکل اختیار کر لیتا ہے، جو اپنی روانی اور رفتار سے کوہ و دمن میں نغمے جگاتی ہے، جس کی سیمائے بے داغ آئینے کی طرح بے رنگ و غبار ہے اور جس کی

راہوں میں بہاریں کھلتی ہیں۔ یہ آب جُو بعد میں ایک دریا بن جاتی ہے' جو سارے بند توڑ کر نشیب و فراز کو یکساں کر دیتا ہے۔ یہ دریائے بے تاب تند و تیز اور جگر سوز ہے اور ہر زمانے میں کہن کو ترک کر کے تازہ کا دامن تھام لیتا ہے۔ اقبال نے "جوئے آب" کے عنوان سے اس نظم کا آزاد ترجمہ کر کے اس شعر میں نفس مضمون کا خاکہ پیش کیا ہے:

زی بحر بے کرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

"دیوان مغربی" میں جو نظم "حور و شاعر" کے نام سے موسوم ہے' اقبال نے پیام میں اس کا منظوم جواب اسی عنوان سے لکھا ہے جو ایک حور اور شاعر کے بین مکالمے کی صورت میں ہے۔ اس نظم کے مطالعہ کے بعد قاری اقبال کے ذہن پر "دیوان مغربی" سے زیادہ "فاؤسٹ" کے اثرات کو زیادہ واضح اور نمایاں طور پر دیکھتا ہے کیونکہ اس شاہ پارے کا شاعر انہی محسوسات اور جذبات کا ترجمان ہے جن کے والہانہ اثر کے تحت فاؤسٹ نے شیطان کے ساتھ ایک معاہدے کے بعد بیس سال تک عیش و عشرت کی ساری بہاریں لوٹنے کے باوجود سادگی اور صداقت کی خلوت گاہ میں آباد ہونے کی تمنا کی تھی۔ شاعری کی زبان سے ادا کیے گئے یہ چند اشعار اسی فلسفے کی گرہ کشائی کرتے ہیں' جو گوئٹے کے اس شہرہ آفاق کردار کا محور رہا ہے:

چہ کنم کہ فطرت من بہ مقام در نسازد
دل ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروئے
تپد آں زماں دل من پے خوبتر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
سر منزلے ندارم کہ میرم از قرارے
دل عاشقان میرد بہ بہشت جاودانے
نہ نوائے دردمندے' نہ غمے' نہ غم گسارے

اقبال نے "پیام مشرق" افغانستان کے فرمانروا امیر امان اللہ کے نام معنون کی ہے' جو بقول شاعر "اپنی فطری ذہانت و فطانت سے اس نکتے سے بخوبی آگاہ معلوم ہوتے ہیں" کہ "

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش قابل احترام ہے جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالا تر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو قابل احترام ہے۔" اپنے انتساب میں بھی اقبال نے گوئٹے کے فلسفہ اور تخیل کا تجزیہ کیا ہے جہاں وہ مشرق اور مغرب کے ماحول کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے گوئٹے کو "چمن زادہ و چمن پروردہ" اور اپنے آپ کو "زمین مردہ کی مخلوق" قرار دیتا ہے۔ گوئٹے کے تصورات پر جس طرح ایرانی ادب اور خاص کر کلام حافظ ایک آتشی تاثر کے ساتھ چھا گیا تھا' اس کے پیش نظر اقبال نے اسے "قتیل شیوہ ہائے پہلوی" کہہ کر پکارا ہے۔ یہ موازنہ ان رواں اور پربیان اشعار میں کیا گیا ہے :

پیر مغرب شاعر المانوی
آں قتیل شیوہ ہائے پہلوی
بست نقش شاہدان شوخ و شنگ
داد مشرق را سلامے از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغام شرق
ماہ تابے ریختم بر شام شرق
تاشناسائے خودم' خود بیں نیم
با تو گویم او کہ بود و من کیم
او ز افرنگی جواناں مثل برق
شعلہ من از دم پیران شرق
او چمن زادے' چمن پروردۂ
من دمیدم از زمین مردۂ
او چو بلبل در چمن "فردوس گوش"
من بصحرا چوں جرس گرم خروش
ہر دو دانائے ضمیر کائنات
ہر دو پیغام حیات اندر ممات
ہر دو خنجر صبح خند' آئینہ فام

او برہنہ، من ہنوز اندر نیام
ہر دو گوہر ارجمند و تاب دار
زادۂ دریائے ناپیدا کنار
او ز شوخی در تہہ قلزم تپید
تا گریبان صدف را بر درید
من بہ آغوش صدف تابم ہنوز
در ضمیر بحر نایابم ہنوز

"پیام" کی اشاعت کے بعد سروجنی نائیڈو نے اقبال کو ایک مفصل خط لکھا جس میں اقبال کا شکریہ ادا کیا گیا کہ اس نے بلبل ہند کو وطنیت کے قفس سے آزاد کرا کے سارے جہاں کا چمنستاں بخش دیا اور اس مجموعہ پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر آر۔ اے۔ نکلسن نے اقبال کے نام ایک مراسلے میں تحریر کیا کہ "اس میں جدید اور حقیقی خیالات موجود ہیں اور یہ گوئٹے کے دیوان کا قابل تحسین جواب ہے۔"

اقبال کا اولیں مجموعہ کلام "اسرار خودی" فارسی میں 1915ء میں اشاعت پذیر ہوا، جس میں شاعر نے حافظ شیرازی کے بارے میں یہ خیالات ظاہر کئے تھے:

ہوشیار از حافظ صہبا گسار
جامش از زہر اجل سرمایہ دار
نیست غیر از بادہ در بازار او
از دو جام آشفتہ شد دستار او
چوں خراب از بادۂ گلگوں شود
مایہ دار حشمت قاروں شود
مفتی اقلیم او مینا بدوش
محتسب ممنون پیر مے فروش
طوف ساغر کرد مثل رنگ مے
خواست فتویٰ از رباب و چنگ و نے
تخم نخل آہ در کوہسار کاشت

طاقت پیکار باخسرو نداشت
مسلم و ایمان او زنار دار
رخنہ اندر وینش از مژگان یار
آپختان مست شراب بندگی است
خواجہ و محروم ذوق خواجگی است
دعوی او نیست غیر از قال و قیل
دست او کوتاہ خرما پر نخیل
آں فقیہہ ملت مے خوار گاں
آں امام امت بے چارگاں
گوسفند است و نوا آموخت است
عشوہ و ناز و ادا آموخت است
دل ربائی ہائے او زہر است و بس
چشم او غارت گر شہر است و بس
ضعف را نام توانائی دہد
ساز او اقوام را اغوا کند
نغمہ چنگش دلیل انحطاط
ہاتف او جبرئیل انحطاط
از تخیل جنتے پیدا کند
مر ترا برنیستی شیدا کند
مار گلزارے کہ دارد زہر ناب
صید را اول ہمیں آرد بخواب
عشق با نخرنگاہش خود بخش است
کشتن مشکل کہ مار خانگی است
حافظ جادو بیاں شیرازی است
عرفی آتش زبان شیرازی است

ایں سوئے ملک خودی مرکب جہاند
آں کنار آب رکن آبا واماند
ایں قتیل ہمت مرادنہ
آں زرمز زندگی بیگانہ
دست ایں گیرد ز انجم خوشہ
چشم آں از اشک دارد توشہ
محفل او در خورا احرار نیست
ساغر او قابل ابرار نیست
بے نیاز از محفل حافظ گزر
الحذر از گوسفنداں الحذر

یہ اشعار منظر عام پر آتے ہی صوفی حلقوں میں مخالفت کا ایک طوفان بپا ہوا اور اقبال کو طرح طرح سے مورد الزام گردانا گیا کہ اس نے حافظ کے نام یہ ہتک آمیز اشعار کہہ کر بجائے خود تصوف کی توہین کی ہے۔ اقبال نے ان اعتراضات کا جواب چند مضامین کی شکل میں تحریر کیا جو "وکیل" (امرتسر) اور چند دیگر اخباروں میں شائع ہوئے لیکن اس کے باوجود نکتہ چینی کی آگ بھڑکتی ہی گئی۔ اقبال کے نکتہ چینوں میں اکبر الہ آبادی اور خواجہ حسن نظامی تک شامل ہو گئے اور پنجاب کے ایک شاعر فضلی نے "اسرار خودی" کے جواب میں ایک مکمل مثنوی شائع کی، جس کا نام "راز بے خودی" رکھا گیا تھا اور جس میں اقبال کو رہزن اسلام، دشمن اسلام اور اسی قسم کے ناموں سے پکارا گیا۔

"اسرار" کا دوسرا ایڈیشن جب شائع ہوا، تو معترضین یہ دیکھ کر حیران و مطمئن ہو گئے کہ اس سے حافظ کے بارے میں یہ اشعار حذف کئے گئے تھے۔ اقبال سے جب اس کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے جواب دیا کہ "اس سے میرا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا ہے۔" 1919ء میں وہ مولانا اسلم جیراجپوری کے نام ایک خط میں لکھتا ہے "حافظ کے متعلق میرے اشعار کا مقصد محض ایک ادبی اصول کی تشریح کرنا تھا۔ حافظ کی ذات یا اس کے عقائد سے مجھے کچھ لینا دینا نہیں مگر لوگ اس نازک فرق کو محسوس نہ کر سکے۔" اور اس سے چار سال قبل خان بہادر منشی سراج الدین خاں کے نام ایک اور مراسلے میں اقبال نے اس مسئلے کی یوں

وضاحت کی تھی۔ "ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین و غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹیریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں اس حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں' جس کی اشاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے ہوئی۔ صوفی لوگوں نے اسے تصوف پر ایک حملہ تصور کیا ہے اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے۔ انشاء اللہ دوسرے حصے میں دکھاؤں گا کہ تصوف کیا ہے اور کہاں سے آیا۔ اور صحابہ کی زندگی سے کہاں تک ان تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے' جن کا تصوف حامی ہے۔"

مولانا عبدالسلام ندوی فلسفہ حافظ کے اس رد عمل اور اقبال کے نظریہ تصوف کی یوں توضیح کرتے ہیں ----- "وہ اسلامی تصوف کے مخالف نہ تھے بلکہ عجمی تصوف کے مخالف تھے اور عجمی تصوف کے مسائل میں سے انہوں نے خاص طور پر ان کو لیا تھا' جن سے اسلام کی عملی اور مجاہدانہ طاقت کو صدمہ پہنچتا تھا۔ شعرائے ایران نے ان مسائل کو اور بھی زیادہ رنگین اور دلکش پیرائے میں بیان کیا تھا' جس نے ڈاکٹر صاحب (یعنی اقبال) کے نزدیک مسلمانوں کی عملی طاقت کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا تھا اور وہ اپنی تبلیغی شاعری سے اسی نقصان کی تلافی کرنا چاہتے تھے' اس لئے ان کو نفس تصوف سے نہیں بلکہ صوفیانہ شاعری سے پرخاش تھی۔" چنانچہ اقبال سراج الدین پال کو دو خطوط میں لکھتا ہے۔ "شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعرا ہیں' جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفے کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبیعت موجود تھا اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصے تک اس کا نشو و نما نہ ہونے دیا' تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا یا بالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدۃ الوجود پر تھی۔ ان شعرا نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے۔ اگر اسلام افلاس کو برا کہتا ہے تو حکیم سنائی افلاس کو اعلیٰ درجہ کی سعادت قرار دیتا ہے۔ اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لئے ضروری تصور کرتا ہے تو شعرائے عجم اس شعار اسلام میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں مثلاً:

غازی زپے شہادت اندر تگ وپوست
غافل کہ شہید عشق فاضل ترازوست
در روز قیامت ایں باد کے ماند
ایں کشتہ دشمن است و آں کشتہ دوست

یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے بہت عمدہ ہے اور قابل تعریف۔ مگر انصاف سے دیکھئے تو جہاد اسلامیہ کی تردید میں اس سے زیادہ دلفریب اور خوبصورت طریقہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر نے کمال یہ کیا ہے کہ جس کو اس نے زہر دیا ہے' اس کو احساس بھی اس امر کا نہیں ہو سکتا ہے کہ مجھے کس نے زہر دیا ہے بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ مجھے آب حیات پلایا گیا ہے۔ آہ مسلمان کئی صدیوں سے یہی سمجھ رہے ہیں..... یہ حیرت کی بات ہے کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا۔ جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو پھر اس قوم کا نقطہ نگاہ بدل جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترک دنیا موجب تسکین۔ اس ترک دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی و کاہلی اور شکست کو چھپایا کرتی ہیں۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔"

حافظ' گوئٹے اور اقبال کے تقابلی مطالعہ کے بارے میں یہاں اس امر کی نشان دہی کرنا لازمی ہے کہ ادبیات عالم میں کسی بھی زمانے میں شاید ہی اس طرح سے اثر و قبول کا یہ سلسلہ دنیا کے اس ادب العالیہ کی تخلیق کا باعث بنا ہو' جس میں "دیوان مغربی" اور "پیام مشرق" کا شمار ہوتا ہے۔ دیوان حافظ کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک ایرانی بادشاہ نے چار سخن شناسوں سے کہا کہ وہ اس دیوان کا الگ الگ انتخاب تیار کریں۔ بعد میں ان کے منتخبہ اشعار کو خوش نویس کے حوالے کیا گیا تو پتہ چلا کہ یہ چاروں انتخاب دراصل مکمل دیوان حافظ ہے اور اس واقعے سے متعلق مرزا صائب کا یہ شعر مشہور ہے کہ :

ہلاک حسن خداداد او شوم کہ سراپا
چو شعر حافظ شیراز انتخاب ندارد

دیوان حافظ کے مطالعہ نے گوئٹے کے بادۂ مغربی کو خمار مشرقی سے اس طرح سرشار کیا

کہ اس کی نوائے سروش دیوان مغربی کے پیکر میں ڈھل گئی' جس کے بارے میں ہائینے کہتا ہے کہ "اس دیوان کے سوائے جرمن شعرا کا مشرقی کلام کوئی بڑی وقعت نہیں رکھتا ہے۔"

اور اقبال نے جب یہی "دیوان مغربی" پڑھا' تو اس نے "پیام مشرق" کی تخلیق کی جو اس کی شعری حیثیت اور شاعرانہ لطافت کا اعلیٰ ترین شاہکار اور شاعرانہ شخصیت کا اثر انگیز اظہار ہے۔

حواشی

1- کئی مؤرخین کی رائے میں حافظ کی امیر تیمور سے ملاقات ہی نہیں ہوئی ہے' کیونکہ تیمور نے شیراز 1392ء تک فتح کیا اور حافظ زیادہ سے زیادہ 1391ء تک بقید حیات رہا۔ چند تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ تیمور نے حافظ کو 1387ء ہی میں اپنے پاس بلایا تھا۔ بہرحال اب یہ واقعہ اس قدر غلط العام ہو گیا ہے کہ اس کے بغیر کوئی تذکرۂ حافظ مکمل معلوم نہیں ہوتا۔ اقبال بھی حافظ اور تیمور کی ملاقات کو ممکن قرار نہیں دیتا ہے۔

2- دل من روشن از سوز دروں است
جہاں بین چشم من از اشک خوں است
ز رمز زندگی بیگانہ تر بادا
کسے کو عشق را گوید جنوں است

(محفل اقبال' ترتیب رشید نازکی و محمد اسد اللہ وانی' سری نگر 1978ء' ص 135-149)

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

ابلیس _____ اقبال اور گوئٹے کی نظر میں

عالمی ادب میں ابلیس کے تصور کی بالعموم دو روایتی شکلیں ملتی ہیں۔ ایک مذہبی حکایت یا اسطور سے ماخوذ ہے، جس کی بنا پر ابلیس آدم کا سجدہ کرنے سے انکار کر کے فرمان الٰہی کی عدولی کرتا ہے اور فرشتوں کی سرداری کے مرتبے سے گر کر دنیا میں گمراہی، گناہ اور نافرمانی کی تاریک قوت بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کی دوسری شکل انسان میں انفرادی یا اجتماعی سطح پر خیر کے مقابلے میں شر کی قوت سے متعلق ہے۔ خیر اور شر کے تصادم میں شر کی قوت وقتی طور پر خیر کو پامال کرتی ہے مگر بالآخر خیر کی قوت بحال ہو جاتی ہے۔ اقبال اور گوئٹے کے یہاں ان مروجہ تصورات کے علاوہ اس کی بعض نئی جہات بھی ابھرتی ہیں، جو اس موضوع کو فکر انگیز اور دلچسپ بناتی ہیں۔ قبل اس کے کہ ان جہات پر روشنی ڈالی جائے یہ مناسب ہے کہ ان دونوں شعرا کے یہاں ابلیسیت کے موضوع سے لگاؤ اور اس کے عملی برتاؤ کے اسباب کا جائزہ لیا جائے۔

اقبال کی شاعری کا اکثر و بیشتر حصہ موضوعی نوعیت کا ہے۔ انہوں نے شعوری طور پر مختلف موضوعات مثلاً وطنیت، مغربی تہذیب، مرد مومن، جدید انسان اور شوکت ماضی پر طبع آزمائی کی ہے۔ ابلیس بھی ان کے یہاں شعوری طور منتخبہ موضوع کے طور پر ابھرتا ہے۔ اس موضوع کے برتاؤ میں بھی دیگر موضوعات ہی کی طرح وہ کئی مقامات پر خطابت اور سخن طرازی سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔ مگر دو ایک جگہوں پر یہ موضوع ان کی تخلیقی شخصیت کا

آب و رنگ کشید کر کے شعری اعتبار کا درجہ حاصل کرتا ہے۔ اس لئے کمیت کے طور پر محدود ہونے کے باوجود کیفیت کے لحاظ سے دعوت مطالعہ دیتا ہے۔ "جاوید نامہ" کا وہ حصہ جس کا عنوان "خواجہ اہل فراق" ہے' شیطان کی سیمیائی نمود اور مؤثر گفتگو سے جاذب توجہ بن جاتا ہے۔ دوسری نظم "بال جبریل" میں جبریل و ابلیس ہے۔ یہ نظم ڈرامائیت کے بعض لازمی عناصر مثلاً کردار' واقعہ' فضا آفرینی اور مکالمہ کے علاوہ انتخاب الفاظ' آہنگ' علامت نگاری اور اختصار سے تخلیقی درجہ حاصل کرتی ہے۔ چنانچہ ابلیس سے متعلق جملہ نظموں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی اس موضوع سے ذہنی مناسبت کے دو خاص محرکات رہے ہیں۔ اول میلاد آدم اور انکار ابلیس کی قرآنی تلمیح' دوسرے گوئٹے کا فاؤسٹ۔ ان دونوں محرکات کی توثیق اقبال خود کرتے ہیں۔ میلاد آدم اور انکار ابلیس کے واقعہ پر انہوں نے "تسخیر فطرت" کے عنوان سے نظم لکھی ہے جو "پیام مشرق" میں ہے جس میں ابلیس دعویٰ کرتا ہے:

نوری ناداں نیم' سجدہ بہ آدم برم
او بہ نہاد اسیر خاک' من بہ نژاد آذرم

اور گوئٹے کے "فاؤسٹ" کے مطالعے اور اس سے اثر پذیری کا ثبوت "جلال و گوئٹے" میں ملتا ہے' جو "پیام مشرق" میں ہے:

خواند بر دانائے اسرار قدیم
قصہ پیمان ابلیس و حکیم

اقبال اس نظم کے فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں: "اس ڈرامے میں شاعر نے حکیم فوسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کے امکانی نشو و نما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمال فن خیال میں نہیں آ سکتا۔"

مذکورہ بالا محرکات کے علاوہ اقبال کی ابلیسیت سے وابستگی ان کے زندگی کی پیچیدگیوں کے گہرے شعور سے مربوط ہے۔ انسان اخلاقی' معاشرتی اور فکری طور پر خیر اور شر کے مسلسل تصادم سے گزرتا ہے۔ داخلی طور پر بھی وہ نیکی اور بدی کی قوتوں کے ٹکراؤ کا شکار ہوتا ہے اور اس کی شخصیت شکست کی زد میں آتی ہے اور وہ المیہ کردار بن جاتا ہے۔ ابلیسیت کا یہ نفسیاتی تصور ان کی پوری شاعری میں رچا بسا ہے۔ اقبال کو سیاسی سطح پر بھی

ابلیسوں کی کمی نظر نہیں آتی۔ "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں کہتے ہیں :

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہہ افلاک

جہاں تک گوئٹے کا تعلق ہے' اس کے یہاں ابلیس کے موضوع سے لگاؤ کے محرکات مسیحی نقطہ نظر سے واقفیت کے علاوہ ملٹن کے فردوس گمشدہ کے مطالعے میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ خاص طور پر اس نے قدیم جرمن قصے یعنی ڈاکٹر فاسٹس' جسے سولھویں صدی میں پہلی بار مارلو نے "ڈاکٹر فاسٹس" میں ڈرامائی صورت عطا کی' سے تحریک پائی ہے۔ یہ کہانی جرمن میں اپنی ابتدائی شکل میں نثر میں 1587ء میں چھپی تھی اور 1594ء میں اس کی ڈرامائی شکل جو اسے مارلو نے دی تھی' سٹیج ہوئی۔ گوئٹے نے مارلو کے ڈرامے کا مطالعہ اشتیاق سے کیا ہے اور How greatly it is all planned کہہ کر ڈرامے کی ساخت کو سراہتے ہوئے اس سے متاثر ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اقبال کے نظام فکر میں ابلیسیت کی کیا معنویت ہے۔ اس ضمن میں دو اہم امور کی جانب متوجہ ہونا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ اقبال کی شاعری اور فکر کا محور بنیادی طور پر انسان ہے۔ وہ موجودہ مشینی تہذیب کے فروغ کے نتیجے میں انسانی شخصیت کی پامالی اور تباہی سے حد درجہ متردد ہیں' لیکن انسان کی ذہنی اور روحانی قوتوں سے مایوس نہیں۔ وہ جیسا کہ ان کے "خطبات" سے بھی ظاہر ہوتا ہے' انسان کو کائنات کی عظیم تخلیقی قوتوں کا نمائندہ قرار دیتے ہیں' جو احساس وجود کی بدولت تسخیر کائنات کی غیر معمولی صلاحیتوں سے متصف ہے' انسان کو اپنے وجود کا احساس کرنے کے لئے کتنی ہی مزاحم اور مخالف قوتوں میں اس کے توہمات' عقائد' روایات' فکر' جکڑ بندیوں اور سب سے بڑھ کر اپنی فطری کجی یعنی شر سے متصادم ہونا پڑتا ہے۔ یہ شر اس کے اندر بھی ہے اور باہر بھی' لیکن شر سے ٹکراؤ کے اسی مسلسل عمل سے اس کے عزم و یقین کی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ وہ اپنے مخفی امکانات سے آشنا ہو جاتا ہے یعنی خیر و شر کی یہی ازلی آویزش انسان کو انسان بناتی ہے۔ نہیں تو وہ فرشتگی کی سطح سے بلند نہ ہونے پاتا' جو اقبال کے نزدیک لائق تحسین نہیں۔ ان کے خیال میں ابلیسی قوت سے ٹکرانے سے ہی انسان کے لئے خیر و برکت کی راہیں استوار ہوتی ہیں۔ وہ جوش عمل' جرات فکر اور آزادی روح سے بہرہ ور ہو کر زمان و مکاں کی

حدوں کو پھلانگتا ہے اور لامتناہی ہو جاتی ہے۔ اس لئے اقبال کے نزدیک انسان کی شخصیت کی حقیقی توسیع و ترفع میں ابلیس ایک مثبت رول ادا کرتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اقبال ایک نئے انسان کی تشکیل اس وقت تک نامکمل سمجھتے ہیں' جب تک اس کے دل میں روایت شکنی کا مادہ نہ ہو اور وہ جرأت انکار اور بغاوت سے بہرہ ور نہ ہو۔ "نالہ ابلیس" میں ابلیس کو آدم سے یہی شکایت ہے کہ وہ انکار اور بغاوت کے جذبات سے عاری ہے۔ وہ اس کے حکم سے انکار نہیں کرتا۔ اس نے اپنے آپ کی جانب آنکھ بند کر لی ہے اور خود کو دریافت نہ کر سکا۔ اس کی خاک میں ذوق ابا نہیں' وہ شرار کبریا سے محروم ہے:

ہیچ گہ از حکم من سر برنتافت
چشم از خود بست و خود را درنیافت

خاکش از ذوق ابا بیگانہ
از شرار کبریا بیگانہ

اقبال شیطان کی اسی جرأت انکار کے گرویدہ ہیں اور اس کے جوشیلے بیان سے وہ دراصل اپنے مثالی انسان کو اس سے آراستہ دیکھنا چاہتے ہیں۔

گوئٹے کے "فاؤسٹ" سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انیسویں صدی کے رومانی مزاج کے مطابق روایت پرستی' عقلیت اور امتناعات کے خلاف آزادی' مہم جوئی اور لذت کوشی کے جذبات کے لئے بے قرار ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے شیطان کا سہارا لیتا ہے۔ شیطان ہی کے توسط سے فاؤسٹ ممنوعہ اور نادیدہ جہانوں کی سیاحت کرتا ہے۔ وہ علم و خبر کے تمام ممکنہ شعبوں پر حاوی ہونے کے باوجود اس عرفان و آگہی اور تکمیلیت سے محروم ہے' جو شخصیت کو ایک لازوال قوت بناتی ہے اور جو جبلتوں اور جذبوں کے آزادانہ اظہار ہی سے ممکن ہے۔ اٹھارویں صدی کے کلاسیکی ضابطوں اور اصولوں نے جن کی تائید گوئٹے نے بھی کی ہے' انسانی شخصیت کو تعقل' توازن اور استحکام سے ہمکنار کر کے اس کی تہذیب و تشکیل تو کی تھی' مگر اسے شخصی حد بندیوں میں بھی محصور کیا تھا۔ رومانیت نے ان کی نفی کی ہے اور انسانی شخصیت کو بے کرانی کی لذت سے آشنا کیا ہے۔ شخصیت کی اسی بیکرانی کے

حصول کے لئے شیطانی بہکاوے میں آنا ہزار غیر پسندیدہ سہی' ناگزیر بھی ہے۔ فاؤسٹ کہتا ہے:

Night passes round me, deep and deeper still and yet within me beams a radiant light.

حکیم فاؤسٹ کی شخصیت کی توسیع و تکمیل کا عمل میفسٹو کے ذریعے مکمل ہوتا ہے۔ اس طرح سے وہ جبلت کا اشاریہ بنتا ہے۔ یہ جبلت متحرک ہو کر عشرت کاری' تحیر پسندی' مہم جوئی اور حسن آفرینی پر محیط ہو جاتی ہے اور انسان کی نادیدہ قوتوں کو بروئے کار لانے کا موجب بن جاتی ہے۔ گوئٹے نے گہرے فنکارانہ شعور سے کام لے کر "فاؤسٹ" کو ایک پیچیدہ خلاقانہ صورت عطا کی ہے کہ وہ جرمن کی سیدھی سادی حکایت نہیں رہ جاتی' جس میں حکیم فاؤسٹ شیطان کے بہکاوے میں آ کر اپنی روح کا سودا کرتا ہے' بلکہ یہ ایک اولوالعزم اور حساس انسان کی آرزو اور شکست آرزو کی تہہ دار اور دلگداز داستان بن جاتی ہے اور ابلیس اس کا مرکز و محور بن جاتا ہے۔

اقبال کی شاعری میں بھی ابلیس کا کم و بیش ایسا ہی کردار ابھرتا ہے یعنی وہ انسان کو اپنے ہی وجود سے ٹکرانے کی ترغیب دے کر اسے غفلت سے جگانے اور اس کے کردار و عمل کو مستحکم کرنے اور عرفان و آگہی کی منازل سے گزارنے میں اس کی اعانت کرتا ہے۔ اس طرح سے مذہبی یا اسطوری واقفیت سے ماورا ہو کر اقبال کے تخیل کا زائدہ کردار بن جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اقبال کے یہاں ابلیس کا رول وہ وسعت' ایقان اور جامعیت حاصل نہ کر سکا ہے' جو گوئٹے کے یہاں اسے میسر ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ گوئٹے کو ڈرامے کے وسیع کینوس پر تصرف حاصل ہے اور وہ کردار' واقعہ اور فضا کی یکجائی اور عمل اور رد عمل سے شیطان کے تفاعل کو موثر اور نتیجہ خیز بناتا ہے' جبکہ اقبال کے یہاں مختصر نظموں یا نظم پاروں کی بنا پر کینوس بے حد مختصر ہے اور کردار و واقعہ کا ڈرامائی عمل بھی بہت محدود نوعیت کا ہے۔

تاہم اقبال کے یہاں ہیئت کی تنگی کے باوجود ابلیس کا کردار ایک منفرد المیہ شکوہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے' جس سے گوئٹے کا میفسٹو محروم ہے۔ "جبریل و ابلیس" میں ابلیس کے کردار کا المیہ رنگ زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ وہ راندۂ درگاہ ہونے کے باوجود پستیوں

میں نہیں گرتا' بلکہ اپنے ٹوٹے ہوئے سبو سے ہی سرمست ہو جاتا ہے۔ اپنے ٹوٹے ہوئے سبو سے سرمست ہونے کا رویہ اس کی المیہ کوتاہی کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ اس کے عروج و زوال کی پوری سرگزشت کا اشاریہ ہے:

کر گیا سرمست مجھ کو' ٹوٹ کر میرا سبو

نظم کے آغاز میں جبریل کے اس استفسار:

ہمدم دیرینہ' کیسا ہے جہان رنگ و بو؟

کے جواب میں ابلیس کا یہ کہنا:

سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو

اس کے انداز فکر کو آئینہ کرتا ہے۔ یہ مصرع خود ابلیس کے کردار کا اشاریہ ہے' جس کی تفسیر نظم کے آخری بند میں ملتی ہے:

دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزم خیر و شر
کون طوفان کے طمانچے کھا رہا ہے' میں کہ تو
گر کبھی خلوت میں میسر ہو' تو پوچھ اللہ سے
قصہ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

ابلیس کی تمجید جسے پروفیسر سرور اس کی "عظمت" سے تعبیر کرتے ہیں' اقبال ہی سے مختص ہے۔ "جاوید نامہ" میں وہ اسے خواجہ اہل فراق کے خطاب سے نوازتے ہیں اور "سراپا سوز" قرار دیتے ہیں۔ مزید کہتے ہیں:

اندکے در واردات او نگر
مشکلات او ثبات او نگر

گوئٹے کے یہاں اگرچہ ابلیس کی تمجید کا یہ انداز نہیں' تاہم اس کے تئیں تحقیر کا رویہ بھی نہیں ملتا جو کہ روایتی شیطان کے تئیں عام ہے۔ وہ شر' گناہ اور لذتیت کی ترغیب ضرور دیتا ہے' مگر نرمی' ترحم' بذلہ سنجی' دنیوی دانائی' انتباہ' علم' مشاہدہ اور تجربے کے اوصاف سے پسندیدہ بھی بن جاتا ہے:

A man, the microcosmic fool, down in his soul
is wont to think himself a whole

For life is short and art is long,

How would true insight make you grieve?

وہ فریب اور گناہ کا راستہ ہموار کرتا ہے' مگر یقین اور نیکی کی منزل کی جانب لے جاتا ہے۔

"فاؤسٹ" میں فاؤسٹ کی داخلی شخصیت خیر و شر کی رزم گاہ بن جاتی ہے اور وہ نفسیاتی کشمکش بھرپور انداز میں ابھرتی ہے' جو موجودہ دور کے انسان کی تقدیر ہے۔ وہ انسان جو علم اور کلچر کی غیر معمولی فتوحات کے باوجود جذباتی اور روحانی طور پر تہی مایہ ہے۔ فاؤسٹ تیزی سے بڑھاپے کی طرف جا رہا ہے اور اپنے کمالات کے باوجود داخلی بنجرپن کا شکار ہے۔ اس بنجرپن سے نجات پانے کے لئے وہ شیطان سے معاہدہ کرتا ہے اور ایک مقررہ وقت کی بھرپور' پُر شباب اور متمتع زندگی گزارنے کے عوض زوال' بڑھاپے' اندھے پن اور موت کو قبول کرتا ہے۔ یہ رویہ جدید حسیت سے گہرے طور پر مربوط ہے:

Of freedom and of life he alone is deserving

who every day must conquer them anew.

اقبال بھی انسان کے روحانی دیوالیہ پن کا شدید احساس رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انسان اس وقت تک اپنی شخصیت کی تکمیل نہیں کر سکتا' جب تک کہ وہ ابلیسیت سے متحارب نہ ہو۔ پس ابلیسیت اس کی تکمیل کا ایک بالواسطہ ذریعہ بن جاتی ہے۔ اقبال کے خیر و شر کے مسائل سے گہرے شعور سے انکار نہیں۔ ان کی شاعری کے بعض حصے اس کی تخلیقی باز آفرینی بھی کرتے ہیں' مگر تصور ابلیس کے مختلف پہلوؤں کو وہ اس وسیع پیمانے پر اور اس تخلیقی شان سے ابھار نہ سکے' جو گوئٹے کا حصہ ہے۔ اور اس کے تفوق کی فہمانت فراہم کرتا ہے۔

(حرف راز۔ اقبال کا مطالعہ' نئی دہلی : موڈرن پبلشنگ ہاؤس' 1983ء' ص 75-83)

ڈاکٹر سید محمد اکرم

اقبال کی نظر میں غالب __ گوئٹے کا ہمنوا

غالب اور گوئٹے دونوں علامہ اقبال کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ دونوں کو اقبال نے اپنے کلام میں جا بجا خراج تحسین پیش کیا ہے اور اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے ان دونوں سے استفادہ کیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

"میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے ہیگل، گوئٹے، مرزا غالب، عبدالقادر بیدل اور ورڈز ورتھ سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ ہیگل اور گوئٹے نے اشیاء کی باطنی حقیقت تک پہنچنے میں میری رہنمائی کی، بیدل اور غالب نے مجھے یہ سکھایا کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمونے کے باوجود اپنے جذبے اور اظہار میں مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھوں۔"

علامہ اقبال نے گوئٹے کے "دیوان مغربی" کے جواب میں "پیام مشرق" تصنیف کی اور اس کے دیباچے میں گوئٹے کو "حکیم حیات" کا نام دیا۔ اقبال نے اسی طرح "بانگ درا" میں مرزا غالب کے عنوان سے ایک نظم کہی جس میں غالب کو ایک عظیم مفکر شاعر قرار دیتے ہوئے کہا :

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا
زندگی مضمر ہے تیری شوخی تحریر میں

تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں

پھر اسی نظم میں گوئٹے کا ہمنوا قرار دیتے ہوئے کہا:

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

اس طرح علامہ اقبال کو گوئٹے اور غالب دونوں میں ایک خاص مماثلت نظر آئی' جسے تلاش کرنے کی یہاں ایک مختصر سی کوشش کی جاتی ہے۔

سب سے پہلے دونوں شاعروں کا ماحول ہے' جس میں انہوں نے زندگی بسر کی۔ یہ ماحول بہت حد تک یکساں ہے۔ گوئٹے کا زمانہ 1749ء تا 1832ء یورپ میں انقلاب فرانس اور جنگ و جدال کا زمانہ ہے۔ نپولین کی جنگوں اور روس کے ہاتھوں اس کی شکست نے جرمنی کا امن و سکون مکمل طور پر تباہ کر دیا تھا۔ بہت سے روسی لشکر جو وسط ایشیا سے آئے ہوئے تھے' گوئٹے کے شہر ویمر میں چھاؤنی ڈالے ہوئے تھے۔ گوئٹے کے لئے یہ پر آشوب اور وحشت ناک ماحول انتہائی نامطلوب اور ناسازگار تھا' چنانچہ اس نے ایک خط میں لکھا:

"فرانس کی شکست کے نتیجے میں روس ایک عظیم ملک بن گیا ہے جو اپنی وحشیانہ فطرت اور استبداد و خشونت کی بنا پر آئندہ یورپی تمدن اور انسانی تہذیب کے لئے خطرہ بنا رہے گا۔"

علامہ اقبال کے الفاظ ہیں: "یہ وہ زمانہ تھا جب جرمن قوم کا انحطاط ہر پہلو سے انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ ملک کی سیاسی تحریکوں میں عملی حصہ لینے کے لئے گوئٹے کی فطرت موزوں نہ تھی اور یورپ کی عام ہنگامہ آرائیوں سے بیزار ہو کر اس کی بے تاب اور بلند پرواز روح نے مشرقی فضا کے امن و سکون میں اپنے لئے ایک نشیمن تلاش کر لیا۔"

یورپ میں یہی زمانہ قومی تعصبات کے فروغ کا زمانہ تھا' جس کے نتیجے میں ہر طرف نفرت اور لڑائی کی فضا قائم تھی۔ کلیسا کے مذہبی نظام کے خلاف مسلسل تحریکوں سے مذہبی اور روحانی اقدار کا فقدان بہت بڑھ چکا تھا' جس کے نتیجے میں گوئٹے جیسے حساس شخص کے لئے یورپ کے ماحول میں زندگی بسر کرنا دشوار ہو گیا' چنانچہ اس نے عالم خیال میں مشرق کا رخ کیا۔ اس نے مغرب کی مکمل طور پر مادی فضا سے نکلتے وقت ایک قطعہ لکھا جس کا عنوان "ہجرت" ہے اور یوں شروع ہوتا ہے:

"شمال اور مغرب اور جنوب پریشان اور آشفتہ ہیں۔ تخت و تاج برباد ہو رہے ہیں' تو اس دوزخ سے دور بھاگ جا اور خوبصورت مشرق کا رخ کر تاکہ وہاں روحانیت کی ٹھنڈی ہوا تجھ پر چلے اور آب حیات تجھے جوان کرے۔ آکہ میں بھی دیار مشرق کا راہی ہوں تاکہ وہاں گڈریوں کے ساتھ زندگی بسر کروں۔"

گوئٹے کی طرح غالب کا زمانہ حیات 1796ء تا 1869ء بھی برصغیر میں مغلیہ سلطنت کے انتہائی انحطاط اور مکمل سقوط کا زمانہ تھا۔ 1857ء میں تخت و تاج کی بربادی' شہزادوں اور اکثر مسلمانوں کا انگریزوں کے ہاتھوں قتل عام اور ماحول میں ہر طرف تباہی و مایوسی' یہ سب کچھ غالب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا' چنانچہ وہ بھی گوئٹے کے طرح اس دردناک ماحول سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ جس طرح گوئٹے کو ایران پسند تھا' اسی طرح غالب بھی ایران کی فضا میں زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ وہ کہتا ہے:

گرفتہ خاطر غالب ز ہند و اعیانش
برآں سر است کہ آوارۂ عجم گردد

گوئٹے کی طرح وہ اپنے آپ کو اس بلبل سے تشبیہ دیتا ہے' جس کی اصل گلستان شیراز ہے' لیکن وہ ایک اجنبی ماحول میں گرفتار ہے۔ غالب کا مندرجہ ذیل شعر اسی احساس کا ترجمان ہے:

بود غالب عندلیے از گلستان عجم
من ز غفلت طوطی ہندوستان نامیدمش

وہ اپنی زبان کو ہندوستانی زبان نہیں کہتا' بلکہ سمجھتا ہے کہ وہ دراصل اصفہان' ہرات اور قم سے تعلق رکھتا ہے:

غالب ز ہند نیست نوائے کہ می کشیم
گوئی ز اصفہان و ہرات و تمیم ما

وہ ہندوستان میں نہ زندہ رہنا چاہتا ہے اور نہ ہی وہاں مرنا چاہتا ہے' بلکہ نجف میں مرنا اور اصفہان میں زندگی بسر کرنا چاہتا ہے:

"در نجف مردن خوش است و در صفاہاں زیستن"

گوئٹے اور غالب میں دوسری مشترک قدر ان کی فارسی ادب سے گہری دلچسپی ہے۔

جرمنی میں مشرقی تحریک کے زیر اثر متعدد فارسی آثار کے ترجمے ہوئے۔ گوئٹے نے نہایت دلچسپی کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا' چنانچہ وہ فارسی شاعری کے متعدد استعارات و لطیف کنایات سے واقف ہو گیا۔ اس بارے میں علامہ اقبال رقم طراز ہیں :

"گوئٹے اپنے تخیلات میں شیخ عطار' سعدی' فردوسی اور عام اسلامی لٹریچر کا بھی ممنون احسان ہے۔ ایک آدھ جگہ ردیف و قافیہ کی قید سے غزل بھی لکھی ہے۔ اپنی زبان میں فارسی استعارات بھی مثلاً گوہر اشعار' تیر مژگاں' زلف گرہ گیر بے تکلف استعمال کرتا ہے.... دیوان کے مختلف حصوں کے نام بھی فارسی ہیں' مثلاً مغنی نامہ' ساقی نامہ' عشق نامہ' تیمور نامہ' حکمت نامہ وغیرہ۔

ایک حصے کا نام "زلیخا نامہ" ہے۔ زلیخا اس نے اپنی دوست ماریان ولمر کا نام رکھا تھا اور وہ اسے اسی نام سے پکارتا تھا۔"

غالب فارسی زبان کا بلاشک و شبہ ایک عظیم اور مسلم الثبوت شاعر ہے' جس کا کلام انیسویں صدی تک ہماری عظیم ادبی روایت کا آئینہ دار ہے۔ غالب کا اردو دیوان اگرچہ اس کا شاہکار تصور کیا جاتا ہے' لیکن خود غالب اپنے فارسی کلام کو اس پر ترجیح دیتے ہوئے کہتا ہے :

فارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

برصغیر میں فارسی شاعری کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ایرانی شعرا مثلاً طالب اور حزیں وغیرہ برصغیر کے بعض شعرا کے فارسی محاورے پر اعتراض کرتے تھے۔ اگرچہ ان پر بعض مقامی شاعروں مثلاً شیدا فتحپوری' منیر لاہوری اور خصوصاً سراج الدین علی خان آرزو نے ایرانی شعرا کے کلام پر ادبی اور فنی نقطہ نظر سے سخت اعتراضات وارد کئے' لیکن خان آرزو اپنی اعلیٰ لسانی بصیرت کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچا کہ فارسی محاورے میں روز بروز بڑھتے ہوئے اختلاف کے سبب برصغیر کے شعرا کو فارسی میں شعر کہنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ اس نے میر اور سودا دونوں کو نصیحت کی کہ وہ فارسی کی بجائے ریختہ میں شعر کہا کریں' چنانچہ یہ دونوں بڑے شاعر اور دوسرے بہت سے فارسی گو شعرا فارسی کے علاوہ زیادہ تر اردو میں شعر کہتے رہے' لیکن اب سب کے برعکس غالب واحد شاعر ہے جس نے خان آرزو کے حکم

امتناعی کے باوجود فارسی میں بکثرت لکھا اور اپنے کلام کے بہترین جوہر فارسی میں دکھائے۔ اگر غالب بھی دوسرے شعرا کی طرح فارسی شاعری کو نظر انداز کرتا تو فارسی شاعری کی نو سو سالہ عظیم روایت یقیناً کمزور ہو جاتی اور آئندہ چل کر شاید علامہ اقبال فارسی کو اس حد تک نہ اپناتے، جس حد تک انہوں نے اپنایا اور اسے انتہائی طور پر مستحکم کر دیا۔

گوئٹے اور غالب میں تیسری اہم قدر حافظ شیرازی ہے، جس کے وہ دونوں شاعر گرویدہ ہیں اور اسے شعر و سخن کے حسن کی انتہا تصور کرتے ہیں۔ گوئٹے حافظ کا صحیح معنوں میں مجذوب ہے۔ اس نے حافظ کی زندگی اور اس کے کلام پر ایک تقریظ لکھی۔ اپنے دیوان کے ایک حصے کا نام "حافظ نامہ" رکھا، جس میں وہ کہتا ہے:

"اے حافظ! تیرا کلام ابدیت کی طرح عظیم ہے، جس کا کوئی آغاز و انجام نہیں۔ اے حافظ آسمانی! میری آرزو یہ ہے کہ میں ہمیشہ تیرے ساتھ رہوں۔ تیری مجلس میں رہنا ہی میرا سرمایہ حیات ہے۔ اے حافظ! تیرے ساتھ برابری کا دعویٰ کرنا محض دیوانگی ہے۔ تو اس عظیم کشتی کی طرح ہے جو سمندر کے سینے کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے اور میں تو ایک تختہ شکستہ کی طرح ہوں جو موجوں کے تھپیڑے کھا رہا ہے۔"

علامہ اقبال لکھتے ہیں:

"حافظ کے ترنم نے اس کے تخیلات میں ایک ہیجان عظیم برپا کر دیا۔ جس نے آخرکار "مغربی دیوان" کی ایک پائدار اور مستقل صورت اختیار کر لی۔ مگر فان ہیمر کا ترجمہ گوئٹے کے لئے محض ایک محرک ہی نہ تھا، بلکہ اس کے عجیب و غریب تخیلات کا ماخذ بھی تھا۔ بعض بعض جگہ اس کی نظم خواجہ کے اشعار کا آزاد ترجمہ معلوم ہوتی ہے اور بعض جگہ اس کی قوت تخیل کسی خاص مصرع کے اثر سے ایک نئی شاہراہ پر پڑ کر زندگی کے نہایت دقیق اور گہرے مسائل پر روشنی ڈالتی ہے۔ گوئٹے کا مشہور سوانح نگار بیل شوسکی لکھتا ہے:

"بلبل شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی، اس کو کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ شاید میری روح ہی حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے..... جس طرح حافظ لسان الغیب و

ترجمان اسرار ہے اسی طرح گوئٹے بھی ہے اور جس طرح حافظ کے بظاہر سادہ الفاظ میں ایک جہان معنی آباد ہے اسی طرح گوئٹے کے بیساختہ پن میں بھی حقائق و اسرار جلوہ افروز ہیں....."

گوئٹے کی طرح غالب بھی حافظ کے کلام کا شیفتہ اور گرویدہ ہے۔ وہ فارسی کے تمام شعرا میں سے حافظ کو خاص اہمیت دیتا ہے۔ گوئٹے کی طرح اس نے بھی "دیوان حافظ" پر تقریظ لکھی اور مندرجہ ذیل بیان میں حافظ کی عظمت کا اعتراف کیا:

"جن ارباب دانش نے آزاد منشی کے تحت کلام کو عظمت عطا کی ہے' ان میں آتش کدہ اسرار کا پیر مغاں' آبروئے فارس' رنگ و بوئے خرد' نکتہ سنج شیراز ہے جس کا کلام عالم معنی کا ایک تحفہ ہے۔ وہ لسان الغیب ہے اور زمزمہ وحی کی صدائے بازگشت ہے۔"

غالب نے حافظ کو خراج تحسین ادا کرنے کے لئے اس کی متعدد غزلوں کا استقبال کیا ہے' جو اس کی فارسی زبان پر کمال قدرت کی دلیل ہیں۔

دونوں شاعروں میں چوتھی مشترک قدر یہ ہے کہ گوئٹے ایک فلسفی شاعر تھا جس نے مذہبی اور قومی تعصبات کے خلاف اپنے اعلیٰ خیالات کا اظہار کیا۔ اس کی آرزو اور کوشش یہ تھی کہ مشرق و مغرب کے مذہبی اور قومی تعصبات کو ختم کیا جائے تاکہ مختلف اقوام ایک دوسرے کا احترام کر سکیں' چنانچہ اس نے کہا کہ میں چاہتا ہوں اپنے دیوان کو ایک آئینہ یا "جام جہاں نما" بناؤں جس میں مغرب کو مشرق اور جرمن کو ایران کے نزدیک کر دوں۔ گوئٹے یقیناً مسیحی ہے' لیکن وہ اسلام اور اسلامی ادب کو بہت اہمیت دیتا ہے۔

گوئٹے کی طرح غالب بھی ایک مفکر شاعر ہے۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں: "غالب یقیناً ان شعرا میں سے ہے جن کا ذہن اور تخیل انہیں مذہب اور قومیت کے تنگ حدود سے بالا تر مقام عطا کرتا ہے۔"

غالب ایک آزاد خیال شاعر ہے۔ فلسفیانہ رجحان نے اسے آزاد خیالی میں مزید مستحکم کر دیا' جس کی بنا پر وہ رسوم و قیود کی پابندی کو ایک طرح کی سرگشتگی سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ عصیاں پر عذر خواہی نہیں کرتا' بلکہ اسے "خوئے آدم" قرار دیتا ہوا اپنا حق سمجھتا ہے اور کہتا ہے:

خوئے آدم دارم و آزادہ ام
آشکارا دم ز عصیاں می زنم

بعض اوقات یہ آزاد خیالی غالب کو کئی مذہبی معینہ نظامات پر نکتہ چینی کے لئے بیباک بھی کر دیتی ہے اور وہ کہہ دیتا ہے کہ چونکہ میری فطرت عجمی ہے اس لئے میں عربی دین کی رموز کو صحیح طور پر درک کرنے سے معذرت خواہ ہوں:

رموز دیں شناسم درست و معذورم
نہاد من عجمی و طریق من عربی ست

غالب اپنی اسی عجمی نہاد کے بہانے وسیع المشربی کا ایک ایسا ماحول فراہم کرتا ہے، جس میں حلال و حرام کی تمیز بھی نہیں رہتی۔ چنانچہ کہتا ہے کہ میں نے بتکدے سے بہشت کا راستہ نکال لیا ہے اور اب میں خم سے حوض کوثر میں شراب کے پیالے ڈالتا ہوں۔

راہے زکنج دیر بہ مینو کشادہ ام
ازخم کشم پیالہ و در کوثر افگنم

اسی مضمون کی تائید میں اس کا یہ شعر بھی قابل ملاحظہ ہے:

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

اگر فردوس اور دوزخ کو دین اور کفر کی اصطلاحات کے مترادف قرار دے لیا جائے تو مفہوم اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل شعر بھی معنی خیز ہے جس کے مطابق وہ اپنی شراب شعر میں کئی فکری آبگینے پگھلا کر ڈال لیتا ہے:

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

یہ رجحان عجمیت کا خاصہ ہے، جس سے رومی اور اقبال کو اپنے خالص اسلامی نظریات کی بنا پر اختلاف رہا۔ چنانچہ غالب کی مذکورہ بحر میں اقبال، رومی کی زبان سے اس آمیزش فکری کے خلاف یہ شعر کہلواتے ہیں:

آمیزشے کجا، گہر پاک او کجا؟
از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

غالب اپنے متصوفانہ کلام میں مذہبی تشخص کو مٹانے کے لئے بھی آواز اٹھاتا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکبر کی "دین الٰہی" یا داراشکوہ کی "مجمع البحرین" تحریک کا فعال نمائندہ ہے' چنانچہ کہتا ہے:

ہم موحد ہیں' ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اسی آزاد خیالی اور مذہبی قیود سے بے نیازی کے حوالے سے غالب اقبال کے نزدیک منصور اور طاہرہ کی طرح قابل اعتراض شخصیت ہے' چنانچہ اقبال نے "جاوید نامہ" میں ایک عنوان قائم کر کے لکھا ہے کہ 'منصور' طاہرہ اور غالب کی ارواح جلیلہ نے بہشت کو اپنا نشیمن نہیں بنایا اور وہ آسمانوں کی ابدی سیاحت میں مصروف ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مذہبی نقطہ نظر سے وہ جنتی نہیں ہیں۔ ان تینوں آزاد خیال اور روشن فکر افراد نے اپنے اپنے دور کے رسمی عقائد و افکار کے خلاف فکری بغاوت کی۔ منصور اور طاہرہ تو دونوں اس جرم میں قتل کر دیئے گئے' لیکن غالب اپنے دور کے سیاسی اور مذہبی انحطاط کی بنا پر بچ گیا اور بند غم میں قید حیات کاٹتا رہا۔ منصور' طاہرہ اور غالب تینوں اپنی انا کے شکار تھے۔ منصور نے "انا الحق" کہا' طاہرہ نے "اناالشہید" اور غالب نے "انا اسداللہ" کا نعرہ لگایا۔ مزید برآں منصور ہونے کا دعویٰ بھی کیا اور کہا:

منصور فرقہ علی اللہیاں منم
آوازہ انا اسداللہ در افگنم

گوئٹے اور غالب میں ایک اور مماثلت یہ ہے کہ زندگی بعد از موت کے بارے میں دونوں کے تصورات یکساں ہیں۔ گوئٹے نے اس تصور کو اپنی ایک نظم "حور و شاعر" میں بیان کیا ہے جس کا دلآویز فارسی ترجمہ علامہ اقبال نے "پیام مشرق" میں کیا ہے۔ گوئٹے بہشت میں داخل ہوتا ہے اور حور کے حسن و جمال کو دیکھ کر کہتا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ تو زلیخا ہے جس کے ساتھ میں نے ایک عمر گزاری ہے اور اگر تو زلیخا نہیں بھی' جب بھی میں سمجھتا ہوں کہ تو زلیخا ہی ہے۔ اس طرح گوئٹے اپنی ابدی زندگی کو وہی رنگ دے لیتا ہے جو دنیا میں اسے حاصل تھا۔

غالب کا تصور بہشت بھی بہت حد تک گوئٹے کے تصور کی طرح ہے۔ بہشت اپنی تمام

جمالیاتی خوبیوں اور رعنائیوں کے باوصف چونکہ ایک پرسکون مقام ہے' جہاں زندگی اپنی ارتقائی کیفیات سے محروم ہو جاتی ہے' لہٰذا غالب کی تنوع طلب اور جدت پسند طبع کے لئے تکلیف دہ ہے۔ غالب نے اس احساس کا اظہار اپنے ایک خط میں یوں کیا ہے :

"میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی' اقامت جاودانی ہے اسی ایک بخت کے ساتھ زندگانی ہے' اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ وہ حور اجیرن ہو جائے گی' طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردیں کاخ' وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بد دور وہی ایک حور' بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔"

غالب نے اس دلچسپ اور معنی خیز مضمون کو مثنوی "ابرگوہربار" میں یوں پیش کیا ہے:

در آں پاک میخانہ بے خروش
چہ گنجائی شورش نائے و نوش
سیہ مستی ابر و باراں کجا؟
خزاں چوں نباشد بہاراں کجا؟
چہ منت نہد ناشناسا نگار
چہ لذت دہد وصل بے انتظار
گریزد دم بوسہ اینش کجا؟
فریبد بسوگند دینش کجا
نظر بازی و ذوق دیدار کو
بہ فردوس روزن بدیوار کو
بہ بند امید استواری فرست
بہ غالب خط رستگاری فرست

یعنی بہشت جو کہ پاک اور خاموش میخانہ ہے' وہاں ہنگامہ آرائی کی گنجائش کیا ہو سکتی ہے؟ وہاں یہ سرمست ہوائیں اور کالی گھٹائیں کہاں ہوں گی' جس باغ میں خزاں نہ ہو اس کی بہار کیا ہو سکتی ہے۔ جس حسن سے آشنائی نہیں' اس کا احسان کیا ہو گا؟ جس وصل کے لئے انتظار نہیں' اس میں کیا لذت ہو گی' حور کو پکڑنے لگوں گا تو وہ مجھ سے بھاگے گی

نہیں۔ نہ ہی وہ جھوٹی قسمیں کھا کر مجھے فریب دے گی، کیونکہ اس کا دین ہی کوئی نہیں ہو گا، بہشت کے مکانوں میں کھڑکیاں نہیں ہوں گی، اس لئے وہاں تاک جھانک کا بھی کوئی امکان نہیں۔ اندریں صورت اے خدا تو غالب کو یہاں سے آزاد کر دے۔

غالب طبعاً" بہشت سے گریزاں ہے۔ کہتا ہے جو دنیا میں مجھ پر گزری ہے، بہشت اس کی تلافی نہیں کر سکتی:

جنت تکند چارہ افسردگی دل
تعمیر باندازہ ویرانی ما نیست

پھر کہتا ہے کہ یوسف کو تو مصر دے کر راضی کر لیا تھا، لیکن میری بربادیوں کی تلافی بہشت سے نہیں ہو سکتی، اس لئے میں بہشت کو نہیں چاہتا۔

یوسف از مصر گشتہ خوشدل و من
بہ تلافی جناں نمی خواہم

وہ زندگی بعد از موت میں بھی موجودہ زندگی کی بیتابیوں، کشمکشوں اور امنگوں کو دیکھنے کا خواہش مند ہے، تاکہ ان کے سبب وجود انسانی میں حرکت اور ارتقائی کیفیت برقرار رہے۔ غالب گوئٹے کی طرح بہشت کو صرف اس شرط پر قبول کرتا ہے کہ اس میں موجودہ شور و ہیجان میسر آئے:

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

غالب کا مندرجہ ذیل شعر بھی گوئٹے کے شعر کا لفظ بہ لفظ ترجمہ معلوم ہوتا ہے:

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے
حوران خلد میں تری صورت مگر ملے

انسان مشرق میں ہوں یا مغرب میں، سب کا دل تقریباً یکساں دھڑکتا ہے۔ عموماً مختلف افراد مین چند ایک مماثلتیں مل جاتی ہیں لیکن غالب اور گوئٹے کے خیالات میں مماثلتیں کچھ زیادہ ہی نمایاں اور واضح صورت میں پائی جاتی ہیں اور اسی بنا پر علامہ اقبال نے اس دلچسپ موضوع کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(اقبال ــــ ایک تحریک مؤلفہ ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ، لاہور 1998ء، ص 1-10- نیز: ماہنامہ "علامت" (لاہور)، 1997ء-)

حصّہ دوم

گوئٹے کا پیغام	فیض احمد فیض	245
گلشن ویمر کا نواسنج، گوئٹے	حسین صدیقی	258
گوئٹے پر حافظ کی شاعری کا اثر	عباس درویش	264
گوئٹے (انسان اور شاعر)	ملک محمد باقر نسیم رضوانی	271
جان ولف گانگ گوئٹے	شیر جنگ	278
غالب اور گوئٹے	حاجی لق لق	291
جرمنی کا مشرقی شاعر... گوئٹے	ممتاز حسن	297
فاؤسٹ	حنیف ہاشمی	312
گوئٹے اور فاؤسٹ	محمود بریلوی	331
فاؤسٹ (مقدمہ)	ڈاکٹر سید عابد حسین	341
گوئٹے... اس کا فلسفہ	فضل حسین	368
دیباچہ (اردو ترجمہ "فاؤسٹ")	محمد عبدالقیوم ہاتی	384
غم نصیب	محمد ہادی حسین (مترجم)	387
ورتھر کی داستان غم (ابتدائیہ)	ڈاکٹر ریاض الحسن	391
ایران و ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر (ریی)....(دیباچہ)	ڈاکٹر ریاض الحسن	437
ولہیلم مائسٹر (مقدمہ)	ڈاکٹر سید عابد حسین	483
ایران و ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر (ریی)....(پیش لفظ)	ممتاز حسن	485
خدا، روح اور گوئٹے	محمد اسحاق امرتسری	495
گوئٹے کی چند نظمیں	نامعلوم الاسم	499
دیوان مغرب	نامعلوم الاسم	503
گوئٹے، اٹلی میں	منصور احمد	505

فیض احمد فیض

گوئٹے کا پیغام

اکثر اوقات شاعر کے تخیلات واعظ یا منطقی کے برعکس ایک خط مستقیم کی صورت میں متشکل ہونے کی بجائے ایک دوسرے کو مختلف نقاط پر قطع کرتے ہیں۔ تاہم اس کا مجموعی کلام ایک ایسے عنصر کا حامل ضرور ہوتا ہے' جو اس کی بوقلموں نگارشات میں تسلسل و ارتباط پیدا کرے اور اس کے اضطراری جذبات کے لئے ایک ساکن "پس منظر" کا کام دے۔ اسی کو عرف عام میں اس کا پیغام یا فلسفہ کہا جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ شاعر نے اس عنصر کو اپنے کلام کے دوسرے ترکیبی عناصر پر ترجیح دی ہو۔ عجیب نہیں کہ اسے اس کی موجودگی کا علم تک نہ ہو' لیکن ایک مفسر یا نقاد کے لئے اس کی توضیح ناگزیر ہے۔ چنانچہ مضمون زیر بحث میں میں اپنے آپ کو گوئٹے کی تصنیفات کے اس جزو تک محدود رکھوں گا' جس کے ذریعے سے اس کے مختلف نقطہ ہائے نظر کو ایک نظام کے تحت میں لایا جا سکتا ہے اور جس کے مختلف مفہوم گوئٹے کے ذہنی ارتقا کی مختلف منازل کے آئینہ دار ہیں۔ گوئٹے کی بعض تصانیف جو فنی لحاظ سے از حد قابل قدر ہونے کے باوجود اس کے فلسفہ حیات سے بالواسطہ تعلق نہیں رکھتیں' میں نے مجبوراً نظرانداز کر دی ہیں۔

گوئٹے کی ادبی زندگی کا آغاز جرمن ادب کے اس دور میں ہوا' جسے "طوفان و ہیجان" کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ اٹھارہویں صدی کے اختتامی حصہ کا ذکر ہے' جب جرمن ذہنیت روسو اور اس کے متابعین کی تلقین سے اس قدر متاثر ہو چکی تھی کہ اسے قانون

فطرت کے علاوہ کوئی داخلی یا خارجی پابندی گوارا نہ تھی۔ اس رومانی بغاوت کے علمبردار مروجہ تمدن اور اسکی تمام رسوم و قیود کو انسان کی فطری آزادی میں حائل ہونے کے سبب سے تحکمانہ اور غیر واجبی سمجھتے تھے۔ وہ انفرادیت کے دلدادہ اور استبداد کے دشمن تھے۔ ان کی دنیائے خیال ایسے افراد سے آباد تھی' جو سیاسی اور جسمانی قیود کے علاوہ روحانی اور جذباتی قیود سے بھی آزاد تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تمثیلات میں خود پرستی اور قوت عمل کی بیباک ترین تصاویر پیش کیں' لیکن اپنی غنائی شاعری میں تعیش اور خود رفتگی کا آخری قطرہ تک نچوڑ دیا۔ دنیائے ادب میں گوئٹے کے اولیں کارنامے یعنی "گوٹزوان برلی شنگن" (1871ء) اور "ویرتھر کے مصائب" (1874ء) انہیں متضاد اثرات کے ماتحت لکھے گئے۔ گوٹز اور ویرتھر دونوں باغی ہیں اور مکمل آزادی کے خواہش مند گوٹز جسمانی آزادی کا طلبگار ہے اور ویرتھر نفسیاتی آزادی کی تلاش میں سرگرداں۔

"گوٹز وان برلی شنگن" قرون وسطی کا ایک سردار قبیلہ تھا' جس کے اردگرد آئین و قواعد کی زنجیریں روز بروز کڑی ہوتی جا رہی تھیں' جس کے عز و اقتدار پر استبداد پرستوں کی گرفت دن بدن سخت ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے آنے والی مصیبت کا مقدور بھر مقابلہ کیا' لیکن بالآخر تہذیب و تمدن کی بالا تر طاقتیں اس کی مغرور روح کو اپنے ریلے میں ہمیشہ کے لئے بہا لے گئیں۔ وہ اپنی ہمت کو بے پناہ اور اپنی قوت کو بے قید دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ضمیر انسانی کے علاوہ کسی سیاسی حقیقت کے وجود کو تسلیم کرنے کا روادار نہ تھا اور اس کا منتہائے نظر ایک ایسی سوسائٹی تھی' جس کا ہر فرد خود مختار ہو۔

بقولہ "عظمت اور فارغ البالی اسی کے لئے ہے' جو اپنے منصب حیات پر آزادی سے قائم ہے' جو نہ حاکم ہے نہ محکوم"۔ اسے یہ احساس نہ تھا کہ معاشرتی اور سیاسی قوانین ارتقا کی قید سے آزاد نہیں۔ تدبر کو غداری اور حکومت کو استعمار سمجھ کر اپنے آخری الفاظ میں مستقبل کا نقشہ یوں کھنچتا ہے۔

"میری بے کس رفیقہ
میں تمہیں ہزیمت خوردہ دنیا میں چھوڑے جاتا ہوں۔
اپنے دل کو اپنے دروازہ کی طرح بند کر دو۔
غداری کا زمانہ قریب ہے اور حریت فنا ہو چکی ہے۔

اب نااہلوں کی حکومت ہو گی اور وہ مکر و فریب سے احرار کو شکار کر
لیں گے۔ آزادی' آزادی۔"

گوٹز کی نبرد آزما فطرت کے تقابل میں گوئٹے نے ویرتھر کی توہم پرست طبیعت کا نقشہ کھینچا۔ ویرتھر ایک نرم دل عاشق مزاج اور وجدان پسند نوجوان تھا' جس کی لطیف روح دنیا و مافیہا کو شراب و شعر میں غرق دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے جذبات کی باگ مروجہ اخلاق کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک دنیا کا واحد فرض اس کی جذباتی تسکین کے سامان مہیا کرنا تھا۔ ایک جگہ کہتا ہے کہ "میں اپنے دل کی بیمار بچے کی طرح ناز برداری کرتا ہوں' جس کی ہر خواہش پوری کی جاتی ہے۔" اس میں مادی حقائق کو سمجھنے اور ان سے توافق پیدا کرنے کی اہلیت نہ تھی۔ اس کی ذہنی ترکیب احساس مجسم لیکن ادراک سے ناآشنا تھی۔ اس کمزوری کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے: "میری قوت مشاہدہ بہت کمزور ہے۔ میرے سامنے ہر چیز اتنی موہوم اور تیرتی ہوئی نظر آتی ہے کہ میں تصور میں اس کا صحیح نقشہ قائم نہیں کر سکتا۔" رفتہ رفتہ دنیا کی تلخ حقیقتیں اس پر واضح ہوتی گئیں کہ "زندہ رہنے کے لئے کانٹوں میں الجھ کر زندگی بسر کرنے کی خو پیدا کرنا ضروری ہے" لیکن اپنے آپ میں اتنی قوت نہ پا کر ناکام ویرتھر کو موت کی آغوش میں پناہ ڈھونڈنی پڑی۔

گوٹز اور ویرتھر کی خودسری' حریت پرستی' انتہا پسندی اور آزادہ روی گوئٹے کے فلسفہ کی پہلی قسط ہے۔ تاحال اس کی ذہنیت ایک رومانی نوجوان کی سی تھی' جو اپنے آپ کو مرکز دو عالم جان کر تمام خارجی اشیا کو ذاتی املاک تصور کرتا ہے' جنہیں وہ جس طرح چاہے تصرف میں لائے۔ اسے آرزو رہتی ہے کہ

پھونک ڈالے یہ زمین و آسماں مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

لیکن کارل گرن کے الفاظ میں گوئٹے رومانیت کا مریض ہی نہیں' حکیم بھی تھا۔ اس نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ اتنی قدیم دنیا ایسے آسانی سے جل جانے کی ہرگز عادی نہیں اور دنیا والے بھی کچھ کم سخت جان نہیں ہیں۔ فطرت کی طرح انہیں بھی اپنے قوانین میں مداخلت گوارا نہیں۔

لیکن انسان کو اپنے فطری اور تمدنی فرائض کا احساس محض تجربہ کی بنا پر ہو سکتا ہے۔

گوٹز اور ویرتھر اپنے تجربات کو مشعل راہ بنانے کی بجائے لکیر کے فقیر بنے رہے اور اسی لئے ان کی پہلی شکست ان کی آخری شکست ثابت ہوئی۔ انہیں نہیں تو گوئٹے کو اعتراف کرنا پڑا کہ خود پرستی اور خود رفتگی فی نفسہا ایسا لائحہ کار پیش نہیں کرتیں، جس پر ایک قوم انفرادی یا اجتماعی طور پر گامزن ہو سکے۔

گوٹز اور ویرتھر سے ان بنیادی قوتوں کا انکشاف مقصود تھا، جو انسانی فطرت میں مضمر ہیں یعنی ذوق عمل اور وجدانیت۔ نظام حیات میں ان کی ترتیبی اہمیت گوئٹے کے ذہنی ارتقا کے ساتھ تدریجاً" مختلف ہوتی گئی۔ اس ارتقا کے دوسرے مرحلہ کا حق نمائندگی "ٹاسو" اور "ایگمونٹ" کو حاصل ہے۔ ٹاسو، ویرتھر کی طرح ایک شاعر ہے، جسے "خواب و خیال کی نیم تاریک دنیا میں گھومنے کے سوا کوئی کام نہیں۔" فرق اتنا ہے کہ اس کے مقابلہ میں گوئٹے نے ایک حقیقت پسند اور سنجیدہ مزاج کردار انٹونیو پیش کیا ہے، جس کی مدد سے وہ اپنی عارضی نیند کو ابدی نیند میں مبدل کرنے کی بجائے بیدار ہو جاتا ہے۔ ٹاسو رومانیت کا مفسر بھی ہے اور مرثیہ گو بھی۔ اس کی تقاریر شباب کی خوشنما امیدوں کے نوحے ہیں۔ مثلاً

آہ زندگی کا ذہبی عہد کیا گیا
جس کے لئے ہر دل بیسود مضطرب ہے

جب روئے زمین پر انسان بے فکر گلوں کی طرح آزاد اور بے خود پھرا کرتے۔ جب شاہ بلوط کے سن رسیدہ درخت کے نیچے کولن اور فلس راز و نیاز کیا کرتے اور ہم عمر جھاڑیوں کی نرم و نازک شاخیں محبت اور اس کی آہوں کو چھپا لیتیں۔

ساکت اور چمکیلی ریت پر
ملائم، سیمیں قدم لڑکیاں رقص کیا کرتیں

جب بسیط فضا کی آزاد مملکت میں ہر ایک طائر اور دشت و جبل میں ہر ایک حیوان اس امر کا اعلان کرتا رہتا۔

کہ مسرت قدرت کا واحد قانون ہے۔"

شاہزادی اسے ٹوکتی ہے "تمہارا آخری فقرہ صرف ایک ترمیم کا محتاج ہے۔

"اہلیت قدرت کا واحد قانون ہے۔"

Pitness alone is law.

ایگمونٹ گوٹز کی طرح ایک قائد تھا' جس کی خلقت میں تدبر اور معاملہ فہمی نام کو نہ تھی۔ اس نے تقدیر کو تدبیر کے تحت لانے کی کوشش نہ کی اور بے دیکھے بھالے موت کے منہ میں بڑھتا چلا گیا۔ ایگمونٹ کی مناقض شہزادہ آرینج کی شخصیت ہے' جس کی دور اندیشی اور سلامت رائے نے اسے لقمہ اجل ہونے سے بچا لیا۔ گوئٹے نے گوٹز اور ویرتھر کے حریفین کو اخلاقی ترجیح نہیں دی۔ گوٹز کے غنیم مکار اور کمینے ہیں۔ ویرتھر کے مقابلہ میں کوئی اور فرد تمثیل اہمیت ہی نہیں رکھتا' لیکن "ٹاسو" اور "ایگمونٹ" میں اینٹونیو یا شہزادہ آرینج کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے الفاظ میں گوئٹے اب محسوس کرنے لگا تھا کہ انسان کو مکمل انسان بننے کے لئے وجدانیت کے ساتھ حقیقت پسندی اور معتدل مزاجی بھی لازم ہے۔ اس کا صحیح مسلک وہم اور تذبذب کی دنیا سے نکل کر فرض شناسی کی دنیا میں گامزن ہونا ہے۔

گوئٹے کی یہ تعلیم اس کی آخری تصانیف یعنی "ولہلم مائسٹر" اور "فاؤسٹ" میں تکمیل پذیر ہوتی ہے۔

"ولہلم مائسٹر کے زمانہ شاگردی" اور "ولہلم مائسٹر کے زمانہ سیاحی" کو مجموعاً تعلیم نفس کا ایک عملی نصاب سمجھنا چاہئے۔ ایسی تعلیم جو زندگی کے لئے نہیں' بلکہ زندگی کے ذریعے سے حاصل کی جاتی ہے' جس کا مقصد انسان کو غلطیوں سے آگاہ کرنا نہیں' غلطیوں سے آشنا کرنا ہے۔ اس کی زندگی اس کی منسوبہ کے الفاظ میں ایک پیہم تلاش ہے۔ حصول آرزو سے عاری۔

ابتدائے سفر میں ولہلم مکمل جذبات پرست تھا۔ جذبات کی رو اسے جدھر چاہتی' بہکا لے جاتی تھی' لیکن اس کے دل میں ایک ایسے مستقر کی تمنا ضرور تھی' جہاں اس کی تمام قوتیں توازن اور ہم آہنگی کے ساتھ مجتمع ہو سکیں۔ "آغاز شباب سے لے کر اب تک میرا مقصد ہمیشہ تکمیل نفس رہا ہے۔ میں اپنی فطرت میں ایسا انضباط پیدا کرنا چاہتا ہوں' جو ورا ثتاً" مجھے نہیں ملا۔ اس تمنا کے علاوہ مجھے ذوق شعری اور مذاق ذہنی کی اصلاح بھی مدنظر ہے' تاکہ میں صرف خیر کو خیر اور صرف حسن کو حسن کہوں" لیکن اس وقت تک اس کی تمام تر توجہ خارجی حقائق کی بجائے داخلی تجربات تک محدود تھی۔ جب وہ خط لکھنے بیٹھا تو

اسے محسوس ہوتا کہ "اس کو اپنے جذبات' اپنے تخیلات' اپنی روحانی اور قلبی واردات کے متعلق بہت کچھ کہنا ہے' لیکن خارجی اشیا کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں۔" اس کا پہلا سبق انہیں اشیا کا غائر مشاہدہ کرنا اور ان کی حقیقت کو سمجھنا تھا' تاکہ نظام کائنات میں اسے اپنا صحیح مرتبہ معلوم ہو سکے۔ "اپنا نہیں بلکہ اپنے ماحول کا مطالعہ کرو۔"

اس کی تعلیم کا دوسرا عنصر تجربہ کی قدر وقیمت سمجھنا اور اس سے مستفید ہونا تھا۔ وہ کہتا ہے "شک اور تذبذب صرف تجربہ کے ذریعہ سے دور ہو سکتے ہیں ..... سرگرمی عمل انسان کا اولیں فرض ہے۔ اس کے لمحات فرصت اس لئے ہیں کہ ان کے دوران میں وہ اپنے گرد و پیش کا مطالعہ کر کے اپنے کام کو آسان بنا سکے۔"

ایک دوسری جگہ کہتا ہے۔ "دنیا میں ایسے افراد بہت کم ہیں' جو دقت خیال کے ساتھ قوت عمل بھی رکھتے ہوں۔ خیال وسعت دہ ہے' لیکن مردہ کن عمل زندگی بخش ہے لیکن تنگ نظری سکھاتا ہے۔ ولہلم اپنی فطرت میں ان دو عنصروں کا توازن پیدا کرنے کا خواہش مند ہے۔ ذوق طلب اور تجربہ زیست اسے بالآخر اس منزل پر پہنچا دیتے ہیں۔ اسے بہت سی مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ متعدد مرتبہ زک اٹھانی پڑتی ہے' لیکن وہ جستجو کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ اس کی بو قلموں اور رنگین زندگی کے مقابلے میں جانور کی زندگی بہت سادہ' بے کیف اور بے حظ ہے۔ جارنو کو دولت اکٹھا کرنے کے سوا اور کوئی ہوس نہ تھی۔ وہ تجربات کی یک رنگی کو ان کی رنگا رنگی پر ترجیح دیتا تھا۔ اگرچہ دنیاوی اصطلاح میں وہ ولہلم سے کہیں زیادہ کامیاب رہا' لیکن حیات انسانی کی بہترین داخلی اور خارجی لذات اسے نصیب نہ ہوئیں۔ اس کا ذہن ایک ہی طرف گامزن رہنے کے سبب وسعت اور تکمیل سے آشنا نہ ہوا۔

کہا جا سکتا ہے کہ گوئٹے کے شاہکار فاؤسٹ کی بنیاد انجیل کی اس آیت پر رکھی گئی ہے: "جو ڈھونڈھتا ہے وہ پاتا ہے اور جو کھٹکھٹاتا ہے اس کے لئے کھولا جاتا ہے۔" ولہلم کی طرح فاؤسٹ بھی تکمیل خودی اور توسیع نفس کی خاطر زندگی کی تمام تلخیوں اور تمام شیرینیوں سے لذت یاب ہونا چاہتا تھا۔ اس کا فلسفہ حیات جنت سے نکالے ہوئے آدم کا فلسفہ تھا۔ یعنی

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن
دل کوہ و دشت و دریا بہ دمے گداز کردن

ز قفس درے کشا دن بہ فضائے گلستانے
رہ آسماں نوردن بہ ستارہ راز کردن
بہ گداز ہائے پنہاں بہ نیاز ہائے پیدا
نظرے ادا شناسے بحریم ناز کردن
گہے جزیکے ندیدن بہ ہجوم لالہ زارے
گہے خارپنش زن راز گل امتیاز کردن
ہمہ سوز نا تمام ہمہ درد آرزویم
بہ گمان دہم یقین را کہ شہید جستجویم

دوسرے حصے کے پانچویں ایکٹ میں وہ اپنا کیریکٹر یوں بیان کرتا ہے :

میں نے دنیا کا نہایت سرعت سے سفر کیا ہے۔
میں نے ہر تمنا کو گویا بالوں سے پکڑ کر کھینچ لیا۔
اور سیر ہو جانے پر چھوڑ دیا۔ جو نہیں مل سکا' اس کی پرواہ نہیں کی۔
میں نے ہر لحہ کچھ نہ کچھ چاہا اور کچھ نہ کچھ پا لیا۔ تاہم اپنی جستجو برقرار رکھ۔
میں نے جوانی کو بگولے کی طرح گذارا۔
اور اب احتیاطاً اپنی رفتار سست کر دی۔

"گرد راہیم ولے ذوق طلب جوہر ماست"

فاؤسٹ کے نزدیک جستجو سے مقصود حصول مقصود بہتر ہے۔ وہ منزل کو جادہ منزل بنا دینے کا عادی ہے۔ اس کے تلون اور خود سری کی بنا اس امر پر ہے کہ زندگی کا ہر تجربہ کار آمد اور روح کا مستقبل غیر محدود ہے۔ فاؤسٹ رومانیت کا زندہ مجسمہ ہے اور چونکہ ہر رومانی متہائے نظر حاصل ہو جانے پر اپنی دلکشی کھو بیٹھتا ہے' اس لئے فاؤسٹ کی جستجو کا سلسلہ بھی جاودانی ہے ۔

گفتم کہ شوق سیر نبردش بمنزلے
گفتا کہ منزلش بہ ہمیں شوق مضمر است

اسی لئے وہ زندگی کے عظیم ترین گناہ یعنی "گناہ یاس" کا کبھی مرتکب نہیں ہوتا۔
اور یاس کا ترانہ :

جو کوئی میرے دام میں آ جائے۔
محسوس کرتا ہے کہ زندگی میں کوئی خوبی نہیں۔
اسے ہمیشہ تاریکی گھیرے رہتی ہے۔
اس کی دنیا میں سورج کی روشنی کا گزر نہیں۔
تمام حواس برقرار ہونے کے باوجود اس کی روح اندھیرے میں رہتی ہے۔
اس کے لئے سعادت مفقود ہے۔
وہ خوش قسمتی اور بد قسمتی کو ایک وہم کے برابر سمجھتا ہے۔
اور دولت کو اضطراب کے۔
خوشی ہو یا غم۔
وہ کل پر اٹھا رکھتا ہے۔
اس کی نظر مستقبل پر لگی رہتی ہے۔
لیکن وہ کبھی مقصود کو نہیں پہنچتا۔"

فاؤسٹ کی فطرت کا عین تضاد ہے۔

فاؤسٹ کی رومانیت جستجوئے حقیقت۔ ذوق عمل اور جب زندگی کا تصادم موت' بے حسی اور خشک عقلیات کے نمائندہ ابلیس سے ہوتا ہے۔

تمہیدی سین میں اللہ تعالیٰ فاؤسٹ کی فطرت کو مدنظر رکھتے ہوئے غالب کے ہم خیال ہو کر فرماتے ہیں کہ :

"وفاداری بہ شرط استواری اصل ایمان ہے"

اور ابلیس فاؤسٹ کی وفاداری یعنی اس کی موہوم جستجو کو نابود کرنے کا بیڑا اٹھاتا ہے۔ شرط بندھتی ہے کہ جب فاؤسٹ گزرتی ہوئی ساعت کو کہہ اٹھے "ٹھہر تو کتنی حسین ہے۔" یعنی جب اس کا جذبہ عمل بالکل مفقود ہو کے رہ جائے' تو اس کی روح ابلیس کے سپرد کر دی جائے۔

ابلیس کے وجود کا منشا فطرت کے ابدی جذبہ تخلیق کی نفی کرنا ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں (ترجمہ فاؤسٹ۔ مقدمہ) "شیطان عشرت حیات اور قوت عمل کا ایک جزو ہے اور روح ارض کا مددگار۔ اس کا کام یہ ہے کہ انسان کے دل میں زندگی اور عمل کا ولولہ پیدا

کرے۔" میرے خیال میں حقیقت اس کے عین برعکس ہے۔ شیطان موت کا اہم ترین نمائندہ اور روح ارض کا دشمن ہے۔ اس کا کام انسان کے دل میں زندگی کی محبت پیدا کرنا نہیں' بلکہ انسان کے سامنے زندگی کا وہ پہلو پیش کرنا ہے' جو اسے زندگی سے بہت جلد سیر کر دے۔ وہ قلب انسانی میں ولولہ عمل پیدا نہیں کرتا' بلکہ اس کے فطری جذبہ عمل کو ایسے طرائق کی طرف مبذول کرتا ہے' جو فنا کی طرف لے جاتے ہیں اور تخلیق عارضی اور بیکار چیزیں ہیں۔ حقیقت اور دوام صرف موت کو حاصل ہے' اسلئے عقل کا مقتضا یہی ہے کہ دنیائے ہست کی ہر حقیقت سے انکار کرے اور اس کی ہلاکت میں ساعی ہو۔

جب فاؤسٹ کی موت پر فرشتوں کی سنگت گاتی ہے کہ :

"گھڑی بند ہو گئی۔ سوئی گر چکی۔

وقت گزر چکا۔"

تو ابلیس چونک کر کہتا ہے۔

کیا گزر چکا؟ فضول۔

کیوں گزر چکا؟

"گزر چکا اور فنا ہو چکا۔

اگر انجام فنا ہے۔

تو اس مسلسل تخلیق سے فائدہ؟

میں تو ایک ابدی خلا کو زیادہ ترجیح دوں۔"

عقلیات کا متکلم ہونے کے سبب سے ابلیس حسن عشق آرٹ اور دیگر وجدانی حقیقتوں کو جنون یا ہوس رانی کی مختلف اشکال سمجھتا ہے۔ ایک جگہ فاؤسٹ کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

"کیا کہنا اس مافوق الارض مسرت کا۔ رات کو اوس میں ان پہاڑیوں پر لیٹنا اور روحانی ذوق و شوق سے آسمان و زمین کا مشاہدہ کرنا۔ پھول کر دیوتا بن جانا۔ تخیل کے زور سے ناف زمین میں گھس جانا۔ اللہ میاں کے چھ دن کے سارے کام کو اپنے سینے میں سمیٹ لینا۔ غرور کی طاقت سے نہ جانے کیا کیا لطف اٹھانا۔ خوشی کے مارے ساری کائنات میں پھیل جانا۔ انسانیت کی قید سے رہا ہو جا اور پھر سب سے

بڑھ کر وجدان (ناشائستہ اشارہ کر کے) اور آخر میں۔ کیا کہوں۔ کہنے کی بات نہیں۔"

فاؤسٹ کے دوسرے حصہ میں جب ہیلن کی روح اسٹیج پر آتی ہے اور فاؤسٹ کے حساس دل کا ہر تار وفور کیف سے کانپنے لگتا ہے' تو ابلیس کی زبان سے صرف یہ لفظ نکلتے ہیں "تو یہ ہے ہیلن! میں تو اس کے لئے اپنا قرار ضائع نہ کروں۔ خیر اچھی ہے' لیکن میرے کام کی نہیں۔"

تاہم ابلیس کا وجود اولی الابصار کے لئے فوائد سے خالی نہیں۔ وہ "اس قوت کا ایک جزو ہے' جو ہمیشہ بدی چاہتی ہے' لیکن نیکی کرتی ہے۔" دوسرے الفاظ میں ابلیس محسوس کرتا ہے کہ اگر شباب کی موہوم اور نوخیز تمناؤں کو تنہا چھوڑ دیا جائے' تو ان کا نتیجہ کچھ بھی نہیں' اس لئے وہ گناہ زیست کو سرے سے ہی ناپید کر دینا چاہتا ہے' لیکن فاؤسٹ ابلیس کے ہاتھوں ناپید ہو جانے کی بجائے اپنی موہوم تمناؤں" میں تنظیم اور اعتدال پیدا کر لیتا ہے۔ اس کے لئے ابلیس کی ہستی معاندانہ ہونے کی بجائے مویدانہ ہو جاتی ہے۔

مختصراً فاؤسٹ ایک اولوالعزم اور عالی ہمت شخص کی سیرت ہے' جس نے قوت بازو کے زور سے گناہ اور مجاز کی تمام حدود سے گزر کر ابدی نجات حاصل کی۔ فاؤسٹ کی موہوم بے قراری اور جستجو حقیقتاً جس کی حیثیت ابتداً ایک اضطراری جذبہ سے زیادہ نہ تھی۔ بالآخر عشق' حسن' گناہ' آرٹ اور رفاہ عام کے طرائق سے ہوتی ہوئی اس کی نجات ثابت ہوئی اور اسے ابلیس کے پنجوں سے بچا لے گئی۔

سطور بالا سے گوئٹے کے ذہنی ارتقا کے مختلف مدارج کسی حد تک آپ کے ذہن نشین ہو گئے ہوں گے۔ اب اس کی تعلیم کا مختصر سا خلاصہ پیش کرنا باقی ہے۔

گوئٹے کے نزدیک انسان کا اولیں فرض زندہ رہنا ہے۔

"فرض ہے خواہ ایک لحہ کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔" (فاؤسٹ)

"جینے کی فکر کرو" "Think of living

"ہم زندہ ہیں۔ موت کیا ہے۔ محض ایک لفظ بے معنی آواز' (ویرتھر کے مصائب)

"جسے زندگی پر اعتماد ہو' وہ موت کو اپنا دشمن نہیں سمجھتا' (ولہلم مائسٹر)

"اور زندگی عمل کا نام ہے۔"

"ابتدا میں عمل تھا" (فاؤسٹ)

"In the beginning was the deed"

"سرگرمی عمل انسان کا اولیں فرض ہے۔" (ولہلم مائسٹر)

"فتح نے اپنا نام عمل کی دیوی رکھا ہے۔" (فاؤسٹ)

عشق اور عمل لازم و ملزوم ہیں۔ عشق اس موہوم جذبہ طلب کا نام ہے' جو ایک حساس دل کو تکمیل خودی کی خاطر کسی بالاتر حقیقت کی جستجو میں پریشان رکھتا ہے۔ اس جذبہ کی قیادت کے لئے عقل کا وجود لابد ہے' عقل بجائے خود اتنی صلاحیت نہیں رکھتی کہ انسان کے دماغ میں نظام کائنات یا نفس انسانی کا صحیح ادراک پیدا کرے۔ یہ ادراک محض تجربہ کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ فاؤسٹ کائنات کے محض نظارے سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔

"ہمارا فرض راز کائنات پر غور و فکر کرنے کی بجائے کشمکش زیست میں اپنا مرتبہ اور اس کے فرائض معلوم کرنا ہے کہ معمہ شروع کہاں سے ہوتا ہے اور اس کے بعد اپنی سرگرمیوں کو محسوسات تک محدود رکھنا ہے۔" (شعر اور حقیقت)

"غیر مرئی روحوں کی مدد سے آفتاب کے آتشیں گھوڑے تقدیر کی ہلکی پھلکی گاڑی کو اڑائے لئے جاتے ہیں۔ ہمارے لئے صرف اتنا ہے کہ ان کی لگامیں سکون اور خود اعتمادی کے ساتھ تھامے رہیں اور گاڑی کے پہیوں کو چپ و راست چٹانوں اور ڈھلوانوں سے بچاتے رہیں۔ ہم کہاں جا رہے ہیں یہ کسے معلوم' ہمیں تو یہ بھی یاد نہیں کہ آئے کہاں سے ہیں۔

بنگر چہ کسی و از کجا آمدہ ای
میداں کہ چہ میکنی کجا خواہی رفت

(خیام)

لیکن تجربات کی روشنی سے استفادہ کر کے اصلاح خودی اور ضبط نفس کی منازل پر پہنچنے کے لئے عقل کی مدد مانگنا پڑتی ہے۔ عقل کا کام انسان کے جذبات میں توازن اور اس کے اعمال میں تنظیم پیدا کرنا ہے۔

بات میں غلطیاں اور گناہ بھی شامل ہیں' لیکن گوئٹے شر کی قطعیت کا قائل نہیں۔ شر کا مقصد خیر کا احساس پیدا کرنا ہے۔ گناہ اور اس کے نتائج انسان کی تکمیل کے لئے تعلیم اور

تادیب کے مترادف ہیں۔ فاؤسٹ کی طرح گناہ کے ذریعے بقائے دوام حاصل کر لینا واگنر کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنے سے کہیں بہتر ہے۔

اطفال و اقوام کی تربیت کا فضول ترین عنصر وہ قوانین ہیں' جو انہیں بجائے کسی ایک کام کی ترغیب دینے کے کسی دوسرے کام سے منع کریں۔ آدمی فطرتاً عمل پسند ہے۔ وہ ایک طریق پر سختی سے کاربند رہ سکتا ہے' بشرطیکہ آپ کو اتنا کہنے کا سلیقہ ہو کہ "تم کو یہ کرنا ہے۔ غلطیاں اور خطائیں سہہ کر حقیقت کو پا لینا اس سے کہیں بہتر ہے کہ آدمی غلطیوں سے پرہیز کرتا رہے' لیکن ان کی جگہ لینے کے لئے کوئی اور نظام عمل موجود نہ ہو۔"

اسی وجہ سے گوئٹے کی تصنیفات ندامت اور افسوس کے جذبات سے قطعاً" معرّا ہیں۔ گریٹشن کی موت پر فاؤسٹ کے کرب و اضطراب کو "فاؤسٹ" کے پہلے اور دوسرے حصہ کے درمیانی وقفہ کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ و لہلم یکے بعد دیگرے اپنے تمام گناہوں اور تمام ذہنی صدموں کو فراموش کرتا چلا جاتا ہے۔

مکمل انسان بننے کے لئے ذوق عمل' سلامت خیال اور وقت نظر کا امتزاج ضروری ہے۔ اس منزل پر پہنچنے کے لئے گوئٹے نے آرٹ کو بھی اہمیت دی ہے۔ گوئٹے کے نزدیک آرٹ کا مقصد حواس انسانی کو مخمور و مدہوش بنانا نہیں' بلکہ انہیں ابھارنا' بیدار کرنا اور ان میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ انسان کو جزئیات کے تنگ دائرے سے نکال کر کلیات سے آگاہ کرنا ہے۔ اس کے دل میں فطرت کے دیگر عناصر سے ہمدردی پیدا کرنا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اسے اپنی ممکنات اور حدود سے واقف کرنا ہے۔

گوئٹے حیات بعد الممات کا قائل ہے' لیکن اس کے نزدیک ہر جاندار اس کا مستحق نہیں۔

آئندہ زندگی کا انحصار موجودہ زندگی پر ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے: "ایک معقول آدمی کسی مقصود کو حاصل کرنا ہے' وہ اگلی دنیا کی پروا نہیں کرتا اور اس دنیا میں سرگرم اور مفید ہونا کافی سمجھتا ہے۔" اس کے نزدیک دنیا میں بعض دوامی اصول ایسے ہیں' جنہیں قدرت فنا نہیں کر سکتی۔ انسان کو حیات جاوید حاصل کرنے کے لئے ان اصولوں کا جزو بننے کی صلاحیت پیدا کرنی چاہئے۔ Xenien میں لکھتا ہے "کیا تم موت سے خائف ہو؟ کیا تمہیں حیات جاوید کی تمنا ہے؟ تو پھر کل کا ایک جزو بن کے رہو۔ وہ تمہارے بعد بھی قائم رہے گا۔"

مختصراً گوئٹے کی تعلیم دو عناصر پر مشتمل ہے۔ ذوق عمل اور ضبط نفس۔ اس کے نزدیک جہد پیہم زندگی ہے۔ ابدی زندگی اور تساہلی اور کاہلی موت ہے' ابدی موت۔

(مجلس لاہور۔ 1936ء- گورنمنٹ کالج (لاہور)' مجموعہ نظم و نثر' زیادہ تر کالج کے زیر تعلیم طلبہ کی تحریریں۔ مقالات فیض مرتبہ شیما مجید' لاہور : فیروز سنز' 1990ء' ص 72-83)

حسین صدیقی

گلشن ویمر کا نواسنج ___ گوئٹے

ادبستان عالم میں ہر گل ایک خاص نوعیت اور ہر عندلیب ایک انوکھی نوا رکھتا ہے اور اپنے بعد اپنے نغمات کی صدائے بازگشت سے اپنے وجود کو ہمیشہ یاد دلاتا رہتا ہے۔ دور گذشتہ کے عندلیبان خاموش میں ہم آج ایک ایسی ہستی کو بھی زمانہ میں مترنم پاتے ہیں، جس کی پاکیزگی خیال، ندرت جذبات، بلندی تخیلات کا اس وقت تک یورپ میں تو کوئی ہم پلہ نہیں۔ لوگ مغربی دنیائے ادب میں شیکسپیئر کو بہت اہمیت دیتے ہیں، مگر سچ تو یہ ہے کہ شیکسپیئر نے گذشتہ نکات منتشرہ کو اکٹھا کر کے ایک نیا ڈھانچا بنا دیا ہے اور ان پر ایک نئی جلا دی ہے، بلکہ اپنی خداداد طباعی سے انکی معنویت کو خود ساختہ کر لیا ہے۔ فرانس میں ڈی بیل زک البتہ گوئٹے کے برابر ہے، مگر ڈی بیل زک میں وہ گوئٹے کی شوخی تحریر اور تخیل کے پردہ میں حقیقت کی جھلک نہیں ہے۔ ڈی بیل زک انسانی ہستی کا مرقع کھینچنے میں کمال رکھتا ہے اور اس کا سچا مصور ہے۔ گوئٹے کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے خدائے سخن حضرت غالب کا یہ شریک ہے اور واقعہ یہ ہے کہ غالب مرحوم کی طرح یہ بھی ادبستان مغرب میں سب پر غالب ہے۔ ہاں فرق اتنا ہے کہ حضرت غالب میں تمام جذبات شاعری اتم درجے پر قدرتاً موجود تھے اور ان کا ہلال تخیل کسی خورشید کے پرتو کا محتاج نہ تھا۔ برخلاف اس کے گوئٹے کی شاعرانہ طبیعت اس سے کمزور واقع ہوئی تھی اور اس کے لئے ضرورت تھی کہ کسی کے آفتاب حسن کی تمازت اس کو گرمائے اور پائے کمال کو پہونچائے۔

ایسی کمزوری اس میں ہونی چاہیئے تھی' اس لئے کہ وہ ایک غریب خشک مزاج درزی کا لڑکا تھا۔ گوئٹے کا عروج یا اس کی شاعری کا کمال اس وقت سے شروع ہوتا ہے' جب 1772ء میں وہ شارلاٹ نامی ایک لڑکی پر عاشق ہوا' جو اس سے دو سال قبل ایک دوسرے شخص سے منسوب ہو چکی تھی۔ اسی ناکامی اور مایوسی کا نتیجہ اس کی مشہور و معروف تصنیف "حرماں نصیب ورٹر" ہے' جس نے گوئٹے کو چار دانگ عالم میں مشہور کر دیا اور اسوقت تک تمام یورپ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ سب سے بڑا ثبوت اس کتاب کی مقبولیت کا اس کے رقیب کے الفاظ ہیں' جو یوں لکھتا ہے "جب جوش میں کچھ کمی آئے گی اور یہ آگ بجھ جائے گی' اس وقت ہم کو مصنف کی تحریر سے خوشی اور مسرت حاصل ہو گی۔"

ہم ناظرین کی دلچسپی کے لئے اس کتاب کا ایک ٹکڑا پیش کرتے ہیں' جس سے خود ناظرین کو اندازہ ہو جائے گا کہ اس کتاب کے بارے میں کارلائل کی رائے کس قدر انسب ہے۔

"لوگوں نے نہایت زور کے ساتھ اس کتاب کا خیر مقدم کیا اور بہت پسند کیا۔ وہ بے نشان بے چینی' وہ روح کی غلامی میں کشمکش' وہ بلند اور بے قرار کرنے والی بے صبری جس سے ہر دل متاثر ہے۔ اس نے گوئٹے کو بالکل مایوس بنا دیا تھا اور اسے ہر شخص محسوس کرتا تھا' لیکن اس نے اس کی صدا بلند کی اور یہی اس کی ناموری کا باعث ہے۔ اس کے دل میں وہی خیالات موجزن تھے' جس سے ہر شخص متاثر تھا' مگر قوت متخیلہ جو اسے ایک شاعر ہونے کی حیثیت سے ملی تھی' اسے اس نے ایک لفظی جامہ پہنا دیا اور اسے کتابی صورت میں لا کر اپنے وقت کا بڑا راہرو بن گیا۔ دراصل ورٹر ایک فریاد اس دلی اور روحانی تکلیف کی ہے' جس میں ایک خاص زمانہ کے اصل خیال مبتلا تھے اور یہی باعث ہے کہ تمام یورپ آج اس کی تعریف میں یک زبان ہے اور اس کا طالب۔"

حرماں نصیب ورٹر

خط نمبر 31

12 اگست۔ البرٹ سے بڑھ کر ہونہار نوجوان ملنا مشکل ہے۔ کل کی گفتگو نہایت

دلچسپ تھی اور اس قابل ہے کہ تمہیں لکھوں۔ میں اس سے رخصت ہونے کے لئے گیا کیونکہ چند روز کے لئے پہاڑ پر جانے والا تھا۔ چنانچہ آج اسی پہاڑ پر سے لکھ رہا ہوں۔ اس کے کمرے میں ٹہلتے ہوئے میں نے اس کا پستول دیکھا اور سفر کے لئے اس کو عاریتاً مانگا۔ اس نے کہا' ہاں نہایت شوق سے لے جایئے' لیکن بھرنے کی زحمت گوارا کرنا پڑے گی' کیونکہ میں تو محض شوقیہ اس کو رکھتا ہوں۔ ایک دفعہ حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس وقت سے میں نے پھر کبھی اس کو بھرنے کا خیال بھی نہیں کیا۔ میں نے واقعہ پوچھا۔ اس نے کہا کہ میں تین مہینے تک ایک دوست کے یہاں گاؤں میں مقیم رہا اور گو میرا پستول بھرا ہوا تھا' لیکن مجھے کسی قسم کا کھٹکا نہ تھا۔ ایک سہ پہر کو بارش ہو رہی تھی' مجھے بیکاری میں یہ خیال گزرا کہ آج شب کو چور نہ آئیں۔ چنانچہ میں نے اپنے خدمتگار کو پستول صاف کرنے کے لئے دے دیا۔ اس نے مذاق میں بارود بھر کر ایک ملازمہ کو ڈرانا شروع کیا اور اتفاقی طور پر ایک نال چل گئی۔ غلطی سے گز بھی اس میں رہ گیا تھا' جو اڑ کر ملازمہ کے داہنے ہاتھ میں لگا اور انگوٹھا پھٹ گیا۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ اس میں کتنی پریشانی ہوئی اور ڈاکٹر کی جو فیس ادا کرنا پڑی' وہ مستزاد۔ اس تاریخ سے میں نے پستول کو بھر کر نہیں رکھا۔ گو میں جانتا ہوں کہ انسان کی تمام کوششیں کسی خطرہ کو یا کسی آنے والی مصیبت کو نہیں روک سکتیں۔ باتیں ہو رہی تھیں اور البرٹ اپنے خیالات کا جوش کے ساتھ اظہار کر رہا تھا۔ مجھے اب باتوں میں کچھ دھیان نہ رہا اور میں نے پستول سے کھیلنا شروع کیا۔ بے خیالی میں اس کی نال کا منہ اپنی پیشانی سے لگا لیا۔ البرٹ نے مجھ سے فوراً پستول چھین کر کہا۔ ہائیں یہ کیا کرتے ہو۔ میں نے کہا یہ تو خالی ہے۔ اس پر اس نے جوش میں کہا کہ اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ کوئی شخص کیسے خودکشی کر لیتا ہے۔ مجھے تو اس کے خیال سے خوف آتا ہے۔ میں نے کہا کہ تم اس کے متعلق یوں کیونکر فوری رائے قائم کر سکتے ہو۔ نتیجہ پر پہونچنے کے لئے اس کو سوچنا چاہئے کہ یہ کیوں کیا گیا اور اس کی ضرورت کیا تھی۔ جب یہ سوچو گے تو یوں جلد کوئی رائے قائم نہ کرو گے۔ البرٹ نے کہا کہ بعض افعال چاہے کسی وجہ سے کئے جائیں' مگر ہر صورت میں وہ جرائم کی حد تک پہونچتے ہیں۔ میں نے اسے سرسری طور پر مانتے ہوئے کہا کہ ہاں' مگر اس میں چند مستثنیات بھی ہیں۔ چوری ایک جرم ہے' لیکن وہ بدنصیب مجرم جو انتہائی غربت سے پریشان ہے اور جو محض اپنے اور اپنے خاندان کی

قوت لایموت کے لئے کچھ چرا لیتا ہے' تو کیا وہ قابل سزا ہے یا قابل افسوس۔ اس شوہر کو کون قاتل کہے گا' جو غصہ میں اپنی وفادار بیوی اور اس کے دغاباز عاشق کو قتل کر دیتا ہے۔ کون اس معشوقہ کو بدکار کہے گا' جو اس دغاباز چاہنے والے کی جھوٹی باتوں میں آ کر اور جھوٹے وعدوں پر اعتبار کر کے اس کے دام فریب میں آ جاتی ہے۔ ہمارے سخت قوانین بھی ان صورتوں میں رحم کریں گے اور سزا نہ دیں گے۔ البرٹ نے کہا' لیکن یہ مثالیں تو عائد نہیں ہوتیں۔ جو شخص جلد بازی سے کوئی کام کرتا ہے' وہ یا تو متوالا ہے یا مجنون۔ میں نے کہا ارے یار تم تو نہایت ٹھنڈے دل سے جنون اور جوش جذبات کی برائی بیان کر رہے ہو۔ ہوش و حواس میں رہ کر تم متوالوں کی مذمت کرتے ہو' میں نے بھی اکثر نشہ کا استعمال کیا ہے' اس وقت عجیب عجیب خیالات دل میں موجزن ہوتے ہیں' جن کے اقرار میں مجھے حجاب نہیں' کیونکہ مجھے ان سے ایک سبق ملا۔ ہر شخص جو ذرا تیز طبع اور ذکی ہوتا ہے اور کوئی غیر معمولی کام کرتا ہے' لوگ اسے متوالا اور مجنوں قرار دے دیتے ہیں۔ معمولی روزمرہ کی زندگی میں بھی یہ الفاظ ایسے شخص کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں جو حقیقتاً فیاض اور بہادر ہے اور اسے متوالا یا مجنوں کہتے ہیں۔ اے فلسفیو! اور اے اخلاق کے حامیو! ذرا اپنے دل میں شرماؤ اور پشیمان ہو۔ البرٹ نے کہا کہ یہ تو تمہارے شاعرانہ خیالات ہیں۔ تم ہمیشہ بڑھ جاتے ہو اور نفس مضمون سے ہٹ جاتے ہو۔ تم خودکشی کو ایک بہادرانہ فعل سمجھتے ہو۔ حالانکہ یہ ایک مسلمہ کمزوری ہے۔ کیونکہ مرجانا اس تکلیف سے آسان ہے' جس میں طرح طرح کے مصائب پیش آتے ہیں اور مردانہ وار دلی الجھنوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

میں چاہتا تھا کہ کسی طرح یہ بحث ختم ہو' کیونکہ ایسی معمولی رائے مجھے پسند نہیں آتی' لیکن خدا جانے آج کل کیا ہو گیا ہے کہ بحث کی پیچیدگیوں سے نہیں گھبراتا۔ میں نے جوش میں کہا کہ کیا تم خودکشی کو کمزوری سمجھتے ہو؟ لیکن ذرا سوچو اور غور کرو' محض کھلی ہوئی باتوں پر نہ جاؤ۔ اگر کوئی قوم ظالموں کے ظلم سے تنگ آ کر ان کے خلاف بغاوت کرے اور ان کی حاکمانہ بندشوں کو توڑنا چاہے تو کیا تم اس بغاوت کو کمزوری کہو گے۔ یا یوں سمجھو کہ اگر ایک بہادر شخص جو دس دس بیس بیس دشمنوں کے مقابلہ سے نہیں گھبراتا' لیکن جب اس کے گھر میں آگ لگتی ہے' تو وہ اپنا اسباب نکال کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ کیا تم اسے کمزور کہو گے۔ البرٹ نے ذرا رک کر کہا' یہ مثالیں معاف کرنا چسپاں نہیں ہوتیں۔ میں نے کہا کہ

ممکن ہے یہی بات ہو' کیونکہ میری باتوں کے متعلق اکثر یہی کہا جاتا ہے کہ میں بے خیالی سے باتیں ملا لیا کرتا ہوں' لیکن اچھا اسے ایک دوسرے پہلو سے دیکھنا چاہئے۔ ہم کو اس شخص کی حالت پر غور کرنا چاہئے' جو زندگی کے ختم کرنے پر تیار ہے۔ غرضیکہ جذبات کا لحاظ کرنا چاہئے جن کے بغیر صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ انسانی قوت کی ایک حد ہوتی ہے اور اس میں ایک خاص درجے تک خوشی و رنج و تکلیف کے برداشت کی قابلیت ہوتی ہے۔ جب یہ حد سے گزر جاتی ہے تو انسانی قوت بیدم ہو جاتی ہے۔ ہم کو انسانی طاقت و کمزوری پر غور نہ کرنا چاہئے' بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ اس میں کہاں تک قوت برداشت ہے۔ میرے خیال میں اس شخص کو جو خودکشی کرتا ہے' کمزور کہنا اسی حد تک لغو ہے جس حد تک کہ کسی شخص کو جو بخار میں مبتلا ہو کر مرا ہو۔ البرٹ نے بات کاٹ کر کہا کہ یہ بالکل خیالی باتیں ہیں۔ "خیالی" تمہاری رائے صحیح نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ کسی مرض کو مہلک کہنے کے یہ معنی ہیں کہ اس میں کسی حملہ کے روکنے کی طاقت باقی نہیں ہے اور اسکی قوت اس درجہ کم ہو گئی ہے کہ وہ زندگی کو قائم اور اس کی حرکت کو جاری نہیں رکھ سکتا۔ اب اس کو دل پر منطبق کرو اور دیکھو کہ اس پر جذبات و خیالات کا کیا اثر پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک جوش پوری طرح اس پر قابض ہو جاتا ہے اور اس کی پہلی قوتیں بالکل سلب ہو جاتی ہیں۔ اس وقت سمجھدار اور نکتہ داں شخص کی سعی بیکار ہوتی ہے اور نصیحت بے اثر اور وہی حالت ہو جاتی ہے کہ ایک قوی اور تندرست شخص اپنے مردہ دوست کی نعش کے پاس بیٹھ کر اسے قوت نہیں پہنچا سکتا۔

ایسی بحث البرٹ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ اسے بہت عام بحث سمجھتا ہے۔ میں نے اس لڑکی کی مثال دی' جس نے حال میں ڈوب کر خودکشی کی ہے۔ گو اس واقعہ کو وہ پہلے سن چکا تھا لیکن میں نے اس کا اعادہ کیا۔ ایک معصوم نو عمر لڑکی جس کی زندگی محض امور خانہ داری اور محنت و مزدوری تک محدود ہے۔ اس کی ساری خوشی کا انحصار اس پر ہے کہ اتوار کو کھیتوں کی سیر کرے۔ تعطیل میں رقص و سرود کے جلسہ میں شریک ہو اور بقیہ تعطیل پڑوسیوں سے بات چیت کر کے ختم کر دے اور بات چیت بھی محض گھر آنگن کی ہو اور اسی گاؤں تک محدود ہو۔ بالاخر اس کے دل میں نئے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور پرانی مسرتیں مفقود ہوتی جاتی ہیں۔ وہ اتفاقاً" ایک نوجوان سے ملتی ہے اور اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی

ہے۔ اس روز سے صرف اس کی الفت پیش نظر رہتی ہے اور ساری دنیا تاریک۔ اس کے دل میں محض یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کس طرح اس کی ہو جائے۔ وہ اس کی بیوی بننے کا خواب دیکھا کرتی ہے اور اس خواب کے پورا ہونے کی خدا سے التجا کرتی ہے۔ ان امیدوں میں اس نوجوان کے وعدوں سے پختگی آتی ہے اور نوجوان کے اظہار محبت سے اس میں جوش کے ساتھ مسرت شریک حالی ہوتی ہے۔ آخرکار وہ اس سے انتہائے محبت سے ملنے کے لئے ہاتھ بڑھاتی ہے۔ مگر اب دھوکا ظاہر ہوتا ہے۔ اس کا عاشق جھوٹا نکلتا ہے اور اس لڑکی کو بھول جاتا ہے۔ حیران و پریشان وہ مصیبت کے تاریک غار میں گر پڑتی ہے۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہوتی ہے اور کہیں سے امید کی جھلک نہیں۔ وہ نوجوان ہمیشہ کے لئے چھوٹ جاتا ہے' جس کے لئے یہ لڑکی جیتی تھی۔ اب اس کے واسطے دنیا سونی ہے اور سیکڑوں جانبازوں کے بیچ میں وہ تنہا ہے۔ اس طرح اندھی ہو کر اور دلی الجھنوں اور بے قراریوں سے گھبرا کر وہ اپنی قبر میں کود پڑتی ہے اور یہی حالت اے البرٹ بہت سے لوگوں کی ہوتی ہے۔ کیا یہ واقعہ اس بیماری کے مشابہ نہیں ہے۔ قدرت اس کی نجات کا کوئی ذریعہ نہیں پاتی۔ اس کے قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں' وہ بیماریوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی' جس کا انجام موت ہوتا ہے۔ افسوس ہے اسے سن کر بھی کوئی شخص کہے کہ یہ کمزور لڑکی تھی۔ اس نے اس وقت تک کیوں نہیں برداشت کیا کہ اس کا اثر زائل ہو جاتا یا کوئی دوسرا عاشق مل جاتا' جس سے اس کا دل بہل جاتا اور طبیعت کو سکون ہو جاتا۔ اسی طرح ایک دوسرا شخص کہہ سکتا ہے کہ او بیوقوف بخار سے مرنے والے' تو اس وقت تک کیوں نہ زندہ رہا جبکہ خون میں سردی آ جاتی اور قوت عود کر آتی اور حالت روبہ اصلاح ہو کر پھر زندگی قائم ہو جاتی۔ البرٹ نے اس مثال سے اتفاق نہیں کیا اور یہ کہا کہ تم نے تو محض ایک جاہل لڑکی کی مثال دی ہے' لیکن ایک سمجھدار اور تعلیم یافتہ شخص جس کے خیالات میں وسعت ہے اور جو مختلف طریقوں سے اپنا دل بہلا سکتا ہے' کبھی خودکشی کا مجرم نہ ہو گا۔ میں نے کہا کہ عالی جناب انسان لاکھ تعلیم یافتہ ہو' پھر بھی انسان ہے اور جب طبیعت میں جوش ہوتا ہے' عقل ٹھکانے نہیں رہتی۔ علاوہ بریں------ مگر خیر اب پھر کبھی گفتگو کروں گا۔ یہ کہہ کر میں وہاں سے گھبرا کر اٹھا۔ افسوس اس وقت میرا دل بالکل بھرا ہوا تھا اور ہم بلا کسی تصفیہ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ آہ! انسان بہت کم ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔

(الناظر (لکھنؤ)' اکبر نمبر' جلد 23' نمبر 136' بابت اکتوبر 1921ء' ص 23-28)

عباس درویش

گوئٹے پر حافظ کی شاعری کا اثر

پینسٹھ برس کی عمر میں گوئٹے کی زندگی کا ایک دلچسپ دور شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے وہ مدتوں طبیعیات اور حیاتیات کی دشوار گزار گھاٹیوں میں بھٹکتا پھرا۔ خوش قسمتی سے اس علمی تگ و دو میں گوئٹے کے فطری ذوق ادبیات نے اس کا دامن تھامے رکھا' ورنہ ممکن تھا کہ اس کے فلک پیما تخیلات جو جرمن زبان کی شاعری کا بہترین سرمایہ ہیں' سائنس کے کسی ادق مسئلہ میں الجھ کر رہ جاتے۔ جس طرح ٹالسٹائی آخری عمر میں جمالی اور اخلاقی رجحانات کی کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا' اسی طرح گوئٹے کی طبیعت بھی سائنس اور ادب کی آویزش سے محفوظ نہ رہ سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں اس کی شاعری میں سائنس کا دخل ہو گیا' وہاں اس کے علمی نظریات میں شاعری کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ آپ "فاؤسٹ" ہی کو لیجئے۔ اس میں علم کیمیا' مابعد الطبیعیات اور نظریہ ارتقا کے مسائل کا بیان شاعرانہ تخیل کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اسی طرح سائنس کے میدان میں جب اس نے نیوٹن کے سات رنگوں والے نظریہ کی تردید کی' تو تمام یورپ کے حکما نے اس کی مخالفت میں لمبے چوڑے مضامین لکھے' مگر وہ برابر کہتا گیا کہ میں یہ کیسے مان لوں کہ سفید روشنی جو ایک سماوی مظہر قدرت ہے' سات حصوں میں منقسم ہو سکتی ہے:

بت پرستی میں بھی رکھ حسن کے پہلو پہ نظر
ہار بن' دیر سے رشتہ ہو تو زنار نہ بن

عمر کے اس دور میں جب عوام کے روحانی اور جسمانی قواء پر یخ بستہ افسردگی چھا جاتی ہے اور ہمارے شاعر "شیب" کا ماتم شروع کر دیتے ہیں، گوئٹے کی رگوں میں خون کے بجائے شراب اور آگ گردش کرنے لگتی ہے اور وہ ایک نوعمر عاشق کی عقیدت مندی کے ساتھ "محبوب چہاردہ سالہ" کے سامنے دو زانو ہو جاتا ہے۔

اس حیرت انگیز تبدیلی کی وجہ یہ ہے کہ اتنا عرصہ خشک علمی مباحث میں مصروف رہنے سے اس کی طبیعت افسردہ ہو گئی تھی۔ اب آہستہ آہستہ رد عمل شروع ہو رہا تھا۔ عین اسی وقت وہ حافظ شیرازی کی شاعری سے روشناس ہوا۔ فارسی شاعری اور تغزل کی دو نمایاں خصوصیات ہیں۔ حکمت اور عشق چونکہ گوئٹے کی فطرت کا خمیر انہی دو عناصر سے اٹھایا گیا تھا، اسلئے وہ حافظ کے حکیمانہ تغزل سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ حافظ نے بندگی اور الوہیت، حقیقت و معرفت، مذہب و اخلاق اور فنا و بقا کے مسائل کو ساقی کے گوشہ چشم اور چین ابرو سے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہماری ذہنی الجھنوں میں مذہب اور تصوف کا اثر غالب ہے، اس لئے ہم حافظ کی شراب کو شراب معرفت سے تعبیر کرتے ہیں، مگر گوئٹے جو مذہب کیا مذہب کا دشمن تھا، اس کو معرفت اور حقانیت کا واعظ نہیں بلکہ جوانی اور محبت کا پیامبر سمجھتا تھا۔ اس کو حافظ کی شراب میں تلخی اور بدمستی کا احساس ہوتا تھا۔ اس کے لئے حافظ کی قنوطیت بھی امید افزا ثابت ہوئی۔ حافظ کے کلام کا مطالعہ کرنے سے بقول خود اس کو از سر نو شباب حاصل ہو گیا۔ نقطہ نگاہ کا اختلاف کہئے یا ذہنیت کا فرق، کیسی ستم ظریفی ہے کہ جو کلام ہمیں یاس و قنوط کا درس دیتا ہے، جسے پڑھ کر ہمارے نوجوانوں کے عملی قویٰ مفلوج ہو جاتے ہیں۔ وہی کلام ایک آزاد قوم کے لئے آب حیات کا کام کرتا ہے۔

گوئٹے پر حافظ کے کلام کا یہ اثر ہوا کہ دن رات اس پر عجیب مسرت بخش وجدانی کیفیت طاری رہنے لگی۔ وہ بسا اوقات گوشہ تنہائی میں چلا جاتا یا باہر ویرانہ میں نکل جاتا اور پہروں ایک ہی شعر پر غور و خوض کرتا رہتا۔ معنوی محاسن سے قطع نظر اس کو غزل کے قافیے اور ردیف سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ مگر سب سے زیادہ وہ فارسی شاعری کی اچھوتی تشبیہوں سے متاثر ہوا۔ مثلاً سیمیں ذقن، گلبدن، آہو چشم، نرگس جماتن، بوسہ شکریں، سروِرواں، لعل نوش لب، ساق شمشاد قد، ساعد سیم اندام وغیرہ۔ مغربی شاعری میں لطیف تشبیہوں کی کمی نہیں، مگر فارسی کے مقابلے میں گوئٹے انہیں ہیچ سمجھتا تھا۔ حافظ کی نادر

تراکیب اور سبک بندشیں اس کی جمالیاتی حس کو تسکین کا سامان بہم پہنچاتی تھیں۔ اس کے تتبع میں گوئٹے نے بعض بہت نازک تراکیب اپنی زبان میں داخل کیں۔ گوئٹے کے اس رنگ میں کہے ہوئے قطعات حافظ کے شعروں کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔

گوئٹے ایک آزاد مشرب حکیم تھا۔ اس کا تخیل وطنیت اور ملت کی بندشوں سے آزاد تھا۔ بنی نوع انسان کے لئے اس کی ہمدردی اور دلسوزی ہمہ گیر تھی۔ وہ رنگ و قوم کی قیود کو انسانیت عالیہ کے لئے لعنت سمجھتا تھا۔ اس نے بارہا اپنی قوم کے قومی جنون' خود پرستی' استبداد' عسکری تادیب اور فنون لطیفہ سے بیگانگی کا رونا رویا ہے۔ اس کا قول ہے کہ اگر جرمنوں کو یہودیوں کی طرح ساری دنیا میں بکھیر دیا جائے' تو وہ یقیناً انسانیت عالیہ کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ بحیثیت قوم ان کا وجود حد درجہ خطرناک ہے۔ چونکہ وہ خود ایک عالم بے بدل تھا' اس لئے کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ عمر بعد میں اس نے صرف دو شاعروں کو اپنا ہم مرتبہ تسلیم کیا۔ حافظ اور بائرن۔ حافظ کے مشرب کی عالمگیر وسعت نے اس پر جادو کا اثر کیا۔ اس شعر کو اس نے یقیناً بہت سراہا ہو گا:

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

والٹیر کی طرح وہ بھی اپنے ہم عصر رہنمایان دین کی ریاکاری اور ابلہ فریبی سے سخت نالاں تھا۔ حافظ نے مکار صوفیوں کا خوب خاکہ اڑایا ہے۔ یہاں بھی دونوں میں نسبت روحانی پیدا ہو گئی۔ حافظ کے مندرجہ ذیل اشعار میں اسے ویمریا برلن کے کسی گندم نما جو فروش بشپ کی زندہ تصویر حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہو گی:

نقد صوفی نہ ہمہ صافی و بے غش باشد
اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد
صوفی ما کہ زرد سحری ست شدے
سارگاہش نگراں باش کہ سرخوش باشد
صوفیاں جملہ حریفند و نظر باز ولے
ایں میاں حافظ دل سوختہ بدنام افتاد
واعظاں کیں جلوہ محراب و منبر می کنند

چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند
فقیہ مدرسہ دی مست بود و فتویٰ داد
کہ مے حرام ولے بہ زمال اوقاف است

اس جگہ بے اختیار مجھے پنجاب کے "طرہ باز" پیرزادوں کا خیال آ گیا' جن کے مجاہدات نفس کونسل کی ممبری کے لئے دوڑ دھوپ' خرگوش کے شکار اور کشمیر کی سیر تک محدود ہو کے رہ گئے ہیں۔ مریدوں کی جو حالت ہو گی وہ ظاہر ہے۔ طالب آملی نے سچ کہا ہے :

خانہ شرع خراب است کہ ارباب صلاح
در عمارت گری گنبد دستار خود اند

حافظ کے کلام نے گوئٹے کو صحیح معنوں میں جوان کر دیا تھا۔ اس کا جنسی جذبہ از سر نو بھڑک اٹھا۔ انہی ایام میں جب وہ حافظ کے ہاتھ سے بادۂ شیراز کے جام نوش کر رہا تھا' ایک مدت کی جدائی کے بعد اسے اپنا ایک رنگیں مزاج دوست فان ولمر ملا۔ فان ولمر کے ساتھ اس کی نوعمر محبوبہ میرین بھی تھی۔ میرین جیسی خانہ بدوشوں کی لڑکی تھی جسے چودہ برس کی عمر میں فان ولمر نے اس کے والدین سے خرید لیا تھا۔ آمد شباب کے ساتھ اس بدیشی حسینہ کا جوبن پہاڑی چشمے کی طرح پھوٹ پڑا۔ متناسب اعضا' گدرایا ہوا جسم' سیاہ رسیلی آنکھیں' کلی کی طرح نازک دہن' آواز میں طوطی شکر دہاں کی چہک' گوئٹے نے محسوس کیا جیسے حافظ کی خیالی محبوبہ اس کی نگاہوں کے سامنے زندہ ہو کر آ گئی ہے۔ ہزار جان سے اس پر عاشق ہو گیا۔ وہ اسے مشرقی حسن کا بہترین نمونہ سمجھنے لگا' عربی اور فارسی ادبیات کے مطالعہ کے بعد لفظ "مشرق" کے ساتھ جو رنگین تاثرات اس کے ذہن پر مرتسم ہو گئے تھے' میرین کو دیکھ کر تازہ ہو گئے۔ اس کے رگ و پے میں عنفوان شباب کی گرمی دوڑ گئی اور اس کے جمالی احساسات تھرتھرا اٹھے :

گفتم ز لعل نوش لباں پیر را چہ سود
گفتا بہ بوسہ شکر ینش جواں کنند

انہیں ایام میں فان ولمر نے گوئٹے کو اپنے دیہاتی مسکن پر آنے کی دعوت دی' جسے اس نے دلی شوق کے ساتھ قبول کر لیا۔ اب اس کی زندگی شراب و شعر کی فضا میں گذرنے لگی۔ وہ بہت کم باہر نکلتا۔ اپنے کمرے میں ایک طرف بیٹھا تصورات کی دنیا میں کھویا رہتا۔

سامنے میز پر ایک نقرئی ساغر شراب سے لبالب بھرا پڑا رہتا اور وہ اس پر نظریں گاڑے بے حس و حرکت اپنی جگہ بیٹھا رہتا:

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم
اے بے خبر زلذت شرب مدام ما

دن کا کچھ حصہ وہ پائیں باغ کے پھولوں کے مطالعہ میں گزارتا اور شام کو میرین سے پیانو پر اپنے لکھے ہوئے گیت سنتا اور سر دھنتا۔ بسا اوقات جذبات کی فراوانی سے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ میرین اپنے دست نازک سے اسے مئے گلرنگ انڈیل کر دیتی۔ جب گوئٹے آتش بار نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا' تو میرین کے رخسار ان کی تپش سے تمتما اٹھتے:

یاد باد آنکہ چو یاقوت قدح خندہ زدے
درمیان من و لعل تو حکایت ہا بود

کبھی کبھی وہ اس کے قریب آ بیٹھتی تو گوئٹے جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں اسے اپنی شراب و عشق کی تعریف میں لکھی ہوئی غزلیات سنایا کرتا۔ میرین جس کی رگوں میں صحرا کا جنوں پرور خون گردش کر رہا تھا' اپنے بوڑھے عاشق کی والہانہ محبت کی تاب نہ لا سکی۔ اس معمر شاعر کے گیتوں نے جن میں بادۂ شیراز کی آگ دہک رہی تھی' اس پر جادو کر دیا اور وہ بھی اس سے محبت کرنے لگی۔ گوئٹے کا یہ قطعہ اسی زمانے کا ہے:

اس نے مجمع پر ایک نگاہ دزدیدہ ڈالی
سب حیران ہیں کہ اس نگاہ کا مطلوب کون ہو سکتا ہے
مگر میں خوب جانتا ہوں کہ یہ خاموش پیار
میری ہی خوش نصیبی میں اضافہ کرے گا

مگر یہ معاملات ناز ونیاز زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکے۔ فان ولمر گوئٹے کی سرمستی اور میرین کی محبت بھری محجوب نگاہوں سے خائف ہو گیا:

ترا حیا و مرا آب دیدہ شد غماز وگرنہ عاشق و معشوق راز دارانند

اس کے بعد جلد ہی ولمر نے میرین سے نکاح کر لیا۔ اب گوئٹے کو بھی اخلاقی فرض کے پیش نظر اپنی محبوبہ سے جدا ہونا پڑا اور وہ دل پر پتھر رکھ کر ویمر چلا گیا۔ اس کے بعد تا دم

مرگ ان کی ملاقات نہ ہو سکی، مگر میرین کی محبت اس کے دل میں باقی رہی۔ اب اس نے اپنی نظموں میں اپنے آپ کو حافظ اور میرین کو زلیخا کے نام سے مخاطب کرنا شروع کر دیا۔ میرین بھی گوئٹے کو نہ بھلا سکی۔ لطف یہ ہے کہ اس پرجوش جذبہ عشق نے اس صحرائی حسینہ کو شاعرہ بنا دیا۔ اس واقعے کے بعد ان کی خط و کتابت جاری رہی اور وہ شعروں میں ایک دوسرے پر اپنی ناکامی آرزو کا اظہار کرتے رہے۔ گوئٹے کے دیوان میں جو دیوان حافظ کی روش پر لکھا گیا ہے میرین کی چار نظمیں بھی شامل ہیں۔ اور اہل نقد و نظر انہیں اس دیوان کی چند بہترین نظموں میں شمار کرتے ہیں۔

ویمر میں میرین کی طرف سے جو پہلا خط گوئٹے کو ملا، اس میں اس مطلب کے اشعار درج تھے۔

آہ! میری حسرت نصیب محبت
اے نسیم! تیرے بازو پر کیف آور لمحات کا بار ہے
اور تیرے جھونکوں میں سرمدی راحت کا پیام نہاں ہے
لیکن میرے دل ناشاد کو تسکین کہاں؟
آ میرے کانوں میں سرگوشی کے لہجے میں کہہ دے
"اس سے پہلے کہ شب تار کی زنگاری ردا
وادی اور دریا اور کوہستان کو ڈھانک لے
تجھے بھی اپنے محبوب کی آغوش ڈھانک لے گی"

گوئٹے نے مندرجہ ذیل جواب لکھ کر بھیجا:

میرا دل جو زلف سیاہ کے پرپیچ حلقوں میں اسیر ہے
ہر وقت اضطراب اور بے کلی کی حالت میں رہتا ہے
لیکن میں اس قید کا جس پر آزادی روح نثار کر دوں اور ان بدمست
سانپوں کا جن پر شراب کی سیہ مستی فدا ہو جائے، کیسے شکوہ کر سکتا ہوں
فصل بہار آ گئی
مرغزاروں اور گلبنوں میں سبزے نے اپنی چادر بچھا دی
کوہ آتش فشاں بھی سبزے سے ڈھک گیا

مگر اس کے سینے میں جہنم کی آگ بھڑک رہی ہے
اسی طرح جان من! تمہارا عاشق محبت کی آتش خاموش میں جل کر بھسم ہو گیا
ان دنوں وہ کہیں راکھ کا ڈھیر دیکھ کر کہہ اٹھے گی
"اف بیچارہ۔ میری محبت میں جل مرا"

آپ نے دیکھا حافظ کے الہامی نغموں نے مغرب کے اس مفکر اور حکیم کے دل و دماغ کو کس طرح متاثر کیا تھا۔ حافظ کا اثر اتنا سطحی نہیں تھا کہ وہ گوئٹے کے "دیوان" کے صفحات میں محدود ہو کر رہ جاتا۔ اسّی برس کی عمر میں گوئٹے نے اپنا شاہکار "فاؤسٹ" مکمل کیا۔ "فاؤسٹ" کے آخری حصے میں جہاں کہیں معاملات حسن و عشق بیان کئے گئے ہیں، حافظ کے اس گہرے اثر کا کھوج ملتا ہے۔

(ہمایوں (لاہور)، جلد 40 نمبر 4، بابت اکتوبر 1941ء، ص 630-634)

ملک محمد باقر نسیم رضوانی

گوئٹے

(انسان اور شاعر)

جب گذشتہ سال کے اوائل میں جرمنی نے گوئٹے کی وفات کی صد سالہ برسی منائی تو اس سے ایک ایسے شاعر کا نام روشن کرنا مقصود نہ تھا' جس نے اہل جرمنی کو حال کے چند ایک غیر ضروری اور تشویش انگیز مسائل سے نجات دلائی تھی' بلکہ اس سے مقصد گوئٹے جیسے عظیم الشان شاعر کی یاد کو تازہ کرنا تھا' جو حریت اور حسن صداقت کا مجسمہ تھا' بلکہ اس کا درجہ اس سے بھی بلند تر ہے' کیونکہ اس میں دیگر قائدین کے علی الرغم فطری اور اخلاقی محاسن بیک وقت جمع ہو گئے تھے اور یہی ایک خوبی تھی جو اس کی عظمت کی ذمہ دار ہے۔ شاعروں کی طرح خواب دیکھنے کی بجائے اس نے اپنی عمر میں غیر معمولی سرگرمی اور غیر مختتم قوت عمل کا ثبوت دیا ہے۔ اس نے خاموش رہ کر بھی بہت سے عام آدمیوں کو معراج ترقی تک پہنچا دیا۔ علاوہ ازیں کسی دوسرے جرمن شاعر نے تنہا قوم کی تعمیری طور پر اتنی خدمت نہیں کی' جتنی اس صالح مفکر نے کی ہے۔ گوئٹے کی وساطت سے پہلی مرتبہ جرمن ادب ادب عالم سے روشناس ہوا۔ اس لئے گوئٹے کی یاد کو تازہ کرنے میں دیگر ممالک نے بھی کافی دلچسپی لی' کیونکہ اس موقع پر ایک ایسے قائد کی شخصیت کو نمایاں کیا گیا تھا' جو صرف "شاعر" ہی نہ تھا' بلکہ "انسان" بھی تھا۔

آج ہم گوئٹے کی مکمل شخصیت پر تبصرہ کرنے کے قابل ہیں۔ یہاں یہ ذکر کر دینا

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گوئٹے کا اپنے معاصرین پر براہ راست اثر صرف اس کی شاعری سے پڑا ہے، لیکن وہ اس کی پوری شخصیت سے متاثر نہیں ہوئے، جس میں اس کی حقیقی عظمت پنہاں تھی۔ یہاں تک کہ اس کے دوستوں نے بھی اس کی مکمل شخصیت کا اندازہ نہیں لگایا۔ چنانچہ جب وہ 22 مارچ 1832ء کو فوت ہوا، تو اسے اتنی شہرت حاصل نہ تھی، جتنی اس کی عزت کی جاتی تھی۔ اس کے لئے تقریباً ایک صدی کا عرصہ درکار تھا کہ قوم اس کی شاعری، اس کے خیالات اور اس کے درس انسانیت سے مستفیض ہو سکے۔

گوئٹے کے متعلق جرمنی اور دیگر ممالک کی آرا میں اختلاف ہے۔ جرمنی میں گوئٹے کی زندگی اور اس کی شاعری پر مکمل طور پر محاکمہ کیا جاتا ہے، لیکن غیر ممالک میں صرف جزءاً تبصرہ کیا جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ غیر ممالک اس کی چند ایک نظموں کا مطالعہ کر کے اس کے پیغام کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس طرح پر اگر اس کی شخصیت کو پس پشت ڈال کر اس کی نظموں کا مفصل جائزہ بھی لیا جائے، تو بھی گوئٹے ایسے شاعر کے متعلق صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس صورت میں گوئٹے کا صرف ایک قلیل سا حصہ نظر آ سکتا ہے اور ممکن ہے کہ انفرادی طور پر ہر ایک نقاد کا تبصرہ صحیح ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ گوئٹے کی شخصیت ایک عظیم الشان اور مقتدر شخصیت تھی، جس کی تعظیم کرنا ہمارا فرض ہے۔

اس مختصر سے مقالہ میں گوئٹے کی ادبی تخلیقات پر سیر حاصل تبصرہ کرنے کی گنجائش نہیں۔ تاہم اگر مجملاً" اس کو ایک غزل نگار کی حیثیت ہی سے دیکھیں، تو بھی اس کی عظمت کا اقرار کرنا پڑے گا۔ غزل کے اشعار بیشتر ذاتی تاثرات کے ماتحت نظم کئے جاتے ہیں اور یہی اشعار ہیں، جنہوں نے آئندہ نسلوں اور غیر ممالک کو زیادہ متاثر کیا۔

سٹراس برگ میں گوئٹے کا زمانہ طالب علمی (1770ء - 1771ء) ایک ایسا وقت تھا، جس میں اس کی عقل و فراست کی مکمل ترین نشو و ارتقا ہوئی۔ یہ شہر فرانس اور جرمنی کی سرحد پر واقع ہے اور یہ شاعر جو اب تک فرانک فورٹ میں تربیت پاتا رہا تھا، یہاں پہلی مرتبہ قومی جذبات سے متاثر ہوا۔ یہاں گوئٹے ہمدرد رفقا کی وساطت سے جرمن علم و ادب کی تحصیل کے لئے آمادہ ہو گیا۔ اسے سٹراس برگ کے گرجا میں جرمن فن تعمیر کے نادر نمونے نظر آئے اور یہی وہ جگہ تھی، جہاں فطرت نے اس کی خفتہ قوتوں کو بیدار کر دیا۔

اسے بچپن میں یہ تعلیم دی گئی تھی کہ صرف وہی فن خوبصورت کہلانے کا مستحق ہے،

جس میں قدیم روایات کی پیروی کی گئی ہو اور رسمیات کے اس زمانہ میں کسی فن میں کامیابی حاصل کرنا ناممکن تھا۔ گوئٹے نے عوام کے گیتوں کی کتاب اپنے قدیم دوست گاٹفرائڈ ہرڈر سے حاصل کی تھی اور باقی کے گیت اس نے خود سٹراس برگ میں جمع کئے تھے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے "میں اب تک نظم کو کسی اور نقطہ نظر سے دیکھا کرتا تھا' لیکن اب میں نظم کے ایک اور نقطہ نظر سے متعارف ہوا ہوں۔۔۔ فن شاعری کی خود اپنی ایک دنیا تھی۔ اور یہ عوام الناس کی ملکیت تھی' نہ کہ چند ایک تعلیم یافتہ اور خوش مذاق لوگوں کی۔" اس کی اپنی شاعری بلند آہنگ الفاظ اور متبدل تشبیہات سے بالکل پاک تھی۔ "ہیڈن روزلین" نظم میں اس نے پہلی دفعہ ایک گیت کی تصویر کھینچی۔ فن اور مواد دونوں سولہویں صدی کے ایک گیت سے مستعار لئے گئے تھے' لیکن گیت کی مختصر سی شکل اور قوت بیان گوئٹے کا اپنا تحفہ تھا' جو جرمن شاعری کو پیش کیا گیا۔ اس نے پورے طور پر غزل کی طرف اس وقت توجہ کی جب اس کا دل جذبہ محبت سے معمور ہو گیا۔ اس جذبہ کی محرک سیسن ہیم کے پادری کی حسین لڑکی فریڈرک برائن تھی۔ اب تک گوئٹے کی نظموں میں تغزل کی ایک جھلک سی تھی' لیکن اس کے بعد اس کی نظموں میں تغزل اور موسیقیت کی فراوانی نظر آنے لگی۔ اس کے گیتوں کے الفاظ عشقیہ جذبات کی پورے طور پر ترجمانی کرنے لگے۔ حقیقی شاعر کے اشعار ہمیشہ اس کے جذبات و تاثرات کا عکس ہوتے ہیں' چنانچہ گوئٹے کے احساسات اس کی غزل کی زبان اور موسیقیت میں تبدیل ہو گئے۔ شاعرانہ الفاظ نے پرسوز بانسری کے راگ کا جامہ پہن لیا۔ اس نے ناقابل بیان نغموں کو اپنی قوت بیان سے عالم وجود میں منتقل کر دیا۔ سادہ لغوی بیان اور تجربہ کے براہ راست اظہار سے گوئٹے کی غزلوں کے لاثانی اور عدیم النظیر ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ پترارکا دانتے اور شیکسپیئر نے بھی اپنے تجربات کو براہ راست بیان کرنے کی کوشش کی ہے' لیکن ان کے پاس ایسے الفاظ کہاں۔ مزید براں گوئٹے کو سیر و سیاحت میں مصروف رہنے کی وجہ سے محاسن فطرت کا جائزہ لینے کا ملکہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کو فطرت کی ہر ایک شے میں حرکت تخلیق اور عمل نظر آتا تھا۔ صانع حقیقی' فطرت بخشندہ حیات (خدا) کے وجود کا یقین اس کے لئے کافی نہ تھا' بلکہ وہ اس کی قوت تخلیق کا بھی قائل تھا۔ وہ خدا کے "علام الغیوب" اور "فعال لما یرید" ہونے کی بجائے اس کے ہر جگہ موجود ہونے کا زیادہ قائل تھا۔ فطرت نے اسے تمام اسرار و رموز سے آگاہ کر دیا۔ وہ اس کے

جذبات کی مقدس رفیق بن گئی اور اس طرح اسے محیر العقول قوت بیان کا مالک بنا دیا۔ اگر شاعری سے مراد صرف شعور کا اظہار ہے تو گوئٹے کی جوانی کی شاعری کسی صورت میں بھی اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔ وہ شاعر کے دل کی ایک ایسی تخلیق تھی، جس میں آورد اور تصنع نام کو نہ تھا۔ وہ اس قسم کے اشعار لکھتا تھا، جو پرندوں کے نغمے کی طرح دلکش ہوتے تھے، لیکن ان میں کسی طرح کی بناوٹ نہ ہوتی تھی اور صرف اسی طرح اس شاعر نے ہمیشہ اپنی فطرت اور ضمیر کی آواز کو عوام الناس تک پہنچایا۔ اس کی عالم شباب کی عشقیہ غزلیات جذبات و تاثرات کی ہیجانی کیفیات کے قلزم متلاطم کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ ہر ایک لفظ سے موسیقی ٹپکتی ہے، جو فریڈرک کے حسن و شباب کی رعنائیوں کا اعلان کر رہی ہے۔ وہ عہد پیری میں بھی دلکش غزل لکھتا ہے، لیکن اس میں جوانی کا جوش و خروش نہیں۔ وہ شباب کی بے باکیوں کو متانت کے پردوں میں ملفوف کر دیتا ہے۔ اب اس میں دوسری شاہراہوں پر چلنے کی بھی جرات پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ایک تجربہ کار انسان کے عالم جذبات کی تصویر کھینچتا ہے۔ کرسٹین و لپیس (اس لڑکی سے اس نے بعد میں شادی کر لی تھی) سے اس کی محبت کا زمانہ ایسا وقت نہ تھا، جب محبوب کی حیثیت ایک ناممکن الحصول شے کی ہوتی ہے۔ اس کی محبوبہ اس کی دن رات کی رفیق تھی۔ اصناف کے تعلقات کا یہ قدیم مفہوم اس کے مجموعہ نظم "رومیشن ایلی جین" (مطبوعہ 1788ء) میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ان نظموں میں جذبات فراق اور احساسات ہجر مفقود ہیں۔ محبوب کو ایک بعید منتہائے مدعا کی حیثیت سے نہیں ظاہر کیا گیا، بلکہ ان میں ان تمام جذبات ابتہاج و آسائش کو نظم کیا گیا ہے، جو ایک کامران عاشق کے دل کو کامیابی اور اطمینان کی مسرت سے معمور رکھتے ہیں۔ ان اشعار میں کچھ مزاح کا عنصر بھی شامل ہے، جس سے نوجوانی کی بیہودہ باتوں کا متانت سے مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ شباب کی غزلوں میں جس اذیت و کرب کا اظہار ہوتا تھا، اس کو شائستہ انداز میں محدود کر کے حالات کے موافق بیان کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزل ایک ذاتی ملکیت ہونے کی بجائے عوام کی دلچسپی کا باعث بن گئی۔ کائنات کی ہر ایک شے شاعر کے لئے گویا ہو گئی اور وہ عوام الناس کے جذبات کی نمائندگی کرنے لگا۔ اس طرح اس کی غزل کو کلاسیکی رتبہ حاصل ہو گیا۔

نپولین کے خلاف جرمنی کی تحریک حریت کے پر آشوب واقعات سے اس کے دل میں

کوئی ہمدردی پیدا نہ ہوئی' کیونکہ اس کے خیال میں اس کے معزز شہنشاہ کا زوال اور حریت پسندوں کا اقتدار تشدد کے مترادف تھا۔ اس نے اپنی توجہ دوسری طرف منعطف کر لی اور ادب و فن کی خدمت میں مشغول ہو گیا۔ سن رسیدہ گوئٹے کے خیال میں قومیت پسند انسان بننے کی بجائے دنیا کا شہری کہلانا افضل تر تھا۔ چنانچہ وہ جرمن ادب کی بجائے ادب عالم کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ ہندوستان اور ایران کی شاعری اسے کافی دلچسپ معلوم ہوئی۔ بالخصوص کالی داس کی "شکنتلا" نے اسے بہت متاثر کیا۔ 1813ء میں اس نے ایران کے چودھویں صدی کے مشہور شاعر حافظ کے چند ایک ساقی ناموں اور غزلیات کا ترجمہ کر کے شائع کیا۔ گوئٹے کو حافظ کے اور اپنے خیالات میں بہت سی یکسانیت نظر آئی' کیونکہ اس کی شاعری میں بھی رجائیت کا عنصر غالب ہے۔ اسے مشرق کے تقدس نے بھی کافی متاثر کیا۔ یہ ایسا تقدس تھا' جس سے وہ ناقابل حصول خدا کی ضرورت سے بے نیاز ہو گیا اور اسے اس دنیا میں ہی خدا مل گیا۔ فطرت کی ہر چھوٹی بڑی تخلیق اس کے لئے مظہر صانع حقیقی تھی۔ گوئٹے نے ایران کے تصوف کا کافی مطالعہ کیا اور اسی مطالعہ کے زیر اثر "دیوان مغرب" نظم کیا۔ جب وہ 1814ء - 1819ء میں یہ دیوان لکھ رہا تھا' تو اس کا تعارف میرین فان ولیمر سے ہوا۔ دونوں میں ایک دوسرے کے لئے کافی دلچسپیاں تھیں اور اس لئے دونوں ایک دوسرے کو بہت جلد چاہنے لگے۔

"دیوان مغرب" کے تغزل کی تخلیق کی ذمہ دار زیادہ تر میرین فان ولیمر ہے۔ میرین اپنے غیر معمولی محاسن کے لحاظ سے زلیخا کی طرح مشہور تھی۔ گوئٹے نے اسے اپنا معمول مطالعہ بنا لیا۔ اس کے خیال میں اس کے نسائی پیکر میں ذہنی اور جسمانی محاسن بیک وقت جمع ہو گئے تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایک شریف خاتون سے محبت کرنا خدا سے محبت کرنے کے برابر ہے۔ محبت کا یہ مفہوم مغربی اور مشرقی صوفیا کی محبت کے ہم معنی تھا اور یہی وجہ تھی جس نے اسے اپنی تصنیف 'زلیخا' میں یہ لکھنے پر مجبور کر دیا کہ ارضی محبت کے پردوں میں نہایت بلند مرتبہ جذبات ملفوف ہیں۔ 'زلیخا' کی نظم دیوان کے وسطی حصہ پر مشتمل ہے۔ اس سے بعد کی نظموں میں اس قدر بے باکی سے کام نہیں لیا گیا جتنا اس سے پہلی نظموں میں۔ ابتدائی جذبات کو نہایت ہوشیاری سے لکھ کے بے باک انداز میں نظم کیا گیا ہے۔ تخیل اور تجربہ میں کسی طرح کا امتیاز روا نہیں رکھا اور اشعار کی ظاہری وضع کو خوبصورت بنانے میں

کافی محنت کی گئی ہے' لیکن کتاب کے آخری حصہ میں اصلاحی نظمیں ہیں۔ خوش آئند اور فلسفیانہ گیت ہیں اور بے شمار اقوال دانش نظم کئے گئے ہیں۔ گوئٹے کی عمر کے آخری حصے کی نظموں میں شاعر کے جذبات نے فکر و دانش کا جامہ پہن لیا ہے۔ وہ ذاتی تاثرات اور اپنی یادداشتوں کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ وہ عالمگیر حقائق اور تجربات حیات کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اصلاحی عنصر کی آمیزش ہر ایک نظم میں نظر آتی ہے' لیکن شاعر نے اصلاح نفس و تعمیر اخلاق کا درس دیتے ہوئے بھی شاعرانہ لطافتوں کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ یہ مجموعہ ایک ہفتاد سالہ بوڑھے شاعر کی مسرتوں اور غیر معمولی ذہنی قوتوں کا آئینہ دار ہے اور اس کی آخری عمر کی غزلیات کا بہترین مجموعہ ہے۔ یہ غزلیات دوسرے شعرا کے خلاف بیشتر مشرقی شاعری سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ جرمن شاعری میں یہ تخلیق ایک عظیم الشان اضافہ ہے' کیونکہ ان غزلیات میں صدق جذبات اور ذاتی تاثرات کی صحیح تصاویر کو نظم کیا گیا ہے۔

اس مجمل سے تبصرہ سے یہ ظاہر ہو گیا ہو گا کہ گوئٹے صرف ایک غزل نگار کی حیثیت سے ہی کافی بلند مرتبہ شاعر ہے' کیونکہ گوئٹے کے اشعار سے قبل یہ گمان ہی نہ کیا جا سکتا تھا کہ جرمن زبان میں بھی اس قدر لطافت اور رنگینی پیدا ہو سکتی ہے۔ گوئٹے کی غزلیات سے متاخرین نے بھی کافی افادہ کیا ہے اور وہ اس کی تقلید میں اپنے خیالات کو سادگی اور صداقت سے بیان کرنے لگے ہیں۔ اس طرح سے اس نے ادب عالم کے لئے لاثانی اور اہم ادبی تخلیق کا دروازہ کھول دیا ہے' لیکن گوئٹے غزل نگار شاعر ہی نہ تھا' بلکہ وہ ایک کامیاب رزم نگار اور تمثیل نگار بھی تھا۔ "ہرمن انڈ ڈورتھیا" اور "رینک فکس" اس کی دو کامیاب حکائتی نظمیں ہیں' جن کا ادبی رتبہ یقیناً نہایت بلند ہے۔ وہ اپنے وقت کا بہترین ناول نویس تھا۔ چنانچہ متاخرین اس کے ناول ولہلم ماسٹر کو "شاندار ادبی کارنامہ" کہتے ہیں۔ "وہل وردانڈ شیفن" ایک نفسیاتی رومان ہے۔ تمثیل نگار کی حیثیت سے اس نے دو شاہکار "تاسو" اور "ا گمنی" کے نام سے لکھے تھے اور "فاؤسٹ" تو اس کی ادبی کاوشوں کا ایک عدیم النظیر اور مکمل ترین نتیجہ ہے۔ جن لوگوں نے گوئٹے کی مصوری' صناعی اور دستکاری کے نادر نمونوں کا مطالعہ کیا ہے' ان کی نظروں میں اس کی شاعری کی کوئی حقیقت نہیں' کیونکہ اس نے شاعری کی بہ نسبت مصوری اور تھیٹر کی طرف بہت توجہ دی ہے۔ گوئٹے کی زندگی کے ہر رخ پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قدر عظیم الشان "شاعر" اور "انسان" تھا اور

اس نے عملی طور پر ثابت کر دیا کہ انسانی ذہن کو انتہائی حضیض و پستی سے نکال کر اوج و رفعت کی انتہائی بلندیوں تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

(ادبی دنیا (لاہور)، اکتوبر 1933ء، ص 431-435) (ماخوذ)

شیر جنگ

جان ولف گانگ گوئٹے

آپ نے کسی حسین تخیل کے وفور شدت کا احساس کیا ہے' ایسا حسن جو ایک درد کی شکل اختیار کر کے آپ کے وجود کا جزو بن گیا ہو؟ آپ بے چین ہو جاتے ہیں اور امن کی تلاش میں موسیقی کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ موسیقی بھی زیادہ دیر تک آپ کی توجہ نہیں کھینچ سکتی۔ آپ دفعتاً" غائب ہو جاتے ہیں۔ خود میں ہی کہیں دور' بہت دور' گم ہو جاتے ہیں۔ وقت کا دھارا جیسے رک گیا ہو' اور تب آپ کی کائنات کا خلا ان جانے میں ہی اس ان سنی موسیقی سے بھر جاتا ہے اور آپ کا تصور اس دوشیزہ کی طرح مسکرانے لگتا ہے جو دن بھر ٹیگور کی نظموں کا مجموعہ پڑھتی رہی ہو۔ حتیٰ کہ شام کے دھندلے سایوں نے دھرتی کو اپنے گہوارے میں سمیٹ لیا ہو اور رات پہاڑ کی چوٹیوں پر سے کھسک کر کتاب کے صفحوں پر آنکھ مچولی کھیلنے لگی ہو۔ اب ادھ کھلی کتاب کو آغوش میں لئے ادھ پڑھی آخری نظم کے تاج محل کو اپنی نیم وا آنکھوں میں بند کر کے نامکمل تصورات میں ڈوب جاتی ہے اور پھر اسی حالت میں سو جاتی ہے۔ اگلے دن کسی کام میں اس کا جی نہیں لگتا' وہ کھوئی کھوئی سی رہتی ہے' جیسے کہیں کچھ رکھ کر بھول گئی ہو۔ دل میں رہ رہ کر ایک کسک سی ابھرنے لگتی ہے اور نامعلوم اجنبی سے درد کا بوجھ تکان بن کر تمام بدن میں سرایت کر جاتا ہے۔ اکھڑی اکھڑی سی طبیعت میں "بی تھوون" کی "سمفنی" کے سے نغمے ناچنے لگتے ہیں اور وہ غیر ارادی طور پر چھلکی ہوئی آنکھوں کے سائے تلے مسکرانے لگتی ہے۔

گوئٹے کی شاعری کا تخیل بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہمارے اندر پیدا کر دیتا ہے۔ ایک درد' ایک سرور اور خود فراموشی کا ایک ایسا شدید انجذاب ہمارے اندر پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم انجانے میں ہی زندگی کے ہم نوا ہو کر مسکرانے لگتے ہیں اور حسن کی بلندیوں سے تخلیق کے کرشموں کا تماشہ کرنے لگتے ہیں۔

گوئٹے جس کے متعلق علامہ اقبال نے فرمایا ہے۔

شاعرے کو ہم چو آں عالی جناب نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

یہی گوئٹے آسمان ادب کے ان چند درخشندہ ستاروں میں سے ایک ہے' جن کی کرنوں کے لمس سے انسانی فکر کی کلیاں چٹکتی ہیں اور جن کی شبنم میں تخلیق حسن کے پھول پلتے ہیں۔ وہ اس محفل کا صدر ہے جس میں ہومر' ورجل' دانتے' شیکسپیئر' رومی' فردوسی' حافظ' بھرتری اور کالی داس جیسی سحر آفریں ہستیاں رونق افروز ہیں' ایسی ہستیاں جو ہر قوم' ہر ملک اور ہر نسل کی مشترکہ وراثت ہیں' جنہوں نے انسانی شعور کے حاشیوں پر سے جہالت کی پرانی' میلی اور بھاری بھرکم سنگین دیواروں کے بوجھ ہٹائے۔ جنہوں نے انسانی تخیل کو پر پرواز دیئے اور انسانی امنگوں کو زبان دی۔

آرٹ کی دنیا میں جو درجہ مائیکل انجیلو اور رافیل کا ہے' ادب کی دنیا میں وہی مقام گوئٹے کو حاصل ہے۔ یعنی سلطان مطلق' مقتدر اعلیٰ' جس کا ہر لفظ قانون اور ہر بول کلیہ اور جس طرح مائیکل انجیلو کو اپنے آرٹ کی ہر شاخ یعنی مصوری' صنم گری' استرکاری' نقاشی' تعمیر سازی وغیرہ میں تفوق اعلیٰ حاصل تھا' ٹھیک اسی طرح گوئٹے کو ادب کی ہر صنف پر قدرت اولیٰ حاصل تھی۔ کتبوں' سانیٹ' گیت' رزمیہ اور بزمیہ نظموں سے لے کر فاؤسٹ جیسا عظیم اور ابدی شاہکار اس نے تخلیق کیا۔ ایسا شاہکار جس کا ہم پلہ دانتے کی ڈیوائن کامیڈی اور والمیکی رامائن کے سوا دنیائے ادب میں نایاب ہے۔ فاؤسٹ نہ صرف دنیا کی ایسی اعلیٰ ترین غنائی نظم ہے جو حسن کی انتہائی بلندیوں پر چھائی ہوئی ہے اور جس کی ڈرامائی ہیئت اپنے تعمیری اسلوب اور فنی تکمیل میں بھو و نیشور' مہابلی پورم' تنجور اور مدورا کے ان ہندو مندروں کا تصور جگا دیتی ہے جو مفرد چٹانیں کاٹ کر بنائے گئے ہیں' بلکہ یہ شاہکار انسان اور انسانی فطرت کا نہایت وسیع اور عمیق مطالعہ بھی ہے۔ اس کے دیگر ڈرامے رزمیہ' بزمیہ' طنزیہ اور المیہ سبھی ادب کے تخلیقی معجزے ہیں۔ ایسے معجزے کہ اس کے

علاوہ شاید شیکسپئر ہی وہ دوسرا معجزہ گر ہے جس کے قلم کا جادو اس صنف ادب میں دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔ نثر میں بھی' چاہے وہ کہانی کی شکل میں ہو یا رومان کی' چاہے وہ ناول ہو اور چاہے سفر نامہ' اس کو وہی عظمت' تفوق اور قدرت حاصل ہے جو کہ نظم اور ڈرامہ میں ہے۔

گوئٹے کو بلا شبہ روح تخلیق کہا جا سکتا ہے جس کی تخلیقی اور تعمیری قدرت محض ادب کی دنیا تک ہی محدود نہ تھی' بلکہ ادراک اور فہم کے ہر شعبے کو احاطہ کئے ہوئے تھی۔ وہ صحیح معنوں میں عصر آفریں شخصیت اور ہمہ گیر فراست کا مالک تھا۔ دنیا کی ان معدودے چند عصر آفریں ہستیوں میں سے شاید وہ آخری انسان تھا' جس کے شعوری معراج نے بلندی کی انتہائی منزلوں میں عافیت اور شادمانی کے آشیانے تعمیر کئے ہیں۔ وہ شاعر تھا' ادیب تھا' مدبر تھا' مقنن تھا' سیاست دان تھا' حکیم تھا' مصور تھا' فن تعمیر کا ماہر تھا' اس کا لکھا ہوا ضابطہ قانون' رنگوں کے متعلق اس کی حکیمانہ تحقیقات اور علم نباتات پر اس کے تدقیقی مقالے دنیائے علم کے بیش بہا گوہر ہیں۔ گوئٹے کا یہ ہمہ گیر علم اور تبحر اسے دانتے پر بھی فوقیت بخشتا ہے' جس نے کہ لیوناردو داونچی اور مائیکل انجیلو کی طرح علم' فن اور آرٹ کے بہت سے شعبوں پر قدرت حاصل کی تھی۔

جان ولف گانگ گوئٹے کا جنم جرمنی کے فرانک فورٹ شہر میں 28 اگست 1749ء کو ایک متمول' متمدن اور پڑھے لکھے گھرانے میں ہوا تھا۔ اس کے والد شاہی کونسلر تھے اور والدہ چیف مجسٹریٹ کی بیٹی تھیں۔ ہونہار گوئٹے بلا کا ذہین بچہ تھا۔ آٹھ سال کی عمر میں ہی اس نے جرمن' فرانسیسی' اطالوی' لاطینی اور یونانی زبانیں سیکھ لی تھیں اور بعد کو ان میں انگریزی اور عبرانی زبانوں کا اضافہ کر لیا تھا۔ اکتوبر 1765ء میں جب کہ اس کی عمر سولہ سال کی تھی' یہ لائپ تسیگ یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ جہاں سے 1770ء میں قانون پڑھنے کے لئے یہ سترازبرگ یونیورسٹی چلا گیا۔ یہاں اس نے ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کی' محبت کا داغ کھایا اور شیکسپئر کا مطالعہ کیا۔ 1771ء میں اس کی تین کتابیں شائع ہوئیں۔ گوئٹز' آوارہ گرد اور آوارہ گرد کے طوفانی گیت۔ 1773ء میں اس نے پرومی تھی لیس' امیر اور چند طنزیہ نظمیں لکھیں۔ 1774ء میں اس کا ایک ناول شائع ہوا' نوجوان وردر کی آہ و زاری' جس کے متعلق ایک نقاد لکھتا ہے :

"یہ آہ و زاری اس گہرے اور انجانے درد کی گونج ہے' جو فکر پرور دماغ اور زود حس دل کے انسانوں کو ایک خاص عمر میں اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ اس کی درد بھری پکار اور فریاد بھرے شکوے یورپ بھر کے دلوں میں گونج اٹھے تھے اور صدائے بازگشت بن کر ہر جوان مرد اور ہر جوان عورت کی زبان پر ورد ہو گئے تھے۔"

نوجوان شاعر کی اس کتاب کا ہیرو گویا مرقع تھا' اس تمام بے چینی اور افراتفری کا جو کہ یورپ میں اس وقت عام تھی۔ وہ تمام تمدنی اور سماجی بے زاری جس نے یورپ کے عوام کو گھیرا ہوا تھا' "وردر" کی آہ و زاری میں زبان اختیار کر کے ایک وسیلہ بنی' جس کی مدد سے ہر شخص نے اپنے دل کی آواز سنی اور اس کو سمجھا۔ اس کتاب کو عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی۔ اگرچہ اس میں سماج کی اس بیماری کا کوئی علاج نہیں بتایا گیا تھا جس کی وجہ سے ہر شخص پریشان اور ہراساں تھا۔ وہ تو انقلاب فرانس کا جراحی عمل ہی تھا جس نے اس دکھ کی دوا پیش کی اور جس نے انسان کو ایک بار پھر اطمینان کا سانس لینے کے ذرائع بہم پہنچائے۔

اس کتاب کی اشاعت نے گوئٹے کی شہرت کو جرمنی کی حدود سے نکال کر یورپ بھر میں پھیلا دیا اور "وردر" کے تتبع میں مختلف زبانوں میں ادبی تخلیقیں ہونے لگیں۔ "وردر" اپنے زمانے کا نہ صرف ادبی جنون ہی تھا بلکہ اس کا اثر عوام کی گفتار و رفتار اور وضع قطع پر بھی خبط کے درجے تک پہنچ گیا تھا۔ حد یہ ہے کہ اس کردار کی نقل میں لوگوں میں ویسی ہی پوشاک مروج ہو چلی تھی جیسی کہ گوئٹے نے اس ناول میں اسے پہنائی تھی۔

اس کے علاوہ گوئٹے نے اور بھی بہت سی کتابیں نظم اور نثر میں لکھیں' جن میں سے مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں۔ ایفی جینیا' اگمانٹ' تاسو' ولیم مائسٹر' ہرمن اور ڈوروتھیا' رنگوں کا نظریہ' آپ بیتی اور دیوان شرق و غرب' مؤخرالذکر کتاب حافظ اور دیگر شعرائے فارس کے تتبع میں گوئٹے کی غزلوں کا مجموعہ ہے جو کہ یورپی ادب میں ایک انوکھی جدت ہے۔

گوئٹے کی اس شہرت سے متاثر ہو کر وائمر کے نوعمر سلطان چارلس آگسٹس نے اسے 1774ء میں اپنے دربار میں مدعو کیا۔ سلطان کی عمر اس وقت بیس برس کی تھی اور گوئٹے کی پچیس برس کی۔ پہلی ہی ملاقات میں دونوں ایک دوسرے کے ہو گئے اور ایک لمبے عرصے کے لئے دونوں کی دوستی استوار ہو گئی۔ گوئٹے کو علاقے کا گورنر مقرر کیا گیا اور اس کے بعد سے گیارہ برس تک وہ اسی اونچے مقام سے اپنے آس پاس کی دنیا کو دیکھتا ہوا مختلف فرائض

انجام دیتا رہا۔

دنیا کی تاریخ میں کتنے اہم تھے یہ سال! انسان کے شعور کا ارتقا بلو غیت کے بال و پر نکال کر آسمان کی بلندیوں میں پرواز کے خواب دیکھ رہا تھا۔

یہی وہ سال ہیں جن میں ٹامس پین نے اپنا شہرۂ آفاق منشور "آزادی کا اعلان" مرتب کیا' جس کی بازگشت براعظم امریکہ کو ایک کونے سے دوسرے کونے تک ہلاتی ہوئی دنیا بھر کے صاحب فراست لوگوں کے سینوں میں گونج اٹھی تھی اور جو آج بھی ہر ملک میں انسانی آزادی کی ایک مسلم الثبوت' لافانی اور ٹکسالی دستاویز کی شکل میں لوگوں کے دلوں پر کندہ ہے۔

صنعتی انقلاب کا جادوگر بھاپ بن کر آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا اور تاریخ کو ایک نئی کروٹ دینے کے لئے خم ٹھونک رہا تھا۔

امریکہ میں جنگ آزادی کا شعلہ بھڑک چکا تھا اور آزادی کے پروانے دور دور سے اس کی طرف جوق در جوق کھنچے چلے آ رہے تھے۔ یورپ کا خود دار طبقہ جگہ جگہ روپے اور رضاکار جمع کر رہے تھے کہ اس میں حصہ لے سکیں۔

فرانس کا حکمران طبقہ ملک کے بے روزگار لوگوں سے چھٹکارا پانے کے طریقے ایجاد کر رہا تھا۔ چنانچہ 1777ء میں بارہ لاکھ بھک منگے جیلوں اور جبریہ مشقت کے مرکزوں میں کوڑوں سے ہانک ہانک کر بھیجے گئے تاکہ وہاں کے ایک لاکھ چھیالیس ہزار امرا اور ایک لاکھ تیس ہزار کاہن اور گرجا کے رکن اطمینان اور عیش کی زندگی گزار سکیں اور اس طرح انجانے میں ہی آنے والے انقلاب کے لئے راستہ صاف کیا جا رہا تھا۔

اور یہی وہ سال ہیں جن میں دنیا کی لافانی نظم 'فاؤسٹ' گوئٹے کے ذہن میں بتدریج نشو و نما پا رہی تھی۔

گوئٹے کا یہ شاہکار اس کی تمام زندگی کا ماحصل ہے' جس کی تخلیق میں وہ عمر بھر لگا رہا۔ 1770-71ء میں اس نے یہ نظم شروع کی اور 1790ء میں پہلی مرتبہ ایک ادھورے ڈرامے کی شکل میں شائع کی۔ 1797ء میں اس نے اس کو پھر سے ڈھالا اور بہت سی ترمیم و تنسیخ کے بعد شائع کیا۔ 1801ء میں اس میں مزید تبدیلیاں کی گئیں اور 1806ء میں مزید ترمیم و تنسیخ کے بعد کم و بیش اس صورت میں شائع ہوئی جس میں کہ آج یہ ہمارے سامنے

موجود ہے۔ اس کے بعد بھی 1832ء میں اپنی موت کے دن تک گوئٹے اس نظم کو سنوارنے میں مصروف رہا۔

ٹامس مان نے جس کو 1929ء میں دنیا کا بہترین ادیب ہونے کی حیثیت سے نوبل پرائز ملا تھا' مندرجہ ذیل الفاظ میں گوئٹے کی موت کا نقشہ کھینچا ہے :

"1832ء کے مارچ کی بائیسویں تاریخ تھی۔ اپنی آرام کرسی میں گھٹنوں پر کمبل اوڑھے اور آنکھوں پر سبز سایہ باندھے گوئٹے دنیا سے رخصت ہوا..... مرنے سے کچھ عرصہ پہلے اس نے دریافت کیا کہ آج کونسی تاریخ ہے۔ بتایا گیا کہ بائیسویں۔ یہ سن کر اس نے کہا کہ اب بہار کا موسم آ پہنچا ہے۔ سختی کے دن ختم ہو گئے ہیں اور پھر اپنا بازو اٹھا کر انگلی سے ہوا میں کچھ لکھنے لگا۔ اس کی انگلی لکھتی رہی۔ بائیں سے داہنی طرف کو' اور بازو نیچے ہوتا گیا۔ وہ سطر کے نیچے سطر لکھتا گیا حتی کہ اس کا بازو تھک کر اس کے پہلو میں ڈوب گیا۔ اس کی انگلی پھر بھی بدستور کمبل پر لکھتی رہی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی ایک ہی چیز بار بار لکھ رہا تھا' جس میں نہایت احتیاط سے اوقاف و اعراب لگاتا جاتا تھا۔ وہ لکھتا گیا' لکھتا گیا' سایوں کی تحریر میں لکھتا گیا۔ حتی کہ اس کی انگلیاں نیلی ہو گئیں' اور ان کی حرکت بند ہو گئی اور جب اس کی آنکھوں پر سے سبز سایہ ہٹا کر دیکھا گیا تو ان کی روشنی بجھ چکی تھی اور وہ سایوں کی دنیا میں پہنچ چکا تھا۔"

گوئٹے لکھتے لکھتے دنیا سے رخصت ہوا اور کون جانے اس وقت بھی وہ اپنی نظم فاؤسٹ پر ہی کام کر رہا ہو۔

حسن اور حریت کا اتحاد اس کا مطمح نظر تھا' اس کی انفرادیت جو کہ جمالیاتی آزادی کے مترادف تھی' اس کے زور قلم سے ایک ایسے ناقابل شکن حصار کی شکل اختیار کر گئی تھی جس کی سیسہ پلائی ہوئی دیواروں سے سیاسی' سماجی اور فکری بندشیں' ہر زمانے کے بندھن' ٹکراتے تھے اور چُور چُور ہو کر گر جاتے تھے۔ اس کی زندگی کا دھارا اپنے دور کی ہر تحریک کو یورپ کی ہر علمی' سماجی اور فکری تحریک کو اپنی لہروں میں سمیٹتا' اچھلتا کودتا اپنے ساحلوں کو سیراب کرتا' سیپ' موتی اور مونگے بکھیرتا' قوس و قزح کے رنگوں سے تانے بانے بنتا' ایک لافانی' ابدی نغمے کی طرف بڑھتا گیا' حتیٰ کہ خود بھی اس لافانی اور ابدی نغمے میں مدغم ہو کر ایک لافانی اور ابدی نغمہ بن گیا۔

اس کی زندگی کا دامن کتنا وسیع اور بسیط تھا' کتنوں کی زندگی اور زندگی کا ماحصل اس میں جمع ہے۔ ونکل من' اور لے زنگ' مینڈل شون اور کانٹ' شلر' شلے گلز اور شے لنگ' فشٹے' ہیگل اور شوپن ہاور' بیش و کم اس کے ہم عصر تھے' جن کی فکر نے اس کے تخیل کی آبیاری کی۔ نپولین اور بے تھوون سے یہ ذاتی طور پر ملا اور دونوں پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے۔ برطانوی شاعر کیٹس اور کولرج نے اس کے تخیل کی پھلواری سے کلیاں چنیں اور شیلے کے نغموں کی رنگینی نے اس کے گیتوں میں رنگ آمیزی کی۔

گوئٹے نے اپنی کتاب "فاؤسٹ" کی تصنیف میں کم و بیش ساٹھ سال لگائے اور اس دور کی روح کو اس نظم میں چاند کی کرنوں اور ستاروں کے نغموں میں سمو کر بند کر دیا۔ یاد رہے کہ اس دور میں تاریخ کا وہ ناقابل فراموش زمانہ بھی شامل ہے' جس میں انسان کی انسانیت نے غلامی کی زنجیروں پر پہلی ضرب پہنچائی تھی۔ یعنی 27 اگست 1789ء سے لے کر جبکہ "انسانی حقوق کا اعلان" شائع ہوا تھا۔ 21 جنوری 1793ء تک جس دن کہ فرانس کا بادشاہ لوئی سولھواں' انقلابیوں کے ہاتھوں قتل ہوا' یہ زمانہ بھی اس دور میں شامل ہے۔

ایک فرانسیسی نقاد کے الفاظ میں' اس نظم میں انسانی روح کے ارتقا کا پورا دور لافانی طور پر محفوظ ہے۔ اس درد سے جو نسل انسانی کے لئے سوہان روح ہے' یہ نظم کراہتی ہوئی ملے گی۔ وہ سب عناصر جن سے نسل انسانی بے تاب ہے۔ جن سے نسل انسانی گریز کرتی ہے اور جن سے نسل انسانی متنفر ہے' یہ نظم بھی ان سے بے تاب' بے زار' گریزاں اور متنفر ملے گی اور تمام وہ عناصر جو نسل انسانی کے لئے راحت اور شادمانی کے باعث ہیں' اس نظم میں بھی وہ محبوب اور مقبول ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کو اس قدر قبول عام اور شہرت دوام حاصل ہے۔ اگرچہ دنیا کے مسائل آج وہ نہیں ہیں جو کہ شاعر کے دور حیات میں تھے اور ہماری جدوجہد بھی آج اس دور کی جدوجہد سے مختلف ہے' لیکن نسل انسانی کی جذباتی کیفیت' اس کی شادی و غمی' اس کے آنسو اور قہقہے بیش و کم آج بھی وہی ہیں جو کہ اس وقت تھے۔ چنانچہ آج اور کل کی نسلوں کے لئے یہ سود مند ہی ہے کہ وہ پچھلی نسلوں کے غم اور شادمانی کی داستان کا مطالعہ کریں تاکہ آنے والے کل کے استقبال کے لئے تیار ہو سکیں۔

اور آنے والے کل کے دامن میں ہے کیا؟

شاید فاؤسٹ کا یہ کورس اس کی طرف اشارہ کرتا ہے :

"جو فانی ہے وہ محض سایہ ہے۔
نامکمل یہاں تکمیل پاتا ہے۔
جو کبھی الفاظ میں ادا نہ ہو سکا وہ یہاں شکل اختیار کرتا ہے۔
سرمدی حسینہ' ابدی نسوانیت' ہمیں بلندیوں کی طرف کھینچتی ہے۔"

یہی بات ایک دوسرے پیرائے میں گوئٹے اس سے قبل بھی کہہ چکا ہے۔ "وردر" کے پہلے باب میں وہ یوں کہتا ہے :

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیکی اور حسن کے تمام مظاہر' نیچر نے جنسی زندگی کی رنگینیوں میں یک جا کر دیئے ہیں۔"

گوئٹے نے ان الفاظ میں مافوق الفطری نظریوں کی دھند کو کاٹ چھانٹ کر کائنات کے اس کھلے راز کو بے نقاب کیا ہے جس کے جلوے خود ہی پردہ داری کے ضامن ہیں۔ ابدی نسوانیت یعنی حسن اور ذوق حسن کے اطوار ہی وہ ذرائع ہیں' جن کی بدولت انسانی روح بالیدگی اور بلوغیت کی معراج حاصل کرتی ہے۔

اس نظریئے میں "فاؤسٹ" کا مصنف ہیگل' شے لنگ اور شوپن ہاور کا ہم خیال ہے۔ ان کے فلسفے کی "خودی اور عدم خودی" "جواب اور جواب دعویٰ" اور "عزم اور تصور" کے مقابلے میں اس نے فاؤسٹ اور میفسٹو کے کردار پیش کئے ہیں' جو ایک دوسرے کی ضد بھی ہیں اور ایک دوسرے کا تکملہ بھی - نیچر کی وحدت اس کے نزدیک ان دونوں کے ادبی تضاد اور ازلی جدوجہد سے عبارت ہے۔ جس جدوجہد میں نہ کسی کو فتح حاصل ہوتی ہے اور نہ شکست۔ اگر فاؤسٹ خواہش ہے تو میفسٹو خواہش کی اسیری' اگر فاؤسٹ زندگی کی بے چینی کا نام ہے تو میفسٹو اس بے چینی کا سکون۔ اگر فاؤسٹ مرد فاعل کا تخیل ہے تو میفسٹو ابدی نسوانیت کا تصور۔ اس طاقت کا تصور جو ہر جذبے' ہر ذائقے اور ہر خواہش کی تسکین کے سامان بہم پہنچاتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اکثر مقامات پر میفسٹو کا کردار اس جانے پہچانے کردار سے مشابہ ہے جو کہ مسیحی مذہب نے شیطان کا پیش کیا ہے۔ ایک گھناؤنا' بدکار' دھوکا باز اور فتنہ ساز کردار جس پر فتح حاصل کرنا انسانی مسرت کا باعث ہوتا ہے۔ میفسٹو کا یہ کردار فاؤسٹ کے دوسرے

حصے کے دوسرے سین میں خاص طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے' لیکن مجموعی طور پر اس رزمیہ ڈرامے کی تشکیل میں میفسٹو کے کردار کی وہ تمثیلی اور تصوری خصوصیت غالب ہے جو اسے زندگی کا جزولاینفک قرار دیتی ہے۔ میفسٹو کے بغیر فاؤسٹ ایک بے سود خواہش اور لاحاصل تمنا بن کر رہ جاتا ہے۔ میفسٹو کے نکال دینے سے فاؤسٹ کے لئے کوئی بھی چیز ایسی نہیں رہ جاتی' جس کے لئے زندگی کی صعوبت اٹھائی جا سکے۔ وہ ایک ایسی خواہش بن جاتا ہے جس کا کوئی مدعا نہ ہو۔ ایسی محنت جس کا کچھ حاصل نہ ہو اور ایسی مسافت جس کی کہیں منزل نہ ہو۔ میفسٹو کے رہنے سے فاؤسٹ کے پاس زندگی کا مدعا ہے اور اس کے جذبات کے لئے ایک منزل۔ اس کے وجود سے فاؤسٹ کی امنگیں اور ولولے قائم ہیں' اور قائم ہی نہیں بلکہ اس کی مدد سے انہیں منزل کی نشان دہی ملتی ہے۔ منزل کی سمت اور منزل کا راستہ ملتا ہے۔ اس کا مقصد حاصل ہوتا ہے' چاہے وہ ادھورا ہی کیوں نہ ہو۔ اور ادھورا اسے رہنا بھی چاہئے کیونکہ تکمیل کے معنی ہیں خاتمہ۔ اس تڑپ' جدوجہد اور جوش کا خاتمہ جو زندگی کی شرط اولیں ہے اور اس فاصلے کا نفی مطلق میں تبدیل ہو جانا' جو خواہش اور تسکین' تخم اور ثمر اور زندگی اور موت کے درمیان حائل ہے۔ تکمیل کے معنی ہیں محبت اور تصرف کا فرق مٹ جانا۔ حسن اور قبضہ' تمنا اور حصول' کاوش اور منزل کا دو نہ رہ کر ایک ہو جانا' زندگی کا موت میں کھو جانا یعنی فاؤسٹ کا میفسٹو میں مدغم ہو جانا اور گردش دوراں پر سکوت کا حکم نافذ کر کے مرزا غالب کے اس شعر کا مجسمہ بن جانا۔

نو میدی ما گردش ایام نہ دارد روزے کہ سیہ شد سحر و شام نہ دارد

گوئٹے نے اس ادغام اور کھو جانے کے اس عمل کو جنسی مباہجت کی مثال میں پیش کیا ہے۔ "محبت" وہ کہتا ہے "موت کی طرح خودی کو فنا کر دیتی ہے۔ جنسی مباہجت ایک ایسا متبرک پیمان ہے جو دو اشخاص کی انفرادی شخصیتوں کو ان میں سے نوچ کر علیحدہ کرتا ہے اور پھر تخلیقی خودفراموشی اور مکمل سپردگی کی آغوش میں جھٹک کر ایک کر ڈالتا ہے۔" یہ اتحاد اس کے نزدیک اس وسیع اور بے کراں اتحاد کی نشان دہی کرتا ہے' جو موت کی عظیم قربانی کے علاوہ اور کہیں میسر نہیں آ سکتا۔

یہ موت ہی میفسٹو کی معنوی صورت ہے۔ وہ خود ہی اپنے آپ کو "نفی کی روح" بتاتا ہے یا ایسی استدلالی بصیرت کا حامل جو ہر جدوجہد کا مقصد مہیا کر کے خود جدوجہد کی شکست کا

موجب ہوتا ہے اور مقصد کو ختم کر ڈالنے کا باعث۔ فاؤسٹ کے لئے زندگی کا یہ ایک ایسا ساتھی ہے جو اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ زندگی کے مرض کا خوفناک معالج ہے' زندگی کے زخم کا بے رحم جراح' اس ابتدائی عالم گیر تاریکی کا ایک جز جس سے روشنی ظہور پذیر ہوئی اور ہر موجود شے نے وجود پایا۔ یہ فنا کی لافانی یادداشت کو زندہ رکھ کر زندگی کی باگ ڈور کو متانت کی طرف موڑتا رہتا ہے۔ یہ اس قوت کا ایک جز ہے جو ادراک کی گرفت سے باہر رہتا ہے۔ جو شر سے شروع ہوتی ہے اور خیر پر ختم ہوتی ہے اور جس کا ہر سالمہ نفی اور اثبات سے مرکب ہے۔ نفی اور اثبات کی یہی دو طاقتیں جو ہر انفرادی زندگی اور ہر ملک کی ارتقائی تاریخ کی تہ میں کارفرما ہیں' جو نیچر اور انسان کے ارتقا کی عظیم الشان عمارت کے بنیادی پتھر ہیں' گوئٹے کے اس ڈرامے میں دو کرداروں کی شکل میں پیش کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک کردار کا نام فاؤسٹ ہے اور دوسرے کا نام میفسٹو۔

گوئٹے نے اپنے اس ڈرامے کا پلاٹ ایک پرانی داستان سے لیا ہے اور کچھ اس طرح پیش کیا ہے۔

ایسٹر سے پہلی شام ہے اور شام کا دامن دراز ہو کر رات کے آنچل سے الجھ چکا ہے' ایک اونچے مکان کی کھڑکیوں کے گرد آلود شیشوں میں سے چاند کی دھیمی روشنی کتابوں کے انبار' سائنس کے آلات' کانچ کی نالیوں اور صراحیوں پر سے پھسلتی ہوئی بہت سے ناپنے' تولنے' اور مختلف قسم کے ریاضی آلات پر پڑ رہی ہے۔

سامنے لیمپ کی مدھم سی زرد روشنی میں گھرا ہوا ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بیٹھا ہے' جس کی کمر مطالعے کے بوجھ سے جھکی ہوئی ہے اور جس کا لباس اور وضع قطع کمرے کی خشک بے رونق اور سنسان فضا سے ہم آہنگ ہے..... یہ جرمنی کا شہرہ آفاق عالم ہے جس کے علم و فضل کے کمال کا شہرہ دور و نزدیک پھیلا ہوا ہے اور جس کا نام ڈاکٹر فاؤسٹ ہے۔

آج یہ غیر معمولی طور پر اداس ہے' مایوسی کی کڑواہٹ سے اس کا سینہ لبریز ہے۔ تحصیل علم میں چوتھائی صدی کی شب و روز جانفشانی کے بعد آج اس پر یہ حقیقت واضح ہوئی ہے کہ علم کا غرور کتنا تھوتھا ہے۔ کیونکہ علم خود ایک بے حقیقت شے ہے۔ اس کی نظریں کتاب کے صفحے سے اچٹ کر کمرے کا جائزہ لے رہی ہیں۔ جس کا ہر گوشہ انسانی دماغ کی صدیوں کی تحقیق و تدقیق کے ماحصل کا ایک بوسیدہ گودام ہے۔ وہ سوچتا ہے۔

"میں نے فلسفہ' قانون اور طب کے ہر شعبے میں تحقیق و تدقیق کی ہے۔
میں نے الٰہیاتی علوم کے مطالعے میں دن رات ایک کیا ہے۔
لیکن حیف! سمجھا یہ کہ کچھ بھی سمجھا نہیں جا سکتا۔
اور بعد میں وہی روز اول کا جاہل مطلق ہوں۔
حقیقت کا یہ انکشاف مجھے کھائے جا رہا ہے۔"

فاؤسٹ کو یہ احساس ہو رہا ہے کہ سالہا سال کی اس کی محنت شاقہ رائیگاں گئی۔ مطالعے کے دبیز غلاف نے زندگی کو اس کی آنکھوں سے اوجھل رکھا۔ کتابوں کے گنجان جنگل میں ہی وہ بھٹکتا رہا اور زندگی سے اس کی آشنائی نہ ہوئی۔ وہ زندگی کے لئے بے تاب ہو جاتا ہے۔ زندگی کی لذت چکھنا چاہتا ہے۔ زندگی سے اس کی مراد لہو و لعب' عیش و عشرت اور رقص و سرود نہیں ہے۔ ان کے لئے اب اس کی عمر نہیں ہے' وہ گزر چکی اور اب وہ پیچھے نہیں پلٹ سکتا اور نہ ہی عمر گذشتہ کو واپس بلا سکتا ہے۔ پھر زندگی کہاں ہے؟ زندگی کی لذت کیسے حاصل کرے؟ وہ اسی کشمکش میں مبتلا ہے کہ میفسٹو سے اس کی ملاقات ہوتی ہے اور وہ زندگی کے راستے پر ____ عمل پیرائی' ہمت آزمائی' مہم جوئی' حوصلہ مندی' حسن بازی' دل فروشی اور محبت کے راستے پر---- اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ وہ سب کچھ مہیا کرنے کا وعدہ کرتا ہے' جس کے لئے اس کا دل تڑپ رہا ہے۔ میفسٹو سب سے پہلے اسے شراب خانے میں لے جاتا ہے' لیکن شراب کا سرور فاؤسٹ کو مسرور نہیں کرتا اور وہ وہاں سے باہر نکل آتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ایک جادوگرنی کی کٹیا میں جاتے ہیں' جہاں اس کے دماغ کو اس زنگ سے پاک کرنا ضروری ہے' جو علم نے اس پر چڑھا دیا تھا۔ فاؤسٹ یہاں ایک آئینے میں ایک حسین عورت کا عکس دیکھتا ہے اور بس دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ اس اثنا میں جادوگرنی فاؤسٹ کے لئے ایک دوا تیار کر کے لاتی ہے اور اسے پلا دیتی ہے۔ دوا پیتے ہی اس کی جوانی واپس آ جاتی ہے اور میفسٹو کے الفاظ میں "اب اسے ہر عورت وہ ابدی حسینہ نظر آنے لگے گی جس کا نام ہیلن ہے اور جو حسن و جمال کے اس انتہائی تصور کا مجسمہ ہے جس تک پہنچنے کے لئے روز اول سے' شعرا کا تخیل صدیوں اور نسلوں کی منزلیں طے کرتا ہوا روز آخر کی طرف سرگرم سفر ہے۔"

فاؤسٹ نے آئینے میں ہیلن کا عکس دیکھا تھا اور اب ہیلن کو حاصل کرنا ہی اس کی

زندگی کا مقصد ہو جاتا ہے۔ میفسٹو اسے دھوکا دیتا ہے اور ہیلن کی جگہ ایک اور لڑکی کو پیش کرتا ہے۔ فاؤسٹ اور اس لڑکی کے تعلقات' حسن پر عشق کا قبضہ لڑکی کے لئے تباہی کا باعث بن جاتے ہیں۔ محبت میں گرفتار ہو کر یہ لڑکی اپنی ماں کو زہر دیتی ہے۔ اپنے بھائی کو قتل کرتی ہے' اپنے نوزائیدہ بچے کو گلا گھونٹ کر مار ڈالتی ہے اور پھر خود بھی پاگل ہو جاتی ہے اور پھانسی پر لٹکا دی جاتی ہے۔ حسن اپنی آزادی کھو کر عالمگیر تباہی کا حربہ بن جاتا ہے اور خود بھی اس تباہی کے ساتھ تباہ ہو جاتا ہے۔

ڈرامے کا پہلا حصہ یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرے حصے میں گوئٹے اپنے ہیرو کے لئے از سر نو دنیا تخلیق کرتا ہے۔ میفسٹو کی مدد سے فاؤسٹ دوبارہ زندگی شروع کرتا ہے۔ اسے شہرت حاصل ہوتی ہے۔ عیش و عشرت حاصل ہوتا ہے۔ دولت حاصل ہوتی ہے۔ سلطنت اور اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ لیکن دل کا سکون حاصل نہیں ہوتا۔ "زندگی" حاصل نہیں ہوتی۔ ہیلن کی تلاش' حسن تامہ کی تلاش' اسے بدستور بے تاب رکھتی ہے اور کشاں کشاں ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف آگے ہی آگے کھینچتی چلی جاتی ہے۔ آخر میں کچھ وقفہ کے لئے اسے ہیلن مل جاتی ہے' جو اس کی روح کو بالیدگی اور اس کی زندگی کو ارتعاش بخشتی ہے' لیکن جوں ہی وہ اس پر قبضہ کرنا چاہتا ہے' اپنے بازوؤں میں باندھنے کی کوشش کرتا ہے وہ دفعتاً" بادلوں میں غائب ہو جاتی ہے۔ محض اس کا لبادہ اس کے ہاتھوں میں رہ جاتا ہے اور از سر نو جستجو' جدوجہد کا میدان اس کی آنکھوں کے سامنے ----- اب وہ سمجھتا ہے کہ پیہم جدو جہد اور مسلسل جستجو ہی زندگی کا راز ہے۔ صرف وہی لوگ زندگی اور آزادی کے حقدار ہیں' جو اپنے لئے زندگی اور آزادی اور جیت از سر نو حاصل کرتے ہیں۔ نیز یہ کہ حسن اور آزادی کے اتحاد پر ہی زندگی قائم رہ سکتی ہے - اس اتحاد کی نفی پر نہیں۔

یہ نظم کیا ہے گویا انسانی زندگی کے دائرے کا نقشہ ہے۔ زندگی کی طرح یہ بھی عورت کی محبت سے شروع ہوتی ہے اور جادہ فن' آرٹ' دولت' جاہ و حشم' جنگ و جدل اور شادی غمی میں سے گزرتی ہوئی عورت کی ہی محبت پر ختم ہوتی ہے۔ جب تک یہ رواں ہے' ہر بلا اور ہر فتنہ سے محفوظ ہے اور جہاں اور جب یہ روانی بند ہوئی کہ فتنوں اور بربادیوں نے اسے آدبوچا۔

گوئٹے کے اپنے الفاظ میں "یہ نظم انسانی زندگی کی تمثیل ہے' جو شروع ہوتی ہے' ختم

ہوتی ہے اور جس میں کوئی باہمی ربط نہیں ہے۔" اور جو ربط یا اتحاد اس میں نظر آتا بھی ہے، وہ محض ان کی نفی کا ہی پیدا کردہ ہے۔ فقدان ربط کا ہی ظہور ہے۔ فقدان ربط گویا ایک دامن ہے، جس کے زیر سایہ حریت عزم پرورش پاتی ہے۔ وہ حریت جو اپنے لئے مسلسل جدوجہد اور مستقل جستجو کے میدان تیار کیا کرتی ہے اور ازلی طور پر ابدی حسینہ کی جویا رہتی ہے۔

اس ابدی حسینہ کو کون پکڑ کر رکھ سکتا ہے، حصول حسن کی یہ نفی حریت عزم کے اثبات کو پیدا کرتی ہے اور اس طرح حسن اور حریت کا اتحاد وجود میں آتا ہے۔

(آجکل (دہلی)، بابت دسمبر 1953ء، ص 16-24)

حاجی لق لق

غالب اور گوئٹے

مجھ سے روایت کیا کامریڈ باری علیگ نے اور انہوں نے سنا اپنے دوست مرزا کاظم سے اور مرزا کاظم نے سنائی آپ بیتی اور اب آپ مجھ سے سنئے "مرزا بیتی" میرے الفاظ میں اور اس کا ثواب پہنچایئے غالب اور گوئٹے کی ارواح کو اور دعا کیجئے میرے حق میں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مرزا کاظم جن دنوں برلن میں تھے' ان ایام کا ذکر ہے کہ مرزا صاحب کی ملاقات ایک پنجابی سکھ پریتم سنگھ سے ہوئی اور دونوں تین چار روز تک ایک قہوہ خانہ میں ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ ایک روز سردار جی نے مرزا صاحب سے کہا کہ بھائی صاحب! بات یہ ہے کہ میں اٹلی جانا چاہتا ہوں اور میرے پاس پیسہ کوئی نہیں۔ اٹلی میں میرا مستقبل بہت شاندار ہو سکتا ہے' اس لئے اگر آپ کچھ روپیہ مجھے بطور قرض دے دیں یا کسی دوست سے دلا دیں تو میں اٹلی پہنچ کر تھوڑے ہی عرصے یں یہ قرض چکا دوں گا۔

مرزا کاظم نے ایک لحہ بھر سوچنے کے بعد کہا "قرض؟ سردار صاحب! یہاں پردیس میں کون ایسا ہندوستانی فارغ البال ہو سکتا ہے' جو اپنے اللے تللوں کے علاوہ کسی دوست کو قرض دے سکے؟"

سردار جی: مجھے کوئی زیادہ روپیہ نہیں چاہئے۔ صرف .....

مرزا صاحب: (بات کاٹ کر) اجی کم زیادہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں

ہوتا۔ بات یہ ہے کہ کسی سے ایسی درخواست کرنا ہی بے معنی چیز ہے۔

سردار جی: (مایوسی کے لہجہ میں) تو پھر کیا کیا جائے؟

مرزا صاحب: کیا کیا جائے؟ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

سردار جی: (پرامید نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) وہ کیا' وہ کیا؟

مرزا صاحب: وہ یہ کہ ہندوستانیوں کی بجائے جرمنوں سے روپیہ حاصل کیا جائے۔ جو بہت آسان کام ہے۔

سردار جی: وہ کیسے؟

مرزا صاحب: میں کل بتاؤں گا۔ آپ اسی وقت یہاں تشریف لے آیئے۔

سردار جی کی آنکھیں ان الفاظ کو سن کر چمک اٹھیں اور مرزا صاحب کا "پیشگی" شکریہ ادا کر کے رخصت ہوئے۔

رات بھر سردار جی کو نیند نہ آئی اور دوسرے دن وقت مقررہ سے آدھ گھنٹہ پہلے ہی قہوہ خانہ میں پہنچ گئے اور بے صبری کے ساتھ مرزا کاظم کا انتظار کرنے لگے۔ آخر مرزا آئے اور قہوہ کی پیالی پیتے ہوئے یوں گویا ہوئے:

مرزا صاحب: دیکھئے سردار جی! مرزا غالب ہندوستان کے بہت بڑے شاعر تھے۔ آپ جانتے ہی ہوں گے؟

سردار جی: وہی نا۔ جنہیں انڈین شیکسپیئر کہتے ہیں؟

مرزا صاحب: (مسکراتے ہوئے) نہیں نہیں۔ انڈین شیکسپیئر تو آغا حشر کاشمیری مرحوم تھے جو مشہور ڈراما نویس تھے۔ غالب ان سے بہت پہلے عہد مغلیہ میں گزرے ہیں۔ آپ کا نام اسد اللہ خاں تھا اور وطن دہلی۔ آپ فارسی اور اردو زبانوں کے بہت بڑے شاعر تھے' لیکن عمر تنگ دستی میں گزری۔ آپ کو شراب نوشی کا بہت شوق تھا' اس لئے کبھی فارغ البالی نصیب نہ ہوئی۔

سردار جی: بالکل میرے چچا ہر نام سنگھ کی طرح ذیلدار تھا۔ دو سو

بیگھہ زمین تھی۔ ضلع بھر میں عزت تھی، لیکن شراب نے بیڑا غرق کر دیا۔ آج اسے کوئی دس روپے ادھار نہیں دیتا۔

مرزا صاحب : ہاں ہاں بس غالب کی بھی یہی حالت تھی، لیکن تھا بڑا خوددار۔ مرتا گیا لیکن امرا کے سامنے نہ جھکا۔ اس کی ایک خوبی یہ تھی کہ .....

سردار جی سر تو ہلاتے جاتے تھے، لیکن دل میں سوچتے تھے کہ بات تو جرمنوں سے روپیہ حاصل کرنے کی تھی۔ یہ مرزا صاحب غالب کا قصہ کیوں چھیڑ بیٹھے؟ آپ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ مرزا کاظم نے ان کے دل کی بات کو بھانپ کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ خاموشی سے سنتے جایئے۔

مرزا صاحب : غالب ایک فلاسفر شاعر تھے اور انہوں نے وہی زمانہ پایا، جو جرمنی کے فلاسفر شاعر گوئٹے کو نصیب ہوا۔ گوئٹے بھی .....

مرزا صاحب یہاں تک کہہ پائے تھے کہ سردار جی سے صبر نہ ہو سکا اور انہوں نے بات کاٹ کر اپنی بات شروع کر دی۔

سردار جی : لیکن مرزا صاحب! جہنم میں جائیں غالب اور گوئٹے، آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ جرمنوں سے روپیہ حاصل کرنے کی ترکیب بتائیں گے۔

مرزا صاحب : بالکل درست، اور میں وہی ترکیب تو بتا رہا ہوں۔ آپ ذرا سنتے جایئے۔ آپ ہندوستان کے بہت بڑے مورخ، شاعر اور ادیب ہیں۔

سردار جی : میں اور شاعر؟

مرزا صاحب : بس آپ چپ رہئے اور میری بات سنئے۔ آپ اتوار کے دن "ہومبرگ ہال" میں ایک تقریر کریں گے جس میں آپ غالب اور گوئٹے کی شاعری کا موازنہ فرمائیں گے۔

سردار جی : یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میں تو جرمن زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا اور نہ غالب اور گوئٹے کی شاعری سے واقف ہوں۔

مرزا صاحب : آپ اردو زبان میں اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو پنجابی زبان میں تقریر فرمایئے۔ بات صرف یہ ہے کہ بولتے جایئے۔ غالب اور گوئٹے کی شاعری سے آپ واقف نہیں' تو ان کے نام تو چنداں مشکل نہیں۔ ذرا کہئے تو۔

سردار جی: غالب گوئٹے۔۔۔۔ غالب گوئٹے۔۔۔۔"

مرزا صاحب : بالکل ٹھیک۔ آپ پاس ہو گئے۔ صرف اتنی بات ہے کہ "غالب انڈ گوئٹے" کہے۔ انگریزی زبان میں جسے ہم اینڈ کہتے ہیں۔ جرمن میں اسے انڈ کہا جاتا ہے۔

سردار جی: غالب انڈ گوئٹے ------ غالب انڈ گوئٹے ------

مرزا صاحب : واہ واہ۔ خوب! آپ ہندوستان کے بہت بڑے سکالر ہیں۔ کل برلن کے اخبارات میں اعلان شائع ہو گا کہ ہندوستان کے مشہور سکالر سردار پریتم سنگھ اتوار کے دن شام ہومبرگ ہال میں "غالب اور گوئٹے" کے موضوع پر ایک زبردست تقریر کریں گے۔ داخلہ ٹکٹ کے ذریعہ ہو گا۔ وغیرہ۔

سردار جی: لیکن میں تقریر میں کہوں گا کیا؟

مرزا صاحب : جو جی میں آئے کہتے جایئے۔ بس بولتے جایئے اور ہر تین چار جملوں کے بعد "غالب انڈ گوئٹے" کہتے رہئے۔

اتوار کی شام آ پہنچی۔ ہومبرگ ہال جرمن "اہل ذوق" سے کھچا کھچ بھر گیا۔ صدارت کی کرسی پر برلن کے ایک مشہور ماہر ادبیات جلوہ افروز تھے۔ ان کے ایک طرف سردار پریتم سنگھ اور دوسری طرف مرزا کاظم بیٹھے تھے۔ تقریر کا وقت آ گیا اور سردار صاحب تقریر کرنے کے لئے اٹھے۔ صاحب صدر نے اٹھ کر حاضرین سے پروفیسر پریتم سنگھ کا تعارف کرایا' جس پر ہال خیر مقدم کی تالیوں سے گونج اٹھا۔

سردار صاحب نے اپنی تقریری شروع کی :

"صاحبان! مرزا اسد اللہ خان غالب دہلی کے رہنے والے تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ شراب بہت پیتے تھے' اس لئے ان کی عمر تنگ دستی میں گزری۔ دہلی

ہندوستان کا دارالسلطنت ہے۔ وہاں ایک گھنٹہ گھر بھی ہے۔ چاندنی چوک میں سودا بیچنے والوں کی صدائیں بہت پیاری ہوتی ہیں۔ ہر طرف سے آوازیں آتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غالب انڈ گوئے!"

مجمع نے پرزور تالیاں بجا کر آسمان سر پر اٹھا لیا اور جب تالیوں کی گونج ختم ہوئی ' تو سردار صاحب نے تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"دہلی سے تین سو میل کے فاصلے پر لاہور ہے۔ میں ضلع لاہور کا رہنے والا ہوں۔ ہمارا علاقہ بڑا زرخیز ہے۔ پچھلے سال بارشیں کم ہوئی تھیں' اس لئے فصلیں اچھی نہ ہوئیں۔ اس سال گورو مہاراج کی کرپا ہے۔ نہر میں بھی پانی خوب رہا اور بارشیں بھی اچھی ہو گئیں۔ امید ہے کہ گیہوں کی فصل اچھی رہے گی۔ لاہور کی بہت سی چیزیں دیکھنے کے لائق ہیں۔ مثلاً بادشاہی مسجد' مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ' چڑیا گھر' عجائب گھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غالب انڈ گوئے!"

پھر تالیوں سے فضا گونج اٹھی اور صاحب صدر کے لبوں پر تبسم رقص کرنے لگا۔ آپ نے میز پر ہاتھ مار مار کر مقرر کی "جادو بیانی" کی داد دی۔ سردار صاحب نے اپنی حوصلہ افزائی دیکھی تو ذرا زیادہ بلند آواز سے تقریر کرنے لگے۔ فرمایا:

"غالب انڈ گوئے کی بدقسمتی تھی کہ انہوں نے شری دربار صاحب امرت سر کے درشن نہ کئے حتیٰ کہ وہ ضلع گورداس پور بھی نہ جا سکے' ورنہ وہاں کا گڑ کھا کر انہیں نانی سپنے یاد آ جاتے۔ ضلع امرت سر میں ایک گاؤں چمیاری ہے۔ وہاں کے خربوزے بہت مشہور ہیں' قصور کی میتھی بہت خوشبودار ہوتی ہے اور پھر غالب انڈ گوئے کے کیا ہی کہنے ہیں گویا انڈیا انڈ جرمنی!"

اس دفعہ سردار نے استاد کے بتائے ہوئے سبق "غالب انڈ گوئے" پر "انڈیا انڈ جرمنی" کا اضافہ کر کے کمال کر دکھایا اور ان الفاظ نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ تالیوں سے ہال گونج اٹھا۔ سردار صاحب نے تقریر جاری رکھی اور دو تین فقرے کہنے کے بعد فرمایا کہ:

"صاحبان اب غالب کے اشعار بھی سنئے"۔

اس مقام پر مرزا کاظم نے اٹھ کر حاضرین سے جرمن زبان میں کہا کہ پروفیسر پریتم سنگھ اب غالب کے چند اشعار سنائیں گے۔ سردار صاحب نے اپنے مخصوص قومی انداز میں یہ گانا شروع کر دیا:

اساں نت دے

نی اساں نت دے شرابی رہنا نی ہر نام کورے نارے

ادھ وچ کندھ کر لے

مرزا کاظم کرسی سے اچھل پڑے، جس پر حاضرین نے تالیوں سے فضا میں گونج پیدا کر دی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب نے ان اشعار کو بے حد پسند کیا ہے۔ سردار صاحب پھر بولے:

اسیں مر گئے

نی اسیں مر گئے کمایاں کردے نی ہر نام کورے نارے

اجے تیرے بند نہ بنے ۔ ۔ ۔ ۔ ہائے نی اسیں مر گئے

اس دفعہ بھی حسب معمول کافی داد ملی، لیکن داد کی حد تو اس وقت ہوئی جب سردار صاحب نے "غالب" کی وہ "مثلث" سنائی جس کا ٹیپ کا مصرعہ یہ تھا:

"موڑیں بابا ڈانگ والیا چھئی"

ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا اور سردار پریتم سنگھ مورخ، شاعر اور ماہر ادبیات کی تقریر ختم ہوئی۔ اس کے بعد مرزا کاظم اٹھے اور انہوں نے نہایت فصیح جرمن زبان میں بیان کیا کہ پروفیسر نے جس قابلیت کے ساتھ غالب اور گوئٹے کا موازنہ کیا ہے، شاید ہی آج تک کسی نے کیا ہو۔ کم از کم برلن میں تو ایسی تقریر آج تک نہ ہوئی ہو گی اور مجھے فخر ہے کہ میرے ملک نے پروفیسر صاحب جیسے آدمی پیدا کئے ہیں۔ میں اس پوری تقریر کا ترجمہ کر کے برلن کے اخبارات میں شائع کراؤں گا اور آپ دیکھیں گے کہ میرے وطن کے مایہ ناز ماہر ادبیات نے علم و فضل کے کیا کیا دریا بہائے ہیں۔ میں آپ صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے پروفیسر صاحب کے خیالات سننے کی تکلیف گوارا فرمائی۔ ۔ ۔ ۔ اس کے بعد صاحب صدر اٹھے اور انہوں نے پروفیسر صاحب اور مرزا کاظم کا شکریہ حاضرین کی طرف سے ادا کیا اور جلسہ کے اختتام کا اعلان کیا۔ پھر کیا تھا۔ بڑے بڑے ادیب، شاعر، اخبار نویس اور رئیس سردار صاحب سے مصافحہ کرنے کو لپکے اور آپ کو بڑی مشکل سے ہال کے دروازے تک لے جایا گیا۔ ۔ ۔ ۔ اسی رات کو مرزا کاظم پروفیسر پریتم سنگھ کو ٹرین پر سوار کرانے کے لئے اسٹیشن تک گئے اور دونوں کی جیبیں نوٹوں سے پر تھیں۔

(ہمایوں (لاہور)، بابت جولائی 1940ء، ص 534-537)

ممتاز حسن

جرمنی کا مشرقی شاعر _____ گوئٹے

(قسط اول)

گوئٹے کا دیوان یورپ کے ادب میں اپنی قسم کی ایک ہی چیز ہے۔ جرمن زبان میں اس کا نام ہے "ویسٹ آسٹلیشر دیوان" یعنی "مغربی۔ مشرقی دیوان"۔ اقبال نے اختصار سے کام لے کر اس کو گوئٹے کے "دیوان مغرب" یا "مغربی دیوان" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ مگر گوئٹے نے دیوان کے پہلے ایڈیشن میں اس کے عنوان کے متعلق جو الفاظ لکھے' وہ یہ تھے "الدیوان الشرقی للمولف الغربی"۔ گوئٹے کی پیروی میں اگر اس مجموعہ کلام کو "دیوان شرقی" ہی کہا جائے' تو بہتر ہو گا۔

یہ دیوان جرمن زبان میں ہے' مگر اس کی ہر نظم پر مشرقیت کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ بالتخصیص اس میں اسلام اور ایرانی ادب کا اثر نمایاں ہے۔ کس قدر نمایاں' اس کا اندازہ محض دیوان کے بارہ حصوں کے عنوانوں پر ایک نظر ڈالنے سے ہو سکتا ہے۔ وہ عنوان یہ ہیں :- مغنی نامہ' حافظ نامہ' عشق نامہ' ساقی نامہ' زلیخا نامہ' پارسی نامہ' تیمور نامہ' خلد نامہ' تفکیر نامہ' رنج نامہ' حکمت نامہ' مثل نامہ۔

عنوانوں کے علاوہ مضامین کو دیکھئے تو تیمور کے حملوں سے لے کر ابو ہریرہؓ کی بلی تک سب کچھ موجود ہے۔ اکثر ترکیبیں' تشبیہیں اور استعارے فارسی شاعری کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ دیوان کی اس آخری خصوصیت کی طرف اقبال نے بھی "پیام مشرق" کے

دیباچے میں اشارہ کیا ہے۔

دیوان کے آخر میں گوئٹے نے متعدد نوٹ لکھے ہیں' جو منجملہ اور موضوعات کے مختلف ایرانی شعرا' مثلاً حافظ' سعدی' انوری' رومی' نظامی' فردوسی و غیر ہم سے متعلق ہیں۔ خود رسولؐ اللہ پر بھی ایک نوٹ ہے۔ گوئٹے جناب رسالت مآبؐ کی ذات گرامی سے غیر معمولی طور پر متاثر ہے۔ اس کی ایک مشہور نظم "نغمہ محمدؐ" کا ترجمہ اقبال نے کیا ہے' جو "پیام مشرق" میں شامل ہے۔ اس نظم سے گوئٹے کی عقیدت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"دیوان شرقی" کی تصنیف کے تین بڑے محرکات ہیں۔ اول تو یہ کہ گوئٹے کی ہمہ گیر طبیعت اوائل عمر ہی سے مشرقی ادب کی طرف مائل تھی۔ وہ اپنے طالب علمی کے زمانے میں جب شٹراس برگ میں مقیم تھا' تو اس کی ملاقات ہرڈر سے ہوئی۔ ہرڈر نے گوئٹے کو فارسی ادبیات' خصوصاً سعدی سے متعارف کرایا۔ اس کے بعد فارسی ادب سے گوئٹے کی دلچسپی کم و بیش قائم رہی' اس زمانے میں مختلف جرمن ادیب فارسی زبان کے شاہکاروں کو جرمن میں منتقل کر رہے تھے۔ 1812ء میں فان ہامر کا دیوان حافظ کا ترجمہ شائع ہوا اور گوئٹے اس سے خاص طور پر متاثر ہوا۔ حافظ سے گوئٹے کی عقیدت کی بنیاد یہی ترجمہ ہے۔ گوئٹے نے "دیوان شرقی" میں جا بجا حافظ کو "ولیٔ مقدس" کے نام سے مخاطب کیا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اگر گوئٹے حافظ کے کلام سے آشنا نہ ہوتا تو "دیوان شرقی" کا وجود میں آنا مشکل بلکہ ناممکن تھا۔

مشرقی ادبیات سے گوئٹے کی دلچسپی فارسی تک ہی محدود نہیں تھی' اس نے عربی' عبرانی' سنسکرت اور چینی ادب کا بھی مطالعہ کیا تھا' البتہ جس زبان نے اس کی شاعری پر سب سے زیادہ اثر ڈالا' وہ فارسی ہی ہے۔

مشرق سے ادبی دلچسپی کے علاوہ دیوان کی تصنیف کا ایک اور بڑا محرک اس زمانے کے یورپ کے سیاسی حالات تھے۔ نپولین کی فتوحات نے یورپ میں ایک عرصے تک امن قائم رکھا' مگر جب مفتوح ملکوں نے نپولین کے خلاف پے در پے بغاوتیں کیں' تو سارے کا سارا یورپ ایک میدان جنگ بن گیا اور بدامنی اور بے اطمینانی کا دور دوبارہ شروع ہو گیا۔ یورپ کی یہ حالت گوئٹے کے لئے روحانی اذیت کا باعث تھی۔ اس نے مشرق کی پرسکون فضا میں پناہ لینی چاہی۔ دیوان کی پہلی نظم سے جس کا عنوان "ہجرت" ہے' اس کی نفسیاتی کیفیت کا

اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہی کیفیت تھی' جس سے دیوان کی ابتدا ہوئی۔ یہ 1814ء کے آغاز کا ذکر ہے۔ اس سال ستمبر کے مہینے میں دیوان کی تصنیف کا تیسرا محرک معرض وجود میں آیا یعنی گوئٹے کی ملاقات اس خاتون سے ہوئی' جس کی شخصیت 'زلیخا' کے فرضی نام کے پردے میں 'زلیخا نامہ' اور دیوان کے دوسرے حصوں کی زینت ہے۔ اس آفت جان کا نام ماریانی ینگ تھا۔ اس کی عمر کے پہلے پندرہ سولہ سال کم و بیش کسمپرسی کے عالم میں گذرے تھے۔ کچھ عرصے تک وہ "بالی" کی رقاصہ بھی رہی۔ اس کے بعد فرانک فرٹ کے ایک دولت مند ساہوکار یوہان یاقوب فان ولے مار نے اسے اپنے دامن تربیت میں لے لیا۔ جس وقت گوئٹے سے اس کی پہلی ملاقات ہوتی ہے' اس کی عمر تیس سال تھی اور گوئٹے پینسٹھ سال کا تھا۔ ماریانی' فان ولے مار کے ہاں رہتی تھی جہاں اس کے علاوہ فان ولے مار کی دو لڑکیاں بھی مقیم تھیں۔ فان ولے مار کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی ایک لڑکی بھی بیوگی کی زندگی گذار رہی تھی۔

ماریانی سے گوئٹے کی پہلی ملاقات دیوان کی تصنیف کے سلسلے میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتی' البتہ آثار و قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ جانبین میں باہمی دل بستگی کی ایک ہلکی سی ابتدا ہو چکی تھی۔ بہرحال جب اگلے سال اس ملاقات کی تجدید ہوتی ہے' تو وہ چنگاری جو شاعر کے دل میں دبی ہوئی تھی' شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔ فان ولے مار گوئٹے کا دوست تھا' اس مرتبہ گوئٹے اس کے ہاں فرانک فرٹ کے باہر چھ سات ہفتے مہمان رہا۔ اس سے کچھ پہلے ماریانی کی شادی فان ولے مار سے ہو چکی تھی اور اب وہ ماریانی ینگ کی بجائے ماریانی ولے مار بن چکی تھی' لیکن یہ سماجی پیچیدگی گوئٹے اور ماریانی میں تیز رفتار رومان کے راستے میں حائل نہ ہو سکی۔ ماریانی ذہانت' شوخی اور دل کشی کا ایک بے مثال مجسمہ تھی' بلا تکلف شاعرہ تھی' اس کی بعض نظمیں خود گوئٹے کے دیوان میں موجود ہیں۔ اس کی صحبت میں گوئٹے کی شاعرانہ طبیعت جذبے اور محبت کی انتہائی بلندیوں پر جا پہنچی۔ چنانچہ دیوان کا سب سے زیادہ کیف آور اور وجد آفریں حصہ وہی ہے' جس کی تجدید ماریانی کے عشق سے ہوئی۔

فرانک فرٹ کے مختصر قیام کے بعد جب گوئٹے اور ماریانی ایک دوسرے سے جدا ہوئے' تو انہوں نے آپس میں ملتے رہنے کا وعدہ کیا۔ یہ وعدہ جلد ہی ہائیڈل برگ کی حسین و جمیل فضا میں پورا ہوا' ان کی یہ ملاقات دو تین گھنٹوں سے زیادہ نہیں رہ سکی۔ یہ ان کی آخری

ملاقات تھی۔ البتہ ان میں باہم نامہ و پیام کا سلسلہ گوئٹے کے مرتے دم تک جاری رہا۔

گوئٹے اور ماریانی کی عشقیہ خط و کتابت کے سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جب وہ اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے' تو الفاظ کی بجائے اکثر فان ہامر کے ترجمہ حافظ کے کسی شعر کی طرف اشارہ کر دیتے۔ ہائیڈل برگ کی رومان پرور ملاقات میں انہوں نے باہم یہ عہد بھی کیا کہ وہ ہمیشہ چودھویں رات کے چاند کو دیکھ کر ایک دوسرے کو یاد کیا کریں گے۔

"دیوان شرقی" میں ماریانی زلیخا ہے اور گوئٹے اپنے جذبات کا اظہار حاتم کے نام سے کرتا ہے۔ ایک عرصہ تک زلیخا کی شخصیت پردہ راز میں رہی۔ ماریانی کے انتقال کے بعد اس کے ایک رشتے کے بھائی ہرمان گرم نے یہ راز کھولا' جس کے یوں بھی بکثرت شواہد موجود تھے۔

ماریانی کی وفات 1860ء میں ہوئی۔ موجودہ سال اس کی صد سالہ برسی کا ہے۔ چنانچہ یہی چیز ان چند ترجموں کی محرک ہے' جو ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ یہ "دیوان شرقی" کے اردو ترجمے کی پہلی اور سرسری کوشش ہے۔ امید ہے کہ اگر ارباب علم و ادب کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی' تو دیوان کا ایک ایسا ترجمہ مرتب ہو سکے گا' جو گوئٹے اور اردو ادب دونوں کے شایان شان ہو۔

مغنی نامہ

ہجرت

1

شمال اور جنوب اور مغرب ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں
بادشاہتیں ٹوٹ رہی ہیں سلطنتیں لرز رہی ہیں
آؤ کہ ہم مشرق کی پاک فضاؤں کا رخ کریں
اور پیران شرق کی صحبت سے فیض یاب ہوں
آؤ کہ عشق و محبت اور مے و نغمہ کی بدولت
ہم خضر کے چشمہ حیواں سے شباب رفتہ کو از سر نو حاصل کریں

2

راستی کی اس پاکیزہ فضا میں
جہاں انسان کو براہ راست
ہدایت آسمانی دنیا کی زبانوں میں حاصل ہوئی'
اور جہاں انسانوں نے آپس میں ایک دوسرے کا سر نہیں پھوڑا۔
اس پاکیزہ فضا میں
میں نوع انسانی کی ازلی فطرت کا مشاہدہ کر سکوں گا۔

3

جہاں آباؤ اجداد کا احترام کیا جاتا تھا
جہاں غیروں کے سامنے سر نہیں جھکتے تھے
جہاں اعتقاد کا دائرہ وسیع ہے اور فکر کا محدود
جہاں حرف گفتہ اس لئے اثر رکھتا تھا
کہ وہ حرف گفتہ تھا
وہاں میں اپنے لئے بخوشی وہ سب پابندیاں قبول کروں گا جو نوجوانوں پر عائد ہوتی ہیں

4

میں گڈریوں کے ساتھ رہوں گا
کاروانوں کے ساتھ گھوموں گا
نخلستانوں میں تازہ دم رہوں گا
شال' قہوہ اور مشک بیچوں گا
صحرا بہ صحرا' قریہ بہ قریہ
سب راستے روند ڈالوں گا

5

دشوار گزار پہاڑیوں کے نشیب و فراز میں جب کوئی قافلہ سالار

ستاروں کو جگانے کے لئے
اور قزاقوں کو ڈرانے کے لئے
اپنے مرکب کی اونچی پیٹھ پر
اے حافظ! تیرے میٹھے میٹھے نغمے الاپتا ہے
تو میرے دل کو تسکین ہوتی ہے۔

6

اے حافظ پاک طینت! حماموں میں اور مے کدوں میں
تو مجھے یاد آئے گا
جب محبوبہ اپنے رخ رنگیں سے نقاب اٹھائے گی
اور اپنے گیسوئے عنبریں کی خوشبو کو فضا میں پھیلائے گی
اس وقت شاعر کی محبت آمیز سرگوشیاں
حوروں کے جذبات کو بیدار کریں گی۔

7

کیا تم اس واسطے اس سے حسد کرو گی؟
یا اس سے بیزاری کا اظہار کرو گی؟
یاد رکھو۔ شاعر کے الفاظ'
حیات جاوداں کی طلب میں'
ہمیشہ جنت کے دروازے پر منڈلاتے
اور آہستہ آہستہ دستک دیتے رہتے ہیں۔

حکمت نامہ

1

میں خداوند تعالیٰ کا شکر سب سے زیادہ کس لئے ادا کرتا ہوں

اس لئے کہ اس نے ہمارے مصائب کو ہمارے علم سے علیحدہ رکھا ہے۔
اگر مریض کو اپنے مرض کا علم تمام و کمال اسی طرح ہو جائے جیسے طبیب کو ہے
تو اس کے لئے مایوسی کے سوا کوئی چیز باقی نہ رہے

2

یہ نادانی نہیں تو کیا ہے کہ انسان اپنے معاملات میں
اپنی ذاتی رائے کو فوقیت دے
اگر اسلام کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیں'
تو ہم سب یقیناً اسلام ہی میں جیتے اور اسلام ہی میں مرتے ہیں

تفکیر نامہ

پانچ چیزیں

پانچ چیزیں ایسی ہیں جو پانچ دوسری چیزوں سے پیدا نہیں ہو سکتیں'
میری یہ نصیحت کان کھول کر سن
جس دل میں غرور ہو گا' اس میں محبت کا پودا نہیں لگ سکے گا
جس شخص کی طبیعت میں سفلہ پن ہو' وہ خوش اخلاق نہیں ہو سکتا'
جو شخص بدکردار ہو' وہ بزرگی کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتا'
جس شخص کا دل حسد سے پر ہو' وہ نادار پر رحم نہیں کرے گا۔
جو شخص دروغ گوئی کرے' وہ کسی سے اعتماد اور وفاداری کی توقع نہیں رکھ سکتا۔
میری ان نصیحتوں کو خوب یاد رکھ اور کسی وقت بھی انہیں ہاتھ سے نہ دے۔
یہ تیرے کام آئیں گی۔

پانچ اور چیزیں

وہ کیا شے ہے جو وقت کو ہمارے لئے مختصر کر دیتی ہے؟ وہ ہے عمل۔
وہ کیا شے ہے جو وقت کو ناقابل برداشت طور پر لمبا کر دیتی ہے؟ وہ ہے بے عملی۔

وہ کیا شے ہے جو ہماری موت کو ہم سے قریب کرتی ہے؟ وہ ہے اپنے کاموں میں تاخیر اور بے پروائی۔
وہ کیا شے ہے جو ہمیں کامیابی عطا کرتی ہے؟ وہ ہے جلد فیصلہ کرنے کی قوت۔
وہ کیا شے ہے جو ہمیں عزت دلاتی ہے؟ وہ ہے اپنے نفس کی حفاظت۔
(ماخوذ از تفکیر نامہ)

مغنی نامہ

طلسم

1

مشرق بھی خدا کا ہے
اور مغرب بھی،
اقالیم شمال جنوب دونوں
اس کے دست قدرت میں آسودہ ہیں۔

2

خدا، جو احکم الحاکمین ہے
ہر انسان کے ساتھ عدل کرنا چاہتا ہے،
اس کے سو اسمائے حسنیٰ ہیں،
یہی نام میرے لئے محبوب ترین ہے۔ آمین!

3

خداوندا! میں گمراہی کے ہاتھوں پریشان ہوں
اور تو ہی ہے جو مجھے اس کش مکش سے نجات دے سکتا ہے۔
خداوندا! جب میں کسی کام میں ہاتھ ڈالوں یا فکر سخن کروں،
تو راہ راست کی طرف میری رہنمائی کر۔

4

خواہ میں دنیا ہی کے کاروبار میں مشغول رہوں'
میرے لئے اس میں بھی روحانی منفعت ہے۔
جسم خاکی کے خاک ہو جانے سے روح خاک میں نہیں مل جاتی'
وہ علائق جسمانی سے آزاد ہو کر بلندیوں کی طرف پرواز کرتی ہے۔

5

نفس کی آمد و شد میں دو نعمتیں موجود ہیں
ہم سانس لیتے ہیں تو تازہ دم ہو جاتے ہیں اور سانس سینے سے باہر نکلتا ہے تو ہمیں تنگی سی محسوس ہوتی ہے'
زندگی میں تنگی اور کشائش اسی طرح ملی جلی ہیں۔
پس اے انسان شکر ادا کر خدا کا جب تو تنگی محسوس کرے'
اور شکر ادا کر جب خدا تجھے کشائش بخشے۔

زلیخا نامہ

1

جان من! تو چاہے ہزار بھیس بدلے'
مین تجھے فی الفور پہچان لوں گا۔
تو خواہ جادو کے نقاب اوڑھ لے
میں بلا تامل تجھے پہچان لون گا' اے محبوب ہرجائی!

2

جب میں کسی سرو کی تازہ اور پاکیزہ کونپلوں کو پھوٹتے دیکھتا ہوں
تو اے حسن افزوں! اس میں مجھے تیری ہی جھلک نظر آتی ہے'

جو بہار کی مصفا اور جاندار لہروں میں
میں تیری ہی ادائیں دیکھتا ہوں اے جان بہار!

3

جب ایک فوارۂ آب فضا میں بلند ہو کر بکھرتا ہے
تو اے بت طناز! میں اس نظر میں تیرا جلوہ دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھتا ہوں۔
جب بادل گھر گھر کر بکھرتے ہیں
تو مین ان مین تجھی کو دیکھتا ہوں اے شعبدہ کار!

4

جب میں ہرے بھرے میدانوں میں رنگ برنگ پھولوں کی بہار دیکھتا ہوں
تو اے میری محبوبہ ستارہ جمال! مجھے ان میں تو ہی نظر آتی ہے۔
اور جب عشق پیچان کی بیل اپنے ہزار بازو پھیلاتی ہے
تو وہ بھی تیرا ہی انداز ہوتا ہے اے دل نواز!

5

جب کوہساروں پر شفق صبح کے شعلے بلند ہوتے ہیں
تو اے میری محبوبہ جانفروز! تو میں تیرے حسن کے آگے جھک جاتا ہوں'
اور جب آسمان کا روشن گنبد میرے سر پر چھا جاتا ہے
تو تو میرے نفس میں سما جاتی ہے' اے دل آرام!

6

میں جو کچھ آنکھ سے دیکھتا ہوں اور جو کچھ دل میں محسوس کرتا ہوں'
وہ تیرا ہی فیضان ہوتا ہے' اے حسن بصیرت افروز!
اور جب میں خدا تعالیٰ کے سو نام پکارتا ہوں
تو ہر نام کے ساتھ ایک اور نام بھی گونجتا ہے اور اس کی نسبت تیری ذات سے ہے....!

(ادبی دنیا (لاہو)' خاص نمبر' دو پنجم' شمارہ سوم' 1960ء' ص 21-30)

(قسط دوم)

یہ چار نظمیں جن کے ترجمے ذیل میں پیش کئے گئے ہیں، گوئٹے کے "دیوان شرقی" سے ماخوذ ہیں۔

پہلی نظم اصل کی طرح بے عنوان ہے۔

"باز دید" گوئٹے اور ماریانی فان ولے مار کی ملاقات کی یاد گار ہے اور "چاند کی چودھویں" بھی۔ یہ ملاقاتیں 1815ء میں ہوئیں۔

"پیام راز" میں اس خفیہ زبان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو گوئٹے اور ماریانی ایک دوسرے کو خط لکھتے وقت استعمال کیا کرتے تھے۔ اکثر اوقات اپنی طرف سے کچھ لکھنے کی بجائے وہ فان ہامر کے ترجمہ حافظ کی کسی نظم یا شعر کی طرف اشارہ کر دیتے تھے اور یہی وہ خفیہ "کوڈ" ہے، جس کا تذکرہ اس نظم میں ہے۔

ممتاز حسن

1

اب تو یہ عالم ہے کہ ہر صبح، ہر شام،
لحظہ بہ لحظہ، نظر بہ نظر، نفس بہ نفس، کلمہ بہ کلمہ
میری محبت آئینہ دار ہے تیری محبت کی،
برسوں کی فراوانی سے مخمور،
اور شادمانی و کامرانی سے معمور
تو میرے نغموں کی خلش پنہاں سے آشنا ہے۔
کاش مجھ کو یوسف کی سی دلاویزی نصیب ہوتی
جو تیرے حسن کی حریف ہو سکتی!

2

باز دید

1- کیا سچ مچ یہ تمی ہو' اے میرے ستاروں کی ملکہ!
جسے میں دوبارہ اپنے سینے سے لگا رہا ہوں'
آہ یہ جدائی کی رات کیا تھی! کس قدر عمیق!
کیسے درد و کرب سے لبریز!
ہاں! یہ تمی ہو' اے میری مسرتوں کی آئینہ دار!
میری محبوبہ جاں نواز!
جب مجھے وہ صدمے یاد آتے ہیں جو فرقت میں مجھ پر گذرے ہیں
تو ان کے تصور سے میں آج بھی لرز جاتا ہوں!

2- جب کائنات کی اساس و وجود
خلاق ازل کے سینے میں مضمر تھی'
تو سب سے پہلے' ایک بلند و برتر جذبہ تخلیق کے ساتھ'
اس نے لحہ اولیں کو وجود بخشا'
اور کہا "کن"۔
معاً ایک درد بھری آہ بلند ہوئی'
اور کائنات' پورے شان و شکوہ کے ساتھ'
معرض وجود میں آ گئی!

3- پھر روشنی نمودار ہوئی'
اور ظلمت خجالت کے مارے اس سے الگ ہو گئی۔
اسی لمحے' عناصر کائنات
ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر منتشر ہو گئے'
ہر ایک حیران و پریشاں' خوابوں کی وسعتوں میں مبتلائے کش مکش!
فضائے بسیط میں

ساکت و جامد'
نہ کوئی آواز نہ کوئی امنگ!
4- اب ہر شے خاموش تھی' ساکت اور اداس
خدا پہلی بار تنہا تھا!
اب اس نے شفق صبح کو پیدا کیا'
شفق کو کائنات کے حال پر رحم آیا
اور اس نے اس تاریک اور غم آلود فضا کو
ایک رنگین اور ترنم زا منظر میں بدل دیا'
اور جو عناصر اس سے قبل ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے
وہ محبت سے سرشار' دوبارہ ایک دوسرے سے آ ملے۔
5- اب ہر کوئی سرگرم جستجو ہے'
اپنے اپنے حبیب کی جستجو میں سرگرم!
جذبے اور نظارے
ایک زندگی بے کراں کی طرف گامزن ہیں
وہ عجز و نیاز ہو یا ستیز حریفانہ!
مقصد تو یہ ہے کہ بنائے محبت استوار ہو۔
خدا کے لئے اب تخلیق لازم نہیں'
ہم خود اس کی دنیا میں تخلیق کر رہے ہیں!

3

چاند کی چودھویں

1- اے میرے دل کی ملکہ! ان سرگوشیوں کے کیا معنی؟
تیرے ہونٹوں پہ یہ ہلکی سی لرزش کیسی؟
تیرے لب آپ ہی آپ تتلاتے ہیں
شراب کے گھونٹ سے بھی زیادہ لذت ہے'

کیا تو چاہتی ہے کہ تیرے ہونٹوں کی طرف
دو اور ہونٹ کھنچے ہوئے چلے آئیں!
میں تیرا بوسہ لوں گا! سنا! میں تیرا بوسہ لے کر رہوں گا!

2- دیکھ، اس مبہم تاریکی میں
درختوں کی شاخیں تمام شگفتہ و فروزاں ہیں!
جھاڑیوں میں ہزاروں لعل بکھرے پڑے ہیں،
اور ہزاروں زمرد!
درخشاں ستارے ایک دوسرے کو ماند کرنے کے درپے ہیں،
لیکن تیری ذات ان سب سے جدا اور برتر ہے۔
میں تیرا بوسہ لوں گا، سن لے! میں تیرا بوسہ لے کے رہوں گا!

3- تیرا محبوب، تجھ سے دور،
ایک کیف بے حاصل دل میں لئے،
زندگی کی ترشی اور شیرینی دونوں سے یکساں طور پر آشنا ہے!
تجھے یاد ہے؟ ہم دونوں نے چاند کی چودھویں رات میں تجدید محبت کا عہد کیا تھا!
دیکھ وہ گھڑی آن پہنچی!
میں تیرا بوسہ لوں گا! سن لیا! میں تیرا بوسہ لے کے رہوں گا!

4

پیام راز

1- اے سفرائے عظام! تمہیں چاہئے
کہ اپنے فرائض منصبی کے پیش نظر،
اپنے سلاطین کو
نیک اور مخلصانہ مشورے دیتے رہو،
مناسب یہی ہے کہ دنیا کا کاروبار
خفیہ نامہ و پیام کے ذریعے چلتا رہے،

حتی کہ ہم سب کے انداز فکر و بیان میں
ایک ہم آہنگی پیدا ہو جائے!

2- میری محبوبہ دل نواز کا نامہ راز
میرے پاس آیا ہے'
اور میں اس کی ایجاد کردہ خفیہ زبان سے لذت اندوز ہو رہا ہوں!
یہ زبان فطرت کی حسین تریں فضا میں
میرے اور محبوبہ کے درمیان
خلوص محبت اور عہد وفا کی استواری
کی آئینہ دار ہے!

3- یہ ہزارہا تروتازہ پھولوں کا
رنگین گلدستہ ہے۔
ایک گھر'
جو پریوں کی سی مخلوق سے آباد ہے۔
ایک رنگیں فضا'
جو رنگا رنگ کے حسین پرندوں سے معمور ہے۔
گیتوں کا ایک سمندر'
جس کے گونجتے ہوئے نغموں کو' خوشبو سے مہکتی ہوئی ہوائیں
اڑائے لئے جا رہی ہیں!

4- یہ ذو معنی تحریر'
یہ کوشش جو ہر قسم کی قیود سے آزاد ہے'
زندگی کے عین ہدف پر
تیر پر تیر چلا رہی ہے'
یہ بات جو اب تم پر عیاں ہے'
عرصہ دراز سے ایک نیک رسم سی چلی آتی تھی۔
اور اگر اب تم اسے محفوظ کر لو گے
تو خاموشی سے کار آمد ثابت ہو گی۔

حنیف ہاشمی

فاؤسٹ

"فاؤسٹ" جرمن شاعر گوئٹے کا شاہ کار ہے اور اس کا شمار دنیا کی بہترین ادبیات میں کیا جاتا ہے۔ اس میں قلب انسانی کے ان عمیق جذبات کو بے نقاب کیا گیا ہے' جن کی تابناکی اور ہنگامہ آفرینی نے انسان کو مسجود ملائک بنا دیا ہے۔ حکیم فاؤسٹ کی اندرونی کشمکش جو ہملٹ کے دل کی خوفناک جنگ کی مانند ہے' جنسی اور اخلاقی مبادیات کا مجادلہ اور اس کے تاثرات نہایت بے پناہ طور پر نمایاں ہیں۔ یہ گوئٹے کی تمام عمر کی جدوجہد اور جانفشانی کا ثمرہ ہے' کیونکہ اس کی تکمیل کے خیال نے شاعر کی توجہ کو آغاز باب میں ہی اپنی طرف منجذب کر لیا تھا۔ پہلا حصہ مختلف اقساط میں شائع ہوا اور دنیا نے اس کی طرف چنداں توجہ نہ کی۔ چنانچہ ہائینے نے لکھا ہے "اس کے بعض مقامات نہایت دلکش ہیں' لیکن اکثر حصے ایسے بھی ہیں جن کو صرف وہی شخص تصنیف کر سکتا ہے' جو اپنے سوا باقی تمام دنیا کو احمق سمجھتا ہو۔ پہلا حصہ 1806ء میں مکمل ہوا اور دو سال بعد شائع کر دیا گیا' لیکن دونوں حصوں کی تکمیل شروع کرنے کے ساٹھ سال بعد 1831ء میں ہوئی۔

اراکین تمثیل

(کریکٹرز)

فاؤسٹ	مرتھا	شیطان	والنٹین مارگریٹ کا بھائی
مارگریٹ	فرشتے	ارواح	چڑیلیں

ایکٹ پہلا

رات : فاؤسٹ مضطرب اور بے چین اپنے میز پر بیٹھا ہے۔

فاؤسٹ : آہ۔ زندگی قانون' علم الادویات اور فلسفہ و حکمت کے اکتساب میں گذر گئی۔ کس قدر جدوجہد اور جانفشانی سے میں نے انہیں حاصل کیا اور اے علم الٰہیات وہ کیا اہتمام اور ذوق و شوق تھا' جس سے میں نے تیرا مطالعہ کیا' لیکن آج میرا دل حسرت اور ناکامی کا کاشانہ بنا ہوا ہے۔ عرفان کی شعاعوں نے اس کی ظلمت کو منور نہیں کیا۔ جہل کی وہ تاریکی آج بھی میرے گرد حلقہ کئے ہوئے ہے' جس سے گھبرا کر میں نے اکتساب علم کی ابتدا کی تھی۔ زندگی کو گذرنا تھا۔ گذر گئی' لیکن آہ! ایک ذلیل کتے کی مانند جو محبوس ہو۔ تازی خانہ میں۔ مجھ میں کچھ فرق بھی رونما نہیں ہے۔ پس اب میں "سحر سازی" کو بروئے کار لاتا ہوں۔ ارواح کو طلب کرتا ہوں۔ شاید ان کی دستگیری سے قوانین فطرت کی کلید حاصل کر سکوں اور وہ مجھے کائنات کا راز بتا دیں۔

کتاب سحر کھول کر اس کے اوراق بے صبری سے الٹتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی نگاہ "روح الارض" کے نقش پر پڑتی ہے اور وہ اسے پراسرار انداز میں پڑھتا ہے۔ "روح" ایک تابناک شعلے کے لباس میں ظاہر ہوتی ہے۔ فاؤسٹ جھجک کر پیچھے ہٹتا ہے۔ "روح" اسے حقارت آمیز لہجہ میں مخاطب کرتی ہے اور ان الفاظ کے ساتھ غائب ہو جاتی ہے۔

روح : تو .... میری مانند نہیں ہے۔

فاؤسٹ : تیری مانند نہیں۔ کس کی مانند پھر؟ آہ۔ میں پیکر الوہیت تیرے سامنے حقیر ہوں؟ میں جو خدا کی صورت پر ہوں' جس کی نگاہیں حقیقت کے درخشندہ اور ابدی آفتاب کو بے نقاب نظارہ کر چکی ہیں اور جو ایک وقت اس جسد خاک سے آزاد زندگی بخش شعاع فردوس میں مستغرق تھا۔ کس قدر ذلیل کن زجر و توبیخ جو اب ہے۔ میرے شعلہ تفاخر کا یہ برق صاعقہ کے سے ایک لفظ نے مجھے مجروح کر کے خاک پر گرا دیا--- لیکن یہ کیا ہے۔ وہ؟---- اس کونے میں وہ

شیشہ کیوں میری نگاہوں کو ایک کہربائی کشش کے ساتھ جذب کر رہا ہے۔ آ۔ اے بادہ گلرنگ کی لاجواب مینا۔ میں تجھے بیحد عزت و احترام کے ساتھ لیتا ہوں اور تیرے پرکیف جرعوں سے سرشار ہو کر انسانی عقل و کمال کی داد دیتا ہوں۔ یہ امرت ہے' جو روح کو مخمور کر دیتا ہے۔

وہ جام اٹھا کر پینا چاہتا ہے کہ گھنٹوں کی آواز اسے چونکا دیتی ہے اور وہ رک جاتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ کہیں دور کلیسا میں مذہبی گیت گائے جا رہے ہیں۔

فاؤسٹ : اے دلکش اور شیریں نغمو! اور اے آسمانی ترانو! تم کیا تلاش کرتے ہو؟ یہاں ایک فانی مخلوق کی کراہٹ اور آہ و زاری کے درمیان یہ گیت بچپن میں طفلانہ لہو و لعب کے درمیان آغاز بہار میں خوشیاں منانے کے وقت گایا جاتا تھا۔ گذرے ہوئے ایام کی یاد نے مجھے بے قرار کر دیا ہے اور بچپن کے خیالات ایک پختہ سال انسان پر پھر حکومت کر رہے ہیں۔ آہ۔ گائے جا۔ یہ دلکش آسمانی نغمے گائے جا۔ آنسو امنڈ آئے ہیں اور زمین اپنے مفرور بچے کو واپس بلا رہی ہے۔

فرشتوں کا گیت : مسیح جی اٹھا۔

موت کے جانکاہ قید خانے میں سے
اپنی زنجیریں توڑ دے۔
اور اس کے پیچھے ہو لے۔
اس کے نام سے زندہ رہ۔
اس کے نام پر محبت کر۔
اس کے نام پر خیرات دے۔
تو اپنے آقا سے ملے گا۔

ایکٹ دوسرا

سین پہلا :فاؤسٹ' شہر کے دروازوں کے گرد گھومنے کے بعد اپنے مطالعہ میں

داخل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ گھونگر والے بالوں کا ایک چھوٹا کتا ہے' جو اس کے عقب میں گھر آگیا ہے اور جس کی اجنبی حرکات نے فاؤسٹ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ گھر آکر اس کی حرکات و سکنات اور بھی اجنبیانہ اور غیر مانوس ہو جاتی ہیں۔ فاؤسٹ حیران ہوتا ہے کہ یہ کیوں اس کے ساتھ آگیا ہے اور اس سے کلام کرتا ہے۔ کتا خوف زدہ ہو کر آتشدان کے پیچھے دبک جاتا ہے۔ یکایک بادل نمودار ہوتے ہیں۔ جب وہ فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ آتشدان کی طرف سے شیطان ایک خانہ بدوش عالم کے لباس میں ملبوس ظاہر ہوتا ہے۔

شیطان : یہ کیسا شور ہے؟ آپ کیا چاہتے ہیں؟ بندہ تقدس مآب کے ارشاد کی تعمیل کے لئے حاضر ہے۔

فاؤسٹ : تیرا نام کیا ہے؟

شیطان : میں ایک جزو ہوں - اس ازلی اور سرمدی تاریکی کا۔ جو چاہتی تو ہمیشہ "بدی" ہے' لیکن کرتی ہے "نیکی"۔

فاؤسٹ : یہ ایک معمہ ہے۔ اس کی تفسیر؟

شیطان : میں روح ہوں۔ انکار و استکبار کی!

فاؤسٹ : تو اپنے تئیں ایک جزو کہتا ہے اور یہاں صورت کل میں نمایاں ہے۔

شیطان : میں "جزو" ہوں۔ اس "جزو" کا جو سابق میں "کل" تھا۔ جزو ہوں' اس تاریکی کا جس کی اولیں ردائے ماتم سے نور کی تخلیق ہوئی۔ نور کی۔ متکبر۔ سرکش اور باغیانہ نور کی' جو اب اپنے منبع و مصدر--- اس سرمدی تاریکی سے انحراف کر کے اس سے پنجہ زن ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے جاہ و مرتبہ کے قدیم حقوق کو غصب کر لے..... اگر منظور ہو تو ہم وقت کو مناسب شغل میں صرف کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو حاضرات کے چند عالمانہ کرشمے دکھاؤں۔ کیوں منظور ہے۔

فاؤسٹ : مجھے یہ تجویز منظور ہے۔ تو شروع کر سکتا ہے۔ شاید تیری کرشمہ بازیوں اور لعبت گریوں سے روح کو کچھ مسرت حاصل ہو سکے۔

شیطان اور ارواح کو طلب کرتا ہے۔ وہ نہایت دلکش آواز میں گاتی ہیں۔ یہاں

تک کہ فاؤسٹ پر غنودگی طاری ہو جاتی ہے اور وہ سو جاتا ہے۔۔۔۔ فاؤسٹ بیدار ہوتا ہے اور کمرے کو خالی پاتا ہے۔

سین دوسرا: فاؤسٹ کا مطالعہ۔ فاؤسٹ اور شیطان۔

فاؤسٹ : کون ہے جو چاہتا ہے کہ میرے سکون میں مخل ہو کر پھر اسے برہم کر دے۔ آ۔ اندر۔ آ۔

شیطان : میں تجھے ایک مفید مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے درمیان مفاہمت ہو سکے گی۔ تیرے پاس ایک جوانمرد آیا ہے کہ ان ناکارہ تخیلات کو پریشان کر دے۔ جنہوں نے تیرے دماغ میں ایک ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ میرے الفاظ غور سے سن۔ ان کی اہمیت کا تو اندازہ نہیں کر سکتا۔ تو دیکھتا ہے کہ میرے پہلو میں ایک شمشیر آبدار آویزاں ہے۔ اگر تو کشاکش ہائے پنہاں سے آزاد ہونا چاہتا ہے تو آ۔ تو بھی آ۔ یہ پس و پیش کیوں ہے؟ تفکرات کو جانے دے اور یہی وضع اختیار کر لے۔ دنیا کو کنار عرصہ سے تو تو نے دیکھا ہے' لیکن زندگی کے سوز و ساز میں شریک کبھی نہیں ہوا۔ آ اور اس میں کھو جا۔ تا کہ لذت حیات سے بہرہ یاب ہو اور جان لے کہ مقصد حیات کیا ہے۔

فاؤسٹ : زمانہ گذر چکا ہے۔ کھیل اب میرے لئے باعث مسرت نہیں ہو سکتا لیکن میں اس قدر مسن بھی نہیں ہوں کہ دل ہی بجھ چکا ہو اور اس میں کوئی آرزو ہی نہ ہو۔ اب بھی خواہشات ہیں' لیکن دبی ہوئی۔ تمنائیں ہیں پژمردہ اور نخل آرزو ہے۔ خزاں رسیدہ۔ آہ۔ دنیا مجھے کیا دکھا کر اپنا گرویدہ بنا سکتی ہے؟ وہ "الخذر" پکارتی ہے اور "الخذر" پکار رہی ہے۔ میری ہستی غم و اندوہ کا ایک بار ہے۔ موت میری بہترین رفیق ہے اور زندگی عدوے بدسگال۔

شیطان : بس ۔ اس آشفتہ خیالی کا کھیل نہ بن۔ جس نے کرگس کی مانند تیری زندگی کو ایک دل لگی بنا رکھا ہے۔ میں اپنے تئیں پیش کرتا ہوں کہ زندگی کے پیچ در پیچ راستوں پر تیری راہنمائی کروں۔ اگر تو اس مہم میں شریک ہوتا ہے۔ میں بھی یہاں اس مقام پر ایک مضبوط عہد استوار کرتا ہوں کہ تیرے ہمراہ رہوں گا۔ تیرے ہمراہ رہوں گا' ایک خادم کی حیثیت سے۔ نیند میری آنکھوں کو نہ

جھپکا سکے گی اور تیری رضا مندی کے مقابلہ میں تساہل و تکاسل مجھ پر غلبہ نہ پائیں گے۔ اگر تو اس دنیا میں جب ہماری ملاقات ہو۔ میری خدمات کا معاوضہ اسی صورت میں ادا کر دے۔

فاؤسٹ : کم بخت شیطان! تو انسانی روح کے نقش کے لئے کیا دے سکتا ہے؟ اگر تیرا کوئی شعبدہ مجھے عروس مسرت سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ میری زندگی خواہ ایک لمحے کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ مجھے یہ شرط منظور ہے۔

شیطان : تصفیہ ہو گیا ہے! ابھی ایک امر باقی ہے۔ کاغذ یا چمڑے کے پرزے پر چند سطور' تاکہ عہد مضبوط رہے اور اپنے دستخط خون میں ثبت کر دے۔

(فاؤسٹ کاغذ پر دستخط کرتا ہے۔)

خون عرق ہے لاجواب عزم و ثبات کا

ایکٹ تیسرا

سین پہلا : اورباش کا میخانہ۔ ۔لبرگ۔ بے فکروں کا ایک ہنگامہ آفریں مجمع۔ مصروف سرود و غنا اور غرق شراب نوشی۔ فاؤسٹ اور شیطان داخل ہوتے ہیں۔

شیطان : سب سے پہلے میں تجھے یہاں لایا ہوں۔ بزم عیش و طرب میں تاکہ تو مشاہدہ کرے کہ لوگ کس طرح پریشان کن خیالات اور تفکرات سے آزاد رہ کر زندگی بسر کرتے ہیں۔

فاؤسٹ : حضرات! تسلیم عرض کرتا ہوں۔

فاؤسٹ اور شیطان بھی شریک رنگ و طرب ہو جاتے ہیں۔ شیطان یار لوگوں سے جگت بازی شروع کرتا ہے اور ان کی درخواست پر گاتا ہے۔ پھر شراب کی شکایت کرتا ہے اور کہتا ہے' میں آپ کو شراب پلاتا ہوں اور ان سے برما لے کر میز کے کنارے پر چند سوراخ کرتا ہے۔

شیطان : ہر شخص اپنی پسند کے مطابق شراب کا ذائقہ پائے گا۔ مجھے کچھ موم دو کہ ڈاٹ تیار کروں (سوراخ بند کر دیتا ہے۔)

انگور کے خوشے انگورستان میں آویزاں ہوتے ہیں اور سینگ بکرے کے سر پر۔ شراب شیرہ انگور ہے۔ انگور کی بیلیں لکڑی ہی ہوتی ہیں۔ لکڑی کے میز سے بھی شراب ناب ٹپک سکتی ہے۔ اب ڈاٹ اتارو اور شراب پیو۔

سب : (ڈاٹ اتار کر شراب پیتے ہیں) آہ۔ اے جوئے پاک! آہ۔ اے مقدس چشم سار!

(کثرت سے شراب پیتے اور گاتے ہیں)

شیطان : اب دیکھ اس بھیڑ کو۔ کیا یہ خوش نہیں ہے؟

فاؤسٹ : میں جانا چاہتا ہوں۔ وقت گذر رہا ہے۔

شیطان : تھوڑی دیر اور توقف کر۔ ابھی ہم انسان کی صورت میں ایک وحشی اور خونخوار درندے کا مکمل نظارہ دیکھیں گی۔ ذرا ٹھہر جا۔

مجمع میں سے ایک شخص بہت بے احتیاطی اور کثرت سے شراب پیتا ہے۔ کچھ شراب فرش پر گر پڑتی ہے اور فوراً شعلے میں منتقل ہو جاتی ہے۔

"جل گئے۔ جل گئے۔ لوگو دوڑو۔ آگ لگ گئی۔ یہاں شیطان ہے۔ موت! موت اور بھیانک جہنم۔" سب چاقو نکال کر شیطان پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

شیطان : آنکھ نقش باطل دکھا۔ کان آواز فریب سن۔ حواس۔ بدل جاؤ۔ جگہ بھی بدل۔ کبھی یہاں۔ کبھی وہاں۔

وہ ایک دوسرے کا منہ حیرانی سے تکتے ہیں اور بے حس و حرکت کھڑے رہتے ہیں۔ گویا کہ ایک برق صاعقہ تڑپ کر ان پر آگری ہے۔ پھر وہ انگورستان کے عجیب و غریب نظارے دیکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی ناک پکڑ کر چاقو تانتے ہیں..... شیطان فاؤسٹ کو لے کر غائب ہو جاتا ہے۔

سین دوسرا : چڑیلوں کا باورچی خانہ۔ دھوئیں میں بندر، لنگور اور مختلف قسم کے جانور۔ عجیب و غریب آلات پریشان پڑے ہیں۔ فاؤسٹ اور شیطان داخل ہوتے ہیں۔

فاؤسٹ : میں نہیں جانتا۔ اس لایعنی پریشان حالی اور کوچہ گردی کا مطلب کیا ہے۔ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ میں اپنی جان ان نامعقول مجنونانہ حرکات کی دہکتی

ہوئی بھٹی میں ڈال دوں؟ کیا ایک بوڑھا پاگل میرے لئے وہ شے مہیا کر سکتا ہے جس کی مجھے ضرورت ہے؟ کیا تو شراب کو کشید نہیں کر سکتا؟

شیطان : آہ۔ یہ مشغلہ کس قدر دلچسپ ہے! لیکن مجھے کئی ایک پل تیار کرنے ہیں۔ علم و فن کی یہاں ضرورت نہیں، بلکہ عزم و استقلال کا کام ہے۔

شیطان بندروں سے باتیں کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے اور آگ کے نزدیک بیٹھ جاتا ہے۔ اس اثنا میں فاؤسٹ آئینہ کو حیرانی سے تکتا ہے۔ کبھی اس کے پاس جاتا ہے۔ کبھی پھر پیچھے ہٹ آتا ہے۔

فاؤسٹ : میری آنکھیں کیا نظارہ دیکھتی ہیں؟ کس قدر نورانی اور سحرکار پیکر ہے اس سحرکار آئینے میں، جس نے میری نگاہوں کو اسیر جلوہ بنا دیا ہے۔ لیکن جب میں چاہتا ہوں کہ ایک قدم بڑھا کر اس کو عطر آگیں فضا سے مشام روح کو معطر کروں، تو وہ خواب کی مانند تحلیل ہو کر نظر سے پنہاں ہو جاتی ہے۔ آہ - یہ انسانی حسن و جمال کا ایک نمونہ ہے۔ یکتا اور لاجواب۔ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے؟ کیا یہ محض ایک فرد ہے۔ صنف نازک کا۔

شیطان : میں تجھے پری جمال محبوبہ سے ہمکنار کرا سکتا ہوں کہ شاد کامی کے ساغر کو لبالب بھر کر نوش کرے۔ خوش نصیب ہے وہ انسان جس کے حجلہ عروسی کی یہ گوہر گراں مایہ زینت ہو۔

فاؤسٹ آئینے کے سامنے محو تماشا رہتا ہے۔ آتشدان پر سیال جوش کھاتا ہے۔ یکایک ایک شعلہ التہاب بلند ہوتا ہے اور دہشت ناک شور و غل کے درمیان چڑیل ظاہر ہوتی ہے۔

چڑیل : کیوں؟ کیا کام ہے مجھ سے؟

شیطان : زندگی بخش شراب کا ایک ساغر، جس سے بڑھاپے کے خون میں شباب کی سی گرمی اور زندگی عود کر آئے۔

چڑیل : طیب خاطر سے۔ یہ ہے مینائے شراب۔ کیف بار و خمار انگیز۔۔ وہ ایک حلقہ کھینچتی ہے اور اس کے اندر کئی ایک عجیب و غریب اشیا رکھ کر ایک مطول کتاب میں سے "سحر" پڑھتی ہے اور شراب کو جام میں ڈالتی ہے۔ جب فاؤسٹ

اسے اٹھا کر چاہتا ہے کہ لبوں سے پیوست کرے۔ ایک ہلکا سا شعلہ اٹھتا ہے۔

شیطان : پی جا۔ تفکرات سے خالی الذہن ہو کر پی جا۔ یہ جرعہ تیرے دل میں آتش عشق روشن کر دے گا۔

چڑیل حلقہ مٹا دیتی ہے اور فاؤسٹ باہر آتا ہے۔

آ۔ بہ تعجیل نکل آ۔ اب توقف نہ کر۔

فاؤسٹ : (آئینہ کی طرف جاتا ہے) اک نگاہ' الوداعی نگاہ۔ محض فرصت یک لمحہ۔۔۔ وہ پیکر حسن' پاکیزہ اور منزہ۔ وہ جمال لاجواب۔

شیطان : نہیں۔ نہیں۔ میری مدد سے تو نسوانی حسن و جمال کا بہترین نمونہ دیکھے گا۔ (ایک طرف) اس سحر انگیز ساغر کے کیف سے اسے معمولی عورت میں بھی حسن ٹراجان کی جھلک نظر آئے گی۔

سین تیسرا: راہ گزر۔ فاؤسٹ۔ مارگریٹ گزرتی ہے۔

فاؤسٹ : اے نوخیز۔ اور حسین خاتون۔ کیا میں تیرے حضور میں اپنے تئیں پیش کرنے کی جرات کر سکتا ہوں؟ کہ کاشانہ حسن تک تیرے ہمراہ چلوں۔

مارگریٹ : میں خاتون نہیں۔ میں حسین بھی نہیں۔ مجھے کسی رفیق کی حاجت نہیں کہ گھر تک میرے ہمراہ چلے۔

(چلی جاتی ہے)

فاؤسٹ : بخدا۔ پیکر حسن ہے۔ آج تک میری نگاہ ایسی حسینہ سے آشنا نہیں ہوئی۔ اس قدر باحیا! اور پاک نفس۔ سادگی لیکن شوخی آمیز۔

(شیطان آتا ہے)

فاؤسٹ : سنا؟ اس لڑکی کو لانا ہو گا۔

شیطان : وہ ابھی کلیسا سے "اعتراف" کے بعد واپس آ رہی ہے۔ اسقف نے اسے گناہ کی آلودگی سے مبرہ و منزہ کر دیا ہے۔ اب میں اس پر قدرت نہیں پا سکتا۔

فاؤسٹ : آہ۔ ہوش و خرد ایک نگاہ پر فن کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ کیا اب دل مجروح کی بخیہ گری نہیں ہو سکتی۔ مجھے اس کا نازک اور عنبر آگیں رومال ہی

لا دے۔ وہ فضا ہو' جس سے بوئے یار آئے۔ چل اس دلفریب پرندے کے آشیانہ میں لے چل۔

شیطان : ہم ایک لمحہ بھی ضائع نہ کریں گے۔ میں منزل یار کا راستہ جانتا ہوں۔ تجھے وہاں لے چلوں گا تاکہ تو شراب روح سے مخمور ہو جائے۔

فاؤسٹ : کیا ہم اب نہیں جا سکتے؟

شیطان : قطعاً" نہیں۔ تجھے رات تک انتظار کرنا ہو گا۔

فاؤسٹ : جا میری راحت جان محبوبہ کے لئے کوئی بیش گراں تحفہ لا۔

سین چوتھا : ایک چھوٹا اور مصفا حجرہ۔ مارگریٹ کا کل مشکیں کی مشاطگی میں مصروف ہے۔

مارگریٹ : خدا جانے۔ یہ کون خوش خلق شخص تھا' جس نے آج سر راہ سپاس و نیاز سے اظہار تمنا کر دیا۔ بشرے سے تو کوئی بڑا عالی نسب اور جوانمرد نظر آتا ہے۔

(شیطان اور فاؤسٹ آتے ہیں)

شیطان : آ۔ آہستہ قدم رکھ۔ آ جا۔

فاؤسٹ : میرے حال پر رحم کر۔ مجھے تنہا چھوڑ دے۔

شیطان چلا جاتا ہے۔

مرحبا اے دلفریب شفق شام۔ مرحبا۔ تو نے اس قربان گاہ میں اپنا دھندلا سا نقاب پھیلا دیا اور تو اے درد عشق جو عزیز تریں ہے میرے دل کو' جو شبنم امید پر زندہ رہتا ہے۔ وہ شبنم جو تیری پیاس بجھانے کے لئے غیر مکتفی ہوتی ہے۔ تو میرے دل پر تسلط جمائے ہوئے ہے۔ کس قدر پر کیف سکون اور خاموشی فضا میں طاری ہے۔ آہ۔ کیا ثروت ہے۔ اس عسرت میں؟ اور کیا فردوس مسرت ہے یہ زندان۔

اپنے تئیں ایک چمڑے کے بازوؤں والی کرسی پر گرا دیتا ہے' جو پلنگ کے قریب رکھی ہے۔ شیطان جواہرات اور زیورات کی ایک صندوقچی لا کر مارگریٹ کی الماری میں رکھ دیتا ہے اور دونوں رخصت ہو تے ہیں۔ مارگریٹ ہاتھ میں شمع

لے کر دروازہ تک انہیں رخصت کرنے آتی ہے۔ مارگریٹ الماری کھولتی ہے اور جواہرات کی صندوقچی کو وہاں دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔

مارگریٹ : یہ خوبصورت اور دلفریب صندوقچی یہاں کس طرح آ گئی! کس قدر حیرانی کی بات ہے؟ آہ کس قدر بیش قیمت زیورات ہیں۔ جواہرات سے مرصع گلوبند میرے گلے میں کس قدر خوبصورت معلوم ہوں گے۔ اور یہ زنجیر طلائی؟ (زیورات پہن کر قد آدم آئینہ میں اپنا عکس دیکھتی ہے) کاش یہ بالیاں۔ یہ گردن بند۔ یہ طلائی بازو بند میرے ہوتے۔ غریب کا حسن و جمال کس مصرف کا ہے۔ شیدائی مدح و توصیف تو کرتے ہیں' لیکن ان کی نگاہوں سے رحم کے جذبات ٹپکتے ہیں۔ منزل مقصود کی شاہراہ زر ہے - زر ہے۔ دنیا مال و زر کی دلدادہ ہے۔ کس کام کی زندگی ہے ہم غریبوں کی؟

سین پانچواں : ہمسائے کا مکان۔ مارگریٹ مرتھا سے جواہرات کی اس صندوقچی کا ذکر کرتی ہے' جو اسے الماری سے ملی تھی۔ یہ صندوقچی اس کی ماں کی نظر پڑ گئی تھی اور اس نے جواہرات لے کر کلیسا کی نذر کر دیئے تھے۔ اسی طرح ایک اور صندوقچی اسی مقام سے اسے پھر ملتی ہے اور مرتھا اسے مشورہ دیتی ہے کہ اس کو اپنی ماں سے چھپائے رکھے۔ شیطان مرتھا سے ملاقات کرتا ہے اور اس سے بیان کرتا ہے کہ اس کا خاوند مر گیا ہے اور وہ اس کا آخری پیغام لایا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ شام کو وہ یہ پیغام اسے دے گا اور اپنے ہمراہ ایک سپاہی منش جوان کو بھی لائے گا' جس کے روبرو اس کے خاوند کی موت ہوئی تھی۔

ایکٹ پانچواں

سین پہلا : صحن چمن۔ مارگریٹ فاؤسٹ کے بازو پر جھکی ہوئی ہے اور مرتھا شیطان کے ساتھ ہے۔ سب چہل قدمی میں مصروف ہیں۔

مارگریٹ : میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ میری محبت میں بہت ایثار کر

رہے ہیں۔

فاؤسٹ : تیری اک نگاہ الفت اور لفظ محبت کے مقابلہ میں سب علوم ہیچ ہیں۔ میں تو اس مسرت کو چھوڑ کر انہیں قطعاً" نہ خریدوں۔

مرتھا : کیوں۔ صاحب آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا اب بھی آپ جگہ بہ جگہ پھرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ خیال تو ذرا فرمائیں۔ کس قدر بھیانک اور بیکار موت ہے۔ مجرد آدمی کی؟

شیطان : میں اس بدبختی سے خود گریزاں ہوں۔

مرتھا : تو خیال رکھئے گا۔ ایسا نہ ہو کہ وقت گذر جائے۔

فاؤسٹ : تو تنہا رہتی ہے؟

مارگریٹ : ہاں۔ گھر کا سامان کچھ زیادہ نہیں۔ خادمہ ہم رکھ نہیں سکتے۔ سب کام کاج مجھے ہی کرنا پڑتا ہے۔ میں ہی جھاڑو دیتی ہوں۔ کھانا پکاتی ہوں۔ میرا بھائی فوج میں ملازم ہے۔ میری چھوٹی بہن فوت ہو چکی ہے۔ میری اماں بھی اس وقت بیمار تھی۔ اسے میں نے ہی پرورش کیا تھا۔ میں نے ہی اسے اپنی آنکھوں کے سامنے گھلتے دیکھا۔ یہاں تک کہ وہ میری نظر سے چھپ گئی۔

فاؤسٹ : آہ۔ وہ حور تھی جنت کی۔

شیطان : مثل مشہور ہے۔ باوفا بیوی اور رہنے کے لئے آرام کی جگہ دنیا کے زر و مال سے بہتر ہیں۔

مرتھا : لیکن میں پوچھتی ہوں، کبھی آپ کے دل میں بھی ان کی آرزو ہوئی ہے؟

شیطان : جب کبھی یہ تمنا میرے دل میں پیدا ہوتی ہے، فیاض طبیعتیں اسے پورا کر دیتی ہیں۔

مرتھا : افسوس آپ میرا مفہوم نہیں سمجھے۔

شیطان : مجھے بھی افسوس ہے، لیکن آپ کی کرم فرمائی کا بھی معترف ہوں۔

(گذر جاتے ہیں)

فاؤسٹ : اے حور محبت۔ جب میں باغ میں داخل ہوا۔ کیا تو نے مجھے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا۔

مارگریٹ : آپ نے دیکھا نہیں؟ میری نگاہیں کس طرح شرم سے جھک گئی تھیں؟

فاؤسٹ : اور کیا تو میری اس جرات آمیز گستاخی کو معاف کرتی ہے' جس کا ارتکاب میں نے تیرے سربازار تخاطب سے کیا تھا؟

مارگریٹ : اس خیال سے میں منفعل ہو جاتی ہوں۔ میں آپ کی آواز سن کر بھونچکی سی رہ گئی تھی۔ غصہ و غضب مجھ پر طاری ہو گیا تھا' لیکن میرے دل کی ایک آواز تھی' جو آپ کے حق میں بلند ہو رہی تھی۔

فاؤسٹ : میری مہ لقا محبوبہ آ۔

مارگریٹ :چھوڑو۔ مجھے ("نورچشمی" کا ایک پھول توڑ کر اس کی پنکھڑیاں نوچتی ہے۔) اسے مجھ سے محبت ہے۔ ہاں۔ اسے محبت ہے مجھ سے۔ نہیں! (وہ پتیاں بکھیرتی ہے اور دبی آواز سے کہے جاتی ہے) ہاں۔ اسے مجھ سے محبت ہے۔

فاؤسٹ : جان من۔ یہ خدا کی آواز ہے۔ پہچانتی ہے۔ اس کو۔ تجھ سے اسے محبت ہے۔ ہاں محبت ہے۔ تجھ سے۔ اس کے دونوں ہاتھوں کو سینے سے لگا لیتا ہے۔

مارگریٹ :آہ۔ میرے جسم میں ایک ارتعاش ہے (ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہے۔ فاؤسٹ ایک لمحہ خیالات میں محو کھڑا رہتا ہے اور پھر اس کے تعاقب میں جاتا ہے۔)

مرتھا: (آتے ہوئے) رات گذری جا رہی ہے۔

شیطان: فراق کی گھڑی آ پہنچی۔ اب ہمیں جدا ہونا ہے۔

مرتھا : میں آپ کو کہتی یہیں رہئے' لیکن رسوائی کا خوف ہے۔ ہمارے نوخیز رفیق کہاں ہیں؟

شیطان : روش کے کنارے بہار کی خوش رنگ اور پرمسرت تتلیوں کی مانند پھڑپھڑاتے پھر رہے ہیں۔

مرتھا: وہ دل و جان اس کے حوالے کر چکا ہے۔

شیطان: اور وہ بھی کمند الفت میں اسیر ہو چکی ہے۔

سین دوسرا : آغوش چمن میں گرمائی مکان۔ مارگریٹ بھاگ کر دروازے کے پیچھے چھپ جاتی ہے اور لب میگوں پر انگلی رکھ کر دروازہ میں سے جھانکتی ہے۔

مارگریٹ : وہ آ رہا ہے۔

فاؤسٹ : آہ۔ اے حسن پر فریب! میں تجھے اپنے دل کا اسیر کر کے چھوڑوں گا۔

مارگریٹ : اے میرے محبوب! میرا دل تیری محبت کے نشہ سے سرشار ہے۔

شیطان دروازہ پر دستک دیتا ہے۔

فاؤسٹ : (زور سے پاؤں زمین پر مار کر) کون ہے؟

شیطان : دوست!

فاؤسٹ : وحشی! درندہ!

شیطان : اب ہمیں چلنا چاہئے۔

فاؤسٹ : کیا مجھے ضرور جانا ہے؟ الوداع!

مرتھا : رخصت!

مارگریٹ : رخصت بامید وصال (چلے جاتے ہیں)

"اے خدا وہ لاجواب ہے۔ میں اس کے سامنے شرم سے خاموش کھڑی رہی اور اس کے ہر سوال کے جواب میں ہاں کہا۔ (جاتی ہے)

سین تیسرا : مارگریٹ کا حجرہ۔ مارگریٹ چرخہ کات رہی ہے۔

مارگریٹ : آہ۔ میرا صبر و قرار رخصت ہو گیا۔ میرا دل زخمی ہے۔ چین اب مجھے نصیب نہیں ہو سکتا۔ سانس میرے سینہ میں گرتا اور ابھرتا ہے۔ میں اس کے انتظار میں کھڑی رہتی ہوں۔ میں اسے اپنے دل سے لگا لوں اور کبھی جدا نہ کروں۔

سین چوتھا : مارگریٹ اور اس کی سہیلی لزبیتھ۔ کنوئیں پر پانی کی چھاگل لئے ہوئے ایک اور سہیلی باربرا کی داستان عشق پر تبصرہ کر رہی ہیں۔ لزبیتھ باربرا کو قابل ملامت قرار دیتی ہے اور مارگریٹ کو مستحق تحسین۔

مارگریٹ : (گھر لوٹتے ہوئے) میں بھلا کسی بھولی بھالی لڑکی کو اس کی لرزش پر

کیوں ملامت کروں۔ جب میں خود دربار عشق کی مجرمہ ہوں۔ میں نشہ الفت سے مخمور ہوں اور قریب ہے کہ گناہ کا ارتکاب کروں۔ آہ۔ کس قدر ناقابل برداشت لذت ہے' گناہ کی؟

سین پانچواں : دیوار میں ایک محراب۔ غمگین اور مقدس مریم عذرا کا بت۔ مارگریٹ دوزانو ہو کر پھول چڑھاتی ہے۔

مارگریٹ : مجھ پر نظر کر۔ اے ام حزیں۔ تیرا دل پارہ پارہ ہے اور تیری نگاہیں اپنے مظلوم لخت جگر پر جمی ہوئی ہیں۔ تو آہیں بھرتی ہے اپنے لئے اور اس کے لئے اور انہیں مقدس باپ کے پاس روانہ کرتی ہے۔ ایک بے پناہ الم میرے دل کا رہین ہے۔ میں راتوں کو جاگتی ہوں۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں اور میں بلک بلک کر روتی ہوں..... میرا درد بھرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ میں اپنے پھولوں کو جن کے گملے دریچوں میں رکھے ہیں' آنسوؤں سے سینچتی ہوں۔ جب میں صبح کے وقت انہیں تیرے حضور میں پیش کرنے کے لئے توڑتی ہوں۔ سورج میرے حجرے میں جوئے نور بہا دیتا ہے۔ افسوس میری آنکھوں میں آنسو امنڈ آتے ہیں اور میں محو گریہ ہو جاتی ہوں۔ آہ۔ میری فریاد سن۔ اے ام حزیں۔

سین چھٹا : مارگریٹ کے گھر کا دروازہ۔

مارگریٹ کا بھائی والنٹین سپاہی داخل ہوتا ہے۔

والنٹین : اب مجھ پر انگلیاں اٹھتی ہیں۔ ہر ایک بدتہذیب اور ناتراش میرا مذاق اڑاتا ہے۔ میں نے ان کی خوب مرمت کی ہے' لیکن ان کو جھوٹا نہیں کہہ سکتا۔ (ٹھٹک کر) یہ کیا نظارہ ہے۔ یہ کون نابکار دبکا ہوا آ رہا ہے؟ اگر یہ وہی شخص ہے جس کی مجھے تلاش ہے' تو وہ یہاں سے سلامت نہ جائے گا۔

(چھپ جاتا ہے)

فاؤسٹ اور شیطان باتیں کرتے ہوئے آتے ہیں۔ شیطان بربط بجاتا ہے۔ والنٹین روبرو آ کر بربط کو تلوار سے دوپارہ کر دیتا ہے۔ فاؤسٹ اور والنٹین میں جنگ ہوتی ہے۔ شیطان تلوار گھونپ دیتا ہے اور والنٹین ایک غراہٹ کے ساتھ گرتا

ہے۔ شور و غل سے ایک ہجوم اکٹھا ہو جاتا ہے' جس میں مرتھا اور مارگریٹ بھی ہوتی ہیں۔ لوگ لب مرگ سپاہی کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کی بہن کو ملامت کرتے ہیں۔

مارگریٹ : آہ بھائی! مجھ پر جہنم کا عذاب نازل ہو گیا۔

والنٹین : اب یہ آنسو بے سود ہیں۔ تو نے اپنی عزت کھو کر میرے دل میں ایک گہرا زخم لگا دیا ہے۔ میں مردانہ وار مرتا ہوں' تاکہ ایک بہادر اور وفادار سپاہی کی طرح خدا سے ملاقات کروں۔

سین ساتواں : کلیسا میں نماز ہو رہی ہے۔ ارگن باجا بج رہا ہے اور مغنی گا رہے ہیں۔ مارگریٹ لوگوں کے درمیان کھڑی ہے اور ایک خبیث روح اس کے پیچھے کھڑی ہے۔

خبیث روح : مارگریٹ وہ ایام تجھے یاد ہیں' جب تو معصومانہ انداز میں کلیسا میں پھول چڑھاتی تھی اور پرانی کتاب کھول کر زیر لب دعا مانگتی تھی۔

مارگریٹ : افسوس۔ کاش میں ان خیالات کو فراموش کر سکتی۔

خبیث روح : تجھ پر خوف طاری ہے۔ قرنا پھونکی جا رہی ہے اور درد الفت نے تیرے دل کی خاک سے پھر اس کی تخلیق کی ہے اور اس میں پھر ارتعاش زندگی پیدا ہو گیا ہے۔

گویوں کے گانے کی آواز

مارگریٹ دم گھٹ رہا ہے۔ بھاری ستونوں نے مجھے مقید کر لیا۔ گنبد دار محرابیں مجھے پامال کرنا چاہتی ہیں' ہوا بند ہے!

گویوں کے گانے کی آواز

خبیث روح : عابدوں نے تجھ سے رخ پھیر لیا ہے۔ معصوم اور پاکیزہ ہستیاں تیری طرف ہاتھ بڑھانے سے کانپتی ہیں۔ افسوس ہے تیری زندگی پر!

مارگریٹ غش کھا کر گر پڑتی ہے۔

پانچواں ایکٹ

مطلع ابر آلود۔ کھیتوں کے درمیان۔ فاؤسٹ اور شیطان۔

فاؤسٹ : آہ۔ آسمان مصیبت ٹوٹ پڑا۔ چرخ کہن نے بجلی گرا دی۔ آزادی۔ وسیع اور فراخ زمین پر ایک دشت نورد کی سی آزادی کے بعد اسیری؟ آہ۔ اے بدنصیب حسینہ۔ اور تو اے غدار اور دغا باز "روح" تو سبب ہے' اس سب افتاد کا۔ وہ نازک بدن اس ناگفتنی مصیبت میں پڑی ہے' اس لئے کہ یاس و ناکامی میں اس کی روح پرواز کر جائے۔

شیطان : اس کی مصیبت کوئی انوکھی مصیبت نہیں ہے۔

فاؤسٹ : ذلیل کتے! لعنت ہے تجھ پر۔ انوکھی مصیبت نہیں؟ کس قدر ہجوم ہے' الم و یاس کا کہ انسان کی روح تصور نہیں کر سکتی۔ اس ذلیل روح کی رفاقت سے میں باز آیا' جو حیلہ و فریب میں مسرت حاصل کرتی ہے اور جس کو تباہی میں ایک گونہ لطف ملتا ہے۔

شیطان : تو بس فیصلہ ہو گیا؟

فاؤسٹ : اسے آزاد کر دے۔ ابدلاباد تک تجھ پر مکروہ ترین لعنت ہو۔

شیطان : اس کو آزاد کر دے! کون ہے' جس نے اسے مصیبت میں گرفتار کرایا ہے؟ میں یا تو؟

فاؤسٹ : مجھے اس تک لے چل! وہ رہا ہو جائے گی۔

شیطان : میں تجھے وہاں لے جاؤں گا۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہے' دریغ نہ کروں گا۔ ذرا خیال تو کر آسمان و زمین پر میری قدرت ہے۔ میں محافظ کے حواس مکدر کر دوں گا۔ تو کنجیاں لے کر اسے باہر نکال لانا۔ میں باہر پہرہ دوں گا۔ طلسمی مرکب تیار ہوں گے اور تو فرار ہو سکے گا۔ بس میں یہی کر سکتا ہوں۔

سین دوسرا : قید خانہ۔ فاؤسٹ کے ہاتھ میں کنجیوں کا گچھا ہے اور وہ چراغ لئے آہنی دروازے کے سامنے کھڑا ہے۔

فاؤسٹ : میرے جسم میں یہ کیا ارتعاش ہے؟ کیا تمام دنیا کے غم میرے حصہ میں آ گئے ہیں۔ وہ یہاں ہے۔ اس تاریک اور غم ناک غار میں۔ اس کا جرم کیا تھا؟

ایک رنگیں خواب؟۔۔۔ لیکن وقت گذر رہا ہے۔ موت ہر لمحہ قریب تر آتی جا رہی ہے۔

قفل کو پکڑتا ہے۔ مارگریٹ کے گانے کی آواز آتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے۔

فاؤسٹ : (آہستہ سے) خاموش۔ میری جان۔ میں تجھے ان زنجیروں سے رہائی دینے آیا ہوں۔

مارگریٹ برحم کر۔ اگر تو انسان ہے۔ اگر تو سانس سے زندہ رہتا ہے۔ مجھ پر رحم کر۔۔۔ اے جلاد تجھے یہ حکم کس نے دیا ہے کہ آدھی رات کے وقت مجھے قتل کر دے۔ رحم کر مجھے زندہ رہنے دے۔ (کھڑی ہو جاتی ہے) آہ ابھی میں نے شباب کی بہاریں بھی نہیں دیکھیں اور موت آ گئی۔ میری فریاد سن لے۔

فاؤسٹ : کیا میں تیرے بعد زندہ رہ سکتا ہوں کہ یہ خوفناک نظارہ دیکھوں؟

مارگریٹ باب میں تیرے اختیار میں ہوں - خوشی مجھ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکی ہے۔ خلقت میرے گیت گاتی ہے اور میرا غم افزوں ہوتا ہے۔

فاؤسٹ : مارگریٹ! مارگریٹ!

مارگریٹ بیہ میرے محبوب کی آواز ہے۔ وہ اچھلتی ہے اور زنجیریں گر پڑتی ہیں۔ کہاں ہے وہ؟ کہاں ہے؟ میں نے اس کی شیریں آواز سنی ہے۔

فاؤسٹ : میری پیاری۔ میں حاضر ہوں۔

مارگریٹ بکیا تو ہے؟ جواب دے مجھے - کیا تو ہی ہے؟ تو مجھے ان زنجیروں سے آزاد کر کے اپنے دل سے لگا لے گا؟

فاؤسٹ : آ۔ میری محبوبہ۔ آ۔ رات جلدی سے گذری جا رہی ہے۔

مارگریٹ بمیری ماں موت کی نیند سو رہی ہے۔ بچے کو میں غرق کر چکی ہوں۔ یہ میرے اور تیرے لئے ایک آسمانی نعمت تھی۔ لا۔ اے میرے محبوب مجھے اپنا ہاتھ دے۔ یہ خواب تو نہیں ہے؟ لیکن یہ ہاتھ ابھی تک رنگین ہیں اور ان سے خون ٹپک رہا ہے۔ پہلے انہیں پاک کر۔ اے خدا تو نے کیا کیا ہے؟

(شیطان نمودار ہوتا ہے)

شیطان : جلدی کرو۔ ورنہ فرصت ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ بے سود ہے یہ آہ و

زاری۔ یہ آنسو یہ سسکیاں۔ میرے باد رفتار شبدیز تمہارے منتظر ہیں۔

مارگریٹ بیہ کون ہے جو فرش سے بلند ہو رہا ہے؟ آہ یہ تو وہی ہے۔ اس کا یہاں کیا کام ہے۔ یہاں کی زمین مقدس اور پاکیزہ ہے۔ کیا یہ میرے لئے آیا ہے؟

فاؤسٹ : نہیں۔ تجھے زندہ رہنا ہے۔

مارگریٹ ہائے خدا میں اپنی روح تیرے سپرد کرتی ہوں۔

شیطان : (فاؤسٹ کو مخاطب کر کے) آ' ورنہ تیرا حشر بھی اس کے ساتھ ہو گا۔

مارگریٹ ہائے باپ میں تیری ہوں۔ مجھے نجات دے۔ اے فرشتو! اے مقدس شہسوارو! میرے گرد حلقہ کر لو۔

فاؤسٹ : میری روح تیرے لئے مضطرب ہے۔

شیطان : وہ مقہور ہے!

آسمان سے ایک آواز۔ وہ نجات پا گئی۔

شیطان : (فاؤسٹ سے مخاطب ہو کر) آ۔ اس طرف آ۔

فاؤسٹ کو لے کر غائب ہو جاتا ہے۔ اندر سے مارگریٹ کی آواز آتی ہے اور آہستہ آہستہ خاموش ہو جاتی ہے۔

فاؤسٹ' فاؤسٹ' فاؤسٹ

(ادبی دنیا (لاہور)' جلد 1' نمبر 1' بابت مئی 1929ء' ص 39-46)

محمود بریلوی

گوئٹے اور فاؤسٹ

جرمنی کا مشہور فلسفی شاعر یوحان وولف گانگ فان گوئٹے 28 اگست 1749ء کو جرمنی کے مشہور شہر فرینک فورٹ میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے باپ یوحنا کیسپر گوئٹے کا اکلوتا لڑکا تھا۔ مشرق اور مسلمانوں کا ہر دلعزیز شاعر اقبال اپنی بیش بہا تصنیف "پیام مشرق" کے دیباچہ میں کہتا ہے:

"پیام مشرق کی تصنیف کا محرک جرمن حکیم حیات گوئٹے کا مغربی دیوان ہے' جس کی نسبت اسرائیلی شاعر ہائنا لکھتا ہے کہ یہ گلدستہ عقیدت ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے۔ اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینہ سے حرارت کا متلاشی ہے۔"

گوئٹے کا باپ امپیریل کونسل کا ممبر تھا۔ اس لئے فلاکت و نکبت جو شعرائے عالم کا حصہ ہے' اس کی قسمت میں ودیعت نہیں کی گئی تھی۔ گوئٹے نے بچپن ہی میں مشہور شعرائے انگلستان اور فرانس کا کلام کا مطالعہ کیا تھا۔ اپنے ہم عصر شعرا کی نسبت اس کا معیار تخیل کہیں بلند تھا۔ چنانچہ کسی فلاسفر یا شاعر کا اثر اس کی شخصیت پر شاذ و نادر ہو سکا۔ ہرڈر اس سے عمر میں محض پانچ سال بڑا تھا۔ چنانچہ اس سے کسی قسم کی اصلاح کی توقع بے سود تھی۔ گیلرٹ اور گاٹ شیڈ اس دور کے اساتذہ تھے' مگر گاٹ شیڈ فرانس کی قدیم شاعری کا دلدادہ اور گیلرٹ ضعیف العمر تھا۔ چنانچہ ان کا فرسودہ اور سوقیانہ مذاق شعری گوئٹے کے لئے کوئی

کشش یا دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ البتہ گیلرٹ نے گوئٹے کو خوشخطی سکھائی تھی۔

1765ء میں گوئٹے تحصیل علوم کے لئے فلیشر نامی کتب فروش اور اس کی بیوی کے ساتھ لیپزگ گیا تھا' جہاں "بوپرین نیشن کلاس" میں داخل ہو کر اس نے پروفیسر گیلرٹ کی شاگردی اختیار کی۔ مگر اس پروفیسر کا بہت کم اثر گوئٹے نے قبول کیا۔ اگر یہاں اس پر کچھ اثر ہوا' تو ایک دوسرے پروفیسر کلوڈیس کے خیالات اور تعلیم کا۔ مگر جس شخص کی روحانیت کا زبردست اثر اس کی فطرت پر ہوا' وہ لیپزگ کی اکاڈیمی کا ڈائریکٹر آدم فریڈرک اویسر تھا' جس کے متعلق خود گوئٹے نے کہا ہے کہ "اویسر کی تعلیم میری روح پر اثر انداز ہوئی اور فی الواقعہ میرا جسم بے روح ہوتا' اگر میں اس کے علم سے مستفید نہ ہوتا"۔

1770ء میں قانونی تعلیم کی تکمیل کی خاطر اسٹراس برگ گیا' جہاں اس نے قانون کے ساتھ علم کیمیا وغیرہ کی تعلیم بھی پائی اور شعرائے انگلستان و فرانس خصوصاً شیکسپیئر اور والٹیر کا مزید مطالعہ کیا۔۔۔۔

1779ء میں اس کو ویمر کے ڈیوک کارل آگسٹ نے ویمر میں سکونت پذیر ہونے کی دعوت دی' جو ان دنوں قانون و لٹریچر کے لحاظ سے خطہ یونان کہلاتا تھا۔ گوئٹے نے یہاں غیر معمولی قابلیت کا ثبوت دیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں پریوی کونسلر کے ممتاز عہدہ پر فائز ہو گیا۔۔۔۔

1782ء میں اس نے کئی امتیازی خطابات حاصل کئے۔ 1788ء میں سرکاری طور پر اس نے اٹلی اور سوئٹزر لینڈ کی سیاحت کی اور اس درمیان میں اس نے چند بیش بہا کتب تصنیف کیں۔ 1815ء میں ڈیوک کی وفات کے بعد وہ وزیر اعظم بن گیا۔ ازاں بعد زندگی عزلت گزینی میں بسر کی اور 1832ء میں فوت ہو گیا۔

بچپن ہی میں اس کو ایک لڑکی لی نامی سے محبت ہو گئی تھی' جس کی صحبت لیپزگ چلے جانے کے باعث چھوٹ گئی تھی۔ گوئٹے کی ایک تصنیف جو چھوٹی چھوٹی عاشقانہ غزلیات کا مجموعہ ہے اور جس کا نام "للیز گارڈن" ہے' اسی لڑکی کی محبت کا نتیجہ ہے۔

لیپزگ پہنچ کر گوئٹے ایک اور لڑکی کئی شان کوف نامی پر عاشق ہو گیا۔ مگر اسکی بے مہری' کج ادائی و تغافل کے ہاتھوں ہمیشہ پریشان رہتا تھا۔ اس کا سب سے پہلا ڈراما جو دیہاتی زندگی کا مرقع اور خالص فرانسیسی انداز میں لکھا گیا ہے اور جس کا نام "لینے ڈیز ورب ٹن"

(مخمصہ عشاق) ہے' اسی تعشق کا نتیجہ ہے۔ گوئٹے نے ایک نہایت دلچسپ اور عجیب و غریب ڈراما "ڈی مچوڈی گن" (برابر کے گنہگار) لکھا ہے' جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

گوئٹے ایسے وقت پیدا ہوا تھا' جب جہالت و عصبیت جرمن قوم کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ ہر طرف خونریزی کا بازار گرم تھا.... اخلاقی' تمدنی' معاشرتی اور اقتصادی لحاظ سے ملک جرمنی قعر مذلت و ابتذال میں ڈوبا ہوا تھا۔ جب فرانس نے ہفت سالہ جنگ میں شاہ فریڈرک کے خلاف حصہ لیا' تو فرینک فورٹ فرانسیسی سپاہیوں کی چھاؤنی بنا ہوا تھا۔ ان ملکی انقلابات اور جرمنی کی سیاسی پستی نے گوئٹے کے خیالات پر حیرت انگیز اثر ڈالا اور وہ عشقیہ شاعری ترک کر کے قومی نظمیں لکھنے لگا۔ اپنے ڈراموں سے ملک اور قوم کو اس نے حیرت انگیز تہذیب و اخلاق کا سبق دیا۔

گوئٹے کے کیریکٹر کی حیرت انگیز خصوصیت یہ ہے کہ اس نے طمانیت کو کبھی ہاتھ سے نہ دیا۔ ملکی انحطاط اور قومی تنزل کے زمانہ میں بھی اس نے اپنے سکون قلب کو برباد ہونے سے بچایا اور ایسے پر آشوب وقت میں بھی حسب معمول اس نے اپنے جاں فزا نغموں اور روح افزا ترنم سے قوم کے خون میں حرارت و زندگی پیدا کی' لیکن فرانسیسیوں کے جبر و ستم کے خلاف کچھ نہ کہا۔ اس کی طبیعت میں سطحی جوش مطلق نہ تھا۔ اس کی بالغ نظر فطرت کی گہرائیوں اور آسمان و زمین کی پہنائیوں میں دقت پرواز رہتی تھی۔ وہ سکون و جمود کا مجسمہ نہ تھا' بلکہ اس کا مطمح نظر "زندگی اور عمل" تھا۔

دنیا کے تمام انشا پردازوں میں گوئٹے کی تحریر سب سے زیادہ مبہم' تمام شعرا میں اس کا کلام سب سے زیادہ دقیق و بلیغ اور تمام فلسفیوں اور دماغ داروں میں اس کا تخیل عجیب و غریب ہے۔ جب وہ کسی مضمون پر کچھ لکھتا ہے' تو خیالات کی روانی اسے کہاں سے کہاں بہکا کر لے جاتی ہے اور وہ نفس مضمون سے ہٹ کر بحث و تمحیص' فلسفہ و تخیل کے ایک ایسے عمیق و بسیط بحر ذخار میں شناوری کرنے لگتا ہے کہ معمولی تیراک اس کی ہوا بھی نہیں چھو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح میکالے کی طول پسندی زبان زد ہر خاص و عام ہے۔ اسی طرح گوئٹے کی بے قاعدہ روی و دقت پسندی معروف ہے۔ ایک ہمدرد قاری کے لئے تصانیف سے کہیں زیادہ اس کی ذات اور کیرکٹر باعث دلچسپی ہیں۔

اس کی بہترین تصنیف "فاؤسٹ" میں گریٹشن کی ٹریجڈی اس کی تمام تصانیف میں

سب سے زیادہ گرمجوش شے ہے' لیکن "فاؤسٹ" کے دوسرے حصہ میں سوائے منظر موت کے' ڈرامہ کی دلچسپی مفقود ہو گئی ہے۔ گوئٹے خود کہتا ہے کہ وہ ٹریجڈی لکھنے کے لئے پیدا نہیں ہوا اور یہی وجہ ہے کہ ٹریجڈی کے سلسلہ میں گریٹشن کو عجیب عجیب انداز سے ظاہر کیا گیا ہے۔ "فلسفہ امید" اس کی زندگی و تخیلات کا سکون بخش گہوارہ ہے اور یہی فلسفہ "فاؤسٹ" کی جان ہے۔۔ گوئٹے کی زندگی ایک "نامکمل و ناکامیاب تعشق" اور ایک مکمل' مسلسل و کامران بے قراری و بے کلی" تھی۔ گوئٹے نے اپنی فطری و خلقی کمزوریوں کے خلاف سخت جدوجہد جاری رکھی' جو لٹریچر کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ چنانچہ وہ اپنی تصانیف کو اپنے "اقبال ناموں" کے خطاب سے یاد کرتا ہے۔ گویا اس نے اپنی "فرد جرائم" خود ہی تیار کر دی ہے۔

شروع سے لے کر آخر تک فاؤسٹ گویا ایک ہستی ہے' جس کے اندر دو روحیں ہمیشہ آپس میں مصروف پیکار ہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "میرے اندر دو توام بھائی جن کی سرشت ایک دوسرے سے متضاد ہے' سانس لے رہے ہیں۔" اس امر کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے کہ فاؤسٹ سے گوئٹے کی ذات کو دور کی بھی نسبت نہیں ہے۔ فاؤسٹ ایک کیرکٹر کی حیثیت سے گوئٹے سے کوئی مناسبت و مطابقت نہیں رکھتا۔ اول الذکر قوت رکھتا ہے' مگر صبر و ضبط نہیں' حالانکہ ثانی الذکر کی زندگی گویا ایک مسلسل و مستقل صبر آزما کوشش تھی۔۔ گوئٹے کے محاسن فاؤسٹ میں بہت کم ہیں۔ البتہ گوئٹے کے تخیل' محبت اور عمل کے جذبات و تجربات فاؤسٹ پر بڑی حد تک روشنی ڈالتے ہیں۔ گوئٹے نے ایک مرتبہ جیکوبی کو لکھا کہ "میری بے قرار سرشت ایک قسم کے طرز خیال سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ بطور شاعر اور آرٹسٹ کے میں پالی تھیسٹ' (بہت سے خداوندوں اور دیوتاؤں پر ایمان رکھنے والا) ہوں اور بطور سائنٹفک محقق کے ایک حامل اصول "ہمہ اوست"۔ مگر نہیں جانتا کہ دونوں میں سے کیا ہوں اور کس قدر ہوں۔ اگر کبھی اپنی اصلاح کے لئے مجھے خدا کی حاجت ہوئی' تو اس تک پہنچنا بھی مجھے دشوار نہیں ہے۔"

ورڈز ورتھ اور شیلے سے کہیں زیادہ اور صحیح معنی میں وہ نیچر کا دلدادہ تھا۔ ویمر میں قیام کے ایام میں وہ نیچر کے اوپر اپنے ان زریں خیالات کا اظہار ایک دوست سے کرتا ہے کہ "نیچر.....! وہ ہمارے گرد حلقہ کئے ہوئے ہے۔ ہم اس میں سمائے ہوئے ہیں۔ وہ ہمیشہ نئی نئی

صورتیں پیدا کرتا اور مٹاتا ہے۔ جو اب ہے وہ کبھی پیشتر نہ تھی' جو پیشتر تھی' کبھی واپس نہ آئے گی۔ نیچر کے لئے ہر ایک شے نئی ہے اور بایں ہمہ پرانی۔ ہر لحہ وہ ایک نئی قوم کی بنیاد رکھتا ہے اور ایک پرانی قوم کا خاتمہ کرتا ہے۔ اس کی نہ زبان ہے نہ طاقت گویائی۔ لیکن وہ دل اور آوازیں پیدا کرتا ہے۔ محبت اس کے سر کا تاج ہے۔ محض محبت کی دیوانگی ہی میں کوئی اس قدر عقل پا سکتا ہے کہ اس تک پہنچنے کی سعی کرے۔ تمام مخلوق کے درمیان اس نے ایک خلیج پیدا کر دی ہے اور پھر بھی تمام مخلوق اس سے ہم آغوش ہونے کی متمنی ہے۔ اس نے تمام اشیا کو جدا جدا کر دیا ہے تاکہ تمام اشیا کو پاش پاش کر دے۔ محبت کی فضا میں ایک سانس اس کے فلسفہ کے ماتحت عمر بھر کی کلفتوں کا صلہ ہے۔ نیچر غیر فانی ہے۔ لازوال ہے۔ مہربان اور حسین ہے۔ میں اس کی اور اس کے کارہائے نمایاں کی توصیف و ثنا کرتا ہوں کہ وہ دانا اور متین ہے۔ وہ ہی مجھے اس دنیا میں لایا ہے اور وہ ہی مجھے اس دنیا سے لے جائے گا۔"

گوئٹے کے لئے اس کی تمام عمر دنیا ایک ایسی کشمکش گاہ بنی رہی' جہاں غیر مختتم مگر بے سود مساعی کار فرما ہوں۔ وہ کوشش اور عمل کا بندہ تھا۔ مگر اس کی کوششیں اور اعمال مسلسل تھے اور مال مفقود۔ اس نے اپنا ایک جدا عقیدہ قائم کیا تھا اور اس کے عقیدہ پر عامل اصحاب کی پارٹی "سمبولک" کہلاتی تھی۔ اس نے ایک نہایت عمدہ نظم "سمبولم" کے نام سے اپنے ہم عقیدہ احباب کے لئے لکھی تھی' جس کو کارلائل "بنی نوع انسان کا جاری نغمہ" کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

دنیا میں بہت تھوڑے لوگ ہیں' حتی کہ شعرا بھی جن کے لئے محبت ایک ایسی اہم شے ہو جیسی کہ وہ گوئٹے کے لئے تھی۔ اپنی کل زندگی میں اس نے اس کے مزے مختلف طریقوں سے چکھے۔ عشق مجازی سے لے کر عشق حقیقی تک اس نے محبت کی تمام منزلیں سلسلہ وار طے کیں۔

گوئٹے نہ تو نفس و ہوس کا بندہ تھا اور نہ زاہد خشک اور خدا پرست۔ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ان دونوں کے بین بین تھا۔ "کرسٹیانی ولپیس" اس کی ایک محبوبہ تھی' جس سے زیادہ عرصہ تک اس کے ناجائز تعلقات رہے اور جس سے ناجائز اولاد پیدا ہوئی۔

وہ اپنی ایک جرمن دوست (مس) "فراؤ فواسٹائن" کو لکھتا ہے کہ "محبت دنیا میں سب

سے زیادہ آسان اور سادہ شے بھی ہے اور اس ہستی کے لئے جسے انسان یعنی مرد کہا جاتا ہے' ایک غیر معتبر' غیر مستقل اور تغیر پسند چیز بھی۔"

اس کی سب سے پہلی محبت کی دیوی (جب کہ وہ صرف چودہ برس کا ایک لڑکا تھا) ایک دہقانی لڑکی "گریٹ شین" نامی تھی۔ چنانچہ یہ امر کہ اس نے "فاؤسٹ" کی ہیروئن کے لئے یہ ہی نام کیوں منتخب کیا۔ ظاہر ہے' وہ فرینک فورٹ کے قریب ایک موضع کی رہنے والی تھی۔ چنانچہ "گریٹ شین ٹریجڈی" کا منظر گوئٹے کے وطن مالوف کے حوالی کا خاکہ ہے۔

گوئٹے جب ٹھیک سولہ سال کا تھا' تو ستمبر 1765ء میں وہ لیپزگ یونیورسٹی بھیجا گیا۔ وہاں وہ ایک ملاقاتی کی' جس کے مکان پر وہ دوپہر کا کھانا کھایا کرتا تھا' لڑکی "اما کیتھرینا شین کاپف" پر عاشق ہو گیا۔ مرتے دم تک گوئٹے نے اس لڑکی کو یاد رکھا' مگر اس وقت اس کی متلون مزاجی اور نازک دماغی نے معاملہ خراب کر دیا۔ محبت کی پینگ بظاہر بہت جلد ٹوٹ گئے تھے۔

گوئٹے نے 1769ء میں اپنے ایک دوست بریٹ کاپف کو اس طرح لکھا کہ "شہوت رانی سے احتراز کرو۔ مرد کی قوت عورت کی عصمت کی مانند ہے۔ جب عورت ایک مرتبہ عفت کوشی سے ہٹی' تو گویا پھر وہ شیطان کی مرید ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تم اپنے شکستہ دامن قوت و مردانگی میں جوڑ تو لگا سکتے ہو' مگر پھر پیوند آخر پیوند ہی ہوتا ہے۔"

گوئٹے 1768ء کے موسم گرما میں جب وہ ٹھیک انیس سال کا تھا' فرینک فورٹ واپس آیا تھا اور صحت خراب ہو جانے کے باعث کئی ماہ تک اپنے گھر میں بیمار پڑا رہا تھا۔ اس موقع پر اس کے تعلقات اپنی ماں کی دوست "سوسنا فان کلے ٹین برگ" سے جو نہایت عاقل' تعلیم یافتہ اور پاک باز تھی' نہایت خوشگوار ہو گئے تھے۔ جس کی شبیہ گوئٹے نے اپنی مشہور عالم تصنیف "ولہیلم مائسٹر" میں "حسین روح" کے نام سے کھینچی ہے۔

ایک دوست کے خط میں جس پر 13 فروری 1769ء تاریخ پڑی ہے' گوئٹے لکھتا ہے "ایک بڑا عالم شاذ و نادر ہی ایک زبردست فلاسفر ہوتا ہے' کیونکہ جو شخص کتابوں کے سمندر میں غرق رہنے کا عادی ہو۔ وہ نیچر کا مطالعہ کرنے کے لئے بیکار بیٹھ کر اپنا وقت خراب کرنے سے نفرت کرتا ہے اور جو نیچر کی وسعتوں اور دلفریبیوں میں کھو جانے کی فرصت اور دماغ نہیں رکھتا' وہ فلاسفر ہی نہیں۔" ایک اور خط میں گوئٹے اس طرح رقمطراز ہوتا ہے کہ "میرا

تجربہ ہی میرا حقیقی علم ہے کہ فی الحقیقت تجربہ ہی علم و دانش ہے۔"

1770ء کے موسم بہار میں گوئٹے اسٹراس برگ قانون اور طب کا مطالعہ کرنے گیا تھا۔ گوئٹے کے نہایت کامیاب ڈراموں میں سے ایک تاریخی ڈرامہ "گیٹس فان برلی شنگن" ہے۔ دوسرا اس سے گونہ مختلف ہے' جس کا نام "دی ساروز آف ورتھر" انگریزی میں ترجمہ کیا گیا اور "سوگواری ورتھر" سمجھنا چاہئے۔ اس میں گوئٹے درحقیقت "چارلوئی بف" ہے۔

سب سے پہلے 1769ء میں گوئٹے کے دماغ میں "فاؤسٹ" کا خیال آیا تھا' لیکن پھر بھی کوئی نظم 1773ء تک نہیں لکھی گئی۔ 1773ء کے بعد کچھ عرصہ تک یہ تصنیف جاری رکھ کر علیحدہ رکھ دی گئی۔ مگر پھر گوئٹے نے اس کو یکم مارچ 1788ء سے اٹلی میں شروع کیا۔ وہ اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ "میری عادت تھی کہ میں ایک مضمون اپنے دماغ میں لئے پھرتا اور اپنی آئندہ تصنیف کے مجوزہ واقعات اور مقامات کو پیش نظر سیزیوں سے متوازن کیا کرتا اور یہ چیزیں صفحہ قرطاس پر آنے سے پیشتر اسی طرح میرے ذہن کی زینت اور میرے دل کا سرور بنی رہتیں۔"

1775ء میں گوئٹے فاؤسٹ کے پہلے حصہ "ار فاؤسٹ" کو ویمر لے گیا تھا۔ اسی زمانہ میں اس کی تصنیف "سوگواری ورتھر" کی اصلی لوئے جو کسی زمانہ میں اس کی منظور نظر تھی' اس کے دوست کیسٹنر کو منسوب ہو گئی۔ لوئے بف کے ساتھ شادی کی خبر سن کر کیسٹنر کو گوئٹے اپریل 1773ء میں اس طرح لکھتا ہے۔ "میں اس وقت ایک ایسے ریگستان میں مارا مارا پھر رہا ہوں' جہاں خواب و خیال کو بھی پانی کا نام نہیں ہے۔ میرا موئے تن' میرا سایہ اور میرا خون میرے لئے آبشار یا جوئے نغمہ بار ہے۔ بایں ہمہ مجھے یہ سن کر خوشی ہے کہ تمہارا جہاز صحیح سلامت بندرگاہ میں پہنچ گیا ہے اور میں تصور کی آنکھوں سے اس کے پھریرے شادمانی کے مظاہرہ کے طور پر لہراتے ہوئے دیکھ رہا اور اس کے ملاحوں کو مسرت و تہنیت کے راگ الاپتے ہوئے سن رہا ہوں۔" اس کے چند ہی ماہ بعد وہ "للی شیونے من" پر والہ و شیدا ہو گیا اور شادی کے منصوبے بھی ہونے لگے۔ مدتیں گزرنے کے بعد وہ کہا کرتا تھا کہ اس کو کسی کے ساتھ محبت میں ایسی حقیقی شادمانی اور شادی جیسی مسرت و امتنان نصیب نہیں ہوا' جیسا کہ للی شیونے من کے ساتھ۔ وہ اس وقت دفعتاً" سوئٹزر لینڈ چلا گیا اور یہ طلسم محبت جو متاہلانہ زندگی کا پیش خیمہ بننے والا تھا' درہم برہم ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد اس نے

خود کو اس طرح خطاب کیا ہے کہ "جب گویا میں ایک ریچھ تھا جو رسیاں تڑا کر بھاگ نکلا ہو یا بلی جو اندھیرے میں غائب ہو گئی ہو۔" اس نے محبت اور ناکامی کے سلسلہ میں اپنی ایک ایسی لیڈی دوست کاؤنٹیس اسٹولبرگ کو بہت کچھ لکھا' جو اس کی غائبانہ دوست تھی اور جس سے وہ کبھی نہ مل سکا۔

بعد ازاں ویمر کے نوعمر ڈیوک کارل آگسٹ نے (جو جنگ ہائے نپولین کے بعد ڈیوک اعظم ہو گیا) گوئٹے کو اپنی ریاست کی حکومت کے انتظام کے لئے طلب کیا۔ چنانچہ 1775ء سے 1786ء تک گیارہ سال گوئٹے حکومت و سیاست کے مشغلوں میں مستغرق رہا۔ یہاں 1781ء میں ایک شادی شدہ اور بال بچوں دار عورت چارلوئی فان اسٹائن نے اس سے اظہار تعشق کیا اور دونوں میں ناجائز تعلقات قائم ہو گئے۔ مگر جب 1786ء میں گوئٹے نے چاہا کہ چارلوئی اپنے خاوند کو طلاق دے کر اس سے شادی کر لے' تو اس نے انکار کر دیا۔ اس بات پر ناراض ہو کر گوئٹے یک لخت جرمنی چھوڑ کر اٹلی چلا گیا' جہاں وہ دو سال تک رہا۔ 1788ء میں واپس ہو کر گوئٹے نے ایک اور نوجوان معشوقہ کرسٹیانے ولپیس حاصل کر لی۔ اس خطا کو فراؤ فان اسٹائن نے کبھی معاف نہیں کیا' بلکہ اس نے اپنے ایک ڈرامہ "ڈیڈو" میں گوئٹے پر اوگن کے نام سے بڑی جھاڑ اتاری' جس کا گوئٹے نے کبھی جواب نہیں دیا' بلکہ ہمیشہ فراؤ فان اسٹائن کے متعلق اپنی خوش خیالی اور نیک نیتی کا اظہار کرتا رہا۔ آخر کار سات سال کے بعد فراؤ فان اسٹائن پشیمان ہو کر عذر خواہ ہوئی اور مرتے دم (1827ء) تک گوئٹے کی سچی جاں نثار رہی۔ کرسٹیا نے کے ساتھ گوئٹے کے میاں بیوی کے سے تعلقات عرصہ تک رہے۔ آخر کار 1806ء میں شادی ہو گئی۔

شلر کے ساتھ گوئٹے کی دوستی 1794ء میں ہوئی اور 1805ء کے موسم بہار میں شلر کا انتقال ہو گیا۔ اس موقع پر گوئٹے نے اپنے مرحوم دوست کا ماتم کرتے ہوئے ایک دوسرے دوست زیلٹر کو اس طرح لکھا کہ "شلر کی موت میرے نصف حصہ جان و روح کی موت ہے۔"

1806ء میں گوئٹے کی کرسٹیانے کے ساتھ شادی ہوئی تھی۔ 1807ء میں وہ ایک اور نوجوان لڑکی مناہرزلیپ پر فدا ہو گیا۔

1814ء اور 1819ء کے درمیان گوئٹے نے "مشرقی و مغربی دیوان" کے نام سے

چھوٹی چھوٹی نظموں کا ایک سلسلہ قائم کیا۔ یہ فارسی شاعری کے مطالعہ کا اثر تھا۔ ان میں سے کچھ نظمیں تو اس کی اپنی اور کچھ میرین' اس کے دوست فان ولے مر کی بیوی کی لکھی ہوئی ہیں۔

1823ء میں اپنی بیوی کی وفات سے سات سال کے بعد جب اس کی عمر ستر سال سے اوپر تھی' وہ بڑے زور شور سے انرک فان لیوٹزو نامی ایک انیس سالہ لڑکی پر عاشق ہو گیا۔ گوئٹے نے اس سے شادی کرنی چاہی' مگر بیٹا بیچ میں آ گیا اور یہ شوق دل ہی میں رہ گیا' جو "میرین باڈرا ایلے جی" کے نام سے ایک نہایت درد ناک نظم کی صورت میں نمایاں ہوا۔

گوئٹے کی بہترین تصنیف "فاؤسٹ" کی تحریر و تصنیف کو چار زمانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (1) ڈرامہ کی تصنیف کا خیال' 1769ء سے لے کر "ار فاؤسٹ" کے خاتمہ تک' جو ویمر میں آنے سے کچھ پہلے یا آنے کے کچھ بعد 1775ء کے موسم خزاں میں ہوا۔ (2) روم میں ڈراما کو دوبارہ ہاتھ میں لینے (1786ء یا 1787ء) سے "فر یگمنٹ" کے 1790ء میں شائع ہونے تک۔ (3) شلر کی ترغیب سے ڈرامہ کو مکمل کرنے کی تیاری (1797ء) کرنے سے اس کے پہلے حصہ کی اشاعت (1808ء) تک اور (4) بائرن کی موت (1824ء) سے ایک جوش پیدا ہونے اور چنانچہ "فاؤسٹ" کی تکمیل کا تہیہ کرنے سے گوئٹے کی اپنی موت (1832ء) تک۔ گوئٹے نے شلر کی موت (1805ء) سے لے کر 26 اگست 1826ء تک "فاؤسٹ" کو بیس سال تک ہاتھ نہ لگایا' مگر بائرن کی موت نے اس کے مردہ دل میں پھر روح عمل پھونک دی اور اس نے "فاؤسٹ" کو مکمل کر کے چھوڑا۔

تصانیف

(1) ورتھر: اس میں خود نوشتہ سوانح حیات اور احساسات کا مرقع نہایت خوش اسلوبی سے کھینچا گیا ہے۔ یہی وہ ڈراما ہے' جس کے متعلق گوئٹے خود کہتا ہے کہ "نپولین کے پاس میدان جنگ میں کونسی کتاب رہتی تھی؟ میرا ڈراما "ورتھر"

(2) مائسٹر: یہ ناول قومی تعلیم اور ارتقائی نشو و نما کا خاکہ ہے۔

(3) گیٹز ا یگمونٹ: ایک تاریخی ڈراما ہے۔

(4) وہل ورد انڈٹ شافٹین : یہ ناول اخلاقی اور شہوانی زندگی کا مابہ الامتیاز ہے۔

(5) افے گینیا : ایک المناک ٹریجڈی ہے۔

(6) ہرمین : یہ نظم یونان کے قومی شاعر ہومر کے انداز میں لکھی گئی ہے۔

(7) اچلائس ہیلینا : اس میں قدیم افسانہ نگاری کی تجدید کی گئی ہے۔

(8) لیڈر : یہ بازاری شاعری اور عشقیہ نظموں کا اجتماع ہے۔

(9) فاؤسٹ : یہ ادبی منظوم ڈراما ہے' جو بنی نوع انسان کو دانائی اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

(10) دیوان : ایرانی شعرا کے تتبع میں ردیف اور قافیہ کی قید سے تحریر شدہ نظموں کا گلدستہ' جس کا نام "سلام مغرب" ہے۔ اقبال کا "پیام مشرق" اسی کے جواب میں ہے۔

موقع ملا تو انشاء اللہ "فاؤسٹ" پر ایک علیحدہ اور مفصل مضمون سپرد قلم کروں گا۔

(نیرنگ خیال (لاہور)' جلد 12 نمبر 101' بابت نومبر 1932ء' ص 13-19)

ڈاکٹر سید عابد حسین

فاؤسٹ
(مقدمہ)

جرمن ادب گوئٹے سے قبل:

یورپ کی تمام بڑی قوموں میں جدید تمدنی زندگی کے اعتبار سے جرمن قوم سوائے روسیوں کے (اگر ان کا شمار یورپ کی قوموں میں کیا جائے) سب سے کم سن ہے۔ جب یورپ اسلامی تمدن اور یونان رومی تمدن سے متاثر ہو کر اس جمود سے چونکا جو اس پر قرون وسطیٰ کی آخری صدیوں میں طاری تھا' تو فرانس اور انگلستان میں سیاست و معیشت' علم و حکمت' ادب اور فنون لطیفہ' غرض زندگی کے ہر شعبے میں روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ مگر جرمنی کی ترقی کا دور بہت دن کے بعد شروع ہوا۔ سولہویں صدی میں جو نئی زندگی کی لہر اطالیا سے اٹھی تھی' وہ یہاں بھی پہنچی مگر یہاں اسے عرصے تک ایسے گردابوں کا مقابلہ کرنا پڑا کہ اس کا سارا زور جاتا رہا۔ جرمنی میں عہد جدید مذہبی اصلاح سے شروع ہوا۔ مارٹن لوتھر نے پروٹسٹنٹ مذہب کی بنیاد ڈال کر اپنے ہم قوموں کو رومی کلیسا کی مذہبی اور سیاسی غلامی سے نجات دلائی۔ اس کے سبب سے جرمنوں میں حرکت اور جوش کا ہیجان اٹھا مگر ملک کے بعض حصوں میں کیتھولک مذہب اس قدر مضبوطی سے جڑ پکڑ چکا تھا کہ نئے مذہب کی شدید مخالفت ہوئی اور مذہبی جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا' جس سے تمدنی ترقی رک گئی۔ سترہویں صدی کے آغاز میں ان لڑائیوں میں سویڈن اور فرانس نے مداخلت کی۔ سی سالہ

جنگ نے جرمنی کو برباد کر دیا اور جرمن قوم کی روح کو ایسا کچلا کہ اسے پنپنے میں کم و بیش سو سال کا عرصہ لگ گیا۔ جرمنی کی علمی ترقی سترہویں صدی کے آخر میں شروع ہوئی اور اس کے سیاسی استحکام کی ابتدا اٹھارویں صدی کے نصف اول میں اور تکمیل انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوئی۔ 1870ء میں جرمن ایک متحد قوم بن گئے۔

مستقل جرمن ادب اصل میں اٹھارویں صدی سے شروع ہوتا ہے' لیکن اس کی بنا سولھویں صدی میں پڑ چکی تھی۔ اس سے قبل قرون وسطیٰ میں اور ملکوں کی طرح جرمنی میں بھی علمی زبان لاطینی تھی۔ بولنے کی زبان بھی ایک نہ تھی بلکہ مختلف حصوں میں مختلف زبانیں رائج تھیں۔ ان زبانوں میں تصنیف و تالیف نہیں ہوتی تھی' تاہم شاعری جو بقول ہرڈر کے قوموں کی مادری زبان ہے' موجود تھی۔ اس پر مذہبی رنگ چھایا ہوا تھا اور یہ کیتھولک عیسائیت کا رنگ تھا جو جرمن قوم کی طبیعت کے موافق نہ تھی' اس لئے اس زمانے کی جرمن مذہبی شاعری کچھ بے رنگ سی تھی۔ رزمیہ شاعری البتہ ان لوگوں کے مذاق کی چیز تھی۔ پرانی قومی داستانیں جو زاگاز (Sagas) کہلاتی تھیں' نظم کی جاتی تھیں اور بہت ہر دل عزیز تھیں۔ ان میں نیبلنگن (Nieblungen) کی داستان کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ یہ زیگفریڈ کے کارناموں کا گیت ہے جو قدیم جرمنی کا ہیرو تھا جیسے رستم قدیم ایران کا۔ زیگفریڈ ایک سیدھا سچا بھولا بھالا سورما تھا۔ جنگجوئی نے اس کے مزاج میں خشونت نہیں پیدا کی تھی۔ اس کا قلب رقت اور درد سے معمور تھا۔ وہ موسیقی کا شیدا تھا اور گھریلو زندگی کا عاشق۔ یہ جرمن قوم کا کیرکٹر ہے اور زیگفریڈ جرمن روح کی مثال۔ سولھویں صدی کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے اثر سے اطالیہ' انگلستان اور فرانس میں لوگ تنگ مذہبی دائرے سے باہر نکلے اور قدیم روم و یونان کی تقلید میں علم و حکمت و فنون لطیفہ کی طرف متوجہ ہوئے' مگر جرمنی میں یہ تحریک صرف اس حد تک پہنچی کہ بعض لوگ یونانی اور لاطینی ادب کا مطالعہ کرنے لگے۔ یونان و روم کی روح جرمنی کی تمدنی زندگی میں سرایت نہ کر سکی۔ یہاں نشاۃ ثانیہ سے پہلے تجدید مذہب کا دور گزرا جس کا آغاز مارٹن لوتھر' (1483ء تا 1546ء) سے ہوا لوتھر اصل میں جدید جرمن تہذیب و تمدن کا بانی ہے۔ اس نے نہ صرف اس مذہب کی بنا ڈالی جو جرمنوں کی گہری مذہبیت کا مظہر ہے بلکہ جرمن زبان اور ادب کی داغ بیل بھی اسی کے ہاتھ سے پڑی۔ اس نے انجیل کا اپنے وطن سیکسنی کی زبان میں ترجمہ

کیا اور بہت سے مذہبی اور مناظرانہ رسائل لکھے۔ اس کے ترجمہ انجیل کی سادی اور ستھری زبان تمام جرمنی کی مشترک زبان بن گئی۔ اس نے ایک طرف پادریوں اور دوسری طرف لاطینی کے پرستاروں کے مقابلے میں جرمن زبان کی حمایت کی اور اسے ادبی زبان بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس زمانے میں چھاپا نیا نیا ایجاد ہوا تھا۔ لوتھر نے مطبوعہ کتابوں کو رواج دیا اور ان کے ذریعے سے اس کے مذہبی خیالات کے ساتھ ساتھ زبان کی بھی اشاعت ہوتی رہی۔ اس کی گہری نظر نے دیکھ لیا تھا کہ جو چیز مقبول عام نہ ہو سکے' وہ قومی ترقی کے لئے زیادہ مفید نہیں۔ جس اصول کو پیش نظر رکھ کر اس نے انجیل کا ترجمہ کیا تھا' اسے وہ ذیل کے الفاظ میں بیان کرتا ہے جن سے اس کی اصابت رائے' اس کی قومی محبت اور اس کے اکھڑپن کا اندازہ ہوتا ہے۔ "ان گدھوں کی طرح لاطینی صرف و نحو سے نہ پوچھنا چاہئے کہ جرمن زبان کیوں کر بولی جائے بلکہ گھر میں بیٹھنے والی ماؤں سے سڑک پر کھیلنے والے بچوں سے' بازار میں پھرنے والے لوگوں سے' ان کی بات چیت کان لگا کر سنو اور اسی زبان میں ترجمہ کرو۔ تب وہ سمجھیں گے کہ تم جرمن زبان بول رہے ہو۔"

لوتھر کے مددگاروں میں الرش (Ulrich von Huetten' 1488ء تا 1523ء) خاص امتیاز رکھتا ہے۔ وہ ابتدا میں ہیومانزم کی تحریک کا موید تھا اور لاطینی زبان کا شیدا۔ مگر لوتھر کے اثر سے اس کے خیالات بدلے اور وہ نہایت جوش و خروش سے مذہبی اصلاح اور جرمن قوم کی سیاسی اور ذہنی آزادی کا حامی بن گیا۔ اس کی طبیعت میں لوتھر سے زیادہ شورش تھی' چنانچہ اس نے اپنے زمانے کی انقلابی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ اس کی ادبی خدمات بھی کم نہیں۔ آج تک اس کے قومی گیت فدائے ملت جرمنوں کے دلوں کو ابھارتے ہیں۔

افسوس ہے کہ ملک کے سیاسی انتشار نے اس عہد میں جرمن ادب کی اٹھتی جوانی کو برباد کر دیا۔ تجدید مذہب نے جو نئی روح پھونکی تھی' وہ بجائے اس کے کہ عام تمدنی اور ادبی ترقی میں صرف ہوتی' خانہ جنگیوں کی نذر ہو گئی۔ سولھویں صدی کی ادبی پیداوار سوائے مذہبی گیتوں یا پوپ کے خلاف طنزیہ نظموں اور ڈراموں کے اور کچھ نہیں۔ ہانس زاکس نے ڈراما کو وسعت دینا چاہی اور وکرام نے ناول کی بنا ڈالی' لیکن عام ذہنی معیار اس قدر پست تھا کہ یہ دونوں چیزیں ترقی نہ کر سکیں۔ جرمن قوم کے گہرے دلی جذبات اس زمانے میں ادب

العوام (Folklore) میں ظاہر ہوئے' جن میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر اوئلن سپیگل کے قصے اور فاؤسٹ کی داستان ہے' جو گوئٹے کے ڈراما کا ماخذ ہے۔

سترہویں صدی کی ابتدا میں جرمنی میں ادبی تحریک کچھ دن کے لئے پھر ابھری۔ اس زمانے میں ملک میں مقابلتاً" امن تھا اور لوگوں کو اتنی فرصت تھی کہ ذہنی زندگی کے مسائل کی طرف متوجہ ہوں۔ جرمنوں کو یہ احساس پیدا ہوا کہ ان کا ادب دوسری قوموں کے ادب سے بہت پیچھے ہے اور انہوں نے اپنے دامن سے اس دھبے کو دور کرنے کی کوشش شروع کی۔ مارٹن اوپٹز (1597ء تا 1639ء) نے جرمن زبان کی اصلاح و ترقی میں بہت سعی کی اور اس کے ساتھیوں نے بھی زبان کو بہت سنوارا۔ لیکن مضامین کے لحاظ سے ان لوگوں کی تصانیف بالکل کھوکھلی ہیں۔ ان کے مضامین کا ماخذ یونانی اور لاطینی کے پرستاروں کی تصانیف ہیں اور یہ بھی ان لوگوں کی طرح یونان و روما کی نقالی کرتے تھے۔ اینڈریاس گریفیس اس عہد کا ممتاز ڈراما نگار تھا' مگر اس کی تمثیلیں ڈراما کی روح سے خالی ہیں۔ اس عہد کی شاعری بالکل سطحی اور تصنع سے معمور ہے۔

جرمنی کو امن و سکون کا جو دور نصیب ہوا' وہ دیرپا نہ تھا۔ تھوڑے ہی دن میں سی سالہ جنگ (1618ء تا 1648ء) شروع ہو گئی جس نے ملک کو مادی اور ذہنی حیثیت سے برباد کر دیا۔ اس جنگ میں فرانس جرمنی کی سیاست میں دخیل ہو گیا اور فرانسیسی تہذیب کا رنگ جرمن زندگی پر چھا گیا۔ فرانسیسی زبان جرمنی کے تعلیم یافتہ حلقوں میں پھیل گئی۔ ذہنی غلامی کے زمانے میں کوئی قوم پوری ادبی ترقی نہیں کر سکتی۔ جرمنی کی ادبی تحریک جو اس صدی کے شروع میں اٹھی تھی' بالکل فنا ہو گئی اور صدی کے آخر تک سوائے گریمیل ہاؤزن کے کوئی معقول ادیب نہیں پیدا ہوا۔ اس کا سب سے مشہور ناول ایک آوارہ گرد کی خود نوشتہ سوانح عمری کے طور پر شائع ہوا' جس کا نام Simplicissimus ہے۔

غرض سترہویں صدی کا جرمن ادب مجموعی حیثیت سے سولہویں صدی کے ادب سے بھی بہت پست تھا۔ اس پر تنگ خیالی' بدمذاقی اور کورانہ تقلید کا رنگ غالب تھا۔ نہ اس میں تخیل کی بلند پروازی تھی اور نہ تناسب اور ترتیب۔

اٹھارویں صدی کے نصف اول میں جرمنی کی ذہنی حالت کچھ بہتر نظر آتی ہے۔ اب جرمن' فرانسیسیوں کی تقلید میں بہت کچھ ترقی کر چکے تھے۔ اب وہ محض نقالی نہیں بلکہ سمجھ

بوجھ کر تقلید کرتے تھے۔ فرانس اور انگلستان کا عقلی فلسفہ جرمنی میں پھیل چکا تھا۔ اس فلسفے کا اصل اصول یہ تھا کہ ذہن انسانی کا اصل جوہر عقل ہے اور کائنات پر اسی کی حکومت ہے۔ انسان کی مادی' ذہنی اور روحانی زندگی کا معیار عقل ہی کو قرار دینا چاہئے۔ جو چیزیں احساس و وجدان پر منحصر ہیں' مثلاً مذہب یا آرٹ' وہ بھی اسی حد تک قابل قبول ہیں' جس حد تک وہ عقل کے مطابق ہوں۔ چونکہ عقل سب انسانوں میں مشترک اور ہر زمانے میں موجود ہے' اس لئے صحیح علم' مذہب اور آرٹ کے اصول بھی ہر قوم کے لئے ہر عہد میں یکساں ہیں۔ آرٹ میں یہ اصول یونانیوں کو معلوم تھے' اس لئے ادب اور فنون لطیفہ کے دوسرے شعبوں میں یونانیوں کی تقلید اوج کمال پر پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔

اس علمی تحریک کے ماتحت ایک تعلیمی تحریک بھی تھی۔ اس کی کوشش کی جاتی تھی کہ یہ خیالات عوام میں پھیلیں اور ان کے دل سے مذہبی تعصّبات اور ہر طرح کی ضعیف الاعتقادی دور ہو۔ جرمنی کی ذہنی تاریخ میں یہ تحریک Aufklaerung کہلاتی ہے اور ہم اسے نئی روشنی کی تحریک کہہ سکتے ہیں جرمنی میں اس کا ہراول کرسٹیان ٹومس (1655ء تا 1728ء) ہے۔

عقلی فلسفے کا اس زمانے کے ادب پر بہت گہرا اثر پڑا۔ اس زمانے کی تصانیف میں مذہبی شکوک عام طور پر نظر آتے ہیں۔ شاعری اور ڈراما وغیرہ میں فرانسیسیوں کے توسط سے یونانی نمونوں کی پابندی ہونے لگی۔ شاعری کے موضوع کو بہت وسعت ہوئی۔ سچی شاعری کی جان انسانی جذبات کی ترجمانی کے علاوہ مناظر قدرت کی نقاشی ہے۔ اب تک جرمن شاعری میں حسن فطرت کی تصویروں کی کمی تھی۔ براگس (1680ء تا 1774ء) نے اس کمی کو پورا کیا۔ اس کی شاعری کا پایہ بہت بلند نہیں مگر اس کا یہ احسان ہے کہ اس نے تخیل کی جولانی کے لئے ایک نئی راہ کھول دی۔

اس عہد کا سب سے بڑا ادبی نقاد گوٹ شیڈ (1680ء تا 1747ء) ہے۔ یہ لائپرش کی یونی ورسٹی میں پروفیسر تھا۔ گوٹ شیڈ عقلیت کا حامی تھا اور ادب میں یونانیوں کے مقرر کئے ہوئے قواعد و ضوابط کی پابندی پر زور دیتا تھا۔ سوئسز لینڈ کا بوڈمر اس کا مخالف تھا اور لوگوں کو انگلستان کے ادب کی تقلید اور جذبات پرستانہ شاعری کی طرف توجہ دلاتا تھا۔ ان دونوں کے پیروؤں میں سخت مناظرے رہتے تھے جن کی بدولت جرمنوں کے تنقیدی ذوق کو نشو و

نما کا بہت اچھا موقع ملا۔ اسی زمانے میں لائپزش میں نوجوان ادیبوں کا ایک حلقہ تھا جو شاعری کا مقصد قوم کی اخلاقی اصلاح کو سمجھتا تھا۔ یہ لوگ بریمن کے ایک رسالے میں مضمون لکھا کرتے تھے۔ ان لوگوں میں جرمنی کا پہلا بڑا شاعر کلوپف اشٹوک بھی تھا۔

اٹھارویں صدی کے نصف ثانی میں جرمن ادب نے یکایک حیرت انگیز ترقی کی۔ 1740ء تک یورپ میں جرمن ادب کی کوئی وقعت نہ تھی اور 1800ء میں یہ حالت ہو گئی تھی کہ کسی ملک کا ادب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کایا پلٹ کا راز جرمنی کی سیاسی ترقی میں مضمر ہے۔ اس زمانے میں ریاست پروشن(۱) میں فریڈرک اعظم نے ایک مستحکم سلطنت قائم کی اور تمام یورپ میں اس کا فوجی اقتدار مسلم ہو گیا۔ دوسری بڑی بات یہ تھی کہ پروشن کو چھوڑ کر اور ریاستوں کو تجدید مذہب کے بعد پہلی بار ایک طویل عرصے تک چین سے بیٹھنا نصیب ہوا۔ اب جرمنوں کے دل میں اپنی عزت پیدا ہو گئی' وہ اپنے اوپر اعتماد کرنے لگے اور اپنی زندگی کو اس قابل سمجھنے لگے کہ ادب اور شاعری کا موضوع بن سکے۔ یہ تحریک شروع ہوئی کہ فرانسیسیوں کی تقلید ترک کر دی جائے۔ مگر یہ رنگ اتنا گہرا ہو چکا تھا کہ یکایک اس کو چھوڑنا آسان نہ تھا۔ پھر بھی ادب کے میدان میں اتنا ضرور ہوا کہ کلوپف اشٹوک' ویلانڈ اور لیسنگ کی بدولت جرمن شاعری ڈراما' ناول وغیرہ میں مضامین کے اعتبار سے جدت' گہرائی اور بلند پروازی پیدا ہوئی اور اصول فن کے لحاظ سے فرانسیسیوں کا واسطہ چھوڑ کر براہ راست یونانیوں کی تقلید ہونے لگی اور یونانیوں کے مقرر کئے ہوئے قواعد و ضوابط کی تفسیر جرمن ادیب اپنے طور پر کرنے لگے۔

کلوپف اشٹوک (1724ء تا 1803ء) جیسا ہم کہہ چکے ہیں' لائپزش کے اس حلقے میں سے تھا جو شاعری کا مقصد اخلاقی اصلاح کو سمجھتا تھا۔ اس نے جرمن شاعری کا پایہ بہت بلند کر دیا۔ شاعری اب محض ادبی مشق یا عارضی تفریح کا ذریعہ نہیں رہی بلکہ گہرے مذہبی اور اخلاقی جذبات کا آئینہ بن گئی۔ کلوپف اشٹوک کی سب سے مشہور تصنیف "مسیحا" ہے جس میں اس نے حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کا قصہ نظم کیا ہے۔ اس میں اس نے مسیحؑ کے حالات بالکل کلیسائی روایات کے مطابق بیان کئے ہیں' اس لئے زیادہ شاعری کا موقع نہیں ملا۔ اس کے کیرکٹر جیتے جاگتے انسان نہیں بلکہ کٹھ پتلیاں ہیں' جن کی زبان سے شاعر بولتا ہے۔ یہی حال اس کے ڈراموں کا ہے جن کے موضوع انجیل کے قصے ہیں۔ اس کی غنائی شاعری ترنم

سے خالی ہے' البتہ قومیت کے جذبے کی بدولت اس کی شاعری میں کہیں کہیں زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ سب سے بڑا نقص اس کی شاعری کا یہ ہے کہ اس کی فطرت انسانی کا تصور بالکل یک طرفہ ہے۔ وہ انسان کو محض جذبات کا مجموعہ سمجھتا ہے۔ اس کی ارادی اور عملی زندگی اور اس کی شہوانی کمزوریوں کی طرف سے چشم پوشی کرتا ہے۔

ویلانڈ (1733ء تا 1813ء) کے کلام کی خصوصیت اس کا سادہ اور موثر اسلوب بیان ہے۔ موضوع کلام اور خیالات کے اعتبار سے اس کی شاعری کے دو علاحدہ دور ہیں۔ پہلا مذہبیت اور تصوریت کا ہے۔ اس زمانے میں اس نے ایک طویل نظم "حقیقت اشیاء" کے نام سے لکھی۔ اس میں اس نے قدیم فلسفی شاعر لکریشیس کی مادیت کے خلاف افلاطون کی تصوریت کی حمایت کی۔ اسی دور میں اس نے "بہار" کے نام سے نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا جس میں افلاطونی عشق کی حقیقت بیان کی گئی تھی۔ "ابراہیم کا امتحان" میں چند منظوم خطوط ہیں جن میں کچھ مردے اپنے زندہ دوستوں سے وہ روحانی واردات بیان کرتے ہیں جو انہیں مرنے کے بعد پیش آئی۔ ویلانڈ کی اس دور کی شاعری میں اصلیت کم اور تصنع زیادہ ہے۔ جو مذہبی اور اخلاقی مطالب بیان کئے گئے ہیں' وہ دل سے نکلے ہوئے جذبات نہیں بلکہ دماغ سے پیدا کئے ہوئے خیالات ہیں۔

اس کی شاعری کا دوسرا دور وہ ہے جب والٹیر اور شیکسپیئر کی تصانیف کے مطالعے اور زندگی کے بلاواسطہ مشاہدے کے بعد اس کے ذہن میں فطرت انسانی کا وسیع تصور قائم ہوا۔ اب اس نے جتنی چیزیں لکھیں' ان سب کا موضوع اپنے زمانے کے مسائل زندگی کو قرار دیا۔ افسانے سب غیر ملکوں کے ہیں لیکن ان کے پردے میں وہ اپنے ملک کی حالت دکھاتا ہے۔ مثلاً "ڈان سلویو" جو ڈان کیہوٹے کی طرح اسپین کے ایک بانکے کا قصہ ہے' "اگاتھون" جس میں ایک یونانی سورما کے حالات ہیں۔ 'طلائی آئینہ' جو الف لیلہ کی قسم کی ایک کتاب ہے اور مشرقی ممالک کے قصوں کا مجموعہ ہے۔

جو زور بیان کلوپف اشٹوک کے یہاں تھا' اس سے ویلانڈ کا کلام خالی ہے۔ اسی لئے اسے جتنی مقبولیت غیر ممالک میں حاصل ہوئی' خود جرمنی میں نہیں ہوئی۔ یہاں ایک گروہ اس کا مخالف تھا جو اس کی واقعیت پسندانہ شاعری کو مخرب اخلاق سمجھتا تھا۔

اس دور کا سب سے بڑا ادیب' نقاد اور ڈراما نگار لیسنگ (1729ء تا 1781ء) ہے۔

اس نے اس طرز شاعری کو جو کلاسیکی کہلاتا ہے' کمال کو پہنچا دیا۔ اس طرز کی خصوصیات یہ ہیں کہ انداز بیان سادہ اور حقیقت میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اصول فن کی پوری پابندی کی جاتی ہے اور جذبات کو عقل کے ماتحت رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خیالات کے اعتبار سے لیسنگ "عقلیت" اور "نئی روشنی" کا علم بردار ہے۔ رسم و کیش' مذہب و ملت کی قیود کو وہ عقل انسانی کے لئے زنجیریں سمجھتا ہے۔ وہ ان پردوں کے پیچھے انسانیت کے عین کو دیکھتا ہے اور اسے بے نقاب کرنا چاہتا ہے۔

اس کے ابتدائی ڈراموں میں اصول فن کے لحاظ سے فرانسیسیوں کی تقلید ہے' لیکن چونکہ وہ نقادانہ طبیعت رکھتا تھا' اس لئے اس نے خود یونانی ڈراموں کا جن کی تقلید کا فرانسیسیوں کو دعویٰ تھا' نظر غور سے مطالعہ کیا اور اس کی بنا پر ڈراما نویسی اور دوسرے فنون لطیفہ کے اصول و ضوابط قائم کئے۔ فن تنقید میں اس کی دو کتابیں 'ہامبرگ کا فن ڈراما' اور 'لوکوآن' مشہور ہیں۔ اس کی تنقید عقلیت کے فلسفے پر مبنی ہے۔ اس کے نزدیک فنون لطیفہ کا عام معیار خوبی یہ ہے کہ وہ صاف اور واضح تصورات کو منطقی تناسب اور ترتیب سے پیش کریں۔ اس کا پہلا اوریجنل ڈراما "سارہ سیمپسن" ہے۔ اس میں اس نے یہ قدیم اصول توڑ دیا کہ المیہ کا موضوع ہمیشہ بادشاہوں یا امرا کی زندگی ہونا چاہئے اور ایک معمولی خاندان کی لڑکی کا قصہ بیان کیا' لیکن اس افسانے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ البتہ "مینا فان بان رن ہیلم" اپنے موضوع کے لحاظ سے' نیز ڈراما کی خصوصیات کے اعتبار سے نہایت کامیاب کامیڈی ہے۔ اس میں جذبہ عشق کی کشمکش احساس فرض اور حب وطن سے دکھائی گئی ہے۔ اس ڈرامے میں ایک فرانسیسی کا مضحک کیرکٹر ہے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جرمنوں کے دل پر فرانسیسیوں کا اب وہ پہلا سا رعب نہیں رہا تھا۔

لیسنگ کے دو ڈرامے' امیلیا گیلوٹی اور 'دانمشند ناتان' ادبی دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔ "امیلیا" میں لیسنگ نے اپنے عہد کی اطالوی زندگی کا ایک المناک قصہ لکھا ہے جو اس کے ادبی طرز کی بہترین مثال ہے۔ "ناتان" سلطان صلاح الدین ایوبی کے زمانے کی صلیبی جنگ کا افسانہ ہے جس میں ایک یہودی حکیم کی زبان سے مذہبی رواداری کا درس دیا گیا ہے اور عقلیت کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔

غرض اٹھارویں صدی میں جرمن زبان بہت منجھی اور صاف ہوئی اور جرمن ادب

فرانسیسیوں کی تقلید سے آزاد ہو گیا۔ اس میں جدت اور وسعت پیدا ہوئی لیکن ابھی گہرائی نہ تھی۔ بات یہ تھی کہ اس صدی میں جس راہ پر جرمن ذہن چل رہا تھا' یعنی عقلیت کا فلسفہ اور کلاسیکی ادب وہ جرمن قوم کی طبیعت کے مناسب نہ تھا۔ اس قوم کی طبیعت میں باطنیت اور انفرادیت ہے' اس کے تخیل میں شورش ہے' وہ خارجی قیود سے گھبراتی ہے اور لاعقلی عناصر کو عقل کے ماتحت نہیں رکھنا چاہتی۔ شاید اس کی تربیت اور انضباط کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ عقلیت کے دور سے گزرے' لیکن وہ زیادہ دن تک اس کی پابند نہیں رہ سکتی تھی۔ فلسفے میں کانٹ کے نقادانہ دماغ نے عقلیت کی حدود معین کر دی تھیں۔ اس کے بعد تصوریت پسند فلسفیوں کو تخیل کی بلند پروازی دکھانے اور لاعقلی عناصر پر زور دینے کا موقع ملا۔ ادبی تنقید میں عقلیت کے خلاف علم پیکار بلند کرنے ولا عالم دین ہرڈر تھا۔ عقلیت کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ ذہن انسانی کو ساکن اور یک رنگ سمجھتی تھی اور اس کی تاریخی نشو و نما اور رنگا رنگی کو نظرانداز کر دیتی تھی۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی اور خیال کے اصول جو عقل کی روشنی میں صحیح ہوں' ہر قوم اور ہر زمانے کے لئے یکساں ہیں۔ ہرڈر نے اس پر سختی سے تنقید کی اور "تاریخی منہاج" کی بنا ڈالی۔ اس کی کتاب "جمالیات" میں جو تنقیدی اصول بیان کئے گئے' وہ بالکل نئے اور اچھوتے تھے۔ اس کے نزدیک ہر قوم کا ادب اور اس کی شاعری قومی سیرت کی خصوصیات کا آئینہ اور قومی زندگی کی ارتقا کا نتیجہ ہے۔ اس کے نزدیک سچی شاعری کی پہچان یہ ہے کہ وہ انسانی خواہشات و جذبات کی تصویر ہو اور شدت احساس اور خلوص سے لبریز ہو۔ اگر یہ باتیں شاعری میں موجود ہوں تو وہ فطری شاعری ہے ورنہ ایک مصنوعی اور بے جان چیز ہے۔ اس معیار پر اس کے خیال میں وہ گیت پورے اترتے ہیں جو عوام کے بنائے ہوئے اور ان میں مقبول ہوں۔ اس لئے یہی سچی شاعری کا نمونہ ہیں۔ اس کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ "شاعری نوع انسانی کی مادری زبان ہے۔" اس نے بڑی محنت سے ایک مجموعہ مختلف قوموں کے منتخب گیتوں کا تیار کیا اور اس کا نام "قوموں کی آواز گیت کے پردے میں" رکھا۔

"جرمن ادب کے متعلق چند متفرق خیالات" ہرڈر کا شاہ کار ہے۔ اس میں اس نے اپنا فلسفہ لسان بیان کیا ہے۔ ہرڈر کہتا ہے کہ ہر قوم کی زبان میں ایک خاص روح ہوتی ہے اور یہی روح اس کے ادب کے لئے وجہ حیات ہے۔ زبان کے ارتقا کے عام اصول قائم کرنے

کے بعد وہ جرمن زبان کی خصوصیات بتاتا ہے اور اس کی نشو و نما دکھاتا ہے۔ اس کے نزدیک "نئی روشنی" کے دور نے جرمن زبان و ادب کو ابھرنے نہ دیا۔ اس عہد میں ذہن انسانی کی ساری کائنات عقل سمجھی جاتی تھی۔ حالاں کہ عقل اس کا محض ایک پہلو ہے اور انسانی زندگی کی تکمیل کے لئے کافی نہیں۔ "تنقید کے جنگل" میں اس نے ان خیالات کو پھیلایا ہے اور ان سے ادبی تنقید میں کام لیا ہے۔ "اوسیاں کے متعلق خطوط" میں اس نے ایک قدیم کیلٹ کے کلام پر تبصرہ کیا اور اسے یونان کے مایہ ناز شاعر ہومر کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ 'مقالہ بر کلام شیکسپئر' میں اس نے بتایا ہے کہ شیکسپئر کی تصانیف کو فرانسیسی تنقیدی اصول پر نہ جانچنا چاہئے' بلکہ انگلستان کی مخصوص ادبی روح کے معیار پر۔

اس کی ایک نہایت اہم کتاب Auch eine Philosophie der Geschichte ہے۔ اس عنوان کا ترجمہ اردو میں یہ ہو گا "تاریخ کا بھی فلسفہ"۔ اس نے تاریخ کے مطالعے میں روحانی ارتقا کے نظریئے سے کام لیا اور قرون وسطیٰ کے متعلق عام مورخین کا جو حقارت آمیز رویہ تھا' اس کی سختی سے مخالفت کی۔ لوگ اس عہد کو تاریکی کا زمانہ سمجھتے تھے۔ ہرڈر نے یہ ثابت کیا کہ اس زمانے میں یورپ میں ایک مکمل نظام زندگی موجود تھا' جو فطرت سے قریب تر تھا۔

ہرڈر کا طرز تحریر بھی خاص ہے۔ وہ لکھنے میں کسی اصول کی پابندی نہیں کرتا اور اپنے خیالات وضاحت' صفائی اور روانی سے ادا نہیں کر سکتا' اس لئے اس کی کتابیں پڑھنے میں دلچسپ نہیں۔ لیکن اس کے خیالات اس قدر گہرے تھے اور اس نے جرمن انداز طبیعت کو اس خوبی سے سمجھا تھا کہ اس کی وجہ سے جرمنی کی ادبی دنیا میں عظیم الشان انقلاب ہو گیا۔ اس کی تحریک سے جرمن زبان بیرونی بندشوں کو توڑ کر آزاد ہوئی اور جرمن روح کی بے چینی' آرزو اور جستجو نے ادب اور شاعری میں عجیب سوز و گداز پیدا کر دیا۔

اس ادبی انقلاب کی جو طوفان و ہیجان کا دور کہلاتا ہے' ابتدا اس زمانے سے سمجھنا چاہئے جب استراس برگ میں ہرڈر اور گوئٹے میں ملاقات ہوئی (1771ء)۔ نوجوان گوئٹے جس قدر ہرڈر کی اثر آفریں شخصیت سے متاثر ہوا' اپنے ہم عصروں میں کسی سے نہیں ہوا۔ 1772ء میں ایک مجموعہ مضامین "جرمن ذہن اور جرمن آرٹ" کے نام سے شائع ہوا جو گویا نئے دور کا پیش خیمہ تھا۔ اس میں ہرڈر' گوئٹے اور چند اور لوگوں کے مضامین تھے۔

اس ادبی انقلاب نے دو راہیں اختیار کیں۔ ایک تو غنائی شاعری اور دوسرے ڈراما۔ نئی غنائی شاعری کا مرکز گوٹنگن تھا' جہاں یونی ورسٹی کے چند طالب علموں نے مل کر ایک حلقہ شعرا قائم کیا' جن میں فوس اور بیورگر ممتاز تھے۔ یہ لوگ ایک سال نامہ "آرٹ کی دیویوں کے سال نامے" کے نام سے نکالتے تھے۔ ان کی شاعری نفس مضمون اور طرز ادا کے لحاظ سے کلاسیکی شاعری کی ضد ہے۔ ان کے کلام میں اس قدر جوش و خروش ہے کہ وہ پوری طرح اپنے مضمون پر قابو نہیں پا سکتے۔ ان کا موضوع کلام انسان کی داخلی زندگی' اس کے جذبات کا ہیجان' اس کی باطنی قلبی واردات ہے۔ اس ضمن میں گوئٹے کا 'ویرتھر' بھی شمار کیا جا سکتا ہے' جو شعر منثور کا نمونہ ہے۔

لیکن 'طوفان و ہیجان' کی تحریک کا اصلی زور ڈراما میں ظاہر ہوا۔ جرمنی کے دو سب سے بڑے ڈراما نگار گوئٹے اور شلر اپنی جوانی کے زمانے میں اس تحریک کے علم بردار تھے' گوئٹے کا "گوتس" اور شلر کا قزاق 'ہیجان و طوفان' کا آئینہ ہیں۔ "گوتس" سولہویں صدی کے ایک باغی سردار کا قصہ ہے اور "قزاق" جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے' قزاقوں کا افسانہ ہے۔ دونوں میں مصنفوں کی ہمدردی ان لوگوں کے ساتھ ہے جو مروجہ اخلاق کو توڑ کر محض اپنے ضمیر کے احکام کی پابندی کرتے ہیں۔ گوئٹے اور شلر نے اس دور میں اور بھی کئی ڈرامے لکھے اور یہ رنگ اس قدر پھیلا کہ بہت سے ڈراما نگاروں نے اسے اختیار کر لیا۔ ان لوگوں میں "کلنگر" کسی قدر اہمیت رکھتا ہے جس کے ڈراما 'طوفان و ہیجان' کے نام سے یہ دور موسوم ہے۔

اس دور کی خصوصیات تین تھیں: کلاسیکی اصول فن کی سختیوں سے آزادی' داخلیت کی جذبات پرستی اور انفرادیت' مروجہ اخلاقی اور تمدنی قوانین کے خلاف احتجاج۔ اس زمانے میں جرمن روح کو اپنی خصوصیات' اپنی خوبیاں اور کمزوریاں پوری طرح ظاہر کرنے کا موقع ملا۔

اس دور کی کمزوریاں بھی صاف نظر آتی ہیں۔ ادب اور زندگی کی صحیح نشو و نما کے لئے جہاں بے جا قیود سے آزادی لازمی ہے' وہاں کسی نہ کسی ذہنی معیار کی پابندی بھی ضروری ہے۔ "طوفان و ہیجان" نے جرمنی کی رومانی روح کو آزاد کر دیا تھا۔ اس میں بے حد زور' بے تھاہ گہرائی' بے پایاں وسعت تھی' لیکن بہت جلد یہ معلوم ہو گیا کہ ان خوبیوں کے ساتھ ترتیب اور ہم آہنگی کے نہ ہونے سے بے راہ روی اور انتشار کا خوف ہے۔ کچھ دن میں

اس دور کے ادیبوں کی بے اصولی' داخلیت اور انفرادیت حد سے گزرنے لگی۔ اس کا احساس سب سے پہلے گوئٹے کی ہمہ گیر طبیعت کو ہوا۔ اس نے اس مسئلے کو اپنی زندگی اور اپنی تصانیف دونوں میں حل کیا۔ ایک طرف تو اس نے زندگی میں آزادی اور پابندی' فطری جوش اور اخلاقی انضباط' Genius (خداداد تخلیقی قوت) اور Character (اکتسابی سیرت) میں امتزاج پیدا کر کے جرمن قوم کے لئے ایک نمونہ قائم کیا اور دوسری طرف اپنی شاعری میں رومانی روح کے ہیجان و طوفان کو کلاسیکی ہم آہنگی اور ترتیب کی مدد سے راہ پر لگا دیا۔ گوئٹے کے بعد کئی بار جرمن روح کے دست وحشت نے زندگی کے گریبان تنگ کو چاک کیا' لیکن گوئٹے کی زندگی اور شاعری کی مثال سامنے تھی' اس لئے فوراً ہی اس کی بخیہ گری بھی ہو گئی۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ گوئٹے نے یہ مثال کیوں کر قائم کی۔

گوئٹے کی زندگی کے حالات اور اس کی تصانیف:

یوحان وولف گانگ گوئٹے 1749ء میں شہر فرانک فورٹ میں جو دریائے مائن کے کنارے واقع ہے' پیدا ہوا۔ اسے اپنے باپ سے ضبط و انضباط' باریک بینی اور مشاہدے کی عادت ورثے میں ملی اور اپنی ماں سے وسعت تخیل اور ذوق جمال۔ وہ اپنے ایک قطعے میں کہتا ہے:

"اپنے باپ سے میں نے وجاہت اور سنجیدگی پائی ہے اور اپنی پیاری ماں سے زندہ دلی اور کہانی کہنے کا شوق۔"

جوانی میں اس کے مزاج میں بے حد تلون تھا۔ اس کا دل جذبات و کیفیات کا ایک سمندر تھا جس میں ہمیشہ مد و جزر رہتا تھا۔ کبھی ملال اور افسردگی' کبھی جوش اور مسرت' کبھی حوصلہ مندی اور امید' کبھی بے دلی اور یاس' کبھی لطف صحبت کا ذوق' کبھی تنہائی کی تلاش۔ یہ کیفیت کم و بیش ہر نوجوان کی ہوتی ہے۔ عہد شباب میں جس طرح خون گرم ہوتا ہے اور تیزی سے بہتا ہے' اسی طرح جذبات مشتعل ہوتے ہیں اور جلد جلد رنگ بدلتے ہیں مگر گوئٹے کی طبیعت کے تلون اور بے چینی کو محض عمر کا تقاضا نہیں کہہ سکتے' کیوں کہ اس کی یہ سیماب مزاجی عنفوان شباب کے گزرنے کے بعد بھی عرصے تک اسی زور شور سے باقی رہی' بلکہ آخر عمر میں بھی رہ رہ کے ظاہر ہوتی رہی۔ اس کے اس باطنی اضطراب کا سبب یہ

تھا کہ اس کے سینے میں "دو روحیں" تھیں۔ ایک تو شاعر کی حسن پرست، عشق پرور، شورش انگیز، ہنگامہ خیز روح اور دوسرے حکیم کی عرفان جو، حق پسند، سکون طلب، نظم آفریں روح۔ ان دونوں کی کشمکش اسے چین نہ لینے دیتی تھی اور اس کشمکش کو دور کرنے پر اس کی نجات منحصر تھی۔ اسی کے ساتھ اس کے ذہن میں بلا کی وسعت اور ہمہ گیری اور اس کی طبیعت میں غضب کی آمد اور روانی تھی۔ اس کے لئے یہ بھی ایک اہم مسئلہ تھا کہ اپنی تخلیقی قوت کے لئے کیا حدود اور کیا ضوابط مقرر کرے تاکہ وہ سیلابی دریا کے مانند کناروں کو توڑ کر آس پاس کی بستیوں کو ویران نہ کر دے بلکہ سبک رو ندی کی طرح ایک مقررہ دھارے میں بہہ کر اپنی وادی کو سیراب کرے اور زرخیز بنائے۔ غرض گوئٹے کو اپنی ذات کے ارتقا اور تکمیل کے لئے ایک بہت بڑا کام انجام دینا تھا یعنی اپنے مزاج کے متضاد عناصر میں توازن پیدا کرنا اور اپنے ذہن کی حد بندی، تہذیب اور انضباط کرنا۔

مگر گوئٹے کا کام یہیں تک محدود نہ تھا۔ وہ شاعر تھا اور اس کی فطرت کا تقاضا تھا کہ اپنی داخلی زندگی کے نشیب و فراز اور نشو و نما کو الفاظ و تصورات کے خوش نما نقوش، لحن و صوت کی خوش آئند ترکیبوں میں ظاہر کرے تاکہ دوسرے بھی اس سے سرور کے پردے میں تسکین اور نجات حاصل کریں۔ جس روحانی کشمکش میں گوئٹے مبتلا تھا، اسی میں اس کی قوم بھی گرفتار تھی۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ اس زمانے میں رومانی جرمن روح فرانسیسیوں اور یونانیوں کی تقلید سے آزاد ہو کر اپنے فطری جوش کی رو میں بہہ رہی تھی۔ جرمن ادب پر 'طوفان و ہیجان' کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ اس نے اصول کے بند توڑ دیئے تھے اور مذہب و اخلاق رسم و رواج کے پشتوں کو کمزور کر دیا تھا۔ لیکن ایک طرف تو کلاسیکی تاریخی روایات، دوسری طرف جرمنوں کی گہری مذہبیت، تیسری طرف فریڈرک اعظم کا قائم کیا ہوا فوجی انضباط جو تمام قوم کے دل میں گھر کر چکا تھا، یہ سب قوتیں طوفان و ہیجان کی تخریبی اور انقلابی تحریک کی مطلق العنانی کو روک رہی تھیں۔ بہتوں کے دل میں یہ احساس پیدا ہو چکا تھا کہ تخریب کے ساتھ تعمیر کی بھی ضرورت ہے۔ سب سے زیادہ اس کا احساس گوئٹے کو تھا اور اسی میں اتنی قوت بھی تھی کہ اس طوفان کو قابو میں لا کر اس سے کشت زندگی کی آبیاری کا کام لے۔

غرض گوئٹے کی زندگی اس اصلاح و تعمیر کا افسانہ ہے، جو اس نے اپنی سیرت میں اور اپنی قوم کے ادب اور تہذیب میں کی۔ یہ کوئی سہل کام نہ تھا جو تھوڑے دن میں انجام پا

جاتا' بلکہ اس میں گوئٹے کو سالہا سال داخلی اور خارجی مشکلوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھنا پڑے۔ اس کی زندگی کے چھ دور قرار دیئے جا سکتے ہیں' جنہیں ہم علاحدہ علاحدہ بیان کریں گے۔

پہلا دور بچپن اور عنفوان شباب کا ہے۔ فرانک فورٹ میں گوئٹے کی زندگی باپ کی سخت نگرانی میں' ماں کے دامن شفقت میں' بہن کے ساتھ پیار اور کھیل میں گزری۔ اس کا باپ خوشحال آدمی تھا مگر سادگی اور کفایت شعاری سے زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے اور بیٹی کو بڑے اہتمام سے گھر پر تعلیم دیتا تھا۔ گوئٹے دس برس کا تھا (1759ء) کہ فرانسیسیوں نے فرانک فورٹ پر قبضہ کر لیا اور شہر والوں کے گھروں میں جبراً فرانسیسی سپاہی اور افسر رکھے گئے۔ گوئٹے کے گھر میں بھی فرانسیسی افسر رہتے تھے۔ اس کا باپ شرم اور نفرت کے جذبات سے اس قدر مغلوب تھا کہ اس نے اپنے کمرے سے نکلنا چھوڑ دیا' مگر خاندان کے اور سب افراد ان فرانسیسیوں کی خوش مزاجی' تہذیب اور نفاست سے بہت خوش تھے اور ان کے ساتھ لطف سے وقت گزارتے تھے۔ اس طرح گوئٹے کے خیالات اور اس کے مذاق پر بچپن سے فرانسیسی اثر پڑا۔ 1765ء میں جب وہ لائپزش یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم پانے کے لئے بھیجا گیا' اس وقت وہ فرانسیسیوں کی تقلید میں سر سے پیر تک ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی وضع قطع میں' بات چیت میں' نشست و برخاست میں تکلف اور تصنع کی بھرمار تھی۔ لائپزش کے لوگوں پر بھی یہی رنگ چھایا ہوا تھا۔ یہاں گوئٹے کی زندگی سخت روحانی کوفت میں گزری۔ اس کی شاعرانہ طبیعت اپنے اور دوسروں کے اس طرز زندگی سے سخت بیزار تھی۔ علاوہ اس کے وہ یونی ورسٹی کے تنگ نظرانہ اور سطحی طرز تعلیم سے بہت گھبراتا تھا۔ ایک تو وہ خاموش اور حساس طبیعت رکھتا تھا اور ملنے جلنے سے پرہیز کرتا تھا اور دوسرے درسی مشقوں کو کوہ کندن اور کاہ برآوردن سمجھ کر ان سے جی چراتا تھا۔ اس لئے اس کے استادوں کو اس کی طرف کوئی توجہ نہ تھی۔ طالب علموں میں بھی اس کے دوست بہت کم تھے۔ اس کسمپرسی سے محبت کا بھوکا گوئٹے ہمیشہ ملول اور افسردہ رہا کرتا تھا۔ کچھ اس کے اثر سے اور کچھ نوجوانی کی بے راہ روی سے وہ ایک معمولی درجے کی عورت انیٹے شونے کوپف پر عاشق ہو گیا۔ اس زمانے میں اس نے بہت سی غنائی نظمیں لکھیں اور دو چھوٹے ڈرامے۔ لیکن اس کلام میں بھی وہی تصنع پایا جاتا ہے جو اس کی زندگی میں تھا۔ اس کو ابھی وہ راہ نہیں ملی تھی جسے

اس کی روح ڈھونڈتی تھی۔ اس کے حوصلے' اس کی آرزو' اس کے نصب العین میں اور اس کی واقعی زندگی میں جو تضاد تھا' اس نے گوئٹے کو عجب روحانی کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ عشق کے معاملے میں بھی اسے تھوڑے دن کے بعد مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ انیٹے سے اس کے تعلقات نہ نبھ سکے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ گوئٹے کی صحت روز بروز گرتی گئی' یہاں تک کہ آخر وہ سخت بیمار ہو کر 1768ء میں اپنے گھر فرانک فورٹ واپس آیا۔

یہاں وہ ڈیڑھ سال تک علالت کی حالت میں رہا۔ اس کی ماں کی دوست فرولائن فان کلیٹن برگ نے جو پائی ٹسٹ(2) (pietist) فرقے سے تعلق رکھتی تھی' بڑی دل سوزی سے اس کی تیمار داری کی۔ وہ چاہتی تھی کہ گوئٹے کو اپنے فرقے میں شامل کر لے۔ اس کی صحبت کے اثر سے گوئٹے کے دل میں مذہبیت کا جوش پیدا ہوا جو کسی نہ کسی صورت میں عمر بھر باقی رہا۔ مگر پائی ٹسٹ فرقے کے جذبات پرستانہ عقائد سے اس کی تسکین نہیں ہوئی۔ اس نے اس سلسلے میں سحرونیز نجات کی کتابوں کا مطالعہ کیا' لیکن اس کی نقادانہ اور محققانہ نظر نے بہت جلد دیکھ لیا کہ ان چیزوں کی کوئی اصلیت نہیں۔ پھر بھی فرولائن فان کلیٹن برگ کا وہ بہت ممنون احسان تھا اور اس نے اپنے ناول و لہیلم مائسٹر میں اس خاتون کی سیرت نہایت خوبی سے بیان کی ہے۔

گوئٹے کی زندگی کا دوسرا دور 1770ء سے شروع ہوتا ہے جب وہ اپنی تعلیم کو مکمل کرنے اسٹراس برگ گیا۔ یہ شہر فرانس کی سرحد پر واقع ہونے کے سبب سے لاپَرش سے بھی زیادہ فرانسیسی رنگ میں رنگا ہوا تھا' لیکن گوئٹے کی نظر میں اب زیادہ گہرائی پیدا ہو چکی تھی۔ یہاں اس نے اپنے ہم وطنوں کو اس اندھے پن سے وضع قطع' گفتگو اور خیالات میں فرانسیسیوں کی تقلید کرتے دیکھا تو اسے بے حد شرم آئی اور ان کی ضد پر اس کے دل میں جرمن قومی تمدن کی محبت کا جذبہ بیدار ہوا اور ہرڈر کی ملاقات گویا سونے پر سہاگا ہو گئی۔ ہرڈر نے گوئٹے کے دل میں قومیت کے جوش کو اور ابھارا' اسے اپنا قومی ادب کا نظریہ سمجھایا اور جرمن قومی شاعری اور جرمن طرز تعمیر کی خوبیوں کی طرف توجہ دلائی۔ گوئٹے پر ہرڈر کی شخصیت کا جتنا گہرا اثر پڑا' اتنا کسی کا نہیں پڑا اور جتنی عقیدت اسے اس سے تھی اور کسی سے نہیں ہوئی۔ باوجود اس کے کہ ہرڈر گوئٹے کے ساتھ برابر سختی' بے مروتی' ہمت شکنی' تضحیک کا برتاؤ کرتا رہا' گوئٹے کے دل میں ہمیشہ اس کے خیالات کا احترام رہا۔ بعض

لوگوں کا خیال ہے کہ گوئٹے نے فاؤسٹ میں شیطان کی جو تصویر کھینچی ہے' وہ ہرڈر اور اس کے ایک اور دوست میرک کے خط و خال سے مرکب ہے۔ اسٹراس برگ میں اور بھی کئی نوجوان ہرڈر کے خیالات سے متاثر ہوئے تھے اور ان سب نے مل کر ایک ادبی حلقہ قائم کیا تھا' جس نے جرمنی کی رومانی روح کو بیدار کرنے کے لئے 'طوفان و ہیجان' کی تحریک شروع کی' لیکن اس تحریک کا روح رواں گوئٹے ہی تھا۔ اسی کی بدولت رومانیت پروان چڑھی اور اسی نے اس کی کمزوریوں کو محسوس کر کے اس کی اصلاح کی۔

اسٹراس برگ میں بھی گوئٹے کے درد آشنا دل نے محبت کی چوٹ کھائی ۔ شہر کے قریب ایک خاندان رہتا تھا جس سے گوئٹے کی ملاقات تھی۔ صاحب خانہ کی بیٹی فریڈریکے بریون کے حسن نے گوئٹے کے دل کو موہ لیا۔ یہ محبت بالکل پاک تھی۔ اسی لئے گوئٹے پر اس کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ اس نے اپنی معشوقہ کو "فاؤسٹ" میں گریٹشن بنا کر اسے حیات جاودانی بخش دی۔ کشمکش آرزو سے نجات پانے اور راز معشوق کی پردہ داری کے خیال سے گوئٹے نے اس گھر میں آنا جانا ترک کر دیا۔ یہ رمیدگی اس کے عشق کی خصوصیت تھی اور کئی بار مختلف موقعوں پر ظہور میں آئی۔

جب گوئٹے 1771ء میں اپنی تعلیم ختم کر کے اور قانون کی سند لے کر اسٹراس برگ سے رخصت ہوا تو اس کے دل میں دو ڈراموں کا منصوبہ تھا۔ ایک تو "گوتس فان برلی شنگن" کا اور دوسرے "فاؤسٹ" کا۔ یہ دونوں سولھویں صدی کے جرمن کیریکٹر ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہرڈر کے اثر سے قومی ادب کا خیال گوئٹے کے دل میں کس قدر راسخ ہو چکا تھا۔

اب گوئٹے نے فرانک فورٹ میں وکالت شروع کی لیکن اس کا اصلی مشغلہ تصنیف و تالیف تھا۔ 1771ء میں اس کا ڈراما "گوتس" شائع ہوا۔ یہ جرمن ادب میں اپنی قسم کا پہلا ڈراما تھا۔ اس میں سولھویں صدی کے ایک اولوالعزم بانکے کا قصہ ہے' جو رسمی اخلاق کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں کرتا بلکہ اپنے ضمیر کے اخلاقی نصب العین کے ماتحت شجاعت اور مردانگی کے بڑے بڑے کار نمایاں انجام دیتا ہے۔ وہ شاہنشاہ اور دوسرے رئیسوں سے لڑ کر اپنے طبقے کی کھوئی ہوئی عزت حاصل کرتا ہے اور میدان جنگ میں تلوار کا زخم کھا کر ہنستے کھیلتے جان دیتا ہے۔ اس مشہور ڈرامے میں گوئٹے نے شیکسپیئر کی طرح تمام مسلمہ اصول فن توڑ

دیئے۔ اس نے اس میں صرف کیریکٹر نگاری کو مدنظر رکھا۔ داستان کے تسلسل اور اسٹیج کے قواعد کی کوئی پروا نہیں کی۔ جرمن پبلک نے بڑے زور شور سے اس کا خیر مقدم کیا اور اس مصنف کی شہرت تمام ملک میں پھیل گئی لیکن ہرڈر کی مشکل پسند طبیعت نے اسے پسند نہیں کیا اور اس نے گوئٹے کو بہت سرزنش کی اور لکھا کہ شیکسپیئر نے تمہیں خراب کر دیا۔

اس زمانے میں عشق نے پھر گوئٹے کی جراحت دل کی پرسش کی۔ وہ اپنے ایک دوست کی بیوی لوٹے کیسٹز پر دل و جان سے عاشق ہو گیا۔ لوٹے اس سے دوستانہ تلطف کا برتاؤ کرتی تھی لیکن اس کا ناز پاک دامنی گوئٹے کے نیاز عشق کو ہمیشہ رد کرتا تھا۔ شاعر نے اپنے قلب کی بے چینی کی تصویر شعر منثور میں کھینچی اور اس قصے کا نام "نوجوان ویرتھر کے مصائب" رکھا (1774ء)۔ ویرتھر ایک شادی شدہ حسینہ پر عاشق ہوتا ہے' اپنے جذبات مضطرب کا اظہار عاشقانہ خطوط میں کرتا ہے اور آخر درد فراق کی تاب نہ لا کر خودکشی کر لیتا ہے۔ یہ قصہ گوئٹے نے بے خودی کے عالم میں ایک مہینے میں ختم کیا۔ گوئٹے کی عمر کا یہ دور سراپا طوفان و ہیجان ہے اور ویرتھر اس کا سچا مظہر ہے۔ گوئٹے بہت کوشش کرتا تھا کہ وکالت کے پیشے میں جی لگائے' لیکن اس کا سیماب وش دل چین نہ لینے دیتا تھا۔ اس نے چاہا کہ ایک تاجر کی لڑکی سے شادی کر لے۔ نسبت بھی ہو گئی لیکن اختلاف معاشرت اور اختلاف مذاق کے سبب سے شادی کی نوبت نہ آئی۔

1775ء میں گوئٹے نے "فاؤسٹ" لکھا۔ ابتدائی شکل میں یہ 'طوفان و ہیجان' کا ڈراما تھا لیکن آگے چل کر کچھ اور ہی چیز بن گیا۔

اسی سال گوئٹے کو وامار کے نوجوان فرماں روا کارل آوگسٹ نے اپنا مشیر مقرر کر کے بلا بھیجا۔ گوئٹے بھی فرانک فورٹ کی پرآشوب زندگی اور مایوسی عشق کی تلخیوں سے عاجز آ گیا تھا۔ علاوہ اس کے وامار کے دربار میں جانے کی اسے امید تھی کہ وکالت کی محدود زندگی سے نجات پا کر جاہ و منصب' ثروت اور عزت حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔ اس لئے اس نے خوشی سے منظور کر لیا۔ نوجوان ڈیوک اور جوان شاعر میں کچھ دن قبل پہلی بار ملاقات ہوئی تھی اور انہیں ایک دوسرے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی۔ اسی کی بدولت گوئٹے کو کارل آوگسٹ کا قرب حاصل ہوا اور اس قرب سے عمر بھر کی سچی دوستی کی بنیاد پڑی۔ وامار میں گوئٹے کی زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا جس نے بتدریج اس کے مزاج

اور اس کی سیرت میں عظیم الشان تبدیلی پیدا کی۔ درباری زندگی کی دلچسپیوں اور مصروفیتوں کے سبب سے بہت دن تک اس کی شاعرانہ تخلیق کا سرچشمہ بند رہا لیکن گوناگوں تجربوں کی بدولت سطح کے نیچے آب حیات کا خزانہ جمع ہوتا رہا جو آگے چل کر ابلا اور بحر زخار بن کر ابلا۔

فرانک فورٹ ہی میں گوئٹے نے اپنا ڈراما 'ایگمونٹ' شروع کر دیا تھا' مگر یہ وا مار جانے کے بارہ برس بعد 1787ء میں ختم ہوا۔ یہ ایک امیر کا قصہ ہے جو ایک نیچے طبقے کی عورت پر عاشق تھا۔ اس کی راہ میں ہزاروں خطرے تھے مگر اسے کسی کا احساس نہیں ہوا یہاں تک کہ آخر وہ ورطہ ہلاکت میں غرق ہو گیا۔ اس قصے میں گوئٹے کا ڈیمون (Demon) کا نظریہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ انسان کی سیرت کا لاشعوری عنصر ہے جو حرکت اور تخلیق کی قوت کا خزانہ ہے۔ اس کی بدولت انسان زندگی کی سنگلاخ راہوں میں بے جانے بوجھے' بے دیکھے بھالے' آگے بڑھا چلا جاتا ہے' چاہے جو انجام ہو۔ اس نئے رومانی دور میں گوئٹے اس کا قائل ہے کہ آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو اس مخفی قوت کے ہاتھ میں چھوڑ دینا انسان کی نجات کا باعث ہے۔ ان دنوں اس کی تصانیف پر بلکہ اس کی ساری زندگی پر بے خبری کا رنگ چھایا ہوا ہے۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں وا مار آنے کے بعد چند سال تک گوئٹے دربار کی لاابالی زندگی اور ہم سن اور ہم مشرب احباب کی پرلطف صحبتوں میں ایسا ڈوبا رہا کہ اسے سوا چھوٹی چھوٹی ہنگامی چیزیں لکھنے کے تصنیف و تالیف کا بالکل موقع نہیں ملا۔ ڈیوک کارل آوگسٹ ان دنوں عہد شباب کی رندی و سیہ مستی کی داد دے رہا تھا۔ گوئٹے اس کی بزم عشرت میں شمع فروزاں بن کر پہنچا۔ سفر میں' حضر میں' دربار میں' شکار میں وہ ڈیوک کے ساتھ رہتا تھا اور اپنی طبیعت کی رنگینی' شوخی اور اپج سے عیش و مسرت کی نئی نئی راہیں نکالتا تھا۔ مگر اس کی روح اس زندگی سے مطمئن نہ تھی۔ مبداء فیاض نے اسے جو جوہر قابل عطا کیا تھا' وہ نشو و نما کے لئے بے چین تھا۔ اس کے دل میں جوش جوانی اور احساس فرض' آرزوئے عیش اور تمنائے تخلیق میں شدید کشمکش تھی۔

اس روحانی تلاطم میں گوئٹے کی دستگیری اس چیز نے کی جو بہتوں کو گرداب بلا میں مبتلا کرتی ہے یعنی عشق و محبت نے۔ فراؤفان اشٹائن نے جو ریاست وا مار کے ایک عہدہ دار

کی بیوی تھی حسن صورت اور جمال سیرت کی موہنی سے جوان شاعر کے دل کو موہ لیا۔ یہ خاتون گوئٹے سے عمر میں بڑی تھی۔ وقار' متانت' نفاست' مذاق' اصابت رائے اور حسن تدبیر میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ کچھ اس کی واقعی صفات اور شاعر کے تخیل کی کمال بینی (Idealization) غرض گوئٹے اسے صنف نسوانی کا کامل نمونہ سمجھتا تھا۔ ان دونوں کی محبت برسوں تک افلاطونی عشق کی حد سے آگے نہیں بڑھی۔ گوئٹے اس سے کاروبار میں تصنیف و تالیف میں غرض ہر چیز میں مشورہ لیتا تھا اور اس کے مشورے پر عمل کرتا تھا۔ جوش جوانی کے تقاضے سے وہ روحانی ارتباط کے علاوہ جسمانی وصل کا بھی طالب تھا' مگر اس کی معشوقہ مدتوں ان پیارے حیلوں سے جنہیں پاک دامن اور شائستہ عورتیں ہی خوب جانتی ہیں' ٹالتی رہی۔ آخر گوئٹے کے دل کی مراد پوری ہوئی۔ اگرچہ بعض دقتوں کی وجہ سے نکاح نہ ہو سکا' مگر دونوں کے تعلقات اسی قدر گہرے اور استوار تھے جیسے میاں بیوی کے ہوتے ہیں اور آخر عمر تک ایسے ہی رہے۔

فراوفان اشٹائن کے اثر سے گوئٹے کی سیرت میں عظیم الشان انقلاب ہو گیا۔ اس نے اپنی لاابالی زندگی بالکل ترک کر دی اور وہ ضبط نفس حاصل کیا جس پر زاہدوں کو بھی رشک آئے۔ وہ محنت' فرض شناسی' کفایت شعاری اور پابندی اوقات کا پتلا بن گیا۔ جو انتظامی فرائض اس کے سپرد تھے' ان سے اس کی طبیعت کو ذرا بھی مناسبت نہ تھی۔ لیکن طبیعت پر انتہائی جبر کر کے اس نے محنت اور دیانت سے اپنے فرائض انجام دینا شروع کئے۔ اسے وا مار کی رعایا کی بہبودی کا سوتے جاگتے ہر وقت خیال رہتا تھا اور اس کے لئے وہ نت نئی تدبیریں سوچتا تھا اور ان پر مستعدی اور تن دہی سے عمل کرتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس کی سعی سے ملک کے نظم و نسق میں کوئی دیرپا خارجی نتائج حاصل نہیں ہوئے' مگر اس میں اس کا قصور نہ تھا اور پھر یہ فائدہ کیا کم ہے کہ خود گوئٹے کی سیرت میں اس علمی جدوجہد سے پختگی اور یک سوئی پیدا ہوگئی اور اسے انسانی زندگی میں وہ بصیرت حاصل ہو گئی' جو بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس نے نوجوان ڈیوک کی تربیت اور اصلاح کی کوشش شروع کی جو ابتدا میں تو بالکل کامیاب نہیں ہوئی' لیکن اس کے انتہائی استقلال کی بدولت آخر میں اپنا اثر دکھا کر رہی۔ مدبر کی حیثیت سے گوئٹے نے وا مار کو کوئی نمایاں فائدہ نہیں پہنچایا' لیکن معلم کی حیثیت سے اس نے وا مار کے فرماں روا کو رند لاابالی سے فرض شناس

اور خوش تدبیر حکمران بنا دیا۔

اس عرصے میں اس کی تصنیف بہت محدود رہی۔ زیادہ تر توجہ غنائی شاعری کی طرف تھی۔ دو ڈرامے 'افی گینیا' اور 'ٹاسو' اس نے شروع کئے مگر انہیں ختم نہ کر پایا۔ ان ڈراموں کے جو حصے اس نے اس زمانے میں لکھے' ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کا شاعرانہ عقیدہ بدل چلا ہے۔ وہ انسان کے فطری جوش طبیعت کا قائل ہے لیکن اخلاق و تمدن کے ضابطوں کی روحانی قوت بھی اسے نظر آنے لگی ہے۔ اسے یہ احساس پیدا ہو چلا ہے کہ ان دونوں چیزوں میں امتزاج کی ضرورت ہے' لیکن ابھی اس امتزاج کی کوئی شکل اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کے لئے اسے کسی خارجی اثر کی ضرورت ہے مگر یہ اثر جرمنی میں نہیں ملتا۔ خدا جانے کیا بات ہے کہ اس کا دل خود بخود اطالیہ کی طرف کھنچ رہا ہے۔

1786ء کے آغاز میں گوئٹے کی طبیعت بہت بے چین ہے۔ اپنی شاعرانہ قوت تخلیق کے رک جانے کا اسے بے حد صدمہ ہے۔ وہ سمجھ گیا ہے کہ انتظامی کام اس کے بس کا نہیں۔ بے دلی سے کام کرنا اسے گوارا نہیں۔ وہ رسیاں تڑا کر بھاگنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی کمزور طبیعت کا آدمی ہوتا تو خدا جانے کب تک اس حیص بیص میں رہتا مگر گوئٹے کی طبیعت کمزور نہیں۔ اس میں بلا کی قوت ہے جو پچھلے چند سال کی باضابطہ زندگی کی بدولت اور پختہ ہو گئی ہے۔ وہ جلد فیصلہ کرتا ہے کہ مجھے اطالیہ کا سفر کرنا چاہئے اور ڈیوک سے اجازت لے کر اپنے دوستوں سے مشورہ کئے بغیر چل دیتا ہے۔

اطالیہ میں اس کا قیام دو سال سے زیادہ رہا۔ اس ملک میں اسے وہ چیز مل گئی جسے اس کا دل مدت سے ڈھونڈتا تھا۔ یہاں کی خوشنما پرانی عمارتوں میں' یہاں کے عجائب خانوں میں' یہاں کی آرٹ گیلریوں میں اسے قدیم یونانی رومی تمدن کے نمونے اور کلاسیکی روح کے مجسمے ملے۔ یہاں آکر اسے معلوم ہوا کہ انسان نے کس طرح اپنی فطرت کے ابھار' اپنی طبیعت کی اپج کو ترتیب اور ہم آہنگی کے ضابطوں سے جکڑ کر خوشنما اور مفید بنایا تھا' کس طرح طوفان و ہیجان کو اخلاقی اور مدنی اصولوں کے پشتوں سے قابو میں لا کر راہ پر لگایا تھا۔ اطالیہ میں آکر گوئٹے کی زندگی کا چوتھا دور شروع ہوا جو اصل میں اس کی شاعرانہ تخلیق کا آغاز تھا۔ زندگی کے مطالعے کے لئے اسے جس بصیرت کی حاجت تھی' وہ مل گئی۔ اس کے دھندلے خیالات واضح ہو گئے' اسے اپنا نصب العین صاف نظر آنے لگا۔

علاوہ اس کے فرحت بخش جنوبی آب و ہوا میں سکون و تنہائی کی زندگی بسر کرنے سے گوئٹے کو اپنی پچھلی زندگی پر تبصرہ اور آئندہ زندگی کی تیاری کرنے کا موقع ملا۔ یہاں اس نے اپنی کل پرانی تصانیف پر نظر ثانی کی۔ "ایگمونٹ" جو اس کی بے خودی اور وارفتگی کے عہد کی یادگار تھا' ختم کیا۔ 'افی گینیا' جو اس کے ہوش اور خود داری کے دور کی تمہید تھی' مکمل کی۔ 'ٹاسو' کا اکثر حصہ اور "فاؤسٹ" کے کچھ سین لکھے۔ "فاؤسٹ" کا جو خاکہ اس کے ذہن میں تھا' وہ بالکل بدل گیا۔

'افی گینیا' کا قصہ ایک قدیم یونانی روایت پر مبنی ہے۔ مشہور یونانی شاعر یوری پیڈیس نے بھی اس پر ڈراما لکھا ہے۔ یہ ایک بہادر اور عقل مند لڑکی کی کہانی ہے جو اپنے باپ کے قول کو پورا کرنے اور اپنے ملک کی مدد کے لئے آرٹیمس دیوی کے مندر میں قربان کئے جانے پر تیار ہو گئی مگر اپنی دانشمندی اور دیوی کی مدد سے اس نے اپنی جان بھی بچا لی اور اپنے ملک کی لاج بھی رکھ لی۔ اس ڈرامے میں گوئٹے نے کلاسیکی طرز ادا کو اس خوبی سے نبھایا ہے کہ یہ قدیم یونانی طرز کے بہترین ڈراموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ مضمون کے اعتبار سے بھی یہ قصہ شاہد ہے کہ اب گوئٹے مذہب و اخلاق کو جس کا وہ ابتدائی دور میں مخالف تھا' اور ہی نظر سے دیکھتا ہے۔

'ٹاسو' میں اگرچہ گوئٹے نے جدید عہد کے ایک شاعر کا قصہ لکھا ہے' لیکن ہر اعتبار سے یہ ڈراما بھی کلاسیکی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ شاعر کی بے چین اور حساس طبیعت' اس کی عاشق مزاجی' اس کے والہانہ جوش' اس کی شہرت پسندی' اس کی رقابت کی تصویر دکھانے میں گوئٹے نے کمال کر دیا ہے۔ 'ٹاسو' کے حریف مدبر کا کیرکٹر بھی بالکل حقیقت پر مبنی ہے۔

اصل میں اس ڈرامے میں گوئٹے یہ اعتراف کرتا ہے کہ شاعر اپنی نازک مزاجی' اپنی زود رنجی' اپنی لطافت طبع کے باعث عملی زندگی کی سختیوں اور ناہمواریوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور اس کی کشتی حیات ان چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے۔

1788ء میں اطالیہ سے واپسی کے بعد گوئٹے نے انتظامی اور عملی کاموں میں حصہ لینا کم کر دیا اور آہستہ آہستہ تخیل اور تفکر کے کنج عزلت میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ جو خدمتیں اس نے اپنے ذمے لیں بھی' وہ ایسی تھیں جن سے اس کی طبیعت کو خاص مناسبت تھی۔ کچھ دن وہ وزیر تعلیم رہا اور مدتوں دربار کے تھیٹر کا منتظم۔ 1789ء میں گوئٹے نے 'ٹاسو'

ختم کر لیا۔ دوسرے سال اس کی اس وقت تک کی تصانیف کا مجموعہ شائع ہوا' جن میں فاؤسٹ بھی Fragment (ایک ناتمام ٹکڑے) کے نام سے شامل تھا۔

یہ انقلاب فرانس کا زمانہ تھا۔ گوئٹے کو ابتدا میں اس تحریک سے بڑی ہمدردی تھی۔ اپنی طرز معاشرت کے لحاظ سے وہ امارت پسند تھا لیکن اس کو عوام کے طبقے سے بڑی محبت تھی۔ ابھی تک اس کے دل سے طوفان و ہیجان کی یاد محو نہیں ہوئی تھی جس کا نعرۂ جنگ "آزادی" تھا۔ فرانس کے عوام کو امرا کے جبر و استبداد سے آزاد ہوتے دیکھ کر اسے بڑی خوشی ہوئی۔ جب نپولین نے ریاست پروشن (Prussia) سے جنگ چھیڑی' تب بھی گوئٹے کی ہمدردی اس اولوالعزم فاتح کے ساتھ تھی۔ وا مار نے جب وطن کے جوش میں پروشن کا ساتھ دیا' تو گوئٹے کو بڑا صدمہ ہوا۔ اسے اپنے ملک سے جتنی محبت تھی وہ کم لوگوں کو ہو گی' لیکن وہ سمجھتا تھا کہ نپولین نے تمام یورپ کو آزاد کرانے اور ایک نئے اور اعلیٰ تمدن کی بنیاد رکھنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ وا مار میں کوئی اس معاملے میں اس کا ہم خیال نہ تھا' اس لئے اس کی دلچسپی انقلاب سے رفتہ رفتہ کم ہو گئی اور وہ حکیمانہ بے تعلقی سے اس کی نشو و نما کا مطالعہ کرنے لگا' لیکن نپولین سے اسے ہمیشہ عقیدت رہی۔

ان دنوں وا مار میں ایک نوجوان شاعر آیا ہوا تھا جو جرمنی کے آسمان سخن پر گوئٹے کے پہلو بہ پہلو چمکنے والا تھا۔ شلر' جس کا نام آج تک گوئٹے کے نام کے ساتھ لیا جاتا ہے' افتاد طبیعت' شاعرانہ عقائد' طرز ادا غرض ہر چیز میں گوئٹے سے مختلف تھا۔ سن رسیدہ گوئٹے خود دار' بھاری بھرکم' صابر اور دوراندیش تھا اور نوجوان شلر نے بے تکلف' گرم جوش' جلد باز اور ناعاقبت اندیش۔ شلر صرف شاعر نہ تھا بلکہ اس نے تاریخ اور فلسفے کا بھی عالمانہ مطالعہ کیا تھا۔ فلسفے میں وہ کانٹ کا پیرو تھا اور جمالیات کے شعبے میں اس نے کانٹ کے خیالات کو بنیاد قرار دے کر بڑے گہرے اور بصیرت افروز مقالے لکھے ہیں۔ اپنی شاعری میں بھی وہ ایک حد تک فلسفیانہ اصول کا پابند تھا اور منطقی تحلیل سے جس حد تک شاعر کام لے سکتا ہے' لیتا تھا۔ گوئٹے رسمی فلسفے سے زیادہ دلچسپی نہ رکھتا تھا' لیکن اس کی فطری ذہانت' اس کی وسیع نظر' اس کے گہرے مطالعے' اس کے طویل تجربے نے اسے فلسفہ زندگی میں وہ بصیرت بخشی تھی جو شلر تو کیا عہد جدید کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ پھر ہمہ گیری کے اعتبار سے بھی شلر کو اس سے کوئی نسبت نہ تھی۔ مجرد فلسفہ نہ سہی لیکن سائنس کے ہر شعبے میں اور

دوسرے علوم و فنون میں گوئٹے اہل فن کا سا دخل رکھتا تھا۔ تاہم اس نے شلر کی طرح شاعری کی بنیاد فلسفے پر نہیں رکھی تھی بلکہ فلسفے کی شاعری پر۔ وہ فلسفے کی عینک سے زندگی کا مطالعہ نہیں کرتا تھا' بلکہ شاعر کی نظر سے اس کا مشاہدہ کر کے فلسفیانہ نتائج حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جو لوگ شاعری کی حقیقت سے واقف ہیں' انہیں یہ تسلیم کرنے میں تامل نہ ہو گا کہ گوئٹے کا اصول صحیح ہے اور شلر کا غلط۔ ان دونوں کی شاعری خود اس کی روشن دلیل ہے۔ شلر کا کلام زور' صفائی' چستی کے لحاظ سے نہایت قابل قدر ہے' لیکن اس میں وہ گہرائی نہیں جو گوئٹے کے یہاں پائی جاتی ہے۔ شلر کا کوئی ڈراما فلسفیانہ نہیں کہا جا سکتا۔ گوئٹے کا فاؤسٹ دنیا کی بلند ترین فلسفیانہ نظموں میں شمار ہوتا ہے۔

شلر کو گوئٹے سے ملنے کی بڑی آرزو تھی۔ کچھ اختلاف طبیعت' کچھ عزلت پسندی' کچھ رشک کے سبب سے بہت دن تک کتراتا رہا۔ آخر دونوں میں ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا۔ آہستہ آہستہ انہیں ایک دوسرے کی قدر و قیمت کا اندازہ ہونے لگا۔ 1794ء تک اس دوستی کی بنیاد مضبوط ہو چکی تھی اور باہمی تاثیر و تاثر کا وہ سلسلہ شروع ہو چکا تھا' جس نے دونوں کا حوصلہ بڑھایا اور دونوں کے کلام میں چار چاند لگا دیئے۔

شلر کی دوستی سے گوئٹے کی زندگی کا پانچواں دور شروع ہوتا ہے اور یہی دور اس کی شاعری اور معنی آفرینی کا زریں عہد ہے۔ شلر کے جوش جوانی اور حوصلہ مندی نے گوئٹے کے دل میں شاعری کی دبی ہوئی آگ کو ابھارا اور اسی کے مشورے اور اصرار سے گوئٹے نے ان معرکہ آرا تصانیف کو پھر ہاتھ لگایا' جنہیں وہ مدت سے چھوڑ چکا تھا۔ اب شلر' گوئٹے کا ادبی مشیر بن گیا اور اسی کے اثر سے گوئٹے کو اپنی تصنیف میں تنقید اور تنظیم کی طرف زیادہ توجہ ہوئی۔ اب تک اس کی طبیعت ایک پہاڑی ندی کی طرح بے قید تھی اور جدھر من کی موج ہو' ادھر بہتی تھی۔ اب اس نے اسے ایک نہر کی طرح سوچ سمجھ کر معینہ راستوں پر لے جانے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کیف و کم دونوں کے لحاظ سے اس کی تصنیف نے بہت ترقی کی۔ اب وہ زندگی کے منفرد پہلوؤں کی مصوری سے آگے بڑھ کر مجموعی انسانی زندگی کا نقاش بن گیا۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب "ولیلم مائسٹر کا زمانہ شاگردی" ہے۔ کسی زمانے میں اس نے ایک نوجوان کا قصہ لکھا تھا' جو تھیٹر کی تماشاگری کو اپنا پیشہ بنانا چاہتا ہے اور برسوں اس کوچے میں سرگرداں رہ کر عجیب و غریب تجربات حاصل کرتا ہے۔ اب گوئٹے

نے اس قصے کو دوبارہ لکھا اور ایک شاہکار بنا دیا' جس کا جواب اگر جرمن ادب میں مل سکتا ہے تو 'فاؤسٹ' ہی ہے۔ اب یہ گوئٹے کے فلسفہ زندگی اور فلسفہ تعلیم کا آئینہ بن گیا۔ اس میں گوئٹے نے یہ دکھایا کہ سچی تعلیم وہ ہے جو انسان زندگی کی سختیاں جھیل کر اور ٹھوکریں کھا کر حاصل کرتا ہے' بہ شرطیکہ اس کی آنکھیں کھلی ہوں۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ تنقید کا شوق گوئٹے کو شلر نے دلایا تھا۔ گوئٹے جو زندگی کے مدرسے سے حکمت و بصیرت کی سند لے چکا تھا' اب اس طرف متوجہ ہوا کہ دوسروں کو راہ دکھائے اور تعلیم دے۔ شلر نے 'ینا' سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا تھا۔ گوئٹے نے اس میں تنقیدی اور طنزیہ مضامین لکھے۔ ان میں فن تنقید کے وہ باریک نکتے بیان کئے گئے ہیں' جن کی مثال جرمنی میں کیا' دنیا کے ادب میں ملنا مشکل ہے۔

یہ چیزیں تو نثر میں تھیں۔ نظم میں گوئٹے نے وہ پیاری کتاب "ہرمان اور ڈوروتھیا" لکھی جو خیالات کی پختگی اور طرز ادا کی سادگی کے لحاظ سے ہومر اور فردوسی کے کلام کی طرح سہل ممتنع کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں دیہات کی سیدھی سادی زندگی اور دو پاک اور بھولی روحوں کے باہمی عشق کی تصویر ہے جس کا ہر رنگ دل کش اور خط اثر آفریں ہے۔ اس کے اس عہد کے چھوٹے چھوٹے ڈراموں اور غنائی شاعری میں بھی کلاسیکی رنگ چھایا ہوا ہے۔

ان چیزوں کے ساتھ گوئٹے 'فاؤسٹ' پر بھی نظر ثانی کرتا رہا۔ اس کی ہمہ گیر طبیعت ایک وقت میں ایک چیز پر قناعت نہ کرتی تھی۔ ایک ہی وقت میں وہ نہ صرف مختلف ادبی کام کرتا تھا بلکہ طبیعات' نباتیات' معدنیات وغیرہ کا نظری مطالعہ اور عملی تجربہ کرتا رہتا تھا۔ اسی کے ساتھ نقاشی اور دوسرے فنون لطیفہ کا شغل بھی رہتا تھا۔ اس سرسری خاکے میں ہم گوئٹے کو صرف ادیب کی حیثیت سے دکھانا چاہتے ہیں' ورنہ وہ تو ایسا جامع حیثیات شخص تھا کہ اس کی زندگی علم النفس کے ماہروں کے نزدیک ایک معما ہے۔ اس کی جتنی سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں' ان میں سے کسی کو اٹھا کر دیکھئے تو ذہن انسانی کی وسعت اور ہمہ گیری کا حیرت انگیز نمونہ نظر آتا ہے۔

گوئٹے اور شلر کی دوستی کا یہ دور حکم قضا سے بہت جلد ختم ہو گیا۔ شلر 1805ء میں سن کہولت کو پہنچنے سے پہلے دنیا سے رخصت ہو گیا۔ گوئٹے کو اس کے مرنے کا اتنا صدمہ ہوا

کہ اس کی فطری شیفتگی ہمیشہ کے لئے مرجھا کر اور اس کی خلقی امنگ ہمیشہ کے لئے دب کر رہ گئی۔ اس کی عزلت پسندی اب اور بھی بڑھ گئی۔ 1806ء میں اس نے اپنی ایک وفادار خادمہ سے نکاح کر لیا اور خارجی دنیا سے قریب قریب قطع تعلق کر کے اپنی تخیل اور تفکر کی دنیا میں، جو ظاہر میں محدود مگر اصل میں کل کائنات سے زیادہ وسیع ہے، محو ہو گیا۔

مگر یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ گوئٹے کی ادبی اور علمی جدوجہد ختم ہو گئی۔ اس نے اپنی نصف صدی کی زندگی میں تجربے اور مشاہدے کا اتنا بڑا خزانہ جمع کر لیا تھا اور تندہی اور محنت کی ایسی پختہ عادت ڈال لی تھی کہ اس کی عمر کے بقیہ پچیس برس میں تصنیف و تالیف کا مشغلہ بدستور جاری رہا۔

گوئٹے کی عمر کا یہ آخری دور غالباً انسانی زندگی کے مبصر اور ادبی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کے لئے سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ اس میں ہمیں ایک پیر دانشمند کی تصویر نظر آتی ہے جو زندگی کے نشیب و فراز دیکھ چکا ہے، جو اپنی فطری بے چینی، اپنی بے قید قوت تخلیق، اپنی بے روک جذبات پرستی کو ضبط و انضباط، اصول و قواعد، عقیدے اور نصب العین کے قابو میں لا چکا ہے، اپنے ملک کے ادب کے رومانی جوش و خروش کو کلاسیکی ترتیب و ہم آہنگی کے سانچے میں ڈھال چکا ہے، اپنی قوم کے مزاج کی وحشت اور شورش کو تنظیم اور تہذیب کی راہ دکھا چکا ہے اور اب سکون و اطمینان سے بیٹھ کر اپنے کام پر نظر ثانی کر رہا ہے۔ وہ اپنے گھر سے باہر بہت کم نکلتا ہے لیکن اس کا گھر اہل علم و ارباب ادب کا مرجع ہے۔ لوگ آتے ہیں اور اس کے فیض سخن، اس کی حکمت و بصیرت سے مالا مال ہو کر جاتے ہیں سارے جرمنی، بلکہ سارے یورپ کی ادبی نشو و نما اس کے پیش نظر رہتی ہے۔ وہ تنقید اور بزرگانہ مشوروں سے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی کوششوں کو سیدھی راہ پر لگاتا رہتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ رومانی تحریک، جسے وہ دبا چکا تھا، اب پھر نئی نسل میں ابھر رہی ہے مگر وہ اس سے خفا نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے، شباب کا گرم خون "طوفان و ہیجان" بن کر ابلتا رہے گا۔ مگر اسے یہ بھی یقین ہے کہ جیسے اس نے رومانی زندگی کی تپ مدتوں سہہ کر آخر میں ضبط و انضباط کی تبرید کی قدر پہچانی، اسی طرح دوسرے بیمار بھی کریں گے اور انہیں اپنے علاج میں اس کے نسخوں سے بڑی مدد ملے گی۔ رومانیت کی دوا مل جانے سے وہ اتنا مطمئن ہے کہ اس عمر میں بھی کبھی کبھی یہ درد مول لیتا ہے اور اس کے سوز و ساز کا

لطف اٹھاتا ہے۔

گوئٹے کی متعدد بہترین تصانیف اسی دور میں لکھی گئیں یا شائع ہوئیں۔ 1808ء میں اس نے "فاؤسٹ" کا پہلا حصہ شائع کیا۔ اس کے کچھ سال بعد اس نے "مشرقی مغربی دیوان" لکھا۔ یہ اس کی متعدد غنائی نظموں کا مجموعہ ہے' جو اس نے ایرانی شعرا خصوصاً حافظ کے کلام سے متاثر ہو کر لکھا۔ اسی کے جواب میں اقبال نے "پیام مشرق" لکھا تھا۔ اس کتاب نے جرمنی کے شاعرانہ حلقوں میں ہل چل ڈال دی۔ اس کی تقلید میں رومانی شاعروں نے متعدد کتابیں لکھیں اور شرقیات ایک مستقل شعبہ ادب بن گئی۔

اب گوئٹے نے پھر نثر کی طرف توجہ کی۔ "انتخابی رشتے" جو اصول فن کے لحاظ سے اس کا سب سے مکمل ناول ہے' اسی عہد کی تصنیف ہے۔ یہ عورت اور مرد کے عشق کا نفسیاتی مطالعہ ہے۔ ایک میاں بیوی کا جوڑا جن کی طبیعتوں میں باہم مناسبت نہیں ہے' احساس فرض کے سبب سے کچھ دن ایک دوسرے کے ساتھ نباہ کرتا ہے مگر آخر میں میاں اپنی ایک عزیز لڑکی پر اور بیوی میاں کے ایک دوست پر عاشق ہو جاتی ہے۔ پاس آبرو اور اخلاقی قانون انہیں زنجیروں میں جکڑ کر رکھتا اور ان کی زندگی کو برباد کر دیتا ہے۔ اس میں گوئٹے نے سماج کو انفرادی روح کی فریاد سنائی ہے لیکن اخلاقی قانون کی زور شور سے حمایت کی ہے۔ اس کا مقابلہ "ویرتھر" سے کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب گوئٹے کا عقیدہ زندگی کتنا بدل چکا تھا۔

اس کے بعد گوئٹے نے "ولہیلم مائسٹر" کا دوسرا حصہ "ولہیلم مائسٹر کا زمانہ سیاحی" کے نام سے لکھا۔ اس میں اس نے دکھایا ہے کہ ایک شخص جو جوانی میں "طوفان و حوادث" کے "مکتب" میں تعلیم حاصل کر چکا ہے' کیوں زندگی کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے اور اپنی قوم کی تنظیم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ "فاؤسٹ" کے دوسرے حصے کی طرح یہ بھی گوئٹے کے فلسفہ حیات کا دستور العمل ہے۔ تعلیم کے متعلق جو گہرے خیالات اس میں ظاہر کئے گئے ہیں' وہ آج تک معلموں کے لئے سبق آموز ہیں۔

جب گوئٹے کی کتاب زندگی ختم ہونے کو آئی تو اسے اپنی سوانح عمری لکھنے کا خیال آیا۔ "شاعری اور حقیقت" کے نام سے اس نے اپنے عہد شباب کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے۔ یہ صرف اس کی ابتدائی زندگی کی تصویر نہیں ہے بلکہ طوفان و ہیجان کی ادبی تحریک کا

مرقع ہے۔ افسوس ہے کہ اسے اس کتاب کے ختم کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ورنہ ہمارے سامنے گوئٹے کی پوری زندگی کی کہانی خود اس کی زبانی موجود ہوتی۔

گوئٹے کی آخری تصنیف 'فاؤسٹ' کا دوسرا حصہ ہے۔ اسے اس نے 1831ء میں ختم کیا اور دوسرے سال 83 برس کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

حواشی

1- German : Preussen, English : Prussia

2- جرمنی میں ایک مذہبی فرقہ تھا جو سترہویں صدی میں قائم ہوا۔ یہ لوگ 'پروٹسٹنٹ' مذہب کی انتہائی عقلیت اور خشکی کو تصوف اور جذبات پرستی کی چاشنی سے دور کرنا چاہتے تھے۔

(فاؤسٹ' حصہ اول۔ مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین' دہلی : مکتبہ جامعہ' طبع ثانی 1982ء' طبع اول 1931ء)

فضل حمید

گوئٹے۔ اُس کا فلسفہ

جان وولف گانگ گوئٹے 18 اگست 1749ء میں فرانک فورٹ ام مین میں پیدا ہوا اور جرمنی کے تاریخی شہر وائمر میں مدفون ہوا۔

گوئٹے نے ابتدائی تعلیم اپنے باپ سے حاصل کی۔ اس کا باپ ایک سخت گیر، خشک مزاج قانون دان تھا اور اس کی ماں کے مزاج میں خوش دلی اور شگفتہ مزاجی تھی۔ اس طرح اس کے گھر کے ماحول میں ایک طرح کا اعتدال پیدا ہو گیا تھا۔ گوئٹے میں ایک فرانسیسی ادبیات اور جمالیات سے لگاؤ فوجی افسروں اور تھیٹر کے تماشوں کے ذریعہ پیدا ہوا۔ سولہ سال کی عمر میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے وہ لائپ زگ گیا۔ یہاں اس کا وقت زیادہ تر لہو و لعب اور رنگ رلیوں میں گذرا۔ لائپ زگ میں ہی اسے فنون لطیفہ اور شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اس پر طرہ یہ کہ ایک مہ جبیں کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ بقول شیخ سعدی

"در عنفوان جوانی چناں کہ ا فتد دانی"

گوئٹے نے اس زمانے میں دو مختصر سے ڈرامے اور چند شوخ غنائی نظمیں لکھی تھیں۔ اپنی بے اعتدالیوں کی وجہ سے وہ بیمار ہو گیا اور یہیں سے وہ رد عمل شروع ہوا، جس نے اس کی آئندہ زندگی کی داغ بیل ڈالی۔ بیماری کے دوران میں اس کا رجحان مذہب اور علم الاخلاق کی طرف ہو گیا۔ حافظ کے کلام سے وہ بہت متاثر تھا۔ اس نے اپنے دیوان میں دیوان حافظ کا جواب تو نہیں لکھا، لیکن اظہار عقیدت اور تتبع ضرور کیا ہے۔ تصوف اور علم

باطن کے رموز و اسرار سے بھی اسے شغف ہو گیا تھا۔ اس کے کلام میں تصوف کا ایک ہلکا سا رنگ پایا جاتا ہے۔ اس رمز آگاہی کی جھلک "فاؤسٹ" کے ڈرامے میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ یہ درست نہیں کہ گوئٹے کو حافظ کے تصوف یا صوفیانہ تعبیروں سے کچھ لگاؤ نہ تھا اور وہ محض حافظ کے تغزل کا دلدادہ تھا۔

سٹراس برگ میں گوئٹے نے قانون کی ڈگری دو سال میں حاصل کی۔ اس کے بعد اسے علم طب کا شوق دامنگیر ہوا۔ گمان غالب یہ ہے کہ اسی زمانے میں کیمیا سے بھی دلچسپی ہوئی ہو گی یا کیمیا گروں سے سابقہ پڑا ہو گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جرمنی کے سائنس دانوں کو مہوسی کی کافی دحمت تھی۔ "فاؤسٹ" میں گوئٹے نے اس فن کا خوب مذاق اڑایا اور اس کی بے حاصلی اور زیاں کاری پر سخت طنز کیا ہے۔ افکار و خیالات کے اس تعمیری و ترکیبی دور میں گوئٹے نے ہلکے پھلکے علوم و فنون کو چھوڑ کر علم الحقائق سے وابستگی پیدا کی۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کا مطالعہ کیا۔ گاتھی آرٹ کی عظمت اور ہرڈر کی تنقیدی تصانیف سے متاثر ہوا۔ اس کے تاریخی ڈرامے گوئز (Goetz) اور المیہ افسانے ورتھر (Werther) کو قبولیت عام کا شرف حاصل ہوا اور سب نے اعتراف کیا کہ اس کی غنائی شاعری عظیم ترین مرتبے کی ہے اور یہ مان لیا کہ وہ جرمنوں کی رومانی بغاوت (Romantic Revolt) کا قائد ہے۔ 1775ء میں گوئٹے کو وائمر آنے کی دعوت دی گئی اور وائمر کی جرمن ریاست کے ڈیوک کارل آگسٹ نے اسے وزیر بنا دیا۔ وہ وقتاً" فوقتاً" مالیات' زراعت اور معدنیات کا وزیر رہا۔ اس زمانے میں اسے فرو فان اشائن سے محبت پیدا ہوئی اور یہ تعلق خاطر اس کی آئندہ زندگی اور افکار پر بہت اثر انداز ہوا۔ 1786ء میں گوئٹے اطالیہ چلا گیا' جہاں وہ دو سال تک روما کی فنی و علمی تاریخ اور تعمیرات کی عظمت و شان کا مطالعہ کرتا رہا۔ اسے وجدانی طور پر یہ احساس تھا کہ عہد عتیق اور فن قدیم میں جو پرسکون عظمت و شان ہے' وہ دور جدید کو میسر نہیں۔ اس شعور نے اس کے نظریات کو یکسر بدل ڈالا۔ "فاؤسٹ" میں دور جدید کے آرٹ پر جو تنقید ہے' وہ اسی احساس سے متاثر ہے۔ اطالیہ جا کر اسے یہ احساس ہوا کہ جرمن علوم اور افکار ابھی خام ہیں اور ان کی پختگی میں وقت لگے گا۔ گوئٹے نے 1806ء میں کرسٹائنے ولپائیس (Christiane Vulpius) کے ساتھ شادی کی اور اس کی رفاقت میں اپنی بقیہ عمر بسر کی۔ 1788ء سے آخر تک اس کی زندگی نیم عزلت گزینی کے

عالم میں گذری اس عرصے میں امور مملکت سے اس کا عملی تعلق تدریجاً کم ہوتا گیا۔ صرف سرکاری تھیٹر کی ہدایت و نگرانی کے فرائض وہ بیس سال تک سرانجام دیتا رہا۔

جرمن شاعر، ڈرامہ نویس اور مستند طبیب شلر (Schiller) سے گوئٹے کی دلی دوستی تھی۔ اپنی زندگی کے نہایت اہم سالوں میں وہ شلر کی صحبت اور فکری انگیخت سے بہت اثر پذیر ہوا۔ "ہرمین اور ڈوروتھی" (Hermann and Dorothea) اور "فاؤسٹ" (Faust) حصہ اول اسی دور کی یادگاریں ہیں۔ 1805ء کے بعد گوئٹے کی تصانیف یعنی دیوان، آٹو بایوگرافی (تذکرہ) کنور سیشنز (مکالمات) اور فاؤسٹ حصہ دوئم جاندار مگر متین قسم کی چیزیں ہیں، جنہیں ابداعی قوت اور تخیل کی ندرت کے لحاظ سے اس کے فنی کمال کا اوج حاصل نہیں۔ گوئٹے کا شاہکار "فاؤسٹ" حصہ اول ہے، جس نے شہرت دوام کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا اور لافانیوں کے زمرے میں داخل کر کے اسے ہومر، دانتے اور شیکسپیئر کا ہم پلہ بنا دیا۔ "فاؤسٹ" کے منظوم ڈرامے میں علم و حکمت اور جذبات کا ایک ایسا دلپذیر امتزاج ہے، جس کی بنا پر گوئٹے دنیا کے عظیم ترین شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔ گوئٹے نے زندگی کے ہر شعبے پر غائر نظر ڈالی ہے اور اس کی ہمہ گیر، ہمہ رس طبیعت کے اعجاز نے ہر اجمال و تفصیل میں تجزیاتی حقیقت شناسی کا جوہر پیدا کر دیا ہے۔ "فاؤسٹ" میں طنز و مزاح، تشبیہ و تمثیل، استعارہ و کنایہ، ہجو ملیح، ذم بالمدح، رنج و الم، حسرت و یاس، شفقت و بیدردی، رقت و سوز کے جذبات اور واردات کا اظہار اس قدر موثر انداز سے ہوا ہے کہ معلوم ہوتا ہے گوئٹے نے حسن بیان کے نگینے جڑ دیئے ہیں۔ کہیں کہیں غیر فصیح، مبتذل اور عامیانہ باتیں بھی پائی جاتی ہیں، مگر اس کے کمال فن نے انہیں بھی اظہار حقیقت کے لحاظ سے بلیغ بنا دیا ہے۔ گوئٹے نے فطرت انسانی کی پستیوں، نااستواریوں اور زندگی کی تلخ نابکاریوں کا نقشہ ایسے دلپذیر انداز سے کھینچا ہے کہ پڑھنے والا بے اختیار یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ لغزشیں، یہ خطائیں، یہ مصیبتیں گویا خود اسی سے سرزد ہوئی تھیں یا ہونے والی ہیں۔ بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ اس واقعہ نگاری میں گوئٹے نے اپنی فطری سادگی و سادہ دلی اور انسانی ہمدردی و خیر اندیشی کے محرکات اور عواطف کو فراموش نہیں کیا اور یاس و المناکی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بھی انسان کو سعادت و فلاح کی کرن نظر آ جاتی ہے اور مجبوراً انسان کی نجات کا عقیدہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔

گوئٹے کے فلسفے کا جامع اجمالی بیان مشکل ہے۔ اس کا ہزار شیوہ فکر اپنی بداعی اور تخلیقی قوتوں کی ہمہ رنگی کے ساتھ کسی خاص مسلک کا پابند نہیں ہو سکتا تھا۔ جس طرح زندگی ایک ہمہ رنگ رواں دواں حقیقت ہے' جسے کسی تنگ جادۂ تخیل کا پابند نہیں بنایا جا سکتا' اسی طرح گوئٹے کے فکری نظریات اور احساسات بھی کسی ایک دائرے میں مقید نہیں ہو سکتے۔ فطرت انسانی کی استعداد' طبعی رجحانات خیر و شر اور فلاح و نجات کے مسائل خصوصیت کے ساتھ گوئٹے کے پیش نظر ہیں۔ اس سلسلے میں اس نے شیطان کے تصور سے بڑا کام لیا ہے۔ میفسٹو فیلس (جس کا ترجمہ میں نے خناس کیا ہے) جرمن دیو مالا کا شیطان ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گوئٹے نے ارادی طور پر شیطان یا ابلیس کا لفظ استعمال نہیں کیا تاکہ ابلیس کے انجیلی تضمنات و تصورات سے بچا رہے۔ شیطان یا شیطانی فطرت کا اتنا تفصیلی اور حقیقت پسندانہ بیان کسی اور شاعر یا افسانہ نویس کے ہاں نہیں تھا۔ اگر "فاؤسٹ" کے فلسفے یا اس کے ایمائی پہلوؤں پر مقدمہ لکھا جائے' تو بجائے خود ایک ضخیم کتاب بن جائے گی اور یہ ظاہر ہے کہ یہاں اس جگہ کی گنجائش نہیں۔ اس لئے بالاختصار کچھ تشریحات و تصریحات کی جا رہی ہیں' تاکہ "فاؤسٹ" کے سمجھنے میں ایک طرح کی سہولت ہو جائے۔

انتساب

گوئٹے نے "فاؤسٹ" کو اپنے مرحوم دوستوں سے منتسب کیا ہے۔ وہ کہتا ہے "پیاری یادیں اور محبوب سائے! اٹھو کہ ایام خوش دلی کے تمہیں آئینہ دار ہو..... وہ جوش محبت کی گرما گرمی والا مجمع رخصت ہو گیا اور ان کی قدر شناس تحسین بھی مردہ ہو چکی ہے۔ میرے نغمے کے الم انگیز موضوع کے لئے یہ مقدر ہے کہ اجنبی اسے سنیں اور اس طرح کی ناشناس تحسین کریں' جو مجھے نیم ہراساں کر دیتی ہے۔" یہاں گوئٹے حیات بعد الموت اور روحوں سے عالم آخرت میں ملاقات کے عقیدے کا اظہار بھی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے "اب مجھے اس پر تمکین اور مسرت آگیں عہد ملاقات کی تکمیل کی آرزو ہے' جس پر وہ رسمیں قائم رہتی ہیں"۔ ضمناً گوئٹے اس خیال کا اظہار کرتا ہے کہ "معنوی قرب جسمانی قرب سے زیادہ قوی اور مؤثر ہے۔ میں لرزہ براندام ہوں' میں روتا ہوں۔ وہ سب جو میرے پاس ہے' مجھ سے

بہت دور ہٹا ہوا ہے۔ وہ سب جو میں گم کر چکا ہوں' میرے لئے حقیقت رکھتا۔ ہے وہی میرا ستارۂ راہ نما ہے۔"

فن

فن کے متعلق گوئٹے کا نظریہ یہ ہے کہ اس کی کسوٹی خواص اور باذوق لوگوں کا حسن قبول ہے۔ عوام کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی بے معنی ہے۔ اس کے نزدیک شاعر اور صاحب فن کو نفع اور نقصان سے بالا تر رہ کر فن کی بے لوث خدمت کرنی چاہئے۔ چنانچہ وہ افتتاحی مقالے میں شاعر سے کہلواتا ہے۔ "جاؤ ہٹو اور اپنے لئے کوئی دوسرا غلام تلاش کر لو۔ بصورت دیگر کیا شاعر اپنی نعمت کے خداداد حق کی تذلیل کے بعد مردہ دلی کی زندگی پر قانع ہو جائے۔ کیا انسان کی اعلیٰ ترین قوت کو آپ کے گھڑی بھر کے لطف کے لئے ضائع کر دیا جائے"۔ گوئٹے کے خیال میں شاعری کا نصب العین یہ ہے کہ وہ انسانی معاشرے اور اس کے افراد کی زندگی میں ہم آہنگی اور سازگاری پیدا کرے۔ وہ پوچھتا ہے کہ جب فطرت کا تاگا' وہ لامتناہی ریشہ بے پرواہی سے چوبی مقطع پر لپیٹا جاتا ہے' جب بے جوڑ انمل چیزیں مل کر آزردہ' پریشان اور بے سری آوازیں نکالتی ہیں۔ تب کون ہے جو سامعہ نواز ترنم کی طرز' قاعدے کی حرکت جو استہزا یا تسکین روح کا باعث ہوتی ہے' پیدا کرتا ہے؟ کون ہے جو اجزائے پریشان کو پر تکلف شاندار موسیقی کی ہمہ گیر کلیت میں مربوط و منظم کر دیتا ہے اور پھر جواب دیتا ہے کہ یہ شاعر ہی تو ہے۔

شیطان

گوئٹے نے شیطان کی حقیقت ذات پر بحث نہیں کی۔ "فاؤسٹ" الٰہیات یا مابعد الطبیعیات پر کوئی تحقیقی مقالہ نہیں ہے' لیکن اس نے شیطان کی ریشہ دوانیوں' فتنہ پردازیوں اور شیطانی فطرت کے اسرار و غوامض کو بڑی شرح اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جہاں تک شیطان کی ہستی کا تعلق ہے' اس نے اپنے تخلیقی و تعلیمی مقاصد کے لئے

انجیل کے قصہ شیطان و آدم کو کافی سمجھا ہے۔ اسی معنوی مناسبت سے شیطان شگافتہ سم اور میرے عم زاد مار جنت کی تلمیحات "فاؤسٹ" میں موجود ہیں۔ مگر آدم کی پہلی بیوی "لیلتھ" کی اختراع بھی موجود ہے۔ عرش پر خدا کے ساتھ فرشتوں اور خناس کا جو مکالمہ ہوا ہے' اس کا انداز بیان بھی بائبل سے چنداں مختلف نہیں۔ گوئٹے کا شیطان باوجود ناری ہونے کے ایک باردا لجذبات شیطان ہے' جو بذات خود کسی معصیت یا جنسی برائی کی استعداد نہیں رکھتا۔ اس میں بہیمی جذبات اور منفی خواہشات معدوم ہیں۔ وہ صرف انسان کی خرابیوں اور اخلاقی پستیوں سے خوش ہوتا ہے۔ شیطان انسان کے ایگو (انانیت) کے ذریعے کام کرتا ہے اور اسے اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ دوسروں کے سود و زیاں اور دکھ سکھ سے قطع نظر کر کے اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرے۔ گوئٹے کا شیطان ذہنی طور پر کلیت میں مبتلا ہے یعنی وہ انسانی نفرت کی نیکی کی صلاحیت کا منکر ہے..... منفی طرز فکر' تحقیر و استخفاف کی صفات ذمیمہ اس میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ انسان کی خودی کے ساتھ اس کا تغافل آدمی کو قعر مذلت و پستی میں گرا دیتا ہے۔ شیطان جب فاؤسٹ کے ساتھ معاہدہ کرتا ہے تو دنیا کی ہر خواہش کو پورا کرنے کا ذمہ لیتا ہے۔ مگر اس کے معاوضے میں فاؤسٹ کا نصیب آخرت طلب کرتا ہے۔ یہ خیال بھی سامی مذاہب میں پہلے سے موجود ہے۔ البتہ شیطان کی کارسازیوں اور "چاش" لگانے کا بیان گوئٹے نے جس دلچسپ اور بدیع انداز سے کیا ہے' وہ اسی کا حصہ ہے۔ شیطان میں درد مندی اور دلسوزی کا مادہ قطعاً" نہیں ہے۔ لطیف جذبات سے وہ یکسر خالی ہے۔ اس کے سینے پر ایک زمہریری کیفیت چھائی رہتی ہے' جو اسے انسانوں کے آلام و مصائب سے کلیتہ" بے نیاز کرتی ہے۔ اسی طرح شیطانی مزاج میں حیرت و استعجاب بھی نہیں ہے۔ فطرت کے حسین مناظر اور قدرت کی بوقلموں حسن آفرینیوں سے وہ متاثر نہیں ہوتا۔ محض اپنے تخریبی مقاصد کی دھن میں لگا رہتا ہے۔ انسانیت سے اسے نفرت و بیزاری ہے۔ عمل بے غرض' یا نیکی برائے نیکی سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ البتہ جہاں لوگ باہمی انس و محبت سے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں' وہاں شیطان عناد ڈلوانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا مقصد حیات یہ ہے کہ انسان کی انانیت کو ابھارے اور اس میں خود بینی' خود پسندی اور خود رائی پیدا کر دے۔ وہ انسانی افراد کو یہ قوی احساس دلاتا ہے کہ انہیں اپنی لذت و راحت اور اپنے مطالب کو حاصل کرنے کا مطلق حق ہے۔ خواہ ایسا

کرنے میں دوسروں کے لئے کتنی بھی مصیبت اور خرابی کیوں نہ ہو۔ ابلیسی فطرت کھلی صاف ہوا' قدرتی مناظر کی دلکشی اور سادگی کی فطری زندگی سے گھبراتی اور گریز کرتی ہے۔ تعلیم و تربیت کا شیطانی نظریہ یہ ہے کہ طلبا تمام دن کتابوں کے مطالعہ میں صرف کر دیں۔ تنگ اور تاریک کمروں میں زندگی بسر کریں۔ دھوپ سینکنے کے لئے باہر نہ نکلیں۔ ہوا خوری میں وقت ضائع نہ کریں۔ مابعد الطبیعیات کو ریاضی اور طبیعاتی علم پر ترجیح دیں اور پیچیدہ و لایعنی فلسفیانہ مباحث میں اپنے ذہن کو مبتلا رکھیں۔ گوئٹے کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ روزمرہ کی زندگی میں عمل سے غافل و بیکار دقیقہ سنجیوں اور علمی موشگافیوں میں سرگرداں اور مافوق العادت کی جستجو میں حیران و پریشان رہتے ہیں' وہ بالآخر شیطانی اوہام اور وساوس میں مبتلا ہو کر بے راہ ہو جاتے ہیں اور نتیجے میں عمل صالح کی صلاحیت ضائع کر دیتے ہیں۔ خیالات کا تانا بانا بنتے رہنے سے یہ بہتر ہے کہ آدمی مفید کام کرے اور بنی نوع انسان کو نفع پہنچائے۔ بایں ہمہ شیطان کا وجود مصلحت اور حکمت سے خالی نہیں۔ فی الحقیقت خیر کے حصول کے لئے شر کا وجود لازم ہے۔ انسانی فطرت کے جمال و کمال کی تکمیل شیطان کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ شیطان کے مہمیز لگانے سے انسان کی ترقی کے امکانات عملی صورت اختیار کرتے ہیں۔ جب فاؤسٹ خناس کو زجر و ملامت کرتا ہے' تو یہ جواب دیتا ہے۔ "اے زمین کے بے بس فرزند! میری مدد کے بغیر تو کس طرح زندگی کے دن گذارتا! زندگی کے سوز و ساز اور ذوق و شوق کا سامان کہاں سے لاتا؟ اگر میں نہ ہوتا تو تو اس کرہ ارضی کو چھوڑ کر بھاگ جاتا اور تنہا غاروں میں مارا مارا پھرتا۔ الو کی طرح کسی لجلجے پتھر پر بیٹھا ہوا کائی چاٹتا رہتا"۔ اقبال نے یہ مضمون بڑی خوبی سے بیان کیا ہے:

مزی اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزداں' دارد و شیطاں ندارد
نہ دیدہ درد زنداں یوسف او
زلیخایش دل نالاں ندارد
کجا آں لذت عقل غلط سیر
اگر منزل رہ پیچاں ندارد

عرش پر تمہیدی مکالمے میں جو خدا اور فرشتوں کے مابین ہوا' شیطان کو دنیا میں بھیجنے کا

منشا خدا نے یوں بیان کیا ہے۔ ''نفی اور انکار کی جملہ قوتوں میں شیطان کا بار سب سے کم گراں ہے۔ آدمی کی مساعی اس کے مقام کی مناسب سطح سے فروتر رہ جاتی ہیں' کیونکہ وہ غیر مشروط اور لاتعین راحت و عافیت کا طالب ہے۔ میں بدذات (شیطان) کو اسی لئے بھیجتا ہوں کہ اکسائے اور ستائے اور خدمت خلق کے لئے محنت و مشقت کرے۔ باوجودیکہ شیطان ہے۔'' شیطان کی انانیت ہے کہ وہ کوئی عمل بے غرضی سے نہیں کرتا۔ جب فاؤسٹ کے خناس کے ساتھ عہد و پیمان ہوتے ہیں' تو فاؤسٹ کہتا ہے ''شیطان انانیت پسند ہے اور فی سبیل اللہ کسی کی مدد نہیں کرتا۔ اپنی شرائط و معاوضے کی وضاحت کرو۔''

عمل

گوئٹے کے نزدیک عمل ہی زندگی نہ بدلنے والی حقیقت ہے اور حقیقی عمل وہ ہے جو بے حاصل نہ ہو۔ جب فاؤسٹ بائبل کا جرمن زبان میں ترجمہ کرنا شروع کرتا ہے اور اس مقام پر پہنچتا ہے کہ ابتدا میں کلام تھا' وہ کلام کی تعبیر عمل سے کرتا ہے۔ گوئٹے مسلسل پیہم جدوجہد کا قائل ہے۔ اس کے لئے سکون اور تعطل موت کے مترادف ہیں۔ ذوق عمل میں انسان کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ فاؤسٹ خناس سے کہتا ہے۔ ''اگر میں کسی گریزاں ساعت سے یہ کہوں' ٹھہری رہ' تو کتنی حسین ہے' تو وہ میری موت کی گھڑی ہونی چاہئے۔''

انانیت

گوئٹے کے فلسفہ حیات میں انانیت ام الرذائل ہے اور تیاگ و ترک خواہشات ام الفضائل۔ اس کے نزدیک انسان کی جملہ خرابیوں اور مصیبتوں کی ذمہ دار خودبینی اور خود پسندی کی ابلیسی تحریک ہے۔ فاؤسٹ کی سیرت میں بڑا نقص جو بالاخر اس کی اخلاقی پستی اور روحانی بربادی کا باعث ہوا' وہ اس کی انانیت تھی۔ عظیم روح ارضی سے فاؤسٹ کا یہ کہنا کہ ''میرا نام فاؤسٹ ہے اور میں ہر حیثیت سے تیرا ہمسر ہوں۔'' اس کی خود بینی اور خود پسندی پر دلالت کرتا ہے (یوں سمجھئے کہ اس مقام پر گوئٹے ظلوماً جہولا کی تفسیر کر رہا ہے)۔ اسی

خودی کا یہ نتیجہ تھا کہ اس نے گریٹا کی سادگی اور بھولے پن سے فائدہ اٹھا کر اس غریب کو اپنی ہوا اور ہوس کا نشانہ بنا لیا۔ ڈاکٹر فاؤسٹ میں اقتدار اور قوت کے حصول کی ایک لامتناہی طلب تھی اور یہی اس تباہی کا موجب ہوئی' لیکن اس کے باوجود گوئٹے قناعت اور سکون خاطر کو جو عمل کے سوز و ساز اور جدوجہد میں مانع ہو کر کمزوری تصور کرتا ہے' وہ عمل کی ضرورت کو حیات اور اخلاق کا بنیادی تقاضا سمجھتا ہے۔ ان دونوں باتوں میں بظاہر کچھ تضاد ہے - معاملے کی حقیقت یہ ہے کہ گوئٹے پیہم عمل اور مسلسل طلب کا قائل ہے' مگر شرط یہ ہے کہ عمل صالح ہو اور طلب برحق۔ بالفاظ دیگر وہ خواہشات اور ہوس کے لئے عمل اور طلب کو مذموم قرار دیتا ہے' مگر نیکی اور حق کی راہ میں لامتناہی جستجو اور جدوجہد کو حیات حقیقی کا لازمہ سمجھتا ہے۔ اس اعتدال سے گوئٹے کا فلسفہ حیات ایک مفید اور بار آور معنویت کا حامل بن جاتا ہے۔ فاؤسٹ جب خناس سے صحت و مسرت کی زندگی کا راز یا جوان بنے رہنے کا نسخہ دریافت کرتا ہے' تو وہ جواب دیتا ہے "اچھا لو یہ ہے فطرت کا نسخہ جس میں نہ ڈاکٹر کی ضرورت ہے نہ روپے پیسے کا خرچ اور نہ کوئی سحر افسوں کی بات۔ کھلی ہوا میں زندگی بسر کرو۔ زمین کھودو۔ ہل چلاؤ۔ کاشتکاری کرو۔ عام لوگوں میں مل جل کر رہو۔ سادہ غذا کھاؤ۔ سب کو اپنے برابر خیال کرو۔ حیوانوں کو زندگی کی نعمتوں میں برابر کا شریک سمجھو اور یاد رکھو کہ جہاں سے تم فصل برداشت کرتے ہو وہاں.... تمہیں اپنے ہاتھوں سے گوبر اٹھا کر ڈالنا پڑے گا۔" مگر فاؤسٹ کی انانیت و خود پسندی اس تجویز سے متفق نہیں ہوتی اور وہ غیر معمولی اور مافوق العادت مسرت و راحت اور عروج و ترقی کا خواہش مند رہتا ہے - خود غرضی' انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے انسان کی راحت' آسودگی' مسرت اور اخلاقی سعادت کو تباہ کر دیتی ہے۔ محبت خودغرضی کی ضد ہے۔ جب محبت کے معاملے میں نفس پروری آ جاتی ہے تو انانیت کی تباہ کاری کی کوئی حد نہیں رہتی۔ فاؤسٹ کی خود غرضی سے بیچاری گریٹا کا جو حشر ہوا' وہ گوئٹے نے نہایت دردناک پیرائے میں دکھایا ہے۔

تیاگ اور عشق و محبت

گوئٹے ترک و ایثار کا بڑا حامی ہے۔ اس کا تمام فلسفہ اخلاق دو بنیادی تصورات پر قائم

ہے یعنی تیاگ اور عمل بے غرض۔ اس سلسلے میں وہ تصوف سے ضرور متاثر ہوا ہے' خواہ وہ یورپ کے صوفیوں کی تعلیمات ہوں' حضرت حافظ کے صوفیانہ اشعار ہوں یا دیدانیت کا فلسفہ ہو۔ گوئٹے کے نزدیک حیات انسانی کا کمال عشق و محبت ہے اور عشق و محبت کا کمال بہ رضائے خاطر خودی کو مٹا دینا ہے۔ جب انانیت (خود غرضی' نفس پروری' خود طلبی) فنا ہو جاتی ہے تو حیات روحانی کا ایک عظیم الشان سلسلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ انسانی کمال' ایثار اور خواہشات نفسانی کے ترک پر منحصر ہے۔ اس سے عمل صالح اور نیکی کے رستے میں سعی کا ترک لازم نہیں آتا۔ یہ حصول خیر کے لازمی وسائل ہیں۔ انسان جب خواہشات کو ترک کرنا سیکھ لیتا ہے یعنی ضبط نفس اور تربیت خودی کے مراحل کو طے کر لیتا ہے تو حقیقت وجود سے آشنا ہو کر دائمی مسرت سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ گوئٹے تسلسل حیات کا قائل ہے وہ حقیقت انسانیہ کے بقائے شخصی میں اعتقاد رکھتا ہے اور اس کائنات آب و گل کو راہ سفر سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ وہ خیال کرتا ہے کہ انسان کا نشیمن نہ یہ خاک دان ہے' نہ یہ افلاک اس کی منزل مقصود ہیں۔ گوئٹے ایک لامحدود فضائے روحی و معنوی کا متلاشی ہے' جہاں پہنچ کر وہ زمان و مکاں کی حدود و قیود اور اضافتوں اور نسبتوں کی گیرو دار سے آزاد ہو جائے اور یہ ارتقا' تیاگ اور ایثار کے بغیر ممکن نہیں۔ مولانا روم کی طرح گوئٹے بھی اکل حلال کو عشق و معرفت کے حصول کے لئے لابدی تصور کرتا ہے:

علم و حکمت زاید از نان حلال
عشق و رقت آید از نان حلال

اس لئے گوئٹے کے فلسفہ میں حسن یقین اور حسن عمل کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ اس نام نہاد محبت کا جو دراصل بوالہوسی ہے' سخت مخالف ہے۔ اطالویوں کی عشق بازی پر جو طنز گوئٹے نے کیا ہے' وہ اس کے ذاتی مشاہدے پر مبنی ہے۔ کچھ عرصہ اطالیہ میں رہنے کے بعد اسے معلوم ہو گیا کہ اطالوی بارد قسم کی ہوس بازی اور تعیش کو محبت کہہ کر پکارتے ہیں۔ درآں حالیکہ محبت کے سوز اور اشتیاق کی گرمی کا شائبہ تک بھی اس میں موجود نہیں ہوتا۔ مقلیہ والوں کے عشق کے لئے جو استحسان کے جملے وہ خناس سے کہلواتا ہے' اس سے اطالویوں کی ہوس بازی پر طنز مقصود ہے۔

مذہب اور خدا

گوئٹے نہ مذہب کا منکر ہے اور نہ کسی مخصوص مذہب کو حق و صداقت کا واحد اجارہ دار سمجھتا ہے' اس کے نزدیک مذہب خدا تک پہنچنے یعنی معرفت الٰہی حاصل کرنے کی راہ ہے۔ مگر اس معنی میں راہ حق نہیں ہے کہ کوئی اور راہ حق نہ ہو یا کم از کم ہمارا علم کسی مذہب کے بارے میں اتنا قطعی اور یقینی نہیں ہے کہ ہم دوسرے مذاہب کی صداقت کی قطعی طور پر نفی کر سکیں اور اصرار کرنے میں حق بجانب ہوں کہ ہمارے مذہب کے سوا کوئی مذہب نجات حاصل کرنے کا وسیلہ نہیں بن سکتا۔ اس بارے میں گوئٹے کا عقیدہ لاادریت اور خدا پرستی کے بین بین معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایمان کی ضرورت کو تسلیم کرتا ہے مگر اپنے ہمنوا غالب کی طرح یہ پوچھتا ہے کہ ایمان پر کامل ایمان کسے ہے؟

جز سخن در کفر و ایمانے کجا است
خود سخن در کفر و ایماں می رود

مذہب اور خدا کے بارے میں جو مارگریٹا اور فاؤسٹ کے سوال و جواب ہوئے ہیں' وہ گوئٹے کے عقیدے پر کافی روشنی ڈالتے ہیں :-

مارگریٹا : آپ کے لئے مذہب کیا معنی رکھتا ہے۔ گو میں آپ کو نیک طینت اور رحم دل سمجھتی ہوں مگر میرا خیال ہے کہ عبادت سے آپ کو چنداں لگاؤ نہیں۔

فاؤسٹ : اسے رہنے دو۔ جن سے میں محبت کرتا ہوں' ان کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہوں۔

مارگریٹ : آپ مائدہ مقدسہ کا احترام نہیں کرتے۔

فاؤسٹ : احترام! ہاں کرتا ہوں۔

مارگریٹا : لیکن ایمان اور احتیاج کے تحت نہیں۔ آپ کلیسا کی دعا میں شامل نہیں ہوتے اور ذکر خدا سے غافل ہیں۔ کیا آپ خدا پر ایمان رکھتے ہیں؟

فاؤسٹ : جان من! یہ کہنے کی کون جرات کر سکتا ہے کہ وہ یقین رکھتا ہے۔ کسی سے پوچھ کر دیکھ لو۔ کوئی صاحب معرفت حکیم ہو یا ولی اللہ' تم دیکھو گی کہ اس کے جواب کی حیثیت سوال کے مضحکہ سے زیادہ نہ ہو گی۔

مارگریٹا: تو پھر آپ ایمان نہیں رکھتے۔

فاؤسٹ: پیاری، غلط فہمی کی کیا ضرورت ہے۔ ایمان کا لفظ کون زبان پر لا سکتا ہے اور یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کا ایمان حق الیقین کی حد کو پہنچ گیا اور کون ہے جسے وحی و الہام کا کچھ بھی وجدانی احساس ہو اور وہ اسے ڈھونگ و فریب سے تعبیر کر سکے؟ وہ جس کی وجہ سے تمام موجودات قائم ہیں اور جو تمام کائنات کو اپنے دامن میں لپیٹے ہوئے ہے۔ کیا وہ مجھے تمہیں اور اپنے آپ کو لپیٹے ہوئے نہیں ہے..... تم جو نام چاہو اسے دے دو۔ اپنا نور و سرور کہو۔ اپنی محبت کہو۔ اپنا دل کہو۔ اپنا خدا کہو۔ میں تو اسے کوئی نام نہیں دے سکتا۔ بالیقین سب کچھ احساس ہی ہے۔ ناموں کی حیثیت شور و غل یا گرد و غبار سے زیادہ نہیں۔ یہ نور عرش اور ہمارے درمیان حجاب بن جاتے ہیں۔

اس انداز فکر و بیان میں تصوف کا رنگ ہویدا ہے، گو پیرہن مغرب کا ہے۔ گوئٹے نے خدا کو 'محسوس' کہا ہے۔ غالب بھی یہی بات کہتے ہیں:

ہمہ محسوس بود ایز دو عالم معقول
غالب ایں زمزمہ آواز نہ خواہد خاموش

اور یہ خیال بھی صوفی شعرا کا ہے کہ خدا کو ہم کوئی نام نہیں دے سکتے۔ وہ ہماری صفت و تعریف سے ماورا ثم وراء الوراء ہے:

بنام آنکہ او نامے نہ دارد
بہ ہر نامے کہ خوانی سر بر آرد

حیدر دہلوی نے بھی خدا کی بے ہمہ و باہمہ ہستی کے بارے میں ایک شعر کہا تھا، جو گوئٹے کے تصور الہیہ کو کسی قدر واضح کر دیتا ہے:

یہ کیسی اجنبی بستی میں لے آئی طلب تیری
یہاں سب مختلف معنوں میں تیرا نام لیتے ہیں

گوئٹے میں تشکیک یا لاادریت کا رنگ ضرور ہے مگر وہ انکار پر منتج نہیں ہوتا۔ جب خناس فاؤسٹ سے کہتا ہے کہ وہ مارتھا کو خوش کرنے کے لئے (جو فاؤسٹ اور مارگریٹا کے معاشقے میں بچوں کا کام کرتی ہے) یہ حلفیہ شہادت دے دے کہ اسے شورلین کی موت اور

تدفین کا عینی علم ہے اور وہ اس دروغ حلفی سے احتراز کرتا ہے' تو خناس یہ الزامی جواب دیتا ہے "اے نیک آدمی! تمہاری زندگی کا یہ پہلا واقعہ ہو گا؟ کیا تم نے پہلے کبھی جھوٹی شہادت نہیں دی.... کیا خدا اور کائنات کے حقائق کے بارے میں تمہیں اتنا بھی علم و ادراک تھا جتنا کہ شورلین صاحب کی آخری آرام گاہ کے بارے میں؟" بایں ہمہ گوئٹے مذہب اور' ایجاب و یقین' کی ضرورت کا قائل ہے۔ گریٹا جب تک کلیسا کے زیر اثر رہی' عفت اور نیکی میں فرق نہیں آیا' مگر جب فاؤسٹ کے تشکیک یا الحاد نے اسے متاثر کیا تو وہ اخلاقی قدروں سے بے نیاز ہو گئی۔ فاؤسٹ جو جڑاؤ زیورات مارگریٹا کے ہاں رکھ آیا تھا' وہ اس کی ماں نے پادری کے حوالے کر دیئے۔ پادری نے شکریہ ادا کیا اور یہ کہہ کر سب زیورات لے گیا کہ "میری بیٹی! مال حرام صرف گرجا ہی ہضم کر سکتا ہے"۔ تمہیں ان زیورات کا معاوضہ آخرت میں مل جائے گا۔" بظاہر اس میں پادریوں کی حرص و آز پر طنز ہے' مگر درپردہ اس حقیقت کا بیان مطلوب ہے کہ گو اہل کلیسا ظواہر پرست ہوتے ہیں' تاہم ان سے رابطہ رکھنا اخلاق کی حفاظت کا ضامن ہے۔ اگر جواہرات کا دوسرا ڈبہ بھی پادری صاحب کی نذر ہو جاتا' تو غالباً مارگریٹا کا دامن عصمت پارہ پارہ ہونے سے بچ جاتا۔ غرضیکہ گوئٹے مذہب کا قائل ہے' مگر مذہبی تشدد و تعصب کو پسند نہیں کرتا۔

عورت کی عفت و عصمت

گوئٹے دوشیزگی کی حرمت کا بڑا قائل ہے۔ وہ زنا کو ام الخبائث سمجھتا ہے اور نکاح کو انسانی معاشرے کی فلاح و بہبود کا سب سے بڑا ذریعہ شمار کرتا ہے۔ گریٹا کی ساری مصیبت کا باعث یہ ہے کہ وہ اپنی آبرو کی حفاظت نہ کر سکی۔ اگر وہ فاؤسٹ سے کہتی کہ وہ شادی سے پہلے اس سے متمتع نہیں ہو سکتا تو جان' ایمان اور آبرو تینوں کی سلامتی رہتی۔

مافوق العادات و ماوراء المشاہدات

گوئٹے علوم طبیعہ' ریاضی اور قانون کو مابعد الطبیعیات پر ترجیح دیتا ہے اور لاحاصل علمی

باریک بینیوں اور موشگافیوں کو تضیع اوقات سمجھتا ہے' مگر اس کے باوجود وہ عقل معادی کا منکر نہیں۔ وہ بقائے روح کا قائل ہے اور عالم ارواح یا عالم مثال میں نہ صرف انسانی زندگی کے تسلسل پر یقین رکھتا ہے بلکہ ارواح طیبہ اور ارواح خبیثہ دونوں کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کے نزدیک کائنات کی تعلیلی حکمتیں مسلسل اور لامحدود ہیں اور تخلیقی تنوع کا یہ تقاضا ہے کہ ارواح اور مثالی اجسام اس عالم اور اس سے ماورا عوالم میں اپنے اپنے رنگ اور اپنی اپنی حدود کے اندر متحرک و متصرف رہیں' لیکن وہم کی خلاقی اور کارپردازی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے محتاط اور معقول رہنے کی ضرورت ہے۔ شیطان انسانی وہم اور توہم کے ذریعے بہت سے خیالی پیکر پیدا کرتا رہتا ہے' جن کی وجہ سے انسان راہ راست سے بھٹک جاتا ہے۔

فطرت

فطرت کے متعلق گوئٹے نے "فاؤسٹ" میں کوئی نظریہ واضح اور صاف طور پر پیش نہیں کیا مگر فاؤسٹ اور مارگریٹا کے معاملے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گوئٹے جذبات و خواہشات نفسانی کو انسان کی فطرت کا جزو سمجھتا ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک فطرت کے اسرار و غوامض کا علم ہدایت یا نجات کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر فاؤسٹ باوجود اپنے علم و حکمت کے گمراہ ہو کر بدترین قسم کے فسق و فجور میں مبتلا ہو گیا۔ مارگریٹا اپنی سادگی اور کم علمی کے باوجود معصیت سے اس وقت تک بچی رہی' جب تک کہ فاؤسٹ نے فلسفہ تشکیک اور لاادریت نے اس کا یقین متزلزل نہ کر دیا۔ اگرچہ گوئٹے کے شیطان میں حیرت و استعجاب کا مادہ نہیں اور اس لئے حق کی لاانتہا طلب و تلاش بھی اسے نہیں ہے' لیکن فطرت کے اسرار کا اسے بہت زیادہ علم ہے۔ اس کے باوجود وہ شعر کی دعوت دیتا رہتا ہے۔ بدطینتی' بدنیتی اور بداندیشی شیطانی فطرت کے خواص ہیں۔ افسردہ خاطری اور مردہ دلی کا علاج شیطان کے بیت الحکمت میں محض بارو قسم کے فسق و فجور سے کیا جاتا ہے۔ گوئٹے کے نزدیک اخلاقی اور روحانی قدروں میں یقین رکھنا عمل صالح کے لئے ضروری ہے اور یہ یقین مذہب سے پیدا ہوتا ہے۔ فطرت کے اسرار کی غواصی سے نہیں۔

جبر و اختیار

جبر و اختیار کے بارے میں گوئٹے کا فلسفہ حضرت حافظ سے ملتا جلتا ہے :

گناہ اگرچہ نبود اختیار ما حافظ
تو در طریق ادب کوش و گو گناہ من است

مارگریٹا کے آخری وقت میں جو آواز عالم بالا سے آتی ہے' وہ بھی یہی ہے کہ :

نصیب ما ست بہشت اے خدا شناس برو
کہ مستحق کرامت گناہگاران اند

گوئٹے کے نزدیک گناہ' بالخصوص جنسی گناہ بعض اوقات فطرت کا ایک ناگزیر تقاضا ہوتا ہے' جس کے ہاتھ میں انسان مجبور محض ہوتا ہے۔ فاؤسٹ جب مارگریٹا کو جیل خانے کی قید سے چھڑانے کی نیت سے جاتا ہے' تو اس کی کوٹھڑی کے باہر کھڑے ہو کر اپنے آپ سے کہتا ہے کہ اس کی خطا محض یہ ہے کہ وہ ایک نابینا اور بے گناہ مشیت سے مجبور ہو گئی۔ بقول حافظ :

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردۂ
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

عقل

گوئٹے کے نزدیک عقل مجرد کا بڑا درجہ ہے۔ وہ حکمت کو جو مبنی بر حقیقت ہو' خیر کثیر سمجھتا ہے۔ جذبات خصوصاً سفلی جذبات کا ہیجان عقل کے لئے حجاب ہے۔ نیکی عقل کے صحیح استعمال کا نام ہے۔ شیطان ہمیشہ عقل کے خلاف مشورہ دیتا رہتا ہے یا عقل مجرد کے بجائے عقل جزئی یا عقل اضافی کو بروئے کار لاتا ہے۔ بالفاظ دیگر "عقل بے یزداں" انسان کو خواہشات کا غلام بنا دیتی ہے۔ جب تک نفس کا ضبط اور تزکیہ نہ ہو' عقل کل انسان کو ہدایت نہیں دے سکتی۔ عقل پر جب شیطان کا غلبہ ہو جاتا ہے' تو یہ خواہشات نفسانی کا آلہ

کار بن جاتی ہے۔ اسی بنا پر انسان کی نجات کے لئے ہدایت وحی کی ضرورت از قبیل واجبات ہے۔

تشبیہ و تمثیل

"فاؤسٹ" اول سے لے کر آخر تک تشبیہوں' تمثیلوں اور استعاروں سے بھرپور ہے۔ اس کا بیان بخوف طوالت نظر انداز کیا جا رہا ہے' لیکن قارئین "فاؤسٹ" کی تمثیلی و اشاریتی حیثیت کو پیش نظر رکھیں گے' تو بہت سے مطالب و معانی خود بخود ظاہر ہو جائیں گے۔ مثال کے طور پر جادوگرنی سے مراد محض لغوی طور پر نہیں ہے' بلکہ ان بڑی بوڑھیوں سے بھی مراد لی جا سکتی ہے جو خود تو توہمات میں مبتلا ہیں اور دوسروں کو بھی توہمات میں مبتلا رکھتی ہیں یا وہ عشوہ طراز اور کرشمہ ساز عورتیں جو متعارف اخلاقی قدروں اور معنوی حقیقتوں کو فراموش کر کے خواہشات نفسانی کے مطابق معاشرے کو چلانا چاہتی ہیں۔ بوزنوں سے مراد وہ لوگ بھی ہیں' جو فکر و نظر اور ہوش و خرد سے کام نہیں لیتے اور پابند رسوم و اوہام ہیں یا محض کورانہ تقلیدی رنگ میں غلط اور خلاف عقل باتوں کو مانتے ہیں یا زندگی کے ٹھوس حقائق کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔

(فاؤسٹ- مترجم فضل حمید' بہاول پور : اردو اکیڈمی' 1964ء' دیباچہ)

محمد عبدالقیوم باقیؔ

دیباچہ

(اردو ترجمہ "فاؤسٹ")

گوئٹے کے مشہور عالم فسانہ "فاؤسٹ" میں قدرت کی دو متضاد قوتوں کی کشمکش ہے' جس کی ایک حد شیطان اور دوسری حد انسان ہے۔ اس کشمکش میں قدرت دنیا کی سب سے بڑی نیکی یعنی عشق کے ذریعہ مداخلت کرتی ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ بالآخر جیت انسان نے حاصل کی' ہاں یہ استدلال کر سکتے ہیں کہ عشق نے اپنی فتح مندی کا تاج خلیفہ خداوندی ہی کے سر پر رکھا۔

عشق ما اندر جہاں ہنگامہ ہا تعمیر کرد
ورنہ ایں شہر خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

اس ڈرامائی نظم کے تین کردار ہیں۔ ایک شیطان' دوسرا فاؤسٹ' تیسرا مارگریٹ۔ گوئٹے کے آرٹ نے ان تینوں کرداروں کو علم انسانی کے تین شعبوں کی روح سے پیدا کیا ہے۔ شیطان درحقیقت انسان کا جذبہ ناکام ہے' جو ہر آن اسے نہ صرف قدرت کے سمجھنے' بلکہ کائنات کی قوت عمل کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنے سے روکتا ہے۔ اس جذبہ ناکامی کو جہاں جہاں اعلیٰ ترین رفعت نصیب ہو سکتی تھی اور جس رفعت کے ذریعہ وہ قدرت کے ساتھ ایک فاتحانہ ٹھٹول کرتا ہوا آگے بڑھ سکتا تھا' وہاں گوئٹے نے فلسفہ اور نفسیات سے تخلیقی کام لیا ہے۔ "فاؤسٹ" جذبہ ناکامی کا مرکز اور اس کا رد عمل بھی ہے۔ یہاں شاعر نے

اپنے مشرقی ذوق ادب سے تصوف اور فلسفہ کی بڑی حسن کارانہ آمیزش کی ہے اور جہاں مارگریٹ--- عورت --- کو اپنی داستان میں الجھایا ہے' یہ سمجھئے حسن اور شعر کو نمود کی جنتیں عطا کی ہیں۔ اس طرح "فاؤسٹ" میرے نزدیک بہ یک وقت فلسفہ' تصوف اور شاعری کا روحانی ڈراما ہے' جس پر ایک عالی فکر شاعر کا ساٹھ سالہ ذوق نظر حکومت کر رہا ہے۔

"فاؤسٹ" کے معنوی مدو جزر میں چند اور موجیں بھی ابھر آئی ہیں۔ کہیں احساس بہار ہے'تو کہیں تکلیف خزاں۔ کہیں طلسمی سرزمین نظر آتی ہے' تو کہیں جادو کے نقش بولتے ہیں۔ کہیں مرثیہ حیات ہے' تو کہیں میکدوں کے قہقہے۔ کہیں فرشتوں کی حمد ہے' تو کہیں شیطان کا طنز و الحاد۔

"فاؤسٹ" کی اس قوت کی زد میں رہتے ہوئے میرے دل نے کہا عجیب بات ہے کہ انسان عرفان کی تلاش میں فریب کا شکار ہو جاتا ہے' لیکن اس فریب میں اسے یقین کی دولت بھی مل جاتی ہے۔ جب گوئٹے حضرت محمد مصطفیٰ صلعم پر اظہار خیال نہ کر سکا' تو قدرت نے دنیا کے فکر کے لئے اس سے ابلیس ہی پر ایک شاہکار لکھوا دیا۔

اس منزل پر خیال آیا کہ "فاؤسٹ" کو اردو میں کیوں نہ منتقل کر لیا جائے؟ کیا اردو ادب کو اس داستان سے' جس میں مشرق اور مغرب ہاتھ ملا رہے ہیں' محروم رہنا چاہئے؟ اس کے ساتھ گوئٹے کا ایک قول بھی یاد آیا جو اس نے اپنے دوست شلر کو 1797ء میں لکھا تھا۔

"All that is poetic in character should be rhythmically treated."

اس قول نے میرے اس ارادہ کو کہ "فاؤسٹ" کی اگر کوئی صحیح ترجمانی ہو سکتی ہے' تو وہ نظم ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے' ایک سند کا درجہ دے دیا۔

اب "فاؤسٹ" کو اردو نظم میں منتقل کرنا ہی نہ تھا' بلکہ جس طرح حافظ نے اپنی رباعی میں ایک جذبہ کا اظہار کیا ہے۔ اس جذبے کو اپنی کتاب کے ذریعہ تشفی دینے کا بھی عزم تھا۔

دو یار زیرک واز بادہ کہن دو منے
فراغتے' و کتابے' و گوشہ چمنے!
مزاج دہرتبہ شد دریں بلا حافظ

کجاست فکر حکیمے، ورائے برہمنے؟

"فکر حکیمے ردائے برہمنے" کی پوری تعبیر گوئٹے میں نظر آتی ہے۔ شاعر کے افکار کو اس انداز کے ساتھ نظم کرنے میں جو دشواریاں حائل تھیں، ان کا اعادہ غیر ضروری ہے۔ ہر قدم پر اقبال کا یہ شعر پڑھ کر دل تھامنا پڑا۔

مجھے آہ و فغان نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے رہرو، کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا!

اب جو مرقع آپ کے سامنے ہے، وہ سمجھئے ایک اور جنگ ہے، جو "جذبہ ناکامی" کے ساتھ کی گئی ہے۔ ان تین ہزار اشعار میں جنہیں "فاؤسٹ" جیسے شاہکار کی ترجمانی کا شرف حاصل ہو رہا ہے، جگہ جگہ میں نے اپنے دل پارے بھی چھوڑ دیئے ہیں تاکہ مطالب روشن ہوں اور مشرقی شاعری کا رنگ آ جائے۔ اگر میری یہ سعی مشکور ہوئی تو میں کہوں گا۔۔۔۔

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم!

(فاؤسٹ (حصہ اول) منظوم ترجمہ از مولوی عبدالقیوم خاں باقی مرحوم، کراچی : انجمن ترقی اردو، 1961ء)

محمد ہادی حسین (مترجم)

غم نصیب

(معروف مترجم محمد ہادی حسین نے گوئٹے کے اہم ترین ناول "نوجوان ورتر کی داستان غم" (Die Leiden des jungen Werthers) کا اردو ترجمہ "غم نصیب" کے عنوان کے تحت شروع کیا تھا اور اس کی پہلی قسط لاہور کے ادبی ماہنامہ "رسالہ ہزار داستان" (مدیر حکیم احمد شجاع) کی جلد اول شمارہ سات (بابت ستمبر 1922ء) میں شائع ہوئی تھی۔ چند اقساط کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور اسی رسالے کے اگست 1925ء کے شمارے سے اس ترجمہ کی بقیہ اقساط چھپنا شروع ہوئیں۔ اس کے ساتھ مترجم نے ایک طویل ابتدائیہ تحریر کیا' جو سطور ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ عرصہ دراز کے بعد یہ ترجمہ "دل ناداں" کے زیر عنوان کراچی سے 1953ء میں اشاعت پذیر ہوا' لیکن اس میں یہ تعارفی عبارت موجود نہیں۔ مرتب)

ذیل کے صفحات ایک سلسلہ کہنہ کی تجدید ہیں' جو "ہزار داستان" میں بہت مدت تک جاری رہنے کے بعد بعض مجبوریوں کی بنا پر منقطع ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اور اور دلچسپیوں نے مجھے مشغول رکھا اور میں اس کی تکمیل کے فرض سے جو قارئین "ہزار داستان" کی طرف سے مجھ پر عاید ہوتا تھا' عہدہ برآ نہ ہو سکا۔ میں ان حضرات کا ممنون ہوں جن کے متواتر اصرار نے مجھے یہ بھولا ہوا فرض یاد دلایا اور اگر اتنی مدت کے بعد تلافی مافات کی کوشش لاحاصل نہیں تو میں انشاء اللہ شکایت کا موقعہ نہ رہنے دوں گا۔

"غم نصیب" کی رسم تعارف اس سے پیشتر ادا ہو چکی ہے۔ تاہم ان حضرات کے پاس خاطر سے جن کو اس کے دیکھنے کا پہلے کبھی اتفاق نہیں ہوا' اس کا اعادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس کا مصنف جرمنی کا مشہور و معروف ادیب گوئٹے ہے' جس کا نام ہندوستان میں سر اقبال کے "پیام مشرق" کی اشاعت کے بعد تعارف کا محتاج نہیں رہا۔ کیونکہ اسی کے "سلام مغرب" کے جواب میں یہ غیر فانی کتاب لکھی گی ہے۔ یورپ کی نگاہ میں اس کے علو مرتبت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ دور متاخرین کا بہترین مصنف تسلیم کیا گیا ہے اور اس کا شمار ہومر' ڈانٹے اور شیکسپیئر کے پہلو بہ پہلو ادبیات یورپ کے اراکین اربعہ میں ہوتا ہے۔

"غم نصیب" گوئٹے کی ادبی زندگی کے اوائل کا کارنامہ ہے۔ بلکہ یہی کتاب تھی جس سے شروع شروع میں اس کی شہرت وابستہ رہی۔ یورپ کی تاریخ ادبی میں اس کا نام ان منتخب کتابوں کی ذیل میں لیا جاتا ہے' جن سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس تاریخی حیثیت سے قطع نظر کر لیں' تو ایک اور اعتبار سے بھی اس کی قدر و قیمت نقادان ادب کے نزدیک بہت زیادہ ہے۔ یعنی یہ گوئٹے کے عہد جوانی کی ایک مستند یادگار ہے یہ ایک معروف و مسلم حقیقت ہے اور اس کا ثبوت گوئٹے کی خود نوشتہ سوانحعمری سے بھی بہم پہنچتا ہے کہ اس کتاب کے جزئی واقعات کا بیشتر حصہ ایسے واقعات پر مشتمل ہے جو خود اسے اپنی زندگی کے ایک دور میں پیش آئے اور جن جذبات و حسیات کا اس کے ضمن میں اظہار کیا گیا ہے۔ وہ خود اس کی کیفیت قلبی کا آئینہ ہیں۔ بلکہ تحقیق سے یہاں تک دریافت ہوا ہے کہ جن خطوط سے کتاب کا پہلا حصہ ترتیب دیا گیا ہے' ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو کسی فرضی شخصیت کی طرف سے نہیں لکھے گئے بلکہ فی الواقعہ اس نے خود اپنی طرف سے لکھے۔ گوئٹے جیسا شخص جس کا دماغ انسان کے ذہنی ارتقاء کی سدرۃ المنتہیٰ مانا گیا ہے جسے بعض اعاظم پرستوں نے مافوق البشر کہنے میں تامل نہیں کیا اور جس کی تصانیف تمدن حاضرہ کے ترکیبی عناصر میں ممتاز ترین حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر کسی کتاب میں اپنے عہد جوانی کے جذبات اور خیالات کا صحیح صحیح اظہار کرے تو اس کتاب کی جتنی بھی قدر کی جائے' مقام تعجب نہیں۔ کم از کم میں نے اسی خیال سے متاثر ہو کر اس کا ترجمہ شروع کیا ہے۔ اگرچہ گوئٹے کے نام کی نسبت سے صرف نظر کر کے اس کی ذاتی خوبیاں بھی اس کے حق میں کچھ کم سفارش نہیں۔

"غم نصیب" کو اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے کہ وہ مختلف خطوط کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً لکھے گئے تو اس کا ہر حصہ بذات خود مکمل ہے۔ تاہم چونکہ یہ خطوط ایک سلسلے میں مربوط ہیں اور ان کے ضمن میں ایک افسانہ محبت تحریر کیا گیا ہے' اس لئے تسلسل واقعات کا سر رشتہ قائم رکھنے کے لئے گزشتہ اقساط کا خلاصہ ضروری معلوم ہوتا ہے:۔

ویرٹر نام ایک شخص ہے جسے قدرت نے بلند خیالی اور عالی دماغی کے ساتھ ایک نازک و حساس دل اور ضعیف ارادہ ودیعت کیا ہے۔ اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات کو اپنی مرضی کے مطابق نہ پا کر اور اپنے آپ میں ان کے بدلنے کی صلاحیت نہ دیکھ کر وہ ہر وقت دل ہی دل میں کڑھتا رہتا ہے اور نامساعد بخت کی شکایت کرتا رہتا ہے۔ غم روزگار کی جفائیں' اپنے ہم جنسوں کی نامہربانیاں اور بیوفائیاں' اور اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا مبالغہ آمیز احساس' یہ سب چیزیں مل ملا کر اسے دنیا سے' دنیا والوں سے اور اپنے آپ سے بیزار کر دیتی ہیں اور اس کی روح کو ایک دائمی بے قراری میں مبتلا رکھتی ہیں۔ چنانچہ سکون کی ناکام جستجو میں مصروف وہ شہر بہ شہر آوارہ و سرگرداں رہتا ہے۔ اپنی سیاحت کے دوران میں اسے جو قابل ذکر واقعات پیش آتے ہیں اور جو تاثرات اس کے قلب پر وارد ہوتے ہیں' ان کو وہ گاہے گاہے اپنے ایک دوست ولیم کو خطوں میں لکھ بھیجتا ہے۔ اسی سلسلے میں ایک مرتبہ وہ ایک مقام والہیم سے خط لکھتا ہے اور اس میں ایک عورت کا ذکر کرتا ہے' جس کے ساتھ مل کر اسے رقص کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس عورت کا نام شارلوت ہے اور وہ اپنی ماں کی وصیت کے مطابق ایک شخص البرٹ نامی سے منسوب ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں ویرٹر شارلوت کے جمال صوری و معنوی سے متاثر ہو جاتا ہے اور اس سے راہ و رسم بڑھاتے بڑھاتے آخرکار محبت کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ محبت صرف اس کے دل کا ایک خاموش جذبہ نہیں بلکہ البرٹ اور شارلوت بھی اس سے آگاہ ہیں۔ البرٹ اپنے حسن اخلاق کے باعث کبھی یہ بات نہیں جتاتا اور ویرٹر سے بہت خاطر و مدارات کا سلوک کرتا ہے۔ شارلوت بھی اس کی محبت کی قدردان ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ اس فرض کا احساس جو اس کی ماں نے مرتے دم اس پر عاید کیا تھا' اسے ایجاب محبت سے معذور رکھتا ہے۔ ویرٹر کو کبھی کبھی یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ اس کی محبت شارلوت کے دل پر اثر کرنے میں کامیاب ہوئی ہے اور وہ محض ضمیر کے تقاضے سے مجبور ہو کر یہ راز اس پر فاش نہیں کرتی۔ لیکن ویرٹر کی

حس اخلاقی بھی اتنی تاثر پذیر ہے کہ وہ شارلوت کے ضمیر پر غلبہ پانے کی کوشش کرنا گناہ کبیرہ سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ذہن میں کامیاب محبت کا وہ مفہوم نہیں جو عوام الناس کے ذہن میں ہوتا ہے۔ وہ نکاح کے رشتے کو جو دنیا داروں کی نگاہ میں عشق کی معراج ہے' اتصال روحانی کا ضامن نہیں سمجھتا۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ شارلوت کے قرب کا بھی خواہاں نہیں رہتا اور ایک سفیر کے ماتحت ملازمت اختیار کر کے کسی اور مقام کو چلا جاتا ہے۔ اس میں اس نے ایک مصلحت بھی سوچی ہے۔ اسے خوف ہے کہ مبادا کسی دن وہ بیخودی کے عالم میں ان مجرمانہ آرزوؤں کا جو اس کے دل میں کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں' اظہار کر بیٹھے اور وہ یہ نہیں چاہتا کہ شارلوت کو آزمائش و ابتلا میں ڈالے۔

ذیل کے خطوط انہی دنوں کے لکھے ہوئے ہیں' جب وہ شارلوت سے جدا ہو کر عملہ سفارت کے ہمراہ شہر بہ شہر پھر رہا تھا۔ پہلے خط میں ایک ناگوار واقعے کی طرف اشارہ ہے جو اسے چند روز پہلے پیش آیا تھا۔ جس شہر میں وہ مقیم تھا وہاں ایک کاؤنٹ سے اس کے مراسم دوستانہ ہو گئے۔ اور اس کے علاوہ ایک عورت سے جسے وہ مس ب..... کہتا ہے' محض مطابقت مزاج کی بنا پر جان پہچان ہو گئی۔ ایک دن کاؤنٹ نے اسے ایک تقریب پر مدعو کیا جس میں شہر کے روسا و امرائے کبار شریک تھے۔ ان لوگوں نے اس سے نخوت فروشی کا سلوک کیا اور مس ب..... بھی خلاف توقع اس مجلس میں اس سے ہمکلام نہ ہوئی۔ اس سے اس کی عزت نفس کو بہت صدمہ پہنچا! چنانچہ یہ خط اس کے برافروختہ جذبات کا اظہار ہے۔ اس کے بعد کے خط میں سفیر کی ملازمت سے مستعفی ہونے کا تذکرہ ہے کیونکہ اس کے ساتھ بھی اس کا نباہ نہ ہوتا تھا۔

ڈاکٹر ریاض الحسن

ورتھر کی داستان غم

(ابتدائیہ)

جرمنی کا عالم گیر شہرت رکھنے والا فلسفی شاعر، ڈرامہ نگار اور ناول نویس یوحان وولف گانگ گوئٹے ایک ہمہ گیر طبیعت لے کر پیدا ہوا تھا۔ ایک طرف اگر اس میں زندگی کے راز ہائے سربستہ کو جاننے اور سمجھنے کا شوق تھا، تو دوسری طرف اس عالم آب و گل کے ہر ذرے کا راز دار بننے کا بھی آرزو مند تھا(۱)۔ وہ فلک الافلاک کی سیر کا خواہشمند تھا مگر دنیائے سائنس سے بھی خاصی دلچسپی لیتا تھا۔ اس طرح اس کی ہمہ گیر طبیعت میں ایک ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی، جو اس کی سیرت کا بڑا کارنامہ ہے۔ اس میں تمثیل کی رنگینی کے ساتھ عقل، جوش و خروش کے ساتھ سکون اور عشق کی بے قراری اور وارفتگی کے ساتھ بے پروائی اور رمیدگی کا توازن اس مناسبت کے ساتھ تھا کہ اس کی روحانی زندگی ہمیشہ خارجی دنیا سے ہم آہنگ رہی۔ نپولین تو اس کو دیکھ کر پہلی ہی ملاقات میں بول اٹھا کہ "بے شک یہ ایک انسان ہے۔"

اس ہم آہنگی کی ایک وجہ اور بھی تھی یعنی اس کے سینے میں دو روحیں تھیں۔ "ایک تو شاعر کی حسن پرست، عشق پرور، شورش انگیز، ہنگامہ خیز روح اور دوسری حکیم کی عرفان جُو، حق پسند، سکون طلب، نظم آفرین روح۔" اس کو وہ ایک جگہ فاؤسٹ کی زبان سے یوں

ادا کرتا ہے کہ "میرے سینے میں دو روحیں ہیں اور ان دونوں میں بڑی کشمکش ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر غلبہ پانے اور دونوں ایک دوسرے کے پنجے سے آزاد ہونے کی جنگ میں مصروف ہیں۔ ایک نے جسمانی لذتوں کے شوق میں دنیاوی کثافتوں پر اپنا بدصورت جال پھیلا رکھا ہے اور دوسری اپنی جبلی طاقت کے زور سے اڑ کر آسمانوں کی طرف جانا چاہتی ہے جو اس کا پیدائشی اور آبائی مسکن ہے۔" یہ دو روحیں گویا نیکی اور بدی کی حامل ہیں اور ان کی کشمکش سے گوئٹے کی زندگی میں جو توازن پیدا ہو گیا تھا' وہی انسانیت کا وہ اعلیٰ جوہر ہے جو اس کو دوسری نامور ہستیوں سے ممتاز کرتا ہے۔ حالانکہ وہ جرمنی نژاد تھا' مگر وہ اپنے کو انسانیت اور تہذیب کا بجا طور پر نمائندہ سمجھتا تھا۔

یوحان وولف گانگ گوئٹے دریائے مائن کے کنارے والے شہر فرانک فورٹ (جرمنی) میں 28 اگست 1749ء کو بوقت دوپہر پیدا ہوا۔ اس کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور گھر ہی پر اس نے یورپ کی جدید اور قدیم زبانوں کے علاوہ مذہب و سائنس' تاریخ و جغرافیہ' ادب و فنون لطیفہ' شہسواری اور سپہ گری کی تعلیم حاصل کی۔ اس کی ابتدائی تربیت میں ماں کا بہت حصہ تھا جو اطالوی زبان کے علاوہ نغمہ اور موسیقی سے بھی بخوبی واقف تھی اور اس نے اپنے بیٹے کو اس فن کے اصولوں سے بہت جلد باخبر کر دیا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد باپ کی مرضی کے مطابق گوئٹے کو سولہ سال کی عمر میں لائپزگ کی یونیورسٹی میں قانون پڑھنے کے لئے داخلہ لینا پڑا۔ یہاں اس نے قانون کے علاوہ ادب اور فلسفہ کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ لائپزگ میں تین سال تک طلب علم کی خاطر محنت اور مشقت کی زندگی گذارنے سے اس کی صحت اتنی خراب ہو گئی کہ اس کو اپنے وطن واپس جانا پڑا اور وہاں علاج کے بعد اس کو کلّی صحت ہو گئی' مگر چونکہ ابھی اس کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی' اس لئے باپ نے اس دفعہ اس کو اشٹراس بورگ بھیجا تاکہ وہاں وہ قانون کی سند لے کر اپنی تعلیم مکمل کر لے۔ گوئٹے نے 1770ء میں اشٹراس بورگ کی یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور یہاں اس نے قانون کی سند لی' لیکن ساتھ ساتھ اس نے طب' علم کیمیا اور علم برق بھی پڑھنا شروع کیا۔

اشٹراس بورگ کے دوران قیام میں جس چیز نے گوئٹے کی شخصیت پر نہایت گہرا اثر ڈالا' وہ ہرڈر (Herder) کی ملاقات تھی۔ ہرڈر عجیب و غریب شخص تھا۔ وہ عقل کے مقابلے

میں احساس کی شدت' تیزی اور تربیت پر زور دیتا تھا' جو شاعری کا منبع اور عمل کی بنیاد ہے۔ اس کے خیال میں شاعری کا مقصد محض تفریح طبع نہیں ہے' بلکہ اس کا کام قوموں کو ابھارنا اور ان کو ایک بلند اخلاقی اور عملی سطح پر لانا ہے۔ وہ اپنے زمانے کی یورپی تہذیب پر سخت تنقید کرتا ہے' اس لئے کہ اس میں عملی پہلو عقلی اور جذباتی پہلو سے الگ ہے' اس کو قدیم تہذیبوں کا دور پسند تھا کیونکہ ان میں انسان اپنے عملی' جذباتی اور عقلی پہلوؤں میں فرق نہیں کرتا تھا۔ اس موضوع پر اس نے بہت سی قابل قدر تصنیفیں چھوڑی ہیں۔ جرمن ادب کی تاریخ میں ہرڈر ایک نئے طرز خیال کا بانی ہے' جس کے نتائج بہت دور رس ہوئے ہیں۔

ہرڈر کے فیض صحبت سے گوئٹے' گوئٹے بن گیا۔ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں گوئٹے ہرڈر کے کمالات اور ذہنی عظمت کا بڑی فراخ دلی سے اعتراف کرتا ہے۔ ہرڈر کی ملاقات کا اثر گوئٹے پر یہ ہوا کہ وہ فرانسیسیوں کی نقل چھوڑ کر جرمن طرز خیال کا پرستار بن گیا اور خود اپنے تمدن اور اپنی روح کی گہرائیوں میں اپنے مقاصد کی تلاش کرنے لگا۔ اس کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ قدیم روایات کا سلسلہ جو معاشرت کو مدتوں سے جکڑے چلا آتا تھا اور جو محض بے روح ہو کر رہ گیا تھا' ٹوٹ گیا۔ یہ انقلابی تحریک جرمن ادب میں (Sturm und Drang) "طوفان و ہیجان" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا دور دورہ کوئی دس سال یعنی 1770ء سے لے کر 1780ء تک رہا' مگر اس نے ادب اور معاشرے کی تمام چولیں ڈھیلی کر دیں۔ اس تحریک کو منضبط کرنے والا ہرڈر تھا مگر اس کو ادب و شعر میں کامیابی کے ساتھ برتنے والے گوئٹے اور اس کے رفقا تھے' جن میں بورگر (Buerger)' ہامن (Hamann)' مرک (Merck)' کلنگر (Klinger) اور لینز (Lenz) بہت مشہور ہوئے ہیں۔

تحریک "طوفان و ہیجان" کے ایوان کی زیبائش میں لیسنگ (Lessing) کی پرزور تنقید' اوسیاں کے دل ہلا دینے والے نغمے' شیکسپئر کی فطرت پرستی' شمالی یورپ کے اساطیر کی تجدید اور خیال اور عمل میں فرانسیسی مفکر روسو (Rousseau) کی پیروی کو بہت بڑا دخل ہے۔ روسو وہ شخص ہے جو اپنے زمانے سے ہمیشہ برسرپیکار رہا اور اس نے اپنے ہم عصروں میں ایک غیر معمولی نشاط کی کیفیت اور فکر و خیال میں ایک طرح کی گرمی پیدا کر دی تھی۔ ان سب نے مل کر نوجوانوں میں روایات کے خلاف ایک باغیانہ روح پھونک دی تھی اور

فطرت پرستی نے نوجوانوں کو ایک ایسی بے راہ روی پر ڈال دیا تھا' جس میں چاندنی راتوں کی تنہائی' طوفانوں کے شور اور موسیقی اور نغمے نے بجلیاں بھر دی تھیں۔ اس طرح فطرت پرست بن کر روایات کے خلاف بغاوت کرنا اور پھر خیال پرستی سے متاثر ہو کر ذرا ذرا سی تکلیف پر ماتم کرنا اور آنسو بہانا قابلیت کا ایک معیار بن گیا تھا۔ اگر جرمن بننا ہے تو طوفان پر سوار ہو جاؤ' قانون کو توڑ دو اور اکھڑ بن کر فطرت کی پیروی کرو۔ یہ تھا اس زمانے کے نوجوانوں کا انداز۔

1771ء میں گوئٹے وکالت کی سند لے کر اپنے وطن فرانک فورٹ واپس آیا اور یہاں اس نے وکالت بھی شروع کر دی' مگر وکالت میں اس کا بالکل جی نہیں لگتا تھا اور وہ بجائے وکالت کے ادبی دلچسپیوں میں منہمک ہو گیا اور اسی زمانے میں اس نے اپنا پہلا ڈرامہ "گوتس فان برلی شنگن" (Goetz von Berlichingen) لکھا جو بعد کو 1773ء میں شائع ہوا۔ گوتس کے قصے کا سرا جرمنی کی سولھویں صدی کی تاریخ میں ملتا ہے' جب تعلقہ داروں کا زور تھا۔ گوتس فان برلی شنگن سولھویں صدی کا ایک لڑاکا جنگجو تعلقہ دار ہے' جو غریبوں اور مظلوموں کی مدد کے لئے دوسرے تعلقہ داروں سے برابر لڑتا بھڑتا رہتا ہے اور انہیں کی خاطر ہر قسم کی سختیاں برداشت کرتا ہے۔ گوتس کی بہادری اور نیکی دکھا کر گوئٹے انسان کی فطری صلاحیتوں کو اکتسابی صلاحیتوں پر ترجیح دیتا ہے اور جماعت کے سامنے فرد کی کوششوں کو لائق تحسین قرار دیتا ہے۔ اس ڈرامے میں اس نے نوجوانوں کو اعلیٰ اخلاقی نصب العین کے حاصل کرنے میں فنا ہو جانے کی تلقین کی ہے' جس کی بنیاد آزادی اور فطرت پرستی پر ہو۔

"طوفان و ہیجان" کے خد و خال یعنی آزادی' فطرت پرستی' جوش' عمل' خلوص اور راستبازی اس ڈرامے میں مکمل طور پر نمایاں ہیں۔

فرانک فورٹ میں تھوڑے دنوں قیام کے بعد بجائے قانون کے اس کی ادبی سرگرمیاں تیز ہو گئیں' تو باپ نے اس کو ویتس لر (Wetzlar) کی عدالت عالیہ میں وکالت کرنے کے لئے بھیج دیا۔ مئی 1772ء میں گوئٹے ویتس لر پہنچا اور وکیلوں کی فہرست میں اپنا نام درج کروایا' مگر یہاں عدالت عالیہ کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ گوئٹے کے ایک تازہ ترین سوانح نگار ریچرڈ فریڈن ٹال کے بقول تنخواہ کم ہونے کی وجہ سے جج خوب رشوت لیتے تھے اور آرام و آسائش کی زندگی گذارتے تھے اور یہ رواج عام ہو گیا تھا۔ پھر ویتس لر کی سوسائٹی

میں معاشرتی امتیازات کا وہ زور تھا کہ ہر شخص اس کے بندھنوں میں گرفتار تھا' ہر شخص کی سوسائٹی میں جگہ معین تھی اور اگر کوئی شخص اپنی جگہ سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہٹتا تو اس پر کہرام مچ جاتا تھا اور جھگڑے کھڑے ہو جاتے۔ ان سب باتوں سے گوئٹے کی طبیعت وکالت سے بالکل اچاٹ ہو گئی اور اس نے بجائے قانون کے قدیم یونانی شعرا مثلاً ہومر اور پنڈار کے کلام کا مطالعہ شروع کیا۔ اسی زمانے میں اس نے کچھ نوجوانوں سے راہ و رسم بھی پیدا کر لی اور ان کے ذریعہ سے وہ ایک کلب کا رکن بھی بن گیا۔ اس کلب کے اراکین میں ایک نوجوان یروشلم تھا' جو برنس وک (Bruenswick) کے سفارتخانے میں منشی تھا۔ اس سے گوئٹے کی بہت جلد دوستی ہو گئی۔

و یتس لر ہی وہ مقام ہے جہاں "ورتھر" کے افسانے کی بنیاد پڑی۔ یوں تو گوئٹے کی تمام تصانیف میں اس کی زندگی کے جستہ جستہ واقعات کسی نہ کسی شکل میں شامل ہیں' مگر جیسا کہ اس کے سوانح نگاروں کا بیان ہے' گوئٹے کے ذاتی حالات کی جتنی صاف جھلک "ورتھر" میں نظر آتی ہے' اتنی اور کسی تصنیف میں موجود نہیں ہے۔ ایک ایک واقعہ کی تفصیل ہے جو "ورتھر" میں موجود ہے' گوئٹے کے حالات زندگی سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

و یتس لر کا قصبہ گندا اور اس کی گلیاں تنگ تھیں لیکن قرب و جوار کا منظر دلفریب تھا۔ یہ زمانہ شروع گرمی کا تھا' جب ہر چیز پر بہار کا جادو چل رہا تھا۔ گوئٹے نے وہاں پہنچ کر اپنے لئے ایک جگہ مخصوص کر لی تھی' جہاں وہ بیٹھ کر قہوہ پیتا اور دوستوں سے ادب' فنون لطیفہ اور قدیم یونانی شعرا کے بارے میں گفتگو کرتا۔ اس نے "ورتھر" میں جس چشمے کا ذکر کیا ہے' وہ اب تک موجود ہے۔ اکثر سیر کرتے کرتے وہ گاربن ہائم کے گاؤں تک نکل جاتا' جس کو "ورتھر" میں وہ والہائم کے نام سے پکارتا ہے۔

و یتس لر آنے کے دو تین ہفتے بعد اس کی ملاقات ایک شخص مسمی کیسٹنر (Kestner) سے ہوئی' جو ڈیوک آف ہریمین کے سفیر کا سیکریٹری تھا۔ وہ کلب کا کارکن تھا' مگر کام کی زیادتی سے رکنیت سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ کیسٹنر گوئٹے سے آٹھ سال بڑا تھا مگر دونوں کی طبیعتوں میں ایک طرح کی ہم رنگی تھی' جس سے دونوں بہت جلد دوست بن گئے۔ کیسٹنر نے گوئٹے کے ابتدائی زمانہ قیام کا حال اپنے ایک دوست کو ایک خط میں لکھا

ہے جس سے گوئٹے کی ذہنی کیفیت پر خاص روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ”موسم بہار میں یہاں ایک صاحب گوئٹے آتے ہیں۔ ان کی عمر قریب 23 سال کے لگ بھگ ہو گی۔ کسی امیر آدمی کے لڑکے ہیں۔ یہاں وکالت میں تجربہ حاصل کرنے آئے ہیں..... آدمی بہت قابل ہیں..... ان کے تخیل میں خاصی رنگینی ہے اور اسی وجہ سے وہ ہر چیز کا اظہار تشبیہ اور استعارے میں کرتے ہیں.... ان کے جذبات میں جوش بہت ہے مگر ساتھ ساتھ اپنے اوپر قابو پانے کی صلاحیت بھی ہے۔ ان کو نہ تو آبرو نہ رواج اور نہ فیشن کا خیال ہے۔ جو جی میں آتا ہے، کرتے ہیں۔ پابندیوں سے ان کو سخت نفرت ہے..... وہ بچوں کے گرویدہ ہیں اور ان کے ساتھ دیر تک کھیل سکتے ہیں، مگر وہ عجیب چوں چوں کا مربہ ہیں اور ان میں بعض باتیں قابل اعتراض بھی ہیں، لیکن بچوں، عورتوں اور بعض دووسرے لوگوں میں وہ بہت مقبول ہیں۔ وہ عورتوں کی عزت کرتے ہیں۔ ان کا ابھی کوئی اصول نہیں ہے، مگر رفتہ رفتہ وہ کوئی نہ کوئی اصول ضرور بنا لیں گے۔ روسو کے متعلق ان کا خیال بہت اچھا ہے، لیکن وہ اس کی اندھا دھند پیروی نہیں کرتے۔ وہ مذہب کے معاملہ میں تقلید کو پسند نہیں کرتے، لیکن ان کا غیر مقلد ہونا کسی غرور یا خبط یا شہرت کی خواہش کی وجہ سے نہیں ہے۔ بعض اہم مسائل پر وہ اپنی رائے کا بہت کم لوگوں سے اظہار کرتے ہیں، کیونکہ وہ لوگوں کے اپنے خیالات میں تلاطم پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ شک و شبہ سے دور بھاگتے ہیں اور چند اصولی باتوں میں سچائی اور حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں..... وہ نہ تو گرجا جاتے ہیں اور نہ کسی عبادت میں شریک ہوتے ہیں، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ میں کسی عبادت میں شریک ہو کر ریاکار نہیں بننا چاہتا۔ عیسائی مذہب سے بے شک ان کو محبت ہے مگر اس رنگ کو پسند نہیں کرتے، جس میں پادری اس کو پیش کرتے ہیں۔ معاد اور حیات بعد الممات کے قائل ہیں۔ یہاں ان کے خیال میں ایک بہتر روحانی نظام ہو گا۔ وہ سچائی اور حقیقت کے متلاشی ہیں، لیکن اس کے اظہار سے زیادہ اندرونی جذبے کی قدر کرتے ہیں۔ اتنی کم عمری میں انہوں نے بہت کچھ پڑھا ہے اور ان کی معلومات بھی بہت وسیع ہیں، لیکن ان سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ غور و فکر کے عادی ہیں۔ روٹی کمانے والے علوم کے علاوہ ان کو تمام علوم سے دلچسپی ہے۔“

وِیتس لر کے زمانہ قیام میں گوئٹے کی ملاقات ایک مشہور شہری مسٹر بوف کی لڑکی شار

لوٹے یوف (Charlotte Buff) سے ہوئی' جو لوٹے اور لوٹشن کے نام سے بھی پکاری جاتی تھی۔ شارلوٹے ایک حسین' نازک اندام' خوش باش اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ علم کا کوئی خاص شوق نہ تھا' مگر کچھ نہ کچھ پڑھنے کی عادی تھی۔ اس کا زیادہ تر وقت گھر کے دھندوں میں گذرتا تھا۔ اس کی ماں کو فوت ہوئے دو سال گذر چکے تھے اور اس کو اس وقت سے سولہ سال کی عمر میں گھر بار کا انتظام سنبھالنا پڑا اور اس کے کئی بھائی اور بہنیں تھیں۔ گھر کی دیکھ بھال اور صفائی' بچوں کی پرورش اور چولہے برتن کا سارا کام اس کی نگرانی میں ہوتا تھا لیکن اس کے پُرسکون ماتھے پر کبھی بل نہیں آیا۔

گوئٹے کی ملاقات شارلوٹے سے ایک رقص کے موقع پر ولپرٹ ہاؤزن کے قصبے میں ہوئی' جو ویتس لر سے گھوڑے گاڑی کی مسافت سے کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے فاصلے پر واقع ہے۔ کیسٹنر بھی اس رقص میں مدعو تھا' شارلوٹے جس طرح رقص میں پہنچی' اس کا پورا حال "ورتھر" میں درج ہے۔ جب کیسٹنر پہنچا' تو گوئٹے اس سے ملا۔ کیسٹنر نے اس ملاقات کا حال ایک خط میں یوں لکھا ہے: "گوئٹے ایک رقص کے موقع پر ایک گاؤں میں موجود تھے اور وہاں میں اور میری منسوبہ بھی گئے تھے۔ میں دیر میں پہنچا.... میری منسوبہ دوسرے لوگوں کے ساتھ گئی۔ گاڑی میں ڈاکٹر گوئٹے بھی تھے' جو پہلی مرتبہ میری منسوبہ سے ملے۔ وہ بہت قابل آدمی ہیں اور انہوں نے فطرت کے طبعی اور اخلاقی پہلو کے مطالعہ کو اپنا خاص شعار بنا لیا ہے اور ان دونوں صورتوں میں حسن کے جویاں ہیں۔ رقص میں شرکت کرنے والی کسی خاتون سے مل کر ان کو خوشی نہیں ہوئی' مگر شارلوٹے فوراً ان کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ شارلوٹے میں جوانی کی امنگ ہے اور گو بہت حسین نہ سہی' مگر اس کے چہرے میں خاصی دلکشی ہے۔ اس کی نظر میں موسم بہار کی تازگی ہے اور اس روز تو اس میں یہ دلکشی خاص طور پر نمایاں تھی' کیونکہ وہ رقص پسند کرتی ہے۔ وہ بہت خوش نظر آتی تھی اور سادہ لباس زیب تن کئے ہوئے تھی۔ فطرت کے حسن میں شارلوٹے کی دلچسپی کا احساس گوئٹے کو ہوا اور اس کو شارلوٹے کی ذہانت اور خوش طبعی کا بھی علم ہوا۔ گوئٹے کو اس بات کا مطلق علم نہ تھا کہ وہ کسی سے منسوب ہے۔ میں کئی گھنٹے بعد پہنچا۔ ہم لوگوں میں یہ دستور ہے کہ سب کے سامنے اپنی منسوبہ سے سوائے معمولی دوستی کے اور کسی چیز کا اظہار نہیں کرتے۔ وہ بھی اس وقت بہت خوش تھا اور اکثر خوش رہتا ہے' مگر بعض وقت دلگیر و ملول بھی رہتا

ہے۔ شارلوٹے اس کی نظر میں سما گئی۔ کچھ اس وجہ سے کہ اس نے معاملے کی اصل حالت گوئٹے کو نہیں بتائی اور وقتی طور پر رقص سے لطف اٹھانے میں منہمک ہو گئی۔ دوسرے دن گوئٹے اس سے ملنے آیا۔ رقص کے موقع پر تو اس نے شارلوٹے کو ایک ایسی لڑکی کی طرح دیکھا تھا' جو خوش باش ہونے کے علاوہ رقص کی مشتاق اور لطف و انبساط کی گرویدہ ہو' لیکن اب اس نے اس کو بالکل دوسرے.... اور بہتر رنگ میں دیکھا' یعنی گھر کے کاروبار میں مشغول دیکھا۔"

اپنی خود نوشت سوانح عمری میں گوئٹے شارلوٹے کے بارے میں لکھتا ہے کہ .....

"شارلوٹے کی طبیعت سادہ تھی۔ دوسرے اس نے ایسے شخص سے محبت کرنا شروع کی تھی' جو ہر طرح اس کے لائق تھا اور جو ہر سرد و گرم میں اس کا رفیق بننے پر تیار تھا.... اس نے اپنے چاروں طرف مسرت اور انبساط کی فضا پیدا کر لی تھی۔ نئے ملاقاتی (اپنی طرف اشارہ ہے) نے اول اول اپنی پرانی روش (یعنی عاشق مزاجی) پر چلنا شروع کیا اور جلد ہی اس کے عشوہ و ناز کا شکار ہو گیا' مگر وہ دونوں (شارلوٹے اور کیسٹر) اس کے ساتھ محبت اور دوستی کا ایسا برتاؤ کرتے کہ وہ اپنے آپ کو بھول بیٹھا۔ تخیل پسند اور ایک گونہ کاہل ہونے کی وجہ سے وہ حال سے دل برداشتہ ہو گیا۔ پھر اس کو لوٹشن میں ایک دوست کی ساری خصوصیات نظر آنے لگیں۔ گو لوٹشن مستقبل سے بے پرواہ نہ تھی' مگر حال سے بھی لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔ اس نے اس ملاقاتی کی دوستی سے لطف اٹھایا اور وہ ملاقاتی بھی اس کی عدم موجودگی کو محسوس کرتا.... کچھ دنوں بعد میدان اور باغ کی سیر میں دونوں ساتھ جانے لگے..... کبھی کبھی لوٹشن کا منگیتر بھی ساتھ ہو لیتا' مگر ان تینوں کو مطلق خبر نہیں ہوئی کہ تینوں کس طرح ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔"

چونکہ گوئٹے کو ویتس لر میں معمولی قانونی ذمہ داریوں کے علاوہ اور کوئی کام نہ تھا' اس لئے زیادہ تر وقت لوٹشن کے ساتھ گذارتا۔ وہاں بچوں کے ساتھ کھیلتا' چنانچہ ورتھر کی زبان سے ایک جگہ کہتا ہے کہ "مجھے یہاں کے سب لوگ خاص کر بچے بخوبی جان گئے ہیں اور مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ ان حالات میں گوئٹے' شارلوٹے کے دل میں اپنی محبت استوار کرنا چاہتا تھا مگر شارلوٹے کیسٹر کی منسوبہ ہونے کی وجہ سے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتی تھی اور وہ کوئی ایسا قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں تھی' جس سے کسی قسم کی غلط فہمی کا اندیشہ

ہو۔

کیٹس اپنے ایک خط میں لکھتا ہے کہ "ایک نوجوان جس کی عمر 23 سال ہے' شارلوٹے کا گرویدہ ہو گیا ہے۔ یوں تو وہ نوجوان ہے مگر علم اور دماغی نشو و نما اور سیرت کے اعتبار سے وہ سن رسیدہ آدمی ہے۔ اس کی قابلیت خداداد ہے۔ اس کے خاندان والوں نے اس کو یہاں قانونی تعلیم و تجربہ حاصل کرنے کے لئے بھیجا ہے' مگر وہ دراصل فطرت اور سچائی کا متلاشی ہے اور قدیم یونانی شاعر ہومر اور پنڈار کا مطالعہ کرتا ہے' لیکن وہ روٹی کمانے کے لئے علم حاصل نہیں کرتا۔ اس شہر میں آنے کے بعد اس سے اتفاقیہ طور پر شارلوٹے سے ملاقات ہو گئی اور اس کو شارلوٹے میں ایک مثالی عورت کے انداز معلوم ہوئے۔ اس نے شارلوٹے کو اول اول ایک خوش باش عورت کے روپ میں دیکھا تھا' لیکن بہت جلد اس کو پتہ چل گیا کہ یہ اس کا بہترین روپ نہیں ہے' لیکن جب اس نے اس کو خانہ داری کے کام کاج میں مصروف دیکھا' تو پھر اس کا مداح بن گیا۔ اس کو معلوم کرنے میں زیادہ دن نہیں لگے کہ لوٹشن اس کی محض دوست ہو سکتی ہے۔ لوٹشن کا برتاؤ گوئٹے کے ساتھ بہت قابل تعریف ہے۔ ہم لوگوں میں مذاق کی یکجہتی اور ان دونوں کے آپس کے میل جول نے ہم دونوں کو بہت قریبی دوست بنا دیا۔ حالانکہ گوئٹے لوٹشن کی طرف سے مایوس ہو کر اس سے کُلّی طور پر دست بردار ہو چکا تھا' لیکن اپنے جذبات کو باوجود اپنی فلسفہ دانی اور اپنی طبیعت کے فطری وقار اور تمکنت کے اچھی طرح نہ دبا سکا۔ اس میں چند ایسی خصوصیات ہیں' جو حساس اور بامذاق عورتوں کے لئے سخت خطرے کا باعث ہو سکتی ہیں' لیکن لوٹشن نے اس سے اول روز ہی سے ایسا برتاؤ شروع کیا' جس سے گوئٹے کے دل میں کسی قسم کی نازیبا امید پیدا ہونے کا کوئی امکان نہ ہو اور ساتھ ہی شارلوٹے کے برتاؤ کی اس کے دل میں قدر بھی پیدا ہو جائے' مگر گوئٹے کا دماغی سکون اور دلی اطمینان اتنے میل جول ہی میں رخصت ہو گیا۔ بعض وقت تو ایسے مواقع بھی پیش آئے' جنہوں نے میرے دل میں لوٹشن کی قدر و منزلت اور بھی بڑھا دی۔ ساتھ ہی گوئٹے بحیثیت دوست کے میرے لئے زیادہ قابل قدر ہو گیا لیکن مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ محبت بھی کیا بلا ہوتی ہے' جو ایسے بھلے چنگے اور ضبط نفس والوں کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ پھر مجھے گوئٹے پر رحم بھی آیا اور اس طرح میں ایک سخت کشاکش میں گرفتار ہو گیا' کیونکہ ایک طرف تو مجھے یہ خیال ہوتا کہ میں لوٹشن کو اتنا خوش نہیں رکھ سکتا' جتنا

گوئٹے رکھ سکے گا۔ لیکن دوسری طرف لوٹشن کو چھوڑنے کے خیال کو برداشت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ آخرکار یہی دوسرا خیال کامیاب رہا' مگر خود لوٹشن میں میں نے اس کشاکش کا ذرا سا بھی شائبہ نہیں دیکھا۔"

ایک دفعہ گوئٹے اور شارلوٹے میں بوس و کنار کی نوبت بھی آ گئی تھی' جس سے شارلوٹے نے فی الفور کیسٹنر کو آگاہ کر دیا مگر کیسٹنر نے تھوڑے سے اظہار ناراضگی کے بعد اس کو درگذر کر دیا۔ دوسرے روز شارلوٹے نے گوئٹے کو نہایت نرمی سے اس کی نازیبا حرکت اور بے اعتدالی پر نصیحت بھی کی۔ دراصل کیسٹنر کی شریفانہ طبیعت نے اس میں رقابت کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہونے دیا' کیونکہ وہ اپنی منسوبہ کی سیرت کی مضبوطی سے واقف ہو گیا تھا۔ اس طرح دونوں کی دوستی برابر جاری رہی' البتہ یہ معاملہ اس لحاظ سے ذرا نازک تھا کیونکہ کیسٹنر ابھی باقاعدہ رشتہ مناکحت میں منسلک نہیں ہوا تھا اور اس گومگو کے عالم میں اس کو نتیجے کی طرف سے ضرور اندیشہ ہونا چاہئے تھا۔ 28 اگست کو اتفاق سے گوئٹے اور کیسٹنر دونوں کی سالگرہ تھی۔ اس دن کیسٹنر نے گوئٹے کو قدیم یونانی شاعر ہومر کے کلام مولفہ ویٹ اشٹائن کا ایک نسخہ تحفتاً" بھیجا' جس کا ذکر "ورتھر" میں موجود ہے۔

آخرکار جب عشق کی آگ اور ذرا تیز ہو گئی اور گوئٹے ڈرا کہ اس شعلے سے کہیں کیسٹنر اور لوٹشن کو نقصان نہ پہنچ جائے' تو وہ یکایک ویتس لر سے بغیر کسی سے ملے چلا آیا۔ یہ رمیدگی اس کی سیرت کا خاص پہلو ہے یعنی اس نے کبھی عشق کی منزل میں اپنے کو اتنا نہیں الجھایا کہ بغیر شادی کے اور کوئی صورت ممکن نہ ہو۔ دور حاضر کے ایک جرمن سوانح نگار پروفیسر فریڈن ٹال کا خیال ہے کہ گوئٹے عورتوں کے میل ملاقات اور دوستی کو ہمیشہ وقتی تصور کرتا تھا اور اس میں الجھنے سے ڈرتا تھا۔ دراصل یہ الجھاؤ اس کی زندگی کا سب سے بڑا خوف بن گیا تھا۔

آنے سے دو ایک روز قبل باتوں باتوں میں لوٹشن سے حیات بعد الممات کا ذکر چھڑ گیا۔ پھر لوٹشن نے اپنی والدہ کی موت کا حال بیان کیا۔ یہ سارا ماجرا مع سوال و جواب کے ٹھیک اسی روز کی تاریخ میں یعنی 10 ستمبر کے خط میں "ورتھر" میں درج ہے۔ لوٹشن سے آخری بار مل کر گوئٹے گھر گیا اور اس نے ایک خط کیسٹنر اور ایک لوٹشن کو لکھا' جو اس کی روانگی کے بعد دیا جانے والا تھا۔ روانگی کے دن اور اس سے ایک روز قبل کا حال کیسٹنر

کے روزنامچے سے یوں معلوم ہوتا ہے۔

"10 ستمبر 1774ء۔ آج ڈاکٹر گوئٹے نے میرے ساتھ باغ میں کھانا کھایا۔ مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ یہ آخری ملاقات تھی۔ شام کو وہ مجھ سے ملنے آئے..... وہ' لوٹشن اور میں تینوں بڑی دیر تک حیات بعد الممات پر گفتگو کرتے رہے..... گفتگو لوٹشن نے شروع کی تھی۔ ہم لوگوں میں یہ طے ہوا کہ جو ہم میں سے پہلے دنیا سے کوچ کرے' وہ اپنے بقیہ دوستوں کو اگر ممکن ہو سکے' اپنی دوسری زندگی کی خبر بھیجے۔ گوئٹے بہت افسردہ دل تھا کیونکہ اس نے دوسرے روز جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔"

11 ستمبر 1774ء۔ آج صبح کو سات بجے گوئٹے ہم لوگوں سے بغیر ملے چلے گئے۔ چلتے وقت انہوں نے ایک خط مع چند کتابوں کے بھیجا۔ جانے سے بہت پہلے انہوں نے کہہ رکھا تھا کہ وہ اسی زمانے میں کوبلنز (Coblenz) چلے جائیں گے' جہاں ان کا دوست مرک (Merck) ان کا انتظار کر رہا ہو گا اور وہ کسی سے ملے بغیر یکایک روانہ ہو جائیں گے۔ تو مجھے اس کا خیال ضرور تھا' لیکن اس کے باوجود میں اس طرح کی روانگی کے لئے تیار نہیں تھا۔ ان کے اس فعل سے مجھے شدید روحانی تکلیف ہوئی ہے..... ہر بچے کی زبان پر یہی تھا کہ ڈاکٹر گوئٹے چلے گئے..... شام کو میں نے گوئٹے کا خط شارلوٹے کو دیا۔ وہ بھی گوئٹے کے چلے جانے سے بہت رنجیدہ ہوئی اور خط پڑھتے پڑھتے تو آنسوؤں کے قطرے بے اختیار اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔ مگر وہ ایک طرح سے مطمئن بھی تھی کہ وہ چلے گئے کیونکہ وہ جس قسم کی محبت کا تقاضا کرتے تھے' وہ ان کو نہیں دے سکتی تھی۔"

گوئٹے لوٹ کر فرانک فورٹ آیا تو عشق کی ایک زندہ داستان بن کر آیا' مگر دوست احباب کے بیکاری کے طعنوں اور شارلوٹے کی جدائی نے حالانکہ ایک سوحان روح پیدا کر دیا تھا' مگر وہ شارلوٹے سے دور ہی رہنا چاہتا تھا۔ اس اضطراب کے عالم میں وہ قانون' ادب' نقاشی اور مصوری کی طرف رجوع ہوا۔ جون 1773ء میں اس نے گوتس کا ڈرامہ شائع کیا۔ گو اس کے خیال میں ویتس لر کی رنگین زندگی برابر سامنے رہتی اور اس کو ستاتی۔ اس تکلیف کو کم کرنے کے لئے اس نے ارادہ کیا کہ ویتس لر کی رنگین داستان کو ایک قصے کے پیرایہ میں لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کرے۔ اس طرح نوجوان ورتھر کی داستان غم 1773ء کے آخر میں لکھی گئی اور 1774ء میں شائع ہوئی اور شائع ہوتے ہی مقبول ہو گئی۔ بقول

ٹامس مان اس مختصر افسانے میں جو ناقابل بیان بجلیاں بھر دی گئی ہیں' ان کا اس وقت کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ "ورتھر" کی کامیابی کا راز اس فتنے میں پوشیدہ ہے' جو اس سے پیدا ہوئے یعنی اہل کلیسا اور بعض معلمین اخلاق اس کے سخت مخالف بن گئے' کیونکہ اس میں خودکشی کو اچھالا گیا تھا۔

ورتھر شائع ہونے کے بعد گوئٹے دنیائے ادب کی ایک نہایت ممتاز اور معروف شخصیت کا مالک ہو گیا۔ بڑے بڑے نامور اہل قلم دور دور سے ملنے آتے اور اس کی خداداد قابلیت کا برملا اعتراف کرتے۔ اس کا مکان دلدادگان ادب کا مرجع بن گیا تھا' گو اس نے جرمنی میں اور ورتھر نے یورپ میں ایک دھوم مچا دی۔

1775ء میں وہ ڈیوک آف وائمر کی ملازمت میں وزیر مقرر ہو کر وائمر چلا گیا اور ڈیوک کے آخری ایام تک اس عہدے پر فائز رہا۔ وائمر میں سکونت اختیار کرنے اور حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد اس کے خیالات میں حیرت انگیز نشو و نما ہوئی۔ 1786ء میں وہ کچھ صحت کی خرابی اور کچھ ذاتی حالات کی وجہ سے اطالیہ کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ وہاں وہ کوئی دو سال مختلف مقامات کی سیر کرتا رہا۔ اس زمانے میں گوئٹے نے وہاں کی قدیم تاریخ اور تمدن' آرٹ اور نقاشی وغیرہ کا مطالعہ کیا' جس کا اثر اس کے ذہنی ارتقا پر خاصا ہوا۔ اس مطالعہ سے اس کو پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ انسان کس طرح لاابالیانہ زندگی کی قوتوں اور غیر ذمہ دارانہ جوش و خروش کو زندگی میں نظم و ترتیب اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔ اب اس نے طوفانی اور ہیجانی دور کے خیالات سے توبہ کی اور خود اپنی پچھلی تصنیفوں پر سخت تنقید کی۔ پہلے اس کا انداز انفرادی تھا' مگر اب ہر چیز کو وہ جماعت اور تمدن کے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے یعنی فرد کو جماعت کے مفاد سے کس طرح ہم آہنگ بنایا جا سکتا ہے۔

اطالیہ سے واپس آیا تو نئے خیالات کا اس کے دل میں طوفان برپا تھا۔ وائمر کی تنگ زندگی بے کیف معلوم ہونے لگی۔ دوستوں کی صحبت میں اس کا جی گھبراتا۔ اپنی اس حالت کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ "میں صورت دار اطالیہ سے بے صورت جرمنی میں واپس آ گیا.... میرے دوست بجائے مجھے تسلی دینے اور اپنی طرف بلانے کے مجھ سے بددل ہو کر مایوس ہو گئے ہیں۔ قدیم زمانے سے میری گہری دلچسپی سے..... ان کو سخت تکلیف ہونے لگی

ہے۔ میرا کوئی ہمدرد نہیں.... افسوس! میری زبان کوئی نہیں سمجھتا۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے سے بہت بلند ہو گیا ہے۔ 1808ء میں اس نے اپنے شاہکار "فاؤسٹ" کا حصہ اول شائع کیا۔ اس کے بعد دوسری تصنیفوں میں منہمک ہو گیا۔ یہ زمانہ یورپ میں انتہائی کشاکش کا تھا۔ ہر طرف جنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ نپولین یورپ پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتا تھا۔ گوئٹے چونکہ سیاسی آدمی نہیں تھا' اس لئے ان تمام ہنگاموں سے بچنے اور کچھ اپنی طبیعت کو یورپ کے ماحول سے ہٹانے کے لئے اور کچھ فطری طور پر مشرق کے تمدن سے متاثر ہو کر اس نے ایران کی شاعری اور مذہبی تمدن کا مطالعہ شروع کیا۔ 1819ء میں اس نے "مغربی مشرقی دیوان" شائع کیا جس کی نظمیں فارسی ادب اور خاص کر حافظ سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھیں۔ گوئٹے نے خواجہ حافظ کی آنکھوں سے جو ایرانی کیف و مستی کا مشاہدہ کیا' تو بے اختیار ہو گیا۔ اس کو کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ شاید میری روح خواجہ حافظ کے پیکر میں مشرق کی زمین میں زندگی بسر کر چکی ہے۔ پھر گوئٹے پہلا یورپی شخص ہے' جس نے مشرق کے خلاف مغربی تعصب کو کم کرنے کی کوشش کی اور اپنا دیوان شائع کر کے اس نے گویا مغرب و مشرق میں دوستی اور مفاہمت کا بیج بویا۔ اس کی دیگر تصانیف میں ہرمان اور ڈروتھیا (Hermann und Dorothea) کلاویگو (Clavigo) اور ولہیلم مائسٹر کی سرگذشت (Wilhelm Meisters Wander jahre) مشہور ہیں۔

اپنے آخری زمانے میں خانہ نشین ہو کر اس نے "فاؤسٹ" کا دوسرا حصہ مکمل کیا اور ایک مختصر سی علالت کے بعد 22 مارچ 1832ء کو اس عالم فانی سے کوچ کر گیا۔ مرتے وقت اس کی زبان پر "روشنی' مزید روشنی" کے الفاظ جاری تھے۔

گوئٹے کو انتقال کئے ہوئے سوا سو برس سے زائد ہو چکے ہیں' مگر اس پر رائے زنی اور تنقید کا سلسلہ اب تک بند نہیں ہوا ہے۔ کسی نہ کسی نقطہ نظر سے برابر اس پر مضامین اور کتابوں کا سلسلہ جاری ہے۔ چونکہ گوئٹے جرمن ہونے کے ساتھ ساتھ انسانیت اور تہذیب کے شرف کا بھی ماننے والا تھا' اس لئے ہٹلر کے دور میں اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی گئی تھی' مگر جنگ عظیم کے بعد اس کی شخصیت پھر ابھر آئی ہے اور حال میں تو اس کی شہرت خاصی بڑھ گئی ہے۔ اس کو ثقافت اور علم کے میدان میں نہ صرف یورپ کا نمائندہ مانا جاتا ہے' بلکہ اس کو علم انسانیت کا بھی دوست گردانا جاتا ہے۔ یہ اس کی شہرت کو دوبالا کرتا

ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں' ان کی صرف فہرست سے دو ہزار صفحات سے زائد پر ہو جائیں گے.... دراصل یہ اعزاز آج تک کسی مصنف کو حاصل نہیں ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بحر تصنیف میں ایسے گہر آبدار بھی ہیں' جن کی چمک تا ابد قائم رہے گی اور جن کو قبول دوام کی سند مل چکی ہے۔

ورتھر کی ابتدا

جب گوئٹے ویتس لر سے لوٹ کر فرانک فورٹ آیا' تو اس کے بہت سے قریبی دوست فرانک فورٹ جا چکے تھے۔ ان کی عدم موجودگی اس پر سخت گراں گذری۔ تنہائی میں اکثر دنیا کی بڑی بڑی شخصیتوں سے عالم خیال میں باتیں کرتا۔ اس کے علاوہ لوٹشن کی محبت کا نقش بھی اب تک دل سے مٹا نہ تھا۔ لوٹشن کی یک رخی تصویر دیوار پر لٹکا کر گھنٹوں دیکھا کرتا تھا۔ ابھی اس کو آئے دو ہفتے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک خط میں لکھتا ہے کہ "میں ابھی ابھی رات کو لوٹشن کی یک رخی تصویر سے رخصت ہو کر آیا ہوں۔" کیسٹر کو ایک خط میں لکھتا ہے کہ "یقین مانو کل شام کو تم سے اور لوٹشن سے قریب ایک گھنٹے کے باتیں کرتا رہا.... دروازے کی طرف جاتے ہوئے میرا ہاتھ ایک کاغذ پر پڑا..... دیکھا تو لوٹشن کی تصویر تھی۔ اسے چھونے سے کیسا دل خوش کن احساس پیدا ہوا۔ میں نے اسے بڑے شوق سے سلام کیا اور چلا گیا۔"

نومبر 1772ء میں گوئٹے کو اطلاع ملی کہ اس کے ویتس لر کے دوست یروشلم نے خودکشی کر لی۔ یروشلم ایک امیر آدمی کا لڑکا تھا اور سفارتخانے میں منشی تھا اور دوستوں میں "نوشہ" کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے چہرے میں نرمی تھی۔ رنگ سرخ و سفید تھا' آنکھیں نیلی اور خوبصورت تھیں' حالانکہ اس کے خیال میں صفائی اور عمل میں پختگی تھی' مگر تخیل میں بلا کی تیز رفتاری تھی۔ سفارت خانے کے کام میں اس کا جی بہت کم لگتا۔ اس وجہ سے سفیر سے ان بن ہو گئی تھی۔ البتہ شعر و شاعری و فلسفہ اور خاص کر انگریزی ادب کا دلدادہ تھا۔ تنہائی پسند تھا اور اکثر چاندنی راتوں میں تنہا سیر کو نکل جاتا۔ حساس دل رکھنے کی وجہ سے اکثر غمگین رہا کرتا اور موت کی آرزو کرتا۔ یہ اس وقت کے جرمن ادب کا ایک

خاص موضوع ہے۔ خودکشی سے کچھ دنوں قبل اس نے ایک شخص سے خودکشی کے مسئلہ پر گفتگو بھی کی تھی۔ انگریزوں کے لباس کی پیروی میں جیسا جنوبی جرمنی میں رواج ہو گیا تھا' وہ نیلا کوٹ پیلی واسکٹ اور پیلے رنگ کا پتلون پہنتا' جو ورتھر کی پوشاک بتائی گئی ہے۔

وہ یتس لر کے دوسرے سفیر کے سکریٹری کی حسین بیوی پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا' مگر سب کے سامنے یہ دونوں بہت کم ملتے تھے۔ آخر اپنی معشوقہ کی سردمہری سے تنگ آکر ایک روز آدھی رات کو اکتوبر 1773ء میں کیسٹنر سے پستول منگا کر اس نے خودکشی کر لی۔

اس خطرناک واردات کے دن وہ اپنے کاغذوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہا اور متعدد بار باہر بھی گیا۔ اسی روز اس نے اپنا قرض وغیرہ بھی ادا کیا۔ رات کو نوکر سے آگ جلوائی اور اس کے دوسرے روز علی الصباح تیار رہنے کا حکم دیا۔ رات کو اس نے تھوڑی سی شراب بھی طلب کی تھی۔ اس کی میز پر مشہور جرمن مصنف لیسنگ کا ناول "ایمیلیا گالوتی" کھلا پڑا تھا۔ چونکہ اس نے خودکشی کی تھی' اس لئے عیسائی مذہب کے مطابق کوئی پادری اس کے جنازے میں شریک نہیں ہوا اور نہ کوئی مذہبی رسم ادا کی گئی۔

اس دلدوز واقعہ کی خبر سے تمام قصبے میں اتنی سنسنی پھیلی کہ بہت سے لوگ اپنی نیند کھو بیٹھے' لیکن جب نوجوانوں کو معلوم ہوا کہ یہ خودکشی عشق میں ناکامی کی وجہ سے ہوئی ہے تو ان کا جوش و خروش بہت بڑھ گیا۔ اپنی سوانح عمری میں گوئٹے لکھتا ہے کہ "ورتھر کو لوگوں نے یروشلم کی زندگی اور سیرت کا بالکل چربہ سمجھا' کیونکہ مقام اور شخصیت دونوں میں یکسانی پائی گئی اور بیان بھی اتنا قدرتی تھا کہ لوگ مطمئن ہو گئے کہ ان کو واقعے کی ٹھیک تفصیل ملی ہے' لیکن واقعے کو غور سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اصل اور نقل میں فرق ہے اور اصلیت کا پتہ لگانا بڑا مشکل کام ہے کیونکہ صحیح جانچ پڑتال سے ہزاروں قسم کے شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ واقعات کی اصلی تہ تک پہنچنا ناممکن تھا' کیونکہ اس افسانے میں میں نے اپنی زندگی کے بعض واقعات اور اپنی تکلیفوں اور پریشانیوں کی داستان کو اس طرح ملا دیا تھا کہ اصل اور نقل کا پتہ چلانا مشکل تھا' اور بات یہ بھی تھی کہ میں اس وقت ایک معمولی نوجوان تھا۔" اس زمانے کے ماحول کا ذکر کرتے ہوئے گوئٹے آگے چل کر لکھتا ہے کہ "ان حالات اور ان اثرات میں جذبات کی ناآسودگی نے خیالی تکالیف کو اور بھی بڑھا دیا تھا' لیکن ان تکالیف میں خارجی حالات کو کم دخل تھا۔ ہم لوگ اس طرح مجبوراً ایک بے رنگ اور

بے کیف زندگی گذارنے پر مجبور تھے اور ایسی تیرہ و تار فضا میں اس بیہودہ خیال کے حامل بن گئے کہ زندگی آسودگی سے نہیں گذر رہی ہے' تو اس سے کسی وقت بھی دامن چھڑایا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہماری روزمرہ کی زندگی کی بے کیفی اور بھی تیز ہو گئی اور یہ احساس اتنا عام ہو گیا تھا کہ جب "ورتھر" شائع ہوئی' تو اس کا بہت بڑا اثر ہوا۔ خاص کر اس وجہ سے بھی اس سے ہر جگہ لوگوں کو علانیہ ہمدردی ہو گئی' کیونکہ اس افسانے نے نوجوانوں کی افسردہ کرنے والی خام خیالی کو طشت از بام کر دیا تھا۔"

ایک عجیب بات یہ ہے کہ گوئٹے بھی اپنی جوانی کے اس دور میں خودکشی کے خیالات سے کھیلتا رہا اور ہر روز رات کو سوتے وقت ایک خنجر آبدار اپنے سینے میں چھپانے کی کوشش کرتا' مگر اس میں ناکام رہا اور آخرکار اس قسم کے مالیخولیا کا مذاق اڑانے لگا۔ پھر آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ "ورتھر" کا افسانہ لکھ کر میں نے اپنے کو خودکشی کے خطرے سے زیادہ خودکشی کے بیہودہ خیال سے نجات دلائی اور یہ خیال اس کاہلی اور بے کاری کے زمانے میں میرے دماغ میں جاگزیں ہو گیا تھا.... لیکن اس سے نجات پانے کے لئے میں ایک شاعرانہ مسئلہ سلجھانے پر مجبور ہو گیا یعنی اس مسئلہ پر جو کچھ میں نے سوچا یا محسوس کیا تھا' اس کو کس طرح تحریر میں لاؤں اور اس خیال سے میں نے کوشش کی کہ جو کچھ میرے اب تک کے دلخراش اور اندوہناک تجربات تھے' ان کو جمع کر کے کوئی چیز لکھوں' مگر کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اتنے میں یروشلم کی موت کا حال افواہاً معلوم ہوا اور بعد کو پورے واقعہ کی تفصیل معلوم ہو گئی۔ اسی وقت "ورتھر" کا خاکہ ذہن میں تیار ہو گیا اور تمام چیزیں مکمل صورت میں اس طرح جمع ہو گئیں' جس طرح ایک برتن میں جمتا ہوا پانی ایک معمولی حرکت سے جم کر فوراً برف بن جاتا ہے۔ گوئٹے کا ایک مشہور جرمن سوانح نگار گوئٹے کے اس بیان کو تسلیم کرتا ہے مگر دور حاضرہ کے ایک مشہور انگریز ناقد پروفیسر رابرٹسن کو اپنے ایک پیشرو انگریز سوانح نگار جارج ہنری لوئس(2) کی پیروی میں اس بیان کو تسلیم کرنے میں اس لئے پس و پیش ہے کہ یروشلم کی موت کے تقریباً پندرہ ماہ بعد یہ افسانہ لکھا گیا' حالانکہ بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ افسانہ فوراً لکھا گیا' لیکن گوئٹے کے بیان میں تعجب کی کیا بات ہے۔ گوئٹے اپنے ذہن میں صرف خاکے کے تیار ہونے کا ذکر کرتا ہے' افسانہ لکھنے کا نہیں۔ خود "فاؤسٹ" کا خاکہ اس کے ذہن میں اشٹراس بورگ کے زمانے میں آیا' مگر یہ خاکہ اس

کے دماغ میں برسوں پڑا رہا۔ پھر اس نے فرانک فورٹ میں کچھ لکھ کر قلم روک لیا۔ اس کام کو اس نے کئی دفعہ شروع کیا اور چھوڑا' تب کہیں مدتوں کی محنت کے بعد یہ تصنیف پوری ہوئی۔ اسی طرح یروشلم کی موت نے افسانے کا خاکہ اس کے دماغ میں تیار کر دیا' مگر لکھنے کی نوبت نہیں آئی کیونکہ اس زمانے میں وہ مصوری اور نقاشی میں مصروف رہا۔ پھر جب طبیعت مائل ہوئی' تو اس نے چار ہفتے میں لکھ کر پورا کر دیا۔ یہ بات یہاں واضح ہو جانا چاہئے کہ ورتھر کے قصے کا آخری جزو گوئٹے کے ذاتی تجربات سے بالکل مختلف ہے' البتہ اول باب کا بیشتر حصہ اس کی داستان و یتس لر کا ایک رنگین سرورق ہے' جس کو وہ تھوڑے سے تصرف کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ گوئٹے ورتھر نہیں ہے' گو ایک حد تک دونوں کی سیرت ضرور ملتی ہے' مگر دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

ورتھر کا قصہ

ورتھر ایک نہایت تیز حس رکھنے والا نوجوان ہے' جو شاید گوئٹے کا ہم عمر ہے۔ بلا کا ذہین ہے اور قابلیت بھی ایسی ہے کہ جس کام میں لگا دیا جائے' اس کو اچھی طرح انجام دے' مگر پہلو میں ایسا حسن پرست دل ہے' جو پکار پکار کر کہتا ہے کہ :

الفراق اے صبر و تسکین

الوداع اے عقل و دین

طبیعت میں طوفان کا سا جوش ہے اور قدرت نے ایسا رنگین تخیل عطا کیا ہے کہ عارض گل اور سرخی شفق کو اپنے ہی خون دل کی لالی سمجھتا ہے۔ مناظر قدرت کے نظارے سے بقدر تخیل بے چین ہو جاتا ہے۔ پابندیاں خواہ کسی قسم کی بھی ہوں' اس کے لئے بلائے جان ہیں۔ وہ آزادی کا دم بھرتا ہے' اس وجہ سے نوکری وغیرہ میں اس کا جی نہیں لگتا' کیونکہ اس میں محکومی کی بو آتی ہے۔ ایک دفعہ کسی سفارتخانے میں ملازم ہو گیا تھا' مگر جلد ہی استعفیٰ دے کر علیحدہ ہو گیا۔

افسانے میں کہیں اس کے باپ کا ذکر نہیں ہے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فوت ہو چکا ہے۔ باپ کے مرنے کے بعد اس کی ماں نے کسی دوسرے قصبے میں سکونت اختیار کر

لی ہے۔ ورتھر کا بچپن نہایت مسرت اور شادمانی کے عالم میں گذرا' البتہ استاد کی تیجی کبھی کبھی ناگوار ساعت ضرور پیدا کر دیتی تھی۔ دادی جان پریوں کے قصے سنا کر اس کے تخیل کو بھی ایڑ لگاتی تھیں۔ قصبے کے سامنے پہاڑ اور دریا کا منظر خاصا دلفریب تھا۔ محلے کے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں بقدر جوش و ہمت شریک ہوا' مگر کھیل کی حد نیبو کے دو درخت تھے' جن سے وہ آگے نہیں بڑھتا تھا اور اسی حد پر کھڑے ہو کر تخیل کے زور سے وہ پہاڑوں کے اندرونی مناظر کی سیر اور دریا پر سفر کرتا۔

جب بچپن کا زمانہ شباب میں آہستہ آہستہ تبدیل ہو رہا تھا' تو اس وقت کسی لڑکی سے ملاقات ہوئی' جو اس سے عمر میں بڑی تھی۔ اس کی ہم نشینی سے ورتھر کی خفیہ صلاحیتیں بیدار ہونے لگیں' لیکن یہ صحبت دیرپا ثابت نہیں ہوئی' کیوں کہ وہ کچھ دنوں بعد فوت ہو گئی۔ ورتھر پھر رنج و الم کا شکار ہو کر تنہائی کی زندگی بسر کرنے لگا اور اس دوران میں پھر ایک لڑکی لیو نورا سے ملاقات ہوئی جو خود ورتھر پر عاشق ہو گئی' مگر ورتھر اس سے کسی طرح دور ہی رہا۔

یہ زمانہ بہرحال لطف سے گذرتا ہے کہ رفتہ رفتہ بچپن کی معصومانہ اور بے فکری کی زندگی سے نکل کر وہ شباب کی خار دار وادی میں قدم رکھتا ہے' جس کا ہر جلوہ نظر فریب اور جس کا ہر خار جگر دوز ہے۔ مئی کا خوشگوار مہینہ ہے' جب یورپ میں سرما کی شدت ختم ہو جاتی ہے اور موسم معتدل ہو جاتا ہے اور ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ پھولوں اور سبزے سے ہری بھری وادیاں اور مرغزار دل کو لبھاتے ہیں۔ بہار کی طراوت گدگدی پیدا کرتی ہے اور فضا میں تتلی کو مصروف رقص دیکھ کر بے اختیار پرواز کی خواہش ہوتی ہے۔ اس ماحول نے ورتھر میں سرشاری اور بے خودی کا عالم پیدا کر دیا۔ نگاہ کسی نوبہار ناز کی طلب میں محو ہے کہ آخر دل کی مراد پوری ہوئی یعنی جون میں ایک محفل رقص کے موقع پر ایک حسینہ شارلوٹے سے ملاقات ہوئی۔ اس کی نگاہ بیباکانہ سے ورتھر کا دل ہاتھ سے چلا گیا اور دل کے ساتھ صبر و قرار بھی رخصت ہو گیا۔ ورتھر اس روز سے برابر شارلوٹے کے مکان پر جاتا ہے۔ اس کے پاس بیٹھ کر باتوں میں اس کا دل بہلاتا ہے۔ حالانکہ اس کو معلوم ہو چکا ہے کہ شارلوٹے ایک شخص آلبرٹ سے منسوب ہو چکی ہے' مگر ورتھر اس کی کچھ پروا کئے بغیر اپنے خیال میں مست ہے۔

آہ! از آں حرماں کہ دل را از خیالات محال
گاہ می دادم تسلی گاہ خون می ساختم
(عرفی)

اس طرح دن گذرتے جاتے ہیں کہ جولائی کے آخر میں شارلوٹے کا منگیتر آلبرٹ آتا ہے۔ آلبرٹ ایک نیک سیرت انسان ہے اور اس کا سینہ رقابت کے جوش سے خالی ہے' مگر اس کی آمد ہی سے ورتھر کی حرارت عشق سرد پڑنے لگتی ہے اور اب اس کی طبیعت میں نہ تو وہ اگلی سی روانی باقی رہتی ہے اور نہ وہ والہانہ شیفتگی۔ مناظر قدرت کی دلفریبیاں اب اس کے دل میں کوئی شوق نہیں پیدا کرتیں یعنی جوجذبہ مناظرقدرت کے اثر سے اس کے دل میں محبت پیدا کر کے اس کو مسرت اور شادمانی سے بیخود کر دیتا اور بہشت کی ساری نعمتوں کو اس کے سامنے پیش کرتا تھا' اس نے اب ایک ناقابل برداشت درد و محن کی صورت اختیار کر لی ہے۔" وہ معاملے کی نزاکت کو سمجھتا ہے مگر تب بھی کچھ نہیں کرتا۔ اس ناامید زندگی کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ آلبرٹ سے خودکشی پر بحث کرتا ہے اور اس فعل کو صحیح اور جائز قرار دیتا ہے۔ پھر آگے چل کر اس کے سامنے سے سارے حجابات اٹھ جاتے ہیں اور قبر کا گڑھا منہ پھیلائے بھیانک انداز میں دکھائی دیتا ہے اور وہ زندگی کے فانی ہونے پر بحث کرتا ہے۔ ان باتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دماغ اب تندرست نہیں رہا۔ اس کے دوست و ہمدم کو جب ورتھر کے ان خیالات کا پتہ چلتا ہے' تو وہ ورتھر کو وہاں سے فوراً چلے آنے کی تاکید کرتا ہے' مگر ورتھر کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ کر رک جاتا ہے۔ بالآخر 11 ستمبر کو بغیر کسی کو اطلاع دیئے چلا جاتا ہے اور یہاں پہلا باب ختم ہو جاتا ہے۔

دوسرے باب کے شروع ہی میں ہم کو علم ہوتا ہے کہ ورتھر کسی سفارت خانے میں منشی کے عہدے پر مامور ہو گیا ہے اور کام میں مشغول رہنے سے اس کی طبیعت میں سکون بھی پیدا ہو گیا ہے اور کام بھی جی لگا کر کرتا ہے' مگر سفیر سے ان بن ہو گئی' کیونکہ سفیر چڑچڑے مزاج کا آدمی ہے اور کاغذات وغیرہ میں زبردستی رسمی تحریر وغیرہ کی پابندی کراتا ہے۔ دوران ملازمت میں ورتھر کو وہاں کے امرا سے ملنے کا موقع ملتا ہے اور ان کے اخلاق کی ناگفتہ بہ حالت پر' جس میں اقتدار اور منصب کے لالچ کو دخل ہونے کے علاوہ نشستوں میں آگے پیچھے کا بھی خیال ایک نمایاں طریقے پر ظاہر ہوتا ہے' اس کو غصہ بھی آتا ہے اور

افسوس بھی۔ اسی طرح سال ختم ہو جاتا ہے۔

فروری میں اس کو آلبرٹ اور شارلوٹے کی شادی کا حال معلوم ہوتا ہے اور وہ ان کو مبارکباد دیتا ہے۔ مارچ میں طبقہ امرا میں سے اس کا ایک دوست کاؤنٹ "ک" اس کو مدعو کرتا ہے۔ جس دن ورتھر کاؤنٹ کے پاس جاتا ہے' اتفاق سے اسی روز کاؤنٹ کے یہاں امرا کے مجمع کا دن ہے۔ امرا کو منصب اور درجے کا بہت خیال ہوتا ہے۔ وہ کسی کم درجے کے آدمی سے ملنا اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ ورتھر وہاں بھولے سے ٹھہر جاتا ہے اور ایک جانی پہچانی لڑکی سے باتیں کرنے کی کوشش کرتا ہے' مگر وہ جواب سے احتراز کرتی ہے۔ آخر ورتھر سے کہہ دیا جاتا ہے کہ آپ یہاں سے تشریف لے جایئے۔ ورتھر اس پر بہت برہم ہوتا ہے اور غصے کی حالت میں گھر آتا ہے اور اسی مہینے استعفا دے دیتا ہے۔

مئی میں ایک پرنس کے ساتھ سیر و تفریح کی خاطر اس کی دعوت پر اس کے یہاں جاتا ہے' مگر اصل مطلب اس سے فوج میں داخلے کی سفارش کرنا ہے۔ پرنس اس خیال کی مخالفت کرتا ہے' جس سے ورتھر اس خیال سے باز آ جاتا ہے۔ جون کے آخر میں وحشت دل پھر اس کو شارلوٹے کی طرف لے جاتی ہے اور آلبرٹ ورتھر کا خیر مقدم کرتا ہے لیکن اب ہر چیز کا سماں بدلا نظر آتا ہے۔ نہ وہ زمین رہی نہ وہ آسمان' نہ وہ دل رہا اور نہ وہ حوصلے۔ پہلے اسے ہر چیز سے انس و رفاقت کی بو آتی تھی مگر اب ہر چیز سے بیگانگی ٹپکتی ہے۔ اس کو اب کسی چیز سے لطف نہیں ملتا' کیونکہ زندگی کا سارا آرام جو غم کی افزائش اور آنسوؤں کے گرم گرم قطروں میں پنہاں تھا چلا گیا۔ اب

نہ وہ گریہ سحری رہا' نہ وہ آہ نیم شبی رہی

شارلوٹے اب آلبرٹ کی وفا شعار بیوی بن چکی ہے مگر ورتھر سے ابتدائی بیباکانہ ملاقاتوں کے مزے ابھی تک اس کے دماغ سے محو نہیں ہوئے تھے۔

شارلوٹے اپنی اور ورتھر کی طبیعت میں ایک طرح کی ہم آہنگی محسوس کرتی ہے اور ورتھر کی شادی اپنی کسی خاتون دوست سے کر کے ورتھر کو اپنے قریب رکھنا چاہتی ہے۔ ورتھر کچھ دن اور وہاں ٹھہر جاتا ہے' مگر اس کا دل نہ تو مقصد کی تڑپ سے معمور ہے اور نہ امید کی چمک سے روشن۔ اس کے عزم میں نہ تو استقامت ہے اور نہ مضبوطی۔ مستقبل کا خیال کر کے لرز جاتا ہے۔ غرض اس کو افکار نے گھیر رکھا ہے اور افکار کے ہجوم سے اس کو ہر

طرف تاریکی نظر آتی ہے' لیکن اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک اور چیز ہے' جو دلیل سحر کا کام دے سکتی ہے اور اس کی ناامیدی کو ہمت سے اور کمزوری کو طاقت سے بدل سکتی ہے اور وہ مذہب کی بے پناہ قوت ہے۔ اس لئے وہ مذہب کی طرف جھکتا ہے' مگر چونکہ اس کے دل میں یقین کی جگہ شک و شبہ نے لے لی ہے' اس لئے مذہب سے بھی اس کی تسلی نہیں ہوتی۔

فطرت کے مہیب مناظر مثلاً اندھیری راتوں میں طوفان و سیلاب سے اس کو دلچسپی ہو جاتی ہے۔ جاڑے کی ٹھنڈی اور تاریک طوفانی راتوں میں وہ تنہا سیر کو نکل جاتا ہے' لیکن وحشت دل کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا آخری وقت اب قریب آ چکا ہے اور اسی اضطراب کی حالت میں وہ موت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ٹھان لیتا ہے' مگر مرنے سے پہلے اس درد مند عشق کی ایک خواہش ہے کہ ایک دفعہ شارلوٹے کے دیدار سے آنکھیں منور ہو جائیں۔ آخر آلبرٹ کی عدم موجودگی میں کرسمس سے ایک دن قبل شام کو وہ شارلوٹے کے یہاں جاتا ہے اور اوسیان کا ترجمہ پڑھ کر سناتا ہے اور پڑھتے پڑھتے دونوں بے تاب ہو کر روتے ہیں۔ پھر دونوں اس بے قراری کے عالم میں ہم آغوش ہوتے ہیں اور ورتھر شارلوٹے کے عفت مآب لبوں پر صدہا بوسہ شوق دیتا ہے۔ شارلوٹے کو فوراً اپنی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو ورتھر کی بے راہ روی سے چھڑا کر پاس والے کمرے میں چلی جاتی ہے اور دروازہ بند کر لیتی ہے۔ ورتھر مایوسی اور ناامیدی کے عالم میں پکارتا ہے' مگر وہاں جواب ندارد۔ آخر وہ واپس چلا جاتا ہے اور دوسرے روز آلبرٹ سے پستول منگا کر ٹھیک بارہ بجے رات کو خودکشی کر لیتا ہے۔ اس زمانے کے مشہور المانوی مصنف لیسنگ کا ناول "اِمیلیا گالوتی" جس میں خانگی زندگی کی آویزش دکھائی گئی ہے' اس کی میز پر کھلا ہوا پایا جاتا ہے۔ ورتھر کی لاش گویا زبان حال سے یہ سوال کر رہی ہے :

کس کے گھر جائے گا سیلاب "فنا" میرے بعد؟

ورتھر کی موت ایک ایسی شریف النفس ہستی کی موت ہے' جس پر صاحبان دل جتنا ماتم کریں کم ہے۔ ورتھر میں جذبہ عشق کے ساتھ غیرت اور حیا بھی ہے۔ وہ اپنے نفس کی عزت کرتا ہے اور کسی قسم کی بے عزتی برداشت نہیں کرتا۔ وہ کمزوروں کا دوست اور ظالموں اور بدنہادوں کا دشمن ہے۔ وہ قدرت کا شیدائی اور حسن کا پرستار ہے' مگر اس کی

سیرت کا سب سے بڑا نقص اس کی قوت ارادی کی کمزوری اور خارجی دنیا سے عدم یگانگت ہے۔

اپنی خود نوشت سوانح عمری میں گوئٹے لکھتا ہے کہ "زندگی کی تمام آسانیوں اور آسائشوں کی بنیاد خارجی اشیا کے بار بار واقع ہونے پر ہوتی ہے۔ مثلاً دن اور رات کی تبدیلیاں' موسم کا بدلنا' پھلوں اور پھولوں کے موسم کا آنا اور جانا اور جو کچھ بھی ہماری نظروں کے سامنے ہر زمانے میں آتا ہے' وہ اسی لئے ہوتا ہے کہ ہم اس سے لطف اٹھائیں۔ درحقیقت ہماری دنیاوی زندگی کی یہی برکتیں ہیں اور ان نعمتوں سے جتنا زیادہ ہم فائدہ اٹھائیں گے' اتنا ہی زیادہ ہم خوش و خرم ہوں گے' لیکن اگر یہ تمام تبدیلیاں ہمارے سامنے ہوتی رہیں اور ہم ان سے یک لخت منہ موڑ لیں اور ان خوبصورت چیزوں سے قطعی بے تعلق ہو جائیں تو پھر ہماری زندگی میں سب سے بڑی خرابی اور سب سے بڑی بیماری پیدا ہوتی ہے یعنی ہم زندگی کو ایک نفرت انگیز اور ناقابل برداشت بوجھ تصور کرنے لگتے ہیں۔ گوئٹے نے اس طرح ورتھر کی دماغی حالت کی تشریح بڑے اچھے لفظوں میں کی ہے۔ بقول پروفیسر اشتال "ورتھر کی بیماری کا یہی بنیادی سبب ہے۔ وہ فنا کا جام اس لئے پیتا ہے کہ وہ زندگی کی بے ثباتی سے سخت پریشان اور اداس ہے۔ زندگی کے کاروبار میں حصہ لینے کی بجائے وہ زندگی سے بالکل کنارہ کش ہو گیا ہے اور اس کو صرف دور سے دیکھتا ہے"۔ چنانچہ اپنے 22 مئی کے خط میں لکھتا ہے کہ میں نے اپنے اندر آپ اپنی دنیا پیدا کر لی ہے اور یہی دنیا خارجی ماحول سے بالکل علیحدہ ہونے کی وجہ سے اس کو تباہی و بربادی کی طرف لے جاتی ہے۔

ورتھر نے اپنے دل کی دنیا آباد کرنے کے لئے عشق و محبت کا جو راستہ اختیار کیا' وہ اخلاق کے بالکل خلاف تھا۔ اس سے اس کے اخلاقی انحطاط کا پتہ چلتا ہے اور ساتھ ہی اس کی دوسری کمزوریوں کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ دراصل گوئٹے نے اس دوگونہ انحطاط کے مدارج بڑی خوبی سے بیان کئے ہیں۔ اس بے راہ روی کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جا سکتی ہے کہ اس زمانے کی جرمن معاشرت میں نوجوانوں کے لئے مشاغل بہت کم تھے۔ انگریزوں کی طرح ان کے پاس کوئی سمندر پار کے مقبوضات نہیں تھے' جہاں جا کر وہ اپنی قوت عمل کو کام میں لاتے۔ نوابوں اور رئیسوں کا زور تھا اور قومی خدمت کے راستے بھی کم و بیش بند تھے۔ اس

طرح جرمن نوجوانوں کی زندگی تنہائی پسند ہو گئی تھی۔ پھر ورتھر میں ملازمت کی وجہ سے تنہا رہتے رہتے اور سفیر سے ان بن ہو جانے سے ایک طرح کی مردم بیزاری بھی پیدا ہو گئی تھی۔

ورتھر کی تلون مزاجی اور کاہلی کو بھی اس کی سیرت کی افتاد میں دخل ہے۔ اس کا دل اتنا نازک اور حساس ہے کہ عشق کی ناکامی' اس کی طبیعت کا فطری سوز و گداز اور زندگی کے عام معاملات سے اس کی علیحدگی اور اپنے دل میں آپ اپنی دنیا پیدا کرنے کی کوشش اور سوسائٹی کی بداطواری یہ سب مل کر اس کو توڑ دیتی ہیں۔ افسانے کی ابتدا ہی سے ہم کو ورتھر کے الم ناک نتیجے کا کچھ کچھ گمان گذرتا ہے اور جب آگے چل کر وہ مغموم رہنے لگتا ہے اور دنیا سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی پر بحث کرتا ہے' تو یہ گمان یقین سے بدل جاتا ہے اور اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اس کی قسمت کا راز اس کی سیرت میں پوشیدہ ہے۔ ورتھر ہر چیز کو تخیل کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ تخیل کا عاشق اور جذبات کا بندہ ہے۔ وہ صرف درد دل کی پرورش کرتا ہے اور اسی میں خوشی تلاش کرتا ہے اور اس طرح اس کا قلب حزیں تاریک اور متشائم خیالات کا گہوارہ اور رنج و الم کا مسکن بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا آدمی زیادہ دن ان حالات میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر تخیل کے ساتھ عمل بھی ہوتا یعنی خارجی دنیا سے ہم آہنگی ہوتی' تو ورتھر کو اپنی مشکلات کا احساس ہوتا اور تب اس کی جان بچ جاتی۔ محض تخیل زندگی کے لئے سخت خطرناک ہے' کیونکہ تخیل مجرد قویٰ کو مضمحل کر کے زندگی کو ختم کر دیتا ہے۔ اگر زندگی قائم رکھنا ہے تو تخیل کے ساتھ قوت عمل بھی ضروری ہے۔ ورتھر کا قصہ دراصل ایک ایسے نوجوان کا قصہ ہے' جس کو زندگی کے آلام نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہو' کیونکہ اس کی سیرت و طبیعت میں اب صحت کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ اس میں نہ تو فطرت اور نہ سوسائٹی کوئی بہتری پیدا کر سکتی ہے اور نہ مذہب اور آرٹ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آلام کا شکار ہو کر تیزی سے اپنی تباہی کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ عمل کے فقدان سے ورتھر کا افسانہ "طوفان و ہیجان" سے ہٹ کر ایک علیحدہ چیز بن گیا ہے۔ تحریک "طوفان و ہیجان" میں فعالیت کا عنصر زیادہ ہے' مگر ورتھر میں اس تحریک کا انفعالی اثر موجود ہے' اس لئے یہ ایک ایسا افسانہ بن گیا ہے' جس میں شباب کی رومانی کیفیات کی نفسی تصویر کشی کی گئی ہے۔

1808ء میں نپولین، جو یورپ پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہا تھا، جرمنی میں تھا۔ انگریزوں نے ہر طرف سے اس کی اقتصادی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ اس وجہ سے پریشان ہو کر نپولین زار روس سے ملنے کے لئے جرمنی کے ایک چھوٹے سے قصبے ایرفورٹ (Erfurt) گیا۔ یہ قصبہ وائمر سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں نپولین اور زار روس کے استقبال کے لئے قریب کے تمام چھوٹے چھوٹے حکمران جمع تھے۔ اس موقع پر نپولین نے ڈیوک آف وائمر کی دعوت کی، جس میں گوئٹے اور ویلانڈ (Wieland) بھی موجود تھے۔ 2 اکتوبر کو نپولین نے گوئٹے کو ملاقات کے لئے طلب کیا۔ جب گوئٹے پہنچا، نپولین اس وقت بڑے کمرے میں ناشتہ کر رہا تھا اور اس کے دو وزیر تالے راں (Tallayrand) اور درو (Daru) اس کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ نپولین نے گوئٹے کو نظر جما کر دیکھا اور پھر اس کو مخاطب کر کے بولا کہ "بیشک آپ ایک انسان ہیں۔" اس تعریف کا گوئٹے پر بہت اچھا اثر پڑا۔ پھر کچھ رسمی گفتگو کے بعد "ورتھر" کا ذکر چھڑ گیا۔ نپولین نے ورتھر پر اس طرح بیباکی سے رائے زنی کی، جیسے کوئی جج عدالت میں مجرم پر تنقید کرتا ہے۔ نپولین "ورتھر" کو سات دفعہ پڑھ چکا تھا اور جب اس نے مصر پر حملہ کیا، تو یہ کتاب اس کے سفری کتب خانے میں موجود تھی۔ گوئٹے کا بیان ہے کہ "نپولین نے ورتھر پر رائے زنی کرتے ہوئے مجھ سے ایک ٹکڑے کی بابت پوچھا کہ اس کے لکھنے کی کیا وجہ تھی، کیونکہ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ نپولین نے اپنی رائے کے ثبوت میں بڑی صفائی سے دلائل پیش کئے۔ میں خاموشی سے سنتا رہا اور جواب دیا کہ مجھے معلوم نہیں کہ آیا کسی نے اس قسم کا اعتراض پہلے بھی کیا ہے۔ ممکن ہے اس میں کوئی خلاف فطرت بات ہو، لیکن شاعر نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے جو ترکیب استعمال کی ہے، اس کے لئے شاید وہ قابل معافی ہے"۔ نپولین نے گوئٹے کے جواب پر گفتگو کا رخ بدل دیا اور پھر ڈرامے پر گفتگو کرنے لگا۔

ایکرمان نے گوئٹے سے ایک گفتگو میں نپولین کی سولہ سال پہلے کی ملاقات یاد دلاتے ہوئے پوچھا کہ "ورتھر" کا وہ کون سا فقرہ تھا، جس پر نپولین کو اعتراض تھا اور آپ نے اس وقت اعتراض کو صحیح مان لیا تھا۔ گوئٹے نے ایک رازدارانہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا کہ "آپ خود اس کا اندازہ لگایئے کہ وہ کون سا فقرہ تھا"۔ اس پر ایکرمان نے کہا کہ "میرا شبہ اس موقع پر ہے، جب شارلوٹے نے ورتھر کو پستول بھیجا اور نہ اس کا اور نہ اپنے دل میں

گزرنے والے شبہات اور خطرات کا ذکر آلبرٹ سے کیا اور آپ نے اس خاموشی کا جواز پیدا کرنے کے لئے اپنے سر ایک مصیبت مول لے لی ہے' لیکن جہاں ایک دوست کی زندگی خطرے میں تھی' وہاں یہ خاموشی اور سکوت کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا"۔ اس پر گوئٹے نے جواب دیا کہ "آپ کا خیال برا نہیں ہے' لیکن میں بتانا مناسب نہیں سمجھتا کہ نپولین کا کیا مطلب تھا' لیکن کچھ بھی ہو' آپ کی رائے اتنی ہی صحیح ہے جتنی کہ نپولین کی"۔ نپولین کا خیال تھا کہ ورتھر کی طبعی افسردگی اس کی خودکشی کا باعث ہوئی' حالانکہ اس کی خودکشی کی وجہ اس کے ناکام عشق کو ہونا چاہئے تھا۔ پھر اس افسردگی میں اس کے مقاصد کی ناکامی کو بھی دخل ہے یعنی ان دونوں کے مقاصد الگ الگ ہیں' حالانکہ خودکشی کے لئے ایک مقصد کافی تھا۔ اس طرح نپولین اس کو خلاف فطرت سمجھتا تھا۔ ہرڈر کا اعتراض تھا کہ یہ آرٹ کا نقص ہے۔ گوئٹے ان دونوں اعتراضوں کو گویا صحیح مان کر اور ایک شاعرانہ جواب دے کر خاموش ہو گیا' لیکن جارج ہنری لوئس کا خیال ہے کہ گوئٹے نے جو کچھ لکھا ہے' وہ بالکل صحیح ہے اور عین فطرت کے مطابق ہے کیونکہ "ورتھر" کا آخری حصہ یروشلم کی داستان کا چربہ ہے اور جب آخری واقعہ یہی ہے کہ یروشلم کو عشق میں اور اپنے مقاصد کے حصول دونوں میں ناکامی ہوئی' تو پھر نتیجہ خلاف فطرت کیسے ہو سکتا ہے۔ پھر فطرت آرٹ کی رہنمائی کرتی ہے' نہ کہ آرٹ کو فطرت کا استاد بن جانا چاہئے۔

اپنی گفتگو میں پھر گوئٹے نے کہا کہ "ورتھر" میں لوگوں نے اتنی خامیاں نکالی ہیں کہ اگر میں ان فقروں یا حصوں کو نکال دوں' جن میں خامیاں بتائی گئی ہیں' تو ساری کتاب میں کوئی سطر باقی نہیں رہے گی' لیکن اس تمام تنقیدی سرزنش سے مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا' کیونکہ ناقدوں کے ان فیصلوں کی اصلاح جو سراسر داخلی جذبات پر مبنی تھے اور ممکن ہے وہ اہم بھی ہوں' عوام نے کر دی اور جو مصنف کم سے کم دس لاکھ پڑھنے والوں کے لئے نہیں لکھتا' اس کو ایک سطر بھی نہیں لکھنا چاہئے۔

ایکرمان سے اس موضوع پر دوبارہ گفتگو کرتے ہوئے گوئٹے نے کہا کہ "ورتھر ایک ایسی تخلیق ہے' جس کی آبیاری میں نے اپنے خون جگر سے کی ہے۔ اس میں میرے دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی باتیں ہیں' جن کو آسانی سے دس جلدوں میں پھیلایا جا سکتا ہے' لیکن جب سے "ورتھر" شائع ہوئی ہے' میں نے اس کو صرف ایک دفعہ پڑھا ہے اور اس بات کا

خاص طور پر خیال رکھا ہے کہ دوسری بار نہ پڑھوں.... جب میں اسے دیکھتا ہوں تو مجھے سخت تکلیف ہوتی ہے اور ڈرتا ہوں کہ وہی اگلی سی دماغی کیفیت سے دوچار نہ ہو جاؤں' جو اس کتاب کا سبب بنی۔"

ورتھر کے بعد جس شخص سے ہم روشناس ہوتے ہیں' وہ ورتھر کی محبوبہ شارلوٹے ہے۔ شارلوٹے کی شخصیت میں تخیل کا عنصر خاصا ہے مگر وہ کسی قدر خیال پرستی کا شکار ضرور ہے۔ گھر کے کاروبار اور بچوں کی دیکھ بھال سے اس میں یہ جذبہ جنون کی حد تک نہیں پہنچتا۔ پھر وہ اپنے شوہر کی وفا شعار بیوی ہے اور ورتھر سے اس کو طبعی مناسبت کے باوجود وہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتی' جس سے ورتھر کو کسی قسم کی بیجا محبت کی شہ ہو اور نہ اس کے اور اس کے شوہر کے درمیان کوئی رخنہ پیدا ہو۔

اب دیکھنا ہے کہ ورتھر کی شارلوٹے کی شخصیت کیا شارلوٹے بوف کا چربہ ہے۔ گوئٹے نے شارلوٹے کی شخصیت کو کئی عورتوں کی شخصیت کو ترکیب دے کر بنائی ہے۔ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں گوئٹے کہتا ہے کہ "میں نے شارلوٹے کی شخصیت کئی خوبصورت عورتوں کی خوبصورتی اور سیرت کو باہم ترکیب دے کر تیار کی ہے' حالانکہ اس کی نمایاں خصوصیت میں نے اس عورت سے لی ہے' جس کو میں سب سے زیادہ پیار کرتا تھا۔ اس معاملے میں جو لوگ تجسس کرنا چاہتے ہیں' ان کو صرف یہ معلوم ہوا ہو گا کہ شارلوٹے کی خصوصیات کئی عورتوں میں موجود ہیں اور خود ان عورتوں میں بھی یہ مسئلہ چھڑ گیا تھا کہ درحقیقت شارلوٹے کی اصل کون ہے' لیکن یہ مختلف روایتیں جن سے میں نے شارلوٹے کی سیرت ترتیب دی ہے' میرے لئے عذاب جان بن گئیں' کیونکہ ان میں سے ہر ایک مجھ سے آکر دریافت کرتی تھی کہ اصل شارلوٹے کون ہے۔"

شارلوٹے کے بعد آلبرٹ کی شخصیت سامنے آتی ہے۔ وہ ایک متین' خشک مزاج سرکاری ملازم ہے' جو اپنا کام وقت سے کرتا ہے اور کام میں اتنا انہماک ہوتا ہے کہ اکثر دورے پر جا کر گھر سے غائب رہتا ہے۔ وہ ہر چیز کو عقل کی عینک سے دیکھتا ہے' مگر اس میں انسانی ہمدردی کا جذبہ خاصی حد تک نمایاں ہے۔ اس کی سیرت کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں باوجود اس علم کے کہ ورتھر کو شارلوٹے سے محبت ہے اور شارلوٹے بھی ورتھر کا خیال کرتی ہے' اس میں کوئی شدید جوش رقابت نہیں پیدا ہوا' بلکہ وہ اکثر ورتھر کو نصیحت کرتا

ہے اور اس کو بالواسطہ صحیح راستے پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے باوجود اس میں اور اس کی بیوی شارلوٹے کی سیرت میں بڑا فرق ہے' مگر وہ شارلوٹے سے بہت محبت کرتا ہے اور اس کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

ولہلم ایک ایسا شخص ہے جو ورتھر کا جگری دوست ہے اور اس کو ہر طرح سے نیک مشورہ دیتا ہے - اردو شاعری میں جو ناصح مشفق کی حیثیت ہے' وہی ولہلم کی ہے۔ وہ بھی متین' خشک' عقل پرست اور زمانہ شناس ہے اور ورتھر کو ہر موقع پر اس کی بے راہ روی سے روکنے کی کوشش کرتا ہے' مگر اس کا کوئی خاطر خواہ اثر ورتھر پر نہیں پڑتا' اس لئے کہ دونوں باوجود دوست ہونے کے اپنے اپنے مزاج و کردار میں بہت مختلف ہیں' مگر ولہلم ہی وہ شخص ہے جس سے ورتھر کھل کر باتیں کر سکتا ہے اور اس کو اپنے درد دل کی داستان سناتا ہے۔ بعض محققین کی رائے ہے کہ آلبرٹ کی شخصیت کو گوئٹے نے اپنے دوست مرک (Merck) کی سیرت پر تصرف کے بعد ڈھالا ہے۔

"ورتھر" کی شہرت

"ورتھر" شائع ہوئی تو لوگوں نے اس کا نہایت پرجوش استقبال کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خفیہ یا نادانستہ طور پر لوگ اس کتاب کے منتظر تھے' کیونکہ اٹھارویں صدی کی خیال پرستی کی ساری خصوصیت اس میں صاف جھلکتی تھی اور یہ گوئٹے کا بڑا کمال تھا کہ اس نے "ورتھر" کو اس عہد کا ایک ایسا مکمل آئینہ بنا دیا' جس میں ہر شخص اپنے جذبات کی صحیح تصویر دیکھ سکتا تھا۔ خیال پرستی جو اس عہد کی خاص خصوصیت تھی' ایک روحانی بیماری کے درجے تک پہنچ گئی تھی۔ جذبات کی آگ کو بجائے عمل کے آنسوؤں سے بجھانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر لوگ بے اختیار ہو کر نوحہ کرتے تھے۔ لب و لہجہ میں بے قراری اور دردمندی کا فیشن ہو گیا تھا۔ اسی زمانے میں عقلیت کی ترقی سے مذہب میں انقلاب برپا ہو رہا تھا۔ مسیحیت پر سخت عقلی تنقید ہو رہی تھی' جس سے شک و تذبذب کی عام روحانی وبا پھیلی ہوئی تھی اور یہ وبا مذہب کے علاوہ اخلاق' سیاست و فلسفہ غرض زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو گئی تھی۔ لوگ قدیم روایات پر نہایت سختی سے نکتہ چینی کرنے

لگے۔ "ترقی" کی آواز لوگوں کو پریشان کرنے لگی۔ آزادی فکر اور آزادی عمل کی ہر طرف پکار اٹھی۔ اس ہنگامے میں سوسائٹی کا روایتی نظام درہم برہم ہونے لگا اور اس برہمی کی سب سے زیادہ شکار شادی بیاہ کی مقدس رسم ہو گئی۔ اس طرح خیال و عمل کے جوش میں خانگی زندگی کی دیواریں بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ بہت سے زندہ دل ایسے پیدا ہو گئے' جو شادی کی مبارک رسم کو پس پشت ڈال کر بجائے اپنے ہمسایوں کے ان کی بیویوں سے کھل کھلا محبت کرنے لگے۔ یہ سارا آتش گیر مادہ یوں ہی تیار ہو رہا تھا کہ گوئٹے نے "ورتھر" کی چنگاری اس میں ڈال دی اور اس چنگاری کا پڑنا تھا کہ سارا مادہ چشم زدن میں اڑ گیا۔ گوئٹے اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ اس چھوٹی سی کتاب کا نہایت زبردست اثر پڑا' کیونکہ اس نے اس عہد کی خصوصیتوں کو چھیڑ دیا۔ جس طرح ایک دیا سلائی دکھانے سے بارود سے بھری ہوئی سرنگ بھک سے اڑ جاتی ہے' اسی طرح میری تصنیف سے زبردست دھماکہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے عہد کے نوجوانوں نے اپنی زندگی کو کھوکھلا کر کے بارود کی سرنگ کی طرح بنا لیا تھا اور زور بھی اس لئے زیادہ ہوا کہ اس میں اس عہد کے تمام بیجا مطالبات' ناآسودہ خواہشات اور خیالی تکالیف کا پرجوش طریقے پر ذکر کیا گیا تھا۔ عوام سے اس بات کی خواہش کرنا بالکل فضول ہے کہ وہ فن کو فن کی نظر سے دیکھیں۔ واقعتاً اس کا صرف نفس مضمون دیکھا گیا۔ میرے بعض دوستوں نے بھی اس کو اسی نقطہ نظر سے دیکھا۔ اس کے ساتھ وہ پرانا تعصب بھی ظاہر ہوا کہ ہر چھپی کتاب میں کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق ضرور ہونا چاہئے' لیکن زندگی کی اصلی تصویر میں ایسی کوئی چیز نہیں ہوتی کیونکہ زندگی نہ تو سراہتی ہے اور نہ مذمت کرتی ہے" بلکہ احساس اور عمل کو قدرتی نتائج کے ساتھ آگے بڑھاتی ہے اور اس کا یہی سب سے بڑا سبق ہے۔"

کارلائل کا خیال ہے کہ "اس عہد کے اثرات کو تمام لوگ محسوس کر رہے تھے' مگر ان اثرات میں آواز صرف گوئٹے نے پیدا کی اور گوئٹے کی شہرت کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے یعنی اپنے دل میں اس نے وہ چیز محسوس کی' جو اس عہد کے ہزاروں دلوں میں چبھ رہی تھی اور اپنی خداداد تخلیقی قوت سے جو شاعر ہونے کی حیثیت سے اس کا حصہ تھا' اس نے اس احساس کو ایک صورت میں متشکل کر کے اس کا نام رکھا اور اس کی جائے سکونت بھی تیار کر دی۔ اپنے اس کارنامے سے وہ اپنے عہد کی زبان بن گیا۔"

اگر تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ کتاب آنے والے انقلاب فرانس کا پیش خیمہ سمجھی جا سکتی ہے یا اس کے پس منظر کا کام دے سکتی ہے' کیونکہ اس سے یورپی تہذیب کی بعض اندرونی بیماریوں کا پتہ چلتا ہے۔ ٹامس مان کا خیال ہے کہ "روسو کی تعلیمات نے تہذیب سے نفرت' جذبات میں بے لگامی' فطرت پرستی کی طرف واپسی' ایک زوال آمادہ تہذیب سے گلو خلاصی کی کوشش' روایتی اور درمیانی طبقے کی تنگ نظری کے خلاف بغاوت' یعنی ان سب باتوں نے متحدہ طور پر خیالات میں فرد کی تنگ حد بندی اور اس تنگ حد بندی کے خلاف مخالفت کا سامان پیدا کر دیا تھا اور ساتھ ہی جوش اور جذبے کو جو زندگی کے لامحدود تقاضوں کا مظہر ہے' موت کی خواہش سے ہمکنار کر دیا۔ اس طرح زندگی کے روز مرہ اور بے رنگ کاروبار کے خلاف ایک طوفان برپا ہوا اور جرمنی میں اس سے ایسی شاعری پیدا ہوئی' جس میں موت اور قبر کا نقشہ کھینچا گیا۔"

"ورتھر" کی شہرت کی ایک وجہ اور بھی تھی یعنی یروشلم کی خودکشی کا واقعہ ابھی تازہ تھا۔ اس کی موت کی تفصیلات سے خاص و عام دونوں گروہوں میں سخت بے چینی پیدا ہو گئی تھی اور جب "ورتھر" شائع ہوئی' جس میں یروشلم کے واقعہ کو فنی نقطہ نظر سے پیش کیا گیا تھا' تو لوگ بے اختیار "ورتھر" کے استقبال کے لئے آگے بڑھے۔ کہا جاتا ہے کہ جرمن زبان میں آج تک "ورتھر" جیسی شہرت و مقبولیت اور کسی کتاب کو نصیب نہیں ہوئی اور نہ کسی ملک کی کسی ادبی تصنیف نے آج تک اتنی جلدی عظیم الشان شہرت پائی۔ نوجوانوں کا یہ حال ہو گیا تھا کہ انہوں نے ورتھر کی مفروضہ پوشاک یعنی نیلا کوٹ' پیلی واسکٹ اور پیلی پتلون پہننا شروع کر دیا تھا اور بقول مادام دی اسٹائل کتنوں نے ورتھر کی طرح دردمند اور دل فگار بن کر خودکشی بھی کر لی۔ کتنی بیویاں اپنے خشک مزاج شوہروں سے تنگ آ کر کسی رنگین مزاج ورتھر کی دلنواز صحبتوں سے لطف اٹھانے کی آرزوئیں کرنے لگیں۔ ادب میں بھی ورتھریت بری طرح سرایت کر گئی۔ ورتھر اور شارلوٹے پر نظمیں لکھی گئیں' جنہیں عوام سڑکوں پر گاتے پھرتے تھے' جرمنی میں یہ تو سب ہوتا رہا' مگر یورپ کے دوسرے ملکوں میں اس کی شہرت بہت جلد ہو گئی۔ فرانس میں اس کا شاندار خیر مقدم کیا گیا اور انگلستان میں اس کا پہلا ترجمہ فرانسیسی سے شائع ہوا۔ اطالوی زبان میں بھی اس کا ترجمہ اسی زمانے میں شائع ہوا۔ چینی فنکاروں نے شیشے پر شارلوٹے اور ورتھر کی تصویر بنائی۔ غرض کہ تھوڑے

دنوں میں گوئٹے یورپی ادب کی ایک نہایت ممتاز اور قابل احترام ہستی تسلیم کیا جانے لگا اور مدتوں وہ صرف "ورتھر" کے مصنف کی حیثیت سے مشہور رہا' لیکن ورتھر کو صرف اٹھارویں صدی کی خیال پرستی کا آئینہ ہی نہیں سمجھنا چاہئے۔ ورتھر ایک زخمی دل کی پکار ہے' جو خیال پرستی کا عہد ختم ہو جانے کے بعد بھی آج ہماری توجہ کو کاوش و اضطراب کے ساتھ اپنی طرف جذب کرتی ہے۔ کون ہے جس کی آہوں سے افسانہ سوز و گداز نہ نکلا ہو اور کون ہے جو حادثات زمانہ کے بے رحم ہاتھوں سے محفوظ رہا ہو۔ "ورتھر" کے شائع ہونے کے پچاس سال بعد گوئٹے سے ایکرمان نے ایک روز ورتھر کی مقبولیت کا حال بیان کرتے ہوئے کہا "لوگ کہتے ہیں کہ "ورتھر" کی شہرت اور مقبولیت کا سبب اس زمانے کے خیالات میں پنہاں تھا' لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ میرے خیال میں تو "ورتھر" اس لئے کامیاب ہے کہ وہ شائع ہو گئی' نہ اس لئے کہ وہ فلاں زمانے میں شائع ہوئی۔ ہر زمانے میں لوگوں کے دلوں میں غم و الم کا اتنا غیر اظہار شدہ ذخیرہ ہوتا ہے' زندگی میں اتنی بے چینی اور بیزاری ہوتی ہے اور افراد میں زمانے کے خلاف اتنا غصہ ہوتا ہے اور پھر ان کی طبیعتوں اور قانون میں کشمکش ہوتی ہے کہ اگر "ورتھر" آج پہلی دفعہ شائع ہوتی' تو بھی اس کا وہی عالمگیر اثر ہوتا۔"

اس پر گوئٹے نے کہا کہ "آپ ٹھیک کہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب آج بھی ایک عمر تک نوجوانوں کو متاثر کرتی ہے' جیسا کہ اس نے پہلے کیا تھا.... اگر غور سے دیکھا جائے تو "ورتھر" کا زمانہ جس کی بابت لوگ اتنی بحث کرتے ہیں' عالمگیر ثقافتی زندگی کا کوئی خاص دور نہیں ہے' بلکہ یہ تو ہر فرد کی زندگی سے وابستہ ہے جو اپنی آزاد طبعی صلاحیتوں کے ساتھ دنیا کی قدیم روایات کے تنگ حدود میں زندگی گذارنے پر مجبور ہے۔ بخت کی نارسائیاں' میدان عمل کی مجبوریاں' ناآسودہ خواہشیں' یہ سب مصیبتیں کسی خاص زمانے سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ ان کا تعلق ہر فرد و بشر سے ہے اور یہ ایک خراب بات ہو گی اگر کسی نے اپنی زندگی میں گو ایک ہی دفعہ سہی' کوئی ایسا زمانہ نہیں پایا جب اس نے محسوس کیا ہو کہ "ورتھر" صرف اس کے لئے لکھی گئی ہے۔ جب تک سینہ انسان میں رنج و الم کا داغ اور درد کی خلش موجود ہے اور جب تک دل کے ٹکڑے آنکھوں کی راہ بہہ نکلنے کو تیار ہیں' ورتھر ایک زندہ اور غیر فانی ہستی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کو اس سے ہمدردی ہو

جاتی ہے۔"

"ورتھر" کا طرز بیان

گوئٹے نے جو طرز تحریر اختیار کیا' وہ "ورتھر" کے لئے خاص طور پر موزوں تھا' کیونکہ کسی فرد کی نفسی تصویر خطوں سے اچھی اور کسی طرز میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ اس طرز کا سرا تلاش کرنے کے لئے تھوڑی سے تفصیل کی ضرورت ہے۔

سترہویں صدی کے آخر میں انگلستان میں تھیٹر صرف طبقہ امرا کا ایک آلہ تفریح بن گیا تھا۔ عوام اور اوسط درجے کے لوگوں کو اس میں مطلق بار نہ ملتا تھا۔ تھیٹر کی یہ فضا خود اس کی ترقی کے لئے نہایت ناسازگار ثابت ہوئی' کیونکہ عوام کا داخلہ بند کر کے اس نے تخیل اور جذبات پر بھی پابندی لگا دی تھی۔ اس پابندی سے لوگ کسی ایسے ذریعے کو تلاش کرنے لگے' جو ان کے تخیل اور جذبات کی خواہش اظہار کو پورا کر سکے۔ بالاخر اس خواہش کا ظہور افسانوں میں ہوا یعنی ایک طرف تھیٹر کی تنزلی اور دوسری طرف تخیل و جذبات کی خواہش اظہار نے افسانہ نویسی کی بنیاد ڈالی اور یہ بنیاد روز بروز استوار ہو کر ایک شاندار عمارت میں تبدیل ہو گئی۔

اسی زمانے کے ایک انگریز مصنف ریچرڈسن (1689ء - 1761ء) نے فوراً عوام کی اس اندرونی خواہش کو بھانپ لیا۔ ریچرڈسن اوائل عمر میں ایک چھاپے خانے میں ملازم تھا اور چونکہ پڑھا لکھا تھا' اس لئے نوعمری ہی کے زمانے سے نوجوان لڑکیاں اس کے پاس آ کر اپنے دوستوں کو عشقیہ خطوط لکھوایا کرتی تھیں۔ خطوط لکھتے لکھتے اس کو عورتوں کے جذبات و احساسات سے کماحقہ واقفیت ہو گئی اور اس کے بیشتر افسانوں کی بنیاد اس کا خطوط نویسی کا یہی تجربہ ہے۔

اکیاون برس کی عمر میں اس نے اپنا پہلا افسانہ پامیلا (Pamela) شائع کیا اور سات برس بعد اس کا شاہکار کلیریسا (Clarissa) شائع ہوا۔ ان افسانوں کا طرز یہ ہے کہ ایک دور افتادہ لڑکی خطوط کے ذریعے سے اپنے کسی عزیز یا دوست کو آپ بیتی سناتی ہے اور اس آپ بیتی میں وہ اپنے دھڑکتے ہوئے دل کا افسانہ عشق' پھر اپنی مصیبتوں اور تکلیفوں کا حال نہایت

سوز و گداز کے ساتھ بیان کرتی ہے اور آخر میں کوئی نہ کوئی اخلاقی نتیجہ نکلتا ہے۔ ریچرڈسن چونکہ طبقہ عوام' خاص کر اوسط درجے کے لوگوں کی معاشرت سے اچھی طرح واقف تھا' اس لئے افسانوں میں اس نے انہیں کے نازک اور غمگین جذبات کی تصویر تخیل کی رنگ آمیزی کے سات بڑی استادی سے کھینچی ہے۔ اس کے ناولوں کو یورپ میں بڑی شہرت ہوئی۔ فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں ان کے ترجمے شائع ہوئے۔ مشہور فرانسیسی مصنف روسو کے افسانے "نیا یونان" کا طرز ریچرڈسن ہی کے افسانوں کا ہے یعنی خط کو ذریعہ اظہار بنایا گیا ہے۔

جرمنی میں گیلرٹ نے جو لائپزگ یونیورسٹی میں ادب کا پروفیسر تھا' ریچرڈسن کے ناولوں کا ترجمہ شائع کیا۔ گوئٹے خود پروفیسر گیلرٹ کے ادبی لیکچروں میں بحیثیت طالب علم کے شریک ہو چکا تھا۔ اس نے ان ترجموں کو مع روسو کے افسانے کے شوق سے پڑھا اور جب "ورتھر" لکھنے بیٹھا' تو اس نے ریچرڈسن کے طرز افسانہ نگاری کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔

ریچرڈسن کے ناولوں کی سب سے بڑی خرابی ان کی طوالت و ضخامت ہے۔ ایک ایک واقعہ کئی کئی بار دہرایا گیا ہے۔ پھر واقعات کی رفتار بہت سست ہے۔ پڑھتے پڑھتے طبیعت اکتا جاتی ہے۔ گوئٹے نے ان خامیوں سے احتراز کیا اور ریچرڈسن کا واعظانہ اور ناصحانہ انداز بھی ترک کردیا۔ ان خطوط کی تصنیف میں گوئٹے کے خون جگر کی آبیاری اور یروشلم کی خودکشی کا حال ہی نہیں ہے' بلکہ ان خطوط کا تصرف بھی ہے' جو مصنف نے کیسٹنر' مرک اور مرک کی بہن کو لکھے تھے۔ پھر گوئٹے نے اپنے روزنامچے سے بھی مدد لی ہے۔

افسانہ لکھنے کے تین طرز ہو سکتے ہیں۔ پہلا طرز تو یہ ہے کہ افسانہ نویس آپ کے سامنے قصے کو ابتدا سے انتہا تک بیان کر جاتا ہے۔ گو اس کی شخصیت "میں" یا "ہم" میں ظاہر نہیں ہوتی' تاہم آپ برابر محسوس کرتے ہیں کہ کوئی شخص پس پردہ افسانہ سنا رہا ہے۔ آپ افسانہ سنتے ہیں مگر آپ افسانہ نویس کے واقعات پر کوئی نکتہ چینی نہیں کر سکتے۔ آپ کو یہ سوال کرنے کا مطلق حق نہیں ہے کہ اس کو واقعات کہاں سے ملے۔ وہ واقعات کے معاملے میں بالکل آزاد ہے۔ وہ جو قصہ اور جس کا قصہ چاہے' سنائے۔ یہ موجودہ دور کے افسانوں کا طرز ہے اور اس طرز کے مشہور افسانہ نگاروں میں نذیر احمد' سرشار' شرر' مرزا رسوا' پریم چند وغیرہ ہیں۔

افسانہ نویسی کا دوسرا طرز وہ ہے' جس میں ساری داستان مصنف کسی نامور فرد داستان کی زبانی ادا کرتا ہے۔ اس میں داستان کے سارے ضروری اور غیر ضروری اجزا اس ایک فرد داستان کی ذات سے وابستہ ہوتے ہیں اور قصے کی روانی اس کے کردار کے ساتھ ساتھ قائم رہتی ہے۔ مصنف کی شخصیت بالکل پردے میں ہوتی ہے۔ یہ طرز اب پرانا ہو چکا ہے۔ "قصہ حاتم طائی" اور "باغ و بہار" اسی طرز کی یادگاریں ہیں۔

افسانہ نویسی کا ایک تیسرا طرز بھی ہے یعنی افسانے کا ہیرو یا فرد خاص خطوں کے ذریعہ اپنے واقعات اور احساسات کا اظہار کرتا ہے اور آپ بیتی سناتا ہے۔ اردو میں اس طرز کا صرف ایک مشہور افسانہ ہے اور وہ مشہور اہل قلم قاضی عبدالغفار مرحوم کا "لیلیٰ کے خطوط" ہے۔ اس افسانے میں ایک دل فگار اور مصیبت زدہ عورت اپنی عصمت کی شکست کی الم ناک داستان اور مردوں کی نفس پرستی کی کیفیت بڑے سوز و گداز کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ اس میں معاشرے کے اخلاق و اعمال کی نفسی تحلیل بڑی چابکدستی سے کی گئی ہے اور بعض جگہ تو مرزا رسوا کا رنگ جھلکتا ہے۔ قاضی صاحب مغربی ادب کے ادا شناس تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رنگ انہوں نے وہیں سے اڑایا اور پھر اس کو بڑی خوبی سے اردو میں برتا ہے۔ اردو افسانہ نویسی کا ذکر کرنے سے یہاں یہ دکھانا مقصود ہے کہ خطوط کی شکل میں افسانوں کا انداز بالکل مغربی ہے اور قاضی صاحب کے طرز افسانہ نویسی نے جو اردو میں بالکل نیا ہے اور جو مغرب سے آیا ہے' ہمارے یہاں فن میں ایک اچھا اضافہ کیا ہے۔

ان خطوط کے لئے ایک مکتوب الیہ کی ضرورت ہے' جو کاتب کا ایسا دلی دوست ہو جس سے کاتب اپنا تمام حال اور دلی کیفیت بیان کر سکتا ہو۔ "ورتھر" میں ولہلم کی شخصیت بالکل ایسی ہے - ولہلم' ورتھر کا دوست ہے مگر اس کی طبیعت ورتھر کی طبیعت سے بہت مختلف ہے۔ ولہلم حقیقت پسند اور واقعات پر تنقیدی نظر رکھنے والا انسان ہے۔ ورتھر کی ذہنی کیفیت دور سے دیکھ رہا ہے اور موقع بہ موقع اس کو مشورے بھی دیتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ اب ورتھر کا جنون بہت تیز ہو گیا ہے' تو اس کو شارلوٹے کے پاس سے چلے آنے کی تاکید کرتا ہے۔ چنانچہ ورتھر اس کی تاکید پر چلا جاتا ہے' لیکن ورتھر اکثر ولہلم کی باتوں کو نہایت صفائی سے ٹال جاتا ہے۔

خطوں کا یہ سلسلہ آخر تک چلا جاتا ہے' لیکن جب ورتھر کے احساسات قریب قریب

جواب دے چکتے ہیں اور اس میں اتنی طاقت نہیں رہتی کہ وہ وہ قلم سے باقاعدہ خط و کتابت کر سکے، تو گوئٹے خود قلم ہاتھ میں لے کر انجام تک کا حال بیان کرتا ہے۔

ان خطوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کو پڑھ کر ہر درد مند دل بے چین ہو جاتا ہے، کیونکہ ان میں صرف واقعات کی تفصیل ہی نہیں ہے، بلکہ حسن کی بے مہری اور عشق کی نامرادی و ناکامی کی داستان بھی ہے۔ اس میں نفس انسانی کی جو تحلیل کی گئی ہے، وہ مشہور مصنفوں کے ضخیم ادبی کارناموں میں بھی نہیں مل سکتی۔ ایک ایک خط گویا دل کا ٹکڑا ہے، جو صفحہ کاغذ پر اس طرح بچھا دیا گیا ہے کہ اس میں سے کبھی انتظار و تمنا کے اور کبھی یاس و حرماں کے قطرے ٹپکتے ہیں۔ معاملات و جذبات پر قوت متخیلہ کے زور سے ایسی روشنی ڈالی گئی ہے کہ ذرا ذرا سی تفصیل نہایت دلچسپ ہو گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز پر خوردبین کا عمل ہو رہا ہے۔ اگر ایک جگہ پہاڑیاں اور وادیاں آغوش بہار میں دکھائی گئی ہیں، جہاں چڑیوں کے چہچہے اور کیڑوں کی سریلی آواز سے سارا منظر ایک نغمہ زار نظر آتا ہے، تو دوسری جگہ خزاں کی زردی، جاڑے کی آمد، برف باری، بارش کا سیلاب اور بجلی کی کڑک وغیرہ خوفناک طریقے سے سامنے آتے ہیں اور مناظر قدرت کا ہر رنگ اپنی اپنی جگہ جذبات پر اثر ڈالتا ہے۔ موسم بہار میں رقص و سرور، خوشی اور شادمانی کا سماں دکھایا گیا ہے، لیکن جاڑے کی تاریک طوفانی راتوں میں جب سیلاب ایک بھیانک شکل اختیار کر لیتا ہے تو ورتھر کا دل بھی یاس و الم کا مسکن بن جاتا ہے اور یہی خارجی مناظر روح پر اثر ڈال کر اس کے خطرناک انجام کا احساس پیدا کرتے ہیں۔

کچھ ترجمے کے بارے میں

اس ناول کا پہلا ایڈیشن 1933ء میں شائع ہوا تھا۔ اب جو اٹھا کر دیکھا تو اس میں بیان کی کچھ خامیاں نظر آئیں۔ اس لئے میں نے موجودہ ایڈیشن میں ان خامیوں کو دور کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ پھر یہ ترجمہ بالکل لفظی نہیں ہے اور نہ میں نے مکھی پر مکھی مارنے کی کوشش کی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جرمن زبان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کم الفاظ میں بہت معنی سما جاتے ہیں، اس لئے میں نے معنی کو پھیلا کر لکھا ہے تاکہ

پڑھنے والوں کے ذہن میں مصنف کا مطلب پوری طرح سمجھ میں آ جائے۔

اس سلسلے میں میں نے بعض انگریزی ترجمے بھی دیکھے ہیں، مگر بعض لحاظ سے مجھے وہ ناقص نظر آئے مثلاً مترجموں نے بعض خطوں کو سرے سے حذف کر دیا ہے لیکن ترجمہ کرتے وقت میرے سامنے چونکہ اصل جرمن تصنیف رہی ہے اور میں نے گوئٹے کی تصنیفات Deutscher Taschenbuch Verlag, Muenchen مطبوعہ 1962ء کے نسخہ کی تیرہویں جلد استعمال کی ہے، جس میں "نوجوان ورتھر کی داستان غم" شائع ہوئی ہے، اس لئے اس ترجمے میں تمام خطوط موجود ہیں۔

جرمن ناموں کے تلفظ میں میں نے کہیں کہیں رد و بدل کر دیا ہے، مثلاً خود "ورتھر" کا تلفظ جرمن میں "ویرٹر" اور انگریزی میں "ورٹر" سے کیا جاتا ہے، مگر مجھے یہ دونوں تلفظ اردو زبان کے لب و لہجہ سے بہت دور نظر آئے، اس لئے میں نے اس کا تلفظ ورتھر سے کیا ہے۔ آلبرٹ البتہ مانوس نام ہے مگر شارلوٹے، لوٹشن اور وہلم کو میں نے جوں کا توں رہنے دیا ہے۔

پھر میں نے جا بجا حاشیئے پر اردو اور فارسی کے اشعار نقل کئے ہیں۔ ان سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جن خیالات کو گوئٹے نے نثر میں ادا کیا ہے، ان کو ہمارے شعرا نے بغیر کسی رشتہ مخابرت و مخاطبت کے شعر کا جامہ پہنایا ہے یا پہنا چکے تھے۔

اقبال نے غالب کا مقابلہ گوئٹے سے کر کے غالب کو گوئٹے کا ہم نوا بتایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زندگی کی حقیقتوں کے بعض اہم پہلوؤں پر غالب اور گوئٹے کی نظریں یکساں پڑتی ہیں اور یہ وہ زمانہ ہے جب دونوں میں خیال و فکر اپنی پوری بلندی پر پہنچ چکے تھے مگر عنفوان شباب کی کیفیتوں کے ذکر میں جب افسردگی اور غم اکثر نفس کی نشو و نما میں مدد کرتے ہیں، گوئٹے اپنے ابتدائی دور میں اگر کسی مشرقی شاعر کا ہم پلہ ہے، تو وہ عرفی ہے۔ افسردگی اور غم کے معاملات کو ہمارے جوانا مرگ شاعر عرفی نے اپنی غزلوں میں جس با کپن اور لطیف شکوہ سنجی کے ساتھ بیان کیا ہے، وہی انداز "ورتھر" کی نثر میں صاف جھلکتا ہے۔ میں اس بیان کو یہاں طول دینا نہیں چاہتا، کیونکہ اس سے ایک نئے مبحث کا آغاز ہو جائے گا۔

اقبال اور "ورتھر"

1930ء کے آخری ہفتے میں میری ملاقات علامہ اقبال سے پہلی دفعہ الہ آباد میں ہوئی' جب وہ مسلم لیگ کے سالانہ جلسے میں اپنا خطبہ صدارت دینے آئے تھے۔ "ورتھر" کا ترجمہ جب پہلی بار شائع ہوا' تو میں نے اس کا ایک نسخہ علامہ اقبال کو بھی بھیجا۔ اس کے کوئی دو سال بعد مئی 1923ء کے آخر میں میری ملاقات ان سے لاہور میں دوبارہ ہوئی۔ اصغر گونڈوی کا ایک تعارفی خط تھا۔ فوراً اندر بلا لیا۔ کچھ گفتگو کے بعد میں نے "ورتھر" کے ترجمے کی بابت پوچھا تو علامہ نے کہا کہ "آپ نے اچھا کیا اس کا ترجمہ شائع کر دیا' مگر اس ناول کو عمر کے چالیس سال گذرنے کے بعد پڑھنا چاہئے کیونکہ جو تیزی اور جوشیلا انداز بیان اس میں ہے' عنفوان شباب اس کی تاب نہیں لا سکتا۔"

اس پر میں نے عرض کیا کہ خود مصنف کی عمر جب اس نے یہ افسانہ تحریر کیا تھا' کوئی تئیس چوبیس برس ہو گی۔

ڈاکٹر صاحب تکیہ لگائے پلنگ پر نیم دراز طریقے پر لیٹے ہوئے تھے۔ میرے اس فقرے پر اٹھ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے "یہ صحیح ہے کہ گوئٹے نے تئیس چوبیس برس کی عمر میں یہ افسانہ لکھا مگر وہ بہت غیر معمولی آدمی تھا۔ ہر شخص تو ایسا نہیں ہوتا۔ میدان عشق و محبت میں سرگرم ہونے کے باوجود اس کو اپنے اوپر پورا قابو تھا۔" پھر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ:

"میرے پاس دوست احباب بہت سی کتابیں بھیجتے رہتے ہیں۔ میرا لڑکا جاوید ان کو ضرور دیکھتا ہے مگر میں نے آپ کا ترجمہ اپنی الماری میں کتابوں کے پیچھے چھپا کر رکھ دیا ہے تاکہ اس کی نظر نہ پڑے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ اس عمر میں اسے پڑھے۔" اس کے بعد گفتگو کا موضوع بدل گیا۔

پاکستان اور جرمنی

اس ناول کا ترجمہ میں نے پہلی دفعہ گوئٹے کی صد سالہ برسی پر 1932ء میں کیا تھا' جو چھ ماہ بعد 1933ء میں شائع ہوا۔ ملک میں یہ ترجمہ خاصا مقبول ہوا' مگر آج اس کے دوبارہ شائع کرنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔ علامہ اقبال نے "پیام مشرق" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ

"اس (پیام مشرق) کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی' مذہبی اور ملی حقائق کو پیش نظر لانا ہے' جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ اس سے سو سال پیشتر کے جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے۔" وہ کون سی مماثلت تھی' جس کا اقبال نے ہلکا سا اشارہ کیا ہے مگر اس کی تشریح نہیں کی اور جو آج تشریح کی محتاج ہے۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ اقبال کے زمانے کے مشرق میں اور سو برس (آج اسے ڈیڑھ سو برس کہنا زیادہ مناسب ہو گا) پیشتر کے جرمنی میں کیا چیز مشترک تھی۔

اقبال کی مراد مشرق سے یہاں مشرق کی پسماندہ قومیں ہیں' جن میں خاص کر ہندی مسلمان ان کی نظر میں ضرور ہوں گے اور آج ان ہندی مسلمانوں کا بڑا حصہ پاکستانی بن گیا ہے۔ اس لئے ہم پاکستانی مسلمانوں کی ذہنی کیفیت کا تھوڑا بہت جائزہ لیں گے اور اس کا مختصر موازنہ کوئی ڈیڑھ سو برس پہلے کے جرمنی سے کریں گے تاکہ دونوں ملکوں کی تمدنی حالت کا اندازہ کیا جا سکے۔

اٹھارہویں صدی کا ابتدائی اور وسطی دور جرمنی کی معاشرتی اور ادبی زندگی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے' کیونکہ اسی زمانے میں وہ ادبی تحریکیں پیدا ہوئیں' جو آگے چل کر انیسویں صدی میں بار آور ہوئیں۔ اس لئے اگر ہم اٹھارہویں صدی کے ابتدائی اور وسطی دور کا ہلکا سا جائزہ لیں' تو معلوم ہوتا ہے کہ فرانس کا تہذیبی اور ثقافتی اثر اس زمانے میں جرمنی پر غالب تھا۔ یہ جرمنی کی پرانی روایات کا دور تھا' جس میں فرانسیسی ادب اور معاشرے کی نقالی کو سراہا جاتا تھا(3) اور اس کو ہنرمندی بھی سمجھا جاتا تھا۔ فن اور ادب میں فرانس میں جو اصول کارفرما تھے' انہیں کو جرمنی میں نصب العین کا درجہ دیا جاتا تھا۔ شاعری' ڈرامہ نگاری' آرٹ' غرض زندگی کے تمام اہم شعبوں میں فرانس کی نقالی کو ایک بلند درجہ حاصل تھا۔ اس نقالی نے جرمنی کی روح کو مسخ کر کے ایک بند گراں میں جکڑ رکھا تھا۔ مشہور شاعر کلوپ اسٹوک' مشہور ڈرامہ نگار لیسنگ اور مشہور نقاد ہرڈر نے اس نقالی کے خلاف آواز پہلی دفعہ اٹھائی اور پھر گوئٹے نے اپنی تحریروں سے جرمن قوم میں تازہ خون دوڑا دیا۔

یورپ میں فرانس کو قدیم رومی سلطنت کے زوال کے بعد ایک نمایاں تہذیبی اور سیاسی بالادستی حاصل رہی ہے' کیونکہ قدیم رومی سلطنت کی ثقافت اور کلیسائے روما کے امتزاج و

اتصال سے جو اثر پیدا ہوا' فرانس اس کا نمائندہ بن گیا۔ پھر فرانس ہی وہ تنہا ملک ہے' جو یورپ کے تمام ملکوں میں پہلی دفعہ سیاسی اور ملکی لحاظ سے منظم صورت میں ظاہر ہوا۔ اسی طرح فرانس کی سیاسی اور ثقافتی بالا دستی یورپ میں ایک لمبی مدت یعنی گذشتہ صدی کے نصف دوم تک قائم رہی۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں فرانسیسی تہذیب کے عروج پر تبصرہ کرتے ہوئے دور حاضرہ کا ایک مشہور انگریز مورخ کہتا ہے کہ "یورپ میں فرانسیسی کتابیں ہر جگہ پڑھی جاتی تھیں اور فرانسیسی سائنس کا ہر جگہ احترام کیا جاتا تھا اور فرانسیسی فیشن کی ہر جگہ پیروی کی جاتی تھی.... فرانسیسی تہذیب کی تشریح اور توضیح اس کے ممتاز اور نامی گرامی ادیب کرتے تھے اور یہ تہذیب اس وقت گویا سارے یورپ پر حکمرانی کرتی تھی اور ہر اس معاشرتی گروہ کے لئے قانون بناتی تھی' جو روس کی سرحد سے لے کر بحراوقیانوس تک ثقافت کو برتنے کا ذرا سا بھی دعویٰ کرتا ہو"۔(۱) یہ وہ وسیع علاقہ ہے' جس میں جرمنی بھی شامل ہے۔

اب خود ایک جرمن فلسفی سے اس داستان کو سنئے۔ "یوحان گوٹلیب فشٹے (1762ء - 1814ء) انیسویں صدی کی ابتدا میں جرمنی کا ایک نامور معلم اور فلسفی گزرا ہے۔ وہ جرمن قومی تخیل اور اتحاد کا بانی تھا۔ اس نے 1807ء - 1808ء میں برلین یونیورسٹی میں چودہ خطبات میں جرمن قوم کو خود اعتمادی' خود نگری اور اتحاد کا سبق دیا۔ اس وقت جرمنی میں لاطینی اقوام اور خاص کر فرانس کو جس نظر سے دیکھا جاتا تھا' اس کا پانچویں خطبے میں ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ "یہ کمزوری (یعنی لاطینی اقوام کی نقل) گویا بڑھ کر ایک عالمگیر بیماری کی حد تک پہنچ گئی ہے' جس میں ساری ٹیوٹانی قوم گرفتار ہے اور اگر جرمن کمال سنجیدگی سے اس بیماری کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہ ہوں' تو اس کا حملہ ان پر خود اپنے ملک میں ہوتا ہے۔ ہمارے کانوں کو لاطینی الفاظ اعلیٰ اور خوش آئند معلوم ہوتے ہیں اور ہماری آنکھوں کو رومی عادات و اطوار شریفانہ اور شاندار معلوم ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے ہم کو جرمنی کی ہر چیز ناگوار اور بازاری معلوم ہوتی ہے.... اور جب ہم ایسی عادات و اطوار اختیا کرتے ہیں یا ایسے کپڑے پہنتے ہیں جو غیر ملکوں سے لئے گئے ہوں اور جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوں' تو اس وقت ہم اپنے کو ممتاز شخصیت کا مالک سمجھتے ہیں' لیکن ہماری (نقل میں) یہ کامیابی اپنے اعلیٰ مدارج پر اس وقت پہنچتی ہے' جب لوگ ہم کو جرمن کی

بجائے ہسپانوی یا انگریز (ان میں اس وقت جو بھی زیادہ فیشن والا ہو' اس کے مطابق) سمجھتے ہیں اور یہ بات ٹھیک بھی ہے۔ جب ایک جرمن کو اپنی شخصیت کا اظہار منظور ہوتا ہے تو اس کا انداز قدرتی ہوتا ہے اور جب غیر ملکی انداز کا اظہار مقصود ہوتا ہے' تو اس میں تصنع اور خود سری پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ گویا ایک شخصیت کے دو پہلوؤں کا فرق ہے۔ جب ہم اول الذکر پہلو کا اظہار کرتے ہیں' تو ہم بالکل ہم وطن جرمنوں کی طرح ہوتے ہیں جو ہم کو اپنا ہم پلہ سمجھتے ہیں' لیکن جب ہم موخرالذکر طریقہ اختیار کرتے ہیں' تو ہم اپنے ہم وطنوں کے لئے ناقابل فہم بن جاتے ہیں کیونکہ یہ لوگ ہم کو کسی دوسری سیرت کا آدمی سمجھتے ہیں.... ان سب باتوں کی دراصل وجہ یہ ہے کہ جرمنوں کا خیال ہے کہ لاطینی تہذیب کے ملک نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور پھر ساتھ ہی یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ ہم بھی ایک ممتاز اور نمایاں حیثیت حاصل کریں اور جرمنی میں تصنع اور بناوٹ سے عوام اور اونچے طبقے کے درمیان ایک خلیج پیدا کریں' جو باہر کے ملکوں میں ان خیالات کی وجہ سے قدرتی طور پر بن گئی ہے۔ جرمنوں میں غیر ملکی طور طریقے سے جو عشق پیدا ہو گیا ہے' میں یہاں اس کے منبع و مصدر کے اظہار پر اکتفا کروں گا اور دوسرے موقع پر بتاؤں گا کہ اس کا اثر کتنا وسیع ہوا ہے اور ہم پر جو کچھ تباہی آئی ہے' اس کا سبب یہی غیر ملکی منبع ہے"۔(5)

لاطینی تہذیب اور غیر ملکی خیالات سے نٹشے کی مراد فرانسیسی تہذیب اور خیالات سے ہے۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ جس وقت یہ خطبات دیئے گئے تھے' اس وقت تقریباً سارے یورپ میں نپولین کا دور دورہ تھا اور اس وقت نپولین بہ نفس نفیس جرمنی میں موجود تھا' اس لئے فاضل مقرر نے براہ راست فرانس کا نام نہیں لیا۔

دراصل جرمن اور فرانسیسی دونوں قومیں طبعاً ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ فرانس کی طبیعت پر عقل پرستی اور منطق کا اثر غالب ہے۔ فرانسیسی خیال کی صفائی اور منطقی استدلال کو بہت پسند کرتے ہیں۔ فرانس میں ایک کہاوت بہت مشہور ہے' جس سے فرانسیسی قوم کی سیرت کا پتہ چلتا ہے اور وہ یہ ہے "جو چیز صاف اور واضح نہیں ہے' وہ فرانسیسی نہیں ہے(6) لیکن جرمنی کی طبیعت کا خمیر اندرونی سوز و گداز اور جذباتی پیچ و تاب کسی بالا از عقل شے سے مرکب ہوا ہے' جس میں گہرائی کے ساتھ ساتھ ابدیت کو سمجھنے کی خواہش بھی ہے' مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ جرمنی کی سیرت میں عقل کا کوئی مقام نہیں۔ نہیں ایسا

نہیں ہے۔ عقل کا مقام ضرور ہے' مگر وہ دوسرے درجے پر ہے۔ فرانسیسی اپنی روز مرہ زندگی کو عقلی طور پر سنبھالنے اور سنوارنے میں لگے رہتے ہیں' مگر جرمن کائنات کو سمجھنا اور اس کی تہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ اس لئے وہ عالم کی بابت کوئی نہ کوئی انداز نظر یا نظریہ کائنات (Weltanschauung) ضرور رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے فرانسیسی تہذیب کی ملمع کاری سے جرمنی کی سیرت میں ایک طرح کی بے راہ روی' بے مقصدیت اور شدید قسم کی خیال پرستی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ ایک قسم کی نفسیاتی بیماری تھی' جس میں ساری قوم مبتلا ہو گئی تھی۔ ورتھر کی خودکشی سے گوئٹے نے بتایا ہے کہ خیال پرستی اور ہوسناکی کا انجام فرد اور جماعت دونوں کے لئے خطرناک ہے اور اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ اگر دنیا میں انسان ایک خوشگوار تمدنی زندگی گذارنا چاہتا ہے' تو وہ اپنے تمدنی ورثے سے الگ نہیں رہ سکتا۔ دراصل اس کا کام یہ ہو گا کہ اپنی صحیح روایات کی نگرانی کرے اور جو روایت کہنہ ہو جائے' اس کو بقدر ضرورت زمانہ اپنے معاشرے کی فطرت کے مطابق ترمیم کرے۔ در حقیقت اقوام کی صحیح باطنی تربیت و ترقی کا یہی گر ہے۔

خیال پرستی ایک طرح کا وہ خیال ہے' جو حقیقت اور زندہ تہذیبی روایات کے خلاف محض جذبات کی بنیاد پر قائم ہو۔ اس میں گہرائی کی بجائے سطحیت ہوتی ہے اور مغز کی جگہ محض خول یا ہڈی اور یہ اس وقت پیدا ہوتی ہے' جب صحیح تمدنی زندگی کا بہاؤ یا تو رک جاتا ہے یا پھر اس میں فاسد مادہ داخل ہو جاتا ہے' آج پاکستان میں خیال پرستی کی جو وبا پھیلی ہوئی ہے' وہ مغرب کی نقالی یا تقلید جامد سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کا دوسرا نام ہوسناکی بھی ہے یعنی مغرب کی ان روایات و حرکات کی نقل کرنا' جن کو ہماری تہذیب جذب نہیں کر سکتی۔ ظاہر ہے کہ مغرب کا اثر آج کا نہیں ہے' بلکہ بہت پرانا ہے اور ہماری محکومی کے دور میں مغرب کی بالا دستی نے اپنے اثر سے اس کو بہت بلند کرنے کی کوشش کی تھی۔ اقبال نے اس کو اپنے زمانے میں محسوس کیا تھا اور انہوں نے اس اثر کے خلاف بے شمار موقعوں پر اظہار خیال بھی کیا ہے۔ چنانچہ بانگ درا میں ایک نظم "تہذیب حاضر" کے عنوان سے ہے۔ اس کے حسب ذیل اشعار پڑھیئے اور غور کیجئے:

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیب حاضر میں
بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تن خاکی

کیا ذرے کو جگنو، دے کے تاب مستعار اس نے
کوئی دیکھے تو شوخی آفتاب جلوہ فرما کی
نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے
یہ رعنائی، یہ بیداری، یہ آزادی، یہ بیباکی
تغیر آ گیا ایسا تدبر میں تخیل میں
ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چاکی
کیا گم تازہ پروازوں نے اپنا آشیاں لیکن
مناظر دلکشا دکھلائی گئی ساحر کی چالاکی
حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی
فروغ شمع نو سے بزم مسلم جگمگا اٹھی
مگر کہتی ہے پروانوں سے میری کہنہ ادراکی
"تو اے پروانہ! ایں گرمی ز شمع محفلے داری
چو من در آتش خود سوزا گر سوز دلے داری"

یہ نظم طنز لطیف کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے اس میں تازہ پروازوں سے مراد وہ نوجوان ہیں، جو مغربی تعلیم سے آراستہ ہیں اور اس تعلیم کا ان پر یہ اثر ہوا کہ ان میں بلا کی آزادی، بیباکی، رعنائی اور بیداری آ گئی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ صفات بذات خود قابل ستائش ہیں، مگر ان صفات کا غلط استعمال ہوا یعنی تازہ پروازوں نے اپنی جولانی طبع کے آگے کسی قسم کی کوئی اخلاقی حد بندی تسلیم کئے بغیر خود اپنی تہذیبی اور معاشرتی روایات پر بیباکی سے ضربیں لگائیں۔ پھر جو تمدنی بیماریاں بے سمجھے بوجھے غیروں کی تہذیبی روایات کے نقل کرنے سے پیدا ہوتی ہیں، وہ ان میں آ گئیں۔ مقابلے اور رقابت کا جوش آ گیا، جس سے خدمت خلق کی بجائے خود پرستی پیدا ہو گئی۔ پھر خود فروشی کا دور دورہ ہوا، یعنی اپنے مقاصد زندگی اور تہذیبی سرمائے کو غیروں کی نذر کر دینا اور غیروں کی تہذیب کے آگے سر تسلیم خم کرنا ان کا شعار بن گیا۔ پھر ساتھ ہی ساتھ ناشکیبائی اور ہوسناکی بھی آ گئی۔ ناشکیبائی سے یہاں مراد معمولی بے صبری نہیں" بلکہ کسی مسئلے کو سمجھنے اور سلجھانے کے لئے جن تیاریوں اور

جس مطمح نظر کی ضرورت ہوتی ہے' ان کے بغیر ان مسائل کے حل کی جلد بازی سے کوشش کرنا اور اس طرح سیرت میں جو خامی اور ناہمواری آگئی ہے' لفظ ہوسناکی سے اس کا صاف اظہار ہوتا ہے یعنی کسی ایسی چیز کا طلبگار ہونا" جس کے لئے نہ تو صحیح ذرائع استعمال ہوں اور نہ اس سے کسی بلند مقصد کا اظہار ہوتا ہو۔

"شمع و شاعر" میں شمع نے شاعر کی بابت جو کچھ کہا ہے' وہ بالکل ہمارے مغرب کے نقالوں پر صادق آتا ہے۔ مثلاً

یوں تو روشن ہے' مگر سوز دروں رکھتا نہیں
شعلہ ہے مثل چراغ لالہ صحرا ترا
کعبہ پہلو میں ہے اور سودائی بتخانہ ہے
کس قدر شوریدہ سر ہے شوق بے پروا ترا
قیس ہوں پیدا تری محفل میں یہ ممکن نہیں
تنگ ہے صحرا ترا' محمل ہے بے لیلا ترا
اے در تابندہ! اے پروردۂ آغوش موج!
لذت طوفاں سے ہے ناآشنا دریا ترا

پھر آگے چل کر ایک دوسری جگہ کہا ہے کہ

شرق را از خود برو تقلید غرب
باید ایں اقوام را تنقید غرب

یعنی مغرب کی اندھا دھند پیروی میں مشرقی اقوام سے ان کی طبیعت کی روانی اور اپج چھین لیتی ہے اور اس پر ایسا خول چڑھا دیتی ہے کہ وہ اپنی طبیعت کی موزونیت سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں اور فکر و عمل کے میدان میں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ان اقوام کو مغربی قوموں کا سخت انداز تنقید اپنی تہذیبی روایات کی روشنی میں استعمال کرنا چاہئے تاکہ جو خامیاں ہوں' وہ دور کی جا سکیں۔

یہ درست ہے کہ مغرب کی نقالی کے شکار زیادہ تر ہمارے نوجوان ہیں' جن میں دور نظری کی صلاحیت ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ وہ فرنگ کی ظاہرا دلآویزی سے مرعوب ہو کر اس کی نقل اتارتے ہیں' مگر مغرب کی چنگیزی تک ان کی نظر نہیں پہنچتی اور ان میں تقلید جامد

کی یہ خواہش کبھی لباس اور وضع پر، کبھی کردار اور گفتار پر، کبھی اپنی تہذیبی روایات پر ضرب لگانے میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں عقل و فکر کو جوش عمل کے مقابلے میں کم دخل ہوتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ نقل را چہ عقل۔

لیکن یہ بات اگر جوانوں تک محدود ہوتی، تو شاید لوگ اس کو جوانی کی شوخی سمجھ کر درگزر کرتے، مگر واقعہ یہ ہے کہ مغرب کی نقالی کا پودا جو ملک کی آزادی سے بہت پہلے پروان چڑھ رہا تھا، اب ایک تناور درخت بن گیا ہے اور اس کے سائے میں صرف نوجوان ہی نہیں ہیں، بلکہ اچھی خاصی عمر کے ذمے دار لوگ بھی نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کی دو قسمیں ہیں۔ پہلا گروہ تو ان لوگوں کا ہے، جو اپنے تہذیبی سرمائے کو نہایت کم مایہ، کمزور اور پسماندہ سمجھتے ہیں اور اس کو اس لائق نہیں سمجھتے کہ بازار تمدن میں اس کی نمائش کی جا سکے یا اس سے کوئی تمدنی فائدہ اٹھایا جا سکے، وہ اس میں ایک ترقی یافتہ تمدنی معاشرے کے لوازم زندگی نہیں دیکھتے، اس لئے لا محالہ یہ لوگ مغرب کی طرف جھکتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ ہماری محکومی کے دور کی زندہ یادگار ہیں اور اگر ان کا بس چلے، تو یہ اپنے ملک کی زمین اور آسمان کو بدل کر مغربی بنا دیں، مگر یہ بات جتنی ناممکن ہے، اتنی ہی بے معنی بھی ہے۔ انہی لوگوں کے لئے اقبال نے کہا ہے کہ

ترا وجود سراپا تجلی افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
ترا یہ پیکر خاکی خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہے تو زر نگار و بے شمشیر

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے، جو تعلیم جدید سے آراستہ ہیں مگر اپنی تہذیبی روایات کی بنیاد پر ایک ایسی ترقی یافتہ تہذیب بنانے کا خواب دیکھ رہے ہیں جو مغربی تہذیب کے قابل جذب اجزا کو اپنے اندر سمو سکے۔ ان کا ایک نظریہ حیات ہے اور نظریہ کائنات بھی۔ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے بنیادی نظریوں کو بدلے بغیر مغرب کے فکر و عمل کے صرف ان اجزا کو اخذ کر لیں، جن سے ان کی تمدنی زندگی قابل آسائش بنائی جا سکے اور مادی ترقی کے وہ مدارج آسانی سے طے ہو سکیں، جو آج مغربی قوموں کو حاصل ہیں اور ان کے لئے آئندہ بھی دروازے کھلے رہیں---- اور یہ بات ان کی تہذیب کی تاریخ میں نئی نہیں۔ مسلمانوں کا

اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں دوسری قوموں سے سابقہ پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ ایک طرف ایرانی تھے اور دوسری طرف بازنطینی اور یونانی۔ ان لوگوں کی تہذیب سے مسلمانوں نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور جو علوم انہوں نے یونانیوں سے لئے' ان کو اپنی تہذیب میں جذب کر کے ترقی دی۔ چونکہ یہ کام ان لوگوں نے اپنی حاکمیت اور آزادی کے زمانے میں کیا تھا' اس لئے ان کے کام میں تخلیقی اور تشریحی عناصر موجود ہیں۔ ان میں استادی اور خوداعتمادی کی شان ہے۔ برخلاف اس کے پاکستانی مسلمانوں کے پیش روؤں نے علمی کام بہت دیر میں شروع کیا اور پھر وہ زمانہ ایسا تھا کہ مغربی استعمار کا طوفان اپنی پوری تیزی اور ہولناکی کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس طرح ان کے کام میں نہ صرف دیر ہوئی' بلکہ بعض مشکلات کی وجہ سے یہ کام خاطر خواہ طریقے پر انجام نہ پا سکا۔ اب پاکستان میں آزادی کا دور ہے' مگر یہ گروہ جو اپنی زندہ تہذیبی روایتوں کی عمارت کو علوم جدیدہ سے بھی مزین کرنا چاہتا ہے' اس کے راستے میں رکاوٹیں ہیں۔ شماتت ہمسایہ اور نقصان مایہ کا خوف ہے۔ کسمپرسی کا عالم ہے اور صحیح سرپرستوں کا فقدان ہے اور صحیح کارکنوں کی بھی کمی محسوس ہوتی ہے۔ بہرحال اس کو نہ بھولنا چاہئے کہ مغرب نے ایک طرف اگر اپنے استعمار سے مغلوب قوموں کی خودی کو ختم کرنے کی کوشش کی تو' دوسری طرف اس نے علوم جدیدہ کا راستہ بھی دکھایا اور یہ مغلوب قوموں کے ظرف پر تھا کہ وہ علوم جدیدہ سے کتنا حاصل کرتی ہیں۔ اگر آزادی سے پہلے کے غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کی علمی جدوجہد کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ مسلمانوں نے اپنی آزمائش اور ابتلا کے دور میں بڑے بڑے اہل علم' مفکر اور سائنس دان پیدا کئے۔ ان لوگوں نے مشرق اور مغرب دونوں سے اکتساب علم کیا۔ مغربی علوم میں جو نظم' ترتیب اور مشاہدے کی صلاحیتیں تھیں' ان کو حاصل کر کے اپنی تہذیب میں ایک جلا پیدا کردی' مگر آج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تعلیمی یا معاشرتی سانچہ جو ولولہ انگیز طریقے پر بڑے بڑے آدمیوں کو پیدا کرتا تھا' خراب ہو گیا ہے۔ یہ سانچہ دراصل معاشرہ ہے' جس کی تخلیقی قوت کمزور ہو گئی ہے اور وجہ وہی ہے' جو میں نے اوپر بیان کی ہے یعنی کوئی معاشرہ دوسرے کی نقالی سے کبھی نہ تو اعلیٰ درجے کے آدمی پیدا کرتا ہے اور نہ تمدنی زندگی میں کوئی اونچا خیال یا بلند نصب العین پیش کر سکتا ہے۔

ڈیڑھ سو برس پہلے کے جرمنی میں جو پسماندگی کی صورت پیدا ہو گئی تھی' اس کی وجہ

فرانسیسی تہذیب و خیالات کی نقالی تھی اور آج ہمارے یہاں جو فکر کی کم مائیگی اور عمل کی افسردگی نمایاں ہے' وہ مغرب کی نقالی سے پیدا ہوئی ہے۔ میرے خیال میں یہ وہی مماثلت ہے' جس کا اشارہ اقبال نے اپنے "پیام مشرق" کے دیباچے میں کیا ہے۔ جرمنی میں اس کا فکری علاج جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں' کلوپ اشٹوک' ہرڈر اور گوئٹے نے کیا ہے یعنی انہوں نے اپنی قوم میں خود نگری اور خود اعتمادی کی روح پیدا کر دی' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سو برس کے اندر جرمن قوم نے ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کر لئے۔ ہمارے یہاں اس فکری انقلاب کا بانی اقبال ہے' جو جرمنی کی تاریخ و ادب سے بہت متاثر ہے۔ اس نے ایک شعر میں کس خوبی سے اس کی تعلیم دی ہے۔

برکش آں نغمہ کہ سرمایہ آب و گل تست
اے زخود رفتہ! تہی شوز نوائے دگراں

یعنی جب تک اپنی آواز اور اپنا انداز فکر نہ ہو گا' کسی قسم کی ترقی ناممکن ہے۔ سطور بالا میں میں نے جو کچھ لکھا ہے' اس سے میرا مطلب مغربی تہذیب کی تنقیص نہیں۔ مغربی تہذیب میں مشاہدے' علم و عمل کی بہت سی خوبیاں ہیں۔ مجھے یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مغربی تہذیب کی بعض قدریں ایسی ہیں' جو ہماری تہذیب سے مختلف ہیں اور جن کا امتزاج ہماری تہذیب میں نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایسی بھی قدریں ہیں جن کو ہم آسانی سے اپنی تہذیب کی بنیادی قدروں میں کسی قسم کی ترمیم کئے بغیر جذب کر سکتے ہیں اور ہمارے دیدہ ور اور دانشمند بزرگوں نے یہی کیا یعنی انہوں نے نقالی نہیں کی بلکہ جو چیز مغربی تہذیب سے اپنے مخصوص حالات کی بنا پر لے سکتے تھے' لے لی۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ جو چیز ہماری تہذیبی روح کے خلاف ہے' وہ مغربی تہذیب کی نقالی ہے اور ظاہر ہے نقالی خواہ کسی قسم کی ہو' طبیعت کی قدرتی روانی کو روک دیتی ہے اور فساد پیدا کرتی ہے' جس سے تہذیب کی نشو و نما میں خلل پڑتا ہے۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شب کو سحر کر

حواشی

-1 "Was die Welt im Innersten zusammenhelt"

یعنی وہ اس شے کے جاننے کا خواہش مند تھا' جو عالم کو اندرونی طور پر باہم جکڑے ہوئے ہے۔

-2 جارج ہنری لوئس گوئٹے کا پہلا انگریز سوانح نگار ہے' جس کی کتاب "گوئٹے کی زندگی اور اس کی تصانیف" (مطبوعہ 1855ء) بہت مشہور ہوئی اور بقول ایک جدید جرمن سوانح نگار کے یہ کتاب اب بھی اچھی اور مستند سوانح عمریوں میں شمار کی جاتی ہے۔

-3 دیکھو Prof. Roy Pascal : The German Sturm und Drang - p. XV. Manchester University. 1953

-4 دیکھو "تاریخ یورپ" مصنفہ ایچ' اے' ایل' فشر' لندن۔ صفحہ 695' مطبوعہ 1946ء

-5 دیکھو Johann Gottlieb Fichte : Addresses to the German Nation p. 82-84. London 1922

-6 Ce que n'est pas claire, il n'est pas français.

(ورتھر کی داستان غم' مترجم ڈاکٹر ریاض الحسن' الہ آباد : لٹریری سنڈیکیٹ' 1933- طبع دوم' کراچی : ادبی سنڈیکیٹ' 1967- طبع سوم' کراچی : ادارہ ادبیات عالم' 1983)

ڈاکٹر ریاض الحسن

"ایران و ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر"

(ریمی)

(دیباچہ)

اسلامی مشرق کا اثر مغرب کی زندگی کے تقریباً ہر شعبہ پر کم و بیش پڑا ہے، لیکن اسلامی فتوحات کا اثر کچھ اس طرح کا رہا ہے کہ اس نے اول باز نطینی حکومت کے علاقوں میں اور بعد کو یورپ کی عیسائی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ دراصل اسلام اور عیسائیت کی آویزش آل غسان سے شروع ہوتی ہے۔ غسان عربوں کا ایک عیسائی قبیلہ تھا جو عرب کے شمال میں شام کی جنوبی سرحد پر آباد تھا۔ ہم مذہبی کی بنا پر باز نطینی حکومت نے اس کو اپنے اثر و نفوذ کا ذریعہ بنا لیا تھا اور عرب ایسے دور افتادہ ملک میں یہ باز نطینی حکومت کے لئے ایک سیاسی اور انتظامی چوکی کا بھی کام دیتا تھا۔ مزید برآں اس کو قسطنطنیہ کی حکومت سے مالی امداد بھی ملتی تھی(1)۔

ہوا یوں کہ پیغمبر اسلامؐ نے غسانی حکومت سے بعض مسائل میں گفت و شنید کرنے کے لئے اپنا ایک سفیر غسان کے دارالحکومت بصری (Busra) بھیجا۔ غسانیوں نے بغیر کسی وجہ کے اس سفیر کو شہید کر ڈالا(2)۔ غسانیوں کا یہ فعل اس زمانے کے آداب سیاست اور آئین سفارت کے خلاف تھا۔ اس پر پیغمبر اسلامؐ نے جوابی کارروائی کے طور پر بہ تقاضائے آئین سفارت عصری فوج کشی کی اور پھر غسان کی پشت پناہ حکومت باز نطین کے سامنے

مقابلہ پر آ گئی۔ اس طرح جنگوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا' جس کے نتیجہ میں شام فلسطین اور مصر مملکت اسلام میں داخل ہو گئے۔ دوسری طرف اس کا رد عمل یہ ہوا کہ بازنطینی کلیسا مسلمانوں اور اسلام کا دشمن ہو گیا۔

مغرب میں مسلمانوں کی فتوحات کا سیلاب جب شمالی افریقہ سے ہوتا ہوا ہسپانیہ میں داخل ہوا اور پھر کوہ پائیری نیز (Pyrenese) کو عبور کر کے فرانس کے وسطی میدانوں کی طرف بڑھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا روکنا محال ہے۔ لیکن پوآتی ایر (Poitiers) میں آ کر یہ سیلاب عظیم یکایک تھم گیا اور اس کا رخ پلٹ گیا۔ مگر یہ واقعہ دشمن کی کارگزاریوں کی وجہ سے نہیں ہوا تھا بلکہ اس سیلاب کا زور خود بخود گھٹ گیا تھا اور اس میں اب وہ پہلی سی طاقت آگے بڑھنے کی باقی نہیں رہی تھی(3)۔

مغرب کی عیسائی دنیا میں بھی مسلمانوں کی فتوحات کا وہی رد عمل ہوا جو مشرق میں بازنطینی حکومت میں ہوا تھا۔ یعنی مسلمانوں کے خلاف محاذ قائم ہو گیا اور جوں جوں مسلمانوں کا قدم آگے بڑھتا' مخالفت کی یہ آگ اور بھڑک اٹھتی۔ جواب کے طور پر صلیبی جنگوں کا دور خاصی تیاری کے بعد شروع ہوا مگر یہ بادل جس زور و شور سے اٹھا تھا' اسی طرح گرج برس کے ڈیڑھ دو سو برس کے بعد چھٹ گیا۔ ایک اطالوی مصنف کا خیال ہے کہ "کلیسا کی اسلام سے مخالفت اسلام کے ابتدائی دور ہی سے شروع ہو گئی تھی اور صدیوں سے چل رہی ہے۔ اور اس میں حالات کے مطابق کمی بیشی ہوتی رہی مگر یہ کبھی بند نہیں ہوئی۔ صلیبی جنگوں کے زمانے میں یہ مخالفت بہت تیز ہو گئی۔ بعد ازاں ترکوں کی فتح استنبول کے بعد اور پھر سترہویں صدی کے آخر میں جب ترک آسٹریا کے پائے تخت ویانا کا محاصرہ کر رہے تھے' تو نفرت کی یہ آگ اور بھی تیز ہو گئی۔ اس آخر زمانے میں عیسائی مذہب کا دفاع گویا یورپ کے دفاع کا مسئلہ بن گیا تھا۔ (4) ان واقعات کی طرف ایک فرانسیسی مصنف نے بھی کم و بیش انہی الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ "یورپ پر ازمنہ وسطیٰ میں جو رنگ چھایا ہوا تھا' وہ مسلمانوں سے نفرت کا رنگ تھا اور یہ نتیجہ تھا اس جنگ کا جو صدیوں تک ان کے خلاف لڑی گئی اور اس صدیوں کی نفرت سے صلیبی جنگوں کا آغاز ہوا۔" (5)اس سے نفرت کی خلیج اور بھی وسیع ہو گئی اور اس کا اثر ان کتابوں میں ظاہر ہوا جو عیسائی مصنفین شکست سے متاثر ہو کر لکھتے تھے۔ یعنی جنگ کے میدان میں جب وہ تلوار سے شکست کھاتے تھے تو اس

کا بدلہ گھر میں بیٹھ کر قلم کے ذریعہ زہر گھول کر نکلتے تھے۔ اس طرح اس زمانے کی یورپی کتابوں اور رسالوں میں اسلام، پیغمبر اسلامؐ اور مسلمانوں کے خلاف بے سر و پا باتیں لکھی گئیں اور نہایت نازیبا الفاظ کے استعمال میں شدت برتی گئی۔ مندرجہ بالا فرانسیسی مصنف کا بیان ہے کہ یہ گویا "ادب کے پردے میں عیسائیت کا انتقام تھا" La Revanche lieraire de la Chrétienite(6)

اسلام کا اثر یورپ پر

لیکن یہ امر یہاں تعجب انگیز ہے کہ صلیبی جنگوں کی ہولناکیوں کے باوجود جنوبی یورپ اور اسلامی مشرق کے درمیان تجارت کا سلسلہ برابر جاری رہا(7) اور اس تجارت سے سب سے زیادہ فائدہ جینوآ (Genoa) اور وینس (Venice) کے دو بڑے شہروں نے اٹھایا، لیکن یہی نہیں بلکہ اس مدت میں اور اس کے بعد بھی اسلامی ادب اور فلسفہ کا اثر بھی مغرب پر پڑتا رہا۔ مثلاً اطالیہ کے مشہور شاعر دانتے (1260ء - 1321ء) کی لمبی نظم Divina Comedia (طربیہ خداوندی) پر ایک ہسپانوی عرب مصنف کی تصنیف "کتاب المعراج" کے لاطینی ترجمہ کا اثر پڑا ہے(8)۔ مشہور اطالوی افسانہ نگار بوکاچو Bocaccio (1313ء - 1370ء) پر الف لیلہ کی کہانیوں کا اثر بہت نمایاں ہے۔ پھر پیترارک Petrarque (1304ء - 1374ء) کی عشقیہ نظموں کا سرا صقلیہ کی عربی شاعری سے مل جاتا ہے۔ اطالیہ کی شاعری کی ابتدا کے بارے میں موجودہ دور کی ایک جرمن مصنفہ کا بیان ہے کہ فرانس کے صوبے پراونس (Provence) میں اور جرمنی میں لوگ عوامی بولی کی شاعری میں دلچسپی لینے لگے تھے اور اسی عوامی بولی سے اطالیہ کی کلاسیکی شاعری کا یہ فن جو نیا نیا صقلیہ میں پیدا ہوا تھا، اطالیہ میں پھیل گیا اور اس سلسلہ میں دانتے کا بیان ہے کہ ہمارے بزرگوں نے جس عوامی بولی میں شاعری کی ہے، وہ صقلیہ کی زبان کہلاتی ہے اور پیترارک کی شاعری تو تعجب انگیز طریقہ پر صقلیہ کی عربی شاعری سے ہم آہنگ ہے(9)۔ صقلیہ کے بادشاہ فریڈرک دوم کا دربار عرب اہل علم و فن کا مرجع تھا۔ خود فریڈرک دوم چھ زبانیں بولتا تھا۔ اس کی فوج میں عرب سپاہیوں کی خاصی تعداد تھی۔ وہ اپنے عرب سپاہیوں سے عربی میں باتیں کرتا تھا(10)۔ پھر

دانتے نے اپنی کتاب De Vulgari Eloquenti (عوامی بولی) میں لکھا ہے کہ اطالیہ کی شاعری فریڈرک دوم کے دربار سے شروع ہوئی(11)۔

فرانس کے ادب و شاعری' فلسفہ و سائنس' لسانیات اور فن عمارت سازی وغیرہ پر عربی اثر کے متعلق پروفیسر ماسینیوں (Prof. Massignon) کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے البیرونی کی کتاب "کتاب الصیدلۃ" اور یورپ میں ابن رشد کے فلسفہ کی شہرت اور اثر کا خاص طور پر ذکر کیا ہے(12)۔

جرمنی اور مشرق

جرمنی کی عام زندگی' ادب اور ثقافت پر مشرق کا اثر صلیبی جنگوں کے زمانے ہی میں پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ مثلاً ارض مقدس میں صلیبی جنگوں کے حالات' بہادروں کے کارنامے اور عجیب عجیب واقعات تحریری شکل میں آنے لگے تھے۔ اس بارے میں شاید سب سے پہلی کتاب روڈولف فان ایمس (Rudolf von Ems) اور یانسن اینیکل (Jansen Enikal) کی Weltchroniken (واقعات عالم) ہے(13)۔ پھر بعد کو مشرق کا اثر کچھ فرانس کے ذریعہ اور کچھ براہ راست پہنچا۔

جرمنی میں مشرقی علوم کی ابتدا ایک خاص واقعہ سے بیان کی جاتی ہے۔ یہ سترہویں صدی کے نصف اول کا واقعہ ہے' جب ترکوں کی یلغار بلقان سے نکل کر آسٹریا کی طرف بڑھ رہی تھی تو اس وقت ساری جرمن قوم خوف و دہشت میں گرفتار ہو گئی اور ترکوں کے فوجی دباؤ سے نکلنے کی فکر کرنے لگی۔ ترکوں کی شکست سے بچنے کے لئے ان کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ ترکی اور ایران کی چپقلش صفویوں کے زمانے سے شروع ہوگئی تھی اور اس کی خبر یورپ تک پہنچ گئی تھی(14) اور جرمنی کے لئے یہ گویا ایک نیک فال تھی۔ چنانچہ جرمنی کے سیاست دان ان خطوط پر سوچنے لگے تھے کہ اگر ایران اور ترکی کی چپقلش کو تیز کر دیا جائے تو یورپ کی طرف ترکوں کی پیش قدمی اگر ختم نہیں ہو گی' تو کم سے کم اس کا زور ٹوٹ جائے گا۔ اس خیال سے ڈیوک آف شلیسوگ ہولشٹائن۔ گوٹورپ نے ایران بھیجنے کے لئے چونتیس آدمیوں کا ایک وفد ترتیب دیا۔ یہ وفد 6 نومبر 1633ء کو روس اور آذربائیجان

کے راستہ سے ایران روانہ ہوا۔ اس وفد کا مقصد شاہ ایران کو ترکوں کے خلاف ایک معاہدہ پر راضی کرنا تھا(15)۔

"گلستان سعدی" کا جرمن میں ترجمہ

یہ وفد کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوا لیکن یہ وفد فارسی کی بہت سے کتابیں جرمنی لے گیا۔ ان میں "گلستان" کا ایک نسخہ بھی تھا۔ آدم اولیاریوس نے ایک ایرانی عیسائی کی مدد سے جس کو جرمن وفد اپنے ہمراہ ایران سے جرمنی لے گیا تھا "گلستان" کا ترجمہ جرمن زبان میں 1653ء میں شائع کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے "گلستان" کے ترجمے شائع ہو چکے تھے مگر وہ گمنامی میں پڑ گئے تھے۔ اولیاریوس کے ترجمے کی بڑی شہرت ہوئی اور یورپ میں اس کی دھوم مچ گئی۔ "اس ترجمے نے جرمن ادب پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔"(16)

"....einen so bedeutenden Einfluss auf die

deutsche Literatur ausgeuebt hat."

جرمنی کا مشہور مفکر اور ادیب ہرڈر جو جدید جرمنی کے بانیوں میں تھا' سعدی سے بہت متاثر تھا۔ اس نے اپنے رسالے Adrastea میں لکھا کہ "ہم یورپ میں عربی فارسی زبانوں سے محض تفریحاً دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ ہم ان زبانوں کے ذریعہ کچھ سیکھنا چاہتے ہیں۔ حافظ کے نغموں سے ہم خاصا لطف اندوز ہو چکے' اب سعدی ہمارا استاد بن گیا ہے۔" پھر ہرڈر پر ہسپانیہ کے اسلامی دور کا بھی کچھ اثر تھا۔ اس نے گیارہویں صدی ہسپانیہ کے ایک عیسائی جانباز اور فوجی سردار رودر یگودیاز (Rodrigo Diaz) کا جو تاریخ میں Cid یعنی سید کے نام سے مشہور ہے' نہ صرف عیسائی کردار ظاہر کیا ہے بلکہ اس پر مغربی اسلامی تہذیب کی چادر بھی ڈال دی ہے(17)۔

ہرڈز کا اثر گوئٹے پر خاصا پڑا ہے۔ گوئٹے پہلی ہی ملاقات میں اس سے بہت متاثر ہوا اور پھر دونوں کا ملنا برابر ہوتا رہا۔ ہرڈر کے دماغ میں نئے نئے خیالات کا ایک طوفان موجیں مار رہا تھا اور وہ ان طوفانی موجوں سے نوجوانوں کو روشناس کرانا چاہتا تھا۔ چنانچہ گوئٹے پر اپنے خیالات کا انکشاف کرتے ہوئے ہرڈر نے کہا کہ "شاعری انسانیت کی مادری زبان ہے" یعنی

ہر ملک و قوم کے لوگ اپنے خیالات کا اظہار شعر میں کرتے ہیں۔ اس لئے قوموں کی قدیم نظموں کا سراغ لگانا چاہئے۔ دوم' جرمنوں کو اب جرمنی کے مختلف حکمرانوں کے رنگ میں علیحدگی کا خیال ترک کر کے پوری جرمن قوم کے رنگ میں سوچنا چاہئے۔ سوم' یورپ میں فرانس اب دم توڑ رہا ہے اور اس کی ثقافت ماند پڑ رہی ہے۔ اٹلی' ہسپانیہ اور فرانس اپنی اپنی عظمت کے دن دیکھ چکے۔ اب جرمنی کی باری ہے۔ اس کے لئے جرمنی کو تیار ہونا چاہئے اور یہ تیاری اول اول ادب اور شاعری کے میدانوں میں کرنا چاہئے(18)۔ اس اثر سے گوئٹے کے دل میں قوموں کی قدیم شاعری اور اساطیر سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور اس سلسلہ میں اس نے قدیم یونانی اور رومی تہذیب' قدیم ہندو تہذیب اور ایرانی اور عربی تہذیب کا مطالعہ بڑی محنت سے کیا۔ ان مطالعوں سے اس کی طبیعت میں ہمہ گیری اور نظر میں وسعت پیدا ہو گئی۔

یورپ کی دو تحریکیں

اٹھارویں صدی کا آخر یورپی ادب میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس زمانے میں دو مشہور مگر متضاد تحریکیں اٹھیں اور ان دونوں کا مرکز فرانس تھا۔ پہلی تحریک رومانی تحریک تھی جس کا سرا روسو (Rousseau 1712ء - 1778ء) کی تحریروں میں ملتا ہے۔ اس تحریک کے اجزائے چہارگانہ حسن پرستی' قدرت پرستی' جذبات پرستی اور قدامت پرستی تھے۔ دوسری تحریک عقلیت یا نئی روشنی کی تحریک تھی اور اس کا سرا والٹیر (Voltaire 1694ء - 1778ء) اور دیدیرو (Diderot 1713ء - 1784ء) کی تحریروں میں ملتا ہے۔ اس تحریک کو جرمن Aufklaerung (عقلی اور منطقی جلا بخشی یا نئی روشنی) کے نام سے پکارتے ہیں۔ مشہور جرمن فلسفی کانٹ نے 1784ء میں اس تحریک کی حسب ذیل الفاظ میں تعریف کی ہے: "انسان کا اپنی خود عائد کردہ طفولیت سے نکلنے کا نقطہ آغاز عقلیت یا نئی روشنی ہے اور یہ طفولیت نام ہے اپنی دماغی صلاحیتوں اور عقل کو اپنی نااہلی سے بغیر مقصد کے استعمال کرنے کا۔ اس لئے ہمت کرو اور اپنی عقل کو صحیح طریقہ پر استعمال کرو اور یہی نئی روشنی کی تحریک کا مقصد ہے۔"(19)

حالانکہ یہ دونوں تحریکیں متضاد تھیں لیکن گوئٹے نے ان دونوں کا اثر قبول کیا۔ اپنی ابتدائی تحریروں میں گوئٹے رومانیت کا قائل اور جذبات کی پیروی کا حامل تھا۔ "گوتس فان برلی شینگن" کا ڈرامہ اور "نوجوان ورتھر کی داستان غم" کا ناول شائع کر کے وہ "طوفان و ہیجان" کے رومانی دور کا ایک نامور مصنف بن گیا' مگر اس میں عقل پروری کا مادہ بھی موجود تھا۔ عقلیت یا نئی روشنی کی تحریک سے وہ اپنے ابتدائی زمانہ قیام لائپزنگ و اشٹراسبورگ میں واقف ہو چکا تھا۔ کانٹ اس تحریک کا امام تھا اور گوئٹے عقل کی حد بندی اور اس کے طریقہ استعمال میں کانٹ کا ہم نوا تھا۔ گوئٹے کے خیال میں عقل زندگی کا ایک ضروری جزو ہے لیکن اگر اس سے صحیح طور پر کام لینا ہے تو اس کی حدود کا تعین ضروری ہے۔ اس کو بے لگام چھوڑنا کسی طرح فکر انسانی کے لئے درست نہیں۔ ایکرمان سے یکم ستمبر 1829ء کو گفتگو کرتے ہوئے گوئٹے نے کہا کہ "بلاشبہ عقل انسانی کے حدود متعین کر کے جس کے باہر وہ نہیں جا سکتی اور ناممکن الحل مسائل کو اپنی جگہ چھوڑ کر کانٹ نے بڑی خدمت انجام دی ہے۔"(20) اس چیز کو اس نے اپنی ایک نظم Grenzen der Menschheit (انسانوں کے حدود) میں یوں ظاہر کیا ہے:

"آدمی کو دیوتاؤں کے مقابلہ میں کبھی نہیں اترنا چاہئے۔
اگر وہ اتنا بلند ہو کہ ستاروں کو اپنے سر سے چھو لے
تو اس کو پاؤں رکھنے کے لئے کوئی محفوظ جگہ نہیں ملے گی۔
پھر بادل اور ہوا اس کا تماشہ بنائیں گے"(21)

گوئٹے کی مشرق اور اسلام سے دلچسپی

مشرق سے گوئٹے کی دلچسپی بہت پرانی تھی۔ موجودہ زمانہ کے ایک جرمن۔امریکی مصنف کا خیال ہے کہ "گوئٹے کی روحانی زندگی میں مشرقی روایات کا اثر ہمیشہ نہایت موثر طریقہ پر رہا ہے"(22) اور یہ اثر اس کی نوعمری ہی کے زمانے میں فرانک فورٹ میں شروع ہو گیا تھا(23) (Seit seinem Frankfurter Knabentagen)- جب اس نے ہندو تہذیب کا مطالعہ شروع کیا تو اس کو ہندو تہذیب کی دیومالا اور اساطیر میں عجیب عجیب چیزیں

نظر آئیں۔ مثلاً شیو جی کے سر پر سانپوں کی کنڈلی، گنیش جی کے سر پر ہاتھی کا سونڈ، لکشمی جی کے چار پانچ ہاتھ اور مہادیو جی کے گلے میں سانپوں کا ہار دیکھ کر وہ ہندو تہذیب سے سخت متنفر ہو گیا لیکن اس کے باوجود اس نے کالی داس کے ڈرامے "شکنتلا" کی تعریف کی اور "فاؤسٹ" کا ابتدائیہ لکھ کر اس نے کالی داس کا اثر قبول کیا۔

لیکن مشرقی تہذیبوں میں اس نے سب سے زیادہ اثر اسلام کا قبول کیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مسلمان ہو گیا تھا، بلکہ اپنی روایات کو مانتے ہوئے اس نے نہایت فراخدلی سے اسلام کی تعریف کی۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں اسلام کے خلاف قدیم اور روایتی تعصب کی شاہراہ سے ذرا ہٹ کر چند مصنفین کی کتابیں شائع ہوئیں۔ ان میں کلیسا کے غیر عقلی عقائد اور رسم و رواج کے مقابلہ میں اسلام کو عقلی مذہب کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔(24) ان مشہور مصنفوں میں پروفیسر ٹامس وان ایرپی نیوس 'Thomas van Erpenius) 1584ء - 1624ء)، پروفیسر ایڈورڈ پوکاک (Edward Pocock' 1604ء - 1691ء)، پروفیسر جان ہاٹنگر (John Hottinger' 1620ء - 1667ء)، کاؤنٹ ہنری دے بولین ویئر (Count Henry de Boulainvilliers 1658ء - 1722ء)، ڈینس دیدیرو (Denis Diderot 1713ء - 1784ء)، اور بار تیلمی دیر بیلو (Barthelemy d'Herbelot) کے نام قابل ذکر ہیں۔

کاؤنٹ ہنری دے بولین ویئر نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ فلسفیانہ اور اخلاقی لحاظ سے اسلام عیسائیت سے برتر ہے(25)۔ والٹیر نے بھی کسی حد تک ان مصنفوں کی پیروی کی ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ گوئٹے نے ان مصنفین کی تصنیفوں کو ضرور پڑھا ہو گا کیونکہ اس نے اپنے "مغربی مشرقی دیوان" میں جو تعلیقات پیغمبر اسلامؐ، قرآن اور عربی، فارسی شعرا پر لکھے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی تاریخ و ادب پر اس کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ ایک اطالوی ماہر جرمانیات کا خیال ہے کہ "پیغمبر اسلامؐ جو قرآن کے مبلغ ہیں، ان کا اثر گوئٹے پر مدتوں رہا اور اس اثر کا نتیجہ "مغربی۔ مشرقی دیوان" میں دوبارہ ظاہر ہوا۔"(26)

"حکمت نامہ" کی اپنی ایک نظم میں گوئٹے اسلام کے بارے میں حسب ذیل خیالات کا اظہار کرتا ہے:

"Naerrisch, dass jeder in seinem Falle

Seine besondere Meynung priest;

Wenn Islam Gott ergeben heist,

Im Islam leben und sterben wir alle".(27)

"یہ سراسر حماقت ہے کہ ہر شخص
اپنے معاملہ میں اپنی رائے کی تعریف کرتا ہے'
اگر اسلام کا مقصد اپنے کو خدا کی مرضی کے تابع کرنا ہے
تو ہم سب اسلام ہی میں مرتے ہیں۔"

فرانک فورٹ کے زمانہ قیام میں اس نے 1773ء میں پیغمبر اسلامؐ پر ایک ڈرامہ لکھنے کا ارادہ کیا اور اس سلسلہ میں اس نے "نغمہ محمدؐ" نظم لکھی۔ یہ ڈرامہ ادھورا رہ گیا لیکن اس کی تیاری میں اس نے قرآن و پیغمبر اسلامؐ کی سیرت کا بڑی احتیاط اور محنت سے مطالعہ کیا۔ (28) اسلام سے دلچسپی کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ ہندو تہذیب کا حال وہ کتابوں میں پڑھ چکا تھا مگر اسلامی تہذیب کے فرزندوں کو اپنے شہر وائمر میں اس کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ہوا یوں کہ وسط ایشیا کے ترکی قبیلے پاشقیر کا ایک روسی دستہ وائمر میں تعینات تھا۔ اس دستہ کے سپاہی نمازیں پڑھتے اور قرآن کی بہ آواز بلند تلاوت کرتے۔ گوئٹے ان کے رکوع اور سجود کو بڑے غور سے دیکھتا' ان کی تلاوت کو سنتا اور پھر ان سے باتیں کرتا۔ دوسری چیز یہ ہوئی کہ خود وائمر کی فوج کا ایک دستہ نپولین کی فوج کے ہمراہ ہسپانیہ لڑنے گیا تھا۔ وہ جب واپس آیا تو اپنے ساتھ بہت سے قدیم عربی طغرے اور مخطوطات لایا۔ گوئٹے نے یہ تحریریں دیکھیں اور اس کو بہت پسند آئیں(29)۔ غالباً اس نے ان مخطوطات کو دیکھ کر ان کی نقل کرنا بھی شروع کر دی تھی۔

مغربی۔ مشرقی دیوان

گوئٹے کے ذہنی پس منظر میں مندرجہ بالا اثرات کام کر رہے تھے کہ فان ہامر نے جو استنبول میں آسٹریا کے سفارت خانہ میں کام کر چکا تھا' "دیوان حافظ" کا جرمن ترجمہ شائع کیا۔ گوئٹے نے اس ترجمہ کو پڑھا تو اس کی شاعرانہ حس جو پیرانہ سالی کی وجہ سے کمزور

پڑنے لگی تھی، پھر بیدار ہو گئی۔ حافظ کا رنگ شاعری اور طرز کلام اس کو بہت پسند آیا اور حافظ کے ترنم نے اس کے تخیلات میں ایک ہیجان عظیم برپا کر دیا۔

مولانا حالی نے مولانا شبلی نعمانی کے فارسی کلام "دستہ گل" پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "غزلیں کاہے کو ہیں، شراب دو آتشہ ہے جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔" بالکل یہی واقعہ گوئٹے کے ساتھ بھی پیش آیا یعنی "مغربی۔مشرقی دیوان" کی غزلوں میں نہ صرف جوانی کا رنگ ابھر آیا بلکہ چشم ساقی کی سرمستی کے ساتھ ساتھ ساقی کی ہم سری، ہم نشینی اور ہم آہنگی کو بھی اس میں دخل تھا۔

ماریانے ویلیمر (Marianne Willemer) آسٹریا کی ایک رقاصہ تھی جس نے فرانک فورٹ کے ایک ادھیڑ عمر مہاجن (بینکر) سے شادی کی تھی۔ وہ نہایت بیباک، تیز طرار اور نہایت حسین اور ذہین عورت تھی۔ 1814ء میں اس کی ملاقات گوئٹے سے ہوئی۔ اس نے اپنی جادوبیانی اور شاعرانہ مزاج سے گوئٹے کو بہت متاثر کیا۔ دونوں کی عمروں میں خاصا تفاوت ہونے کے باوجود دونوں کی طبیعت ادب اور شاعری کے میدان میں مل گئی۔ اس طرح دونوں نے اپنی اپنی شخصیت کی ایک حد تک نفی کر کے اس ہم رنگی کو نباہا۔ گوئٹے کی زندگی کا یہ دور حافظ کے اس شعر کی ترجمانی کرتا ہے کہ:

پیرانہ سرم عشق جوانے بسر افتاد
واں راز کہ در دل بنہفتم بدر افتاد

گوئٹے نے مغربی۔مشرقی دیوان میں جو نظمیں زلیخا کو مخاطب کر کے یا زلیخا کے نام پر لکھی ہیں، ان کا اشارہ دراصل ماریانے ویلیمر کی طرف ہے۔ ماریانے نے بھی حافظ کے رنگ میں چار پانچ نظمیں (30) لکھ کر گوئٹے کو دیں اور وہ اتنی عمدہ تھیں کہ گوئٹے نے معمولی رد و بدل کے ساتھ ان کو اپنے دیوان میں شامل کر لیا۔ گوئٹے کے ابتدائی ناول "نوجوان ورتھر کی داستان غم" میں اگر رنج و اضمحلال کی کیفیت نمایاں ہے تو مغربی۔مشرقی دیوان میں سراسر سرور اور نشاط کا عالم ہے۔

"دیوان" حافظ پڑھ کر اس کو خیال ہوا کہ "مجھ کو بھی کچھ نہ کچھ لکھنا چاہئے، ورنہ اتنے عظیم شاعر کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔"(31)

گوئٹے کا "مغربی مشرقی دیوان" تمام مغربی ادب میں ایک بے مثال چیز ہے۔ مغربی ادب

میں مشرقی ادب کے بے شمار ترجمے ملتے ہیں مگر مشرقی ادب سے متاثر ہو کر شاعری کی ایک نئی تحریک شروع ہو گئی ہو' ایسی کوئی چیز اتنی آب و تاب کے ساتھ جرمن ادب کے سوا کسی مغربی ادب میں نہیں ملتی۔ اس میں شک نہیں کہ مشرقی ادب نے مغرب کے شعرا اور مصنفین کو انفرادی طور پر متاثر کیا' مگر تحریک کی صورت صرف جرمن ادب میں نمودار ہوئی۔ البتہ انیسویں صدی کے آخر میں اور بعد کو بھی عمر خیام کی مغربی ادب میں مقبولیت خاصی بڑھ گئی تھی مگر یہ جرمن ادب کی مشرقی تحریک کی ہم پلہ نہیں تھی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ گوئٹے کو فارسی ادب اور حافظ سے کیوں اتنا تعلق خاطر ہو گیا کہ وہ دو ڈھائی ہزار سال کی مغربی تہذیب کا پشتارہ اپنے سر سے وقتی طور پر اتار کر مشرق کا تخئیلی سفر کرتا ہے۔ وہ مشرق کے شہروں' بیابانوں اور ریگستانوں میں چشم تصور کی مدد سے جاتا ہے اور وہاں کے حالات لکھتا ہے۔ شراب کے ایک جام سے اور حقے کے ایک کش سے مسرور اور بیخود ہو جاتا ہے۔ وہ قدیم یونانی اور قدیم رومی دیویوں اور دیوتاؤں کے ناموں کو چھوڑ کر لیلیٰ و مجنوں' دلآرام و بہرام گور' شیریں و فرہاد' یوسف و زلیخا' رستم و سہراب وغیرہ کے ناموں کو یورپ سے روشناس کراتا ہے' مشرقی اساطیر کی طرف اشارے کرتا ہے اور ایک جگہ تو ٹھیٹ جرمن شعر میں فارسی ترکیب "بے دماغ بودن" استعمال کرتا ہے اور اس کو دوسرے مصرع میں سمجھاتا ہے۔ اس دیوان میں جا بجا محبوب کی جدائی کے شکوے ہیں اور محبوب سے ملنے کی خوشی بھی ہے یعنی فراق اور وصال کی داستانیں ہیں۔ یہ دیوان ایک طرح سے ایک شاعرانہ روزنامچہ ہے اور ہاں اس میں حافظ کی یاد میں اس کو مخاطب کر کے نظمیں بھی ہیں۔ مثلاً ایک نظم Unbegrenzit (لامحدود) میں حافظ کو یوں مخاطب کیا ہے:

"تیری عظمت اور بزرگی اس میں ہے کہ تیری کوئی انتہا نہیں ہے
اور تیری سیرت کا تقاضا ہے کہ تو ابتدا نہیں کرتا۔
تیری غزلیں گنبد نیلوفری میں ستاروں کی طرح گردش کرتی ہیں
کہ ان کی ابتدا اور انتہا ایک ہی طرح کی ہوتی ہے
اور ان کے وسط میں وہی ہوتا ہے جو ان کی ابتدا اور انتہا میں ہے۔
تو شاعروں کا شاعر ہے اور مسرت کا سرچشمہ
اور اس چشمہ سے لاتعداد چشمے نکلتے ہیں۔

تو ایک لب ہے جو بوسہ کے لئے بنایا گیا ہے'
تو ایک سینہ بے تاب اور نرم رو غزل ہے'
ایک دائمی تشنہ کام بادہ گسار'
اور محبت سے ابلتا ہوا دل ہے۔
اور خواہ دنیا تباہ ہو جائے
مگر حافظ! میں صرف تیری پیروی کروں گا۔
ہم دونوں روحانی طور پر جڑواں ہیں۔
اور آ' ہم مسرت و الم میں برابر کے شریک ہو جائیں۔
تیری طرح محبت کرنا اور میکشی کرنا
میرے لئے باعث فخر اور میری زندگی کا سرمایہ ہو گا۔
اب اے میری غزل! اپنی آتش نفسی دکھا
کیونکہ تو اس کے مقابلہ میں سن رسیدہ بھی ہے اور جوان بھی" (32)

یہاں مختصراً گوئٹے کے مشہور سوانح نگار بیل شوسکی کی رائے نقل کروں گا' جس کا حوالہ اقبال نے اپنے "پیام مشرق" کے دیباچہ میں دیا ہے:

"بلبل شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی۔ اس کو کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ شاید میری روح ہی حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے۔ وہی زمینی مسرت' وہی آسمانی محبت' وہی سادگی' وہی عشق' وہی جوش و حرارت' وہی وسعت مشرب' وہی کشادہ دلی اور وہی قیود و رسوم سے آزادی! غرضیکہ ہر بات میں ہم اسے حافظ کا مثیل پاتے ہیں۔ جس طرح حافظ لسان الغیب و ترجمان اسرار ہے' اسی طرح گوئٹے بھی ہے اور جس طرح حافظ کے بظاہر سادہ الفاظ میں ایک جہان معنی آباد ہے' اسی طرح گوئٹے کے بے ساختہ پن میں بھی حقائق و اسرار جلوہ افروز ہیں۔ دونوں نے امیر و غریب سے خراج تحسین وصول کیا۔ دونوں نے اپنے اپنے وقت کے عظیم الشان فاتحوں کو اپنی شخصیت سے متاثر کیا (یعنی حافظ نے تیمور کو اور گوئٹے نے نپولین کو) اور دونوں عام تباہی اور بربادی کے زمانے میں طبیعت کے اندرونی اطمینان و سکون کو محفوظ رکھ کر

اپنی ترنم ریزی جاری رکھنے میں کامیاب رہے۔"(33)

گوئٹے اور حافظ

گوئٹے نے مشرق کا جو تخیلی سفر کیا اور جس طرح وہ حافظ کے کلام سے متاثر ہوا اس کے کئی وجوہ ہیں جو میرے خیال میں حسب ذیل ہیں :

(1) گوئٹے کے مزاج میں ہمہ گیریت اور آفاقیت تھی۔ (34) وہ تنگ نظری سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔ اس کے بحر خیالات میں نہ صرف گہرائی تھی بلکہ وسعت بھی تھی۔ وہ انسانوں کے احساسات اور تجربات کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا اور ان کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھتا۔ اس کا خیال تھا کہ حقیقت آفاقیت میں پوشیدہ ہے۔ (35) اس خیال سے اس نے مشرق کا مطالعہ کیا۔

(2) گوئٹے کو اپنی نو عمری ہی کے زمانے سے مشرق سے خاص کر اسلامی مشرق سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی' جیسا اوپر کہا جا چکا ہے اس نے قرآن اور سیرت پیغمبر اسلامؐ کا بڑی جانفشانی اور دیدہ ریزی سے مطالعہ کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے آفاقی رویہ کی بنا پر یورپ کے تمدنی خول سے نکل کر دوسرے تمدنوں کی سیر کرنا چاہتا تھا۔ اس کی سیرت میں رنگا رنگی تھی اور تضاد کا عنصر بھی تھا۔ وہ بہ یک وقت جرمن نژاد بھی تھا اور جنوبی یورپیوں یعنی بحر متوسط کے کنارے رہنے والوں سے بھی بہت مشابہت رکھتا تھا۔ اس کا رنگ بھی کچھ سانولا تھا۔ وہ دنیا والوں کے لئے جرمن تھا اور جرمنی والوں کے لئے یورپی تھا۔ اس رنگا رنگی اور تضاد سے اس میں عیسائیت سے ایک طرح کی سرد مہری پیدا ہو گئی تھی۔ اور صلیب سے اپنی کراہیت کے اظہار میں اس کا رویہ بت پرستانہ تھا (یعنی وہ بت پرستانہ عقیدہ جو قدیم یونان اور قدیم روما میں رائج تھا اور گوئٹے عیسائیت کے معاملے میں اس عقیدہ کا ہم نوا تھا)۔ اس کی فطرت پسندی اور اس کی حقیقی دنیا داری میں بہت سی چیزیں عیسائیت کے خلاف تھیں۔ وہ اپنے کو قطعی طور پر غیر عیسائی کہلانا پسند کرتا تھا (A decided non-Christian)(36)

(3) گوئٹے نے جب حافظ کا کلام پڑھا تو وہ اس کو ایسا آئینہ معلوم ہوا جس میں وہ خود

اپنے دور کی تصویر دیکھ سکتا تھا' کیونکہ دونوں شعرا کے ادوار بڑے پر آشوب اور پر خلل تھے جس میں معاشرہ کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور کوئی چیز اپنی جگہ باقی اور ثابت نہ رہ سکی۔ خواجہ حافظ کے دور کا حال بیان کرتے ہوئے مولانا اسلم جیراجپوری نے لکھا ہے کہ خواجہ حافظ کی تمام زندگی کا زمانہ فارس اور خاص کر شیراز کے لئے نہایت پر آشوب زمانہ تھا۔ اس عہد میں بڑے عظیم الشان انقلابات واقع ہوئے۔ خواجہ حافظ کی پچہتر چھہتر (75-76) سال کی زندگی میں شیراز میں سات بادشاہ ہوئے اور اکثر ان میں باہم سخت خون ریزیاں ہوئیں۔ ابو سعید تمام عراق و فارس کا بادشاہ تھا۔ جب 736ھ (1335ء - 1336ء) میں وہ فوت ہوا تو اس کی سلطنت گیارہ حصوں میں بٹ گئی۔ جب ابواسحاق کا دور آیا تو امیر مبارزالدین مظفر نے 754ھ (1353ء - 1354ء) میں شیراز پر حملہ کر دیا۔ امیر مظفر سخت گیر تھا۔ لوگ اس کے خلاف کھڑے ہوگئے اور 761ھ (1358ء - 1359ء) میں اس کو قید کر دیا اور پھر اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی۔ امیر مبارزالدین کے بیٹے تخت کے لئے ہمیشہ خانہ جنگی میں مصروف رہے۔ بعد ازاں وزیروں کے بھی قتل شروع ہو گئے اور سب سے آخر میں تیمور نے 787ھ(1385ء - 1386ء) میں شیراز پر حملہ کر دیا۔ یہ گویا قیامت کا نمونہ تھا(37)۔

دوسری طرف گوئٹے کا زمانہ کچھ کم پر آشوب نہیں تھا۔ اول انقلاب فرانس واقع ہوا اور پھر نپولین کا ہنگامہ گرم ہوا۔ نپولین نے اطالیہ اور جرمنی میں خاص طور پر طوفان برپا کیا۔ اطالیہ میں اس وقت کئی حکومتیں قائم تھیں۔ نپولین نے پرانے فرمان رواؤں کو علیحدہ کر کے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ذمہ ریاستوں کا انتظام ڈال دیا۔ یہی صورت جرمنی میں بھی ہوئی۔ اس وقت جرمنی میں تقریباً ایک سو بیس (120) چھوٹی بڑی خود مختار ریاستیں تھیں۔ نپولین نے ان سب کا قلع قمع کر کے ایک ریاست وفاق رائن کے نام سے مغربی جرمنی میں قائم کی۔ اس سے نپولین کا مقصد آسٹریا اور پروشا کے مقابلہ میں ایک ایسی ریاست کا قیام تھا جو فرانس کی بالادستی تسلیم کرتے ہوئے وسطی یورپ میں توازن قائم کر سکے۔ اس شکست و ریخت کا یہ نتیجہ ہوا کہ حکمرانوں کے تخت الٹ گئے۔ لاکھوں افراد بے گھر ہو گئے۔ انقلاب فرانس اور پھر نپولین کا دور یورپ کے لئے قیامت سے کم نہیں تھا۔ صدیوں کا جما جمایا معاشرہ بکھر گیا۔

حالانکہ گوئٹے نپولین کا مداح تھا لیکن وہ خود سیاست سے طبعاً کنارہ کش رہتا تھا۔ اس

کا میدان عمل اپنی ریاست کے سرکاری کاموں کے علاوہ نثر نگاری' شاعری' مظاہر فطرت کی تحقیقات اور تھیٹر کی رہنمائی تھا۔ اس نے اپنی شاعری اور نثر نگاری سے اپنی قوم کو فرانس کی تقلید کے بند گراں سے آزاد کیا اور یہی جرمنی کی آزادی کا نقطہ آغاز تھا۔(38)

لیکن وہ اس ہنگامہ دار و گیر میں اپنے ذہنی توازن کو برقرار رکھ کر مشرق کی طرف متوجہ ہوا اور حافظ کے کلام میں اپنے روحانی سکون کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔ اس کے مغربی۔مشرقی دیوان میں پہلی نظم "ہجرت" کے عنوان سے ملتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ شاعر روحانی طور پر مغرب سے مشرق کی طرف امن و سکون کی تلاش میں ہجرت کرتا ہے۔ اس کے چند ابتدائی بند کا ترجمہ حسب ذیل ہے :

"شمال' مغرب اور جنوب ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں۔
تخت ٹوٹ رہے ہیں اور ریاستیں بکھر رہی ہیں۔
تو خالص مشرق میں پناہ لے
پیران شرق کی آب و ہوا سے لطف اٹھانے کے لئے۔
وہاں شراب' عشق اور موسیقی سے
خضر کا چشمہ آب بقا تجھ کو جوان کر دے گا

○ ○ ○

وہاں چوپاؤں کی صحبت میں رہوں گا
اور نخلستانوں میں اپنے کو تر و تازہ رکھوں گا۔
جب کاروانوں کے ساتھ سفر کروں گا
تو شال' قہوہ اور مشک فروخت کروں گا
اور ریگستانوں کے تمام راستوں سے گزر کر شہر کو جاؤں گا

○ ○ ○

دشوار گزار پہاڑی راستوں سے اوپر اور نیچے گزرتے وقت'
حافظ! تیری غزلیں تسکین دیں گی
اور سالار کارواں جب اپنے خچر کی پیٹھ سے

کوئی مسحور کن حدی سنائے گا
تو وہ ستاروں میں گرمی اور جوش پیدا کرے گا
اور چوروں اور ڈاکوؤں کو خوف سے بھگا دے گا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حافظ کے کلام کا وہ کون سا حصہ تھا یا وہ کون کون سے اشعار تھے، جن میں گوئٹے نے اپنی اور اپنے زمانے کی شکل دیکھی۔ اگر دیوان حافظ کا وہ نسخہ مل جاتا جو اس کے مطالعہ میں رہا تھا اور اگر اس نے اس میں اپنی پسند کے مطابق اشعار پر نشان لگائے ہوں، تو اس معاملہ میں تھوڑی بہت رہبری ہو سکتی تھی۔ مگر اس نسخہ کی عدم موجودگی میں یہ طے کرنا ناممکن ہے کہ حافظ کے کن اشعار سے وہ متاثر ہوا۔ تاہم اس کی طبیعت کے انداز عاشقی و حسن پرستی، مے نوشی و رندی سے، گردش روزگار اور نیرنگی عالم کی نمود سے جس سے اس کو دوچار ہونا پڑا اور پھر ایک عام اخلاقی نقطہ نظر سے میں نے حافظ کے چند اشعار کا انتخاب نمونتا اس خیال سے کیا ہے کہ سینکڑوں اور اشعار کے علاوہ یہ اشعار گوئٹے کے حسب حال ہیں اور اس کی ذات اور اس کے زمانے پر صادق آتے ہیں:

ساقیا بر خیز و دردہ جام را
خاک بر سر کن غم ایام را
اے دل شباب رفت و نچیدی گلے زعیش
پیرانہ سر بکن ہنرے ننگ و نام را

اے صبا گر بجوانان چمن باز رسی
خدمت ما برسان سرو و گل و ریحان را

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحی مئے ناب و سفینہ غزل است

جریده رو که گزر گاه عافیت تنگ است
پیاله گیر که عمر عزیز بے بدل است
به چشم عقل دریں ره گزار پر آشوب
جهان و کار جهاں بے ثبات و پرخلل است

مباش در پے آزار و هر چه خواهی کن
که در شریعت ما غیر ازین گناہے نیست

آه ازآں نرگس جادو که چه بازی ا نگیخت
واه ازآں مست که با مردم هشیار چه کرد

آں پریشانی شبهائے دراز و غم دل
همه در سایه گیسوئے نگار آخر شد

از صدائے سخن عشق ندیدم خوشتر
یادگارے که دریں گنبد دوار بماند

غلام نرگس مست تو تاجدارانند
خراب بادهٔ لعل تو هوشیارانند

ساقیا عشرت امروز به فردا مفگن
یا ز دیوان قضا خط امانے بمن آر

خیز و در کاسه زر اب طربناک انداز
پیش تر زانکه شود کاسه سر خاک انداز
عاقبت منزل ما وادی خاموشان ست
حالیا غلغله در گنبد افلاک انداز

من نه آں رندم که ترک شاہد و ساغر کنم
محتسب داند که من ایں کار ہا کمتر کنم

عہد و پیمان فلک را نیست چنداں اعتبار
عہد با پیمانہ بندم شرط با ساغر کنم
بے تو اے سرو روان با گل و گلشن چہ کنم
زلف سنبل چہ کنم عارض سوسن چہ کنم

بیاتا گل بر افشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش بر اندازیم

ابر است ساقیا قدحے پر شراب کن
دور فلک درنگ ندارد شتاب کن
زان بیشتر کہ عالم فانی شود خراب
مارا بہ جام بادۂ گلگوں خراب کن

سرم خوش است و ببانگ بلندمی گویم
کہ من نسیم حیات از پیالہ می جویم

دو یار زیرک و از بادۂ کہن دو منے
فراغتے و کتابے و گوشہ چمنے
بیا کہ رونق ایں کارخانہ کم نہ شود
ز زہد ہمچو توئی یا بہ فسق ہم چو منے

گوئٹے کو مشرق اتنا پسند آیا کہ وہ اس کی بہت سی چیزوں کے لباس، وضع قطع اور عادت میں پیروی کرنے لگا۔ مثلاً اس نے مشرقی زبانوں میں عربی اور فارسی کا مطالعہ شروع کیا اور عربی مخطوطات کی نقل کر کے بہت خوش ہوتا..... وہ عمامہ باندھتا اور عبا پہنتا اور افیم اور حقہ بھی پیتا مگر ان سب باتوں کے باوجود اپنے خیالات اور اپنے کلام میں بالکل جرمن رہتا۔(39)

گوئٹے مشرق و مغرب کی دوستی کا داعی تھا

بہرحال یورپ کی تاریخ میں اس کی شخصیت عجیب و غریب چیزوں کی حامل تھی۔ ازمنۂ وسطیٰ کی تاریکی اور جہالت کے بعد گوئٹے وہ پہلا عظیم مفکر شاعر ہے جس نے مغرب اور مشرق کے درمیان مفاہمت اور دوستی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مشرق و مغرب کی چپقلش جو قدیم زمانے میں یونانیوں اور ایرانیوں کی جنگوں سے شروع ہوئی تھی اور جس کا اثر آج تک باقی ہے، گوئٹے اس چپقلش کو دور کر کے آپس میں دوستی اور موانست کا برتاؤ قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس خیال سے اس نے اپنے ناشر کوٹا (Cotta) کو مئی 1815ء میں ایک خط لکھا، جس کا اقتباس حسب ذیل ہے: "میری رائے ہے کہ مغرب اور مشرق میں، ماضی اور حال میں اور ایرانی اور جرمن میں سنجیدہ طریقہ پر اتحاد پیدا کیا جائے اور دونوں طرف کے رسم و رواج اور غور و فکر کے طریقوں کو سمجھنے کا معاملہ ایک دوسرے پر چھوڑ دیا جائے۔"(40)

گوئٹے کے آخری دور کا مشہور ہم عصر شاعر ہائینے لکھتا ہے کہ "مغربی۔مشرقی دیوان کے مطالعہ سے بعض وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاری کسی ایرانی قالین پر بیٹھا ترکستان کا زرد تمباکو پیچوان سے پی رہا ہے اور پاس ہی ایک سیاہ فام خادمہ کھڑی مور پنکھی جھل رہی ہے اور ایک نوجوان مخا (یمن) کا اصلی قہوہ پیالی میں پیش کر رہا ہے۔ گوئٹے نے ان نظموں میں مستی اور سرخوشی کی فضا پیدا کر دی ہے اور اس کے اشعار اتنے شیریں' دلکش' رواں اور لطیف ہیں کہ تعجب ہوتا ہے کہ جرمن زبان کیسے ان کو ادا کر سکی..... اس مجموعہ نظم کا حسن ناقابل بیان ہے۔ یہ ایک گلدستہ عقیدت ہے جس کو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے اور یہ عجیب و غریب پھولوں سے مزین ہے..... اس دیوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے صحت مند سینہ سے حرارت لے کر اپنے کو دوبارہ بحال کرنا چاہتا ہے"۔(41)

مشرق سے اتنی گرویدگی اور دلدادگی پر اور پھر فطرت کی رنگا رنگی اور وسعت سے گوئٹے کی غیر معمولی شیفتگی پر اعتراضات خود اس کی زندگی میں شروع ہو گئے تھے۔ اس کو Der grosse Heide (عظیم کافر) کا لقب دیا گیا اور آوگسٹ ولیلم شلیگل سے جب نہ رہا گیا تو اس نے طنزیہ انداز میں یہاں تک کہہ دیا کہ "وہ ایک کافر تھا جو مسلمان ہو گیا" (Einen zum Islam bekehrten Heiden)۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں ایک ناقد نے یہ بھی کہا تھا کہ گوئٹے نے مغرب کے مقابلہ میں مشرق کی تعریف میں بہت غلو سے کام لیا ہے۔

گوئٹے اور تصوف

گوئٹے رسمی تصوف کا قائل نہیں تھا۔ رسمی تصوف سے اختلاف کی وجہ شاید اس کے دل میں اپنے زمانے کے نام نہاد عیسائی صوفیوں' راہبوں اور پادریوں کی دو رنگی زندگی کو دیکھ کر پیدا ہوئی ہو' لیکن وہ تصوف کے قاعدے اور اصولوں سے واقف تھا۔ وہ مشہور فلسفی اسپنوزا (1634ء - 1677ء) کا بہت مداح تھا' جو وحدت الوجود کا قائل تھا۔ اسپنوزا کا خیال تھا کہ عالم میں ہستی اور وجود صرف خدا کا ہے اور وہ قطعی طور پر مطلق اور نامحدود ہے۔ تمام

محدود چیزیں جو اس ذات مطلق سے صادر ہوتی ہیں اس میں شامل ہیں' اس میں ظاہر ہوتی ہیں اور پھر اسی میں جذب ہو جاتی ہیں۔ ان اشیا کی ہستی حادث' ناپائیدار' اضافی اور ناگہانی ہے۔ ذات مطلق کے ظہور کا علم نامحدود فکر اور نامحدود وسعت سے ہوتا ہے۔ ہم کو صرف ان دو صفات کا علم ہے' لیکن خدائے مطلق کے صفات شاید اس سے کہیں زیادہ ہیں جن کا ہم کو علم نہیں(42)۔

گوئٹے نے اپنے ایک دوست Jacobi (یعقوبی) کو لکھا کہ بہ حیثیت شاعر کے کئی خداؤں کا ماننے والا ہوں مگر فطرت کے مطالعہ کے اثر سے وحدت الوجود کا قائل ہوں' لیکن جہاں اخلاق کا سوال آتا ہے وہاں میں صرف ایک خدائے واحد کا ماننے والا ہوں۔ (43) اس کے باوجود جیسا میں بتا چکا ہوں' وہ رسمی تصوف کا قائل نہیں تھا اور اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ مشرق میں کلام حافظ کی تشریح تصوف کے اصولوں پر کی جاتی ہے۔ مگر وہ اپنی طبیعت اور اپنا نقطہ فکر بدل نہیں سکتا تھا۔ دراصل بات یہ تھی کہ وہ حواس خمسہ یعنی عقل کے ذریعہ کائنات کی حقیقت کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا اور اس خیال سے اس نے کئی علوم میں یعنی طبیعیات' کیمیا' حیوانیات وغیرہ میں تحقیقات بھی کی' مگر حقیقت اپنی مجرد شکل میں وہاں کہاں مل سکتی ہے کیونکہ حقیقت تو عقل سے بالا تر ہے اور اس کا پتہ چلنا محال ہے۔ خود حافظ نے کہا ہے کہ :

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمارا

لیکن گوئٹے راز دہر کو حکمت و عقل کی کنجی سے کھولنا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ عقل کی رسائی وہاں تک ناممکن ہے کیونکہ عقل زمان و مکاں سے رشتہ بپا ہے اور حقیقت اس سے ماورا ہے۔ گوئٹے کے ہم عصر فلسفی کانٹ نے اس نکتہ کو اپنی مشہور عالم تصنیف "تنقید عقل محض" میں کھول کر بیان کر دیا تھا اور آج دو سو برس کے بعد اہل سائنس کا بھی یہی نظریہ ہے۔ چنانچہ دور حاضرہ کا ایک مشہور سائنس داں سر جیمز جینز اپنی کتاب "طبیعیات اور فلسفہ" میں کہتا ہے کہ "اب یہ بات بالکل کھل کر سامنے آگئی ہے کہ قدرت کا آخری عمل زمان و مکاں کے حدود سے بہت دور واقع ہوتا ہے۔ اس طرح قدرت کا یہ آخری عمل ہماری فہم سے بالا تر ہے۔ ہم کبھی اپنے تصور اور قیاس میں بھی اس کا احاطہ نہیں کر سکتے"۔

(۸۸) اس مقام پر عقل کے پر جلتے ہیں اور خرد کی کارفرمائی مجبوری اور بے بصری میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ بے بصری اور جہل کی یہ منزل عقل و خرد کی تمام سرگردانی اور تگ و دو کے باوجود ظہور میں آتی ہے۔ زمانہ حاضر کے ایک مشہور صوفی شاعر اصغر گونڈوی نے اس نکتہ کو ایک لطیف پیرایہ میں یوں بیان کیا ہے:

مقام عقل کو پایا نہ تم و عرفان نے
میں بے خبر ہوں باندازہ فریب شہود

اسلامی تصوف میں حقیقت کا ادراک اگر ممکن ہو سکتا ہے تو وہ دل یعنی عشق کے ذریعہ ہو سکتا ہے مگر اس کے باوجود یہ وہ نعمت ہے جو عطیہ خداوندی ہے۔ یعنی اس منزل کے ہر مسافر کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ کائنات کے حقیقی علم سے بہرہ ور ہو۔ بس یہاں گوئٹے کا اختلاف حافظ سے ہوا' لیکن اس کے باوجود گوئٹے حافظ کے کلام کے ظاہری معنی کا عاشق تھا کیونکہ یہ چیز اس کے مزاج کے عین مطابق تھی۔ رندی' حسن پرستی' خرقہ سالوس سے بیزاری' عام انسانی محبت' فطرت سے شیفتگی وغیرہ اس کی طبیعت کا لازمی جزبن گئی تھیں اور ممکن ہے کہ اس کے ساتھ کچھ یہ بھی رہا ہو کہ:

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اور اسی لئے وہ حافظ کو اپنے ہی ایسا سمجھتا تھا۔

گوئٹے کے بعد جتنے جرمن شعرا نے گوئٹے کی پیروی میں فارسی شاعری اور حافظ کے کلام سے متاثر ہو کر شاعری کی ہے یا اور مغربی مصنفین نے جنہوں نے حافظ پر لکھا ہے' ان سب کا خیال عام طور پر حافظ کے بارے میں یہی تھا اور ہے کہ حافظ ایک رند بادہ گسار' حسن پرست' دنیا دار' ہوا و ہوس اور عشرت امروز کا شاعر تھا۔ حالانکہ حافظ کے کلام میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن کی مجازی تعبیر نہیں ہو سکتی۔ مثلاً

می کشیم از قدح لالہ شرابے موہوم
چشم بد دور کہ بے مطرب و مے مدہوشیم

مدد ے گر بہ چراغے نہ کند آتش طور

چارۂ تیرہ شب وادی ایمن چہ کنم

شرابے بے خمارم بخش یارب
کہ باوے ہیچ درد سرندارم

خرم دل آنکہ ہمچو حافظ
جامے ز مئے الست گیرد

اس قسم کے اور اشعار بھی نقل کئے جا سکتے ہیں مگر بخوف طوالت ان کو حذف کرتا ہوں۔

اس سلسلہ میں مجھے صرف دو مصنف' ایک فرانسیسی اور ایک جرمن ایسے ملے جنہوں نے حافظ کے تصوف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پہلا فرانسیسی مصنف سلویستر دے ساسی (Silvestre de Sacy) ہے اور دوسرا جرمن کونراڈ بورڈاخ (Konrad Burdach) ہے جس نے 1905ء میں "مغربی۔مشرقی دیوان" کی ایک شرح مشہور ناشر کوٹا (Cotta) کے جوبلی ایڈیشن میں شائع کی۔ اس شرح کے دیباچہ میں اس نے "مغربی۔مشرقی دیوان" کے مذہبی اور صوفیانہ عنصر کا ذکر کیا ہے۔ بورڈاخ کا خیال ہے کہ حافظ کی شاعری میں جام سے مراد شراب ازل' روح کی مستی اور ذات کی نفی ہے۔ اس کا عشق خالص صوفیانہ ہے اور اس کے وجد و مستی کی تشبیہ میں ایک صوفی کا دھڑکتا ہوا دل ہے جو عشق الٰہی میں مبتلا ہے (45)۔ اس طرح کلام حافظ کی صوفیانہ تعبیر پر زور دینے سے شاید بورڈاخ نے "دیوان حافظ" میں اپنے پیش روؤں سے زیادہ گہرے معنی دیکھے ہیں' لیکن کچھ بھی ہو اس نے تنقید کے لئے ایک نیا راستہ کھول دیا۔(46)

لیکن جیسا میں نے ابھی کہا ہے کہ مغرب میں شاعروں' پروفیسروں اور مصنفوں کا عام رجحان حافظ کو محض ہوا و ہوس' بادہ پرستی اور عشرت امروز کا شاعر سمجھنے کا رہا ہے اور ہے۔ (47) اور ساتھ ہی یہ بیہودہ' لغو اور بے بنیاد قصہ بھی لکھا جاتا رہا ہے کہ حافظ کی بادہ پرستی کی بنا پر ان کے مرنے کے بعد ملاؤں نے ان کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے سے

روک دیا۔ جو شخص اپنے زمانے کے علما میں شمار ہوتا تھا اور جو نقشبندیہ سلسلہ میں مرید ہو اور اس کے جنازہ کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کسی طرح بھی ذہن میں نہیں آ سکتا۔

اس ضمن میں ایک جدید جرمن مصنف ہانس بیتھگے (Hans Bethge 1876ء - 1946ء) کی رائے نقل کرتا ہوں۔ انہوں نے 1910ء میں حافظ کے کچھ کلام کا ترجمہ Lieder des Hafis (غزلیات حافظ) کے نام سے شائع کیا۔ کتاب کے آخر میں انہوں نے مختصراً حافظ کی زندگی اور کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "حافظ کے کلام کے بہت سے مشرقی شارحین نے اس میں رمزی یا صوفیانہ معنی پہنانے کی کوشش کی ہے اور اس کے عشق و شراب کو اشاریہ بتایا ہے..... لیکن حافظ کا مقصد دراصل اپنے کلام میں صرف معاصرانہ اور دنیاوی باتوں کا ذکر کرنا ہے.... یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایشیائی ادب سے اس طرز کلام سے مبرا نہیں۔ مثلاً عربی، ہندوستانی اور دوسرے ایشیائی ادب میں درویشوں نے اپنی غزلوں میں دنیاوی چیزوں کا بڑی آب و تاب سے ذکر کیا ہے.... حافظ کے کلام کا لب لباب ہے شراب، عشق، موسم بہار میں رقص و مستی، باغ میں پھولوں کی سیر، دنیاوی مسرت، سادہ دلی کی تعریف اور مایوسی اور نامرادی کی تحقیر و تذلیل، تمام صوفیانہ انداز سے بے اعتمادی اور طریقہ سالوسی سے نفرت، گل سے بلبل کا عشق۔ یہ سب چیزیں فارسی شاعری کی جان ہیں اور حافظ نے ان کو مختلف پیرایہ میں بیان کیا ہے.... حافظ نے زندگی کے مختلف نشیب و فراز دیکھ کر یہ تسلیم کر لیا تھا کہ دنیاوی مسرت ہی زندگی کے معاملات میں آخری ہوشمندی ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری زمانے میں اپنے علم و تجربہ کو بڑی بیباکی سے پیش کیا ہے اور انہی چیزوں نے جرمن شاعری میں جوش و ولولہ پیدا کر دیا۔"(48)

مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں کیا یہ رائے قائم کرنا درست ہو گا کہ حافظ ایک لاابالی، رند مے گسار اور حسن مجازی کا دلدادہ تھا اور دنیاوی مسرت اور عشرت امروز پر اس کا تکیہ تھا جیسا اس نے اپنے کلام میں ظاہر کیا ہے۔ مغرب کے فقیہوں کا فتویٰ تو یہی کہتا ہے، لیکن ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ فقیہان مغرب نے کہاں ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے ہم مولانا اسلم جیراجپوری کی رائے نقل کریں گے جنہوں نے حافظ پر پہلی تحقیقی کتاب اردو میں تصنیف کی۔ ان کا بیان ہے کہ حافظ ایک عالم اور صوفی منش بزرگ تھے۔ اپنے زمانے کے علوم یعنی قرآن، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ، ادب اور شاعری پر ان کو عبور حاصل

تھا۔ وہ خواجہ بہاء الدین نقشبندی کے مرید تھے اور تمام عمر زہد و تقویٰ میں گزار دی۔ ان کا تعلق عمر بھر ایک دینی مدرسہ سے تھا جس میں وہ علوم متداولہ کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ اپنے زمانے کے اہل کمال میں شمار ہوتے تھے اور اپنے ہی زمانے میں ان کو شہرت حاصل ہو گئی تھی اور وہ بادشاہوں اور امرا کے دربار میں اکثر مدعو کئے جاتے تھے۔ ان کے کلام سے ان کی زندگی پر رائے قائم کرنا یا ان کے کلام کی روشنی میں ان کی زندگی کے "واقعات" کو تلاش کرنا سراسر نادانی ہو گی۔(49)

اس سلسلہ میں دور حاضرہ کے ایک مشہور ایرانی دانشور پروفیسر علی اصغر حکمت نے دو روایتیں بیان کی ہیں مگر کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی۔ اول یہ کہ حافظ شیخ محمود عطار کے مرید تھے۔ دوسری روایت میں انہوں نے سید اشرف الدین جہانگیر سمنانی (ان کا مزار قصبہ کچھوچھہ، ضلع فیض آباد (ہندوستان) میں ہے) کی تصنیف "لطائف اشرفی" کے حوالے سے لکھا ہے کہ حافظ سلسلہ اویسیہ میں شیخ قوام الدین عبداللہ کے مرید تھے۔(50) میرا خیال ہے کہ حافظ اسلم جیراجپوری کی رائے زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ سلسلہ نقشبندیہ اس زمانے میں خاصا مقبول تھا۔ لیکن کچھ بھی ہو اس سے اتنا تو ظاہر ہوتا ہے کہ حافظ کسی نہ کسی سلسلے میں مرید تھے اور رندی اور بادہ گساری کی روایت جو مغربی مصنفین ان سے منسوب کرتے ہیں درست نہیں۔

اب رہا حافظ کی شاعری سے ان کی زندگی پر رائے قائم کرنے کا مسئلہ تو یہ وہ نازک مقام ہے جہاں مغربی مصنفین عام طور پر ٹھوکریں کھاتے رہے ہیں۔ دراصل عشق حقیقی کو عشق مجازی کے پیرایہ میں بیان کرنے کا طریقہ فارسی شاعری میں ایسا پیوست ہو گیا ہے کہ اکثر لوگ خاص کر مغربی مصنفین اصل اور نقل میں تمیز نہیں کر پاتے۔ سعدی نے پہلے پہل تصوف اور درویشی کے مضامین عشق مجازی کے رنگ میں پیش کرنا شروع کئے اور جب انہوں نے خال و خط، لب و دنداں، زلف و رخ، بادہ و ساغر، بہار و خزاں، امروز و فردا وغیرہ کے مجازی معنی میں عشق حقیقی کا ذکر کیا تو اس کا اثر بہت بڑھ گیا۔ (51) کیونکہ حقیقت کو مجرد طریقہ پر سمجھنا اور سمجھانا مشکل تھا۔ بقول غالب:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

پھر فارسی کے ایک قصیدہ میں غالب نے کہا ہے:

للہ الحمد کہ در ساغر ما ریختہ اند
مے بیرنگ ز میخانہ بے نام و نشاں

ایک شعر حضرت امیر خسرو کا بھی سن لیجئے۔

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے می کنم، با خلق مارا کار نیست

اگر ظاہری معنی لئے جائیں تو غالب کے فارسی شعر میں "مئے بے رنگ" اور "میخانہ بے نام و نشاں" کے کچھ معنی نہیں ہوتے اور حضرت امیر خسرو بت پرست ٹھہرتے ہیں حالانکہ وہ بڑے مشہور بزرگ گزرے ہیں اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرید اور خلیفہ تھے، لیکن کیا کیا جائے کہ اسی طرح واردات قلبی اور حقائق واقعیہ کا ذکر مجاری پیرایہ میں ہوتا ہے۔ اقبال نے بالکل کہا ہے:

برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی ست
حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

مغرب اور فارسی زبان

کوئی ڈیڑھ دو سو سال سے مغرب میں فارسی شاعری اور فارسی زبان کا مطالعہ ہو رہا ہے اور مغرب نے اس کو اب تک مجازی یا ظاہری معنوں میں سمجھا ہے۔ بہت کیا تو لکھ دیا کہ فلاں شاعر کو مے و نغمہ، شراب و ساغر، فراق و وصال کی شاعری کے باوجود مشرقی مصنفین صوفی شاعر کہتے ہیں اور بس۔ بات دراصل یہ ہے کہ فارسی تشبیہیں اور استعارے اس قسم کے ہیں کہ مغربی مصنفین ان کے اصلی معنی سمجھنے میں دھوکا کھاتے رہے ہیں۔ اب دو سو سال کی تگ و دو کے بعد اس منزل کی مشکلات کا ان کو تھوڑا بہت اندازہ ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم تین مغربی مصنفین کی رائے نقل کریں گے۔

پہلے پروفیسر اے۔ جے۔ آربیری کی رائے دیکھئے۔ یہ جامعہ کیمبرج میں چند سال قبل فارسی کے پروفیسر تھے اور اب فوت ہو چکے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ "اب فارسی کی صوفیانہ

شاعری میں تشبیہ کے اجاگر کرنے کی صلاحیت کا جائزہ لینا ضروری ہے کیونکہ ایک طرف تو اس کی خصوصیت فارسی کی مذہبی روح کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے لیکن دوسری طرف اس کی قدر و قیمت کا اپنے اصلی معنوں میں پتہ لگانا بہت مشکل ہے۔ تشبیہ و استعارہ وہ چیز ہے جس کو آج کل کے زمانے میں انسان صرف خوابوں میں استعمال کرتا ہے لیکن جب ایران کے عظیم صوفی شعرا اپنا کلام پیش کر رہے تھے تو تشبیہ و استعارہ قدیم زمانے کی طرح اپنے پورے آب و تاب پر تھا۔ مثلاً حافظ کی خاک دیار کی تشبیہ نہ صرف اپنے تمدن کی ایک رسمی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے بلکہ اس کی نشاندہی ہزاروں برس پہلے بھی کی جا سکتی ہے۔"(52)

اب ایک جرمن مصنفہ آنے ماری شمل (Annemarie Schimmel) کی رائے دیکھئے۔ موصوفہ کو عربی' فارسی' ترکی اور اردو کا خاصا ذوق ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ "ترکی شاعری کی طرح اردو شاعری کو فارسی سے مختلف المعنی الفاظ کا استعمال ورثہ میں ملا ہے اور یہ استعمال شاعری کے عربی' فارسی اور ہندوستانی عناصر کے ساتھ اگر چابکدستی سے کیا جائے تو ایک لاثانی دلفریبی ظہور میں آتی ہے اور ان عناصر کے نہ صرف سادہ معنی ہوتے ہیں بلکہ اس کے علاوہ ان میں گوناگوں اضافی اور اصطلاحی معنی بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے شاعری کا وہ عجیب طرز اظہار نمودار ہوتا ہے جو حقیقی اور مجازی یا نفسانی اور روحانی معنوں کے درمیان حرکت کرتا ہے اور یہ چیز قدیم اسلامی شاعری میں خاص طور پر نظر آتی ہے۔ اسلامی تصوف کا ارتقا خاص کر ایران میں اور فارسی شاعری پر اس کے اثر کا ذکر کئی مصنفوں نے کیا ہے اور جس نے بھی حافظ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ وہ نمایاں اور روشن ایہام اور ذو معنویت (glittering ambiguity) ہے جو اس کلام کو اتنا دلفریب' پیچیدہ اور بعض صورتوں میں ناقابل ترجمہ بنا دیتی ہے..... کس کو علم ہے کہ شاعری میں شراب کا بیان اصلی شراب کا ہے یا اس سے مراد شراب عشق ہے۔ اسی طرح جب ایک کمسن لڑکے کا ذکر بطور محبوب ہوتا ہے جو ریشمی کلاہ اپنے سر پر رکھے اور اپنے گیسوؤں کو اپنے چاند ایسے چہرے کی دونوں طرف لٹکائے ہوئے ہے' تو کون بتا سکتا ہے کہ یہ بیان واقعی ایک حسین لڑکے کا ہے یا اس سے مراد شاہد حقیقی ہے جس کا حسن ہر چیز سے بالا تر ہے اور جس کا اظہار صرف انسانی صفات میں ممکن ہے"۔(53)

تیسری رائے میں چیکوسلوواکیہ کے ایرانیات کے مشہور دانشور پروفیسر یان روپکا (Jan Rypka) کی پیش کرتا ہوں۔ پروفیسر موصوف نے اپنی تمام عمر ایرانی تاریخ و ادبیات کی تحقیق میں گزار دی۔ ان کی ضخیم تاریخ ادبیات ایران تحقیق کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ انہوں نے تصوف کی مجازی اصطلاحات یعنی عشق، شراب اور حسن کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ان کی حقیقی تعبیر بھی ہے جو ایران کی صوفیانہ اور عشقیہ شاعری میں سرایت کر گئی ہے اور اگر کسی کو ان کے اصلی معنوں کا علم نہیں ہے تو وہ مغالطہ میں پڑ جائے گا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شاعر کی ہستی اپنے کلام کے پیچھے چھپ جاتی ہے لیکن اس کے باوجود مغرب حافظ کے کلام کی صوفیانہ تعبیر کا منکر ہے۔(54)

جب صورت حال یہ ہے کہ آج بھی مغرب میں فارسی شاعری کو پوری طرح سمجھنے میں دشواریاں پیش آ رہی ہیں تو گوئٹے کے زمانے میں تو فارسی کا مطالعہ اپنے ابتدائی دور میں تھا۔ اس لئے گوئٹے حافظ کے ظاہری اور سطحی معنی کو اپنی افتاد طبیعت کے مطابق سمجھ کر اس سے متاثر ہوا۔ ہم اس لئے گوئٹے کو معذور سمجھتے ہیں کہ وہ حافظ کو کُلّی طور پر پہچان نہ سکا۔

مشرق کا اثر جرمن ادب پر

اب آیئے ذرا جرمن ادب میں جو مغربی ادب کا ایک اہم حصہ ہے، مشرقی تحریک یا مشرقی اثر کا تھوڑا بہت جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اس کا اثر کہاں تک پہنچا۔ فاضل مصنف پروفیسر رے می کا خیال ہے کہ "مشرقی تحریک سے جرمنی میں جو شاعری پیدا ہوئی ہم اس کی بہت قدر و قیمت کے زیادہ قائل نہیں ہیں۔ ہمارے خیال میں دراصل اس نے کوئی عظیم شاعری نہیں پیدا کی۔" اس کے بعد پروفیسر موصوف نے بعض جرمن شعرا کے کلام کا جنہوں نے مشرقی تحریک سے متاثر ہو کر شاعری کی ہے، جائزہ لے کر یہ کہا ہے کہ "جرمن شاعری میں مشرقی تحریک نے جرمن ادب میں کوئی خاص اضافہ نہیں کیا بلکہ اس کی قدر و قیمت ان ترجموں اور اصل کی پیروی میں پنہاں ہے جو اس تحریک سے متاثر ہو کر کی گئیں، کیونکہ ان ترجموں سے اور مشرقی ادب کی پیروی سے مشرقی فکر کا خزانہ نہ صرف جرمنی بلکہ یورپ کے ادبی ورثے میں داخل ہو گیا۔ لیکن جہاں تک خود جرمن ادب کا تعلق ہے، یہ تحریک بہت

بڑی اہمیت کی حامل تھی کیونکہ اس نے مشرقی اثر کو جرمن ادب میں داخل کیا اور اس طرح جرمن ادب میں عالمگیریت کی روح پیدا ہوئی۔"

پروفیسر موصوف کی رائے میں مشرقی تحریک نے جرمن ادب میں کوئی خاص اضافہ نہیں کیا اور نہ اس سے کوئی عظیم شاعری پیدا ہوئی۔ اس کی قدر و قیمت دراصل مشرقی ادب و فلسفہ کے ترجموں میں پنہاں ہے کیونکہ جرمن زبان میں اس سے عالمگیریت پیدا ہو گئی۔ میں پروفیسر رے می کی رائے سے کلی طور پر متفق نہیں ہوں۔ آئندہ صفحات میں اس کی تشریح کروں گا۔

اس سے ملتا جلتا خیال پروفیسر گب (Gibb) کا ہے۔ پروفیسر گب انگلستان اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں اسلامیات کے پروفیسر رہ چکے ہیں اور دو سال ہوئے وفات پا گئے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "گوئٹے مشرقی شاعری کی نقالی پر مطمئن نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس نے فارسی شاعری کے فنی اسلوب اور فکری عنصر کو یورپ کی رومانی اور ازمنہ وسطی کی روایات سے ملا کر اپنے مطالب کے اظہار کے لئے نئے محاورے اور معنی پیدا کئے..... ایک زمانے تک ایران اور ہندوستان کا سکہ چلتا رہا اور ہائینے بھی اس پر طنز کرنے کے باوجود مشرقی اثر سے علیحدہ نہیں ہو سکا۔ لیکن یہ اثر بالکل ناکام ہو گیا کیونکہ اس کا ناکام ہونا یقینی تھا۔ یہ ایک ایسا پودا تھا جو مغرب کی سرد ہوا برداشت نہیں کر سکتا تھا اور بغیر پیوند کے مغرب کی سرزمین میں پروان نہیں چڑھ سکتا تھا۔ اس رائے میں کافی حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ جوں جوں شاعر (گوئٹے) مشرقی خیالات سے متاثر ہوتا گیا' اتنی ہی اس کی تصنیف ادبی حیثیت سے کم مایہ ہوتی گئی۔ گوئٹے کی عبقریت نے جبلی طور پر حافظ کے ان تمام عناصر سے انکار کیا جو اس کی طبیعت کے مطابق نہیں تھے۔ اس لئے اس کی تمام اعلیٰ تصنیفات کے بعد دیوان کا درجہ آتا ہے۔(55) (Below the best)

اس سلسلے میں اب ہم دو جرمن مصنفین کی رائے نقل کرتے ہیں۔ پروفیسر فان گوٹ شال کا خیال ہے کہ "گوئٹے نے جب اپنے "مغربی۔مشرقی دیوان" کا تاج اپنے سر پر رکھا تو ہمارے ادب میں مشرقی غزل کا داخلہ بڑے زور شور سے ہوا۔ ہماری یہ غزلیں ایک حد تک مشرقی نمونہ پر لکھی گئیں اور پھر ہماری غزلوں نے مشرقی ادب میں عالم کے بارے میں جو سکون پذیر خیالات اور عملی زندگی کے متعلق جو حکیمانہ اقوال تھے' ان سے بھی استفادہ کیا۔"(56)

پروفیسر ارنسٹ بو آئیٹلر' سابق ڈائریکٹر گوئٹے ہاؤس میوزیم' فرانک فورٹ' کا خیال ہے کہ "گوئٹے کا مغربی۔مشرقی دیوان سکون خاطر' دانشمندی' عشق اور ایمان کی ایک عظیم تصنیف ہے۔ "فاؤسٹ" کے بعد یہ سب سے اہم تصنیف ہے اور بیک وقت یہ شاعر کے ذاتی رجحان کو ظاہر کرتی ہے۔"(57) جرمن ادب میں مشرقی تحریک گوئٹے کے مغربی۔مشرقی دیوان سے شروع ہوئی اور اس کا اثر یہاں تک پہنچا کہ بیسیوں جرمن شعرا نے گوئٹے کی پیروی میں حافظ اور دوسرے ایرانی شعرا کے رنگ میں شعر کہنا شروع کر دیا۔ یہ تحریک انیسویں صدی کے آخر تک قائم رہی اور اس کے بعد زمانے کے بدلتے ہوئے مذاق سے سرد پڑ گئی۔ ادبی تحریکوں کا خاصہ ہے کہ وہ ایک زمانے تک چلتی ہیں اور مقبول ہوتی ہیں اور پھر زمانے کے بدلتے ہوئے مذاق کے مطابق سرد ہو کر تاریخ کے پردے میں چھپ جاتی ہیں' مگر اپنا کچھ نہ کچھ اثر چھوڑ جاتی ہیں۔ ذرا انگریزی ادب کو دیکھئے۔ وہاں بھی یہی قصہ نظر آئے گا۔ ایک زمانہ تھا کہ انگریزی شاعری پر کلاسیکی رنگ چھایا ہوا تھا۔ پھر رومانی دور آیا اور وہ بھی اپنا رنگ جماکر غائب ہو گیا مگر کچھ نہ کچھ اپنا اثر چھوڑ گیا۔ لیکن رومانی تحریک کے بارے میں کوئی ناقد یہ نہیں کہتا کہ وہ مغرب کے سرد موسم میں نہیں پنپ سکتی تھی' اس لئے ناکام ہو گئی۔ پھر مشرقی تحریک کے بارے میں اس قسم کی رائے کہاں تک ادبی انصاف کے تقاضے کو پورا کرتی ہے؟ یہ کیا کم ہے کہ مشرقی تحریک کا دور جرمن ادب میں کوئی اسی (80) برس تک قائم رہا اور اس نے جو اثرات چھوڑے ہیں' ان سے جرمن ادب خاصا مالا مال ہو گیا اور ان سے جرمن مصنفین آج بھی استفادہ کرتے ہیں۔ گوئٹے نے جو نئے محاورے ترتیب دیئے' آج بھی وہ مقبول ہیں اور لوگ ان کی ابتدا جانے بغیر ان کو استعمال کرتے ہیں۔

فاؤسٹ گوئٹے کا شاہکار بتایا جاتا ہے مگر یہ ڈراما ہے شاعری کا حصہ نہیں ہے' گو کہ مکالمہ اور بیان میں کہیں کہیں شعر داخل ہو گیا ہے۔ اگر "مغربی۔مشرقی دیوان" کا درجہ "فاؤسٹ" کے بعد آتا ہے تو پھر یہ تصنیف گوئٹے کے شاعرانہ کمال کو بدرجہ اتم ظاہر کرتی ہے۔ اس میں جوش اور ولولہ کے ساتھ حسن و عشق کی داستان ہے' فراق و وصال کا ذکر ہے' ساقی کی نیم نگاہی اور کسی پری وش کی زلف گرہ گیر کا بیان ہے اور ان سب میں تخیل و تفکر کی شان ہے۔ پھر ان چیزوں کا کسی ملک کی گرمی یا سردی سے کیا تعلق؟ یہ چیزیں تو

عالمگیر حیثیت کی ہیں اور ہر ملک کی شاعری میں پائی جاتی ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ مشرقی تحریک سے صرف ترجمہ کا کام آگے بڑھا اور جرمن ادب پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا' تو یہ خیال ادبی دیانت و انصاف کے بالکل خلاف ہے اور یہاں میرے خیال میں جان بوجھ کر چشم پوشی کی گئی ہے۔ عام طور پر ایک زبان جاننے والوں کا اثر دوسری زبان جاننے والوں پر ترجمہ ہی کے ذریعہ پڑتا ہے۔ ایک ملک دوسرے ملک کے ادبی خزانوں سے ترجمہ ہی کے ذریعہ واقف ہوتا ہے اور پھر یہ ترجمہ اس تصنیف پر اثر ڈالتا ہے۔ مثال کے طور پر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (T. S. Elliot) کی رائے پیش کرتا ہوں۔ ایلیٹ انگلستان کا مشہور ادیب' شاعر اور نوبل انعام یافتہ ہے۔ اسے فوت ہوئے تھوڑا زمانہ گزرا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "ایشیا کے ادب میں چوٹی کی شاعری ملتی ہے۔ اس میں حکمت کی گہرائی اور مابعدالطبیعیات کے اشکال بھی ہیں..... میں عربی' فارسی اور چینی زبانوں سے ناواقف ہوں۔ البتہ مدت ہوئی' میں نے ہندوستان کی قدیم زبان کا مطالعہ کیا تھا اور چونکہ میں اس وقت فلسفہ میں دلچسپی رکھتا تھا' میں نے تھوڑا بہت ہندوستان کی شاعری کا بھی مطالعہ کیا اور میں جانتا ہوں کہ میری شاعری پر قدیم ہندوستان کی فکر اور احساس کا اثر ہے..... اور مغربی شعرا پر مشرقی ادب کا اثر عام طور پر ترجموں ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔"(58) اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ملک کے ادب کا اثر دوسرے ملک کے ادب پر ترجموں ہی کے ذریعہ پڑتا ہے اور اس سے انکار کرنا ادبی دیانت کے خلاف ہے۔ سعدی اور حافظ اور دوسرے مشرقی شعرا کے ترجموں نے اسی طرح انیسویں صدی کے جرمن ادب پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ اگر فلسفہ کے میدان میں دیکھا جائے تو شوپن ہاؤایر اور آلڈوس ہکسلے کا فلسفہ بڑی حد تک قدیم ہندو فلسفہ کے ترجمہ ہی کا رہین منت ہے۔

جن لوگوں نے مغربی ادب پر مشرقی ادب کے اثر کو کم درجہ بتانے یا اس اثر کو ختم کرنے اور اس کے باقیات کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی ہے' ان کا نقطہ نظر ادبی نہیں بلکہ مذہبی تعصب اور سیاسی تنگ دلی پر مبنی ہے۔ مذہبی تعصب کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا کہ یہ مختلف ماحول میں مختلف لبادہ اوڑھ کر سامنے آتا ہے۔ کبھی فلسفیانہ' تاریخی اور ادبی تنقید کے رنگ میں ظاہر ہوتا ہے' کبھی نسل و رنگ' تہذیب و ثقافت کے پردے میں اور کبھی انسانی برادری کا نام لے کر اور حد تو یہ ہے کہ مذہبی رواداری کا سوانگ بھر کر

بھی سامنے آتا ہے۔ پہلی چیز جو ناقدوں کو بری لگی وہ یہ تھی کہ جرمنی کا چوٹی کا شاعر اور اسلام سے گرویدگی کا اظہار کرے۔ یہ بات یورپ کے وقار کے بالکل خلاف ہے اور پھر وہ ایک جگہ اللہ کو اپنا خدا مانتا ہے۔(59)

in dem wort Allah, das aber wahrlich fuer Goethes Gott steht

یہ چیزیں عیسائی مذہب کے تمدنی شان و شوکت کی ضد ہیں۔

دوسری وجہ اس تنقید کی یہ ہے کہ جس وقت گوئٹے مشرق سے متاثر ہوا' اس وقت سلطنت عثمانیہ عراق سے لے کر تیونس تک پھیلی ہوئی تھی۔ بلقان کا ایک بڑا حصہ اس کے زیر نگیں تھا۔ ایران کی الگ مملکت تھی جو قفقاز کے شمالی حدود کو چھوتی تھی۔ ہندوستان میں ابھی مغلوں کا بھرم باقی تھا' لیکن اس کے سو (100) برس کے اندر مغربی استعمار کا وہ طوفان اٹھا کہ مشرق کی تہذیب' ثقافت' معیشت غرض ہر چیز ملیامیٹ ہو گئی اور اس کا وقار خاک میں مل گیا۔ نظامی گنجوی نے سکندر مقدونی کے حملہ کے بعد ایران کی تباہی کا جو ناگفتہ بہ حال لکھا ہے کہ :

بہار فریدون و گلزار جم
بباد خزاں گشتہ تاراج غم
نسب نامہ دولت کیقباد
ورق برورق ہر سوئے بردباد

تو مشرق کا حال اس سے بدتر ہوا۔ تعلیم گاہوں میں خاک اڑنے لگی۔ طالب علم اور استاد کا ساتھ چھوٹ گیا۔ کتب خانے لٹ گئے اور علوم و فنون کی بے مثال کتابیں غیر ملکوں کی زینت بن گئیں۔ معاشی زندگی میں وہ بحران آیا کہ اچھے کھاتے پیتے لوگ نان شبینہ کے محتاج ہو گئے۔ صنعتیں تباہ کر دی گئیں۔ علم کی قدر اٹھ گئی۔ غرض جما جمایا معاشرہ بکھر گیا۔ یہاں لینے کے دینے پڑ رہے تھے اور ہر شخص ایک نئے عذاب میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس حالت میں مشرق میں کون تھا جو علمی قدروں کی باتیں کرتا یا علمی معاملات کا سوال اٹھاتا۔ پھر جو لوگ مغرب میں استعمار کے دست راست تھے' وہ بھلا کس طرح مشرق کے کم سے کم ادبی وقار کو سر سبز ہوتے دیکھ سکتے تھے۔ جرمنی انیسویں صدی کے آخر میں صرف ایک مختصر مدت کے علاوہ کبھی استعمار پرست نہیں رہا۔ اس لئے اس میں ادبی انصاف کے تقاضے باقی

ہیں اور یہ چیز آج کے جرمن مصنفین میں بھی باقی ہے کہ وہ ادب کا بہ حیثیت ادب کے جائزہ لیتے ہیں۔

گوئٹے کا فلسفہ

گوئٹے کوئی رسمی فلسفی نہیں تھا بلکہ وہ اصلاً شاعر تھا۔ مگر وہ فلسفیانہ دماغ رکھتا تھا اور کائنات کے مختلف مظاہر پر غور کرتا اور ان کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا۔ اس لحاظ سے وہ سائنس دان بھی تھا۔ اقبال نے کہا ہے کہ "گوئٹے سے مجھے اشیا کی حقیقت معلوم ہوئی۔" اور پھر آگے چل کر کہا کہ "اگر تم انسانی دماغ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہو تو تم ونٹ (Wundt)' وارڈ (Ward)' جیمس (James)' یا اسٹوٹ (Stout) کی تصنیفات کا مطالعہ کرو لیکن اگر تم فطرت انسانی کی تہ تک پہنچنا چاہتے ہو تو یہ علم تمہیں گوئٹے سے مل سکتا ہے۔"(60) اسی خیال کو انہوں نے "پیام مشرق" کی ایک غزل کے شعر میں یوں ادا کیا ہے:

صبا بہ گلشن ویمر سلام ما برساں
کہ چشم نکتہ وراں خاک آں دیار افروخت

لیکن گوئٹے کا کوئی مربوط نظام فکر نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاً وہ شاعر تھا اور زندگی اور کائنات کے مسائل کو شاعرانہ تخیل کی روشنی میں دیکھتا تھا' مگر مظاہر قدرت کو سمجھنے کے لئے وہ سائنس کا ذریعہ اختیار کرتا اور اس کے لئے وہ حواس خمسہ سے باہر جانے کو تیار نہیں تھا۔ یہ بھی ایک وجہ اس کے تصوف کے عقیدہ کو نہ ماننے کی ہے' لیکن اس کی فکر میں ایک منطقی نظام کے فقدان کی وجہ اور بھی ہے۔ یعنی اب تک جتنے چوٹی کے فلسفی افلاطون سے لے کر گوئٹے کے دور تک گزرے ہیں' ان کی ایک بڑی تعداد ریاضی سے واقف تھی۔ جس طرح دو اور دو چار ہوتے ہیں' اسی طرح یہ لوگ ریاضی کے اثر سے اپنے فلسفیانہ خیالات کی چول سے چول بٹھاتے ہیں' لیکن کانٹ نے اپنی فلسفیانہ تحریروں میں ریاضی کا دامن چھوڑ دیا اور اسی طرح گوئٹے کو ریاضی سے سخت چڑ تھی۔ وہ ریاضیات کے گورکھ دھندے سے بہت گھبراتا تھا۔ اس لئے اس نے اپنی فکر کا کوئی مربوط نظام مرتب نہیں کیا' مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کی فکر سطحی تھی۔ اس کے برخلاف اس کی فکر کی گہرائی

یہاں تک پہنچی کہ اس نے فطرت انسانی کے بہت سے رازوں سے پردہ اٹھا دیا۔ مثلاً اس نے اپنے ایک دوست کو 1806ء میں ایک خط لکھا کہ "اشیا کے بارے میں لوگوں کے علم کا سلسلہ ان کی ذات سے وابستہ ہوتا ہے۔ یہ ہم لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ یقین کا انحصار کسی چیز کو ہمارے صحیح سمجھنے پر نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق ہمارے ارادہ سے ہوتا ہے۔ کوئی شخص کسی چیز کو اس وقت تک نہیں سمجھتا' جب تک یہ اس کے حسب حال نہ ہو اور وہ اس کو تسلیم کر لینے کے لئے تیار نہ ہو۔ تعصب علم و عمل دونوں میں فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے۔ کسی چیز کا تسلیم کرنا یا اس سے انکار کرنا ہماری طبیعت پر منحصر ہے۔"(61) اسی طرح اس کا خیال تھا کہ فلسفی جب اپنے موقف کی حمایت میں منطقی دلائل پیش کرتے ہیں' تو دراصل وہ ان کے اپنے عقائد کے عکس ہوتے ہیں اور فلسفی بھی اس بات کو مانتے ہیں جس کو وہ ماننا چاہتے ہیں۔

دور حاضرہ کے ایک مشہور انگریز مصنف آلڈوس ہکسلے نے عقل کی علمی حیثیت کی یوں تعریف کی ہے' جس سے گوئٹے کی تائید ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "حقائق اور اشیا کو سمجھنے کے لئے بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے جو کسی مفاد سے وابستہ نہ ہو۔ لیکن عقلی تنقید بھی اس بھول بھلیاں سے نکلنے میں کسی حد تک مدد دے سکتی ہے۔ مگر عقل کو استعمال کرنے کا طریقہ ارادہ پر منحصر ہوتا ہے۔ جہاں ارادہ کسی طرح کی مفاد پرستی میں الجھا ہوا ہو' وہاں عقل کے (غیر انسانی علوم کے علاوہ مثلاً سائنس' خالص ریاضیات اور ٹیکنالوجی کے میدان میں) جذبات' تعصب اور مفاد کو استدلالی رنگ میں پیش کرنے کا ایک آلہ کار بن جانے کا قوی احتمال ہے۔"(62) یہ خیال فطرت انسانی کی کتنی گہرائی تک پہنچتا ہے۔ جدید تاریخ و مذہب کا مغربی رجحان گوئٹے کے اسی قول کی حقیقی ترجمانی کرتا ہے۔

گوئٹے کا خیال تھا کہ کائنات کے تمام مظاہر میں زندگی رواں دواں ہے' یہاں تک کہ وہ شجر و حجر میں بھی زندگی کے آثار کا قائل تھا۔ اس کے تصور میں مظاہر کائنات میں خدا اور خدا میں کائنات موجود ہے یعنی خدا اور کائنات لازم و ملزوم ہیں۔ وہ کائنات میں ہر لحظہ تغیر کا قائل تھا اور وہ مظاہر فطرت میں زندگی کی برابر بدلتی ہوئی شکل کے اصول اور قاعدے کا متمنی تھا۔ یعنی وہ زندگی کو حرکت کی حالت میں سمجھنا چاہتا تھا' اسی لئے اس نے اپنے انداز فکر کا نام Werden (تغیر) رکھا تھا۔ وہ اپنی ایک نظم میں اس تغیر کا مطلب یوں بیان کرتا

ہے:

قدرت ہمیشہ نئی صورت تخلیق کرتی ہے
جو آج ہے وہ پہلے کبھی نہیں تھا
اور جو پہلے تھا وہ دوبارہ ظہور پذیر نہیں ہو گا
ہر شے نئی ہے اور اس کے باوجود وہ پرانی بھی ہے

یوں تو اس کے فکر کے بے شمار گوشے ہیں مگر میں نہایت اختصار کے ساتھ اس کے فلسفہ کے چار بنیادی اصول بیان کروں گا۔

اول - اصول تشکیل اشیا۔ یعنی قدرت کا ایک قاعدہ ہے جس کی رو سے کائنات میں اور اشیا کی شکل و صورت میں ہر لحظہ تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ کوئی چیز اپنی ایک حالت پر قائم نہیں رہتی' بلکہ صرف تغیر کو ثبات ہے۔

دوم - زندگی ایک جدوجہد' ایک کشاکش ہے' ایک میدان جنگ ہے جہاں تضاد ہی تضاد ہے اور جہاں ہر شے دوسری شے سے باہم دست و گریبان ہے اور جب ایک کشاکش سے زندگی فارغ ہوتی ہے تو فوراً دوسری کشاکش شروع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ہر کشاکش کے بعد زندگی اپنی شکل و صورت بدلتی رہتی ہے اور جو صورت تبدیلی کے بعد پیدا ہوتی ہے' وہ پہلی صورت سے بہتر ہوتی ہے۔ اسی کو مولانا جلال الدین رومی نے مثنوی میں بڑی شرح و بسط سے بیان کیا ہے اور یہی فلسفہ مشہور جرمن فلسفی ہیگل (Hegel) کا بھی ہے۔ پروفیسر گے اورگ لوکاچ (Georg Lukacs) نے اپنی تصنیف Goethe und seine Zeit (گوئٹے اور اس کا عہد۔ مطبوعہ 1947ء) میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ہیگل کے فلسفہ ترتیب تضاد (Dialectics) کی ترکیب اور تشکیل میں گوئٹے کا بھی حصہ ہے۔(63) ہیگل کا یہ فلسفہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے شروع تک تمام مغربی دنیا میں بہت مقبول تھا۔

گوئٹے کے یہاں اس فلسفہ ترتیب تضاد کا تصور گلستان سعدی کے دیباچہ سے ہوا۔ سعدی نے نفس کی آمد و شد اور زیر و بم سے زندگی کو رواں دواں رکھنے کے لئے خدا کا شکر ضروری قرار دیا۔ اس سے گوئٹے کو اپنے خیال میں تقویت ہوئی کہ تضاد و تخالف زندگی کو متحرک رکھنے کا ذریعہ ہے۔(64) اس سلسلہ میں پروفیسر بو آیٹلر کا خیال ہے کہ سعدی کے

بیان کے مطابق ہم سانس کی آمد و شد سے زندہ ہیں اور اس لئے ہم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے مگر اس آمد و شد میں ایک طرح کا تضاد ہے' لیکن یہی نظام نفس گوئٹے کے یہاں ایک اصول بن جاتا ہے۔ یعنی "ہر ہستی کو تضاد کے قانون سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔"(65)

dass egliches Sein aus dem Gesetz der Polaritaet besteht.

سعدی کو بہت سے لوگوں نے پڑھا ہو گا مگر اس سے ایک فلسفیانہ نکتہ پیدا کرنے کا سہرا گوئٹے کے سر ہے۔ گوئٹے نے جب زندگی کے اس تضاد پر غور کرنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ رنج کے ساتھ خوشی' عشق کے ساتھ رقابت' امن کے ساتھ جنگ' زندگی کے ساتھ موت' مرد کے ساتھ عورت' خواب کے ساتھ بیداری' گرمی کے ساتھ سردی' روشنی کے ساتھ تاریکی' دن کے ساتھ رات' دریا کے ساتھ اتار چڑھاؤ اور خشکی یعنی کائنات میں تضاد یا دوئی کا سلسلہ ملا ہوا ہے اور یہ سلسلہ طبیعات' حیوانات اور نباتات میں کارفرما ہے۔(66) اسی قانون تضاد اور مستقل کشمکش سے زندگی آگے بڑھتی ہے۔ اس تمام عمل کو گوئٹے Polaritaet und Steigerung (تضاد اور ترقی) کے فقرہ سے ادا کرتا ہے۔ ڈارون کے تنازع للبقا کے اصولوں کی بنیاد یہاں پڑتی ہے۔ ان تمام چیزوں کا غور سے جائزہ لینے کے بعد یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ہیگل کے فلسفہ ترتیب تضاد کی تشکیل میں گلستان سعدی کا بالواسطہ ایک اہم حصہ ہے۔

سوم - گوئٹے کا خیال ہے کہ ایک غیر مرئی اور فوق العادت طاقت بعض انسانوں میں ایسی ہوتی ہے' جو ان کو برابر عمل کی تحریک کرتی رہتی ہے اور زندگی کی رفتار تیز سے تیز تر کر دیتی ہے اور ان کو بڑے بڑے کاموں کو انجام دینے کے لئے ابھارتی ہے۔ اگر اس میں کامیابی ہو گئی تو وہ عالمگیر شہرت کے مالک بن جاتے ہیں اور اگر نامکمل ہوئی تو تباہی کے غار میں گر کر فنا ہو جاتے ہیں۔ بہرحال وہ کبھی نچلے نہیں بیٹھتے۔ حرکت گویا ان کی زندگی کا لازوال جز بن جاتی ہے۔ دنیا کی عظیم شخصیتوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گوئٹے کا یہ خیال صحیح ہے۔ نپولین' لینن' مسولینی اور چرچل کی زندگیوں پر نظر ڈالئے تو معلوم ہو گا کہ ان لوگوں میں کوئی ایسی قوت کام کر رہی تھی' جو ان کے سکون سے زندگی گزارنے کے خلاف تھی۔ یہ لوگ ہنگامہ پسند تھے اور حرکت کے قائل۔ اس میں کسی کو کامیابی سے ہم کنار ہونا اور کسی کو تباہی کے غار میں گرنا پڑا۔ یہاں ایک بات اور بھی سامنے آتی ہے کہ

اس تحریک کی بنیاد معاشی کم مائیگی یا مالی پریشانی پر نہیں ہوتی بلکہ خود حرکت ان کی زندگیوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ گوئٹے نے اس خصوصیت کو das daemonische (کوئی فوق العادت قوت جیسے جن کی) کا نام دیا ہے۔

چہارم - گوئٹے کا فلسفہ موت و زیست کا فلسفہ ہے۔ اس کے خیال میں موت زندگی کا زینہ ہے۔ بقول شاعر:

جسے مرنا نہیں آتا اسے جینا نہیں آتا

موت کے بعد دوبارہ زندگی کا خیال نیا نہیں ہے۔ تقریباً تمام مذاہب میں یہ خیال ملتا ہے۔ افلاطون کے یہاں بھی یہ خیال پایا جاتا ہے۔ گویا موت ایک دروازہ ہے جس سے زندگی کو ایک دوسرے عالم میں جانے کے لئے گزرنا ہوتا ہے۔ گوئٹے کے یہاں بھی یہ خیال موجود ہے کیونکہ وہ زندگی کو غیر فانی سمجھتا ہے۔ ایکرمان سے گفتگو کرتے ہوئے 2 مئی 1824ء کو گوئٹے نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "میرا پختہ یقین ہے کہ ہماری روح کاملا" ایک ناقابل شکست شے ہے اور یہ ازل سے ابد تک میدان عمل میں سرگرم رہتی ہے۔(67)

فارسی شاعری میں شمع و پروانہ کے رشتہ پر شعرا نے طرح طرح سے معنی آفرینی کی ہے۔ اقبال نے اپنی ایک نظم میں یہ تاثر دیا ہے کہ موت پروانہ کے لئے آزار نہیں بلکہ آرام ہے اور شمع کے شعلہ پر جل مرنے سے اس کو زندگی جاوداں ملتی ہے یعنی فنا کے بعد بقا ملتی ہے۔ اس خیال کو حسرت موہانی نے یوں ادا کیا ہے:

تم پر مٹے تو زندہ جاوید ہو گئے
ہم کو بقا نصیب ہوئی ہے فنا کے بعد

شمع اور پروانہ سے متاثر ہو کر گوئٹے نے ایک نہایت مشہور نظم Selige Sehnsucht (روح کی تمنا) لکھی، جس کو مغربی ناقدین حاصل دیوان کہتے ہیں۔ اس نظم میں گوئٹے نے موت اور زندگی کا فلسفہ پیش کیا ہے۔ اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

کسی سے مت کہہ، اور کہنا ہے تو کسی دانشمند سے کہہ
کیونکہ عام لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے۔
میں اس زندہ چیز (پروانہ) کی قدر کرتا ہوں
جو آگ کے شعلہ میں جان دینے کی آرزو رکھتی ہے۔

عشق کی ان آسودہ راتوں میں
جب تو پیدا ہوا اور تو نے اپنا جانشین چھوڑا
تو شمع کی روشنی نے تجھ میں
ایک عجیب جذبہ بیدار کر دیا۔
تو اب پھیلی ہوئی تاریکی میں
بالکل مقید نہیں رہا۔
اور تجھ میں ایک نئی خواہش
ایک بلند ذات سے وصل کی پیدا ہو گئی۔
کوئی فاصلہ تجھے روک نہیں سکتا۔
تو اڑتا ہوا مسحور آتا ہے
اور آخرکار روشنی کے شوق میں'
اے غریب پروانے! تو جل مرتا ہے۔
اور جب تک تو شمع کو حاصل نہیں کر لیتا
اور اس قول پر عمل نہیں کر لیتا کہ "مرجا اور پھر زندہ ہو جا"
تو اس وقت تک تو اس تاریک دنیا میں
ایک بدنصیب مسافر ہے۔"

اسی مضمون کا ایک شعر اکبر الہ آبادی کا سن لیجئے :-

رقص پروانے کا گرد شمع دیکھیں اہل ذوق
کس خوشی سے جان دینے کے لئے آمادہ ہے

یعنی زندگی ایک جہد مسلسل اور ایک لازوال کشمکش کا نام ہے اور یہ کشمکش موت تک جاری رہتی ہے۔ کسی عظیم مقصد کے لئے جان دینے میں زندگی جاوداں کا راز پوشیدہ ہے۔ جس طرح پروانہ آگ میں جل کر فنا ہونے کے بعد زندہ جاوید ہو جاتا ہے' اسی طرح انسان کی عظمت کا اظہار اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی بلند مقصد کے لئے اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کرتا ہے۔ گوئٹے کی تعلیم نے جرمنوں کو بلند مقصد کے لئے ایثار کا سبق دے کر اقوام عالم کی صف اول میں لا کر کھڑا کر دیا۔ یہاں اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ بالواسطہ

فارسی شاعری کا فیض ہے۔

کچھ کتاب اور مصنف کے بارے میں

میں نے کچھ اصل کتاب کے بارے میں دیباچہ میں گوئٹے پر قدرے تفصیلی بحث کی ہے اس لئے کہ جرمن ادب میں وہ مشرقی تحریک کا علمبردار تھا۔ پھر اس کے دیوان کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے نامور شعرا نے اس کی پیروی کی۔ پروفیسر رے می نے ایسے کوئی نصف درجن شعرا کا ذکر کیا ہے اور ان کے کلام کا حوالہ ان کی تصنیفوں سے دیا ہے۔ افسوس ہے کہ گوئٹے کے علاوہ ان شعرا کا مشرقی کلام مجھے یہاں دستیاب نہیں ہو سکا' ورنہ ان کے اشعار کا ترجمہ پیش کر دیتا۔ صرف بوڈن اسٹیٹ (مرزا شفیع) کے مطبوعہ کلام کا پہلا ایڈیشن اتفاق سے مسٹر فان ہالیم' ڈائریکٹر گوئٹے انسٹیٹیوٹ' کے پاس نکل آیا اور انہوں نے استفادے کا موقع دیا۔

جب "پیام مشرق" 1923ء میں شائع ہوئی تو اس کے دیباچہ میں اقبال نے پروفیسر رے می کی جس کتاب کا ذکر کیا ہے' اس کا یہ ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ کتاب ہندوستان کے کسی کتب خانے یا کتاب کی دوکان میں نہ مل سکی۔ کوئی اٹھائیس سال پہلے کا ذکر ہے کہ میں ایک روز شہر میلان (اٹلی) کے مشہور بازار گیلیریا سے گزر کر ایک گلی میں مڑ گیا۔ وہاں میں نے ایک ٹھیلے پر کچھ پرانی کتابیں بکتی ہوئی دیکھیں۔ یوں ہی بیدلی سے میں کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا کہ دفعتاً" پروفیسر رے می کی کتاب کا یہ نسخہ جو نیچے دبا ہوا تھا' نکل آیا۔ دیکھتے ہی میں نے سوچا کہ یہ وہی کتاب ہے جس کا اقبال نے "پیام مشرق" کے دیباچہ میں حوالہ دیا ہے۔ یہ کتاب بہت معمولی قیمت پر مل گئی اور فوراً ذہن میں اس کے ترجمہ کا خیال پیدا ہوا' مگر سرکاری ملازمت کی بھاگ دوڑ اور مصروفیت نے جم کر کہیں کام کرنے کا موقع نہیں دیا۔

کراچی میں مستقل قیام کے بعد جب میں نے ترجمہ کا کام شروع کیا تو کچھ دقتیں سامنے آئیں۔ پروفیسر رے می نے حافظ کا جہاں حوالہ دیا ہے وہاں انہوں نے بجائے اشعار نقل کرنے کے جرمنی کے چھپے ہوئے دیوان سے غزلوں اور اشعار کے صرف نمبر لکھ دیئے تھے۔

ان نمبروں کے نقل کر دینے سے قارئین کی تسلی نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس خیال کو لے کر کہ حافظ کے اشعار کے نمبر کو نقل کرنے کی بجائے اصل اشعار نقل کروں' میں نے مقامی گوئٹے انسٹیٹیوٹ کے سابق ڈائریکٹر ڈاکٹر اشٹاخے (Stache) سے رجوع کیا کہ اگر ممکن ہو تو وہ جرمنی سے فلاں فلاں غزلوں کی نقل منگوا دیں۔ وہ ایک علم دوست انسان ہیں اور آجکل ایران میں ہیں۔ انہوں نے فوراً میری تجویز منظور کر لی اور تھوڑے زمانے کے بعد وہ نقل آ گئی' مگر بدقسمتی سے وہ ڈاکخانہ سے کھو گئی اور مجھے نہ مل سکی۔ بہرحال میں ڈاکٹر اشٹاخے کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے وہ نقل منگوا دی' جو بدقسمتی سے کھو گئی۔ اس درمیان میں ان کا تبادلہ ہو گیا۔ پھر میں نے ان کے جانشین مسٹر فان ہالیم (Mr. von Halem) سے گزارش کی مگر انہوں نے کہا کہ دوبارہ یہ کام مشکل معلوم ہوتا ہے۔ تاہم انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے لئے کوشش کریں گے۔ ان کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ حافظ کے کلام کی فوٹو نقل دوبارہ آ گئی اور مجھے مل گئی۔ میں ان کی اس کوشش کے لئے اور بوڈن اشٹیٹ کے کلام سے استفادے کا موقع دینے کے سلسلے میں ان کا تہ دل سے منت گزار ہوں۔ اس طرح جہاں کہیں پروفیسر رے می نے حافظ کے اشعار کے نمبر لکھے تھے' وہاں میں نے وہ اصل اشعار قارئین کی دلچسپی کے لئے نقل کر دیئے ہیں۔

دوسری مشکل یہ تھی کہ کتاب کی اصل زبان تو انگریزی ہے مگر اس میں بہت سے حوالے اور ٹکڑے یورپ کی قدیم اور جدید چھ زبانوں سے نقل کئے گئے ہیں۔ ڈچ زبان کے ٹکڑے کا ترجمہ ڈاکٹر اشٹاخے کی اہلیہ محترمہ نے کر دیا اور قدیم یونانی زبان کی ایک سطر کا ترجمہ مقامی عیسائی تعلیمی ادارہ کے ایک ڈچ پادری لیبیریوس (Padre Liberius) نے کیا۔ میں ان دونوں کا نہایت مشکور ہوں۔ بقیہ زبانوں کا ترجمہ میں نے خود کیا۔

اس کتاب کے اصل مصنف کا نام پروفیسر آرتھر رے می ہے اور وہ امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی میں مشرقی لسانیات و تاریخ کے پروفیسر تھے۔ ان کے سوانح حیات ہنوز گوشہ گمنامی میں ہیں۔ میں نے ان کے حالات زندگی کا پتہ چلانے کے لئے جرمنی اور امریکہ خطوط لکھے۔ جرمنی سے کوئی اطلاع نہیں ملی مگر کولمبیا یونیورسٹی سے بہت معمولی حالات کا پتہ چلا اور وہ یہ کہ وہ وہاں پروفیسر تھے اور بس۔ مگر ان کی تحریر اور انداز تحقیق دیکھنے کے بعد میری رائے میں وہ جرمن نژاد تھے اور اغلب ہے کہ وہ 1880ء اور 1890ء کے درمیان جرمنی سے

ترک وطن کر کے امریکہ چلے گئے۔ ترک وطن سے قبل گمان ہے کہ وہ علوم مشرقی میں اپنی تعلیم مکمل کر چکے تھے، اس لئے کہ اس وقت امریکہ میں اس انداز کی تعلیم اور تحقیق شروع نہیں ہوئی تھی۔ جرمن اور یورپی ادب کے ماخذ پر ان کو پورا عبور ہے اور اسی طرح وہ جرمنی میں طبع شدہ تمام مشرقی یعنی سنسکرت، عربی، فارسی ماخذ سے واقف ہیں۔ اس تعلیمی پس منظر نے ان کے لئے امریکہ میں ایک خاص مقام پیدا کر دیا اور ان کی تحقیق کے لئے ایک ایسا میدان فراہم کر دیا جس سے وہ بخوبی آشنا تھے۔ افسوس کہ ان کے بعد کوئی اس میدان کا مرد نہیں پیدا ہوا۔ آج کل امریکہ میں مشرق سے دلچسپی خاصی بڑھ گئی ہے اس لئے

شاید آ جائے کوئی آبلہ پا ان کے بعد

میں رافع الزماں صاحب کا شکرگزار ہوں کہ جرمن زبان و شاعری کے بعض پیچیدہ نکات کو حل کرنے میں ان سے مدد ملی۔

آخر میں میں جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے باوجود اپنی انتہائی مصروفیت کے اس کتاب پر پیش لفظ لکھنا منظور کیا۔

حواشی

1- De Lacy O'Leary, How Greek Science Passed to the Arabs, p. 86. London 1949

2- P. K. Hitti, History of the Arabs, p. 147, London, 1949.

3- Leone Caetani, Annali dell 'Islam, vol. I, p. 1-4, Milano, 1905; see also P. K. Hitti, History of the Arabs, p. 501, London, 1949.

4- Aldobrandino Malvezzi, L'Islamismo e la Cultura Europea, pp. 4-5, Firenze, 1956.

5- Pierre Martino, L'Orient dans la Littérature Française au XVII et XVIII Siècle, p. 6, Paris, 1906.

6- Pierre Martino, op. cit., p. 10

W. Heyd, Histoire du Commerce du Levant au Moyen Age, -7
Paris, 1885.

Asin Placios, L' Escatolagia Musulmana, Madrid, 1919; -8
translated into English as Islam and the Divine Comedy,
London, 1926; see also E. Cerulli, Dante e islam
in : Andalus, vol. XXI, pp. 229 - 253, Madrid, 1956.

Sigrid Hunke, Allahs Sonne ueber Abendland; -9
Unser arabisches Erbe, p. 344, Stuttgart, 1967.

H. A. L. Fisher, History of Europe, p. 272, London, 1946. -10

H. A. R. Gibb, in : Legacy of Islam. p. 54, Oxford, 1931. -11

Prof. Louis Massignon, The Influence of Arab Civilisation on -12
French Culture in:Reflections of Our Age, pp. 134-150,
London, 1948.

Werner P. Friedrich, An Outline of German Literature, -13
p. 11-12, New York, 1948.

Minadoi, Historia della Guerra fra Turchi e Persiani, -14
Venice, 1595.

Annemarie Schimmel, Orientalische Dichtung, -15
p. 15, Bremen, 1963.

Annemarie Schimmel, op. cit., p. 16. -16

Heinz Herz, Morgenland-Abendland, p. 268, Leipzig, 1963. -17

Richard Friedenthal, Goethe, His Life and Times, -18
pp. 73-78, London, 1965.

Quoted by Walter Moench in his Deutsche Kultur von der -19
Aufklaerung bis zur Gegenwart, p. 25, Muenchen, 1962.

-20 Goethe, Gespraeche mit Eckermann, p. 496, Leipzig; see also Ernest Cassirer, Rousseau, Kant, Goethe, Goethe, pp. 77-79, Princeton, 1947.

-21 Goethes Gedichte in zeitlicher Folge, Band I, p. 210, Leipzig.

-22 Karl Viëtor, Goethe, the Poet, p. 220, Cambridge, Mass. 1949.

-23 Hans Albert Maier, West-Oestlicher Divan; Kommentar, p. 10, Tuebingen, 1965.

-24 Aldobrandino Malvezzi, op. cit., pp. 281, 296, 311-314. فرانس کا مشہور مفکر دیدیرو وہ شخص ہے، جس نے کہا تھا کہ دنیا میں عورتوں کے سب سے بڑے ہمدرد اور دوست پیغمبر اسلامؐ ہیں۔

-25 Heinz Herz, op. cit., p. 234.

-26 Arturo Farinelli, Goethe ed ie Pensiero dell 'Eterno in Nuova in : Antalogia, Roma, p. 244, Fascicolo, 1593, Augusto I, 1938.

-27 Goethe, West-Oestlicher Divan, Tuebingen, p. 113, 1965.

-28 George Henry Lewes, The Life and Works of Goethe, (Everyman's Library), p. 142, London, 1949.

-29 Richard Friedenthal, Goethe, His Life and Times, p. 433, London, 1965.

-30 مدت ہوئی ایک امریکی مصنف کا ایک کتابچہ میری نظر سے گزرا تھا۔ اس میں اس بات کی تحقیق کی گئی تھی کہ ویلیمر کی کون کون سی نظم "دیوان" میں شامل ہے۔ افسوس ہے کہ نظموں کے حوالے ذہن سے اتر گئے، ورنہ میں ان کا ترجمہ پیش کر دیتا۔

-31 Karl Viëtor, op. cit., p. 221

-32 Goethe, West-Oestlicher Divan, p. 38 Tuebingen, 1965.

-33 محمد اقبال : پیام مشرق۔ دیباچہ صفحہ ہ، و۔ دہلی

-34 Walter Moench, Deutsche Kultur von der Aufklaerung bis zur Gegenwart, p. 148, Muenchen, 1962.

-35 Goethe, Wisdom and Experience, selected by Ludwig Contius, p. 125 Pantheon, New York, 1949.

-36 Thomas Mann - The Permanent Goethe, Introduction p. xxiii, xxxiii.

-37 حیات حافظ، مصنفہ مولانا اسلم جیراجپوری، صفحات 17-22، علی گڑھ۔ 1909ء

-38 H. A. L. Fisher, History of Europe, pp. 855-858, London, 1946.

-39 George Henry Lewes, The Life and Works of Goethe, p 539, London, 1940.

افیم کھانے یا پینے والی بات میں نے گوئٹے کے کسی دوسرے مشہور سوانح نگار کے یہاں نہیں دیکھی۔ مشرق افیم پینے کا نام نہیں ہے۔ انگلستان کا ایک مشہور شاعر کولیرج (Coleridge) بھی افیم کا رسیا تھا۔ شاید اس زمانے میں مغرب کے لوگ چینا بیگم کے عشق میں گرفتار تھے۔ (مترجم)

-40 Ernst Beutler, Goethes West-Oestlicher Divan, p. 541, Bremen, 1956.

-41 Heinrich Heine, Saemtliche Werke, Band XI, p. 53-54, Muenchen, 1964.

-42 Bertrand Russel, History of Western Philosophy, p. 594. London, 1946; See also Heinrich Heine, op. cit., p. 211.

-43 Ludwig Curtius, Goethe-Wisdom and Experience, p. 45, New York, 1949.

-44 Sir James Jeans, In : The Philosophers of Science, p. 364, edited by Saxe Commins and Robert N. Linscott, New York, 1954.

Ernst Beutler, Goethes West-Oestlicher Divan. -45

p. 408, Bremen, 1956.

Ernst Beutler, op. cit. Vorwort, p. XIII. -46

Jan Rypka, History of Iranian Literature, pp. 263-271, -47

Dordrecht, Holland, 1956.

Hans Bethge, Lieder des Hafis, p. 74-75, Leipzig. -48

حیات حافظ۔ مصنفہ مولانا اسلام جیراجپوری صفحہ 32-35، 9، علی گڑھ 1909ء -49

Quoted by Jan Rypka in his History of Iranian Literature, -50

p. 276-277, Dordrecht, Holland 1956.

حیات سعدی۔ خواجہ الطاف حسین حالی۔ صفحہ 155-156، لاہور -51

A. J. Arberry in : The Legacy of Persia pp. 164-165. -52

Oxford, 1953.

Ralph Russel and Khurshidul Islam, Three Mughal Poets. -53

Introduction by Annemarie Schimmel, p. IX, London, 1966.

Jan Rypka, History of Iranian Literature, pp. 231-232, -54

Dordrecht-Holland 1956.

H. A. R. Gibb, in : Legacy of Islam, pp. 204-205, Oxford, 1913. -55

Rudolf von Gottschall, Deutshe Lyrik des neunzehnten -56

Jahrhunderts bis zum modernen Aera-Einleitung p. 15, Leipzig.

Ernst Beutler, Goethes West-Oestlicher Divan, Vorwort, -57

p. IX, Bremen, 1956.

T. S. Elliot, Notes Towards the Definition of Culture, -58

p. 113, London, 1948.

Max Kommerell in Goethe in : XX Jahrhundert, Hamburg, -59

p. 83, 1967.

Mohammad Iqbal, Stray Reflections -60

pp. 54, 139, Lahore, 1961.

Humphry Trevelyan in : Essays on Goethe, edited by William -61

Rose, p. 124, London 1949.

Aldous Huxley, Ends and Means, p. 3, London, 1946. -62

Quoted by Barker Fairley in : Essays on Goethe, edited by -63

William Rose, p. 11, London, 1949.

Karl Viëtor, Goethe--The Poet, p. 222, Cambridge, -64

Mass. 1949.

Ernst Beutler, Goethes West-Oestlicher Divan, -65

p. 328, Bremen, 1956.

Ernst Beutler, op. cit. pp. 329-330. -66

Goethe, Gespraeche mit Eckermann p. 124, Leipzig. -67

(ایران و ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر۔ مصنفہ ریکی مترجم ڈاکٹر ریاض الحسن،
کراچی، 1973ء)

ڈاکٹر سید عابد حسین

ولہیلم مائسٹر

(مقدمہ)

اب سے کوئی چوتھائی صدی پہلے میں نے "فاؤسٹ" کے ترجمے کے ذریعے اردو دنیا سے جرمنی کے سب سے بڑے شاعر اور نقاد یوحان وولف گانگ۔ گوئٹے کا تعارف کرایا تھا۔ اب ساہتیہ اکادیمی کی عنایت سے مجھے گوئٹے کی ایک اور عظیم الشان کتاب "ولہیلم مائسٹر" کا ترجمہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ چوں کہ "فاؤسٹ" کے ترجمے کے ساتھ ایک مفصل دیباچہ لکھا جا چکا ہے، جس میں گوئٹے کی زندگی، شخصیت اور ادبی خدمات کے تذکرے اور "فاؤسٹ" پر ایک تفصیلی تبصرے کے علاوہ جرمن ادب کی تاریخ پر بھی ایک نظر ڈالی گئی تھی، اس لئے یہاں صرف اس کتاب کے بارے میں چند سطریں لکھی جائیں گی۔ جن حضرات کو کتاب کے مصنف اور اس کے فکر و فن سے اچھی طرح واقف ہونے کا شوق ہو، وہ "فاؤسٹ" اور اس کے مقدمے کا مطالعہ فرمائیں۔

اس میں شک نہیں کہ خالص ادب اور آرٹ کے لحاظ سے گوئٹے کی تصانیف میں "فاؤسٹ" کا درجہ "ولہیلم مائسٹر" سے اونچا سمجھا جاتا ہے، لیکن گوئٹے کی فکر و نظر کے آئینے کی حیثیت سے دونوں کتابیں مساوی قدر و قیمت رکھتی ہیں، اس لئے کہ ایک دوسری کی تکمیل کرتی ہے۔ اگر "فاؤسٹ" میں عہد جدید کے انسان کا عام فلسفہ زندگی بیان کیا گیا ہے، تو "ولہیلم مائسٹر" میں اس فلسفے کو جرمنی کے ان حالات پر جو اٹھارہویں صدی کے ربع آخر میں پائے جاتے تھے، منطبق کر کے دکھایا گیا ہے۔ اس لئے گوئٹے کے تصور "انسانیت" کو جو

قدیم یونانی تصور کا نئے زمانے کے مناسب حاصل نیا روپ ہے' پورے طور پر سمجھنے کے لئے ان دونوں کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے۔

میری خوش قسمتی ہے کہ میرے استاد اور جرمنی کے فلسفہ تمدن اور فلسفہ تعلیم کے جید عالم پروفیسر ایڈورڈ اشپرانگر نے ایک مختصر اور بلیغ پیش لفظ عنایت فرمایا' جس میں "ولہیلم مائسٹر" کے موضوع اور مقصد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد میرے خیال میں کسی مفصل مقدمے کی ضرورت باقی نہیں رہتی' اس لئے کہ یہ کتاب "فاؤسٹ" کی طرح کوئی تمثیلی ڈراما نہیں جس کی تعبیر اور تشریح درکار ہو' بلکہ ایک حقیقت پسندانہ ناول ہے جو اپنی آپ تفسیر ہے۔

پہلے حصے کا ترجمہ جو اس وقت آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے' اپنی جگہ ایک مکمل کتاب ہے - دوسرے حصے کا ترجمہ بھی میں نے شروع کر دیا ہے لیکن چونکہ دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے اس کے لئے وقت کم نکلتا ہے' اس لئے غالباً اس کے مکمل ہونے میں ایک سال لگ جائے گا۔

(ولہیلم مائسٹر (ترجمہ حصہ اول دو جلدوں میں) پہلی جلد (تربیت کا زمانہ) گوئٹے۔ مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین' دہلی : ساہتیہ اکادمی' 1957ء' صفحات 466' دوسری جلد (تربیت کا زمانہ)' ایضاً' دہلی : ساہتیہ اکادمی' 1959ء' صفحات 540)

ممتاز حسن

''ایران و ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر''

(ریمی)

(پیش لفظ)

''پیام مشرق'' کے مختصر سے دیباچے میں اقبال نے جہاں ان محرکات کی وضاحت کی ہے جو ''پیام مشرق'' کی تصنیف کا باعث ہوئے' وہاں انہوں نے جرمن ادب کی مشرقی تحریک کا بھی ذکر کیا ہے اور اس سلسلے میں جو کچھ وہ لکھ گئے ہیں' وہی اس کے متعلق ہمارے علم کی بنیاد ہے۔ افسوس کہ جیسا انہوں نے خود فرمایا ہے' انہیں اس موضوع پر جو کتابیں درکار تھیں وہ اس وقت دستیاب نہ ہو سکیں اور ان حالات میں جو کچھ وہ لکھ پائے' اس کی حیثیت ایک تعارفی خاکے سے آگے نہیں بڑھی۔

اقبال کی مختصر تحریر کا ماخذ ان کے اپنے قول کے مطابق آرتھر رے می (جسے اقبال نے غلطی سے چارلس رے می لکھا ہے) کی کتاب ہے' جس کا عنوان ہے ''ایران و ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر''۔ یہ کتاب اس لحاظ سے اردو ادب اور اقبالیات دونوں کے نقطہ نگاہ سے ایک مخصوص اہمیت کی حامل ہے۔ میری ایک مدت سے خواہش تھی کہ اس کا ترجمہ اردو میں کیا جائے۔ مشکل یہ تھی کہ کتاب قریب قریب نایاب تھی۔ ڈاکٹر ریاض الحسن ہمارے شکریئے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے نہ صرف اس کا ایک نسخہ کہیں سے ڈھونڈ نکالا بلکہ اس کا ترجمہ بھی کر دیا۔

ڈاکٹر ریاض الحسن کا یہ ترجمہ انگریزی متن سے کیا گیا ہے مگر اس میں یورپ کی قدیم اور جدید زبانوں کے کئی ٹکڑے اور حوالے بھی ہیں' جن کا ترجمہ بھی انہوں نے کر دیا ہے۔ اس سے پہلے وہ گوئٹے کے مشہور ناول "نوجوان ورتھر کی داستان غم" کا ترجمہ کر چکے ہیں۔ یہ ترجمہ پہلی دفعہ الہ آباد سے 1933ء میں شائع ہوا اور دوبارہ خاصی ترمیم کے بعد براہ راست جرمن زبان سے کیا گیا' جو کراچی میں 1967ء میں طبع ہوا۔ ان ترجموں کے علاوہ ان کی تصنیف "فلسفہ جمال" 1930ء میں ہندوستانی اکاڈیمی' الہ آباد نے چھاپی تھی۔ ریاض الحسن صاحب بہت سے مقالوں کے بھی مصنف ہیں جو جرمنی' گوئٹے' ترکی تاریخ' ترکی ادب و لسانیات' ٹیپو سلطان اور ہند و مسلم تعلقات جیسے اہم موضوعات سے متعلق ہیں۔ اقبال پر ان کا ایک مبسوط مقالہ جو ایک مشہور اطالوی مجلّے اوریئنتے مودرنو (Oriente Moderno) (اپریل 1940ء) میں چھپا تھا' اقبالیات کے سلسلے میں ایک نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔

ریاض الحسن صاحب 27 اگست 1904ء کو ہندوستان میں مشرقی اترپردیش کے مقام بستی میں پیدا ہوئے' جہاں ان کے نانا 1857ء کے ہنگامہ انقلاب کے بعد علما کے مشہور قصبے چریاکوٹ سے نکل کر سرکاری ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے۔ آپ نے 1932ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا اور 1941ء میں روم یونیورسٹی سے معاشیات اور سیاسیات میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ تقسیم ملک سے پہلے وہ حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات میں ماہوار رسالہ "فارن ریویو" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ پاکستان منتقل ہونے کے بعد پاکستان فارن سروس میں ان کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس حیثیت سے وہ روس' ترکی' سعودی عرب اور لنکا میں تعینات ہوئے۔ 1959ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد وہ کراچی کے انگریزی روزنامہ "مارننگ نیوز" میں دس سال تک اسسٹنٹ ایڈیٹر (مقالہ نگار) رہے۔ اس وقت سے وہ علمی اور ادبی کاموں میں مشغول ہیں۔

پروفیسر رے می کی کتاب جہاں تک معلوم ہو سکا ہے' جرمن ادب کی مشرقی تحریک پر پہلی کتاب ہے۔ کم از کم انگریزی زبان میں تو اس موضوع پر اس سے پہلے کوئی کتاب نظر نہیں آئی۔ کتاب مختصر ہے مگر جامع اور بڑی محنت اور کاوش سے لکھی گئی ہے۔ مصنف بہ یک وقت عربی' فارسی اور سنسکرت سے بھی واقف ہے اور یورپ کی قدیم و جدید زبانوں یعنی یونانی' لاطینی' اطالوی' ہسپانوی اور ولندیزی سے بھی آشنا ہے۔ جرمن اس کی مادری زبان

معلوم ہوتی ہے اور انگریزی پر بھی وہ پورے طور سے حاوی ہے۔ مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس کتاب کا مقام ایک بلند پایہ تعارفی مقالے کا ہے' جو اس اہم موضوع کے منابع اور ماخذ کی نشاندہی کرتا ہے۔ افسوس ہے کہ پروفیسر رے می کے بعد کسی اور محقق نے اس اہم تحریک پر قلم نہیں اٹھایا۔

اقبال نے جو کچھ لکھا ہے' اس میں دو اہم اضافوں کی گنجائش ہے۔ ایک تو یہ کہ جرمن ادب کی مشرقی تحریک یورپ کے مجموعی ادب کی مشرقی تحریک کا ایک اہم اور نمایاں حصہ ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس تحریک سے جس حد تک جرمن شعرا اور مصنفین متاثر ہوئے' وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مگر اس سلسلے میں سر ولیم جونس (Sir William Jones)' سر الفریڈ لائل (Sir Alfred Lyall)' فٹز جیرالڈ (Fitzgerald)' والٹیر (Voltaire)' وکٹر ہیوگو(Victor Hugo) اور آسمان علم و ادب کے ایسے ہی اور درخشاں ستارے نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔

دوسرے یہ کہ جیسے پروفیسر رے می نے تصریح کی ہے' گوئٹے اور پلاٹن کا مشرق تقریباً ایران اور عرب دنیا تک محدود ہے۔ مگر ان کے بعض ہم عصروں اور ان کے بعد آنے والوں جیسے روکرٹ (Rueckert) اور فان شاک (Von Schack) کے لئے مشرق کی ذہنی اور روحانی حدیں وسیع تر ہیں اور ان میں ہندوستان اور چین بھی شامل ہیں۔

یورپ کے ادب کی مشرقی تحریک عموماً اور جرمن ادب کی تحریک خصوصاً اس قابل ہے کہ اس پر مفصل تحقیق کی جائے۔ اس تحریک کی پیداوار ترجمے بھی ہیں جو زبانوں کو علمی اور ادبی سرمائے سے بہرہ ور کرتے ہیں اور نظم و نثر کی وہ تصنیفات بھی ہیں جو مشرقی شاہکاروں کے تتبع میں یا ان سے متاثر ہو کر وجود میں آئیں۔ ان کے علاوہ وہ مختلف اور مفید کتابیں بھی ہیں جو مشرق کے علوم و فنون' رسم و رواج' تاریخ و جغرافیہ اور مختلف انسانی اور طبیعی خصوصیات کے متعلق لکھی گئیں۔ بعض اوقات مشرقی طرز فکر اور گرمی تخیل مغربی شعرا کے کلام میں ایسے دبے پاؤں داخل ہوتی ہے کہ شک بھی نہیں گزرتا۔ انگریزی شاعری ہی کو لیجئے۔ شیکسپیئر (Shakespeare)' شیلے (Shelley)' کیٹس (Keats)' سون برن (Swinburne)' روسیتی (Rosetti)' فرانسس ٹامسن (Francis Thomson) اور بہت سے دوسرے شعرا ایسے ہیں جن کی گرمی کلام' جذباتی گداز اور بلندی تخیل ہمیں عربی

اور فارسی شاعری کی یاد دلاتی ہے۔ مثال کے طور پر شیلے کہتا ہے :

She stood so robed in glory

That I beheld her not. (Epipsychidion)

وہ اپنے حسن کی تجلی میں اس انداز سے پوشیدہ تھی کہ میں اسے دیکھ نہ پایا۔

اس شعر کو غالب کے مندرجہ ذیل شعر کے برابر رکھ کر دیکھئے :

وا کر دیئے ہیں شوق نے بند نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

یا اقبال کا شعر سنئے :

مرا ز دیدۂ بینا شکایتی دگر است
کہ چوں بجلوہ در آئی حجاب من نظر است
(پیام مشرق)

مجھے اپنی چشم بینا سے ایک اور ہی شکایت ہے
کہ اے محبوب! جب تو جلوہ افروز ہوتا ہے تو میری نگاہ خود میرے لئے ایک پردہ بن جاتی ہے

اسی طرح انگریزی کا شاعر براؤننگ کہتا ہے :

Thoughts hardly to be pack'd

Into a narrow act,

Fancies that broke through language

and escaped

(Rabbi ben Ezra)

میرے دل میں وہ خیالات تھے
جن کی پہنائی ایک محدود عمل میں نہیں سما سکتی تھی
اور وہ تخیلات تھے جو الفاظ کی حدود کو توڑ کر باہر نکل جاتے تھے

اب غنی کشمیری کا شعر ملاحظہ فرمایئے :

اگر لب از سخن گوئی فروبندیم جا دارد

کہ نتواں از نزاکت تاب بستن معنیٰ مارا

اگر میں سخن گوئی ترک کر دوں تو بجا ہے

کیونکہ میرے معانی اتنے لطیف و نازک ہیں کہ الفاظ انہیں باندھ نہیں سکتے۔

البتہ یہ ضروری نہیں کہ ہم ہر انگریزی شعر کے مقابلہ میں کوئی عربی یا فارسی کا شعر ہی پیش کر دیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ جہاں بھی کوئی انگریز یا دوسرا یورپی شاعر مغربی دنیا کی سرد روحانیت اور بے کیف اقتصادی جدوجہد سے الگ ہو کر کچھ کہنا چاہتا ہے تو وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر مشرق کے سینے سے الہامی حرارت حاصل کرتا ہے۔ فرانسس ٹامسن کی نظم کا ایک بند ہے:

She went her unremembering way,

She went away and left in me

The pang of all the partings gone,

And partings yet to be.

(Daisy)

اس نے بے نیازانہ اپنا راستہ لیا اور چلی گئی۔

اور میرے لئے ان ساری جدائیوں کا کرب و درد چھوڑ گئی

جو اب تک نوع انسان پر گزر چکے ہیں

یا آئندہ پیش آنے والے ہیں۔

یہاں شاعر اپنی محبوبہ کی جدائی کو اس قدر ناقابل برداشت سمجھتا ہے کہ اس کے خیال میں اسے زمان و مکاں کی حدود میں مقید کرنا بھی اس کے لئے ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک مشرقی قسم کے جذبے کی عکاسی ہے۔ انگریزی میں یہ اشعار فوق العادت معلوم ہوتے ہیں، مگر حبیب یغمائی جب کہتا ہے کہ:

نجوید عمر جاویداں ہر آنکو ہمچو من بیند

بیک شام فراق اندوہ عمر جاودانی را

جو شخص میری طرح محض ایک شام فراق میں

ایک عمر جاوداں کے غم و اندوہ کا تجربہ کرے

وہ کبھی عمر جاوداں کی خواہش نہیں کرے گا۔

تو ہمیں ٹامسن کا تخیل اور اس کا جذبہ فارسی شاعری کی روایات سے الگ محسوس نہیں ہوتا۔

فرانسس ٹامسن کی اسی نظم کا ایک اور بند ہے :

Nothing begins and nothing ends

That is not paid with moan,

For we are born in other's pain

And perish in our own.

دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی ابتدا اور انتہا اپنے اندر درد و کرب لئے ہوئے نہ ہو۔
خود ہم پیدا ہوتے ہیں تو ایک دوسرے انسان کا درد و الم ہمارے ہمراہ ہوتا ہے
اور مرتے ہیں تو اپنے ہی درد و کرب میں۔

اس بند کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے شیخ سعدی نے انگریزی میں شاعری کی ہو۔
یورپ کے شعرا اپنا نام یا تخلص شعر میں استعمال نہیں کرتے مگر کہیں کہیں غالباً فارسی کے اثر سے یہ بھی موجود ہے، مثلاً شیلے (Shelley) کی مشہور نظم "To Jane, A Recollection" کے آخری بند میں :

Though thou art ever fair and kind,

The forest ever green;

Less oft is peace in Shelley's mind

Than calm in waters seen

اے محبوبہ! اگرچہ تو ہر وقت حسین اور مہربان ہے
اور جنگل ہمیشہ سرسبز اور شاداب ہے،
لیکن شیلے کے دل کو سکون کم نصیب ہوتا ہے
اور سمندر کو زیادہ۔

جب ٹینی سن (Tennyson) اپنی نظم لاکسلے ہال (Locksley Hall) میں اپنی محبوبہ

کے قدیم مسکن کو دیکھ کر اپنی جوانی اور ناکام محبت کو یاد کرتا ہے اور اپنے رفقا سے کہتا ہے :

Comrades,leave me here while as yet 'tis early morn,

Leave me here and when you want me, sound upon

the bugle horn.

اے میرے ساتھیو! مجھے یہاں چھوڑ دو اور جب تک صبح

کا سماں ہے مجھے یہیں رہنے دو۔

مجھے یہیں رہنے دو اور جب تم چاہو کہ ہم واپس چلیں تو تم اپنا بگل بجا دینا' میں چلا آؤں گا۔

تو یہ امراء لقیس کے معلقہ کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے :

قفا نبک من ذکریٰ حبیب و منزل

بسقط اللویٰ بین الدخول فحومل

"اے میرے دونوں دوستو! ٹھیرو تاکہ ہم مل کر محبوبہ کی یاد میں روئیں اور اس مسکن کو دیکھ کر آنسو بہائیں جو ریت کے ٹیلے پر دخول اور حومل کے درمیان واقع ہے۔"

واقعہ بھی یہی ہے کہ جب ٹینی سن نے یہ نظم لکھی' وہ سر ایلفرڈ لائل کے سبعہ معلقہ کے انگریزی ترجمے سے متاثر تھا۔ ورنہ اپنے رفقا کو اس طرح خطاب کرنا جہاں عربی شاعری کی قدیم روایت ہے' انگریزی شاعری سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

ہائیڈل برگ سے متعلق ایک گیت کا یہ مصرع

Die jahre sind vergangen und ich bin ganz allein,

from Ich hab' mein Herz in Heidelberg verloren

"سالہا سال گزر گئے اور اب میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں"

قیس عامری سے منسوب اس مصرعے کی یاد دلاتا ہے :

تذکرت لیلیٰ والسنین الخوالیا

"میں نے لیلیٰ کو اور گذرے ہوئے سالوں کو یاد کیا"

اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ اس مصرعے میں جرمن شاعر مجنوں بنی عامر کا مرہون منت ہی ہو

جب شیلے کہتا ہے:

Life of life! thy lips enkindle

With their love the breath between them.

(Prometheus Unbound)

اے جان جاں! تیرے ہونٹوں میں وہ جادو ہے
کہ وہ اپنے محبت کے جذبے کی بدولت ہر سانس کو
ایک نئی زندگی بخشتے ہیں۔

تو اس کے کلام میں محبت کی وہ شدت اور جذبے کی وہ حرارت محسوس ہوتی ہے جو عربی شاعری ہی کا حصہ ہے۔ ایک عرب شاعر کہتا ہے:

لیس الفواء د محل شوقک وحده
کل الجوارح فی هواک فواء د

صرف میرا دل ہی تیری محبت کا مرکز نہیں ہے
بلکہ میری تو یہ کیفیت ہے کہ تیری محبت میں میرا
انگ انگ دل بنا ہوا ہے۔

یہ محض چند مثالیں ہیں، جن سے عربی اور فارسی شاعری کی جذباتی گہرائی کا شعوری یا غیر شعوری اثر یورپ کی شاعری پر دکھانا مقصود ہے۔

مغربی شعر و ادب میں مشرقیت کا عنصر ایک بڑا وسیع مضمون ہے۔ میں نے اس کے ایک پہلو کی طرف مختصر سا اشارہ کیا ہے۔ جہاں تک پروفیسر رے می کا تعلق ہے، ریاض الحسن صاحب نے ان کی کتاب کا ترجمہ کر کے ایک نہایت قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ گوئٹے کے نزدیک ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمے عالمی ادب (Weltliteratur) کی بنیاد ہیں۔ اگر ہم اردو زبان کی ترقی چاہتے ہیں تو ہمیں سید احمد خاں اور ان کے رفقا کی طرح دوسری زبانوں کے خزانے زیادہ سے زیادہ اردو میں منتقل کرنے ہوں گے۔

پروفیسر رے می کے مختلف خیالات اور رایوں کے متعلق ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب اپنے دیباچہ میں اس قدر تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ اس سلسلے میں کچھ اور کہنا تحصیل

حاصل ہے۔ مجھے عام طور پر ڈاکٹر صاحب سے اتفاق ہے۔ پروفیسر رے می کا یہ ارشاد کہ گوئٹے کا دیوان اس کی بہترین شاعری کا نمونہ نہیں ہے' یقیناً محل نظر ہے۔ غالباً جب پروفیسر رے می نے اپنی یہ رائے لکھی' دیوان کی نظمیں اور غزلیں انہیں مستحضر نہیں تھیں۔ ورنہ اگر وہ یہ نظم

Ist es moeglich! Stern der Sterne,

Drueck ich wieder dich ans Herz!

Ach, was ist die Nacht der Ferne

Fuer Abgrund, fuer ein Schmerz!

کیا سچ مچ یہ تمی ہو' اے میرے ستاروں کی ملکہ!
جسے میں دوبارہ اپنے سینے سے لگا رہا ہوں۔
آہ! یہ جدائی کی رات کیا تھی! کس قدر عمیق!
جیسے درد و کرب سے لبریز!

یا دوسری نظم

In tausend Formen magst du dich verstecken,

Doch, Allerliebste, gleich erkenn ich dich;

Du magst mit Zauberschleiern dich bedecken,

Allgegenwaertige, gleich erkenn ich dich.

جان من! تو چاہے ہزار بھیس بدلے
میں تجھے فی الفور پہچان لوں گا
تو خواہ جادو کی نقاب اوڑھ لے
میں بلا تامل تجھے پہچان لون گا' اے محبوب ہرجائی!

یا اور دوسری نظمیں ان کے سامنے ہوتیں تو وہ ایسا نہ فرماتے۔ بہرحال گوئٹے کے دیوان کے متعلق پروفیسر رے می کی رائے وہ وقعت ہرگز نہیں رکھتی' جو گوئٹے کے ہم عصر ہائینے کی ہے۔

آخر میں ڈاکٹر ریاض الحسن سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ اس مفید اور بلند پایہ ترجمے کے بعد جرمن ادب اور یورپ کے ادب میں مشرقی تحریک اور مشرقیت کے عنصر پر بھی توجہ فرمائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام انہی کا ہے۔ شاید کسی اور کے بس کا بھی نہیں۔

(ایران و ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر' مصنفہ ریمی' ترجمہ ڈاکٹر ریاض الحسن' کراچی 1973ء)

محمد اسحاق امرتسری

خدا، روح اور گوئٹے

ایک زمانہ تھا کہ "خدا" اور "روح" کے معنی تھے، جو انسان بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ خدا کو آنکھوں سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کی آواز کانوں سے سن سکتا تھا۔ اس کے اشاروں پر کٹ پتلی کی طرح عمل کر سکتا تھا۔ خدا اور روح کے معنی مقرر و معین تھے۔ دونوں دیکھی بھالی چیزیں تھیں۔ سب کو معلوم تھا خدا کیا ہے، روح کیا ہے۔

اب وہ زمانہ نہیں رہا۔

انسان نے ایک نئی راہ اختیار کی ہے۔ علم بڑھ گیا ہے۔ معرفت گھٹ گئی ہے۔ یوں تو آج بھی خدا اور روح کے الفاظ بجنسہٖ موجود ہیں، مگر ان کے معانی مٹتے مٹتے ناپید ہو گئے ہیں۔

پہلے خدا کیا تھا؟

درخت، پتھر، آگ، پانی، چاند، سورج، زمین، آسمان، سانپ، بچھو، بندر، ہنومان، بن مانس، گڑمانس الابلا، سب خدا تھا۔

روح کیا تھی؟

سانس تھی، ہوا تھی، خون تھی، موج تھی، کبوتر تھی، مقناطیس تھی، بجلی تھی، ذرہ تھی، غبار تھی۔

اب فلسفہ نے خدا اور روح کے معنوں کو کوٹ کر، پیس کر راکھ بنا دیا ہے۔ اڑتی ہوئی

راکھ، مع اس ہوا کے جس میں یہ مل گئی ہے، ہمارا خدا اور ہماری روح ہے۔

پہلے خدا مجسم تھا۔

اب مطلق ہے۔

پہلے روح مجسم تھی۔

اب بسیط ہے۔

مطلق اور بسیط، گویا مجسم خدا اور روح کے معنوں کی چھنی ہوئی راکھ ہے، جو عالم خیال کی فضا میں اڑ رہی ہے۔ چاند کے معنی چاند اور سورج کے معنی سورج ہیں۔ پہلے بھی ان کے یہی معنی تھے اور اب بھی یہی معنی ہیں۔ مگر لفظ خدا کے معنی پھیلتے پھیلتے، بدلتے بدلتے، مٹتے مٹتے، ہاں سے نہیں اور ہست سے نیست ہو گئے ہیں۔

خدا کا انکار مغربی ملحدوں کا کارنامہ نہیں۔ اس کا سہرا گوتم بدھ اور چاردک کے سر ہے۔

زید کہتا ہے کہ خدا سب کچھ ہے، مگر مٹی نہیں، پتھر نہیں، زمین نہیں، آسمان نہیں، یہ نہیں، وہ نہیں، یعنی سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں۔

زید کہتا ہے خدا وہ نہیں جو ہمیں معلوم ہے اور جو ہمیں معلوم ہے وہ خدا نہیں۔

یا مظہر العجائب۔

خدا خیال ہے۔

اور خیال کیا ہے؟

خیال کسی شے کا ہوتا ہے مگر خدا کوئی شے نہیں۔

خدا خیال مطلق ہے۔

اور خیال مطلق کوئی شے نہیں۔

خدا ایک مغالطہ ہے

اور مغالطہ کوئی شے نہیں

خدا، سمیع و بصیر و کلیم ہے مگر اس کے کان نہیں، آنکھیں نہیں، زبان نہیں۔

ہمارے خیال میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس کا تعلق کسی دیکھی بھالی چیز سے نہ ہو، کوئی خیال ہمارے دماغ میں آ نہیں سکتا، جو دیکھی بھالی سوچی سمجھی چیز سے متعلق نہ ہو۔ خدا کے معنی خواہ مادی ہوں یا غیر مادی، مجسم ہوں یا مطلق، روحانی ہوں یا خیالی، سب دنیا کی قوتوں

سے جڑے ہوں گے۔ اگر ہم خدا کو سمجھ لیں تو وہ آگ پانی یا مٹی یا بجلی کی سی کوئی چیز ہو گی یا محض خواب و خیال ہو گا۔ صاف لفظوں میں یوں کہئے' جہاں تک ہماری سمجھ کا تعلق ہے خدا ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ المانی شاعر گوئٹے کہتا ہے :

"جس نے خدا کو سمجھ لیا اس نے دھوکا کھایا۔"

خدا کی تعریف میں مشرقی شعرا نے بہت کچھ لکھا ہے۔ بے محل نہ ہو گا اگر اس معنوی مضمون میں گوئٹے کا بھی شاعرانہ و ملحدانہ نظریہ پیش کر دیا جائے۔ بقول شخصے : تعرف الاشیا باضدادہا۔

گوئٹے کی شہرہ آفاق تصنیف "فاؤسٹ" کی نسبت علمائے ادب کا خیال ہے کہ اس میں شیکسپئر کی بلند نظری اور حافظ کی شیرینی جمع ہے۔ یہ وہ شاعر ہے جس نے خدا سے بغاوت کی اور دنیائے شعرو تخیل میں ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ ایک جگہ لکھتا ہے :

"اے خدا!! اے غیر فانی ہستی! اے وسیع آسمان کے بسنے والے ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دے کہ ہم نڈر ہو کر زمین پر زندہ رہ سکیں اور تو براہ نوازش اپنی وسیع آسمانی قلمرو پر قانع رہ۔"

دوسری جگہ لکھتا ہے :

"اے خدا! اگر تو چاہے تو اپنے آسمانوں کو گھٹاؤں سے' کہر سے اور دھندلکے سے بھر دے اور جس طرح بچے پھولوں اور پتوں سے کھیلا کرتے ہیں' اسی طرح تو بھی پہاڑوں کی چوٹیوں سے کھیلا کر' لیکن میری زمین کو اس کی حالت پر چھوڑ دے۔ میری جھونپڑی تو نے نہیں بنائی۔ میرا چولہا تو نے نہیں بنایا۔ انہیں نہ گرا۔ آہ میرے چولہے کے انگاروں کی چمک میرے دل میں کیوں رشک کی آگ بھڑکاتی ہے۔"

ایک اور جگہ لکھتا ہے :

"میں تیری عزت کرتا ہوں۔ یہ کیوں؟ کیا تو نے کبھی بوجھ اٹھانے والوں کا بوجھ ہلکا کیا؟ کیا تو نے کبھی غمزدوں کا غم دور کیا؟"

ایک اور جگہ لکھتا ہے :

"میں یہاں بیٹھا ہوا اپنی قسم کے انسان پیدا کر رہا ہوں۔ میری طرح کے انسان تکلیفیں اٹھانے کے لئے' صدمے سہنے کے لئے' رونے کے لئے' ہنسنے کے لئے اور تجھ سے اعراض

کرنے کے لئے ہیں۔"

ایک اور جگہ لکھتا ہے:

"اے خدا! اس سورج تلے تجھ سے بڑھ کر کون بھوکا بھکاری ہو گا۔ تو نے اپنی عظیم الشان ہستی کو قربانیوں کے خون اور منتوں کے گوشت پر قائم رکھا ہے۔ بلاشبہ تو خود بھوک سے مرجاتا اگر انسان جاہل اور احمق نہ ہوتا۔"

(ادبی دنیا (لاہور)، بابت ستمبر 1934ء، ص 380-381- ماہوار رسالہ "ماہ تمام" 1934ء سے ماخوذ۔ مدیر محمد اسحاق امرتسری)

نامعلوم الاسم

گوئٹے کی چند نظمیں

آوارہ گرد کا گیت

اے زمینوں اور آسمانوں کے مالک۔ اے رنج و غم کے دور کرنے والے اور اے غمزدہ دل کے چارہ ساز! میں اس کشاکش دوام سے عاجز آ چکا ہوں۔ یہ اضطراب پیہم کس لئے؟

پہاڑوں کی چوٹیاں خاموش ہیں
درختوں کے پتوں میں ذرا بھی جنبش نہیں
درختوں میں چڑیاں سو رہی ہیں
ان کی طرح تجھے بھی آرام اور سکون حاصل ہو گا۔

(مخزن (لاہور)' سالگرہ' مارچ 1930ء' ص 73)

محبت

بے شک محبت سب سے بڑی فضیلت ہے
محبت سے بڑھ کر کوئی نعمت خدا نے ابن آدم کو نہیں دی
محبت اپنے ساتھ دولت و عزت نہیں لاتی' لیکن محبت آدمی کو

دنیا کے ہیروز میں شامل کر دیتی ہے
دنیا جس طرح پیغمبروں کو یاد کرتی ہے' اسی طرح مجنوں کو
بھی یاد کرتی ہے---- دیکھی محبت کی کرامت
دنیا مجنوں کی حقیقت سے' اس کے کارناموں سے ناواقف ہے۔
لیکن دنیا نے صرف اس قدر سنا ہے کہ مجنوں نے محبت کی تھی
بس یہی محبت مجنوں کی سب سے بڑی فضیلت ہے۔

قیدی

یہاں ابھی سرگیں آنکھیں اور چاند سا مکھڑا موجود تھا
میں نے دونوں کو سجدہ کیا اور گرم گرم بوسے دیئے تھے
سرو سا قد' نرم نازک شانے' گویا صرف جنت ہی کے لئے بنائے گئے تھے
مگر کیا واقعی یہاں کوئی ایسی چیز تھی؟
تھی' تو کہاں چلی گئی؟
بے شک تھی
اسی نے مجھے قید کیا
پھر بھاگ گئی
مجھے اپنا قیدی بنا کر غائب ہو گئی

ہدہد

آہ' میں کس قدر خوش نصیب ہوں!
سبزہ زاروں میں پھر رہا تھا کہ ہدہد میرے سامنے آ گئی
سر پر تاج رکھے' غرور سے اکڑ کر چل رہی تھی۔
میں نے کہا "اے ہدہد' حسین چڑیا

میری پیاری ہد ہد' ہاں اڑ اور محبوب کو خبر پہنچا دے کہ میں
اسی کا ہوں' آج بھی اور ہمیشہ بھی!
اے ہدہد' ہاں جا' تو نے ہی سلیمان کا پیام محبت بلقیس کو پہنچایا تھا"
ہد ہد نے مجھے جواب دیا
"تو جس کے پاس مجھے قاصد بنا کر بھیج رہا ہے' وہ اپنے دل کا پورا
راز مجھ سے کہہ چکا ہے
اس نے اپنی نیم باز نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور پورا راز مجھ پر کھل گیا
میں تجھے مبارک باد دیتا ہوں۔
تیری خوش نصیبی پر مجھے رشک آتا ہے
تو محبت کئے جا' عمر بھر محبت کئے جا
تیری قسمت میں لکھ دیا گیا ہے کہ تو کامیاب محبت کا مالک بنے گا
تیری خوشی لازوال رہے گی
کیونکہ تیرا محبوب بھی تجھ پر عاشق ہے"
آہ' میں کس قدر خوش نصیب ہوں

(ادبی دنیا (لاہور)' مئی 1935ء' ص 126-127)

آزادی

مجھے چھوڑ دو
مجھے جانے دو
اپنے پیارے گھوڑے پر سوار ہو کر میں جاؤں گا' اللہ کے
بنائے ہوئے اس ناپیدا کنار میدان میں دوڑتا پھروں گا
میں آزاد ہوں' کیونکہ اللہ نے مجھے آزاد پیدا کیا ہے
کوئی حرج نہیں کہ تم خیموں ہی میں بیٹھے لیٹے رہو' مگر میں
نوجوان ہوں

مجھے اس کشادہ کائنات میں گھوڑا چھوڑ دینے دو
میں جاتا ہوں - - - - ابھی جاتا ہوں
میرے عمامے کے اوپر ستاروں کی سوا کوئی اور چیز بلند
نہیں ہو سکتی
آسمان پر یہ ستارے کیوں ہیں؟
صرف اس لئے ہیں کہ تم اور ہم اللہ کے بنائے ہوئے آسمان کے
نیچے چلا کریں - - - - بے خوف و خطر چلا کریں
اگر کوئی ہماری راہ روکے، تو اس تلوار سے اس کا سر
قلم کر لیں!
میں جاتا ہوں - - - - ابھی جاتا ہوں - - - - اپنے پیارے
گھوڑے پر سوار ہو کے جاتا ہوں

مطالعہ کی کتاب

کیسی عجیب کتاب ہے
یہ عشق کی کتاب ہے
میں نے بہت غور سے اس کا مطالعہ کیا
گنتی کے ایک دو ورق خوشی کے ہیں، باقی پوری لمبی چوڑی کتاب
میں غموں، آہوں، آنسوؤں کی داستان لکھی ہوئی ہے
وصل کا بیان ایک صفحہ پر لکھا ہے۔ فراق کا افسانہ ہزاروں
صفحوں پر پھیلا ہوا ہے
بے شک غمزدہ دل کی کہانی بڑی لمبی ہوتی ہے کبھی ختم
نہیں ہو سکتی

(ادبی دنیا (لاہور)، بابت اپریل 1935ء، ص 766-767)

دیوان مغرب

(نغمہ سنجی کی تلاش میں نغمات کی مملکت کو نکل جا اور معنی کو جاننے کے لئے
اس کے وطن کی جستجو کر)

گوئٹے کے اس مجموعہ کلام کی تمام نظمیں ایرانی انداز میں ہیں اور جس کامیابی کے ساتھ اس مغربی مغنی نے اپنے دل پر تمام تر مشرقی کیفیات طاری کر کے مشرقی شاعری کی روح کو..... ہم آہنگی اور کمال کے ساتھ ادا کیا ہے' مشرق کی فلسفی مزاج طبیعتیں اس کی مداح ہو جاتی ہیں۔ ہائینے کو یہ امر نہایت تعجب انگیز نظر آتا ہے کہ جرمنی زبان اس قدر دلکش اور لطیف اور لوچدار خیالات کے بیان کی بھی طاقت رکھتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ گوئٹے نے اس میں مشرق کی ان تمام دلاویزیوں اور دلفریبیوں کو رکھ دیا ہے' جن کو مغربی زبان میں مشرق کی رومانیت کہا جاتا ہے۔ اس کتاب کی دلآویزی بیان نہیں کی جا سکتی۔ یہ نایاب پودوں کے چمنستانوں سے چنے ہوئے پھولوں کا گلدستہ ہے' جسے عقیدت کے طور پر مغرب کی طرف سے مشرق کی بارگاہ میں پیش کیا گیا ہے ..... یہ سرخ گلاب کے پھولوں' داؤدی کے غنچوں اور مہندی کی پتیوں سے تیار کیا گیا ہے' جس کے درمیان جرمن بنفشہ کا ایک شاداب شگوفہ ہے۔ یہ گلدستہ مشرق کی طرف یہ پیام لے کر جاتا ہے کہ مغرب اپنی نام نہاد اور افسردہ روحایت سے بیزار ہو کر اس کے تاب ناک سینہ میں زندگی تلاش کرنا چاہتا ہے۔ اس کی اکثر نظمیں 1814ء اور 1819ء کے درمیانی عرصے میں لکھی گئی تھیں اور آخری سال انہیں

شائع کر دیا گیا تھا۔ یہ مجموعہ کلام بارہ کتابوں پر مشتمل ہے' جن میں سے زلیخا نامہ کو جو نغمات عشق کا شیریں آواز ساز ہے' بہترین خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کی ایک مشہور ترین نظم کو آج پہلی بار اردو میں شائع کیا جاتا ہے۔ (ایڈیٹر)

زلیخا نامہ

میرا خیال ہے کہ ایک سرد رات کے لمحوں میں میں نے خواب میں چاند دیکھا' لیکن جب میں نیند سے بیدار ہوا تو دیکھا کہ آفتاب نامعلوم طور پر پانی کی گہرائی سے طلوع ہو رہا ہے۔

اس میں کیا کلام ہو سکتا ہے کہ زلیخا کو یوسف سے نہایت محبت تھی۔ وہ جوان تھا اور شباب آنکھوں کو بھاتا تھا۔ وہ خوبصورت تھا اور بے انتہا خوبصورت تھا۔ وہ بھی حسین و جمیل تھی اور دونوں حسن و عشق کے متوالے تھے۔

اے تو جو میرے انتظار میں ہے اور مجھ پر شباب آفریں نگاہیں ڈال رہی ہے۔ تو بھی اپنی محبت سے مجھے سرفراز کرے گی؟ آہ میرے نغمے تیرا گیت گائیں گے اور میں تجھے ہمیشہ کے لئے زلیخا کہوں گا۔

آفتاب طلوع ہو رہا ہے! کس قدر شاندار نظارہ ہے۔ ہلال اس کے گرد لپٹا ہوا ہے۔ اس حیرت انگیز وصال اور اس معمے کو کس طرح حل کیا جا سکتا ہے۔

میری محبوبہ ان شاداب اور گھنی شاخوں کو دیکھ۔ دیکھ ان کے خوش رنگ پھلوں کو بھی دیکھ۔

ابھی تک وہ خام ہیں۔ انہیں اپنی دلکشی اور دلفریبی کا احساس نہیں۔ صرف ایک لٹکی ہوئی شاخ انہیں جھولا جھلاتی ہے۔ لیکن وہ اندر سے پک رہے ہیں۔ ان کا رنگ شوخ ہوتا جا رہا ہے۔ اب انہیں ہوا کی تمنا ہے اور آفتاب کی خواہش۔ اب وہ اپنی خوشی سے شگفتہ ہو رہے ہیں۔ یہی شان میرے نغموں کی ہے۔ وہ ہر روز تیرے پاؤں پر نثار ہوتے ہیں۔

"روزینی"

(ادبی دنیا' بابت جولائی 1929ء' ص 264)

منصور احمد

گوئٹے اٹلی میں

گوئٹے اپنی جوانی میں ایک رند لاابالی تھا' لیکن 1781ء کے موسم بہار میں جب وہ سوئٹزرلینڈ سردیاں گزار کر واپس آیا' تو اس کے دل میں پھر ادبی جوش پیدا ہوا۔ اس نے سپینوزا کی تصانیف کا مطالعہ شروع کیا اور اس کی زندگی میں متانت اور مستعدی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ اس نے "ولہلم مائسٹر" اور "ٹاسو" دو تصانیف کی طرح ڈالی اور سیزر' محمدؐ' آوارہ یہودی اور پرومی تھیوس پر مضامین کے خاکے تیار کئے۔

چھ اور سالوں تک وہ اپنے چھوٹے سے خوبصورت گھر میں رہا' جس کے چاروں طرف باغ تھا اور جو ڈیوک کارل آگسٹ نے اسے دے رکھا تھا' لیکن اس کی طبیعت یہاں بھی بے کیف ہی رہتی تھی۔ اسے ایک تازہ فضا کی ضرورت تھی' جس میں اس کے خیالات ابھریں۔

سو 1786ء میں کسی کو اطلاع دیئے بغیر گوئٹے چپکے سے اٹلی کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ عمر بھر اسے اٹلی جانے کی تمنا رہی تھی۔ جب انگور کی بیلیں' زیتون کے جھنڈ' پرانے شہر اور اس سے بھی پرانے کھنڈر اس کی نظروں سے گزرتے تھے' تو اسے یہ سفر گھر سے زیادہ خوش گوار معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنی شدید کلاسیکی رنگ میں ڈوبی ہوئی تصنیف "افی گینیا" یہیں مکمل کی' جو جرمن زبان میں ایک یونانی المیہ ناٹک ہے۔ روما سے وہ سسلی میں پہنچا' جس میں اس نے یونان سے زیادہ یونانیت پائی۔

اٹلی میں گوئٹے نے اپنے عمر بھر کے ذوق تصویر کشی و نقاشی کو خیرباد کہی اور ہمہ تن

شاعری میں محو ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سمجھ لیا کہ فطرت نے اسے شاعری کے لئے پیدا کیا ہے' چنانچہ ایک مرتبہ وہ پھر ویمر میں آیا' تاکہ اپنے عزائم کو بار ور ہوتا دیکھے۔ اس نے ڈیوک سے کہہ کر دفتری تفکرات سے آزادی حاصل کر لی اور ادب کی خدمت کے لئے تیار ہو گیا۔

(ہمایوں (لاہور)' بابت دسمبر 1929ء' ص 900)

حصّہ سوم

پیغام مشرق .... "مغربی دیوان" کا جواب	چوہدری محمد حسین	509
پیام مشرق	سید سلیمان ندوی	523
پیام مشرق	مولانا محمد اسلم جیراجپوری	525
پیام مشرق	غلام رسول مہر	548
پیام مشرق	ڈاکٹر آر۔ اے۔ نکلسن مترجم: ڈاکٹر عبداللہ چغتائی	554
پیام مشرق	ڈاکٹر عبداللہ چغتائی	571
پیام مشرق	ڈاکٹر عبدالشکور احسن	575
پیام مشرق	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی	605
پیام مشرق (ایک مطالعہ)	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	610
پیام مشرق پر ایک نظر	ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ	621
پیام مشرق .... اقبال کا فارسی دیوان	رحیم بخش شاہین	633

چوہدری محمد حسین

پیغام مشرق

اقبال کے تخیل کی نئی فضاؤں میں پرواز

جرمن کے مشہور حکیم و شاعر گوئٹے کی کتاب "مغربی دیوان" کا جواب

اٹھارہویں صدی عیسوی میں جرمنی کی حالت اور گوئٹے

فطرت نے ہر فرد کو ایک ضمیر عطا کیا ہے، مگر ایسے مقصود خاص فرد کو فطرت صدیوں بعد پیدا کرتی ہے، جسے ایک ابدی و آفاقی ضمیر کا محمل و امین بنانا متصور ہوتا ہے۔ یوں کہو کہ فطرت سالہا سال تک اپنی خاص قیمتی جوہر پیدا کرنے والی قوت مولدہ کو جمع کرتی اور ذخیرہ کرتی رہتی ہے، تاکہ اس کے اس اپنے عمل جمع یا اس کے سابقہ و موجودہ پیدا کردہ قویٰ و اعضا کے مسلسل صرف و اضمحلال سے اجتماع بشری ایک خاص وقت تک پہنچ کر اس حد تک ست و کمزور اور افسردہ و مضمحل ہو جاتا ہے کہ جب تک حیات کے سوز و اضطراب کی ایک نئی رو دوڑائی جائے، اس کی اقدامی حرکت کے درجہ سکون تک پہنچ جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ اس لئے حسب ضرورت و اہمیت مرسلین، ملہمین، حکما، شعرا ضعف و انحطاط زندگی کے ان مخصوص زمانوں میں پیدا ہوتے ہیں (یا پیدا کئے جاتے ہیں) اور بقدر حوصلہ و ہمت سمند

حیات کو اپنی اپنی مہمیز سے سبک خرامی پر آمادہ کرتے ہیں۔

جرمنی کا شہرہ آفاق حکیم و شاعر گوئٹے 1749ء میں جرمنی کے ایک شہر "فرینکفرٹ آن مین" میں پیدا ہوا۔ ذلت و انحطاط کا جو زمانہ جرمنی نے اٹھارویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف اور انیسویں صدی کے آغاز میں دیکھا' وہ شاید دنیا کی بدنصیب سے بدنصیب قوم کے پیش نہ آیا ہو گا۔ جس محکومی اور غلامی کی زنجیروں میں اہل جرمنی اس زمانہ میں جکڑے گئے' جس قعر مذلت میں اس عرصہ میں گرے' تاریخ کوئی ایسا دوسرا عہد بطور شہادت پیش نہیں کر سکتی' جس میں یہ لوگ اس سے بڑھ کر صید آفات و مصائب ہوئے ہوں۔ ان کے فاتحین یعنی فرانسیسیوں کا خیال ان کے متعلق یہ نہیں تھا کہ یہ "انسان" ہیں' بلکہ وہ انہیں "غلام" متصور کرتے تھے۔ غلامی آج بھی ربع مسکون کے سینکڑوں گوشوں میں مخلوق خدا کو بندہ ما سوا بنا رہی ہے۔ تاہم "تہذیب" کی "ترقی" نے لفظ غلام کے معنی کچھ بدل دیئے ہیں۔ جو مفہوم اس نامبارک لفظ کا اس زمانہ تک تھا' اس کے مطابق واقعی غلام انسان نہ تھے اور جن لوگوں پر اس لفظ کا اطلاق تھا' وہ اگر حیوانوں سے رتبہ میں کچھ زیادہ تھے' تو صرف اسی قدر کہ ان کی شکلیں اور صورتیں انسانوں کی تھیں۔ گوئٹے کی شہرت سن کر جب نپولین نے گوئٹے کو اپنی خدمت میں بلایا' تو اسے دیکھتے ہی پرلے درجہ کے حیرت آمیز تعجب کے ساتھ بے اختیار بول اٹھا کہ "ہیں! یہ تو انسان ہے۔ جرمن نہیں۔" گویا جرمن ہو کر "انسان" ہونا بہت ہی بعید از قیاس تھا۔ جرمنوں کا انسانیت کے دائرہ سے اخراج کس کوتاہی' کس کمی' کس گناہ کی بدولت ہوا؟ دل کہتا ہے کہ وہ کوتاہی ہمت و استقلال کی کوتاہی ہو گی۔ ضمیر کہتا ہے کہ وہ کمی صداقت و ایمان اور خود شناسی و خود داری کی کمی ہو گی۔ روح کہتی ہے کہ وہ گناہ عدم ایثار و عدم ذوق شہادت کا گناہ ہو گا' مگر اس گئے گذرے اور اس حد تک گئے گذرے زمانہ میں جبکہ ساری کی ساری قوم غلاموں کی قوم تھی' نہ کہ انسانوں کی۔ قدرت اپنا کرشمہ دکھائے بغیر نہ رہی۔ فطرت اپنا معجزہ آشکار کرنے سے باز نہ آئی۔ چند لمحوں کا تفکر' چند ساعتوں کا تصور کافی ہو گا۔ اس عظیم الشان ہستی کی کچھ تھوڑی سی حقیقت و عظمت آنکھوں کے سامنے لانے کے لئے جو اگرچہ اسی اسفل و ارذل گروہ کا ایک فرد تھا' مگر نپولین اعظم جیسا' "انسان" نپولین اعظم جیسا "مرد" اسے دیکھتے ہی بے ساختہ "انسان" اور "مرد" کہنے پر مجبور ہوا۔

گوئٹے کن کمالات کا مجسمہ تھا۔ کونسے علوم و فنون کا سرچشمہ تھا۔ فطرت نے اپنی مختلف قوتیں کس حد تک اس فرد میں ودیعت کی تھیں۔ اس کے ذہن رسا کی پرواز حکمت کی کن بلندیوں تک تھی۔ اس کی کیفیات روحانی زندگی کے حقائق و نکات کی عقدہ کشا تھیں۔ اس کے جذبات و افکار تھے یا کسی بالا تر ہستی کے نازل کئے ہوئے الہامات۔ یہ سوال ہیں جن کے جوابات لکھنے کے لئے کتابیں کیا' دفتر ہوں تو کافی نہ ہوں۔

ادب' شعر' فلسفہ' دیگر فنون لطیفہ کے زمانہ حال کے نقاد اس فیصلہ میں متفق الرائے ہیں کہ گوئٹے کے بعد فطرت نے آج تک گوئٹے سا وسیع النظر طباع حکیم و سخن طراز پیدا نہیں کیا۔

گوئٹے جوں جوں عمر میں بڑھتا گیا' قوم کی مذہبی' اخلاقی' تمدنی' سیاسی کمزوریاں روز افزوں پیش نظر ہوتی گئیں۔ جب قوم کے زوال و ذلت کے جگر پاش مناظر سینہ میں سارے جہاں کا درد بن کر بیٹھ گئے' ہم جنسوں اور ہم قوموں کو محکومی و غلامی کی زنجیروں میں بے کس و بینوا دیکھنے کی تاب لانے سے رہ چکا' تو بے تابانہ راز حیات کے حریت آموز نغمے الاپنے لگا۔ پھر کیا تھا۔ درماندہ و افسردہ دل تڑپ کی لذت سے آشنا ہو گئے۔ بے حس و حرکت روحیں ذوق اضطراب پا کر عرصہ عمل میں جولانیاں دکھانے پر آمادہ ہو گئیں اور پھر کیا کیا جولانیاں دکھائیں۔ قریباً دو سو سال کے بعد وہ آج اس زمانہ میں ہم نے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھیں یا کم از کم ہمارے کانوں نے سنیں۔

فطرت کا یہ طلسم حقیقتاً بڑا محیر العقول ہے۔ قلزم حیات حقیقی خشک ہوتے ہوتے جب سراب رہ جانے کو ہوتا ہے' اس کی تہ سے ریگ کے ذرات میں سے یک دفعہ ایک گوہر تابندہ نمودار ہوتا ہے اور اپنی حیات آفریں آب و تاب سے سراب زندگی کو آناً فاناً پھر سے آب حیات کے سمندر میں متبدل کر جاتا ہے۔ "غلام" "انسان" بن جاتے ہیں۔ زندگی نئی زندگی اختیار کرتی ہے۔

گوئٹے کی سب سے اعلیٰ اور اہم تصنیف جس نے جرمنی کے افراد کو افراد اور قوم کو قوم بنایا' اس کا وہ مشہور و معروف ڈراما ہے' جس کا نام "فوسٹ" ہے۔ یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ جرمنی کے لوگ اس کتاب کو الہامی تصور کرتے ہیں۔ عقیدتاً" ضرور ایسا مانتے ہیں۔

گوئٹے اور حافظ شیرازؒ

نپولین کے حملوں اور اس کی حکومت کے جبر و استبداد سے پامال ہونے پر جب جرمنی کی حالت اسقدر ناگفتہ بہ ہو گئی کہ گوئٹے کے پرسوز و حکمت آموز ترانوں پر کان دھرنا لوگوں کو مشکل ہو گیا اور خود گوئٹے کے لئے ایسی "حکمت" سیدھی اور صاف زبان میں سکھانا آسان نہ رہی، تو قدرت نے ایک نرالے طریق سے اپنے فرستادہ کی مدد کی اور جو کام اس سے اس حالت میں بھی لیتے رہنا مقصود تھا، وہ مسلسل لیتی رہی۔ اپنے اصلی و قدرتی مغربی انداز میں لکھنے سے گوئٹے اکتانے ہی کو تھا کہ 1812ء میں جرمنی کے ایک دوسرے ادیب و شاعر نے "دیوان حافظ" کا ترجمہ جرمن زبان میں شائع کر دیا۔ گوئٹے نے جونہی اسے دیکھا اور پڑھا، حافظ کا انداز ترنم باوجود اس امر کے کہ اب اس کے ساتھ فارسی زبان کی وہ شیرینی اور سحر طرازی نہ رہی تھی، اس کی طبیعت پر فوراً اثر کر گیا اور اس نے اسی وقت یہ ارادہ کر لیا کہ وہ خیالات جن کا اظہار اب پرانے انداز میں موثر نہیں رہا، حافظ کے تتبع میں جادو کا اثر دکھائے گا۔ جدت طرز ادا بجائے خود لوگوں کو جاں فزا نغموں کی طرف کھینچے گی اور جو مقصد فوت ہوتا نظر آتا تھا۔ زندہ تر ہو کر قوم کے مردہ افراد کو زندہ کرتا رہے گا۔

گوئٹے نے نہ صرف حافظ سے غزل کا انداز ہی لیا، بلکہ سینکڑوں لطیف اور نازک معانی و حقائق استفادہ کئے، مگر پھر بھی خذما صفا کی حد سے آگے نہ بڑھا۔ مضامین اور ان کی سپرٹ وہی قائم رکھی، جو اس کی اپنی تھی۔ ترنم و سوز حافظ سے لیا اور پھر ایک بار اس ہمدردانہ بیدردی سے قوم کو نئے سرود اور نئے انداز سے تڑپایا کہ حیات حقہ کے حصول کے لئے ان میں پہلی سے دگنی سعی و قوت عمل کی آگ بھڑک اٹھی۔ پانچ چھ برس میں یہ نظموں یا غزلوں کا مجموعہ تیار ہوا۔ "ویسٹ آسٹلشر دیوان" یا "مغربی دیوان" کے نام سے اسے موسوم کیا اور 1819ء میں مکمل و مرتب کر کے شائع کر دیا۔ کتاب کے اس نام میں جو مفہوم مضمر تھا، وہ بھی یہی تھا کہ مغرب اس وقت قسمت کے چکروں میں ہے۔ فساد و فتنہ کا گھر ہے۔ بداخلاقی و بدنظمی میں مبتلا ہے۔ ظلم و استبداد کے تیروں کا نشانہ ہے اور اپنے ہمدرد مشرق کی طرف اپنی غم و اندوہ کی داستان اسی کے انداز بیان میں سنانے کو متوجہ ہوتا ہے۔

تاریخی اعتبار سے اس زمانہ میں مشرق کا انحطاط شروع تھا۔ تاہم وہ حالت نہ تھی، جو

اس کی اب ہے یا جو اس وقت مغرب کی تھی۔

اقبال اور مشرق کی موجودہ حالت

مشرق کی جو حالت اس زمانہ کے بعد ہوئی' اسے قلم بند کرنا سوائے اس کے نہیں کہ انہیں الفاظ کا اعادہ کر دیا جائے' جو جرمنی یا مغرب کے متعلق اوپر لکھے جا چکے ہیں۔ طوالت مضمون کا ڈر مانع تفصیل ہے۔ ورنہ بنظر غائر دیکھا جائے تو بحیثیت مجموعی صورت حالات بدرجہا بدتر ہو گئی۔ کونسا ملک تھا' جو غلامی و محکومی کی بند و قید سے آزاد رہا۔ کونسا صوبہ تھا' جہاں بدامنی نے ہلاکت نہیں ڈھائی۔ کونسا شہر و قصبہ تھا کہ قحط و مصائب کی زد میں نہیں آیا۔ کونسا گھر ہے' جہاں غربت و افلاس نے پرورش نہیں پائی۔ پھر ان سب سے بڑھ کر خانہ جنگیوں نے جو خانہ بربادیاں کیں' ان کا بیان احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ تمام مشرقی اقوام و ملل آپس کے نفاق اور دشمنی کی لعنتوں میں گرفتار ہو گئیں۔ دوسرے معنوں میں اخلاقی' تمدنی' سیاسی اعتبار سے افراد کیا اور اقوام کیا' سب ننگ زیست ہو گئے۔ سب افراد اصل انسانی حیثیت سے مسخ ہو چکے۔ گویا "غلام" تھے' گو غلام کہلاتے نہ تھے۔

دنیا میں جنگ عظیم برپا ہوئی۔ سینکڑوں سوئی ہوئی کلیں جاگ اٹھیں۔ مگر ان اقوام کی رفتار وہی تیلی کے بیل کی رفتار رہی' وہی ہنوز آنجائی کا قصہ ؎

خزاں رسیدو کسے آشنائے عیش نہ شد
بہار ہمچو غریباں ازیں دیار گذشت

مگر فطرت جو کرشمے مغرب میں دکھا سکتی ہے' مشرق میں دکھانے سے قاصر نہیں۔ زندگی کی نگاہوں میں مغرب و مشرق کی کوئی تمیز نہیں۔ مغرب میں گوئٹے سا نغز گو اگر مردہ جانوں میں سوز کی لہر دوڑا سکتا ہے' تو مشرق میں اقبال سا نباض حیات ہر بے خود و بے جان کو خودی اور زندگی کی لذت سے آشنا کرنے کو تیار ہے اور کر رہا ہے۔

مشرق کی یہ مہتمم بالشان ہستی جس سے فطرت کو سینکڑوں گنا زیادہ وہ کام لینا ہے' جو اس نے گوئٹے سے لیا۔ خدا ہی کے علم میں ہے کہ اپنی انتہائی تکمیل میں کن کارناموں کی مالک ہو گی۔ جو کارنامے یہ ہستی اب تک دکھا چکی ہے۔ حقیقت کے جو نئے اسرار پردۂ مجاز کو اٹھا کر اب تک انسانی آنکھوں کے سامنے لا چکی ہے' حکمت کے آفتاب کو افق پر نمودار

کر کے مشرق کو جس حد تک صحیح معنوں میں مشرق بنا چکی ہے۔ از خود رفتگاں کو جس قدر با خود و خود دار بنا چکی ہے' سوز و گداز کے نغموں سے زندگی کے قلزم میں جو ہیجان و طوفان برپا کر چکی ہے' اس کی تشریح و تنقید کے لئے نہ ہی یہ جائز محل ہے اور نہ ہم اس داستان کو یہاں چھیڑنا چاہتے ہیں۔ تخاطب اہل نظر اصحاب سے ہے۔ شپرہ چشموں کو ہستی آفتاب کے قائل کرنے کے ہم اہل نہیں۔ جن واقعات نے ہمیں خاص طور پر انگشت بدنداں کر رکھا ہے' وہ محض فطرت کے طریق عمل کا مطالعہ ہے۔ اقبال کے درد و سوز کا گوئٹے کے درد و سوز سے مقابلہ نہیں۔ اقبال کے محرم راز حیات ہونے کا گوئٹے کے شناسائے رموز زیست ہونے سے موازنہ نہیں۔ اقبال کے محاسن حکمیہ و شعریہ کا گوئٹے کے کمالات عقلیہ و علمیہ سے توارد نہیں۔ جو بات اس تطابق کو حیرت کے انتہائی درجہ تک لے جانے والی ہے' وہ یہ ہے کہ اگر فطرت نے ایک بادشاہ کو گوئٹے کو 'انسان' یا 'مرد' کہنے پر مجبور کیا' تو آج اقبال نے بھی حکومت کی طرف سے "انسان اور مرد" کا خطاب پایا اور خدا گواہ ہے کہ ہماری آنکھوں میں خطاب "سر" کے دیئے جانے کے اس کے سوا اور کچھ معنی نہیں۔

گوئٹے اور اقبال

وحی الٰہی جب بھٹکے ہوئے بندوں کی طرف بواسطہ رسول بھیجی جاتی ہے' تو اس کا پہلا مقصد فرد کی اصلی شخصیت کو قائم کرنا ہوتا ہے۔ دوسرا افراد کے مجموعہ یعنی قوم کو اس کے حقیقی نصب العین کا پتہ دینا اور تیسرے اس نصب العین تک پہنچنے کے لئے زندگی کے آئین و اصول وضع کرنا۔ تمام کامل اور اعلیٰ منصب کے انسانوں یعنی حضرات مرسلین و انبیا نے بھی فرائض ادا کئے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ دوسرے رتبہ کے افراد یعنی ملہمین اور حکما و شعرا نے انہیں مقاصد کی تائید تاسیس کس حد تک کی ہے۔ ان میں سے جس جس نے اپنا مطمح نظر اسی بہبودی بنی نوع کو قرار دیا ہے اور جو حیات انسانی کو محکم و استوار کرنے میں (نہ کہ اس کو کمزور و ناتواں کرنے میں) تھوڑا بہت کامیاب ہوا ہے۔ وہ بیشک قابل احترام ہے اور نوع کا محسن' لیکن جو اس معیار پر صحیح نہیں اتر سکتا' وہ محض مدعی ہے اور مقصد حیات سے ناآشنا۔

دوسرے رتبہ کے حضرات کے مدارج کو کماحقہ سمجھنے کے لئے یہ لازمی ہو گا کہ پہلے یہ

امر ذہن نشین کر لیا جائے کہ الہام اور حکمت اور شعر کو وحی سے کیا نسبت ہے۔ اگرچہ یہ مضمون میری استعداد و قابلیت سے بالا تر ہے۔ تاہم تسلسل بیان کی خاطر اتنا عرض کر دینا کوئی بے محل جرأت نہ ہو گی کہ شعر زندگی کی ایک تڑپ ہے۔ ایک جذبہ ہے۔ ایک شرر ہے' جو زندگی کے اپنے ہی بہترین و منزہ ترین حاصل تعمیر' خدا کے گھر یعنی انسانی دل سے بہ لباس صوت باہر ٹپکتا ہے اور فضائے بیرونی میں قرار نہیں پکڑتا' جب تک کہ دوسرے دلوں میں جا کر دل نہیں بن جاتا یا پھر عین زندگی نہیں ہو جاتا۔ بحر ہستی کی تمام روانیاں' اس کی تمام طغیانیاں ہستی کے اسی شرر اسی اضطراب سے پیدا ہیں۔ یہ نہ ہو تو یہ بحر منجمد ہو اور جب تک یہ نہ تھا' یہ بحر واقعی منجمد تھا۔ زندگی کا یہ کیف اضطراب فطرتاً اپنے عدم سے وجود میں آنے کے لئے ایک دوسرے سوز کو اختیار کرتا ہے یعنی صوت کو' جسے عرف عام میں موسیقی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو چیز شعر و موسیقی میں رشتہ قائم کرتی ہے' اسی کا نام موزونیت ہے۔ ہر ملک اور ہر قوم کے شعر و موسیقی نے باعتبار زبان و ماحول الگ الگ موزونیت اختیار کی ہے۔ موزونیت پر حدود و قواعد کی ٹھوس قیدیں فطرت کو اپنے کرشمے دکھانے سے روکنے کی بودی تدبیریں ہیں۔ جن میں مدعیان ناقص کامیابی کا کبھی منہ نہیں دیکھ سکتے۔ حکمت کمال علم و کمال عمل کے مجموعہ کا نام ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک جستجوئے صداقت ہے۔ گو عین صداقت نہیں۔ وحی' شعر و حکمت دونوں پر حاوی ہے اور دونوں کے کمالات کا مجموعہ۔ وحی میں جو بات بالخصوص ممیّز ہے' وہ اس میں صداقت حقہ کا جوہر ہے' جس میں حیات حقیقی کا تمام تر دار و مدار ہے۔ وحی کا حامل اس صداقت میں بدرجہ اتم ایقان و ایمان رکھتا ہے۔ "لا ریب فیہ" وحی کے ہر جملے' ہر لفظ' ہر حرف کی شان ہوتی ہے۔ پس جو فرق عین صداقت و جستجوئے صداقت میں ہے' وہی فرق مرسل و حکیم میں ہے۔ یہی نور صداقت جس آتشی لباس میں خدا کی طرف سے آراستہ کر کے عطا کیا جاتا ہے' اسی کا نام شعریت ہے۔ صداقت کاملہ لاینفک ہے۔ محض شاعر کبھی کامل شاعر نہیں ہوتا۔ بعینہٖ اسی طرح محض حکیم کبھی کامل حکیم نہیں ہوتا۔ شاعر کی بھی حامل وحی سے وہی نسبت ہے' جو حکیم کی ہے۔ صرف پہلو دوسرا ہے۔ بغیر محدود وحی ہونے کے شاعر شعریت حقہ کا مالک نہیں ہو سکتا' بلکہ انہیں الفاظ میں جستجوئے شعر میں سرگرداں رہتا ہے۔ لہٰذا جو فرق عین شعریت و جستجوئے شعریت میں ہے' وہی ایک حامل وحی و شاعر میں ہو گا۔ گویا شعر و حکمت وحی کے دو ایسے اہم

خواص ہیں، جو محض شاعر و محض حکیم میں اپنے کمال کو نہیں پاتے۔ شعر و حکمت بلا تکلف قلب انسانی پر نازل و وارد ہوں، مگر ان کے اندر کی صداقت انتہائی صداقت کا درجہ نہ رکھتی ہو یا مشتبہ ہو، تو اسے الہام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ پایہ کا شاعر، اعلیٰ پایہ کا حکیم عموماً ملہم ہوتا ہے۔

وحی، الہام، شعر، حکمت کی جو تعریفیں لکھی گئی ہیں، ان کے جانے بغیر گوئٹے اور اقبال کا سمجھنا یا ان کے شعر و سخن کی قدر و منزلت کا اندازہ لگانا محال محض ہے - دیکھنا یہ ہے کہ کس قدر ملہم یا حکیم یا شاعر دنیا میں ایسے ہوئے، جو اس معیار پر صحیح اتر سکتے ہیں اور اصل الہام یا حکمت یا شعریت ان کے حصہ میں آئی۔ الگ الگ ان خواص کے مالک شاید بہت نکل آئیں۔ ہماری ناقص رائے میں ایسے بہت کم ہوں گے، جو ان ہر سہ کمالات کے مالک ہوں۔ شیکسپئر، دانتے اور مولانا روم کے سوا اگر کوئی اور دو ہستیاں اس شمار میں آ سکتی ہیں، تو وہ اٹھارہویں صدی میں گوئٹے تھا اور آج بیسویں صدی میں اقبال۔

قوم کی ذلت، قوم کے دکھ، قوم کے انحطاط کو دیکھ کر جو درد گوئٹے کے دل میں اٹھا، اس سے سو گنا زیادہ درد آج ایشیائی اقوام کی حالت دیکھ کر اقبال کے دل میں اٹھا۔ بنی نوع کو غلامی کی جس پستی سے نکال کر حریت کی بلندی پر پہنچانا گوئٹے کی قسمت میں تھا، اس سے پست تر پستی سے نکال کر بلند تر بلندی پر بنی نوع کو لے جانا اقبال کے حصہ میں ہوا۔ جس مرد خدا کو تمام دنیا کے لٹریچر پر یا کم از کم جرمنی اور ہندوستان کے لٹریچر پر یکجا تبصرہ کی توفیق ہو گی، وہ ان دونوں ہستیوں کے صحیح جوہروں کو اندازہ کرنے اور ان پر قطعی رائے دینے کا مجاز ہو گا۔ کئی اور موضوعوں کی طرح میری طاقت سے یہ موضوع بھی باہر ہے کہ میں اس مضمون کے سلسلہ میں اس پر قلم اٹھاؤں۔ ہاں اتنا کہنے سے نہیں رک سکتا کہ فطرت نے دونوں کو ایک ہی جوہر سے پیدا کیا ہے۔ کمیت میں تفاوت ہو تو ہو، کیفیت میں فطرت نے دونوں کو ایک ہی سا احساس، ایک ہی سا درد دل، ایک ہی سا سوز و گداز، ایک ہی سی فکر بلند، ایک ہی سی بالغ نظری، ایک ہی سا ضمیر جہاں نما عطا کیا ہے۔ دماغی، عقلی، روحانی موازنوں کو چھوڑ کر میرا خیال ہے کہ دونوں کی روزانہ زندگی کا مطالعہ اس راز کا منکشف ہو گا کہ قوائے باطنی کے یکساں ہونے کی بنا پر دونوں کے عام اخلاق و محاسن دنیوی بھی ایک ہی قسم کے ہوں گے۔ خدا کے پیغمبروں کو خدا کے "شاگردوں" پر ہر پہلو سے فوقیت ہے، مگر

اس پایہ کے شاگردوں پر قدرت بھی اگر ناز کرے' تو بجا ہو گا۔ ایسی ہستیوں کا پیدا کرنا اس کی قوت اعجاز کے طلسم ہیں۔ پیغمبروں کو براہ راست وحی عطا کر کے خدا انہیں دماغ سوزی کی زحمت سے بچا لیتا ہے۔ اس کے عوض ان کے دلوں میں قوت ارادی شدت کے ساتھ بھر کر ان کو اس قابل بنا دیتا ہے' کہ دنیا کے تختے اپنے ہاتھوں الٹ دیں۔ حکیم یا شاعر محروم وحی ہونے کے سبب دماغی کاوشوں سے فرصت کم پاتے ہیں۔ قوت ارادی از خود کم ہو جاتی ہے اور عملی راہنمائی سے اپنے ہاتھوں دنیا میں انقلاب پیدا کرنے سے بسا اوقات قاصر رہ جاتے ہیں۔ گویا حکما و شعرا بہت حد تک فطرتاً میدان عمل میں باہر نکلنے سے مجبور ہیں۔ وہ صرف فطرت کے حکمت و شعر پیدا کرنے یعنی زندگی اور اس کا سوز پیدا کرنے کے آلے ہیں' جن سے نکل نکل کر زندگی عوام میں سرایت کرتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ عوام میدان عمل میں گرم رفتاری پر آپ کو مجبور پاتے ہیں۔

حاصل کلام مغرب کی ذلت گوئٹے کو گوارا نہ ہوئی۔ اس کی فطرت نے ذلت کے خلاف بغاوت کی۔ آج مشرق کا انحطاط اقبال کو ناگوار ہوا۔ اس کی فطرت اس انحطاط کے خلاف برسرپیکار ہے۔ گوئٹے نے مغرب کی ذلت کے احساس کو مشرق تک پہنچانا چاہا اور "مغربی دیوان" لکھ کر دل کی بھڑاس نکالی۔ اقبال نے آج مشرق کے انحطاط سے مغرب کو روشناس کرنے پر کمر باندھی ہے' بلکہ خود مغرب کو رو بہ انحطاط ہونے کی تنبیہ کرنے کی ٹھانی ہے اور "پیام مشرق" لکھ کر دل کے بخار نکالنے والا ہے اور مجھ کو بطور اعلان اس جگہ یہ کہنا ہے کہ یہ تمام مضمون "پیام مشرق" ہی کے عنقریب شائع ہونے کا پیام ہے۔

اقبال اور حضرت حافظ شیرازؒ

ایک جملہ معترضہ ذہن میں آیا۔ کہے دیتے ہیں' کیونکہ گفتنی ہے۔ "اسرار خودی" کے پرانے معترضین جنہوں نے اس نادر و جدید مجموعہ حکمت و شعر کی قدر تو کیا کی' شعر حافظ کی تنقید پر بے سوچے سمجھے چراغ پا ہو گئے۔ کیا آج بتائیں گے کہ گوئٹے کا "دیوان حافظ" کے جواب میں "مغربی دیوان" لکھنا اور آج گوئٹے کے جواب میں اقبال کا "پیام مشرق" لکھ کر روح حافظ کی طرف سے جواب دینا خود حافظ علیہ الرحمہ کی کرامت ہے یا اقبال کی طرف سے حافظ کی خدمت میں اصلی قدر دانی کا تحفہ؟ شاید کرامت کہہ دینا نہایت

آسان ہو گا۔ ہم جب جانیں اگر سخن فہم و نکتہ شناس بن کر اس قدر دانی کی اہمیت کا اندازہ لگائیں۔

پیام مشرق

بڑی مشکل سے ہم شرح پیام شوق تک پہنچے ہیں' مگر پہنچنا آسان بھی نہ تھا۔ علامہ اقبال کی تازہ ترین تصنیف جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے' الحمد للہ کہ ترتیب پا چکی ہے اور اس کا پہلا حصہ کاتب کے پاس لکھنے کو جا چکا ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ دو مہینہ کے اندر اندر چھپ کر شائع ہو جائے گا۔

یہ جرأت بڑی بے محل اور قبل از وقت ہو گی' اگر ہم اس مقام پر جب کہ کتاب ابھی زیر طبع ہے' اس کے خواص و محاسن کو زیر بحث لائیں اور ان نوزائیدہ افکار کے جواہر ریزوں کو پرکھنے کی نگاہ سے دیکھیں۔ تصنیف کے تمام مضامین کو خود مصنف سے پڑھ کر اور اس کے بعد سب کو یکجا پیش نظر رکھ کر باوجود میری علمی بے بضاعتی کے جو شعر اس تصنیف کی ایک غزل کا میری زبان پر ہر وقت جاری ہے' وہ یہ ہے:

نگاہ می رسد از نغمہ دل افروزے
بہ معنی کہ برو جامہ سخن تنگ است

نغمے اور ان کی دل افروزیوں کو ایک طرف چھوڑتے ہوئے وہ معانی جن کو باوجود تنگی جامہ سخن کے حضرت اقبال نے پر سحر کلام کے لباس میں آراستہ کیا ہے' ان کا تعلق عموماً زندگی کے بڑے اہم ترین مسائل سے ہے۔ ناظرین کو کتاب کی خصوصیات و خیالات سے تھوڑا بہت روشناس کرنے کے لئے اجمالی طور پر اس کے مضامین کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کتاب تمام کی تمام فارسی زبان میں ہے اور نظم میں یہ دیوان چار مختلف حصوں پر مشتمل ہو گا' جن کے الگ الگ مستقل نام ہونگے۔ حصص کتاب و مضامین کی تقسیم قریباً قریباً حسب ذیل ہے:-

حصہ اول : رباعیات۔ زندگی کے مختلف دقیق اور نازک پہلوؤں پر حکیمانہ نظر ڈالتے ہوئے شاعر نے ہزاروں تابدار جواہر افکار کو ڈیڑھ سو رباعی کی شکل میں رکھ کر ایک بزم انجم قائم کی ہے۔ بڑے بڑے گہرے مسائل حکمیہ کو شعر کے طلسم و تاثیر سے عام انسانوں کے

افہام و اذہان کے قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ مسائل مجملاً" اس قسم کے ہیں : حیات جاوید کیا ہے۔ حاصل کس طرح ہو سکتی ہے۔ فنا و بقا کیا ہیں۔ انسان اور اس کی حقیقت کیا ہے۔ خدا کی ذات و صفات کے کیا معنی ہیں۔ آرزو کیا ہے۔ جہاں میں اس کے کیا کیا کرشمے ہیں۔ عشق کیا ہے۔ عقل کیا ہے۔ انسان ان دونوں سے متاثر کس طرح ہوتا ہے۔ زوال کیا مصیبت ہے۔ انقلاب کی کیا حقیقت ہے۔ زندگی مادہ کے لباس میں کیا کیا نیرنگیاں دکھاتی ہے۔ غرض بے شمار حقائق و معارف ہیں' جن پر احصا اس مقام پر مشکل ہے۔

حصہ دوم : **قطعات**۔ ڈیڑھ سو کے قریب مختلف نظمیں ہیں۔ حیات انسانی کے ہزار ہا اسرار و غوامض ان میں بتائے گئے ہیں۔ ہر لفظ میں نغمہ کی بدولت زندگی کا وہ سوز اور وہ تڑپ ہے کہ صفحہ قرطاس پر ہر نقش زندہ نظر آتا ہے۔ مغرب کی تمام موجودہ تہذیب کی حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔ عقل و سائنس کی ایجادوں اور کارناموں کی قلعی کھولی ہے۔ غلبہ عقل و شکست عشق نے دنیا کو جس پستی میں گرایا ہے' اس کا نقشہ کھینچ کر دکھایا ہے۔ اخلاقی زیست کے زشت ونکو بہترین سے بہترین پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔ خدا اور انسان کے تعلق کی باتیں بتائی ہیں۔ شعر و حکمت' علم و عمل کی حقیقتیں واضح کی ہیں۔ بتایا ہے کہ مشرق و مغرب کے متقدمین و متاخرین حکما کی عقلوں نے کہاں کہاں تک پرواز کی۔ شعرا نے زندگی کو کیا سمجھا۔ آفرینش عالم اسباب سے کیا غرض و غایت مقصود ہو سکتی ہے۔ انسان مادہ کو کس طرح مسخر کرتا جاتا ہے۔ وقت کی کیا حقیقت ہے۔ مکان و لامکاں کے معنی کیا ہیں۔ حکومت' غلامی' حریت کیا شعبدے ہیں۔ کس طرح دنیا میں عمل کرتے ہیں۔ سیاست حاضرہ کس فن کا نام ہے۔ کمزور اقوام اس کی کیوں مسحور ہیں۔ سرمایہ و محنت کی موجودہ جنگ کیوں ہو رہی ہے اور کیا کیا نتائج دکھائے گی۔ اس طرح مضامین کا گننا تو بہت دشوار ہے۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس حصہ کے نہایت اہم اور چیدہ مضامین کی ایک مختصر فہرست دے دی جائے۔ مسائل حیات و آفرینش پر جو نظمیں ہیں' ان کے عنوان یہ ہیں :

عشق' دنیائے عمل' زندگی' حکمت و شعر' زندگی و عمل' الملک للہ' اگر خواہی حیات اندر خطرزی' تہذیب' محاورہ مابین خدا و انسان' علم و عشق' حیات جاوید' بہشت' تسخیر فطرت (اس بے نظیر و جان بلاغت نظم کے پانچ حصے ہیں۔ (1) میلاد آدم (2) انکار ابلیس (3) اغوائے آدم (4) آدم از بہشت بیروں آید و باخویش میگوید (5) صبح قیامت' آدم در حضور باری۔ اس

قصہ کو دنیا کے بڑے بڑے الوالعزم انبیا نے بیان کیا ہے اور بڑے بڑے شعرا نے اس پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ناظرین دیکھیں گے کہ اقبال کے حکمت و سرود اس کی کیا توجیہ کرتے ہیں اور اس قصہ کے کیا معانی بتاتے ہیں' نوائے وقت' غلامی وغیرہ

مغرب : اس کی تہذیب اور حکمائے مغرب کے فلسفہ و حکمت کے متعلق حسب ذیل نظمیں ہیں :

شوپن ہار و نٹشا' ہیگل' نٹشا' پیام بدانایان فرنگ' میخانہ فرنگ' طیارہ' خطاب بہ انگلستان' خرابات فرنگ' جلال و ہیگل' حکیم فرنسوی و مرد مزدور' پیام برگساں' جلال و گوئٹے' قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور' پٹوفی (شاعر ہنگری)' صحبت رفتگاں در عالم بالا (ٹالسٹائے۔ کارل مارکس۔ ہیگل۔ مزدک۔ کو ہکن)' حکیم آئن سٹائن' موسیولینن و قیصر ولیم' جمعیت اقوام' بائرن وغیرہ۔

حسن فطرت و حقائق نمود حیات پر مفصلہ ذیل نظموں میں روشنی ڈالی گئی ہے :

بوئے گل' لالہ' شبنم' افکار انجم' فصل بہار' کشمیر۔

چند متفرق نظمیں بھی ہیں۔ مثلاً لسان العصر اکبر مرحوم' غنی کشمیری' خطاب بہ مبلغ اسلام در فرنگستان' خطاب بہ مصطفیٰ کمال' خطاب بہ امیر کابل' ساقی نامہ (در نشاط باغ کشمیر نوشتہ شد)۔

حصہ سوم : غزلیات۔ غزلیں عموماً مشہور اساتذہ عجم حافظ' سعدی' نظیری' عرفی' غالب وغیرہ کی شہرہ آفاق غزلوں کا جواب ہیں۔ مطلب یہ کہ زبان و انداز و سرود وہ ہے۔ مضامین دیکھنے' پڑھنے اور سمجھنے ہی سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ کاش یہ تمام اساتذہ آج زندہ ہوتے اور نقد و نظر کے بعد ہمیں بتاتے کہ ان غزلوں کی کیا قدر و قیمت ہے۔ خال ہندو پر سمرقند و بخارا بخشنے والے زلف اسلام کی ہندی مشاطہ کو سارے کا سارا عجم نذر میں پیش نہ کرتے تو صبر نہ آتا۔ موت پر سینکڑوں کہنے والے جاں گداز مرثیے کہہ گئے۔ نغمہ حیات کا سر بہت تھوڑوں نے چھیڑا یا آج تک کسی نے نہ چھیڑا۔ مقصد ان تمام غزلوں کا صرف ایک مطلع میں مضمر ہے اور وہ ہم سنائے دیتے ہیں ؎

بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم
غزل سرایم و پیغام آشنا گویم

ناظرین ہمارے ساتھ اس بات میں کم از کم اتفاق کریں گے کہ غزل سراؤں میں سے کسی نے آج تک غزل سرائی کے پردہ میں آشنا کی پیغام رسانی نہیں کی۔ پیغام رسانی کے لئے غزل سرائی ذریعہ کیوں اختیار کیا گیا۔ صرف اس لئے کہ اب تک بعض حلقے غزل کے سوا اور کسی انداز میں پیغام سننے کو تیار نہیں۔

حصہ چہارم: اگر ہوا تو اس میں چند متفرق نظمیں یا اشعار ہوں گے۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔ کتاب ناظرین تک ابھی نہیں پہنچی۔ اس لئے اس کے نص و نقد کو زیر بحث لانے سے ہم قاصر ہیں۔ صاحب نظر اصحاب سے التجا صرف اس قدر ہے کہ نظموں اور غزلوں کو پڑھتے وقت اس امر کا خیال رکھیں کہ زبان فارسی جس میں شاعر نے مطالب و معانی بیان کئے ہیں' بالکل وہی ہے جو اس کتاب سے قبل اور فارسی کی کتابوں میں موجود تھی یا اس میں ادائے اظہار خیال کے لئے بعض جگہ الفاظ کو نئے مفہوم دیئے گئے ہیں اور نئی نئی تراکیب کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس اضافہ کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ ایک ہندی شاعر نے جس نے کبھی فارسی مدرسہ میں نہیں پڑھی' یہ جرأت کس طرح کی اور ذوق سلیم کے بل پر اس جرأت میں کس طرح کامیاب ہوا۔ دیکھیں کہ کیا ان میں کوئی ایک ترکیب بھی ایسی ہو سکتی ہے' جو جب تک جگر خون ہو کر نہ بہہ جائے' وضع ہو سکتی ہو۔ ہم اردو زبان کو محدود و نامکمل کہتے تھے۔ اقبال کے افکار و مضامین کی فارسی بھی متحمل نہ ہوئی۔ شاید اس کے بعد وہ دن قریب ہوں کہ "دہن پر از عربی است" کا اعلان ہو جائے اور خدا بالآخر اقبال پر اپنی ہی زبان میں شعر کہنے کی توفیق عطا فرماوے۔

اتنے لمبے مضمون کے مطالعہ کی تکلیف دینے کے بعد ہم ناظرین کے لطف طبع کے لئے ان کی خدمت میں "پیام مشرق" کی تین رباعیاں پیش کرتے ہیں اور مضمون کو جناب علامہ کے ان حیات افروز نغموں پر ختم کرتے ہیں:

دمادم نقشہائے تازہ ریزد
بیک صورت قرار زندگی نیست
اگر امروز تو تصویر دوش است
بخاک تو شرار زندگی نیست

زجان بے قرار آتش کشادم
دلے در سینہ مشرق نہادم
گل او شعلہ زار از نالہ من
چو برق اندر نہاد او فتادم

گدائے جلوہ رفتی برسر طور
کہ جان تو زخود نامحرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن
خدا ہم در تلاش آدمے ہست

(رسالہ ہزار داستان (لاہور) جلد 2 نمبر 2 (فروری 1923ء)' ص 4-15- اقبال' چوہدری محمد حسین کی نظر میں' مرتبہ محمد حنیف شاہد' لاہور 1975ء' ص 125-144)

سید سلیمان ندوی

پیام مشرق

جرمنی کے ایک شاعر گوئٹے نے اپنے جس مجموعہ اشعار کا نام "مشرقی دیوان" رکھا ہے' مغرب کا مشرق پر اب تک یہ قرض چلا آتا تھا۔ ہمارا "مشرقی شاعر" اس قرض کے بار سے مشرق کو سبکدوش کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ جیسا ڈاکٹر اقبال صاحب کے والانامہ (بابت 14 مئی 1922ء) سے معلوم ہوا کہ انہوں نے گوئٹے کے جواب میں فارسی اشعار کا ایک مجموعہ لکھا ہے' جو عنقریب شائع ہو گا۔ اس کے دیباچے میں ڈاکٹر اقبال یہ دکھائیں گے کہ فارسی لٹریچر نے جرمن لٹریچر پر کیا اثر ڈالا ہے۔ ابھی گذشتہ دنوں مشرقی کانفرنس کلکتہ میں ڈاکٹر جیون جی جمشید جی نے تقریباً اسی موضوع پر ایک مضمون پڑھا تھا۔ امید ہے کہ ڈاکٹر اقبال کا قلم ان سے زیادہ سیراب کن ہو گا۔"

(معارف' اعظم گڑھ' بابت مئی 1922ء)

"ایک سال کا عرصہ ہوا کہ "معارف" نے یہ اطلاع شائع کی تھی کہ ڈاکٹر اقبال آجکل جرمن شاعر کے "مغربی دیوان" کے جواب میں ایک مشرقی دیوان مرتب کر رہے ہیں۔ ایک سال کے انتظار کے بعد "ماہ عید" پیام مشرق بن کر نظر آیا۔ "پیام مشرق" مختلف اوزان و بحور میں مواعظ و حکم اور حقائق و معارف کا ایک بحر ذخار ہے۔ یقیناً یہ ڈاکٹر اقبال کے دماغ و قلم کا شاہکار (ماسٹر پیس) ہے اور شاید اقبال بھی اس سے بہتر کبھی نہ کہہ سکیں گے۔ کبھی

موقع سے اس کے متعلق ہم اپنے مفصل خیالات پیش کریں گے۔"

(معارف، اعظم گڑھ، بابت جون 1923ء)

مولانا محمد اسلم جیراجپوری

پیام مشرق

ڈاکٹر اقبال کا یہ تازہ دیوان میں نے پڑھا۔ مجھے اس سے جو حظ اور لطف حاصل ہوا' وہ بیان سے باہر ہے لیکن بعض احباب کا اصرار ہے کہ میں اس کو تحریر میں لاؤں۔ اس لئے سرسری طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔ اس کو نہ تنقید سمجھا جائے نہ تفریظ۔

یہ دیوان جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے دیوان کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ جرمن زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے چوں کہ میں گوئٹے سے آشنا نہیں ہوں' اس لئے مقابلے کی جلوہ آرائی کا لطف نہیں اٹھا سکا' لیکن مشرقی شاعری کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ اس نے مغرب کو مخاطب کیا اور ایشیا کے سینے کی برقی حرارت یورپ کے برفستان میں پہنچانے کی کوشش کی۔

دیباچہ

شروع میں ایک چھوٹا سا دیباچہ ہے' جس میں گوئٹے کی شاعری میں جو مشرقی رنگ ہے اس کا ذکر کیا ہے۔ اسی ذیل میں جرمن ادبیات پر عجمی شاعری کا جو اثر پڑا ہے' اس کی نہایت مختصر تاریخ لکھی ہے۔ یہ مضمون مفید اور پر از معلومات ہے۔ اگر جداگانہ بسط کے ساتھ لکھا جائے' تو نہایت کار آمد ہو۔ چونکہ دیوان فارسی میں ہے' اس لئے اگر دیباچہ بھی بجائے اردو کے فارسی میں ہوتا' تو زیادہ بہتر تھا۔

زبان

ڈاکٹر صاحب نے جب فارسی زبان میں شعر گوئی اختیار کی، تو شروع شروع میں ان کی بعض مثنویوں کی زبان پر لوگوں نے اعتراضات کئے، لیکن اب انہوں نے اپنے ذہن وقاد اور طبع نقاد سے زبان میں ایسی لطافت اور شستگی پیدا کر لی ہے کہ صائب اور نظیری کے رنگ میں آ گئے۔ اس تمام مجموعے میں زبان کی صفائی اور پختگی اور کلام کی بے ساختگی اور برجستگی پر مشکل سے کہیں انگلی رکھی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان میں رہ کر فارسی زبان کو جو اظہار خیالات کا ذریعہ بنایا ہے، حقیقت میں انہوں نے کوہ کنی کی زحمت گوارا کر کے ایشیائی اقوام مسلمہ کے لئے جو بالعموم فارسی سمجھتی ہیں، اپنی فائدہ رساں تعلیمات کی ایک جوئے شیر نکالی ہے، ورنہ آج یہ نہ کہہ سکتے:

نوائے من بہ عجم آتش کہن افروخت　　عرب ز نغمہ شوقم ہنوز بے خبر است

لیکن مجھے یقین ہے کہ جب اٹالین اور انگریزی وغیرہ مغربی زبانوں میں کلام اقبال کے ترجمے ہو رہے ہیں، تو اہل مصر جو اس معاملے میں یورپ کے کسی ملک سے پیچھے نہیں ہیں اور جنہوں نے ٹیگور تک کا ترجمہ عربی میں کر لیا ہے، اس اپنی بضاعت ملیہ کو عربی میں منتقل کئے بغیر نہیں رہیں گے۔

شاعری

بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ شاعری وہی اچھی ہوتی ہے، جو زمانہ جاہلیت میں ہوتی ہے۔ لیکن میرے نزدیک:

دکان عاشقی را بسیار مایہ باید

بے شک جاہلی شاعری کی زبان میں سادگی اور طرز ادا میں بے ساختگی ہوتی ہے، لیکن شعر کی خوبی انہیں چیزوں پر محدود نہیں ہے بلکہ ان کے سوا اس میں معنوی خوبیاں بھی ہوتی ہیں، جو زیادہ قدر کے قابل ہیں اور یہ بلا علم کے پیدا نہیں ہو سکتیں۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں:

بافہم و عقل و دانش داد سخن تواں داد
چوں جمع شد معانی گوئے بیاں تواں زد

ذوق صحیح جذبات عالیہ کی ان لطیف تحریکات پر وجد کرتا ہے' جن سے دل کے تار بجتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر اقبال کی شاعری اہل فہم کی دماغی راحت اور روحانی لذت کے لئے ایک میوۂ پر مایہ ہو گئی ہے' کیونکہ وہ علوم دینی و دنیوی اور مشرقی و مغربی کے مجمع البحرین ہیں۔ ذوق صحیح' دل درد مند اور طلاقت لسانی رکھتے ہیں۔ ان کی چشم بصیرت انسانی خیالات کی انتہائی بلندیوں پر پہنچی ہوئی ہے اور ان کے دیدۂ تخیل کے سامنے سے زمین سے آسمان تک کے پردے اٹھے ہوئے ہیں۔ وہ عرش کے پایوں میں جھولتے ہیں۔ مرغان اولیٰ اجنحہ کے ساتھ اڑتے ہیں۔ ساکنان حرم قدس سے ملتے ہیں۔ بزم انجم و کواکب کے رموز سنتے ہیں۔ شبنم اور آفتاب کے باہمی راز' گل و بلبل کے راز و نیاز اور شمع و پروانہ کے سوز و ساز سے آشنا ہیں۔ پہاڑوں کی چٹانوں میں برق کی موجیں' سمندروں کی موجوں میں زندگی کی لہریں' قطرۂ اشک میں سوزش دل کا تب و تاب اور دانہ گوہر میں حیات معنوی کی آب دیکھتے ہیں۔

غرض عالمستان معنی ہے' جس کے چپے چپے اور گوشے گوشے سے جواہر پارے چنتے ہیں اور جذبات ملیہ و دنیہ کا پیکرستان تیار کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ اس قدر تیز بیں ہے کہ ایک ہی چیز پر نہیں رکتی' بلکہ نتائج سے اسباب اور اسباب سے متعلقات پر بلندی سے پستی تک اور خشکی سے تری تک ایک ساتھ دوڑ جاتی ہے۔

تہدیہ

کتاب کو کسی کے نام سے معنون کر دینا ایک عام رسم ہو گئی ہے' حالاں کہ اس کا موقع صرف وہ ہے جب کہ کتاب کے مقصد کو اس سے مدد مل سکے۔ ورنہ اہل نظر اس کو کتاب کی خواری اور مصنف کی سبک ساری کی دلیل سمجھتے ہیں۔

اس سے پیشتر ڈاکٹر صاحب کی ایک مثنوی کا تہدیہ میری نظر سے گزرا تھا' جس کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی کہ اللہ اکبر۔ اسرار خودی کی تعلیم اور اس پر یہ بے خودی :

چوروئے خویش در آئینہ میتوانی دید
چرا نظر بہ جمال کسے دگر داری

شکر ہے کہ اس دیوان کے بارے میں مجھے یہ شکایت نہیں ہے کیوں کہ اس میں انہوں نے کسی شخص کو نہیں بلکہ درحقیقت ایک قوت کو خطاب کیا ہے' جو ان تعلیمات کی جو اس

کتاب میں دی گئی ہیں، صحیح مخاطب ہے یعنی امیر امان اللہ خان فرمانروائے افغانستان۔

خطاب کا مضمون اور انداز نہایت دلکش اور بلیغ ہے۔ عالم اسلامی کی موجودہ حالت کا صحیح نقشہ صرف چند شعروں میں کھینچ دیا ہے:

دیدۂ ای اے خسرو کیواں جناب — آفتاب ما توارت بالحجاب
انطحی در دشت خویش از راہ رفت — از دم او سوز الا اللہ رفت
مصریاں افتادہ در گرداب نیل — ست رگ تورانیان ژندہ پیل
آل عثماں در تکنج روزگار — مشرق و مغرب زخونش لالہ زار
عشق را آئین سلمانی نماند — خاک ایراں ماند و ایرانی نماند
سوز و ساز زندگی رفت از گلش — آں کہن آتش فسرد اندر دلش
مسلم ہندی شکم را بندۂ — خود فروشے، دل ز دیں برکندۂ
در مسلماں شان محبوبی نماند — خالدؓ و فاروقؓ و ایوبیؒ نماند

درخواست یہ ہے:

اے ترا فطرت ضمیر پاک داد — از غم دیں سینہ صد چاک داد
جان تو برمحنت پیہم صبور — کوش در تہذیب افغان غیور
تاز صدیقان ایں امت شوی — بہر دیں سرمایہ قوت شوی

لالۂ طور

دیوان کا پہلا جز ہے۔ اس میں 155 قطعات ہیں، جو ایک ہی وزن پر ہیں۔ یہ فلسفہ زندگی کے اصرار اور معدن حکمت کے گوہرہائے آبدار ہیں۔ دو چار درج کرتا ہوں:

دل من روشن از سوز درون است
جہاں بیں چشم من از اشک خون است
ز رمز زندگی بے گانہ تر باد
کسے کو عشق را گوید جنون است

دما دم نقشہائے تازہ ریزد
بیک صورت قرار زندگی نیست

اگر امروز تو تصویر دوش است
بخاک تو شرار زندگی نیست

مگو کار جہاں نااستوار است
ہر آن ما ابد را پردہ دار است
بگیر امروز را محکم کہ فردا
ہنوز اندر ضمیر روزگار است

رمیدی از خداوندان افرنگ
ولے برگور و گنبد سجدہ پاشی
بہ لالائی چناں عادت گرفتی
ز سنگ راہ مولائے تراشی

افکار

دیوان کا دوسرا جز کم و بیش 40 صفحے ہے۔ اس میں مختلف عنوانات پر نظمیں ہیں۔

"ہلال عید" کے متعلق کہتے ہیں:

نتواں زچشم شوق رمیدائے ہلال عید — از صد نگہ براہ تو دامے نہادہ اند
برخود نظر کشا ز تہی دامنی مرنج — در سینہ تو ماہ تمامے نہادہ اند

"تسخیر فطرت" کے عنوان سے ابلیس و آدم کا جو قصہ لکھا ہے' اس کا پرواز نہایت شاندار ہے۔ سجدہ سے انکار کے وقت ابلیس کا متکبرانہ لہجہ اس کی تعلی کی کیسی عجیب تصویر ہے:

نوری ناداں نیم' سجدہ بہ آدم برم — او بہ نہاد است خاک' من بہ نژاد آذرم
می تپد از سوز من' خون رگ کائنات — من بہ دو صرصرم' من بہ غوتندرم
من ز تنک ماتگاں گدیہ نکردم سجود — قاہر بے دوزخم' داور بے محشرم

آدم ایک نافرمان لڑکے کی طرح جو باپ کے گھر سے نکلنے پر آزادی کا سانس لیتا ہے' جنت سے خارج ہو کر خوشی کا راگ گاتا ہے۔ یہ راگ نہایت دلفریب ہے' خاص کر یہ شعر:

بگداز ہائے پنہاں، بہ نیاز ہائے پیدا نظرے ادا شناسے بحریم ناز کردن

لیکن صبح قیامت کو جناب باری میں اس کا یہ جواب:

تاشود از آہ گرم ایں بت سنگیں گداز بستن زنار او بود مرا ناگزیر
عقل بدام آورد فطرت چالاک را اہرمن شعلہ زاد سجدہ کند خاک را

مبہم ہے۔ اس کے سمجھنے سے میں قاصر رہا ہوں، کیوں کہ ابلیس کی تعبیر فطرت چالاک کے ساتھ کسی طرح قرآن سے مطابقت نہیں کھاتی۔

بوئے گل کی حقیقت پر شاعرانہ تخیل کی لطافت قابل دید ہے:

حورے بکنج گلشن جنت تپید و گفت
مارا کسے از آنسوئے گردوں خبر نداد
ناید بہ فہم من سحر و شام و روز و شب
عقلم ربود اینکہ بگویند مرد و زاد
گردید موج نکہت و از شاخ گل دمید
پا ایں چنیں بعالم فردا ودی نہاد
وا کرد چشم و غنچہ شد و خندہ زو دے
گل گشت و برگ برگ شد و برزمین فتاد
زاں نازنیں کہ بند زپایش کشادہ اند
آہے است یادگار کہ بونام دادہ اند

شاہین و ماہی کی گفتگو کس قدر ترانہ انگیز لہجہ میں لکھی ہے:

ماہی بچہ شوخ بشاہیں بچہ گفت
ایں سلسلہ موج کہ بنی ہمہ دریاست
باسیل گراں سنگ و زمیں گیر و سبک خیز
باگوہر تابندہ و بالولوے لالاست
بیروں نتواں رفت ز سیل ہمہ گیرش
بالائے سرماست، تہ پاست، ہمہ جاست
ہر لحظہ جوان است و روان است دوان است

از گردش ایام نہ افزوں شد و نے کاشت
ماہی بچہ را سوز سخن چہرہ برافروخت
شاہیں بچہ خندید و ز ساحل بہ ہوا خاست
زد بانگ کہ شاہینم و کارم بزمیں چیست
صحراست کہ دریاست تہ بال و پر ماست

مئے باقی

یہ تیسرا جز بھی کم و بیش چالیس صفحوں کا ہے۔ اس میں غزلیں ہیں' جن کی زبان کی سلاست ترنم ریز اور معنوی لطافت وجد انگیز ہے - دو ایک نمونتاً" درج کرتا ہوں :

می تراشد فکر ماہر دم خداوندے دگر
رست از یک بند تا افتاد دربندے دگر
بر سر بام آ' نقاب از چہرہ بے باکانہ کش
نیست در کوئے تو چوں من آرزو مندے دگر
بسکہ غیرت می برم از دیدۂ بینائے خویش
از نگہ بانم بہ رخسار تو رو بندے دگر
یک نگہ' یک خندۂ دزدیدہ' یک تابندہ اشک
بہر پیمان محبت نیست سو گندے دگر
عشق را نازم کہ از بے تابی روز فراق
جان مارا بست بادرد تو پیوندے دگر
تاشوی بے باک تر در نالہ اے مرغ بہار
آتشے گیر از حریم سینہ ام چندے دگر
رہ مدہ در کعبہ اے پیر حرم اقبال را
ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر
بہ ملازمان سلطاں خبرے دہم زرازے
کہ جہاں تواں گرفتن بہ نوائے دلگدازے

به متاع خود چه نازی که به شهر درد منداں
دل غزنوی نیرزد به تبسم ایازے
همه ناز بے نیازی، همه ساز بے نوائی
دل شاه لرزه گیرد ز گدائے بے نیازے
زمقام من چه پرسی به طلسم دل اسیرم
نه نشیب من شمے نه فراز من فرازے
ره عاقلی رہاکن که باو توان رسیدن
بدل نیاز مندے، به نگاه پاکبازے
به ره تو ناتمام، ز تغافل تو خامم
من دجان نیم سوزے، تو و چشم نیم بازے
ره دیر تخته گل ز جبین سجده ریزم
که نیاز من نه گنجد به دو رکعت نمازے
ز ستیز آشنایاں چه نیاز و ناز خیزد
دلکے بهانه سوزے، گهے بهانه سازے
زخاک خویش طلب آتشے که پیدانیست
تجلی دگرے درخور تقاضا نیست
اگرچه عقل فسوں پیشه لشکرے انگیخت
تو دل گرفته نه باشی که عشق تنها نیست
تو ره شناس نه ای و زمقام بے خبری
چه نغمه ایست که در بربط سلمے نیست
نظر بخویش چناں بسته ام که جلوهٔ دوست
جهاں گرفت و مرا فرصت تماشا نیست
بیا که غلغله در شهر دلبراں نگینم
جنون زنده دلاں هرزه گرد صحرا نیست
زقید و صید نهنگاں حکایتے آور

مگو کہ زورق ماردشناس دریانیست
مرید ہمت آں رہروم کہ پا نہ گذاشت
بہ جادۂ کہ درو کوہ و دشت و دریا نیست
شریک حلقہ رندان بادہ پیما باش
حذر ز بیعت پیرے کہ مرد غوغانیست
برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی ست
حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

ایک غزل میں ایک شعر کیا بلند حوصلگی کا کہا ہے:

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

مولانا روم نے بھی فرمایا ہے:

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند
فرشتہ صید و پیمبر شکارد یزداں گیر

لیکن شاعرانہ خیالات کا تضاد احسن تقویم اور اسفل سافلین کا کیسا صحیح منظر پیش کرتا ہے کہ کہاں آدم خاکی کا یہ جوش و خروش اور کہاں وہ نگاہ میں اس قدر حقیر کہ اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ:

نقش وگر طرازدہ آدم پختہ تر بیار
لعبت خاک سافتن می نہ سزد خدائے را

نقش فرنگ

یہ چوتھا جز چالیس صفحے سے کچھ کم ہے۔ اس میں اہل مغرب کے خیالات اور ان کے متعلق رائیں ہیں۔ ان مضامین سے ایشیائی شاعری اب تک قطعاً" روشناس نہ تھی۔ آغاز اس پیام سے ہوتا ہے۔

از من اے باد صبا گوئے بدانائے فرنگ
عقل تا بال کشود است گرفتار تر است

برق را ایں بہ جگر می زند آں رام کند
عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دار تر است
چشم جز رنگ گل و لالہ نہ بیند ورنہ
آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است
عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری
عجب ایں است کہ بیمار تو بیمار تر است
علم و حکمت اگرش خوئے سگی باز دہد
آدمی زادۂ دانا' زدداں خوار تر است
خواجہ را قیمت عیش است اگر مزد غلام
بندہ آزاد تر و خواجہ گرفتار تر است

رفتگان عالم بالا کی صحبت بھی نہایت دلچسپ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مغربی حکما نے وہاں جا کر سیاسی مذاکرے شروع کر دیئے ہیں:

روس کا مشہور حکیم ٹالسٹائی کہتا ہے:

بار کش اہرمن لشکری شہریار
از پئے نان جویں تیغ ستم برکشید
زشت بہ چشمیس نکوست مغزنداند ز پوست
مردک بیگانہ دوست سینہ خویشاں درید
داروئے بیہوشی است تاج' کلیسا' وطن
جان خدا داد را خواجہ بجامے خرید

مزدک ایران کے اباحیہ مذہب کا پیشوا اپنی تعلیم کو کامیاب دیکھ کر خوش ہوتا ہے:

دانہ ایراں ز کشت زار و قیصر بردمید
مرگ نومی رقصد اندر قصر سلطان و امیر
مدتے در آتش نمرود می سوزد خلیل
تا تہی گردد حریمش از خداوندان پیر
دور پرویزی گذشت اے کشتہ پرویز خیز

نعمت گم گشتہ خود راز خسرو باز گیر

"کشتہ پرویز" ناکام گر سنہ مزدور طرب گاہ رقیب کوہ کن بھی اس مجلس میں شامل ہے۔

وہ کہتا ہے :

نگار من کہ بے سادہ، و کم آمیز است
ستیزہ کیش و ستم کوش و فتنہ انگیز است
برون او ہمہ بزم و درون اوہمہ رزم
زبان او ز مسیح و دلش ز چنگیز است
اگرچہ تیشہ من کوہ را ز پاآورد
ہنوز گردش گردوں بکام پرویز است

ایک نظم میخانہ فرنگ کی یاد میں ہے۔ اس میں کہتے ہیں :

چشم مست مے فروشش بادہ را پروردگار
بادہ خواراں رانگاہ ساقی اش پیغمبر است

یہی وہ جرم ہے جس پر ملا شیدا غریب شاہجہانی علما کے فتووں کی بنیاد پر دہلی سے نکالا گیا تھا۔ اس نے کہا تھا :

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے
حسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

مولانا نظامی گنجوی کا یہ قطعہ بہت مشہور ہے اور اکثر ایرانی استادوں نے اس کے جوابات لکھے ہیں :

دوش رفتم بخرابات و مرا راہ نبود
می زدم نالہ و فریاد کس از من نہ شنود
یانبد ہیچ کس از بادہ فروشاں بیدار
یا کہ من ہیچ کسم ہیچ کسم درنہ کشود
پاے بگذشت ز شب بیشترک یا کمتر
رندے از غرفہ بروں کرد سرورخ بہ نمود
گفت خیر است دریں وقت کرامیخواہی

بے محل آمدنت بر در ما بہرچہ بود
گفتمش در بکشاگفت بروہرزہ مگوے
کاندریں وقت کسے بہر کسے درنہ کشود
ایں نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشایند
کہ تو دیر آئی و اندر صف پیش استی زود
ایں خرابات مغانست درو رندانند
مومن و برہمن وگبرو نصارا و یہود
گر تو خواہی کہ دم از صحبت ایشاں بزنی
خاک پائے ہمہ شو تا کہ بیابی مقصود

ڈاکٹر صاحب "خرابات فرنگ" کے عنوان سے اسی نہج پر ایک قطعہ لکھتے ہیں:

دوش رفتم بہ تماشائے خرابات فرنگ
شوخ گفتاری رندے دلم از دست ربود
گفت ایں نیست کلیسا کہ بیابی دروے
صحبت دخترک زہرہ دش و نائے و سرود
ایں خرابات فرنگ است و ز تاثیر میش
آنچہ مذموم شمارند' نماید محمود
نیک و بدرا بتر ازوئے دگر سنجیدیم
چشمہ داشت ترازوئے نصارے و یہود
خوب زشت است اگر پنجہ گیرات شکست
زشت' خوب است اگر تاب و توان تو فزود
تو اگر در نگری جز بہ ریانیست حیات
ہر کہ اندر گرو صدق و صفا بود نبود
دعوی صدق و صفا پردۂ ناموس ریاست
پیر ما گفت مس از سیم بباید اندود
فاش گفتم بتو اسرار نہانخانہ زیست

بکسے باز مگو تا کہ بیابی مقصود

دول مغربیہ نے جو جمعیت اقوام قائم کی ہے' وہ شاعر کو اس شکل میں نظر آتی ہے:

برفتد تاروش رزم دریں بزم کہن
درد مندان جہاں طرح نوانداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

درد مندان جہاں کا لفظ خاص توجہ کے قابل ہے۔

مولانا وحشی کا یہ قطعہ "برادر و تقسیم نا برابر" مشہور ہے:

زیبا ترآنچہ ماندہ زبابا از ان تو
بد اے برادر از من و اعلیٰ از ان تو
این طاس خالی از من و آں کوزۂ کہ بود
پارینہ پرزشہد مصفا از ان تو
یا بوئے ریسماں گسل و میخ کن زمن
مہمیز کلہ تیز مطلا از ان تو
ایں دیگ لب شکستہ صابون پزی زمن
و آں چمچہ حریسہ و حلوا از ان تو
ایں اشتر خموش لگد زن از ان من
واں گربہ مصاحب بابا از ان تو
از صحن خانہ تا بلب بام از ان من
وز بام تا بہ سقف ثریا از ان تو

اسی لطیف طرز پر ڈاکٹر صاحب نے قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور لکھا ہے:

غوغائے کارخانہ آہنگری زمن
گلبانگ ارغنون کلیسا ازان تو
نخلے کہ شہ خراج بروی نہد زمن
باغ بہشت و سدرہ و طوبا ازان تو

تلخابہ کہ درد سر آرد ازان من
صہبائے پاک آدم و حوا ازان تو
مرغابی و تدرو و کبوتر ازان من
ظل ہما و شہپر عنقا ازان تو
ایں خاک و آنچہ در شکم او ازان من
و ز خاک تا بہ عرش معلا ازان تو

پیغام

عجمی شاعری نے اول اول حسن و عشق کے گہوارہ اور سلاطین و امرا کی مداحی کی آغوش میں پرورش پائی۔ کچھ زمانہ کے بعد صوفیانہ خیالات کے بزرگوں نے اس پر تصوف رنگ چڑھایا۔ خاص کر مولانائے روم نے اس صور کو اس بلند آہنگی سے پھونکا کہ شاعری نے حریم دین میں بار پا لیا۔ یہاں تک کہ آج بھی مسجدوں کے منبروں پر سے ان کی آواز کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

اب زمانے نے دوسری کروٹ بدلی اور امت اسلامیہ غیروں کے پنجہ تسلط میں پڑ کر مصائب و آلام میں مبتلا ہو گئی۔ اس وجہ سے شاعری نے بھی نیا رنگ اختیار کیا اور اس کے ساز پر قومی اور وطنی راگ گائے جانے لگے۔ مصر' ایران' ہندوستان نیز افغانستان ہر جگہ شاعری سے یہ کام لیا جانے لگا۔

ہم ان تمام نغموں کو سنتے ہیں' لیکن ان سب میں ڈاکٹر صاحب کے لئے ایک جداگانہ انداز رکھتی ہے۔ وہ دو باتوں میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز نظر آتی ہے۔

(1) ان قومی شعرا کی نگاہیں اپنی قومی اور ملکی حدود سے باہر کم پہنچتی ہیں اور ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر کل امت اسلامیہ ہے یعنی ان کا خطاب صرف جذبہ اسلامی سے ہے' نہ کہ ایرانی یا تورانی سے۔ اس لئے اوروں کے کلام کو ہم صرف "قومیات" یا "وطنیات" کہہ سکتے ہیں' لیکن ڈاکٹر صاحب کی نظمیں "ملیات" کے لقب کی مستحق ہیں۔

(2) دوسرے شعرا جذبات عام کو لے کر نظم کا لباس پہناتے ہیں۔ بخلاف اس کے ڈاکٹر صاحب کی طبع خداداد و حیات ملیہ کے اسرار خود اخذ کر کے ان کو شاعری کے قالب میں ڈھالتی ہے۔

کسی کا قول ہے:

اگرچہ شاعران نغز گفتار
زیک جا مند در بزم سخن مست
ولے بایادۂ بعضے حریفاں
خمار چشم ساقی نیز پیوست
ببیں یکساں کہ در اشعار ایں قوم
درائے شاعری چیزے دگر ہست

"چیزے دگر" وہی رموز لطفیہ ہیں جن کو پیغامی شاعر کے سوا کوئی دوسرا نہیں پا سکتا۔ ڈاکٹر صاحب امت اسلامیہ کے لئے ایک پیغام رکھتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے:

بخامہ کہ خط زندگی رقم زدہ است
نوشتہ اند پیامے بہ برگ رگینم

وہ اپنا پیغام بھی صاف ظاہر کرتے ہیں:

ز شاخ آرزو بر خوردہ ام من
بہ راز زندگی پے بردہ ام من
بترس از باغباں اے ناوک انداز
کہ پیغام بہار آوردہ ام من

ان کے پیغامی شاعر ہونے کے متعلق غالباً آئندہ آنے والے لوگ ہم سے بہتر لکھ سکیں گے۔

عجمی شاعری جس نے تصوف کی خدمت گزاری کی' اس میں اور ڈاکٹر صاحب کی شاعری میں بھی بڑا فرق ہے۔ وہ فنا اور نفس کشی کی تلقین کرتی ہے اور یہ خودی اور زندگی کی۔ وہ تند مزاجوں کو برف بناتی ہے اور یہ افسردہ دلوں کو برق۔

تعلیمات

ڈاکٹر صاحب حسن و عشق کے شاعر نہیں ہیں، بلکہ ان کے دل کو اللہ تعالیٰ نے حیات ملیہ کے اسرار سے بھر دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

تامرا رمز حیات آموختند
آتشے در سینہ ام افروختند
یک نوائے سینہ تاب آوردہ ام
عشق را عہد شباب آوردہ ام
آشنائے من زمن بیگانہ رفت
از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہ خسروی اورا دہم
تخت کسریٰ زیر پائے او نہم
او حدیث دلبری خواہد زمن
رنگ و آب شاعری خواہد زمن
کم نظر بیتابی جانم ندید
آشکارم دید و پنہانم ندید
فطرت من عشق را دربرگرفت
صحبت خاشاک و آتش درگرفت
حق رموز ملک و دیں برمن کشود
نقش غیر از پردۂ چشمم ربود

ان کی ساری شاعری انہیں رموز کی تعلیمات سے لبریز ہے، یہاں تک کہ قطعات اور غزلیات بھی۔ اس جگہ اجمالاً چند عنوانات لکھتا ہوں۔

خودی

یہ ڈاکٹر صاحب کا خاص مضمون ہے۔ جس پر ان کی مستقل مثنوی موجود ہے۔ خودی سے مراد خودپسندی نہیں، بلکہ خود شناسی ہے۔ یہ مجموعہ بھی اس تعلیم سے خالی نہیں۔ فرماتے

ہیں :

چہ پرسی از کجایم چیستم من
بخود پیچیدہ ام تاز یستم من
دریں دریا چو موج بے قرارم
اگر برخود نہ پیچم نیستم من

شبنم

گفتند فرو د آے زاوج مہ و پرویز
برخود زن وبابحر پرآشوب بیامیز
با موج در آویز
نقش دگر انگیز
تابندہ گہر خیز
من عیش ہم آغوشی دریانخریدم
آں بادہ کہ از خویش رباید نچشیدم
از خود نرمیدم
ز آفاق بریدم
بر لالہ چکیدم

زندگی

اس عالم کائنات کا ذرہ ذرہ سرگرم پیکار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ یہی پیکار اصل زندگی ہے۔ اخلاقیات کے نامور معلم شیخ سعدی نے کہا تھا کہ :

اگر خواہی سلامت برکناراست

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں :

اگر خواہی حیات اندر خطرزی
میارا بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است

بدریا غلط و باموجش در آویز
حیات جاوداں اندر ستیز است

غالباً مولانا بیدل نے کسی غزل میں کہا ہے "بشکند رنگم حبابے چوں بدریا بشکند۔" اس پر کہتے ہیں:

از نزاکت ہائے طبع موشگاف اومپرس
کزدم بادے زجاج شاعر ما بشکند
کے تواند گفت شرح کارزار زندگی
می پر درنگش، حبابے چوں بدریا بشکند

وہ اس عالم ہی کو پسند نہیں کرتے، جس میں یزداں کے مقابلے میں اہرمن نہ ہو:

مزی اندر جہان کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

عمل

ڈاکٹر صاحب کا سارا کلام درحقیقت درس عمل ہے اور یہی نوائے وقت ہے۔ ستاروں کی زبان سے فرماتے ہیں:

خنک انساں کہ جانش بے قرار است
سوار راہ وار روزگار است
قبائے زندگی برقامتش راست
کہ او نو آفرین و تازہ کار است

ہائنا کے جواب میں کہا ہے:

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موج زخود رفتہ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر میردم گر نروم نیستم

اسلام

ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا اصل سرچشمہ قرآن عظیم ہے۔ اسی کے رموز کو لے کر وہ اس ساز پر نغمہ سرائی کرتے ہیں۔ وہ پکار پکار کے کہہ رہے ہیں کہ دین اسلام ہر قسم کی انسانی صلاح و فلاح پر حاوی اور دینی و دنیوی ترقیات کا کفیل ہے۔

ایک غزل میں کہتے ہیں :

تو رہ شناس نئی و زمقام بے خبری
چہ نغمہ ایست کہ در بربط سلیمے نیست

ایک دوسری غزل میں کہا ہے :

برکش آں نغمہ کہ سرمایہ آب و گل تست
اے ز خود رفتہ تہی شوز نوائے دگراں

مغربی تہذیب جو بدبختی سے مسلمانوں کی نگاہوں کو خیرہ کئے ہوئے ہے' ان کے نزدیک نہایت نااستوار بنیاد پر قائم ہے۔ اور وہ ایک ملمع کاری ہے جس کی تہ میں انسانیت اور ہمدردی کا نام و نشان نہیں ہے۔ فرماتے ہیں :

فرنگ گرچہ سخن باستارہ می گوید
حذر کہ شیوۂ اورنگ جوزنی دارد
در ہوایش گرمی یک آہ بے تابانہ نیست
رندایں میخانہ رایک لغزش مستانہ نیست

مسلمانوں پر مدتہائے دراز سے عجمی ادبیات نے اثر ڈال کر ان میں جو افسردگی پیدا کر رکھی ہے' اس سے بھی سخت بیزار ہیں اور پھر ان کو اصل عربی اسلامی رنگ میں لانا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں :

دگر بدشت عرب خیمہ زن کہ بزم عجم
مئے گزشتہ و جامے شکستی دارد

اخوۃ اسلامی

مسلمانوں نے جہالت کی وجہ سے جو نسلی اور ملکی امتیازات پیدا کر کے باہمی تفرقے ڈال

رکھے ہیں' ان کو وہ حرام سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ قرآن نے کل مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا ہے اور یہی اخوت اسلامی ملت کی اصل طاقت ہے۔ فرماتے ہیں :

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو برما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

محنت

دنیا میں ہر شخص فطرتاً اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اس کی محنت کا کل ثمرہ اس کو ملے' لیکن دول مغربیہ کی سرمایہ پرستی کی وجہ سے عالم کی اقتصادی حالت اس قدر پر پیچ ہو گئی ہے کہ مزدور اپنا پورا حق نہیں پا سکتا' بلکہ سرمایہ دار بھی اس میں شریک ہو جاتا ہے۔ یوروپین ممالک میں سرمایہ اور محنت کی جنگ نہایت اہمیت پکڑ گئی ہے اور کچھ تعجب نہیں کہ روس کی طرح دیگر مغربی سلطنتیں بھی اس کی رو میں بہ جائیں۔

ڈاکٹر صاحب سرمایہ داری کے خلاف جہاد عظیم میں مصروف ہیں۔

موسیو لینن صدر جمہوریہ روس کی زبان سے کہتے ہیں :

بسے گذشت کہ آدم دریں سرائے کہن
مثال دانہ تہ سنگ آسیا بوداست
فریب زاری و افسون قیصری خورد است
اسیر حلقہ دام کلیسیا بود است
غلام گرسنہ دیدی کہ بردرید آخر
قمیص خواجہ کہ رنگین ز خون مابودست

کارل مارکس کی زبان سے جو رفتگان عالم بالا میں سے ہے' یہ آواز سنائی دیتی ہے:

راز دان جزو و کل از خویش نامحرم شد است
آدم از سرمایہ داری قاتل آدم شد است

ٹالسٹائی کہتا ہے :

عقل دورد آفرید فلسفہ خود پرست
درس رضا میدہی بندۂ مزدور را؟

یہ درد ان کے دل میں اس قدر ہے کہ کشمیر جنت نظیر کے دل فریب مناظر میں بھی اس کو نہیں بھولتے :

کشیری کہ بابندگی خو گرفتہ
بتے می تراشد ز سنگ مزارے
ضمیرش تہی از خیال بلندے
خودی ناشناسے ز خود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنت او
نصیب تنش جامہ تارتارے
نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے
نہ در سینہ او دل بے قرارے

تبلیغ اسلام

اسلام کی تبلیغ اہم ترین فریضہ امت ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس زمانے میں جو بعض ہندوستانی مغربی ممالک میں تبلیغ کے لئے جاتے ہیں، یہ کہاں تک بجا ہے جب کہ خود ہندوستان اور اس کے ہمسایہ ممالک میں لاکھوں کروڑوں مسلمان جاہل اور گمراہ پڑے ہوئے ہیں۔ غیروں کو مسلمان بنانے کی بہ نسبت ان کی تعلیم اور ہدایت مقدم ہے۔ اسی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب فرنگستان کے دنیا پرستوں میں تبلیغ کی اس وقت ضرورت نہیں سمجھتے اور ایسے مبلغوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں :

زمانہ بازبرافروخت آتش نمرود
کہ آشکار شود جوہر مسلمانی
بیا کہ پردہ ز داغ جگر براندازیم
کہ آفتاب جہانگیر شد زعریانی
ہزار نکتہ زدی پیش دلبران فرنگ

گداختی صنماں را بعلم برہانی
خبر زشہر سلیمے بدہ حجازی را
شرار شوق فشاں در ضمیر تورانی
رہ عراق و خراساں زن اے مقام شناس
بہ بزم اعجمیاں تازہ کن غزل خوانی
بے گذشت کہ در انتظار زخمہ وریست
چہ نغمہا کہ نہ خوں شد بہ ساز افغانی
حدیث عشق باہل ہوس چہ میگوئی
بچشم مورکمش سرمہ سلیمانی

جمہوریت

ڈاکٹر صاحب کا سارا کلام دیکھنے سے یہ صاف نمایاں ہوتا ہے کہ ان کا آب و گل حریت اور مساوات اور خمیر جمہوریت کا ہے، لیکن ان کا یہ قول:

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

نہایت تعجب انگیز ہے، اس لئے کہ اگر وہ "پختہ کار" صاحب بھی "خرنا مشخص" نکلے تو پھر کیا ہو گا۔ کیوں کہ یہ کون کہہ سکتا تھا کہ ملائکہ کا جو استاد ہے، وہی راندہ درگاہ اور ملعون بارگاہ ہو گا۔ وہ غریب خود اس سے بے خبر تھا۔ چنانچہ کہتا ہے۔

بر لوح ثبت بود کہ ملعوں شود یکے
بر دم گماں بہر کس و برخود گماں نبود

اس میں کچھ شک نہیں کہ رائے صواب ہر معاملہ میں صرف ایک ہی ہوتی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ایک شخص سے حاصل کی جائے یا ایک جماعت سے۔ مشورے میں دو فائدے ہیں۔

(1) نتیجہ خراب ہونے کی صورت میں ملامت کا خوف نہیں رہتا۔ اسی بنیاد پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی جن کی رائے کے قطعی درست ہونے میں

شبہ نہیں تھا' "شاور ہم فی الامر" کا حکم دیا گیا۔

(2) بہ نسبت ایک شخص کے جماعت میں اغلباً مذاق صحیح موجود ہوتا ہے اس لئے عام مسلمانوں کے لئے "امر ہم شوریٰ بینہم" نازل ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے کی کوئی توجیہ میری سمجھ میں بجز اس کے نہیں آتی کہ میں اس کو ان کی تعلیمات سے نکال کر مطائبات میں شمار کر لوں۔(1)

خاتمہ

ڈاکٹر صاحب کا کلام اگرچہ تمام تر آورد ہے' لیکن اس میں انتہائی لطافت اور انتہائی ایجاز ہے یعنی فصاحت لفظی اور بلاغت معنوی دونوں کی پوری پوری رعایت ملحوظ ہے۔ جو مضمون ہے' وہ نہایت صاف برجستہ اور نکتہ سنجی اور ندرت خیال کا پسندیدہ ترین نمونہ ہے۔ انداز بیان اور طرز ادا انوکھا اور دلکش ہے۔ ان کی توجہ خیالات کی رفعت اور معانی کی بلندی کی طرف زیادہ رہتی ہے۔ صنائع و بدائع اور تشبیہات و استعارات کے پیچھے وہ نہیں پڑتے' لیکن باوجود اس کے لفظوں کی لطافت اور ترکیبوں کی نزاکت کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

ان کا قدم کسی کے جادۂ تقلید سے قطعاً بری ہے۔ ممکن ہے کہ کہیں مغز سخن انہوں نے مولانائے روم سے اخذ کیا ہو' لیکن اپنا راستہ جو بالکل اچھوتا اور نیا ہے' خود ہی نکالا ہے۔

ان کا جام شاعری اس سوگواری کی تلخی سے بھی پاک ہے' جو قومی مرثیہ گویوں کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ وہ ماضی کے ماتمی نہیں ہیں' بلکہ شاندار مستقبل کے مژدہ گو ہیں۔ ان کی شگفتہ طبیعت ایک بلبل ہے' جو خزاں کی نوحہ خوانی نہیں کرتی بلکہ بہار کی آمد کا نغمہ گاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری سے ملت جدیدہ کی دماغی تعمیر میں بہت بڑا حصہ لے رہے ہیں۔

حاشیہ

(1) غالباً ڈاکٹر صاحب کا مقصد ڈکٹیٹر شپ ہے' لیکن وہ بھی بادشاہت سے کم نقصان رساں نہیں ہے۔

(رسالہ "جامعہ" (علی گڑھ)' ستمبر 1923ء' ص 145-163- مقالات اسلم' ناشر امداد صابری' چوڑی والان دہلی' بلا تاریخ' ص 82-104)

غلام رسول مہر

پیام مشرق

پیر مغرب شاعر المانوی — آں قتیل شیوہ ہائے پہلوی
بست نقش شاہدان شوخ و شنگ — داد مشرق را سلامے از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغام شرق — ماہ تابے ریختم بر شام شرق

علامہ اقبال کی تازہ ترین تصنیف "پیام مشرق" کے متعلق ان صفحات پر ایک سے زائد بار تذکرہ آ چکا ہے۔ ہم نے اس کی زیور طبع سے آراستگی و پیراستگی کی اطلاع دیتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ اس کے متعلق تفصیل کے ساتھ کسی دوسرے موقع پر اظہار خیالات کریں گے۔ چنانچہ آج اس وعدے کو پورا کرتے ہیں۔

یہ ابتدا ہی میں عرض کر دینا مناسب ہو گا کہ یہ مضمون اس نادرۂ روزگار مجموعہ حقائق و معارف کے محاسن و مطالب کی تمام و کمال وضاحت سے قاصر ہے اور صرف ایک آدھ مضمون اس کے حقیقی خد و خال کی زندگی پرور اور حیات آموز خوبیوں کے وضوح و انشراح کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ایک طویل اور مبسوط سلسلہ مضامین کی ضرورت ہے اور ہمارے پیش نظر فرصت و گنجائش اس .سط و تفصیل کی متحمل نہیں۔ اس مضمون کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ قارئین کرام کو "پیام مشرق" کی حیثیت و اہمیت کا ایک عام اندازہ ہو جائے اور وہ یہ سمجھ لیں کہ علامہ ممدوح کے ندرت زا تخیل نے اس سرزمین میں کیا کیا گل کاریاں کی ہیں اور حقائق و معارف حیات کی کن کن گہرائیوں میں غواصی کی ہے۔

"پیام مشرق" سات حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ دیباچہ ہے جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ کن وجوہ و اسباب کی بنا پر گوئٹے خواجہ حافظ کے دیوان کے ترجمے سے متاثر ہوا اور اس نے خواجہ کے انداز کو اختیار کرتے ہوئے اپنا "مغربی دیوان" مرتب کیا' جس کے جواب میں زیر انتقاد کتاب لکھی گئی۔ دیباچہ نثر میں ہے۔

دوسرے حصے سے نظم کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ اس حصے کو پیشکش کے نام سے موسوم کرنا موزوں ہو گا' کیونکہ اس میں "پیام مشرق" کو ضیغم اسلام اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں غازی تاجدار دولت مستقلہ افغانستان کے نام نامی پر معنون کیا گیا ہے۔ ہم اس پیشکش کے نصف سے زائد اشعار اپنی 4 مئی کی اشاعت میں ہدیہ قارئین کر چکے ہیں' جن سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مشرقی دنیا کے اس سب سے بڑے فلسفی' حقائق حیات کے اس سب سے بڑے ماہر اور دور حاضر کے اس سب سے بڑے شاعر نے کس اچھوتے اور دلکش انداز میں اعلیٰ حضرت امیر غازی کو عملی سیاست کے حقائق بتلائے ہیں اور کس طرح انہیں افغانوں کی غیور قوم کی تہذیب و ترتیب پر متوجہ کیا ہے۔

تیسرے حصے میں اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ یہ حصہ "لالہ طور" کے نام سے موسوم ہے اور 80 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں 163 رباعیات ہیں جن میں حکمت' فلسفہ' تمدن' معاشرت یا بہ اصطلاح جامع زندگی اور حیات کے اسرار بیان کئے گئے ہیں اور کوئی رباعی ایسی نہیں جو از سر تا پا درس عمل اور درس حیات نہ ہو۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

تنے پیدا کن از مشت غبارے تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درون او دل درد آشنائے چو جوئے در کنار کوہسارے

ہم نہیں سمجھتے کہ زندگی کی اس سے بہتر اور کیا تفسیر ہو سکتی ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

دل بے باک را ضرغام رنگ است دل ترسندہ را آہو پلنگ است
اگر بیمے نداری بحر صحرا ست اگر ترسی بہر موجش نہنگ است

ہندوستان کی سرزمین میں جس شخص کی نظر سب سے پہلے وحدت اسلامی کی حقیقت پر پہنچی اور جس نے سب سے پہلے یہاں وطن' نسل' رنگ اور خون کے غیر اسلامی رشتوں کو توڑ کر مذہب کی صحیح اسلامی اساس قومیت کی دعوت دی' وہ علامہ اقبال ہیں۔ آج ہندوستان

کے مختلف حصوں میں وحدت اسلامی کی دعوت کے جو بڑے بڑے آتش کدے روشن ہیں، وہ سب اپنی تپش، سوز اور حرارت کے لئے علامہ ممدوح کے مرہون منت ہیں۔ مسلمان بچوں کے قومی گیت سے لے کر مثنویوں تک علامہ ممدوح کی ایک نظم بھی ایسی نہیں، جس میں یہ دعوت موثر سے موثر انداز میں موجود نہ ہو۔ "پیام مشرق" کے زیر انتقاد حصے میں اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

تو اے کودک منش خود را ادب کن — مسلماں زادہ ای ترک نسب کن
برنگ احمر و خون و رگ و پوست — اگر نازد عرب ترک عرب کن
نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم — چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است — کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

بہرحال ہم عرض کر چکے ہیں کہ مفصل انتقاد کا یہ موقع نہیں، اس لئے محض اشارات پر اکتفا کر رہے ہیں اور صرف ایک رباعی اور یہاں درج کرتے ہیں، جو علامہ ممدوح کے اشعار کی حقیقت کا آئینہ ہے۔ کاش مخاطب سمجھے:

بخود باز آورد رند کہن را — مئے برنا کہ من در جام کردم
من ایں مے چوں مغان دور پیشین — ز چشم مست ساقی وام کردم

"پیام مشرق" کے چوتھے حصے کا نام "افکار" ہے، جس میں مختلف مضامین پر چھوٹی بڑی نظمیں ہیں۔ بڑی بڑی نظموں میں تسخیر فطرت، نوائے وقت، بہار، دنیائے عمل، زندگی وغیرہ نہایت نادر چیزیں ہیں۔ یہ حصہ تقریباً 40 صفحات پر مشتمل ہے۔ بہار اور شبنم پر جو نظمیں ہیں، ان کی بحریں بالکل نئی ہیں، مثلاً "فصل بہار" کا پہلا بند یہ ہے:

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابر بہار
مست ترنم ہزار
طوطی و دراج و سار
بر طرف جوئبار
کشت گل و لالہ زار
چشم تماشا بیار
خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابر بہار

غلامی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے :

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذر قباد و جم کرد

یعنی از خوئے غلامی زسگان خوارتر است
من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

پانچواں حصہ "مئے باقی" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ غزلیات پر مشتمل ہے' جن میں سے ایک غزل ہم اپنی کسی قریبی اشاعت میں شائع کر چکے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ان کے نہج' انداز اور مطالب کی کیا حالت ہے۔ خود علامہ ممدوح نے ایک مقام پر اپنی غزلوں کی حقیقت نہایت عمدہ طریقے پر بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں :

بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم
غزل سرایم و پیغام آشنا گویم

اس حصے میں بھی زندگی کے وہ تمام حقائق و اسرار بدرجہ اتم موجود ہیں' جو نظموں اور رباعیات کی جان ہیں۔ اگر رباعیات میں یہ ارشاد ہوتا ہے کہ "اگر خواہی حیات اندر خطر زی" تو غزلیات کے سفینہ میں بھی یہی گوہر ہیں :

بہ کیش زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است
سفر بہ کعبہ نہ کردم کہ راہ بے خطر است

چو موج ساز وجودم ز سیل بے پرواست
گماں مبر کہ دریں بحر ساحلے جویم

رمز حیات جوئی؟ جز در تپش نیابی
در قلزم آرمیدن ننگ است آبجو را

تنش از سایہ بال تدروے لرزہ می گیرد
چو شاہیں زادۂ اندر قفس بادانہ میسازد

کہیں کہیں ان موتیوں کی آب و تاب بہت تیز ہو گئی ہے :

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست

با من میا کہ مسلک شبیرم آرزوست
گفتند لب بہ بند و ز اسرار ما مگو
گفتم کہ خیر! نعرۂ تکبیرم آرزوست

چھٹے حصے کا نام "نقش فرنگ" ہے، جس میں مغربی سیاسیات، مغربی مسائل، مغربی شعرا اور مغربی حکما وغیرہ پر نظمیں ہیں۔ ان میں شوپن ہار، نیٹشا، ٹالسٹائے، کارل مارکس، ہیگل، آئن سٹائن، برگساں، کانٹ وغیرہ کے فلسفے اور بائرن اور براؤننگ وغیرہ کی شاعری کی حقیقت کو اس طرح ایک ایک دو دو شعروں میں بیان کر دیا ہے کہ جن لوگوں کی عمریں ان میں سے ایک ایک شخص کی مصنفات کے مطالعے میں کامل انہماک و اشغال کے ساتھ بسر ہو چکی ہیں، وہ بھی ان کا خلاصہ اس سے بہتر بیان نہیں کر سکتے۔ نٹشا کے متعلق ایک مقام پر دو شعر لکھے ہیں:

از سستی عناصر انساں دلش تپید
فکر حکیم پیکر محکم تر آفرید

اگلند در فرنگ صد آشوب تازۂ
دیوانہ بکار گہ شیشہ گر رسید

نٹشا کے متعلق اس سے بہتر کیا لکھا جا سکتا تھا؟ دوسرے مقام پر نٹشا کی ساری زندگی کو ایک شعر میں بند کر دیا ہے:

آنکہ بر طرح حرم بتخانہ ساخت
قلب او مومن دماغش کافر است

"نقش فرنگ" میں جمعیت الاقوام کے متعلق جو شعر لکھے ہیں، وہ بطور خاص قابل ملاحظہ ہیں اور غالباً جمعیت الاقوام کے آغاز سے اس وقت تک کسی چھوٹے بڑے مضمون یا نظم و نثر میں اس کی حقیقت اس سے بہتر الفاظ میں بیان نہیں ہوئی۔ فرماتے ہیں:

برفتد تا روش رزم دریں بزم کہن
دردمندان جہاں طرح نو انداختہ اند

من ازیں بیش نہ دانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

"پیام مشرق" کے ساتویں حصے کا نام "خردہ" ہے' جس میں متفرق اشعار ہیں۔ یہ "پیام مشرق" کا نامکمل سا خاکہ ہے' جس سے قارئین کرام کو اس کی حقیقت و اہمیت کا اندازہ کرنے میں کچھ مدد مل سکے گی۔ اگر آج اقبال یورپ کے کسی ملک میں ہوتا' تو اس کی ایک ایک نظم موتیوں سے تلتی لیکن قدرت نے اسے ایک غلام' محکوم اور اپنی اصل سے دور افتادہ قوم کو حقیقی زندگی کی راہ دکھانے اور اسے بھولا ہوا سبق یاد کرانے کے لئے ہندوستان میں پیدا کیا۔ وہ موتیوں کا طالب نہیں ہے' گوہروں کا آرزومند نہیں ہے' دولت اور عز و جاہ کا خواہاں نہیں ہے۔ صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کی بربط وجود سے زندگی کی جو نوا نکلی ہے' لوگ اس کو حقیقت سمجھیں اور جو صحیح اور سچا اسلامی راستہ دکھا رہا ہے' اس کی پیروی کریں۔

اغیار علامہ ممدوح کے حیات پرور افکار عالیہ سے استفادہ کر رہے ہیں اور "اسرار خودی" کا انگریزی ترجمہ اس وقت شاید تیسری دفعہ چھپ رہا ہے۔ کاش ان لوگوں کی بھی آنکھیں کھلیں' جن کے لئے یہ چیزیں لکھی گئی ہیں اور جن کی خاطر علامہ ممدوح خون جگر پی رہے ہیں۔

(اقبال شناسی کے زاویے (منتخب مقالات مجلّہ اقبال 1974ء-1984ء) مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر' لاہور : بزم اقبال' ص 313-319- نیز : اقبالیات از مولانا غلام رسول مہر مرحوم' مرتبہ امجد سلیم علوی' لاہور 1988ء ص 175-180)

ڈاکٹر آر۔ اے۔ نکلسن
مترجم: ڈاکٹر عبداللہ چغتائی

پیام مشرق

عہد حاضرہ کے ہندی شعرا میں اقبال ایک نہایت رفیع پایہ رکھتا ہے۔ اس کے ساز سے دو قسم کے نغموں کی صدائیں نکلتی ہیں۔ پہلی صدا ہندی الاصل (اردو) جو ہندی حرمت وطن کے جذبات کے لئے داد طلب ہے۔ اگرچہ اقبال سیاسی حیثیت سے وطن پرست نہیں۔ دوسرا سرود خاک ایران کی شیریں اور سریلی زبان میں ہے' جو مسلمان جماعت کے ساتھ مخصوص ہے۔ در حقیقت یہ جدید اور فیضانی سرود جو اپنی سحرکاریوں سے آتشیں شعلے اور خاکستر دور دور پھیلا رہا ہے' عنقریب ایک الہامی آواز کی حیثیت سے پیدا کرنے والا ہے۔

اقبال نے پنجاب میں جنم لیا اور تعلیم کی تکمیل انگلستان و جرمنی میں کی۔ گویا مشرق و مغرب کا اقتران ہوا' لیکن یہ کہنا مبالغہ ہو گا کہ وہ متحد ہو گئے۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی قدرتی کمالات سے معمور کیوں نہ ہو' امید نہیں کر سکتا کہ دونوں تہذیبوں سے جو مختلف اساسوں پر مبنی ہیں' کماحقہ حظ اٹھائے۔ حالانکہ اقبال مغربی تربیت سے خاصا متاثر ہے۔ مگر اس کا روح خیال خالصاً مشرقی ہی رہتا ہے۔ بیشک گوئٹے' بائرن اور شیلے سے وہ باخبر ہے۔ وہ نٹشا کی کتاب "قول زرتشت" (جس میں اس نے اپنی تعلیمات کو دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا ہے) اور برگساں کی کتاب "ارتقا تخلیقی" سے اتنا ہی آشنا ہے' جتنا وہ قرآن اور مثنوی مولانا روم سے۔ مگر مغربی تہذیب کے "اصول انسانیت" سے وہ نسبتاً کم باخبر معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم

محسوس کرتے ہیں کہ اس کی تنقید جو اگرچہ کبھی سطحی نہیں ہوتی، مگر بعض اوقات جامع بھی نہیں ہوتی۔

اس کے فلسفہ کے معتبر نظریئے جو زیادہ تر "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" میں اشارتاً نہیں بلکہ صراحتاً مذکور ہیں، مختصراً یہاں بیان کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے علم کے بغیر اقبال کے کلام کا سمجھنا آسان نہیں۔

وہ حقیقت کو تکوین کا عمل قرار دیتا ہے کہ ایک دائمی حکومت ہستی مطلق کا قصر سکوت اس کے نظام اشیا میں کوئی محل نہیں رکھتا۔ کل حرکت میں ہے۔ کائنات افراد کے اشتراک کا نام ہے، جس کا موجد بے ہمتا یعنی خدا ہے۔ وجود کی تشکیل اور تہذیب ان کا مقصد حیات ہے۔ انسان کامل نہ محض مادہ کی دنیا پر تسلط جما کر جذب کر سکتا ہے، اس لئے حیات کا جوہر محبت ہے جو اپنے اعلیٰ پایہ میں تخلیق خواہشات، تخیلات اور ان کے اظہار کی سعی ہے۔ چنانچہ خواہشات ہی، خواہ اچھی ہوں یا بری، شخصیت کو قوی یا کمزور کر دیتی ہیں اور تمام قدر و منزلت اسی معیار سے جانچی جاتی ہے۔

یہ ضرور نہیں(۱) کہ نٹشا اور برگساں کو اقبال سے مناسبت دی جائے، حالانکہ یہ کم واضح ہے کہ کیوں اقبال اپنی خیالی مجلس کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تصور اسلام کے مطابق پیش کرتا ہے اور کیوں اس مجلس کی شرکت کا استحقاق مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی جدوجہد کرنے والے نے فلسفی کو پسپا کر دیا ہے، جس کا منطقی نتیجہ غلط مگر شاعری کے لحاظ سے صحیح ہے۔ شاعر اقبال کو معقولات سے سخت نفرت ہے۔ وہ ابن سینا کا مولانا رومی سے تباین ظاہر کرتا ہے:

بو علی اندر غبار ناقہ گم　　دست رومی پردۂ محمل گرفت
ایں فروتر رفت و تا گوہر رسید　　آں بگرداب چوخس منزل گرفت
حق اگر سوزے ندارد حکمت است　　شعر میگردد چو سوز از دل گرفت

"پیام مشرق" گوئٹے کے "دیوان مغرب" کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ اقبال ابتدائی اشعار میں جو امیر افغانستان کے تہدیہ میں خطاب کئے گئے ہیں، کہتا ہے:

پیر مغرب شاعر المانوی
آں قتیل شیوہ ہائے پہلوی

بست نقش شاہدان شوخ و شنگ
داد مشرق را سلامے از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغام شرق
ماہ تابے ریختم بر شام شرق

اگرچہ "پیام" "دیوان" سے بظاہر مشابہ ہے کیونکہ دونوں میں مختصر نظمیں ابواب میں مرتب ہیں اور علیحدہ علیحدہ عنوان رکھتے ہیں۔ ویسے اپنے عام مقصد میں نفس مضمون کے لحاظ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ گوئٹے کی صرف "حور و شاعر"(2) اور "جوئے آب" نظمیں ہیں' جو دیوان میں شامل نہیں ہیں اور "پیام" میں انہیں عنوان سے براہ راست جواب دی گئی ہیں۔ "جلال اور گوئٹے" کے عنوان کے تحت میں اقبال' مولانا جلال الدین رومی کو' جس کا وہ نہایت مداح ہے' گوئٹے سے بہشت میں ملاقات کرتا ہوا تصور کرتا ہے۔ اس کو سننے کے بعد "فوسٹ"(3) مصنفہ گوئٹے کا مطالعہ کیا ہے۔ رومی اس طرح کلام کرتا ہے:

فکر تو در کنج دل خلوت گزید — ایں جہان کہنہ را باز آفرید
سوز و ساز جاں بہ پیکر دیدہ ای — در صدف تعمیر گوہر دیدہ ای
ہر کسے از رمز عشق آگاہ نیست — ہر کسے شایان ایں درگاہ نیست
"داند آں کو نیک بخت و محرم است — زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است"

"پیام" کے کثیر حصہ کا سمجھنا مشکل ہے اور اس سے زیادہ مشکل اس کا ترجمہ کرنا ہے۔ پیچیدہ جذبات اور مشکل فلسفی تخیلات اکثر اوقات فارسی شاعری کے استعارات و تشبیہات میں پنہاں ہو جاتے ہیں' لیکن دراصل اظہار شدہ ہمارے ادراک پر بڑی طلب پیدا کرتے ہیں۔ مزید برآں ہماری ہمدردی کو بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ ذیل کا خلاصہ خط ہے' جو شاعر کو اس کے کسی مسلمان دوست نے لکھا ہے۔ واقعی ایک اعلیٰ تربیت یافتہ اور فہمیدہ انسان مادہ کے اصل اصول کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اگر کسی نے کافی پڑھا ہو' کافی تفکر کیا ہو اور کافی ہی شبہات میں پڑا ہو' تو اعلیٰ تخیل تک پہنچ سکتا ہے' جس پر آپ اپنے مطالعہ کرنے والوں کو اپنے سادہ طریقہ سے لے جانے کی خواہش کرتے ہیں۔ یہ کتاب محض ان کے لئے ہے' جو اپنی خودی کو ارادتاً مصروف کرنے کے شغل سے کافی واقف ہوتے ہیں' کیونکہ وہ اسے ایک فریب سے اور دوسرے تک لے جانے کے لئے ذریعہ ایمان بناتے ہیں

معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تمام انسانی دنیائے جذبات کی غایت بلندی سے لے کر تنگ و تاریک شکوک تک تلاش کر لی ہے۔ آپ کے معاملہ میں نہایت وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔ "دست از یک بند تا افتاد بند دگر" اور ہم ہیں کہ نہ اتنا محسوس کیا ہے اور نہ اتنا مشاہدہ کیا ہے' اس لئے ہم کو اس اعلیٰ روحانی دنیا میں رہنے کی نہ جرات ہے اور نہ قابلیت ہی رکھتے ہیں۔ مگر وقتاً" فوقتاً" اس میں تفکر کرتے ہیں۔

میں جو کچھ کر سکتا ہوں' وہ یہ ہے کہ شاعر کے تخیل کے اشارات قلمبند کر دوں۔ اس امید میں کہ بعض لوگ جو میرا ترجمہ پڑھیں گے' تو اس عجیب و غریب کتاب کو مجموعی حیثیت سے مطالعہ کرنے کی طرف راغب ہوں گے۔ یہ اس قابل ہے کہ اقبال کی بلند اور زبردست شخصیت سے تعارف کرا دے۔ یہ مسلمہ ہے کہ جس قدر سخت تکالیف ہوتی ہیں' اتنا ہی عظیم ان کا اجر ہوتا ہے۔ جیسا کہ عرصہ ہوا۔ لسرمین نے کہا ہے....

اقبال کے لئے خود شعوری و انفرادیت ہی اصل اصول ہے۔ وہ ہمیشہ علم ذات و اثبات خودی اور ارتقاء نفس کا سبق دیتا ہے۔ اس کا مقصد حیات عمل ہے' جس کا انجام روحانی اور اخلاقی قوت ہے' جو ضبط نفس و اطاعت سے نشو و نما پاتی ہے۔ ہم مادہ کو تسخیر کرنے کے بعد آزاد ہو جاتے ہیں اور پروحدت زندگی اور وقت کے فضائی تصور کے بعد غیر فانی زندگی حاصل کرتے ہیں:

زندگی

1

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست؟
گفتامئے کہ تلخ تراوتکوتر است
گفتم کہ کرمک است و زگل سربروں زند
گفتا کہ شعلہ زاد مثال سمندر است
گفتم کہ شد بہ فطرت خامش نہادہ اند
گفتا کہ خیر او نہ شناسی ہمیں شر است
گفتم کہ شوق سیر نبردش بمنزلے

گفتا کہ منزلش بہ ہمیں شوق مضمر است
گفتم کہ خاکی است و بہ خاکش ہمی دہند
گفتا چو دانہ خاک شگافد گل تر است

2

گدائے جلوۂ رفتی برسر طور
کہ جان تو ز خود نامحرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن
خدا ہم در تلاش آدمے ہست

3

میا را بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و باموجش در آویز
حیات جاوداں اندر ستیز است

4

دل من رازدان جسم و جاں است
نہ پنداری اجل برمن گراں است
چہ غم گریک جہاں گم شد ز چشمم
ہنوز اندر ضمیرم صد جہاں است

5

جہان ما کہ پایانے ندارد
چو ماہی در یم ایام غرق است
یکے بر دل نظر وا کن کہ بینی
یم ایام در یک جام غرق است

6

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں

خواب را مرگ سبک داں مرگ را خواب گراں

7

می خورد ہر ذرۂ ما پیچ و تاب
محشرے در ہر دم ما مضمر است
با سکندر خضر در ظلمات گفت
مرگ مشکل زندگی مشکل تر است

8

حیات جاوید

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ نا خوردہ در رگ تاک است
چمن خوش است و لیکن چو غنچہ نتواں زیست
قبائے زندگیش از دم صبا چاک است
اگر زرمز حیات آگہی، مجوے دیگر
دلے کہ از خلش خار آرزو پاک است
بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

9

شبے زار نالید ابر بہار
کہ ایں زندگی گریہ پیہم است
درخشید برق سبک سیر و گفت
خطا کردہ ای خندۂ یک دم است
ندانم بہ گلشن کہ برد ایں خبر
سخنہا میان گل و شبنم است

10
زندگی و عمل

(در جواب نظم ہائنا موسوم بہ سوالات)

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موج ز خود رفتہ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم گر زوم نیستم

11
نوائے وقت

خورشید بہ دامانم، انجم بہ گریبانم
در من نگری، ہیچم، در خود نگری جانم
در شہر و بیابانم در کاخ و شبستانم
من دردم و درمانم، من عیش فراوانم
من تیغ جہاں سوزم، من چشمہ حیوانم
چنگیزی و تیموری، مشتے زغبار من
ہنگامہ افرنگی، یک جستہ شرار من
انسان و جہان او، نقش و نگار من
خون جگر مرداں، سامان بہار من
من آتش سوزانم، من روضہ رضوانم
آسودہ و سیارم، ایں طرفہ تماشا بیں
در بادۂ امروزم، کیفیت فردا بیں
پنہاں بہ ضمیر من، صد عالم رعنا بیں
صد کوکب غلطاں بیں، صد گنبد خضرا بیں
من کسوت انسانم، پیراہن یزدانم

تقدیر فسون من، تدبیر فسون تو
تو عاشق لیلائے، من دشت جنون تو
چوں روح رواں پاکم از چندو چگون تو
تو راز درون من، من راز درون تو
از جان تو پیدایم، در جان تو پنہانم
من رہرو و تو منزل، من زرع و تو حاصل
تو ساز صد آہنگے، تو گرمی ایں محفل
آوارۂ آب و گل! در یاب مقام دل
گنجیدہ بہ جامے بیں، ایں قلزم بے ساحل
از موج بلند تو سر برزدہ طوفانم

12
سرود انجم

ہستی ما نظام ما
مستی ما خرام ما
گردش بے مقام ما
زندگی دوام ما
دور فلک بکام مامے نگریم و مے روئیم
جلوہ گہہ شہود را
بت کدۂ نمود را
رزم نبود و بود را
کشمکش وجود را
عالم دیروز ودرا، مے نگریم و مے روئیم
گرمی کارزار ہا
خامی پختہ کار ہا

تاج و سریر و دارہا
خواری شہریار ہا
بازی روزگار ہا، مے نگریم و مے رویم

خواجہ ز سروری گذشت
بندہ ز چاکری گذشت
زاری و قیصری گذشت
دور سکندری گذشت
شیوۂ بت گری گذشت، مے نگریم و مے رویم

خاک خموش و در خروش
ست نہاد و سخت کوش
گاہ بہ بزم ناؤ نوش
گاہ جنازۂ بدوش
میر جہان و سفتہ گوش! مے نگریم و مے رویم

تو بہ طلسم چون و چند
عقل تو در کشاد و بند
مثل غزالہ در کمند
زار و زبون و درد مند
ما بہ نشیمن بلند، مے نگریم و مے رویم

پردہ چرا؟ ظہور چیست؟
اصل ظلام و نور چیست؟
چشم و دل و شعور چیست؟
فطرت ناصبور چیست؟
ایں ہمہ نزد و دور چیست؟ مے نگریم و مے رویم

بیش تو نزد ما کے
سال تو پیش ما دمے

اے بکنار تو بے
ساختہ ای بہ شبنمے
ما بتلاش عالمے، مے نگریم دمے رویم

اخیر حصہ کا عنوان "نقش فرنگ" ہے، جس میں مشرقی ناظر کے لئے اہم ترین مغربی تخیل کی توضیح شاعر کے نقطہ نظر سے کی گئی ہے۔ (اور مغربی ناظر کے لئے) اپنے آپ کو اس طرح مشاہدہ کرنا جس طرح اس کو دوسرے کرتے ہیں، بہت بہتر ہے اور اس سے بہتر یہ ہے کہ ہم صحیح پیام کو دل سے لگائیں، جس میں اقبال خشک عقلی زنجیروں کو اتار کر پھینکنے اور ہماری حیات و محبت کی اندرونی دنیا میں ظاہر ہونے کی تلقین کرتا ہے:

13

دانش اندوختہ ای دل زکف انداختہ ای
آہ زاں نقد گراں مایہ کہ درباختہ ای
حکمت و فلسفہ کارے است کہ پایانش نیست
سیلی عشق و محبت بہ دبستانش نیست
بیشتر راہ دل مردم بیدار زند
فتنہ نیست کہ در چشم سخندانش نیست
دل زناز خنک او بہ تپیدن نرسد
لذتے در خلش غمزۂ پنہانش نیست
دشت و کہسار نوردید و غزالے نگرفت
طوف گلشن زد ویک گل بہ گریبانش نیست
چارہ ایں است کہ از عشق کشادے طلبیم
پیش او سجدہ گذاریم و مرادے طلبیم

چشم بکشائے اگر چشم تو صاحب نظر است
زندگی در پے تعمیر جہاں دگر است

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود
ایں مئے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود
آنچہ بود است و نباید زمیاں خواہد رفت
آنچہ بایست و نبود است ہماں خواہد بود
عشق از لذتے دیدار سراپا نظر است
حسن مشتاق نمود است و عیاں خواہد بود
آں زمنے کہ ہرو گریہ خونیں زدہ ام
اشک من در جگرش لعل گراں خواہد بود
مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم داند
شمع کشتند وز خورشید نشانم دادند

اقبال ادنیٰ ادنیٰ سیاسی واقعات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اس کی جمعیت الاقوام کے متعلق سطور خاص کا اپنا ہی رنگ رکھتی ہیں:

14
جمعیت الاقوام

برفتند تا روش رزم دریں بزم کہن
درد مندان جہاں طرح نواندختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

15

فلسفی را با سیاست داں بیک میزان سنج
چشم آں خورشید کورے دیدۂ ایں بے نمے

مگر فلسفی بذات خود اثر کن چوٹیں سہتے ہیں۔ خاص کر ہیگل جس کے بلند پرواز دماغ کو کہا جاتا ہے۔ "ماکیاں کز زور مستی خابہ گیرد بے خروس" مثلاً مصنف کا طریقہ جسے اپنے مسلمان ناظرین کو مغربی فلسفہ سے آشنا کرنے کی خاطر اختیار کیا ہے۔ شوپن ہار اور نیٹشا کے

متعلق اس کے کلام کو پیش کرتا ہوں :

16
شوپن ہارو نیٹشا

مرغے ز آشیانہ بسیر چمن پرید
خارے ز شاخ گل بہ تن نازکش خلید
بد گفت فطرت چمن روزگار را
از درد خویش وہم زغم دیگراں تپید
داغے زخون بیگنے لالہ را شمرد
اندر طلسم غنچہ فریب بہار دید
گفت اندریں سرا کہ بنایش فتادہ کج
صبحے کجا کہ چرخ درد شامہا نچید
نالید تابحوصلہ آں نوا طراز
خوں گشت نغمہ و زدو چشمش فرو چکید
شور فغان او بہ دل ہدہدے گرفت
بانوک خویش خار ز اندام او کشید
گفتش کہ سود خویش ز جیب زیاں برآر
گل از شگاف سینہ زر ناب آفرید
درماں زدرد ساز اگر خستہ تن شوی
خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی

حالانکہ اقبال بہ صمیم قلب نیٹشا کے ارادہ قوت سے متفق ہے۔ اس کا نظریہ کہ اسلام ایک خیالی جماعت تصور کیا گیا ہے' جو خدائی اور جمہوری سلطنت ہے۔ اس کا "دیوانہ بکار شیشہ گر رسید!" سے مقابلہ کرتا ہے' (4) جسے وہ شاید غیر واجبانہ ایک دہریہ تصور کرتا ہے۔

17
نیٹشا

گر نوا خواہی زپیش او گریز
در نے کلکش غریو تندر است
نیشتر اندر دل مغرب فشرو
دستش از خون چلیپا احمر است
آنکہ بر طرح حرم بت خانہ ساخت
قلب او مومن دماغش کافر است(5)
خویش را در نار آں نمرود سوز
زانکہ بستان خلیل از آذر است

میں خیال کرتا ہوں کہ یہ مناسب ہو گا کہ مصنف پیغام (اقبال) کو بحیثیت زندہ مسلمان کے بیان کردوں، واقعی کوئی بھی جدید فلسفی نہیں، جس سے اسے اتنی ہمدردی ہے، جتنی برگساں جس کی تعلیم کو ان سطور میں بیان کرتا ہے:

18
پیغام برگساں

تا بر تو آشکار شود راز زندگی
خود را جدا ز شعلہ مثال شرر مکن
بہر نظارہ جز نگہ آشنا میار
در مرز و بوم خود چو غریباں گذر مکن
نقشے کہ بستہ ای ہمہ اوہام باطل است
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

ظریف اور دلکش تنقید کے قدر دان خاصا سامان تفریح پائیں گے۔ مثلاً آئن شائن کے متعلق "گردہ زر دشتے ز نسل موسیٰ و ہارون ظہور!" یا لینن کے متعلق جو قیصر ولیم کو غلبہ

اشتراکیت کا دعویٰ کرتے ہوئے جواب دیتا ہے کہ لوگوں نے محض ایک آقا کا دوسرے سے تبادلہ کر لیا ہے:

نماند ناز شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

"قسمت نامہ سرمایاہ دار و مزدور" اور "نوائے مزدور" کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال۔دل و جان سے مزدور کا طرف دار ہے۔ یہاں "نوائے مزدور" کے اقتباس پر اکتفا کیا جاتا ہے:

19

زمزد بندۂ کر پاس پوش و محنت کش
نصیب خواجہ نا کردہ کار رخت حریر
زخوئے فشانی من لعل خاتم والی
ز اشک کودک من گوہر ستام امیر
بطوف شمع چو پروانہ ز یستن تاکے
زخویش ایں ہمہ بیگانہ ز یستن تاکے

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ اصول جو فلسفہ میں عقلیت کے خلاف چلتا ہے' سیاسیات میں بھی سلطنت کے خلاف چلتا ہے۔ انتہا و اعتدال قوم پرست اقبال کو اپنے مطالب کے مطابق بحوالہ پیش کر سکتے ہیں' جیسے فرقہ سائنڈ کلسٹ برگساں کا حوالہ دیتا ہے۔ مگر روح حیات پھونکنے والے عمل کو لغو تحریک پر بنا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اقبال کھلم کھلا ضبط نفس کو بیان کرتا ہے جو خود شعوری کی اعلیٰ شان ہے اور خیالی آدمی میں تعقل اور فہم ایک ہی ہو جاتے ہیں۔ یقین رکھنا چاہئے کہ یہ اس کے نقاد کی تسلی نہیں کرے گا' جو اس کے نظریات کے استعمال کو کافی وضاحت سے جانتے ہیں۔ ان کو اس کا "خطاب بہ انگلستان" پڑھنا چاہئے:

20

خطاب بہ انگلستان

مشرقی بادہ چشید است زمینائے فرنگ
مئے نیست اگر توبہ دیرینہ شکست
فکر نو زادۂ او شیوۂ تدبیر آموخت
جوش زد خوں بہ رگ بندۂ تقدیر پرست
ساقیا تنگ دل از شورش مستاں نشوی
خود تو انصاف بدہ ایں ہمہ ہنگامہ کہ بست؟
"بوئے گل خود بہ چمن راہ نما شد زنخست
ورنہ بلبل چہ خبر داشت کہ گلزارے ہست"

حواشی

1- یہاں پر جتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر براؤن نے اپنی تالیف "تاریخ ادبیات فارس" کی چوتھی جلد صفحہ 430 پر جہاں "حکمت الاشراق" مصنفہ شہاب الدین سہروردی کا ذکر کیا ہے وہاں ڈاکٹر اقبال کی تالیف "مابعد الطبیعیات ایران" سے کچھ نقل کر کے اقبال کے نظریہ مذہب بابی سے کُلّی طور پر اتفاق ظاہر کیا ہے' مگر ساتھ ہی اسی صفحہ پر ایک مختصر سا نوٹ بھی اقبال کا تعارف کرانے کی غرض سے (جس میں آپ کی "اسرار خودی" کے متعلق مذکور ہے) لکھا ہے کہ "یہ کتاب لاہور یونیورسٹی پریس میں طبع ہوئی ہے (جو غلط ہے)۔ یہ مشرقی رنگ میں نیٹشا مشہور جرمن فلسفی کے فلسفہ کا چربہ ہے۔" یہ یاد رہے کہ جب دو بڑے آدمی اگر اپنے کسی جزویات میں ایک دوسرے سے اتفاقیہ متفق ہو جائیں' جس کے نتیجہ میں کُلّی اختلاف ہو' تو ان دونوں کو ایک دوسرے کا کُلّی طور پر خوشہ چیں یا متشابہ نہیں کر سکتے۔ مزید برآں ہم ناظرین کی اطلاع کے لئے ڈاکٹر براؤن کے اپنے الفاظ جو آپ نے لندن کے شاہی مشرقی مجلس کے 1921ء صفحہ 147 پرچہ میں اسی کتاب "اسرار خودی" کے مترجمہ نکلسن انگریزی پر تبصرہ کیا ہے اور اپنے الفاظ کی نہیں' بلکہ جہاں خود نکلسن کو ذرہ بھر بھی اس قسم کا شبہ ہوا ہے' اس کی بھی کامل طور پر تردید کی ہے۔ وہو ہذا:۔ "جیسا کہ ڈاکٹر نکلسن بیان کرتا ہے کہ زیادہ تر نٹشے اور برگساں کا اور بہت کم جدید فلسفہ افلاطون کے

ماہرین اور ان کے مشرقی جانشین کا مرہون منت ہے۔ حالانکہ کسی حالت میں بھی مغربی فلسفہ نہیں بلکہ صراحتاً" فلسفی کی حیثیت سے اخوت اسلامی کی تعلیم ہے' جو استغراق' انسداد خودی و ہمہ اوست کے امراض کے علاج کے لئے لکھی گئی ہے۔ مصنف کے نظریہ کے مطابق جنہوں نے پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندہ تعلیم کے تابعین کو مردہ کر دیا ہے' اس کا روئے سخن جیسا کہ ڈاکٹر نکلسن نے بیان کیا ہے' محض مسلمانان ہند کے لئے نہیں' بلکہ مسلمانان عالم کے لئے ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے بجائے اردو کے فارسی میں تصنیف کرتا ہے' جو ایک عمدہ مسلک ہے' کیونکہ خواندہ مسلمان بہ نسبت اور زبان کے فارسی سے زیادہ آشنا ہیں' جسے بالخصوص اپنے فلسفیانہ تخیلات کو بلا توقف بلند پرواز و دلربا پیرایہ میں بیان کرنے کی غرض سے کماحقہ ادا کیا ہے۔ (مترجم)

2- جن کے جرمنی نام " حوری انٹ دختر " ہیں۔

3- " گوئٹے کی مشہور و معروف تصنیف ایک ڈراما ہے' جس میں شاعر نے حکیم فوسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کا قدیم روایت کے پیرائے میں بیان کیا ہے اور انسان کے امکانی نشو و نما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمال فن خیال میں نہیں آ سکتا۔"

4- ڈاکٹر اقبال نے 1916ء میں ایک مضمون بعنوان "جمہوریت اسلام" "نیو ایرا" اخبار میں لکھا' جس میں آپ نے نٹشے سے اس سلسلہ میں اختلاف ظاہر کرتے ہوئے یورپ کی جمہوریت کا بھی نقشہ پیش کیا ہے۔ وہو ہذا۔ مغربی جمہوریت کو معاشرتی بدامنی اور فساد کے خطرہ میں پناہ دی گئی ہے' جو محض مغربی مجالس کی اقتصادی حیات جدید سے وجود میں آئی ہے۔ نٹشے تاہم جمہوری حکومت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور عام طبقہ سے ناامید نظر آتا ہے۔ وہ تمام اعلیٰ تہذیب کو حکومت شخصی کی تربیت و ترقی پر بنا کرتا ہے۔ مگر کیا عام انسان کُلّی طور پر اسی طرح ناامید ہی جمہوریت اسلام ایزادی اقتصادی عصر سے پیدا نہیں ہوئی۔ یہ ایک روحانی اصول اس فرضیت پر مبنی ہے کہ بنی نوع انسان مستور حکومت کا مرکز ہے' جس کی ممکنات ایک خاص قسم کے عمل سے پیدا کی جا سکتی ہیں۔ اسلام نے عوام میں سے بہترین حیات و عمل کی ہستیاں پیدا کی ہیں۔ پھر کیا جمہوریت ابتدائے اسلام نیٹشا کے نظریات کا عملی بطلان نہیں ہے۔

5- نیٹشا نے مسیحی فلسفہ اخلاق پر زبردست حملہ کیا ہے۔ اس کا دماغ اس واسطے کافر ہے کہ وہ خدا کا منکر ہے۔ گو بعض اخلاقی نتائج میں اس کے افکار مذہب اسلام کے بہت سے قریب ہے۔ "قلب او مومن دماغش کافر است" نبی کریمؐ نے اس قسم کا جملہ امیہ بن صلت (عرب شاعر) کی

نسبت کیا تھا **امن لسانہ و کفر قلبہ**" یعنی "زبان سے مومن ہے اور دل سے کافر ہے۔"

(نیرنگ خیال (لاہور) اقبال نمبر' ستمبر و اکتوبر 1932ء' ص 314-327- نقوش (اقبال نمبر)' 1977ء' ص 224-235- نیرنگ خیال (لاہور) عید نمبر' 1925ء- رسالہ "پیغام حق" (لاہور) اقبال نمبر' 1946ء' ص 180-194- اقبال کی صحبت میں' لاہور : مجلس ترقی ادب' 1977ء' ص 142-161- اقبال ممدوح عالم' مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر' لاہور : بزم اقبال' 1978ء' ص 90-110- اقبال غیر مسلموں کی نظر میں' مرتبہ شمیم حیات سیال اور محمد حیات خاں سیال' لاہور : مکتبہ شاہکار' بلا تاریخ' ص 69-79- نکلسن کے اسی تبصرے کا اردو ترجمہ از حبیب اللہ رشدی' در : مجلّہ عثمانیہ' جلد دوم شمارہ سوم و چہارم' 1928ء' (نیز "اقبال ریویو"' حیدر آباد دکن' اپریل 1994ء ص 3-8- نقد اقبال حیات اقبال میں' مرتبہ ڈاکٹر تحسین فراقی' لاہور : اقبال اکادمی پاکستان' 1992ء' ص 319-338-)

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی

پیام مشرق

1922ء میں جب علامہ اقبال انارکلی والے مکان میں رہائش رکھتے تھے' انہوں نے جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے "مغربی دیوان" کے جواب میں اپنی کتاب "پیام مشرق" شائع کی۔ جب یہ کتاب چھپ گئی تو چودھری محمد حسین مرحوم نے اس پر رسالہ "ہزار داستان" لاہور کے فروری 1923ء کے پرچے میں ایک مبسوط تبصرہ لکھا۔ "ہزار داستان" کے مذکورہ شمارے کے شروع میں علامہ کی ایک تصویر بھی شائع ہوئی تھی اور ایک پورے صفحے پر "پیام مشرق" کی ایک رباعی بھی "خود نگرے" کے عنوان سے طبع ہوئی تھی۔ اس کے بعد چودھری محمد حسین کا مذکورہ تبصرہ صفحہ 4 سے شروع ہوا' جو صفحہ 15 پر ختم ہوا۔ اس رسالے کے مدیر نے بھی علامہ پر ایک نوٹ سپرد قلم کیا تھا۔

1923ء میں جب علامہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں آ گئے تھے' تو انہوں نے مجھے "پیام مشرق" کے تین نسخے دیئے تھے۔ ایک نسخہ ڈاکٹر نکلسن کے لئے تھا' جو میں نے انہیں کیمبرج بھیج دیا۔ دوسرا مولانا سید انور شاہ صاحب کے لئے تھا' جو میں نے دیوبند کے پتے پر ان کی خدمت میں ارسال کر دیا اور تیسرا نسخہ علامہ نے مجھے عنایت فرمایا تھا' جو میں نے اپنے پاس رکھ لیا۔

ڈاکٹر نکلسن نے جب "پیام مشرق" کا مطالعہ کر لیا' تو انہوں نے اس پر ایک عالمانہ تبصرہ انگریزی زبان میں لکھا جو رسالہ "اسلامیکا" لپزگ (جرمنی) کے اول نمبر میں 1925ء

میں شائع ہوا۔ اس تبصرے کا اردو ترجمہ میں نے علامہ کی موجودگی میں اور ان کے مشورے سے کیا تھا' جو "نیرنگ خیال" میں شائع ہوا۔ اس پر جو حواشی لکھے گئے ہیں' ان کی تیاری میں بھی علامہ نے میری مدد فرمائی تھی۔ یہی ترجمہ 1932ء میں "نیرنگ خیال" کے سالنامے (صفحہ 103 - 107) میں چھپا اور پھر ماہنامہ "پیغام حق" کے اقبال نمبر میں فروری 1946ء میں طبع ہوا (صفحہ 180 - 195)۔

مولانا سید انور شاہ صاحب مرحوم نے نکلسن کے اس تبصرے کے جواب میں عربی زبان میں ایک کتاب لکھی تھی' جس کا نام "عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام" تھا اور یہ کتاب انہوں نے علامہ کو بھی ارسال فرمائی تھی۔ اس پر یہ عبارت درج تھی:

"بعالی خدمت علامہ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب دام ظلہ۔"

1923ء میں جامعہ ملیہ کے تین پروفیسر ڈاکٹر سید عابد حسین' پروفیسر حبیب الرحمان اور پروفیسر غلام السیدین کشمیر جاتے ہوئے لاہور سے گزرے تو بطور خاص علامہ اقبال کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ انہوں نے "پیام مشرق" کا 1923ء والا مذکورہ ایڈیشن دیکھا تو اس کی طباعت وغیرہ کو ناپسند کیا۔ پھر انہوں نے جامعہ ملیہ کے پریس کی کارکردگی کی تعریف کرتے ہوئے علامہ سے درخواست کی کہ "پیام مشرق" کا ایک اور ایڈیشن وہ اپنی نگرانی میں چھاپنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ چنانچہ علامہ راضی ہو گئے اور عبدالمجید پروین رقم کی کتابت سے آراستہ یہ نہایت ہی نفیس ایڈیشن جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مطبع سے چھپ گیا۔ طباعت اور کتابت کے لحاظ سے یہ ایڈیشن واقعی ایک شاہکار ہے اور اس کا ایک نسخہ راقم کے پاس بھی محفوظ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسا نفیس ایڈیشن پھر کبھی شائع نہیں ہوا۔ اس کے شروع میں "پیشکش بحضور اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ فرماں روائے دولت افغانستان خلد اللہ ملکہ و اجلالہ" کی عبارت درج ہے اور کاتب اور کتب فروش کے نام بھی طبع ہوئے ہیں۔

1932ء میں یورپ بھر میں گوئٹے کی صد سالہ برسی منائی گئی تھی۔ علامہ اقبال بھی اس زمانے میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لندن میں موجود تھے اور دوستوں کے ساتھ علمی موضوعات پر خوب بحثیں اور مذاکرات ہوتے تھے۔ راقم بھی ان دنوں لندن میں موجود تھا۔ اسی زمانے میں عبدالرحمان چغتائی مرحوم کے ہمراہ ایک جرمن لڑکی ایلزا ہینفر نامی علامہ سے ملنے آئی' جو خاصی پڑھی لکھی تھی۔ اس کے ساتھ دیر تک مفید گفتگو ہوتی

رہی۔ اس کا ذکر میں نے اقبال کے قیام لندن (1932ء) کی یادداشتوں میں بھی مختصراً کیا ہے۔ دوران ملاقات میں "گوئٹے کی گفتگو ایکرمین سے" کا ذکر بھی آیا' جسے علامہ بخوبی جانتے تھے۔ اس کا ایک مستند ترجمہ ہیولاک ایلس نے 1930ء میں کیا تھا' جو لاہور آ کر میں نے خریدا اور علامہ نے بھی اسے دیکھا۔ اس میں مصوری پر اور آرٹسٹ روبنز پر بڑی مفید بحث کی ہے۔

جرمن لڑکی ایلز کے ہاتھ میں رسالہ "نیرنگ خیال" کا 1932ء کا سالنامہ تھا' جو اسی سال چھپا تھا اور اس میں نکلسن کے تبصرۂ "پیام مشرق" کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا تھا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اس لڑکی کو "نیرنگ خیال" کی ظاہری شکل و صورت پسند نہیں آئی اور وہ پرچے کی ہیئت کذائی سے ناخوش ہے۔ دراصل احباب نے علامہ کی تعریف و توصیف جس انداز میں کی تھی' اس کے پیش نظر وہ لڑکی سمجھتی تھی کہ اتنے عظیم آدمی کا ذکر اس قسم کے معمولی پرچے میں زیب نہیں دیتا۔ اس کے بعد جب علامہ نے ایک جرمن پروفیسر کیمف میئر پر گفتگو کی اور پھر گوئٹے پر بات چیت چل نکلی تو وہ علامہ کے خیالات سننے کی شائق نظر آنے لگی۔ چنانچہ علامہ نے "آرٹ اینڈ لٹریچر" پر بھی سیر حاصل بحث کی اور اپنی کتاب "پیام مشرق" کی تخلیق کی وجوہ پر روشنی ڈالی گئی' جو گوئٹے کے "دیوان مغرب" کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ علامہ نے دوران گفتگو فرمایا کہ مجھے زندگی کے بارے میں میتھیو آرنلڈ کے نظریات سے اختلاف ہے۔ اس ضمن میں آپ نے فارسی شعرا کے کلام سے بہت سے اشعار بھی سنائے۔ پھر لیسنگ کے نظریہ لاؤکون' سوفولس کے فلوکیٹس اور ورجل کے نظریات پر آپ نے تفصیل سے بحث کی' جسے سن کر جرمن لڑکی علامہ کے تبحر علمی کی قائل ہو گئی اور مطمئن ہو کر اٹھی۔

ایک مرتبہ میں نے علامہ سے سوال کیا کہ آپ نے "پیام مشرق" کو امیر امان اللہ خاں کے نام ہی معنون کیوں کیا؟ آپ نے مسکرا کر جواب دیا کہ میں اس کتاب کو کسی آزاد مسلمان کے نام معنون کرنا چاہتا تھا اور اس ضمن میں امیر امان اللہ سے زیادہ موزوں شخصیت کس کی ہو سکتی تھی؟ اس پر میں لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا کیونکہ "پیام مشرق" کے جذبے کو فعال بنانے کے لئے اس کا کسی مرد آزاد کے نام معنون ہونا نہایت ضروری تھا۔

"پیام مشرق" کی اشاعت کے بعد دوستوں نے علامہ سے اس کتاب کا ایک [illegible]ور

ایڈیشن شائع کرنے کی درخواست بھی کی تھی کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ علامہ کو ادب کا نوبل پرائز ضرور ملے گا اور اس کے لئے ایک شایان شان مصور ایڈیشن نہایت ضروری تھا۔ اس سے پہلے ٹیگور کی کتاب "گیتانجلی" کا بھی ایک مصور ایڈیشن شائع ہو چکا تھا' جس پر ییٹس نے انگریزی زبان میں مقدمہ لکھا تھا۔ مگر نہ تو "پیام مشرق" کا یہ ایڈیشن شائع ہو سکا اور نہ ہی مغرب والوں کی سیاسی مصلحت نے اقبال کو نوبل پرائز کا مستحق گردانا' جس سے ہندوستان کے تمام اہل علم کو دکھ ہوا۔

(اقبال کی صحبت میں' لاہور : مجلس ترقی ادب' 1977ء' ص 137-141)

ڈاکٹر عبدالشکور احسن

پیام مشرق

"پیام مشرق" علامہ کی تیسری فارسی تصنیف ہے' جو پہلی مرتبہ 1923ء میں شائع ہوئی۔ اس کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "پیام مشرق کی تصنیف کا محرک جرمن حکیم حیات گوئٹے کا مغربی دیوان ہے۔"(1) گوئٹے (1832ء) مشرقی تخیلات کی طرف بہت مائل تھا۔ اس کی مضطرب روح مغرب کی ہنگامہ آرائیوں سے بیزار مشرق کی پرسکون فضا میں عافیت کی متمنی تھی۔ حافظ شیرازی کے سحر آفریں کلام نے اسے شدت سے متاثر کیا۔ دونوں کی سرشار روح اور جذبات و میلانات میں ایک عجیب و غریب ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ بقول اقبال "جس طرح حافظ کے بظاہر سادہ الفاظ میں ایک جہان معنی آباد ہے' اسی طرح گوئٹے کے بیساختہ پن میں بھی حقائق و اسرار جلوہ افروز ہیں۔" حافظ کے نغموں نے گوئٹے کی روح میں جو زبردست ہیجان برپا کیا تھا' وہ بالآخر "مغربی دیوان" کی دلکش صورت میں رونما ہوا۔ "پیام مشرق" "مغربی دیوان" سے سو سال بعد لکھی گئی ہے۔ علامہ سو سال پیشتر کے جرمنی اور اپنے دور کے مشرق میں بھی مماثلت پاتے ہیں' لیکن عصر حاضر کے تجزیہ سے وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "اقوام عالم کا باطنی اضطراب ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔"(3) مشرق بالخصوص اسلامی مشرق صدیوں کے جمود کے بعد بیدار ہوا ہے۔ اس نازک اور اہم موڑ پر علامہ نے "پیام مشرق" میں ایسے مذہبی' اخلاقی اور ملی حقائق پیش کئے ہیں' جن کا مقصد افراد و ملل کی باطنی تربیت ہے۔ وہ اقوام مشرق کو خبردار

کرنا چاہتے ہیں کہ جب تک معنوی اور فکری طور پر زندگی میں انقلاب برپا نہ ہو' خارجی انقلاب کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس انقلاب کو شرمندۂ حقیقت بنانے کی ذمہ داری خود اقوام و افراد کے کندھوں پر ہے۔ یہاں علامہ نے قرآن حکیم کی آیہ شریفہ **ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم**' کی روشنی میں اس حقیقت کو فطرت کا اٹل قانون قرار دیا ہے اور اپنی تصانیف میں اسی صداقت کو پیش نظر رکھا ہے۔

کتاب افغانستان کے معاصر حکمران امیر امان اللہ خاں کے نام معنون کی گئی ہے۔ پیش کش کے تحت جو شعر کہے گئے ہیں' وہ روایتی انتساب سے مختلف اور منفرد ہیں۔ اس میں شاعر نے نہایت بے تکلفی سے اپنے جوہر ذاتی کا ذکر کیا ہے۔ اپنا مقابلہ گوئٹے سے کرتے ہوئے علامہ نے اپنے آپ اور گوئٹے کو "دانائے ضمیر کائنات" "پیغام حیات اندر ممات" اور "خنجر صبح دم و آئینہ فام" کے نام سے یاد کیا ہے۔ البتہ جہاں گوئٹے سمندر کی گہرائیوں میں تڑپنے کے بعد گریبان صدف سے باہر آگیا' وہ اپنے آپ کو سمندر کی آغوش میں کھویا ہوا پاتے ہیں:

او چمن زادے' چمن پروردۂ — من دمیدم از زمین مردۂ
او چو بلبل در چمن "فردوس گوش" — من بصحرا چوں جرس گرم خروش
ہر دو دانائے ضمیر کائنات — ہر دو پیغام حیات اندر ممات
ہر دو خنجر صبح خند' آئینہ فام — او برہنہ' من ہنوز اندر نیام
ہر دو گوہر ارجمند و تاب دار — زادۂ دریائے ناپیدا کنار
او ز شوخی در تہ قلزم تپید — تا گریبان صدف را بر درید
من بہ آغوش صدف تابم ہنوز — در ضمیر بحر نایابم ہنوز

انہیں اپنی بے قدری اور ناشناسی کا گلہ ہے۔ لوگ انہیں شاعر سمجھتے ہیں۔ ان سے حدیث دلبری سننا چاہتے ہیں' لیکن نہیں جانتے کہ یہ حکیم فرزانہ انہیں شکوہ خسروی بخش رہا ہے۔ وہ شاعر کی بے تاب روح سے ناآشنا ہیں۔ اس کی فطرت کو نہیں جانتے' جو عشق کی مستی سے سرشار اور رموز ملک و دین کی محرم ہے۔ اس کی ذات متاع ہنر سے آراستہ ہے' مگر دیار ہند میں اس کی حیثیت اس پرندے کی سی ہے' جو خود اپنے چمن میں بیگانہ لگتا ہو۔

اس تعارف کے بعد وہ مشرق کی مظلومیت اور بے بسی کی خونچکاں حقیقت سے پردہ

اٹھاتے ہیں۔ سرزمین مشرق و مغرب خون ترک سے لالہ زار ہے' خاک ایران سوز و ساز زندگی سے محروم ہے۔ مصر گرداب نیل میں محصور ہے۔ مسلم ہندی خود فروش اور دین فراموش ہے' لیکن اس غم میں وہ کھو نہیں جاتے اور سپر نہیں ڈالتے' بلکہ اپنے مخاطب کو رموز زندگی سے آشنا کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں:

زندگی جہد است و استحقاق نیست
جز بعلم انفس و آفاق نیست
گفت حکمت را خدا خیر کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر

اس کے بعد وہ علم و دولت کی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ مسلمان کو علم اشیا اور لذت احساس سے محروم پاتے ہیں اور انہیں حاصل کرنے کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ فرمانروائے افغانستان کو قبائے خسروی میں درویشی کی زندگی بسر کرنے اور ہجوم امور مملکت میں خود شناسی کا سبق دیتے ہیں کہ جن مسلمانوں نے عظمت و سطوت کے جھنڈے گاڑے تھے' انہوں نے فقیری کو اپنا شعار بنایا تھا۔ آخر میں وہ عشق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبہ بیدار کرتے ہیں کہ ملت کی زندگی اسی ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کے دم سے ہے اور اسی کے عشق سے کائنات میں رونق ہے۔ یہاں وہ پیغمبر اکرم صلعم کی ذات والا صفات سے اپنی بے تاب والہانہ محبت کا ذکر کرتے ہیں اور پھر اپنے مخاطب کو اسی عشق میں سرشار ہونے کی دعوت دیتے ہوئے "پیشکش" کو پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔

"پیام مشرق" چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں "لالہ طور" کے نام سے رباعیات ہیں۔ دوسرا "افکار" کے تحت نظموں پر مشتمل ہے۔ تیسرا حصہ "مئے باقی" کے عنوان سے غزلیات سے عبارت ہے اور چوتھے میں "نقش فرنگ" کے عنوان کے تحت جو نظمیں کہی گئی ہیں' ان کا موضوع مغربی افکار و سیاست ہے۔

لالۂ طور

"لالہ طور" کی رباعیات کا اسلوب مشہور ایرانی رباعی نگار بابا طاہر عریاں سے متاثر ہے اور علامہ نے اپنی تمام رباعیات روایت سے ہٹ کر اسی وزن میں کہی ہیں' جو

پانچویں گیارہویں صدی کے اس عظیم مجذوب شاعر نے اختیار کیا تھا۔ وزن کے اس غیر معمولی انتخاب کی وجہ سے بعض نقادوں نے ان رباعیات کو قطعات کہا تھا۔ چنانچہ علامہ نے اپنے ایک خط مورخہ 5 جون 1933ء میں یہ غلط فہمی رفع کرنے کی کوشش کی ہے:

"... ان کو رباعیات کہنا غلط نہیں۔ بابا طاہر عریاں کی رباعیات جو اس بحر میں ہیں، رباعیات ہی کہلاتی ہیں۔ ان میں قطعات بھی داخل ہیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ یہ رباعیات رباعی کے مقررہ اوزان میں نہیں ہیں، مگر اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔"(4)

بابا طاہر کی رباعیات میں سوز و ساز اور درد و خلش کی ایک غیر معمولی کیفیت ہے۔ عشق ان رباعیات کا واحد موضوع ہے۔ شاعر نے اپنے لطیف پاکیزہ عشق میں، جس کی آگ نے اس کے خرمن حیات کو جلا کے راکھ کر دیا ہے، قلندری اور بے نیازی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ بابا طاہر کے لطیف جذبات عشق، قلندرانہ انداز اور وفور شوق و مستی نے علامہ کو بہت متاثر کیا ہے۔

"لالہ طور" میں ایک سو تریسٹھ رباعیاں ہیں اور ان میں ترتیب وار مختلف مسائل کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ ان کا تعلق اقبال کے بنیادی افکار سے ہے۔ ہر موضوع پر متعدد رباعیات ہیں اور ہر موضوع کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں پر لطیف اور دلآویز رنگ میں الگ الگ رباعیات ہیں۔

خودی کے مضمون کو شاعر "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" میں تفصیل اور وضاحت کے ساتھ پیش کر چکا تھا۔ یہاں اس نے سب سے زیادہ اہمیت عشق کو دی ہے، جسے علامہ کے نظام فکر و عمل میں خودی کے ساتھ ساتھ بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ شروع کی رباعیات میں زندگی کی اسی قوت محرکہ کو شعر کے لطیف و رنگین تانے بانے میں پیش کیا گیا ہے۔

"لالہ طور" کی سب سے پہلی رباعی میں جس سے کتاب کا آغاز ہوتا ہے، کلاسیکی شاعری کے مخصوص انداز میں حضور خداوندی میں ہدیہ نیاز ہے۔ البتہ یہاں یہ نیاز جذبہ عشق سے لبریز ہے۔ پوری بزم وجود شہید ناز ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ حسن ازل کے حضور میں نیاز مجسم بنا ہوا ہے:

شہید ناز او بزم وجود است

نیاز اندر نہاد ہست و بود است
نمی بینی کہ از مہر فلک تاب
بسیمائے سحر داغ سجود است

یہ رباعی الفاظ کے حسن انتخاب، تخیل کی تابانی اور تشبیہ کی لطافت و رعنائی کے باعث کتاب کا حسین آغاز ہے اور فکر و فن کی لطیف ہم آہنگی کی خبر دیتی ہے۔

عشق کے موضوع پر شاعر نے جو اثر آفریں اور فکر انگیز رباعیاں کہی ہیں، ان میں عشق کی قوت تخلیق، جوش اور ہمہ گیری کا ذکر ہے۔ شاعر کی نظر میں سوز دروں اور تب و تاب زندگی کی معراج ہے۔ ہمارا سوز و ساز ناتمام ہی سہی، مگر اسی سے انسان جاوداں ہو جاتا ہے۔

عشق کی عظمت کو خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد شاعر نے عظمت انسانی کو موضوع سخن بنایا ہے۔ وہ انسان کو "ضمیر کن فکاں" کے نام سے یاد کرتا ہے اور پہنائے عالم میں اسی کو سب سے بڑی حقیقت سمجھتا ہے:

ضمیر کن فکاں غیر از تو کس نیست
نشان بے نشاں غیر از تو کس نیست
قدم بے باک تر نہ در رہ زیست
بہ پہنائے جہاں غیر از تو کس نیست

تخلیق آدم خود اس کی عظمت کی دلیل ہے:

بچشم تو بہائے من بلند است
کہ آوردی بہ بازار وجودم

اس کی زندگی ذوق تخلیق کی آئینہ دار ہے:

جہان ہا روید از مشت گل من

اضطراب اس کی روح کا خاصہ ہے۔ وہ ہر لحظہ ایک تازہ ولولے سے سرشار ہے اور تعمیر نو کے لئے شکست و ریخت سے زندگی میں ہنگامہ آرائی چاہتا ہے:

تراشیدم، پرستیدم، شکستم

اس کے لئے ایک جہان کا کھو جانا کوئی حقیقت نہیں رکھتا کہ اس کے ضمیر میں سینکڑوں جہان

آباد ہیں۔ وہ جہان بناتا ہی نہیں' اسے سنوارتا بھی ہے۔ اس کا تخلیقی ذوق اس میں حسن و زیبائی کا یوں اضافہ کرتا ہے' جیسے وہ خلاق فطرت کے ساتھ برابر کا شریک ہو:

جہان او آفرید این خوبتر ساخت
مگر با ایزد انباز است آدم

انسانی عظمت اسے یوں اپنے خالق کے قریب لے آتی ہے کہ اس کی تلاش میں وہ اپنے آپ کو اور اپنی جستجو میں اس عظیم حقیقت کو پالیتا ہے:

تلاش او کنی جز خود نہ بینی
تلاش خود کنی جز او نیابی

یہ تصور فارسی کے صوفی شعرا اور بالخصوص نظریہ وحدت وجود کے پرستاروں کے ہاں شدت سے موجود ہے۔ ہمیں سنائی' عطار' رومی اور دوسرے شاعروں کے ہاں یہ مضمون ملتا ہے۔ اکثر صوفی شاعر نظریہ وحدت وجود کے قائل تھے' جس کا مطلب مختصر طور پر یہ ہے کہ کائنات ذات باری تعالیٰ کا عکس ہے۔ حسن مطلق نے اسے اپنے ظہور کا وسیلہ بنایا ہے اور اس کا ذرہ ذرہ اسی ذات جمیل کے پرتو سے روشن و تاباں ہے۔ کائنات کی بذات خود کوئی حقیقت نہیں' بلکہ اسے ان صوفیا نے سراب یا واہمے سے تعبیر کیا ہے۔ انسان ذات مطلق میں کھو جانے کے لئے تڑپ رہا ہے۔ جس طرح قطرہ دریا میں گم ہو کر آسودگی حاصل کرتا ہے' انسان بھی اناالحق کی منزل کی طرف لوٹ جانے کے لئے بے تاب ہے۔ صوفی انسان کو خدا کے جمال کا پرتو سمجھتا ہے اور اسی لئے اسے انسان کی عظمت کا شدید احساس ہوتا ہے۔ علامہ نے فلسفہ وحدت وجود سے سخت اختلاف کیا ہے۔ وہ انسان کو جسے زمین پر خدا کا نائب بنا کر بھیجا گیا ہے' خودی کے اثبات کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں انسان اپنی خودی کے استحکام و ثبات کے لئے صفات الہیہ کو زیادہ سے زیادہ اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرتا ہے' لیکن اس کی ذات کا جزو نہیں بنتا اور یہی کیفیت اسے عظمت بخشتی ہے۔

ایک دوسری رباعی میں علامہ نے خودی کے نور سے خدا کو دیکھنے کا پیغام یوں دیا ہے:

زمن گو صوفیان با صفا را
خدا جویان معنی آشنا را
غلام ہمت آں خود پرستم

کہ با نور خودی بیند خدا را

عظمت آدم کی بنیادی حقیقت کے اظہار و ابلاغ کے ساتھ ساتھ شاعر انسان کو تخلیق پیہم کی مسلسل مہم پر گامزن رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ زندگی کو ایک پل قرار نہیں اور انسان کی تخلیقی اور تعمیری قوتیں ہر لحظہ تصویر زندگی میں نئے رنگ بھرتی رہتی ہیں۔ اگر وہ ان قوتوں سے ناآشنا ہے اور اس کا آج اس کے گزرے ہوئے کل سے مختلف نہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زندگی کی حرارت سے محروم ہے:

دما دم نقش ہائے تازہ ریزد
بیک صورت قرار زندگی نیست

اگر امروز تو تصویر دوش است
بخاک تو شرار زندگی نیست

زندگی کا ہر لمحہ ابد کا رازداں ہے اور ہر ذرہ منزل دوست کی طرف رواں دواں ہے۔ اس حقیقت سے بیگانگی زندگی کے تقاضوں سے بے وفائی ہے۔ ہر گزرتا ہوا لمحہ تخلیق و تعمیر چاہتا ہے اور آنے والے کل سے بے نیاز ہو کر اپنے آج کو سنوارتا اور ہر گزرتے ہوئے لمحے میں کاوش کے رنگ بھرنا زندگی کے تقاضوں کی صحیح تکمیل ہے:

مگو کار جہاں نااستوار است
ہر آن ما ابد را پردہ دار است
بگیر امروز را محکم کہ فردا
ہنوز اندر ضمیر روزگار است

انسان کی عظمت اور زندگی کے ساتھ اس کے پیہم ربط کا احساس دلانے کے بعد شاعر نے اپنے ایک اور مرغوب مضمون خطر جوئی کو موضوع سخن بنایا ہے۔ اس سے پہلے "اسرار خودی" میں بھی علامہ نے خطرات کو انسانی قوتوں کے تعمیری استعمال کا زریں موقع قرار دیا ہے۔ خطرات کا مقابلہ ان کی نظر میں خودی کے استحکام کے لئے ضروری ہے۔ انہیں مشکلات اور خطرات اتنے پسند ہیں کہ وہ پر پیچ راستے کو منزل مقصود پر ترجیح دیتے ہیں:

مرا صاحبدلے ایں نکتہ آموخت
ز منزل جادۂ پیچیدہ خوشتر

اور ایسے سمندر میں کشتی کھینے کو تیار نہیں، جس کی موجیں نہنگ سے ناآشنا ہیں:

ولیکن من نرانم کشتی خویش
بدریائے کہ موجش بے نہنگ است

رباعیات کا ایک اور موضوع اخوت اسلامی کا تصور ہے۔ وہ ملت اسلامی کو اپنے ملی تشخص کا احساس دلاتے اور اس کی نگہداری کی تلقین کرتے ہیں۔ مسلمان رنگ و نسب سے بالا تر ایک حقیقت ہے۔ اس ملت کی آبیاری ایک چمن میں ہوئی ہے اور اسے ایک ہی نوبہار نے پروان چڑھایا ہے:

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم
تو اے کودک منش خود را ادب کن
مسلماں زادہ ای ترک نسب کن
برنگ احمر و خون و رگ و پوست
عرب نازد اگر، ترک عرب کن

کچھ رباعیات میں شاعر نے اپنی حکیمانہ اور مصلحانہ حیثیت پر ناز کیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ رگ مسلم میں زندگی کا خون اسی کے اشعار نے دوڑایا ہے۔ اس قوم کی حالت دشت میں ایک پراگندہ اور منتشر ہجوم کی تھی، مگر اس کی صدائے درا نے اس بھیڑ کو ایک منظم کارواں کی شکل بخش دی ہے۔ اسے اپنی انفرادیت اور فکری اپج پر ناز ہے۔ وہ افلاطون اور فارابی کا احسان نہیں اٹھاتا۔ اسے دنیا کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے، حقائق کو خود پرکھنے کا دعویٰ ہے۔ اسے اپنی بصیرت پر ناز ہے۔ وہ لالہ خود رو کے مزاج اور شاخ پر کھلے ہوئے گلاب کی مہک سے آشنا ہے۔ وہ راز زندگی کا محرم، آنے والی بہار کا نقیب اور سینہ مشرق میں نئی حرارت اور آرزو کا خلاق ہے:

میان آب و گل خلوت گزیدم
ز افلاطون و فارابی بریدم

نکردم از کسے دریوزۂ چشم
جہاں را جز بچشم خود ندیدم

ز شاخ آرزو بر خوردہ ام من
بہ راز زندگی پے بردہ ام من

بترس از باغباں اے ناوک انداز
کہ پیغام بہار آوردہ ام من

ز جان بے قرار آتش کشادم
دلے در سینہ مشرق نہادم

گل او شعلہ زار از نالہ من
چو برق اندر نہاد او فتادم

افکار

"پیام مشرق" کے دوسرے حصے کا عنوان "افکار" ہے۔ یہ کتاب کا سب سے ضخیم حصہ ہے اور اکاون نظموں پر مشتمل ہے۔ بعض نظموں میں جو "فصل بہار"، "کرمک شب تاب"، "حدی---- نغمہ ساربان حجاز" اور "شبنم" سے عبارت ہیں' شاعر نے ہیئت میں نئے تجربے کئے ہیں۔

"افکار" کے تحت علامہ نے اپنے فلسفہ و فکر کے مختلف پہلوؤں کا اظہار کیا ہے۔ موضوعات میں عظمت آدم' تسخیر فطرت' فلسفہ زماں' عشق و خرد' سوز و ساز' زندگی و عمل' جوش کردار' تخلیق و ارتقا' آزادی و غلامی' اسلام' جمہوریت' کشمیر اور تہذیب وغیرہ شامل ہیں۔ بہت سی نظمیں ایسی ہیں' جن میں شاعر نے فطرت کے حوالے سے اپنے فلسفہ زندگی کی ترجمانی کی ہے۔ ان نظموں کے عنوانات ہی سے علامہ کے اس شعری رجحان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً ان میں "گل نخستین"، "بوئے گل"، "فصل بہار"، "افکار انجم"، "نسیم صبح"، "لالہ"، "کرمک شب تاب"، "قطرۂ آب"، "شبنم" اور "جوئے آب" میں علامہ کے مخصوص طرز تخیل پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مذکورہ بالا عنوانات میں اکثر ایسے مظاہر فطرت کا ذکر ہے' جو حسن و جمال سے ایک خاص نسبت رکھتے ہیں۔ ان میں لطافت' شگفتگی اور رنگ

و بو کا دلآویز امتزاج ہے۔ ان مظاہر کی خصوصیات کو شاعر نے اپنے فلسفہ زندگی پر اس طرح منطبق کیا ہے کہ تجریدی افکار نے حسن و زیبائی میں ڈھل کر محسوسات کی سحر آفریں شکل اختیار کر لی ہے۔ تجریدی اور غیر محسوس حقائق کو موزوں الفاظ اور حسن آفریں تشبیہ و استعارہ میں اس طرح سے پیش کرنا کہ وہ اپنے پورے عمق کے باوجود شعر کے نازک اور لطیف پیکر میں ڈھل جائیں اور فکر کے ساتھ ساتھ ایک غنائی اور نغماتی کیفیت پیدا کر لیں' ایک عظیم فنکار ہی کی ندرت طبع اور قوت تخیل کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔

"افکار" میں "تسخیر فطرت" کے نام سے علامہ نے اپنی نظم میں انسان کی عظمت کا ذکر بڑے شکوہ اور طمطراق کے ساتھ کیا ہے۔ انہوں نے صاحب نظر' خود گر' خود شکن' خود نگر اور پردہ در ایسے الفاظ سے انسان کی قوت اور مضمرات بیان کئے ہیں۔ ادھر' انکار ابلیس' کے نام سے اسی نظم میں انہوں نے ابلیس کی سرکشی' بے باکی اور قوت عصیاں کا ذکر بڑے زور دار الفاظ میں کیا ہے۔ "نوائے وقت" میں وقت کے سیل بے پناہ کی قوت کا بیان ایک دلکش' مترنم اور نغمہ ریز نظم میں کیا ہے۔

"افکار" کے تحت دو نظمیں گوئٹے سے منسوب ہیں۔ ایک "حور و شاعر" اور دوسری "جوئے آب"۔ پہلی گوئٹے کی ایک ایسی نظم کے جواب میں ہے' جس میں شاعر کی فطرت کی بے تابی' اضطراب اور عینیت پرستی کا ذکر نہایت خوب صورت اور پاکیزہ اشعار میں کیا گیا ہے اور دوسری گوئٹے کی نظم "نغمہ محمدؐ" کا بقول علامہ "ایک نہایت آزاد ترجمہ ہے۔"

"جوئے آب" یہاں زندگی کے اسلامی تخیل کی نمائندگی کرتی ہے اور مقصد گوئٹے کا نقطہ نظر پیش کرنا ہے۔ اس نظم میں جوئے آب ہی کی روانی' تندی اور نغمہ آفریں کیفیت ہے اور علامہ نے گوئٹے کی فکر کو صوتیاتی تاثر' آہنگ اور جوش و خروش کے جس سحر آگیں تانے بانے میں پیش کیا ہے' اس نے اس نظم کو لازوال حسن و شکوہ بخش دیا ہے۔

ان نظموں میں شاعر نے ذوق نمود' شوق تخلیق' لذت آرزو' خلش جستجو' ذوق طلب' قوت' عمل' حرکت' رجائیت' عشق کی ہمہ گیری اور عشق و دانش کا باہمی ربط' سوز نا تمام' ولولہ تعمیر' بلند نظری' خطر پسندی' جرات و بیباکی' عظمت ایمانی اور تہذیب مغرب کی تاریک ضمیری ایسے موضوعات پر اظہار فکر کیا ہے اور اپنے شاداب اور توانا تخیل سے ان حقائق کو جان بخش دی ہے۔

مے باقی

حصہ غزلیات کا عنوان "مے باقی" ہے۔ یہ اصطلاح علامہ نے حافظ سے لی ہے اور اس کے مشہور شعر کی یاد دلاتی ہے:

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را

یہ اصطلاح اس لحاظ سے نہایت معنی خیز ہے کہ اگرچہ علامہ نے "اسرار خودی" میں حافظ کے فلسفہ زندگی پر کڑی تنقید کی تھی، لیکن انہوں نے اپنی پہلی مطبوعہ غزلیات کو حافظ کی ایک مقبول ترکیب سے یاد کیا، مگر حافظ سے یہ نسبت یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ ان غزلیات میں حسن و زیبائی کی جو فضا چھائی ہوئی ہے، وہ حافظ کے سحر آفریں انداز کی یاد دلاتی ہے۔ ان غزلیات کا اسلوب اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ اقبال کی نظر میں حافظ ایک عظیم فنکار تھا اور اس کی غنائی تخلیقات ساحرانہ حسن و تاثیر کا مرقع تھیں۔ یہ ایک طرح سے حافظ کے جمالیاتی شعور کو اقبال کا خراج تحسین ہے۔ علامہ کی ان غزلیات میں وہی شگفتگی اور رعنائی، وہی آہنگ نشاط اور انداز بے نیازی ہے، جو حافظ کے کلام پر سر بہ سر چھایا ہوا ہے۔

"مے باقی" کی متعدد غزلیں حافظ شیرازی کی غزلیات کی زمین میں کہی گئی ہیں۔ حافظ کے علاوہ ان غزلیات میں رومی کا گہرا اثر جھلکتا ہے۔ یہ اثر اس عظیم صوفی اور مفکر شاعر کے طرز فکر کا بھی ہے اور طرز اسلوب کا بھی، چنانچہ بعض غزلیں رومی کے تتبع میں کہی گئی ہیں۔ اسی طرح علامہ نے بعض دوسرے شعرا کی غزلیات کے جواب میں بھی غزلیں کہی ہیں۔

غزل اس لحاظ سے باقی تمام اصناف سخن سے مختلف ہے کہ اس میں منطقی تسلسل اور معنوی ربط کی وہ کیفیت نہیں ہوتی، جو مثال کے طور پر مثنوی میں نظر آتی ہے۔ غزل کا ہر شعر ایک مکمل وحدت کا حامل ہوتا ہے۔ یہ صنف سخن شاعر کے فکر و احساس کے داخلی اظہار کا نام ہے۔ اس میں شاعر کی فکر جذبے کی آنچ سے ڈھل کر نکلتی ہے اور فکر و احساس کا یہ امتزاج دل آویز اور اثر آفریں کیفیت پیدا کر لیتا ہے، جو دوسری اصناف سخن میں عام طور سے ممکن نہیں۔ اچھے شاعر کی غزل میں، خاص طور سے جب وہ زندگی کے بارے میں

ایک مثبت نقطہ نظر رکھتا ہو اور اس کے اظہار کے لئے اس نے اپنی تمام فکری، فنی اور جمالیاتی قوتیں داؤ پر لگا دی ہوں، عام غزل کی طرح جذبات و احساسات کی محض پراگندہ تصویریں نہیں ہوتیں، بلکہ فکر کے قوی عنصر کی وجہ سے ایک نقطہ نظر یا زاویہ نگاہ بھی جاری و ساری ہوتا ہے، جس کا نقش ایک مکمل وحدت کی شکل میں قاری کے ذہن پر مرتسم ہو جاتا ہے۔ البتہ اس نقطہ نظر کو جذبات سے ہم آہنگ ہونے کے باعث اظہار کا ایک لطیف وسیلہ میسر آ جاتا ہے۔ "پیام مشرق" کی غزلیات اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہیں کہ ایک عظیم فنکار کے ہاتھوں---- خواہ وہ فن شعر سے لاتعلقی کا کتنا ہی اظہار کیوں نہ کرے---- عمیق اور بلند افکار نہایت کامیابی کے ساتھ غنائیت کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں اور سنگین حقائق غزل کی لطیف زبان، تخیل اور شاداب لہجے میں اپنی پوری معنویت اور اثر انگیزی کے ساتھ پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتے ہیں۔

"مے باقی" میں شاعر نے اپنے فلسفہ حیات کے مختلف پہلوؤں کو حسن و جمال کے جس سانچے میں ڈھالا ہے، اس کی مثالیں فارسی شاعری میں بہت کم ملتی ہیں۔ اسلوب بیان میں اس نے برصغیر کے مخصوص طرز شعر کو جسے ایران میں سبک ہندی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، نظر انداز کر دیا ہے اور جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، زیادہ تر حافظ کے انداز بیان کو پیش نظر رکھا ہے۔ اگرچہ علامہ کے اشعار پر ان کے نظام فکر، جدید علوم اور عصر حاضر کے تقاضوں کی گہری چھاپ ہے، لیکن انہوں نے اپنے بیان کو غزل کی مخصوص کلاسیکی روش کا پابند کیا ہے۔ فارسی شاعری میں رمز و ایما کی روایت بہت قدیم اور صوفی شعرا کی دی ہوئی ہے۔ اس کا آغاز شیخ ابو سعید ابی الخیر (440ھ/1049ء) اور بابا طاہر عریاں کی رباعیات سے ہوا۔ شیخ فرید الدین عطار نے غزل کی حسن آفریں اور لذت پرور اصطلاحات کو کثرت سے علامت کے طور پر استعمال کیا اور رمز و ایما میں عارفانہ حقائق بیان کئے۔ اس ایمائیت نے فارسی غزل میں ابہام تو پیدا کیا، مگر اس کی وجہ سے شعر کی معنویت میں بہت وسعت پیدا ہو گئی۔ رمز و کنایہ کی زبان کے بارے میں پیر رومؒ کا مشہور شعر ہے:

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

اقبال کی غزل میں رمزیت و ایمائیت کی وہی کیفیت ہے جو فارسی غزل کی شان ہے، البتہ

موضوعات کی وسعت و تنوع نے یہاں رمز و ایما کے میدان میں مزید وسعت پیدا کی ہے اور شاعر نے "تنگنائے غزل" میں ہر طرح کے نئے فلسفیانہ افکار کے نہایت کامیاب اظہار سے ایک نئی معنویت سے آشنا کیا ہے۔ یہ انداز اگر شاعر کے فن کی پختہ کاری کی دلیل ہے' تو صنف غزل کی لچک' وسعت اور بے انداز صلاحیتوں کا آئینہ دار بھی ہے۔ اقبال نے اس صنف سخن کے شعری اور غنائی تقاضوں کو نہ صرف ملحوظ خاطر رکھا ہے' بلکہ اس میں ہر طرح کے دقیق و عمیق خیالات کو سمونے کے ساتھ ساتھ اس کے ظاہری حسن میں اضافہ بھی کیا ہے۔ صوفی شعرا نے حقیقت کائنات پر اپنے عارفانہ افکار کا اظہار غزل کے دلنشیں پیرائے میں کیا ہے اور اس کے حسن و جمال کو نہ صرف مجروح نہیں ہونے دیا' بلکہ اس میں مستقل اضافے کئے ہیں۔ مگر اقبال نے غزل میں فلسفہ و فکر کی جو نئی راہیں اختیار کی ہیں اور مختلف معروضی حقائق کے اظہار کے باوجود اس کے حسن اور با نکپن میں جو نکھار پیدا کیا ہے' اس سے شعر پر بالعموم اور غزل پر بالخصوص ان کی بے پناہ قدرت کا ثبوت ملتا ہے اور قدم قدم پر ان کے ذوق جمالیات اور احساس حسن کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ ان غزلیات میں فلسفہ اقبال کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے' جن میں خودی' عشق و خرد' سوز و ساز' تپش و بیتابی' طلب و جستجو' حرکت و عمل' دعوت مبارزت' خطر پسندی اور ملت اسلامی کی انحطاط پذیر زندگی ایسے موضوعات شامل ہیں۔ شاعر نے کسی موضوع میں غزل کے آہنگ اور مزاج سے سر مو انحراف نہیں کیا' بلکہ یہ سنگین حقائق غزل کی روایتی لطافتوں کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہوئے ہیں کہ بعض جگہ موسیقی کے بول بن گئے ہیں۔ یہاں ان موضوعات کا الگ الگ' لیکن نہایت مختصر ذکر بے محل نہ ہو گا۔

علامہ نے انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کا ذکر "لالہ طور" میں بھی کیا ہے' لیکن یہاں انہوں نے اس موضوع میں موسیقی اور نغمے کے سروں سے زیادہ رس گھولا ہے۔ انسانی فکر کی تخلیقی استعداد اور اس کی وسعت اور گہرائی کا یہ عالم ہے کہ وہ اس کی مدد سے نئی دنیائیں آباد کرتا ہے اور اپنے حسن تخیل و اندیشہ سے اس میں نئے رنگ بھرتا ہے۔ اس کی تخلیقی قوت کا ٹھکانا نہیں اور اس کے مزاج کا تنوع اور جدت پسندی اسے نئی حقیقتوں کے انکشاف کی راہ دکھاتی ہے۔ اس حقیقت کے اظہار میں علامہ نے شوخی فکر و جرأت گفتار کا وہ مخصوص انداز اختیار کیا ہے' جو اپنے خالق سے خطاب کے سلسلے میں ان کے ہاں اکثر نظر آتا

ہے۔ مثلاً

صد جہاں میروید از کشت خیال ما چو گل
یک جہان و آں ہم از خون تمنا ساختی

طرح نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم
ایں چہ حیرت خانہ امروز و فردا ساختی

یہ اشعار انسان کے لامتناہی عزائم و تخلیقی مقاصد کا پتا دیتے ہیں۔ شاعر کی نظر میں فطرت میں رنگ و بو اس پیکر خاکی کے دم سے ہے اور لالہ و گل کی رنگین جلوہ سامانیاں اور فطرت آشفتہ کی شیرازہ بندی اسی کی نگاہ کرشمہ ساز کا نتیجہ ہیں۔

ایک اور غزل میں، جس میں ذات انسانی کی قوت و لطافت کے امتزاج کا ذکر ہے، موضوع کی رعایت سے بلند آہنگ اور باشکوہ انداز اختیار کیا گیا ہے:

خاکیم و تند سیر مثال ستارہ ایم
در نیلگوں بے بتلاش کنارہ ایم

با نوریاں بگو کہ ز عقل بلند دست
ما خاکیاں بدوش ثریا سوارہ ایم

در عشق غنچہ ایم کہ لرزد ز باد صبح
در کار زندگی صفت سنگ خارہ ایم

مگر وہ قوت و لطافت عشق کی اس آخری منزل کے لئے تڑپ رہے ہیں، جس میں حقیقت بے نقاب ہو کر جلوہ افروز ہوتی ہے:

چشم آفریدہ ایم چو نرگس دریں چمن
روبند برکشا کہ سراپا نظارہ ایم

انسان ہی ان کی نظر میں اسرار ازل کا محرم ہے، مگر افسوس وہ اس حقیقت سے آشنا نہیں۔ اسی حقیقت کے جاننے کا نام خودی ہے۔ وہ اس کی خودی کو وجد آفریں اشعار میں بیدار کرتے اور اسے دعوت عمل دیتے ہیں:

اسرار ازل جوئی؟ بر خود نظرے وا کن

یکتائی و بسیاری، پنہانی و پیدائی
برخیز کہ فروردیں افروخت چراغ گل
برخیز و دمے بنشین با لالہ صحرائی
بیا اقبال جامے از خمستان خودی در کش
تو از میخانہ مغرب ز خود بیگانہ می آئی

اگر ذات مطلق کی عظمت و جمال کا سلسلہ لامتناہی ہے، تو انسان کے دل بیتاب میں بھی بے شمار اور نت نئے جہان فکر و عمل آباد ہیں:

عشق است و ہزار افسوں، حسن است و ہزار آئیں
نے من بہ شمار آیم، نے تو بہ شمار آئی

عشق کا یہ جذبہ انسان کے اندر پیہم تپش و اضطراب کو جنم دیتا ہے۔ اسی سے انسان کی زندگی لازوال اور غیر فانی بنتی ہے اور وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں بیتاب و سرگرداں رہتا ہے۔ شاعر کا یہ احساس یوں نغمے میں ڈھل جاتا ہے:

تپش است زندگانی، تپش است جاودانی
ہمہ ذرہ ہائے خاکم، دل بے قرار بادا
نہ بہ جادۂ قرارش، نہ بہ منزلے مقامش
دل من مسافر من کہ خداش یار بادا
نشود نصیب جانت کہ دمے قرار گیرد
تب و تاب زندگانی بتو آشکار بادا

شاعر نے عشق کی عظمت کا ذکر ایک عجیب والہانہ انداز میں کیا ہے۔ ان اشعار میں جو کیف و مستی اور جوش و خروش نظر آتا ہے، وہ ہمیں رومی اور حافظ کے اشعار کی یاد دلاتا ہے۔ وہ خود شناسی اور ادعائے ذات کے لئے احساس عشق کو ضروری سمجھتے ہیں:

در بود و نبود من اندیشہ گمانہا داشت
از عشق ہویدا شد ایں نکتہ کہ ہستم من
سرمایہ درد تو غارت نتواں کردن

اشکے کہ ز دل خیزد در دیدہ شکستم من

یہ وہ متاع گرانبہا ہے کہ وہ اسے تخت جم کے عوض بھی دینے کو تیار نہیں ہیں:

گرچہ متاع عشق را عقل بہای کم نہد
من ندہم بہ تخت جم آہ جگر گداز را

دل عشق کا مخزن اور مظہر ہے۔ دل کی قوت اور عظمت ملاحظہ ہو:

سوز سخن ز نالہ مستانہ دل است
ایں شمع را فروغ ز پروانہ دل است
مشت گلیم و ذوق فغانے نداشتیم
غوغائے ما ز گردش پیمانہ دل است
این تیرہ خاکداں کہ جہاں نام کردہ ای
فرسودہ پیکرے ز صنم خانہ دل است
لاہوتیاں اسیر کمند نگاہ او
صوفی ہلاک شیوۂ ترکانہ دل است
غافل ترے ز مرد مسلماں ندیدہ ام
دل درمیان سینہ و بیگانہ دل است

عشق انسان کے اندر جرات کردار پیدا کرتا ہے۔ یہ جرأت، مقاومت و مبارزت کی دعوت دیتی ہے اور انسان کے اندر خطر پسندی کا جذبہ پیدا کرتی ہے، جو انسانی خودی کے استحکام اور تقویت کا باعث بنتا ہے۔ شاعر کے نزدیک زندگی کا راز ہی خطرات سے کھیلنے اور طوفانوں سے لڑنے میں پنہاں ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایسے سفر کعبہ پر بھی آمادہ نہیں، جو خطرات سے خالی ہو:

بکیش زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است
سفر بکعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است
ز قید و صید نہنگاں حکایتے آور
مگو کہ زورق ما روشناس دریا نیست

اس کی نظر میں عافیت کی تمنا زندگی کے سفاک حقائق سے ناآشنائی کی دلیل ہے:

دریں رباط کہن چشم عافیت داری
ترا بکشمکش زندگی نگاہے نیست

شاعر کی نظر میں زندگی ہمیشہ سے حق و باطل کی آویزش کی آماجگاہ رہی ہے اور شر ہمیشہ خیر سے ٹکراتا رہا ہے:

شبے بہ میکدہ خوش گفت پیر زندہ دلے
"بہر زمانہ خلیلؑ است و آتش نمرود"

اقبال کا نصب العین مسلک شبیر ہے۔ گوشہ نشینی کی بجائے وہ کار زار زندگی میں شمشیر و سنان اور نعرۂ تکبیر کو رفیق راہ سمجھتے اور عواقب سے بے پرواہ ہیں:

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزو ست
با من میا کہ مسلک شبیرمؓ آرزو ست

از بہر آشیانہ خس اندوزیم نگر
باز ایں نگر کہ شعلہ در گیرم آرزو ست

گفتند لب بہ بند و ز اسرار ما مگو
گفتم کہ خیر، نعرۂ تکبیرم آرزو ست

شاعر کا عقیدہ ہے کہ خودی مضبوط و مستحکم ہو، تو خطرات کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں اور زندگی کے طوفانی سمندر سے انسان گوہر تابندہ بن کر نکلتا ہے:

گر بخود محکم شوی سیل بلا انگیز چیست
مثل گوہر در دل دریا شتن میتواں

زندگی کو کسی پل قرار نہیں۔ اس میں جمود کو راہ نہیں۔ یہ نئی منزلوں کی تلاش میں ہمیشہ سرگرم سفر رہتی ہے۔ اس خیال کو شاعر نے کس موثر اور دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے:

کجاست منزل ایں خاکداں تیرہ نہاد
کہ ہر چہ ہست چو ریگ رواں بہ پرواز است

ایک دوسری غزل میں حرکت اور پرواز کے اسی تصور کو پھول کی مہک اور نسیم سحر سے

ہم آہنگ کر کے شاعر نے زندگی کے سنگین عمل کو تغزل کے لطیف ساز میں ڈھالا ہے:

با ز خلوت کدۂ غنچہ بروں زن چو شمیم
با نسیم سحر آمیز و وزیدن آموز

اس غزل میں زندگی کے امکانات کو روشن کرنے اور ناسازگار ماحول میں بھی شخصیت کے اظہار کے مواقع ڈھونڈنے اور شکست پر غالب آنے کی بات گل و سبزہ اور شبنم و لالہ کے رنگین پیکروں کے ذریعے کی گئی ہے۔

"مے باقی" کی بعض غزلیات میں ملت کا درد موجزن ہے۔ غزل کے تقاضوں کی مکمل پابندی اور اس کے حسن و نزاکت کی پوری رعایت کے باوصف شاعر نے ملت اسلامیہ کے مسائل پر ایسے لطیف انداز میں بات کی ہے کہ ملت کے عروج و زوال کے اسباب اور ان کا تجزیہ بھی غنائی وحدت کا جزو بن گیا ہے۔ مندرجہ ذیل شعر میں اسلام کے ہمہ گیر پیغام کے لئے غزل کی زبان ملاحظہ ہو:

تو رہ شناس نہ ای وز مقام بے خبری
چہ نغمہ ایست کہ در بربط سلیمی نیست

اور اس کے بعد پھر کارزار حیات میں ذوق کردار اور جنون کی ایک نئی شان، جو صحرا نوردی کا مذاق اڑا رہی ہے:

بیا کہ غلغلہ در شہر دلبراں فگنیم
جنون زندہ دلاں ہرزہ گرد صحرا نیست

شاعر کو مسلمان کے فکر و نظر میں گمراہی نظر آتی ہے۔ وہ عہد حاضر کے مسلمان کو پسر خلیل ہونے کے باوجود آزر کا پیرو سمجھتا ہے اور اسے بیگانہ دل ہونے کا طعنہ دیتا ہے۔ اس کی مسخ شدہ اقدار نے شاعر کے دل کو غم کدہ بنا رکھا ہے اور اس کے نزدیک مسلمان کی موجودہ پستی کا علاج تب و تاب جاودانہ اور کلیم الٰہی کے سوا اور کچھ نہیں:

نشود نصیب جانت کہ دمے قرار گیرد
تب و تاب زندگانی بتو آشکار بادا

ملت کے زوال اور قلب و نظر کی دولت بیدار سے محروم ہونے کے باوجود شاعر مایوسی کا شکار نہیں ہوتا۔ رجائیت اقبال کے شعر و فلسفہ کا لازمی جزو ہے اور ملی زندگی کے تاریک

ترین لمحات میں بھی شاعر نے کبھی دامن امید ہاتھ سے نہیں دیا' بلکہ اس نے خون صد ہزار انجم میں بھی ہمیشہ سحر کی تابانی کا نظارہ کیا ہے۔ ان غزلیات میں ملت کے انحطاط پر دکھ کے ساتھ ساتھ وہ سکھ کی گھڑیوں کا بھی منتظر ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست مسلمانان برصغیر کے لئے ایک عظیم سانحہ تھی' کیونکہ خلافت عثمانی اسلامی اتحاد کا مظہر اور ترک مغرب کے خلاف اسلامی مقاومت کی درخشاں علامت تھا۔ اس شکست نے نہ صرف مسلمانوں کو بے چین کیا' بلکہ برصغیر کی سیاست میں انہیں انگریزوں کے خلاف ایک ایسا محاذ بنانے پر مجبور کیا' جس نے اس سرزمین میں تحریک آزادی کو زبردست تقویت دی۔ اسی زمانے میں شاعر مشرق نے ترکوں کے ان مصائب کو بھی ان کی آزادی اور ترقی کا ضامن قرار دیا اور اس کا سبب یہ بتایا کہ ظہور مصطفوی کے لئے بو لہبی ایک بہانہ ہوا کرتی ہے :

نہال ترک ز برق فرنگ بار آورد
ظہور مصطفوی را بہانہ بو لہبی ست

تشنہ لبی اور محرومی شاخ ملت کے لئے نم کی حیثیت رکھتی ہے' جس سے شگوفے پھوٹتے ہیں' ورنہ آب حیات کی تلاش تو در حقیقت طلب کی کمی کا اعتراف ہے :

بشاخ زندگی ما نمے ز تشنہ لبی است
تلاش چشمہ حیواں دلیل کم طلبی است

شاعر ملت کی بہار کا منتظر ہے۔ اس پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے لئے اپنا سوز اور تپش لٹانے کے لئے بے قرار ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ سوز و اضطراب مرغ بہار کے نالوں میں بیباکی اور جرأت کا باعث بنے گا۔ ملت خوابیدہ کو بیدار کرنے میں شاعر نے فکر و احساس کی جو شمعیں روشن کیں اور دلوں میں جس طرح تپش و اضطراب کی جوت جگائی' وہ اس کا ذکر بھی کرتا ہے اور ملت کی نشاۃ ثانیہ میں وہ اپنے کردار کی عظمت سے بھی آگاہ ہے :

تا شوی بیباک تر در نالہ اے مرغ بہار
آتشے گیر از حریم سینہ ام چندے دگر

نقش فرنگ

"پیام مشرق" کا چوتھا جزو "نقش فرنگ" ایک طویل ترکیب بند سے شروع ہوتا ہے'

جس کا عنوان "پیام" ہے۔ یہ پیام اقبال کی طرف سے مغرب کے نام ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ پیام ہے جو بیسویں صدی کے اس عظیم مفکر شاعر نے گوئٹے کے جواب میں مغرب کے نام بھیجا ہے۔ پیام کیا ہے' مغرب کے نام ایک دعوت مبارزت ہے جس میں شاعر نے مغربی نظام فکر و عمل اور تمدن و سیاست کو للکارا ہی نہیں' بلکہ اس کے تار و پود کو بھی بکھیر کے رکھ دیا ہے۔ اس نظم میں شاعر نہ مغرب کے افکار سے مرعوب ہے' نہ اس کی حاکمیت سے۔ نظم میں ایک للکار اور بیباکی ہے۔ ایک برتری کا احساس اور اعتماد کا آہنگ ہے۔ اس کی گونج شاعر کے متفکرانہ شکوہ و جلال کی آئینہ دار ہے۔ اس نے مغرب کے نظام حیات کا بے مثال جرأت اور بصیرت کے ساتھ تجزیہ ہی نہیں کیا' انتہائی قوت و توانائی کے ساتھ اپنے رد عمل کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس شعلہ بداماں نظم میں فکر و نظر کے شراروں اور انداز بیان کی تابانیوں نے اسے اقبال کی شاہکار تخلیقات میں ایک ممتاز مقام بخشا ہے۔ نظم کا آہنگ و صوت' اس کی بے پناہ روانی اور الفاظ کا شکوہ شاعر کے افکار کے ساتھ پوری مطابقت رکھتا ہے اور کمال کی بات یہ ہے کہ یہ شعلہ بیانی شاعر کو جذبات کی رو میں بہاکر نہیں لے گئی ہے' بلکہ اس کا ہر شعر عمیق فکر کا آئینہ دار ہے اور اس کا ایک ایک لفظ مغرب کے لئے تازیانہ عبرت کا کام دے رہا ہے۔ اگر اس میں چیلنج کی جھنکار پوری قوت کے ساتھ سنائی دیتی ہے' تو وہ بھی فکر کی سطح پر ہے۔ شاعر نظم کا آغاز عقل فسوں پیشہ کی تنگ دامانی اور عشق کی عظمت سے کرتا ہے۔ عقل گل و لالہ کا رنگ تو دیکھ سکتی ہے' مگر وہ اسرار جو رنگ کے پردے میں مچل مچل کے بے نقاب ہو رہے ہیں' عقل کے مشاہدے سے دور ہیں۔ مغرب نے دانش و حکمت کا خزانہ تو سمیٹ لیا' لیکن دل کا گنج گرانمایہ کھو بیٹھا۔ عقل کے بجھے بجھے ناز دل میں حرارت و تپش پیدا نہ کر سکے۔ اس کے غمزہ پنہاں کی خلش لذت کو جنم نہ دے سکی۔ اس بے رحم عقل نے دنیا کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ اس کی کیمیا سازی نے ریگ رواں کو سونے میں بدل دیا' مگر وہ دل افسردہ پر اکسیر محبت نہ چھڑک سکی۔ مغرب اس کے افسوں کا شکار ہوا' لیکن اس نے تہذیب فرنگ کی خاک اڑا ڈالی اور یہی خاک پسر مریم کی آنکھوں میں جھونک دی۔ مغرب سے مخاطب ہو کے حکیم الامت کا ارشاد ہے:

عجب ایں نیست کہ اعجاز مسیحا داری
عجب اینست کہ بیمار تو بیمار تر است

اس کے بعد شاعر نے عقل خود بیں اور عقل جہاں بیں کا مقابلہ کیا ہے۔ اگر ایک بلبل کا پر ہے' تو دوسری بازوئے شاہین۔ اگر ایک نسیم کی مانند چمن کو رہگذار بناتی ہے' تو دوسری گل و نسرین کے ضمیر میں جھانکتی ہے۔ زہے وہ عقل کے دونوں عالم کی وسعتیں اس کے قدموں میں پڑی ہیں۔ شاعر کو شکوہ ہے کہ عشق ہوس پیشہ ہو گیا اور اس نے ضبط کے تمام بند توڑ ڈالے۔ اس نے رہزنی کو جہانبانی کہا اور اس کے ظلم و بیداد نے غلاموں کو کچل ڈالا۔ اس بھیانک فضا میں کہ جہاں عقل خود بیں اور عشق ہوس پیشہ کی کارفرمائی ہے' شاعر اہل مغرب کو ایک نئے نظام زندگی میں شریک ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ اسے بتاتا ہے کہ ملوکیت کے دن بیت گئے۔ بادشاہوں کے تاج لٹ گئے' نہ نے اسکندری باقی ہے اور نہ نغمہ دارائی۔ کوہکن تیشہ بدست آیا ہے اور اقتدار کا طلبگار ہے۔ عشرت سرمایہ رخصت ہوا چاہتی ہے۔ مزدور کی بے بسی رنگ لائی ہے۔ یوسف زنداں سے نکل کر عزیزی کے منصب پر جا پہنچا ہے۔ افسانہ و افسون زلیخائی کا دور ختم ہوا۔ آج زندگی ایک جہان تازہ کی تعمیر چاہتی ہے۔

اس کے بعد شاعر کی چشم حقیقت بیں آنے والے دور کو دیکھتی ہے۔ اس خاک کہن کا ہر ذرہ ستارہ بنا چاہتا ہے۔ وہ دانہ جو ابھی زمین کے آغوش میں پڑا سوتا ہے' تناور اور گرانڈیل درخت بننے والا ہے۔ پہاڑ اپنی ہیبت کے باوجود پرکاہ نظر آنے لگے ہیں اور پرکاہ میں کوہسار کی عظمت جھلک رہی ہے۔ شاعر ایک ایسا انقلاب دیکھ رہا ہے' جو آسمانوں کے ضمیر میں نہیں سما سکتا:

انقلابے کہ نہ گنجد بہ ضمیر افلاک
بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم

آخری بند میں زندگی کے ارتقائی عمل' مسلسل حرکت و انقلاب اور ایسے تابناک مستقبل کا ذکر ہے جس میں ہر زشت اور فرسودہ شے کا وجود مٹنے والا ہے اور وہ حقائق جن کے لئے آنکھیں ترستی ہیں' بے نقاب ہونے والے ہیں۔ اس بند میں افکار یوں نغمہ و شعر میں ڈھلے ہیں:

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود
ایں مے کہنہ جوان است و جواں خواہد بود
آنچہ بود است و نباید ز میاں خواہد رفت

آنچہ بالیست و نبود است ہماں خواہد بود

اور پھر شاعر اپنے گریہ خونیں کے رنگ لانے کو یوں دیکھتا ہے:

آں زمینے کہ برو گریہ خونیں زدہ ام
اشک من در جگرش لعل گراں خواہد بود

شاعر نے مغرب کے انجام کے بارے میں نصف صدی پہلے جب یہ لب کشائی کی، اس وقت ابھی سلطنت برطانیہ پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا اور انڈونیشیا سے مراکش تک پھیلے ہوئے وہ وسیع و عریض خطے جنہیں آج تیسری دنیا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، پابجولاں تھے۔ استعمار اپنی پوری قوت کے ساتھ مشرق کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا اور اس کی آزادی ایک خواب بن کے رہ گئی تھی۔ لیکن شاعر کی نگاہ تیز اقوام عالم کے عروج و زوال کے اسباب و علل پر تھی۔ اس کی حقیقت آشنا نظر مغربی استعمار کے انحطاط اور سرمایہ داری کے اضمحلال کے ساتھ ساتھ نئی توانا اور تازہ خوں قوتوں کا مشاہدہ کر رہی تھی اور وہ قوتیں بھی اس کی نگاہ دور بیں کے سامنے آشکار تھیں، جو ابھی کائنات میں خوابیدہ تھیں۔

"نقش فرنگ" کے حصے میں اس نظم کے علاوہ اکثر نظمیں فرنگ یا فرنگ سے متعلق افراد و احوال کے بارے میں ہیں۔ "میخانہ فرنگ" میں شاعر نے غزل کی رنگین زبان میں فرنگ کی ظاہری نمود اور باطنی خلا پر ایک نظم کہی ہے، جس میں وہ اس کی چشم مست کو تو پروردگار بادہ قرار دیتا ہے، مگر یوں اسے ایسے جلوۂ بے کلیم اور شعلہ بے خلیل کے نام سے یاد کرتا ہے، جس کی بے لگام عقل نے دنیائے عشق و محبت پر تباہی کی بجلیاں گرائی ہیں۔ "خرابات فرنگ" میں مغربی تہذیب کی بنیاد مسخ اقدار اور تزویر و ریا پر دکھائی ہے، جس میں نیک و بد کا پیمانہ اندھی قوت ہے اور بس۔ "آزادی بحر" چودہ اشعار کے ایک قطعہ پر مشتمل ہے۔ اس میں تمثیلی انداز میں استعمار پسند طاقتوں کی قزاقی پر شدید تبصرہ ہے۔

"نقش فرنگ" کا ایک مرغوب موضوع مزدور، سوشلسٹ اور سرمایہ دار ہے اور کئی نظمیں اسی موضوع سے عبارت ہیں۔ علامہ نے جس زمانے میں "پیام مشرق" لکھی، روس میں انقلاب آ چکا تھا اور تاریخ میں پہلی بار مزدور اور کسان نے بادشاہوں کے جاہ و جلال کو خاک میں ملا کر ایک غیر طبقاتی نظام کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ اس زمانے میں اس انقلاب سے خاصے متاثر نظر آتے ہیں، البتہ وہ اس انقلاب میں اس مساوات کی جھلک دیکھتے ہیں جسے

اسلام نے چودہ سو سال پہلے انسانی معاشرے سے روشناس کرایا تھا۔ "نوائے مزدور" میں مزدور کے ولولوں اور امنگوں میں جو جوش و خروش نظر آتا ہے' اس میں شاعر کا ہمدردانہ طرز فکر جھلک رہا ہے۔ "قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور" میں مزاحیہ اور شگفتہ انداز میں سرمایہ دار کی مجرمانہ اور مکارانہ سرشت کی گت بنائی گئی ہے۔ اس کے اشعار یوں ہیں:

غوغائے کارخانہ آہنگری ز من
گلبانگ ارغنون کلیسا ازان تو

نخلے کہ شہ خراج برد می نہد ز من
باغ بہشت و سدرہ و طوبا ازان تو

تلخابہ کہ درد سر آرد ازان من
صہبائے پاک آدم و حوا ازان تو

مرغابی و تدرو و کبوتر ازان من
ظل ہما و شہپر عنقا ازان تو

ایں خاک و آنچہ در شکم او ازان من
وز خاک تا بہ عرش معلا ازان تو

ایک نظم میں حکیم فرانسوی آگسٹس کومٹ (م-1857ء) اور مزدور کے درمیان گفتگو ہوتی ہے۔ یہاں مزدور کے ادعائے برتری میں خود شاعر کے ہمدردانہ افکار و جذبات شامل ہیں۔

"صحبت رفتگاں" میں ٹالسٹائی (م-1875ء)' کارل مارکس (م-1883ء)' ہیگل (م-1831ء)' ایران کے قدیم اشتراکی رہنما مزدک (م- 528ء تا 529ء)اور خسرو پرویز (590ء - 628ء) کے داستانی رقیب فرہاد کوہکن کی گفتگو ہے۔ ٹالسٹائی سرمایہ داری کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ کارل مارکس اس نظام کے خلاف برسرپیکار ہے اور اسے قتل انسانیت قرار دیتا ہے۔ ہیگل سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش کو اپنے فلسفہ اضداد کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ مزدک انقلاب تازہ کو اپنی جدوجہد کا ثمرہ سمجھتا ہے اور خوشی سے دیوانہ ہو رہا ہے کہ قصر سلطان و امیر میں مرگ نو رقص کر رہی ہے۔ البتہ کوہکن ابھی اپنی کامیابی پر مطمئن

نہیں ہے اور اسے اس بات کا غم کھائے جا رہا ہے کہ دور فلک ابھی تک آرزوئے پرویز کے تابع ہے۔

"موسیو لینن و قیصر ولیم" کے مکالمے میں جہاں لینن انقلاب کی کامرانی اور ایک نئے نظام زندگی کے قیام پر فتح و نصرت کے احساس سے سرشار ہے' قیصر ولیم ہوس اقتدار کو انسان کی جبلی خصوصیت قرار دیتا ہے۔

جس زمانے میں علامہ نے "پیام مشرق" شائع کی' جمعیت اقوام (League of Nations) نئی نئی عالم وجود میں آئی تھی اور پہلی جنگ عظیم سے نڈھال دنیا اس مجلس کی طرف بڑی امید کی نظروں سے تک رہی تھی' لیکن علامہ نے اس پر استعمار پسند طاقتوں کے کامل اقتدار اور دبدبہ کے پیش نظر روز اول ہی سے اسے کفن چوروں کی جماعت قرار دے دیا تھا اور آنے والے واقعات نے اس انجمن کی بے بسی' کمزور و ناتواں کے معاملے میں اس کی بے اعتنائی اور بڑی طاقتوں کے ہاتھوں میں اس کا بے اثر کردار ثابت کر دیا۔ مظلوم اور غلام دنیا پر انگلستان اور فرانس کا اقتدار نہ صرف برقرار رہا' بلکہ اس میں مزید تقویت پیدا ہوئی۔ یہ انجمن اپنے بے اثر اور بے اختیار کردار کے باعث نہ مقامی جنگوں مثلاً حبشہ پر مسولینی کے حملے کو روک سکی اور نہ دوسری جنگ عظیم کے راستے میں حائل ہو سکی۔ علامہ نے اس کے قیام کے موقع پر مندرجہ ذیل پیش گوئی کی تھی' جو حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی:

برخند تا روش رزم دریں بزم کہن
دردمندان جہاں طرح نو انداختہ اند

من ازی ے بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

"دردمندان جہاں" کی ترکیب میں طنز و تضحیک اور اس انجمن پر قابض مقتدر اقوام سے نفرت کا جو پہلو جھلک رہا ہے' اس نے اشعار کے لطف کو دوبالا کر دیا ہے۔

"نقش فرنگ" کے ایک حصہ میں بعض اہم مغربی مفکرین کے فلسفہ پر شاعر مشرق کا تبصرہ ہے۔ ہر مفکر کے فلسفہ زندگی کو نہایت بلیغ انداز میں چند اشعار بلکہ بعض جگہ ایک ایک شعر میں سمو دیا گیا ہے۔ یہ اشعار نہ صرف ان مفکرین کے افکار سے علامہ کی گہری واقفیت

اور مطالعہ کا پتا دیتے ہیں' بلکہ علامہ نے دلنشیں اور دلآویز انداز میں ان کے فلسفہ حیات کا تجزیہ بھی کیا ہے۔

علامہ' نیٹشے (م- 1900ء) کے بے حد مداح ہیں اور اس پر انہوں نے کئی جگہ اظہار خیال کیا ہے۔ ایک جگہ اس کا ذکر ایک بلیغ قطعہ میں یوں کیا ہے:

از سستی عناصر انساں دلش تپید
فکر حکیم پیکر محکم تر آفرید

اگفند در فرنگ صد آشوب تازۂ
دیوانہ بکار گہ شیشہ گر رسید

بقول اقبال نیٹشے کے قلم میں بجلی کی کڑک ہے اور اس کے ہاتھ خون کلیسا سے سرخ ہیں۔ وہ خدا کا منکر ہے مگر بعض اخلاقی تصورات میں اسلام سے بہت قریب ہے' اس لئے اس کا دل مومن لیکن دماغ کافر ہے:

آنکہ بر طرح حرم بت خانہ ساخت
قلب او مومن دماغش کافر است

علامہ اقبال' گوئٹے کی عظمت کے بہت قائل تھے۔ یہاں تک کہ "پیام مشرق" اسی حکیم شاعر کے "دیوان" کے جواب میں لکھی گئی۔ کتاب کے اس حصے میں "جلال و گوئٹے" کے زیر عنوان رومی کی زبان سے گوئٹے کی یوں تعریف کی ہے:

گفت رومی اے سخن را جاں نگار
تو ملک صید استی و یزداں شکار

فکر تو در کنج دل خلوت گزید
ایں جہان کہنہ را باز آفرید

سوز و ساز جاں بہ پیکر دیدہ ای
در صدف تعمیر گوہر دیدہ ای

آئن شائن (م-1955ء) کے نظریہ اضافیت سے متاثر ہو کر علامہ نے اس کی تعریف میں ایک زور دار نظم کہی ہے اور بتایا ہے کہ اس کے ضمیر منور نے روشنی کے اسرار کو فاش

کر دیا ہے۔ وہ اسے ایک ایسے زردشت (م- 583ء ق -م) سے تشبیہ دیتے ہیں' جس نے نسل موسیٰؑ و ہارونؑ سے ظہور کیا ہے۔ اسی طرح وہ فرانس کے جدید مفکر برگساں (م-1941ء) کے فلسفے کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہیں کیونکہ برگساں ایک ایسی عقل کا دلدادہ ہے' جو ادب خوردۂ دل ہو:

نقشی کہ بستہ ای ہمہ اوہام باطل است
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

انگریز فلسفی لاک (م-1704ء)' جرمن مفکر کانٹ (م-1804ء) اور برگساں کے فلسفے کا مقابلہ ایک ایک شعر میں گل لالہ کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ لاک اسے تہی جام سمجھتا ہے' جس کی رونق بادۂ خورشید کے دم سے ہے۔ کانٹ کے مطابق لالہ شبستان ازل سے کوکب جام لے کے آیا ہے مگر اس کی اپنی فطرت ذوق مے سے سرشار ہے۔ برگساں کی نظر میں لالہ ازل سے مے آئینہ فام لایا ہے اور نہ جام۔ اس کی دلکشی کا راز اس کے داغ جگر میں ہے' جو سوز دوام کا باعث بنا ہے۔ لالہ' ساغر اور مے کے آئینے میں ایک ایک بلیغ شعر میں تین بڑے مفکرین کے نظریہ حیات کی عکاسی اقبال ایسے فلسفی شاعر کے فکر و فن کے امتزاج ہی سے ممکن ہو سکتی ہے۔

بعض دوسرے مغربی شعرا کا ذکر بھی "نقش فرنگ" میں موجود ہے۔ جن میں ہنگری کا جوانا مرگ سخن سرا پٹوفی اور انگریز شاعر براؤننگ (م- 1889ء) اور بائرن (م- 1824ء) شامل ہیں۔ پٹوفی کو وطن کے دفاع میں جان دینے پر گلہائے عقیدت پیش کئے گئے ہیں:

نفسے دریں گلستاں ز عروس گل سرودی
بہ دلے غمے فزودی' ز دلے غمے ربودی

تو بخون خویش بستی کف لالہ را نگارے
تو بہ آہ صبح گاہے دل غنچہ را گشودی

علامہ نے براؤننگ' بائرن' غالب (م-1869ء) اور رومی کے انداز فکر کو ایک ایک شعر میں بادہ و ساغر کے حوالے سے واضح کیا ہے۔ یہ اشعار مرزا غالب کے ایک شعر کو سامنے رکھ کے کہے گئے ہیں اور ان میں ہر شاعر کا نظریہ حیات پیش کیا گیا ہے:

براؤننگ: بے پشت بود بادۂ سر جوش زندگی
آب از خضر بگیرم و در ساغر افگنم

بائرن: از منت خضر نتواں کرد سینہ داغ
آب از جگر بگیرم و در ساغر افگنم

غالب: "تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم"

رومی: آمیزشے کجا گہر پاک او کجا
از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

براؤننگ آب ساغر کے لئے خضر کا رہین منت ہے تو بائرن کو اپنے خون جگر پر ناز ہے۔ غالب دل کی درد مندیوں کی انتہا دیکھنا چاہتا ہے تو رومی شراب کے لئے کسی واسطے کی بجائے سیدھا تاک تک پہنچتا ہے' جو اس کا سرچشمہ ہے۔

رومی سے اقبال نے دو دوسری نظموں "جلال و گوئٹے" اور "جلال و ہیگل" میں عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اول الذکر نظم میں رومی کی زبان سے گوئٹے کو بھی شاندار خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ اگر گوئٹے رومی کو دانائے اسرار قدیم کے نام سے یاد کرتا ہے تو رومی گوئٹے کی حقیقت شناسی اور حقیقت بینی کی تعریف کرتا ہے۔

علامہ نے دیباچے اور پیشکش ہی میں گوئٹے کے فکر و فن کی عظمت کو خراج عقیدت پیش نہیں کیا' بلکہ "مے باقی" کی ایک غزل کے مقطع میں اس شہر کا نام لے کر جہاں وہ ہمیشہ کے لئے محو خواب ہے' وہ اپنے جذبات محبت و ارادت کا اظہار یوں کرتے ہیں:

صبا بہ گلشن ویمر سلام ما برساں
کہ چشم نکتہ وراں خاک آں دیار افروخت

"نقش فرنگ" کے ساتھ کتاب ختم ہو جاتی ہے' لیکن "خردہ" کے نام سے علامہ نے چند صفحات کا مزید اضافہ کیا ہے۔ ان اشعار میں بھی علامہ کے مخصوص فلسفہ زندگی' ذوق جستجو اور شوق تخلیق و تازہ کاری کی خوبصورت مثالیں ملتی ہیں۔ کتاب کا اختتام تقلید کے خلاف مندرجہ ذیل اشعار پر ہوتا ہے:

چہ خوش بودے اگر مرد نکوپے ز بند پاستاں آزاد رفتے
اگر تقلید بودے شیوۂ خوب پیمبرؐ ہم رہ اجداد رفتے

"پیام مشرق" کے تراجم کے بارے میں علامہ نے مختلف اوقات میں اپنے بعض نیاز مندوں کو معلومات فراہم کی ہیں۔ کتاب کے چھپنے سے پیشتر ہی اس کا ذکر "دیوان" کے نام سے 4 اگست 1920ء کو ایک خط میں یوں کیا ہے:

"مجھے یقین ہے دیوان کا ترجمہ بھی ضرور ہو گا' کیونکہ یورپ کی دماغی زندگی کے ہر پہلو پر اس میں نظر ڈالی گئی ہے اور مغرب کے سرد خیالات و افکار میں کسی قدر حرارت ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔"(6)

ڈاکٹر نکلسن کے تاثرات سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط مورخہ 5 جولائی 1922ء میں یوں دیتے ہیں:

"پروفیسر نکلسن کا خط بھی آیا ہے۔ انہوں نے اسے بہت پسند کیا ہے اور غالباً اس کا ترجمہ بھی کریں گے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب جدید اور یجنل خیالات سے مملو ہے اور گوئٹے کے "دیوان مغربی" کا قابل تحسین جواب ہے۔"(7)

اس کے ایک دن بعد ایک صاحب کو اسی موضوع پر یوں تحریر فرماتے ہیں:

"انہوں (ڈاکٹر نکلسن) نے بعض نظمیں "پیام مشرق" کی بھی ترجمہ کی تھیں' جو جرمنی کے رسالہ Islamica میں شائع ہوئی تھیں۔"(8)

20 جولائی 1923ء کو ایک خط میں بعض مستشرقین کے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"برلن سے ایک پروفیسر نے لکھا ہے کہ "حیرت انگیز" کتاب ہے۔ پروفیسر نکلسن نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک قابل تحسین جواب گوئٹے کے "دیوان مغربی" کا ہے اور جدید اور اوریجنل خیالات و افکار سے لبریز ہے۔"(9)

31 مارچ 1933ء کو ایک خط میں بعض مستشرقین کے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"پیام مشرق کا ترجمہ جرمن زبان میں ہو رہا ہے۔ ارلانگن یونیورسٹی کے

پروفیسر ہل کر رہے ہیں۔"(10)

ایک ایرانی صاحب ذوق ڈاکٹر افشار نے جو اس زمانے میں بمبئی میں تھے' "پیام مشرق" سے متاثر ہو کر اس کی تعریف میں چند شعر لکھے تھے اور انہیں علامہ کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔ یہ اشعار جو علامہ نے سید نذیر نیازی کے نام اپنے ایک خط مورخہ 15 فروری 1936ء میں درج کئے ہیں' حسب ذیل ہیں :

اندیشہ داشتم چہ ز ہندوستاں برم
سوغاتے از سفر بہ بر دوستاں برم
ایران کہ بوستان گل و بلبل است من
در حیرتم چہ تحفہ سوئے دوستاں برم
اقبال روئے کرد فراز آمدم ز در
گلہائے نو ظہور کہ زی گلستاں برم
نغمہ سرا شوند ہمہ بلبلان فارس
زیں نغز چامہ ہا کہ ز ہندوستاں برم(11)

حواشی

1- ص ۱۰۔
2- ص ۵۰۔
3- ص ۶۰۔
4- اقبال نامہ' حصہ اول' ص 303 ۔
5- ص 151 ۔
6- اقبال نامہ' حصہ دوم' ص 159 ۔
7- ایضاً' حصہ اول' ص 120 ۔
8- ایضاً' ص 277 ۔
9- مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خاں' ص 46 ۔

10- اقبال نامہ، حصہ دوم، ص 300 -

11- سید نذیر نیازی، مکتوبات اقبال، کراچی، 1957ء، ص 323 -

(اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، لاہور : اقبال اکادمی پاکستان، 1977ء، ص 74-110، 576-577)

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

پیام مشرق

اقبال کا مجموعہ کلام "پیام مشرق" گوئٹے کے "دیوان مغربی" کے فیوض و تاثرات کا مرہون منت ہے۔ "پیام مشرق" کی تمہید میں اقبال نے گوئٹے کے دیوان کے بارے میں نیز جرمنی ادب کی تاریخ میں مشرقی تحریک پر مختصر تبصرہ کیا ہے۔ اقبال کے پیش نظر صرف آرتھر ریمی کی کتاب تھی، لیکن اس واحد ماخذ کی بنیاد پر اقبال کا بیان دو وضاحتوں کا محتاج ہے: پہلی بات یہ کہ جرمنی میں "مشرقی تحریک" جو گوئٹے کے باب میں اپنی معراج کمال کو پہنچی، دراصل ایک عظیم تر مغربی تحریک کا حصہ تھی، جس کے قائدین میں سر ولیم جونس وغیرہ شامل تھے۔ دوسری بات یہ کہ گوئٹے اور پلاٹن (Platen) وغیرہ کی مشرقیت صرف ایران و عرب تک محدود تھی، جبکہ روکرٹ (Rueckert) وغیرہ نے بعد میں مشرقی ادبیات کے دائرے کو پھیلا کر ہند و چین تک پھیلایا۔ اگرچہ اقبال "دیوان" ہی سے متاثر ہوئے، جسے بیشتر نقاد اس کی عظیم ترین تصنیف قرار دیتے ہیں، لیکن وہ گوئٹے کی "فاؤسٹ" کو "دیوان" یا گوئٹے کے دیگر شاہکاروں سے زیادہ پسند کرتے تھے۔ "پیام مشرق" میں ایک نظم "جلال و گوئٹے" میں اقبال، گوئٹے کو ایک پیغمبر نہ ہوتے ہوئے، صاحب الہامی صحیفہ ("فاؤسٹ") قرار دیتے ہیں۔ یہاں اس نظم کو نقل کرنا مناسب ہے، جس میں اقبال نے گوئٹے کو جلال الدین رومی سے جنت میں ملاقات کرتے اور اپنی کتاب "فاؤسٹ" کو رومی کو سناتے ہوئے دکھایا ہے:

نکتہ دان المنی را در ارم — صحتے افتاد با پیر عجم
شاعرے کو ہمچو آں عالی جناب — نیست پیغمبر ولے دارد کتاب
خواند بر دانائے اسرار قدیم — قصہ پیمان ابلیس و حکیم
گفت رومی اے سخن را جاں نگار — تو ملک صید استی و یزداں شکار
فکر تو در کنج دل خلوت گزید — ایں جہان کہنہ را باز آفرید
سوز و ساز جاں بہ پیکر دیدۂ — در صدف تعمیر گوہر دیدۂ
ہر کسے از رمز عشق آگاہ نیست — ہر کسے شایان ایں درگاہ نیست
"داند آن کو نیک بخت و محرم است — زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است"

(رومی)

(پیام مشرق ص 206)

گوئٹے اور رومی کو یکجا دکھا کر اقبال نے نہ صرف مشرق اور مغرب کے دو عظیم نمائندوں کو یکجا کیا ہے' بلکہ یہی دو حضرات ایسے ہیں' جن سے اقبال فکری اور فنی طور پر سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ بہرحال رومی اور گوئٹے دونوں کے عقیدت مند کی حیثیت سے اقبال ان دونوں کی باہمی اجنبیت کو گوارا نہ کر سکے۔ اقبال چاہتے تھے کہ "فاؤسٹ" کا اردو ترجمہ ہو جائے اور ڈاکٹر عابد حسین کی مدد کرنے پر آمادہ ہوئے' جنہوں نے اس کے حصہ اول و دوم کا ترجمہ کر لیا تھا۔ سید نذیر نیازی نے اقبال کی اس پیشکش کی ایک دلچسپ روداد پیش کی ہے۔ نیازی کا بیان ہے کہ انجمن ترقی اردو کی فرمائش پر ان کے دوست ڈاکٹر سید عابد حسین نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں "فاؤسٹ" کا ترجمہ براہ راست جرمن زبان سے اردو میں کیا تھا۔ یہ ترجمہ نثر میں کیا گیا تھا اور صرف "فاؤسٹ" کے حصہ اول تک محدود تھا۔ ممکن ہے' میں نے اقبال سے اس ترجمے کا ذکر کیا ہو یا یہ ترجمہ کسی اور کے ذریعے سے ان تک پہنچا ہو' لیکن مورخہ 14 اگست 31ء کے ایک خط میں انہوں نے پوچھا تھا کہ آیا ڈاکٹر عابد حسین نے Prologue in Heaven کا ترجمہ کیا تھا؟ شاید انہوں نے یہ بات "جاوید نامہ" کے سلسلے میں پوچھی ہو گی' جو اس وقت ان کے زیر تصنیف تھی۔ علاوہ ازیں "جاوید نامہ" میں "تمہید آسمانی" کے عنوان سے ایک باب Prologue in Heaven کا فارسی ترجمہ ہے۔ جب میں چند روز بعد اقبال سے ملا اور گفتگو کے دوران میں "فاؤسٹ" کا ذکر

آیا' تو انہوں نے دوبارہ پوچھا کہ ڈاکٹر عابد حسین نے حصہ دوم کا ترجمہ کیوں نہیں کیا؟ انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ دوسرا حصہ قدرے مشکل ہے' کیونکہ اس میں فلکیات اور کیمیا کی بہت سی اصطلاحیں بھری ہوئی ہیں اور کچھ ایسی تلمیحات و اشارات ہیں' جنہیں اہل مغرب نہیں جانتے اور صرف اہل مشرق ہی ان سے آشنا ہیں۔ انہوں نے کہا کہ دوران قیام جرمنی میں بسا اوقات ان اصطلاحات و تلمیحات کی تشریح کا مجھے موقع ملا تھا اور میرے جرمن رفقا اس سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ گوئٹے نہایت وسیع فکر و تخیل رکھتا تھا' کہ اگر کسی شخص نے ایک ہزار سال کی تاریخ کا گہرا مطالعہ نہیں کیا' تو وہ مہذب اور تعلیم یافتہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ ہر جرمن باشندہ ان تمام تلمیحات و اصطلاحات سے آشنا ہوتا' جنہیں مشرقی ادب کے حوالے سے گوئٹے نے استعمال کیا ہے۔ ہمارے لئے تو یہ اصطلاحات گویا عام استعمال کے الفاظ ہیں۔ مجھے تو "فاؤسٹ" کے ان ابواب کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ اقبال کہتے ہیں کہ جرمن لوگ اس وقت حیران رہ جاتے تھے' جب ہم ان اصطلاحات کی تشریح کیا کرتے تھے۔"

"پیام مشرق" میں دو نظمیں ایسی موجود ہیں' جو موجودہ پس منظر میں اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں ایک حوالہ "حور و شاعر" آ ہی چکا ہے۔ دوسری نظم جس کا عنوان "جوئے آب" (The Revulet) ہے اور جو گوئٹے کی نظم "Mahomets Gesang" کا آزاد ترجمہ ہے۔ اس نظم میں جو "West-oestlicher Divan" سے بہت پہلے لکھی جا چکی تھی' عظیم جرمن شاعر نے اسلامی تصور حیات کی ایک حسین تصویر پیش کی ہے۔ یہ دراصل ایک اسلامی ڈرامے کے ذہنی خاکے کا ایک حصہ تھا' جسے وہ مکمل نہیں کر سکا تھا۔ موجودہ ترجمے کا مقصد محض گوئٹے کے نقطہ نظر کی ایک جھلک دکھانا ہے۔ گوئٹے نے حضرت رسالت مآبؐ کا تصور ایک فراخ دل' ہمہ گیر شخصیت کے روپ میں پیش کیا ہے' جو زندگی کے جذبہ کامل کی انتہائی تکمیل کے لئے جدوجہد کر رہا ہے اور حیات انسانی' خدا کی اعلیٰ ترین تخلیق کی سطح تک نہیں پہنچا ہے۔ "Mahomets Gesang" کا جو ترجمہ براؤننگ نے کیا ہے' اس کے ایک مندرجہ ذیل ٹکڑے کو نمونتاً" پیش کیا جاتا ہے' جس سے شاعر کے تخیل کی بلندی کا اندازہ ہو گا:

"Social Streamlets

Join his waters. And now moves

He over the plain in silvery glory,

And the plain in him exults,

And the rivers from the plains,

And the Streamlets from the hills,

Shout with joy, exclaiming, Brother,

Brother, take thy brethren with thee,

With Thee to thy aged father,

To the everlashing ocean,

Who, waith arms overcasting far,

Waiteth for us."

اقبال کی تصانیف میں "پیام مشرق" کو ایک خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں موضوعات اور اسالیب فن' دونوں اعتبار سے بڑی رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ ابتدائی حصے میں رباعی نما قطعات کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ بقیہ کتاب "افکار" "مئے باقی" اور "نقش فرنگ" کے عنوان سے تین حصوں پر مشتمل ہے۔ "مئے باقی" جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے' حافظ کے رنگ میں' غزلیات پر اور بقیہ دونوں حصے مختلف موضوعات والی چھوٹی چھوٹی نظموں پر مشتمل ہیں۔ ان میں سب سے طویل نظم "تنہائی" ہے' وہ بھی مخمس ہیئت میں صرف چار بند پر مشتمل ہے' لیکن حسن تخیل کے اعتبار سے اقبال کے شہ پاروں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔ اس نظم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ دسمبر 1923ء میں اقبال سے ان کے ایک نیاز مند اور مخلص دوست سجاد حیدر یلدرم (رجسٹرار علی گڑھ یونیورسٹی) نے یونیورسٹی کے اساتذہ و طلبہ کی طرف سے علی گڑھ میگزین کے ایک خصوصی شمارے کے لئے تازہ کلام کی فرمائش کی تھی۔ اقبال نے اپنی نظم "تنہائی" بھیج دی۔ یلدرم جیسے صاحب ذوق رجسٹرار نظم دیکھتے ہی پھڑک اٹھے۔ فوراً میگزین کے مدیر خواجہ منظور حسین اور یونیورسٹی کے اساتذہ میں سے اپنے چند احباب کو بلایا اور اقبال کی نظم جھوم جھوم کر سنانے لگے۔ جملہ اساتذہ بھی بے حد محظوظ و متاثر ہوئے۔ اس طرح آناً فاناً پوری یونیورسٹی میں اس نظم کا چرچا پھیل گیا۔

اس مختصر شذرے سے قارئین کے دل میں مذکورہ بالا نظم "تنہائی" کے مطالعے کا شوق بیدار ہوا ہو گا..... یہاں "پیام مشرق" کے انتساب کے وہ اشعار درج کئے جاتے، جن میں اقبال نے جرمن شاعر گوئٹے کو نہایت حسین پیرائے میں خراج تحسین پیش کیا ہے:

پیر مغرب شاعر المانوی — آں قتیل شیوہ ہائے پہلوی
بست نقش شاہدان شوخ و شنگ — داد مشرق را سلامے از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغام شرق — ماہ تابے ریختم بر شام شرق
تاشناسائے خودم، خود بیں نیم — با تو گویم او کہ بود و من کیم
او ز افرنگی جواناں مثل برق — شعلہ من از دم پیران شرق
او چمن زادے، چمن پروردۂ — من دمیدم از زمین مردۂ
او چو بلبل در چمن "فردوس گوش" — من بصحرا چوں جرس گرم خروش
ہر دو دانائے ضمیر کائنات — ہر دو پیغام حیات اندر ممات
ہر دو خنجر صبح خند، آئینہ فام — او برہنہ، من ہنوز اندر نیام
ہر دو گوہر ارجمند و تاب دار — زادۂ دریائے ناپیدا کنار
او ز شوخی در تہہ قلزم تپید — تا گریبان صدف را بر درید
من بہ آغوش صدف تابم ہنوز — در ضمیر بحر نایابم ہنوز

(پیام مشرق ص 16)

(فروغ اقبال، لاہور: اقبال اکادمی، پاکستان، 1996ء ص 158-162)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

پیام مشرق
(ایک مطالعہ)

"پیام مشرق" فارسی زبان میں اقبال کا تیسرا مجموعہ کلام ہے اور 1923ء میں پہلی بار چھپا ہے۔ اس میں نظمیں، غزلیں اور قطعات سبھی کچھ شامل ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ ہیئت اور مواد دونوں کے اعتبار سے متنوع ہے۔ اس مجموعے کی تخلیق و ترتیب کا اصل محرک مشہور جرمن شاعر گوئٹے ہے۔ "پیام مشرق" کی تیاری اقبال نے 1918ء میں "رموز بے خودی" کی اشاعت کے فوراً بعد شروع کر دی تھی اور فارسی کے ساتھ بعض اردو نظمیں بھی وہ اس میں شامل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن بعض وجوہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ علامہ سید سلیمان ندوی کو 10 اکتوبر 1919ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "فی الحال میں ایک مغربی شاعر کے دیوان کا جواب لکھ رہا ہوں جس کا قریباً نصف حصہ لکھا جا چکا ہے، کچھ نظمیں فارسی میں ہوں گی کچھ اردو میں۔"(1)

"پیام مشرق" پہلا مجموعہ کلام ہے، جس میں مغربی شعرا و مفکرین سے اقبال کے باقاعدہ ذہنی ربط و تاثر، خصوصاً گوئٹے سے عقیدت کا سراغ ملتا ہے۔ اس سے پہلے ان کی مثنویوں میں گوئٹے کا ذکر آیا تھا، لیکن اس انداز سے نہیں۔ "پیام مشرق" گوئٹے سے ان کے گہرے ذہنی تعلق کا ثبوت ہے اور اس کے سرورق پر "در جواب دیوان شاعر المانوی گوئٹے" کا فقرہ لکھ کر اقبال نے اسے ایک طرح کا خراج عقیدت پیش کیا ہے:

پیر مغرب شاعر المانوی آں قتیل شیوہ ہائے پہلوی
بست نقش شاہدان شوخ و شنگ داد مشرق را سلامے از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغام شرق ماہ تابے ریختم بر شام شرق
ناشناسائے خودم خود بیں نیم با تو گویم او کہ بود و من کیم

"پیام مشرق" کے دیباچے میں علامہ تفصیل سے لکھتے ہیں کہ :

"پیام مشرق کی تصنیف کا محرک جرمن حکیم حیات گوئٹے کا "مغربی دیوان" ہے جس کی نسبت جرمنی کا اسرائیلی شاعر ہائنا لکھتا ہے : "یہ ایک گلدستہ عقیدت ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے ..... اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے سے حرارت کا متلاشی ہے۔" .....ابتدائے شباب ہی سے گوئٹے کی ہمہ گیر طبیعت مشرقی تخیلات کی طرف مائل تھی ..... خواجہ حافظ کے علاوہ گوئٹے اپنے تخیلات میں شیخ عطار' سعدی' فردوسی اور عام اسلامی لٹریچر کا بھی ممنون احسان ہے ..... عجمی تصوف سے اسے مطلق دلچسپی نہ تھی اور گو اسے یہ بات معلوم تھی کہ مشرق میں خواجہ حافظ کے اشعار کی تفسیر تصوف کے نقطہ نگاہ سے کی جاتی ہے' وہ خود تغزل محض کا دلدادہ تھا اور کام حافظ کی صوفی تعبیر سے اسے کوئی ہمدردی نہ تھی۔"

لیکن گوئٹے کے "دیوان مغرب" سے متاثر ہونے کا خاص پس منظر تھا۔ اس پس منظر میں مغرب کا تہذیبی بحران اور مشرق کا سیاسی آشوب خاص اہمیت رکھتا ہے۔ وطنیت پر مبنی قوم پرستی اور روحانیت سے یکسر بیزاری کے نتیجے میں مغرب جس قسم کے مہلک ذہنی امراض کا شکار ہو رہا تھا اور پہلی جنگ عظیم کے دھماکے کے بعد اسلامی ممالک جس قسم کی مرعوبیت' افراتفری اور سیاسی شکست و ریخت سے دوچار ہو رہے تھے' اقبال اس کا بغور مطالعہ کر رہے تھے اور جو کچھ ہو رہا تھا' اسے اپنی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ یورپ مادی قوت کے زعم میں انسانی اقدار اور مشرق وسطیٰ کی اسلامی ریاستوں کو جس طرح پامال کر رہا تھا' اس نے اقبال کو بڑے پیچ و تاب میں ڈال رکھا تھا' لیکن مصطفیٰ کمال پاشا کی صورت میں وہ بعض ایسی علامتیں بھی دیکھ رہے تھے' جو مشرق کو بیدار کر رہی تھیں اور جن سے توقع بندھتی تھی کہ مشرق اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو بہت جلد دوبارہ حاصل کر لے گا۔ اس لئے کہ مشرقی فلسفہ

حیات کا مدار روحانیت پر اور مغربی زندگی کا انحصار کلیتہ مادی ترقی اور اس کی پیدا کردہ علاقائی اور نسلی کشمکش پر ہے۔ یہ حالات کم و بیش اسی قسم کے تھے جو "پیام مشرق" کے وجود میں آنے سے سو سال پہلے گوئٹے کے "دیوان مغرب" کی تخلیق کے وقت موجود تھے۔ گویا زمانی بعد کے باوجود اقبال کو اسی قسم کے تاریخی حالات کا سامنا تھا' جن سے گوئٹے کا عہد عبارت تھا۔ ایسے میں اگر اقبال کو گوئٹے یاد آیا اور اس کے "دیوان" نے اقبال کو "پیام مشرق" کی ترتیب پر آمادہ کیا' تو چنداں تعجب کی بات نہیں ہے۔ ان حالات میں اقبال نے ضروری جانا کہ اقوام مشرق کو انقلابی قوتوں کے حصول کا احساس دلایا جائے اور دریوزہ گری کے بجائے انہیں خود اعتمادی اور خود شناسی کا درس دیا جائے۔ خود اقبال نے دیباچے کے آخر میں لکھا ہے کہ "اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالا تر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو' قابل احترام ہے۔ اسی بنا پر میں نے ان چند اوراق کو اعلیٰ حضرت فرمانروائے افغانستان کے نام نامی سے منسوب کیا ہے کہ وہ اپنی فطری ذہانت و فطانت سے اس نکتے سے بخوبی آگاہ معلوم ہوتے ہیں۔"

اقبال کو گوئٹے کے "دیوان مغرب" کا جو رخ محبوب تھا' وہ یہ ہے کہ اس میں اس نے مغرب کی روحانی سرد مہری اور مادہ پرستی کا رونا رویا ہے اور اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ یورپ روحانی اقدار و سوز باطنی سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی آرزو یہ ہے کہ بے یقینی دور ہو جائے اور مغرب کا سینہ کسی طرح نور یقین سے منور ہو جائے۔ اس کے لئے اس نے مشرقی تخلیقات فن میں پناہ لینے کی کوشش اور مشرق کو اپنا خراج "دیوان مغرب" کی شکل میں پیش کیا۔ اقبال نے "پیام مشرق" کے ذریعے نطشے کی اسی آرزو کو پورا کرنے اور قلب مغرب میں آتش شوق بھڑکانے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں ماحول کے اس خاص فرق کو بھی اس طور ظاہر کر دیا گیا ہے جو اقبال اور نطشے کے درمیان پایا جاتا ہے:

او ز افرنگی جواناں مثل برق
شعلہ من از دم پیران شرق
او چمن زادے' چمن پروردۂ
من دمیدم از زمین مردۂ

او چو بلبل در چمن "فردوس گوش"
من بصحرا چوں جرس گرم خروش
ہر دو دانائے ضمیر کائنات
ہر دو پیغام حیات اندر ممات
ہر دو خنجر صبح خند، آئینہ فام
او برہنہ، من ہنوز اندر نیام
ہر دو گوہر ارجمند و تاب دار
زادۂ دریائے ناپیدا کنار
او ز شوخی در تہ قلزم تپید
تا گریبان صدف را بر درید
من بہ آغوش صدف تابم ہنوز
در ضمیر بحر نایابم ہنوز

لیکن ان باتوں سے یہ خیال کرنا کہ گوئٹے کے "دیوان مغرب" اور اقبال کے "پیام مشرق" میں کوئی موضوعی مناسبت ہے، درست نہ ہو گا۔ اقبال نے یقیناً "پیام مشرق" کو "دیوان مغرب" کے طرز پر مرتب کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ "پیام مشرق" کا بیشتر حصہ "دیوان مغرب" کی طرح چھوٹے چھوٹے نظم کے ٹکڑوں اور مختلف عنوانوں پر مشتمل ہے، ورنہ جیسا کہ ڈاکٹر نکلسن نے "پیام مشرق" پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے، بلحاظ مقصد اور نفس مضمون "پیام مشرق" اور "دیوان مغرب" میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ گوئٹے کی دو نظمیں "پیام مشرق" میں "حور و شاعر" اور "جوئے آب" کے نام سے ترجمہ کی گئی ہیں، وہ بھی "دیوان مغرب" سے نہیں دوسری جگہوں سے لی گئی ہیں۔(2)

"پیام مشرق" کی پہلی اشاعت کے بارے میں مولانا عبدالسلام ندوی نے علامہ اقبال کے ایک خط بنام مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرقوم 17 اپریل 1922ء کے درج ذیل فقرے کا

"پیام مشرق اپریل کے آخر تک شائع ہو جائے گا۔"(3)

یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "یہ کتاب 1922ء میں شائع ہوئی"(4) لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ "پیام مشرق" کے پہلے ایڈیشن کا سن اشاعت، جیسا کہ پچھلی سطور میں ظاہر کیا جا چکا

ہے' 1923ء ہے۔

"پیام مشرق" کی مشمولات چار خاص ابواب میں تقسیم ہیں' پہلے "لالہ طور" کے زیر عنوان ایک سو ترسٹھ قطعات ہیں۔ یہ قطعات فارسی کے مشہور صوفی بابا طاہر عریاں کی دو بیتیوں کے طرز پر "مفاعیلن مفاعیلن فعولن" کے وزن میں ہیں۔ اگرچہ "پیام مشرق" میں "لالہ طور" کے نیچے "رباعیات" درج ہے' لیکن انہیں فنی نقطہ نظر سے قطعہ یا دوبیتی ہی کہنا چاہئے' اس لئے کہ رباعی کی اصطلاح اصناف سخن میں مخصوص وزن اور خاص نظام کے لئے مستعمل ہے۔ اردو کے بعض ناقدین نے اقبال کے ان قطعات کو بے سبب رباعی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی اقبال پر یہ الزام بھی لگایا ہے کہ وہ اپنے قطعات کو رباعی کہنے پر مصر تھے۔ یہ خیال سرے سے بے بنیاد ہے۔ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور خود میں نے اس موضوع پر کئی جگہ تفصیل سے بحث کی ہے' اس لئے اس جگہ اس کی تفصیل میں جانے سے فائدہ نہیں۔ ان قطعات میں اقبال نے خودی' بے خودی اور ان کے اجزائے ترکیبی و دیگر لوازم مثلاً عقل' عشق' جنون' فلسفہ' سخت کوشی' جہد مسلسل' عمل پیہم' یقین کامل اور فقر و استغنا کی کرشمہ سازی اور حیات افروزی کا ذکر حد درجہ لطیف و دلکش پیرائے میں کیا ہے۔ کہنے کو موضوعات وہی ہیں' جو "اسرار و رموز" میں بشکل مثنوی زیر بحث آ چکے ہیں' لیکن قطعہ کے روپ میں ان کی دلاویزی و اثر پذیری کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ بطور مثال چند قطعات دیکھئے :

به برگ لاله رنگ آمیزی عشق
بجان ما بلا انگیزی عشق
اگر ایں خاکداں را واشگافی
درونش بنگری خونریزی عشق

نه با هر کس از محبت مایه دار است
نه با هر کس محبت سازگار است
بروید لاله با داغ جگر تاب
دل لعل بدخشاں بے شرار است
دریں گلشن پریشاں مثل بویم

نمی دانم چہ می خواہم، چہ جویم
بر آید آرزو یا، برنیاید
شہید سوز و ساز آرزویم

تنے پیدا کن از مشت غبارے
تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درون او دل درد آشنائے
چو جوئے در کنار کوہسارے

تہی از ہائے و ہو میخانہ بودے
گل ما از شرر بیگانہ بودے
نبودے عشق و ایں ہنگامہ عشق
اگر دل چوں خرد فرزانہ بودے

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و باموجش در آویز
حیات جاوداں اندر ستیز است

ہزاراں سال با فطرت نشستم
باوپیوستم و از خود گسستم
ولیکن سرگذشتم ایں دو حرف است
تراشیدم، پرستیدم، شکستم

بہر دل عشق رنگ تازہ بر کرد
گہے با سنگ گہ با شیشہ سرکرد
ترا از خود ربود و چشم تر داد
مرا با خویشتن نزدیک تر کرد

دوسرے حصے میں "افکار" کے عنوان کے تحت مختلف موضوعات پر نظمیں ہیں۔ یہ

نظمیں ہیئت کے مختلف تجربات پر مبنی ہیں اور اقبال کی فنی دسترس پر دلالت کرتی ہیں۔ یعنی ان میں مسدس، مثنوی، مثمن اور مختلف تعداد کے مصرعوں کے بند پر مشتمل جدید تر طرز کی نظمیں سبھی شامل ہیں۔ "تسخیر فطرت" قدرے طویل نظم ہے اور اس میں میلاد آدم، انکار ابلیس، اغوائے آدم، آدم از بہشت بیرون آمد اور "صبح قیامت" کے عنوان کے پانچ ٹکڑے شامل ہیں۔ ان کی بحریں اور زمینیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور اس لحاظ سے یہ نظم فارسی شاعری میں ایک نیا فنی تجربہ ہے۔ ہیئت کے جدید تجربوں میں بعض دوسری نظموں مثلاً فصل بہار، سرود انجم، کرمک شب تاب، حدی اور شبنم کے نام آتے ہیں۔ ان میں بند کے مصرعوں کی تعداد اور ان کا نظام وزن قدیم ہیئتوں یعنی مسدس، مثمن اور مربع سے بہت مختلف ہے۔ ان میں سے کسی میں بھی اگرچہ مصرعوں کی تعداد پچیس سے زیادہ نہیں، پھر بھی انہیں طویل کہہ سکتے ہیں کہ بقیہ نظمیں ان سے بھی مختصر ہیں۔ ان میں سے بعض نظمیں مثلاً تسخیر فطرت، نوائے وقت، فصل بہار، سرود انجم، حدی، محاورہ مابین حور و انسان، ساقی نامہ، حور و شاعر، زندگی اور عمل، جوئے آب، بہشت اور کشمیر ایسی معرکہ آرا نظمیں ہیں، جنہیں اقبال کے تخیل شاعرانہ اور فنی دسترس کا حیرت انگیز نمونہ کہہ سکتے ہیں اور جن کو نظر انداز کر کے اقبال کا کوئی ناقد ان کی فطانت شاعرانہ اور معیار فن کا معتبر جائزہ نہیں لے سکتا۔ یہ نظمیں فکر اقبال کو ایسے دلکش انداز میں پیش کرتی ہیں کہ ان کا وہی فلسفہ حیات، جو کہ "اسرار و رموز" میں قدرے ذہنی الجھن کا سبب بنتا ہے، قاری کے ذہن و روح میں نشاط انگیزی کے ساتھ اتر جاتا ہے۔ اس سلسلے میں بعض مختصر نظمیں اور ان کے ٹکڑے دیکھئے:

میلاد آدم

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور
خود گرے خود شکنے خود نگرے پیدا شد

حکمت و شعر

بو علی اندر غبار ناقہ گم

دست رومی پردۂ محمل گرفت
ایں فروتر رفت و تا گوہر رسید
آں بگردابے چو خس منزل گرفت
حق اگر سوزے ندارد حکمت است
شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

زندگی و عمل

ساحل افتادہ گفت، گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موج ز خود رفتہ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر میردم، گر نہ روم نیستم!

بہشت

کجا ایں روزگارے شیشہ بازے
بہشت ایں گنبد گرداں ندارد
ندیدہ درد زنداں یوسف او
زلیخایش دل نالاں ندارد
خلیل او خریف آتشے نیست
کلیمش یک شرر در جان ندارد
یقیں را در کمیں بوک و مگر نیست
وصال اندیشہ ہجراں ندارد
کجا آں لذت عقل غلط سیر
اگر منزل رہ پیچاں ندارد
مزی اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

عشق

عقلے کہ جہاں سوزد' یک جلوۂ بیباکش
از عشق بیاموزد' آئین جہانتابی
عشق است کہ در جانت صد کیفیت انگیزد
از تاب و تب رومی تا حیرت فارابی
ایں حرف نشاط آور' می گویم و می رقصم
از عشق دل آساید' با ایں ہمہ بے تابی
ہر معنی پیچیدہ در حرف نمی گنجد
یک لحظہ بدل در شو' شاید کہ تو دریابی

"پیام مشرق" کی نظموں میں "حور و شاعر" جو کہ براہ راست گوئٹے ہی کے عنوان پر گوئٹے کے جواب میں کہی گئی ہے اور "آب جو" جو کہ گوئٹے کے "نغمہ محمدؐ" کا آزاد ترجمہ ہے' اپنی غنائیت و شعریت کے لحاظ سے نہایت اعلیٰ پائے کی نظمیں ہیں۔ "نغمہ محمدؐ" کا ترجمہ اس خوبی سے کیا ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ فن کے لحاظ سے اصل نظم بہتر ہے یا ترجمہ۔

"پیام مشرق" کے تیسرے حصے کا عنوان "مئے باقی" ہے۔ اس کے تحت غزلیں ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ ان میں عشق کی وہی سرمستی اور اسلوب شاعرانہ کی وہی سحر انگیزی ہے' جو حافظ کی غزلوں کا طرۂ امتیاز ہے' لیکن معنویت کے لحاظ سے وہ حافظ کی شاعری سے بہت الگ ہیں۔ حافظ کی سرمستی لوریاں دے کر سلاتی ہے اور اقبال کی سرمستی نیند کے خمار کو توڑتی اور خواب سے بیدار کرتی ہے۔ اقبال کی عاشقی حافظ کی طرح خود سپردگی و سرمستی کی داعی نہیں' بلکہ جہد و عمل کا پیغام ہے' جیسا کہ خود اقبال نے ایک مقطع میں کہا ہے:

ز شعر دلکش اقبال می تواں دریافت
کہ درس فلسفہ می داد و عاشقی ورزید

اقبال و حافظ کے تصور وصال میں بڑا فرق ہے۔ اقبال کسی عالم میں بھی اپنے وجود کو محبوب کی محبت میں فنا کر دینے یا خود شناسی و تحفظ ذات کے احساس سے دست بردار ہو جانے کے قائل نہیں۔ وصال کے لئے وہ عاشق اور محبوب دونوں کے وجود کو بیک وقت

ضروری جانتے ہیں :

ہم با خود و ہم با او، ہجراں کہ وصال است ایں
اے عقل چہ می گوئی، اے عشق چہ فرمائی

فرزانہ بگفتارم، دیوانہ بہ کردارم
از بادۂ شوق تو ہشیارم و مستم من

"پیام مشرق" کا چوتھا حصہ "نقش فرنگ" سے موسوم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس حصے میں اقبال نے مغرب ہی کو مخاطب کیا ہے۔ چنانچہ اس حصہ میں شوپن ہار، نطشے، ٹالسٹائے، کارل مارکس، ہیگل، آئن سٹائن، بائرن، گوئٹے، برگساں، لینن، لاک، کانٹ، براؤننگ اور ان کے فکر و نظر کا بار بار ذکر آیا ہے۔ سب کی خوبیوں اور کمزوریوں سے بحث کی گئی ہے اور سب کے بارے میں بے لاگ رائیں دی گئی ہیں۔ مغرب کے ان حکما و شعرا کا ذکر اقبال کی دوسری تصانیف میں بھی آیا ہے لیکن "پیام مشرق" میں چونکہ یہ سب ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں، اس لئے مغرب اور اس کے دانشوروں کے متعلق اقبال کا نقطہ نظر جاننے میں "پیام مشرق" کا یہ حصہ سب سے زیادہ رہنمائی کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ اقبال کے فکر و فن کے سلسلے میں "پیام مشرق" نہایت اہم تصنیف ہے۔ ایک طرف یہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اقبال اپنے فلسفہ حیات کو نغمہ و شعر میں ڈھالنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے پیغام اور نقطہ نظر میں پختگی کے ساتھ عظمت کے آثار بھی پیدا ہو گئے۔ رہ گئی طرز اظہار کی بات، اس کے بارے میں جو لوگ "اسرار و رموز" کے اسلوب شاعرانہ سے نامطمئن تھے، انہیں بھی اس کا اعتراف ہے کہ "پیام مشرق" کی اشاعت کے بعد فلسفیت کم اور شعریت بڑھنے لگی ہے۔ نومشقی کا دور ختم ہو گیا ہے اور "اسرار و رموز" کی شراب پیمانے میں ڈھلنے لگی ہے۔

حواشی

1- اقبال نامہ، حصہ اول ص 107

2- نیرنگ خیال (اقبال نمبر 1932ء) ص 316

3- اقبال نامہ' حصہ اول ص 234

4- "اقبال کامل" ص 97

(اقبال (پیش کش انجمن سادات امروہہ' کراچی)' سال طباعت 1977ء' سال اشاعت 1981ء' ص 39-42)

ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ

"پیام مشرق" پر ایک نظر

"پیام مشرق" علامہ اقبال نے جرمنی کے شہرہ آفاق شاعر گوئٹے کے جواب میں لکھی۔ کتاب کا دیباچہ جرمن ادب میں مشرقی تحریک کے متعلق ایک عمدہ بحث پر مشتمل ہے۔ ابتدائی حصے میں 163 رباعیاں "لالہ طور" کے عنوان سے ملتی ہیں' جن کا انگریزی ترجمہ پروفیسر آربری نے Tulip of Sinai کے نام سے کیا ہے۔ یہ رباعیاں جنہیں بہتر ہو گا کہ دو بیتیوں کا نام دیا جائے' سبک شعر کے اعتبار سے بابا طاہر عریاں کی پیروی میں کہی گئی ہیں۔ زبان و بیان کی خوبیوں اور مطالب و معانی کی ندرتوں کے لحاظ سے یہ دو بیتیاں کلام اقبال کا بے نظیر حصہ ہیں۔ علامہ کی زبان نے عظیم افکار کے متحمل ہونے میں جس قوت کا ساتھ ان مختصر ترانوں میں دیا ہے' وہ کہیں اور شاید کم نظر آئے' البتہ اقبال بابا طاہر سے اس لحاظ سے بالکل مختلف ہیں کہ علامہ کے موضوعات طاہر کی طرح عاشقانہ نہیں بلکہ زیادہ تر فلسفیانہ اور عارفانہ ہیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ "افکار" کے نام سے شروع ہوتا ہے' جس میں اکثر انواع سخن مثلاً قطعہ' مثنوی' مسمط' ترکیب بند' ترجیع بند' مستزاد اور قصیدہ وغیرہ پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ یہ مختلف آہنگوں پر مشتمل چھوٹی بڑی منظومات اقبال کی فکر و فن کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اس حصے کی اکثر نظموں میں انسان کی بنیادی صلاحیتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور فلسفہ حرکت کو بالخصوص موضوع بحث بنا کر زندگی کے ارتقائی مراحل کی توضیح کی گئی ہے۔ اقبال نے انسانی

حرکت اور ارتقا کو مغربی فلسفیوں کے برعکس عشق اور اس کے سوز و گداز کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ "عشق" کے عنوان سے ایک نظم میں فرماتے ہیں۔(1)

جز عشق حکایتے ندارم پروائے ملامتے ندارم
از جلوۂ علم بے نیازم سوزم گریم تپم گدازم

"حکمت و شعر" کے عنوان سے ایک قطعہ نہایت پر معنی اور قابل توجہ ہے، جس میں مشرق کے عظیم فلسفی بو علی کو عقل و حکمت سے تعبیر کیا ہے اور رومی کو عشق و وجدان سے:

بو علی اندر غبار ناقہ گم دست رومی پردۂ محمل گرفت
این فروتر رفت و تا گوہر رسید آں بگردا بے چوخس منزل گرفت
حق اگر سوزے ندارد حکمت است
شعر میگردد چو سوز از دل گرفت(2)

تیسرے حصے میں "مئے باقی" کے عنوان سے 45 غزلیں ہیں۔ "مئے باقی" کا عنوان حافظ کے اس شعر سے اقتباس ہے:

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلی را(3)

ان میں بہت سی غزلیں حافظ کی پیروی میں کہی گئی ہیں۔ اقبال کے لئے شیرازی نوا تو پسندیدہ ہے ہی، لیکن یہ التزام خصوصاً اس لئے بھی کیا ہے کہ چونکہ گوئٹے حافظ کے کلام سے غیر معمولی طور پر متاثر تھا اور اپنے آپ کو اس کا مرید تصور کرتا تھا اور حافظ کے کلام کو ابدیت کی طرح عظیم اور ازلی و ابدی گردانتا تھا، لہٰذا اقبال نے اس رعایت سے غزلوں کا ایک بہت بڑا حصہ ایسا تصنیف کیا ہے جو زبان و بیان کے اعتبار سے بہت حد تک غزلیات حافظ کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ بعض غزلیں رومی کی تقلید میں بھی ہیں اور بعض میں نظیری کا استقبال بھی کیا گیا ہے۔

"پیام مشرق" کا چوتھا حصہ "نقش فرنگ" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ وہ پیام ہے، جو اقبال نے مشرق کی طرف سے مغرب کو بھیجا ہے۔ سبک سخن کے اعتبار سے اس حصے کی غزلیں بھی زیادہ تر حافظ کی پیروی میں ہیں۔ اسی حصے میں متعدد قطعات مختلف ہیئتوں اور

گوناگوں عناوین کے تحت درج ہیں' جن میں شوپن ہار' نیٹشے' ٹالسٹائی' کارل مارکس' لینن' ہیگل' رومی' برگساں' مزدک' آئن سٹائن اور کانٹ وغیرہم کے افکار کو بالاختصار بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے "پیام مشرق" کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔

"پیام مشرق" 1923ء میں شائع ہوئی یعنی اس دور میں جب مغرب کی استعماری طاقتیں مشرق کو اپنی یغماگری کا ہدف بنائے ہوئے تھیں۔ سارا مشرق ایک عجیب آشفتگی' بدحالی اور پریشانی کا شکار ہو رہا تھا۔ سیاسی اور اجتماعی زوال کے ساتھ ساتھ مغربی مادیت کے اثر سے مشرق کے پرنور افق پر اندھیرے ہی اندھیرے چھا رہے تھے اور انسان ان اندھیروں کی آڑ میں بڑی بے دریغی سے انسانی ناموس کا پردہ چاک کر رہا تھا۔

مشرق کی بیداری کے لئے اقبال خودی یا استحکام ذات کے فلسفے کو پیش کر کے اہل مشرق کو انسان کی لامحدود اور غیر فانی معنوی اور روحانی اقدار سے روشناس کرا چکا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اقبال نے اجتماعی قدروں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مغرب کو مادہ پرستی کے برعکس مذہب اور روحانیت کی تعلیم دینی شروع کی اور اس میدان میں وہ مشرق کا زبردست معنوی مبلغ بن کر اٹھا اور اسی معنویت کے درس کو اس نے انسانی رفاہ و فلاح کا واحد ذریعہ قرار دیا۔

"پیام مشرق" اقبال نے جرمنی کے بلند پایہ شاعر گوئٹے کے "دیوان غربی و شرقی" کے جواب میں لکھی۔ گوئٹے نے اپنا یہ دیوان جو اس کا شاہکار تصور کیا جاتا ہے' کچھ ایسے ہی آشفتہ اور پراضطراب حالات میں لکھا تھا۔ دراصل انقلاب فرانس کے بعد یورپ کچھ اس طرح بیدار ہوا کہ مادیت کے سوا اسے دنیا میں کوئی اور قدر دکھائی ہی نہ دی اور مادی رجحان کی رو میں بہہ کر معنویت اور وجدان سے بہت ہی دور جا پڑا' چنانچہ یورپ کی مادی فضا ایک حساس روح اور ایک معنویت پسند شخص کے لئے ناقابل زیست بن گئی۔ گوئٹے جیسے انسان دوست آدمی کے لئے ایسی مکدر اور مسموم فضا میں دم لینا دشوار تھا' چنانچہ وہ مغرب سے فرار کر کے مشرق میں پناہ لینے کے لئے مجبور ہو گیا۔ اسرائیلی شاعر ہائنا کے مطابق "دیوان غربی و شرقی" سے "اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے سے حرارت کا متلاشی ہے۔"

1814ء میں گوئٹے نے اپنے مجموعہ کلام کو شعرائے مشرق کی روایت کے مطابق "دیوان" کا نام دیا اور "ہجرت" کے عنوان سے اس کا سر آغاز لکھا' جو مختصراً یوں شروع ہوتا

ہے:

"شمال، مغرب اور جنوب پریشان اور آشفتہ ہیں۔ تخت و تاج برباد ہو رہے ہیں اور سلطنتوں کے پائے لرز رہے ہیں۔ تو اس دوزخ سے دور بھاگ جا اور دل پذیر مشرق کا رخ کر تاکہ وہاں روحانیت کی ٹھنڈی ہوا تجھ پر چلے اور محفل عشق و شراب اور آب حیات تجھے زندہ کرے۔"

"آکہ میں بھی اسی راہ کا مسافر ہوں تاکہ مشرق کی پاک فضاؤں میں گم ہو کر صدیوں پیچھے چلا جاؤں یہاں تک کہ ایک ایسے زمانے میں پہنچ جاؤں، جس میں لوگ خدا سے آسمانی قوانین کو زمینی الفاظ کے وسیلے سے سیکھا کرتے تھے۔"

"آکہ میں بھی دیار مشرق کا مسافر ہوں تاکہ وہاں گڈریوں کے ساتھ ایک پاکیزہ اور صاف ستھری زندگی بسر کروں۔"

"اے حافظ! اس سفر دور دراز میں اور ان وادیوں کے نشیب و فراز میں ہر جگہ تیرے آسمانی نغمے میرے ہم سفر ہیں اور میرے دل کے لئے موجب تسکین ہیں۔ اے حافظ مقدس! میری آرزو یہ ہے کہ میں سفر و حضر میں ہر جگہ تیرے ساتھ رہوں۔" (5)

ثانیاً" یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہنا چاہئے کہ مشرق و مغرب میں جو خلیج حائل ہو رہی تھی اور جس طریق سے انسان کو انسان سے جدا کیا جا رہا تھا، وہ گوئٹے جیسے وسیع مشرب انسان کے لئے قابل تحمل نہ تھا۔ لہٰذا اس نے احترام آدمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے انسان کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے کی زبردست مہم شروع کی۔ چنانچہ "دیوان شرقی و غربی" ایک عظیم اجتماعی فلسفے کا سنگ بنیاد ہے، جس کے ذریعے عالم انسانی کے اتحاد کی جامع اور بلیغ کوشش کی گئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ گوئٹے کا زمانہ قومی تعصب اور نیشنلزم کی ترویج کا زمانہ تھا، جس کے خلاف گوئٹے کی آفاقی اور ہمہ گیر طبیعت نے زبردست آواز بلند کی۔ دراصل مغرب میں مسیحی تعلیمات کا نتیجہ ایک رہبانی نظام کی شکل میں نکل چکا تھا، جس نے بالآخر کلیسائی حکومت کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس کلیسائی حکومت میں جیسا کہ یورپ کی مذہبی تاریخ سے واضح ہے، دنیوی امور کے سلجھانے کا خانہ خالی تھا۔ نتیجتاً" حکومت اور کلیسا ایک دوسرے سے بالکل مختلف صورتیں اختیار کر چکے تھے، چنانچہ اسی وجہ سے لوتھر، روسو،

میکیاولی اور بعد ازاں نیٹشے و غیرہم نے کلیسائی حکومت کے خلاف عملی اور فکری بغاوتیں کیں۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال فرماتے ہیں :

"جس ذہنی تحریک کا آغاز لوتھر اور روسو کی ذات سے ہوا' اس نے مسیحی دنیا کی وحدت کو توڑ کر اسے ایک ایسی غیر مربوط اور منتشر کثرت میں تقسیم کر دیا' جس سے اہل مغرب کی نگاہیں اس عالمگیر مطمح نظر سے ہٹ کر جو تمام نوع انسانی سے متعلق تھا' اقوام و ملل کی تنگ حدود میں الجھ گئیں۔ اس نئے تخیل حیات کے لئے انہیں ایک سے کہیں زیادہ واقعی اور مرئی احساس مثلاً وطنیت کی ضرورت محسوس ہوئی' جس کا اظہار بالآخر ان سیاسی نظامات کی شکل میں ہوا' جنہوں نے جذبہ قومیت کے ماتحت پرورش پائی۔" (6)

گوئٹے نے قومیت کے پست تصور کو پس پشت ڈالا اور انسانیت کی طرفداری اور انسانی برادری کو اپنا شعار بنایا۔ چنانچہ اس بارے میں دسمبر 1814ء میں اس نے لکھا :

"میں چاہتا ہوں اس دیوان کو ایک آئینہ یا جام جہاں نما کی صورت دوں اور اس میں مشرق و مغرب کو ایک دوسرے کے قریب لا کر دکھاؤں۔" (7)

مئی 1815ء میں لکھتا ہے : "میری آرزو اور میرا مقصد یہ ہے کہ میں مشرق کو مغرب کے اور ماضی کو حال کے اور ایرانی کو جرمن کے نزدیک کروں اور ان علاقوں کے لوگوں کے طرز' عادات اور رسوم کو ایک دوسرے سے آشنا کراؤں۔" (8)

ایک اور جگہ کہتا ہے : "مشرق اور مغرب اللہ کے ہیں اور شمال و جنوب بھی۔" (9)

گوئٹے نے اتحاد انسانی کے اس عظیم مقصد کے لئے ایک "عالمی ادب" کا سہارا لیا۔ اس سلسلہ میں وہ اگرچہ گوناگوں اقوام کے تمدن' طرز فکر اور مذہبی اختلافات سے دوچار ہوا لیکن وہ اپنے سارے دیوان میں اس بنیادی نکتے پر زور دیتا ہے کہ : "مشرق اور مغرب ایک دوسرے سے جدا نہیں اور انہیں بہرصورت ایک دوسرے سے قریب ہونا چاہئے۔" (10)

گوئٹے اس عالمی ادب کو وجود میں لانے کے لئے یورپی ادب کے تین بڑے دھاروں' یعنی فرانسیسی' جرمن اور انگریزی ادب کے علاوہ ہسپانوی' اطالوی اور قرون وسطیٰ کے ادب کو بھی ضروری قرار دیتا تھا۔ چنانچہ وہ ہمیشہ اس امر کی تاکید کرتا رہا کہ دروازۂ ادب کو مکمل طور پر کھولنا چاہئے تاکہ مشرق کے عظیم الشان شعرا یعنی حافظ اور سعدی بھی اس بزم میں شریک

ہو سکیں۔(11) وہ اہل علم و دانش کو اس بات کی تلقین کرتا رہا کہ وہ اپنے آپ کو "قومیت" کی چار دیواری میں محبوس کرنے کی بجائے اپنی نظریں آفاقی بلندیوں پر رکھیں اور ایک دوسرے کا احترام کریں۔

دوسری بات جو "دیوان غربی و شرقی" میں خاص اہمیت کی حامل ہے' وہ قومی اور مذہبی تعصبات سے گوئٹے کی شدید نفرت ہے۔ گوئٹے نے اپنے "دیوان" میں حافظ کی طرح جس کا ایمان اور فرمان ہے :

آسائش دوگیتی تفسیر ایں دو حرف است

با دوستاں مروت با دشمناں مدارا(12)

یہ کوشش کی ہے کہ وہ خشک تعصبات کی بجائے وجدان اور منطق کو اپنا شیوہ اور شعار بنائے۔ چنانچہ اس وجدانی رجحان اور منطقی غلبے کی بنا پر وہ کہتا ہے :

"اگر اسلام کے معنی اپنے امور اور ارادوں کو خدا کے سپرد کرنے کا نام ہے تو ہم سب مسلمان ہیں اور مسلمان ہی مریں گے۔"(13)

گوئٹے کی توحید پرستی اور حقیقت پسندی ملاحظہ ہو۔ ایک دفعہ اس کی محبوبہ ماریان نے جسے وہ زلیخا کے نام سے پکارا کرتا تھا' گلے میں صلیب پہن رکھی تھی۔ گوئٹے یہ دیکھ کر سخت برہم ہوا اور کہنے لگا : "کیا حافظ شیرازی تجھے اس بدنما ہار کے ساتھ اپنے شیراز میں داخل ہونے کی اجازت اور تجھے اپنے حضور میں جگہ دے گا؟ جا اور خدا کے شرک کی اس علامت کو دور پھینک دے۔"(14)

اپنی نظم "ساقی نامہ" میں قرآن پاک کے متعلق لکھتا ہے : "بعض لوگ قرآن کو قدیم اور بعض حادث تصور کرتے ہیں۔ مجھے اس راز کا علم نہیں اور نہ ہی میں اسے جاننا چاہتا ہوں کیونکہ میرا تو یہی ایمان ہے قرآن اللہ کا کلام ہے اور مسلمانوں کے لئے بس اتنا ہی جاننا کافی ہے۔"(15)

گوئٹے نے پیغمبر اسلامؐ کی تعریف میں جا بجا نظمیں کہی ہیں اور اس طریق سے کوشش کی ہے کہ شرق و غرب کے باہمی تعصبات کو ختم کرے اور اہل مغرب پر دین اسلام کی عظمت اور ہمہ گیری کو واضح کرے۔ اس نے نپولین کے ساتھ ملاقات میں اپنی نظم "محمدؐ" صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر تبصرہ کیا۔ نپولین نے جو خود پیغمبر اسلام کا مداح تھا' والٹیئر پر سخت

نکتہ چینی کی کیونکہ موخرالذکر نے "المیہ محمدؐ" لکھ کر نبی کریمؐ کی شان میں گستاخی کی تھی۔ گوئٹے نے "نغمہ محمدؐ" "برگزیدہ اشخاص" "ہجرت کا نواں سال" اور دیگر بہت سی منظومات میں حضرت نبی علیہ السلام کی تعریف و توصیف کی ہے۔ "برگزیدہ اشخاص" میں وہ اپنے آپ کو جنگ بدر کے شہدا میں شمار کرتا ہے۔

اقبال گوئٹے کے ان پاکیزہ رجحانات سے بہت متاثر ہوا۔ خصوصاً اس لحاظ سے بھی اقبال کو گوئٹے پسند آیا کہ جن انفرادی اور اجتماعی کیفیات کا اقبال تجزیہ کر رہا تھا' تقریباً اسی نقطہ نظر سے گوئٹے نے ایک سو سال پیشتر انہیں علانیہ طور پر بیان کیا تھا۔ "پیام مشرق" کے آغاز میں اسی حقیقت کا اعتراف اقبال نے یوں کیا ہے :

ہر دو دانائے ضمیر کائنات ہر دو پیغام حیات اندر ممات
ہر دو خنجر صبح خند' آئینہ فام او برہنہ من ہنوز اندر نیام(16)

"پیام مشرق" میں بعض نظمیں ملتی ہیں جو گوئٹے کے "دیوان غربی و شرقی" کی نظموں کا آزاد ترجمہ ہیں' مثلاً "حور و شاعر" جس میں علامہ اقبال نے زندگی کی لامتناہی فعالیتوں کو بیان کیا ہے اور ان کی رو سے فلسفہ ارتقا پر بڑی کامیابی سے بحث کی ہے۔ یہ نظم جواب ہے "حور و شاعر" کا' جو "دیوان غربی و شرقی" کے حصہ "خلد نامہ" میں درج ہے۔ اس نظم میں انسانی زندگی کے دوام کو مسلسل مقاصد آفرینی سے تعبیر کیا گیا ہے کہ انسان بلند سے بلند تر نصب العین کے حصول کے لئے کوشاں رہے۔ چنانچہ اس کا اعلیٰ اور انتہائی نصب العین خدا ہونا چاہئے اور بس :

چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروے
تپد آں زماں دل من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلبم نہایت آنکہ نہایتے ندارد
بہ نگاہ ناشکیبے بہ دل امیدوارے

اسی طرح "پیام مشرق" کی نظم "جوئے آب" آزاد ترجمہ ہے "نغمہ محمدؐ" کا' جس میں اقبال کے قول کے مطابق آلمانی شاعر نے زندگی کے اسلامی تخیل کو نہایت خوبی سے بیان کیا

ہے۔ اس پر معنی نظم کا آخری بند درج ذیل ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ دین اسلام نے کس طرح پرانی رسوم و قیود کو توڑ کر مال و دولت اور رنگ و نسب کے امتیازات کو نابود کیا۔ بندہ و آقا کی تمیز کو ختم کر کے انسانیت کو مساوات کے حقیقی اور فطری اصولوں سے روشناس کیا۔ مزید یہ کہ اسلام میں کسی قسم کے جمود فکری کی گنجائش نہیں' بلکہ وہ زندگی کے نت نئے تقاضوں سے دوبدو رہتا ہے اور انہیں پورا کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہے اور اس طرح یہ دھارا اپنی لامتناہی منزل یعنی خدا کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے :

دریائے پرخروش! زبند و شکن گذشت
از تنگنائے وادی و کوہ و دمن گذشت
یکساں چو سیل کردہ نشیب و فراز را
از کاخ شاہ و بارہ و کشت و چمن گذشت
بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بے قرار
در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گذشت
زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ میرود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ میرود(18)

یہاں بے جا نہ ہو گا اگر گوئٹے کی اصل نظم "نغمہ محمدؐ" کو دہرا دیا جائے تا کہ واضح ہو سکے' گوئٹے دین اسلام کے علاوہ تمام مذہبی اور اجتماعی نظاموں اور رسموں کو عالم انسانی کے لئے کس بیباکی کے ساتھ باطل اور منسوخ قرار دے کر صرف اور صرف دین اسلام کو بنی آدم کے لئے سعادت اور فلاح کا واحد ذریعہ بیان کرتا ہے۔ اس نظم میں وہ اسلام کو ایک ابلتے ہوئے چشمے سے تعبیر کرتے ہوئے کہتا ہے :

"اس چشمے کو دیکھو جو ستاروں کی کرنوں کی طرح ہنستا ہوا صاف شفاف چٹانوں سے نکلا ہے۔ بچپن میں اسے قدسیوں نے اس دنیا میں پالا جو بادلوں سے پرے ہے' شباب کی تازگی اور جوش لئے ہوئے وہ خرام ناز کرتا ہوا بادلوں سے نکلتا ہے اور پتھروں کے بیچ میں سے جھاڑیوں میں سے گزر کر مرمریں چٹانوں پر گرتا اور پھر مسرت کے نعرے لگاتا ہوا آسمان کی طرف اچھلتا ہے....

"نیچے وادی میں جہاں اس کا دم پڑتا ہے' پھول کھلنے لگتے ہیں اور اس کے دم

سے سبزہ زار میں جان پڑ جاتی ہے۔ لیکن اسے نہ سایہ دار وادی روک سکتی ہے نہ وہ پھول جو اس کے گھٹنوں سے لپٹ لپٹ کر محبت بھری نگاہوں سے اس کی خوشامد کرتے ہیں۔"

"چھوٹے چشمے اس کے دامن سے لپٹ کر چلتے ہیں۔ وہ چاند کی طرح چمکتا ہوا میدان میں پہنچتا ہے اور میدان بھی اس کی آب و تاب سے چمک اٹھتا ہے۔ میدان کے دریا اور پہاڑوں کے چشمے پکار پکار کر کہتے ہیں۔ بھائی! اے بھائی! ہمیں بھی اپنے رب کے پاس لے چل' ہمیں بھی بے پایاں سمندر کی آغوش میں پہنچا دے..... افسوس ہم اس کے مشتاق اس کی آغوش تک پہنچ نہیں پاتے۔ ریگستان کی پیاسی ریت ہمیں جذب کر لیتی ہے اور اوپر سے سورج چوسے لیتا ہے' کوئی پہاڑی راستہ روک کر ہمیں تالاب بنا دیتی ہے۔ اے بھائی! اپنے میدان والے بھائیوں کو' اپنے پہاڑ والے بھائیوں کو' اپنے ساتھ اپنے رب کے پاس لے چل۔

"آؤ سب کے سب آؤ! اب وہ بڑی شان سے موجیں مارتا ہوا بڑھتا ہے اور ملکوں پر اپنا سکہ بٹھاتا چلا جاتا ہے۔ جہاں اس کا پاؤں پڑتا ہے' شہر آباد ہو جاتے ہیں۔"

"اس کا بہاؤ کسی کے روکے نہیں رکتا۔ وہ زور و شور سے میناروں کی چمکتی چوٹیوں اور مرمریں عمارتوں کو پیچھے چھوڑ کر تخلیق کے جوش میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔(19)

اقبال کہتے ہیں:

مثل آئینہ مشو محو جمال دگراں — از دل و دیدہ فروشوے خیال دگراں
آتش از نالہ مرغان حرم گیرو بسوز — آشیانے کہ نہادی بہ نہال دگراں(20)

اقبال اہل نظر کے حق میں گوئٹے کے احسانات کا اعتراف کرتا ہوا کہتا ہے:

صبا بہ گلشن ویمر سلام ما برساں
کہ چشم نکتہ وراں خاک آں دیار افروخت(21)

کتاب کے آخر میں اقبال نے گوئٹے کی طرح مغرب کی غیر فطری تہذیب کو ہیچ قرار دیتے ہوئے اسے مشرق کی جانب سے پیغام بھیجا ہے کہ وہ عقل کی بجائے عشق کی طرف

رجوع کرے، کیونکہ یہی وہ جذبہ ہے جو انسان کو اس کی صحیح منزل تک پہنچا سکتا ہے اور یہی وہ افلاطون و جالینوس ہے جو انسان کی جملہ علتوں کا مداوا ہے، کیونکہ عقل کے ہاتھوں انسان اور بھی زیادہ مریض ہو گیا ہے:

از من اے باد صبا گوئے بدانائے فرنگ
عقل تابال کشود است گرفتار تر است
عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری
عجب این است کہ بیمار تو بیمار تر است
دانش اندوختہ ای دل زکف انداختہ ای
آہ ازاں نقد گرانمایہ کہ درباختہ ای(22)

"حکمت فرنگ" "جلال و ہیگل" "پیغام برگساں" "میخانہ فرنگ" "جلال و گوئے" "شعرا" اور "الملک للہ" بھی اسی انداز کی نظمیں ہیں، جن کے تجزیہ و تحلیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ ان منظومات اور دیگر اکثر اشعار میں علامہ اقبال نے خاص طور پر یہ کوشش کی ہے کہ وہ مغرب کو مشرق کی ان روحانی اقدار سے روشناس کرائیں، جو مشرق و مغرب سے بالا تر انسانی مقام کا تعین کرتی ہیں اور جن کی رو سے ساری مخلوق خدا کا کنبہ قرار پاتی ہے اور اگر شرق و غرب کی مختلف اقوام ان قدروں سے بے بہرہ محض مادیت کو اپنا مقصد بنا لیتی ہیں، تو یہ ترقی، یہ تمدن اور یہ علم و فن، یہ سائنس اور اس کے یہ حیرت انگیز انکشافات نہ صرف بے سود اور بے معنی ہیں، بلکہ انسان کے لئے موت کا حکم رکھتے ہیں۔

"طیارہ" کے عنوان سے "پیام مشرق" میں ایک نظم علامہ نے لکھی ہے کہ ٹہنی پر بیٹھا ایک پرندہ طنزیہ انداز میں کہہ رہا تھا کہ خدا نے انسان کو بال و پر عطا نہیں کئے اور اسے قوت پرواز سے محروم رکھا ہے۔ تو میں نے کہا کہ پھر کیا ہوا؟ ہم نے طیارہ سے اپنے بال و پر بنا لئے ہیں اور آسمانوں میں راہیں نکال لی ہیں۔ یہ طیارہ شاہین تو کیا فرشتے سے بھی زیادہ قوی اور پرواز میں سریع ہے۔ اس پر اس زیرک پرندے نے مجھے ذرا دوستانہ نظر سے دیکھا اور ننھی سی چونچ سے اپنے بال و پر سنوارتے ہوئے کہا۔

تو کار زمین را نکو ساختی
کہ با آسمان نیز پرداختی

یعنی کیا تو نے زمین کے سب کام ٹھیک کر لئے ہیں کہ آسمانوں پر چڑھنا شروع کر دیا ہے؟

طیارہ تو انسان نے بنالیا مگر اس لئے نہیں کہ اس سے اہل زمین پر گل افشانی کرے بلکہ اس لئے کہ اس کے ذریعے بنی نوع انسان پر آگ برسائے۔ درحقیقت انسان کی بقا اور ترقی کا راز احترام آدمیت میں مضمر ہے اور بس۔ اور اگر انسان فی الواقع چاہتا ہے کہ وہ عزت اور ناموس کے ساتھ زندگی بسر کرے اور اپنی خدا داد صلاحیتوں اور استعدادوں سے استفادہ کرے اور انسانی تہذیب و تمدن کو فروغ دے تو ضروری ہے کہ وہ رنگ و نسب کے ناپاک تصورات اور قومیت و وطنیت کے ذلیل عقائد کو اپنے ذہن سے یکسر ترک کر دے اور انسانی اخوت اور محبت کو اپنا شعار اور نصب العین بنائے:

چارہ انیست کہ از عشق گشادی طلیم
پیش او سجدہ گزاریم و مرادی طلیم

حواشی

1- "پیام مشرق" طبع دہم، لاہور، 1963ء، ص 143۔
2- ایضاً، ص 122
3- "دیوان حافظ" امیر کبیر، تہران، 1337، ص 19
4- "پیام مشرق" دیباچہ، ص ا
5- "دیوان شرقی" ترجمہ شجاع الدین شفا، تہران، 1328 ش، ص 38، 39
6- "حرف اقبال" لاہور، 1941ء، ص 19
7- "دیوان شرقی" ترجمہ شجاع الدین شفا، تہران 1328 ش، ص 25
8- ایضاً، ص 26
9- ایضاً، ص 40
10- ایضاً، ص 27
11- ایضاً
12- "دیوان حافظ" امیر کبیر، تہران، 1337، ص 21

13- "دیوان شرقی" ص 28

14- ایضاً، ص 98، 99

15- ایضاً، ص 69

16- "پیام مشرق" ص 3

17- ایضاً، ص 148، 149

18- ایضاً، ص 152

19- اردو ڈائجسٹ، جون 1968ء، ص 12

20- "پیام مشرق" ص 209

21- ایضاً، ص 184

22- ایضاً، ص 225، 226

(بیاد اقبال۔ مقالات (جو یوم اقبال 20 اپریل، 26 اپریل 1968ء میں پڑھے گئے)۔ لاہور: سنگ میل، بلا تاریخ (1976ء)، ص 75-92)

رحیم بخش شاہین

"پیام مشرق"____ اقبال کا فارسی دیوان

زمانۂ تخلیق

"اسرار خودی" (1915ء) اور پھر "رموز بے خودی" (1918ء) کی تکمیل کے بعد اقبال مثنوی "اسرار خودی" کا تیسرا حصہ لکھنا چاہتے تھے۔ (1) لیکن انہوں نے مناسب سمجھا کہ "اسرار و رموز" پر اکتفا کریں اور یہ ارادہ کیا کہ گوئٹے کے جواب میں "پیام مشرق" لکھیں۔ 10 اکتوبر 1919ء کو سید سلیمان ندوی کے نام مکتوب میں اس کتاب کے آغاز تصنیف کی اطلاع دیتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں:

"فی الحال ایک مغربی شاعر کے دیوان کا جواب لکھ رہا ہوں جس کا قریباً نصف حصہ لکھا جا چکا ہے۔ کچھ نظمیں فارسی میں ہوں گی کچھ اردو میں۔" (2)

اس خط میں فرصت کی کمی اور کمال فن کے لئے مطلوبہ جانکاہی و جگر کاوی کی ہمت کے فقدان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"کلام کا بہت سا حصہ نظر ثانی کا محتاج ہے لیکن اور مشاغل اتنی فرصت نہیں چھوڑتے کہ ادھر توجہ کر سکوں۔ تاہم جو کچھ ممکن ہے کرتا ہوں۔ شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لئے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔

اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں' ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔ اس واسطے کہ آرٹ غایت درجہ کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات موجودہ حالات میں میرے لئے ممکن نہیں۔" (3)

اس موقع پر اقبال کو جرمنی کے دو بڑے شاعروں کا خیال آیا' جو اتفاق سے بیرسٹر بھی تھے یعنی گوئٹے اور اوہلنڈ' لیکن ایک کمال فن کی بدولت شہرت سے ہمکنار رہا اور دوسرا اس سے محروم۔ اقبال لکھتے ہیں:

"گوئٹے تھوڑے دن پریکٹس کے بعد ویمر کی ریاست کا تعلیمی مشیر بن گیا اور اس طرح فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کا اسے پورا موقع مل گیا۔ اوہلنڈ تمام عمر مقدمات پر بحث کرتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت تھوڑی نظمیں لکھ سکا اور وہ کمال پورے طور پر نشو و نما نہ پا سکا' جو اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔" (4)

4 اگست 1920ء کو پروفیسر محمد اکبر منیر کے نام مکتوب میں رقم طراز ہیں:

"اب میں گوئٹے کے دیوان کے جواب میں ایک دیوان فارسی لکھ رہا ہوں' جس کا ایک تہائی حصہ لکھ چکا ہوں۔" (5)

اسی خط میں آگے چل کر "پیام مشرق" کی مقبولیت کے بارے میں پیش گوئی کرتے ہیں:

"مجھے یقین ہے کہ دیوان کا ترجمہ بھی ضرور ہو گا کیونکہ یورپ کی دماغی زندگی کے ہر پہلو پر اس میں نظر ڈالی گئی ہے اور مغرب کے سرد خیالات و افکار میں کسی قدر حرارت ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔" (6)

یکم جنوری 1923ء کو اقبال کو "سر" کا خطاب دیا گیا' تو 7 جنوری کو ان کے اعزاز میں معززین لاہور نے استقبالیہ دیا۔ اقبال نے اپنی تقریر میں بتایا کہ وہ جرمن شاعر گوئٹے کے جواب میں "پیام مشرق" لکھ رہے ہیں۔ (7)

معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے فروری 1923ء میں "پیام مشرق" کو مکمل کر لیا تھا۔ کتاب کی تکمیل پر مسودہ چودھری محمد حسین نے تیار کیا اور کتابت کے لئے دے دیا۔ 8

مارچ 1923ء کو اقبال نے مولانا گرامی کو کتابت اور اشاعت کے بارے میں یوں اطلاع دی "پیام مشرق کاتب لکھ رہا ہے۔ دو ماہ میں شاید چھپ جائے گا۔"(8) کتابت مکمل ہو گئی تو کتاب اشاعت کے لئے دے دی گئی۔ اس موقع پر علامہ اقبال نے مولانا عبدالماجد دریا بادی کے نام مکتوب محررہ 7 اپریل 1923ء میں بتایا:

"پیام مشرق اپریل کے آخر تک شائع ہو جائے گا۔ چند ضروری نظمیں ذہن میں تھیں لیکن افسوس ہے انہیں ختم نہ کر سکا۔ فکر روزی قاتل روح ہے۔ یکسوئی نصیب نہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ والد مکرم کا اصرار تھا کہ جتنا ہو چکا ہے' اسے شائع کر دیا جائے۔"(9)

مولانا سید سلیمان ندوی کے نام 14 مئی 1923ء کے مکتوب میں "پیام مشرق" کے بارے میں لکھا:

"گوئٹے (شاعر جرمنی) کے "مشرقی دیوان" کے جواب میں میں نے ایک مجموعہ فارسی اشعار کا لکھا ہے۔ عنقریب شائع ہو گا۔ اس کے دیباچے میں یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ فارسی لٹریچر نے جرمنی لٹریچر پر کیا اثر کیا ہے۔"(10)

مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے نام 18 مئی 1923ء کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ "پیام مشرق" مئی 1923ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی تھی۔(11)

اس طرح وہ ادبی شاہکار جس کا آغاز 1916ء میں ہوا تھا' چھ سال کی جانکاہ دماغی مشقت کے بعد منظر عام پر آیا' جس نے نہ صرف "مغرب میں پہنچ کر وہاں کی علمی فضا میں ہلچل پیدا کر دی"(12) بلکہ مشرق میں بھی شرف قبولیت حاصل کیا۔ برصغیر پاک و ہند میں فارسی شعر و ادب کی طرف زیادہ رجحان نہ ہونے کے باوجود "پیام مشرق" کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا' جس کے نتیجے میں صرف آٹھ نو ماہ کے بعد مارچ 1924ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا۔ دوسرے ایڈیشن میں کئی ایسی نظمیں شامل کی گئیں' جو پہلے ایڈیشن میں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں اور بعض نظموں کو کتاب سے نکال دیا گیا۔(13)

گوئٹے

کتاب کے متن پر گفتگو سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ گوئٹے کا کچھ تعارف کرا دیا

جائے۔ گوئٹے (Johann Wolfgang von Goethe) 28 اگست 1749ء کو جرمنی کے شہر فرینکفرٹ (Frankfurt) کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک وکیل تھا اور شاہی مشیر کے عہدے پر فائز رہا تھا۔ ماں شہر کے میئر کی بیٹی تھی۔ اس نے 16 سال کی عمر تک گھر پر انجیل، کلاسیکی ادب، اطالوی، عبرانی اور انگریزی زبانوں نیز موسیقی و نقاشی ایسے فنون کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد لیپزگ یونیورسٹی (Leipzig University) میں قانون کی تعلیم حاصل کی، لیکن اس دوران میں اس کی توجہ اکثر و بیشتر فلسفہ و ادب کی طرف مبذول رہی۔ اس نے کیمیا اور طب کی تعلیم بھی حاصل کی اور اس ضمن میں بعض اہم انکشافات اس سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ 1774ء میں اس کی کتاب "ورتھر کی داستان غم" (Werther's Leiden) شائع ہوئی۔ اس زمانے میں اس نے اپنی مشہور ڈرامائی نظم "فاؤسٹ" (Faust) لکھنی شروع کی، جو اس کی وفات سے ایک سال پیشتر 1831ء میں مکمل ہوئی۔ گوئٹے کی یہ تصنیف جرمن ادب میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس نے جرمنی کو بہت متاثر کیا۔ جرمنی کے لوگ اس کتاب کو الہامی تصور کرتے ہیں۔ اس کی دوسری اہم تصنیف "ویست اسٹلشر دیوان" (West-oestlicher Divan) یا "دیوان غربی و شرقی" ہے، جو 1819ء میں منظر عام پر آئی اور جس کو علامہ اقبال نے کہیں "مشرقی دیوان" اور کہیں "مغربی دیوان" لکھا ہے۔ گوئٹے 22 مارچ 1832ء کو فوت ہوا اور ویمر (Weimar) میں دفن ہوا۔ (14)

گوئٹے جرمنی کے تین بڑے شاعروں میں شمار ہوتا ہے، جن میں اس کے پیشرو ہرڈر (Herder) اور شلر (Schiller) بھی شامل ہیں۔

گوئٹے و اقبال

علامہ اقبال گوئٹے کے بہت معترف تھے۔ انہوں نے گوئٹے کو مرزا غالب کا ہمنوا قرار دیتے ہوئے کہا ہے:

گلشن ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے
آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے(15)

"پیام مشرق" کے دیباچے میں انہوں نے گوئٹے کو "جرمن حکیم حیات" کے لقب سے

یاد کیا ہے۔(16)

"پیام مشرق" میں ایک مقام پر اس سے اپنی محبت و ارادت کا اظہار یوں کرتے ہیں :

صبا بہ گلشن ویمر سلام ما برساں
کہ چشم نکتہ وراں خاک آں دیار افروخت(17)

چوہدری محمد حسین نے "زبور عجم" پر اپنے مقالے میں اقبال کا یہ قول نقل کیا ہے :

I wish Goethe had read this Book.

یعنی کاش گوئٹے اس کتاب (زبور عجم) کو پڑھتا۔ (18) یہ گوئٹے کی قدردانی کے اظہار کا یقیناً ایک اچھوتا اسلوب ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال گوئٹے کو کس قدر احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ گوئٹے سے اقبال کی ارادت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ "پیام مشرق" کی نظم "جلال و گوئٹے" میں اقبال نے اسے "نکتہ دان المنی" (نکتہ دان آلمانی) کے لقب سے یاد کیا ہے اور اسے "نیست پیغمبر ولے دارد کتاب" کہہ کر پکارا ہے۔ یہاں اقبال نے اپنے مرشد معنوی کی زبان سے گوئٹے کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ گوئٹے رومی کو "دانائے اسرار قدیم" کہتا ہے' اسے اپنا ڈرامہ "فاؤسٹ" پڑھ کر سناتا ہے اور رومی اس کی حقیقت شناسی کی تحسین کرتا ہے۔(19)

اقبال گوئٹے کے کیوں معترف ہیں اور اسے اپنی عقیدت و ارادت کا مرجع کیوں خیال کرتے ہیں؟ اس کا ایک پس منظر ہے۔ چوہدری محمد حسین اس ضمن میں رقم طراز ہیں :

"نپولین کے حملوں اور اس کی حکومت کے جبر و استبداد سے پامال ہونے پر جب جرمنی کی حالت اس قدر ناگفتہ بہ ہوئی کہ گوئٹے کے پرسوز و حکمت آموز ترانوں پر کان دھرنا لوگوں کو مشکل ہو گیا اور خود گوئٹے کے لئے ایسی حکمت کا سیدھی اور صاف زبان میں سکھانا آسان نہ رہا' تو قدرت نے ایک نرالے طریق سے اپنے فرستادہ کی مدد کی اور جو کام اس سے اس حالت میں بھی لیتے رہنا مقصود تھا' وہ مسلسل لیتی رہی۔ اپنے اصلی اور قدرتی مغربی انداز میں لکھنے سے گوئٹے اکتانے ہی کو تھا کہ 1812ء میں جرمنی کے دوسرے ادیب و شاعر نے "دیوان حافظ" کا ترجمہ جرمن زبان میں شائع کر دیا۔ گوئٹے نے جونہی اسے دیکھا اور پڑھا' حافظ کا ترنم باوجود اس امر کے کہ اب اس کے ساتھ فارسی زبان کی وہ شیرینی اور سحر طرازی

نہ رہی تھی' اس کی طبیعت پر فوراً اثر کر گیا اور اس نے اسی وقت یہ ارادہ کر لیا کہ وہ خیالات جن کا اظہار اب پرانے انداز میں موثر نہیں رہا' حافظ کے تتبع میں جادو کا اثر دکھائے گا۔ جدت طرز ادا بجائے خود لوگوں کو جاں فزا نغموں کی طرف کھینچے گی اور جو مقصد فوت ہوتا نظر آتا تھا' زندہ تر ہو کر قوم کے مردہ افراد کو زندہ کرتا رہے گا۔ گوئٹے نے نہ صرف حافظ سے غزل کا انداز ہی لیا' بلکہ سینکڑوں لطیف اور نازک معنی و حقائق استفادہ کئے۔ مگر پھر بھی خذما صفا کی حد سے آگے نہ بڑھا۔ مضامین اور ان کی روح وہی قائم رکھی' جو اس کی اپنی تھی۔ ترنم و سوز حافظ سے لیا اور پھر ایک بار قوم کو نئے سرور اور نئے انداز سے تڑپایا کہ حیات حقہ کے حصول کے لئے ان میں پہلے سے دوگنی سعی و قوت عمل کی آگ بھڑک اٹھی۔ پانچ چھ برس میں یہ نظموں یا غزلوں کا مجموعہ تیار ہوا۔ "ویسٹ اسٹلشر دیوان" یا "دیوان مغربی و مشرقی" کے نام سے اسے موسوم کیا اور 1819ء میں مکمل و مرتب کر کے شائع کر دیا۔ کتاب کے اس نام میں جو مفہوم مضمر تھا' وہ بھی یہی تھا کہ مغرب اس وقت قسمت کے چکروں میں ہے' فساد و فتنہ کا گھر ہے' بداخلاقی و بدنظمی میں مبتلا ہے' ظلم و استبداد کے تیروں کا نشانہ ہے اور اپنے ہمدرد مشرق کی طرف اپنے غم و اندوہ کی داستان اسی کے انداز بیان میں سنانے کو متوجہ ہوتا ہے۔" (20)

حقیقت یہ ہے کہ گوئٹے کے اس مجموعہ کلام سے اس کی عالم مشرق سے دلچسپی کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں یورپ کے باشندوں کے لئے اسلامی تعلیمات تک رسائی حاصل کرنا بوجوہ آسان نہ تھا' لیکن گوئٹے کی ہمت قابل داد ہے کہ اس نے اسلام کی انقلاب انگیز روح اور مشرق کے سرچشمہ ہائے فکر تک پہنچنے کی پوری کوشش کی اور اس میں ایک حد تک کامیابی بھی حاصل کی۔

اقبال اور گوئٹے میں حقیقت کی تلاش و جستجو کا مادہ غایت درجے کا تھا۔ ان کی فطرت کی اسی خصوصیت نے انہیں مغرب و مشرق دونوں سے آشنا کیا۔ گوئٹے مغرب میں تھا اور اس نے مشرق کی طرف ذہنی اور روحانی سفر کیا۔ اقبال مشرق میں تھا اور اس نے مغرب کے عالم افکار کی سیاحت کی اور اس سے بصیرت اندوز ہوا۔ چوہدری محمد حسین نے دونوں شاعروں کو دنیا کے کامل ترین شاعروں کی صف میں جگہ دیتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے۔ "وحی' الہام' شعر و حکمت کی جو تعریفیں لکھی گئی ہیں' ان کے جانے بغیر گوئٹے اور اقبال کا سمجھنا یا ان کے

شعر و سخن کی قدر و منزلت کا اندازہ لگانا محال محض ہے' دیکھنا یہ ہے کہ کس قدر ملہم یا حکیم یا شاعر دنیا میں ایسے ہوئے جو اس معیار پر صحیح اتر سکتے ہیں اور اصل الہام یا حکمت یا شعریت ان کے حصے میں آئی۔ الگ الگ ان خواص کے مالک شاید بہت نکل آئیں۔ ہماری ناقص رائے میں ایسے بہت کم ہوں گے' جو ان ہر سہ کمالات کے مالک ہوں۔ شیکسپئر' دانتے اور مولانا روم کے سوا اگر کوئی اور دو ہستیاں اس شمار میں آ سکتی ہیں' تو اٹھارویں صدی میں گوئٹے تھا اور بیسویں میں اقبال۔"(21)

ان دونوں شاعروں میں بعض اور پہلوؤں سے بھی مشابہت پائی جاتی ہے۔ دونوں نے قانون کو پیشہ بنانے کی کوشش کی ہے' لیکن اس کے برعکس دونوں کا ہمہ تن انہماک شعر و ادب میں تھا۔ دونوں جدت پسندی کے ساتھ قدیم شعرا کی کاوشوں سے استفادہ ضروری سمجھتے تھے۔ دونوں شاعر کلام الٰہی سے بصیرت اندوز ہوئے۔ گوئٹے انجیل سے اور اقبال قرآن پاک سے۔ دونوں کو اپنی زندگی میں قدردان مل گئے' گوئٹے کو ڈیوک آف ویمر جبکہ اقبال کو نواب بھوپال و غیرہم کی توجہ حاصل ہوئی۔

1740ء تا 1760ء کا دور یورپ کی مختلف حکومتوں کی باہمی چپقلشوں سے بھرا پڑا تھا۔ ایک طرف آسٹریا کی تخت نشینی کی جنگ کا سلسلہ اور دوسری طرف صنعتی انقلاب کا شور و غوغا ایسے امور تھے' جنہوں نے براعظم کی فضا میں مسلسل اضطراب پیدا کئے رکھا۔ ان حالات سے جرمنی بھی متاثر ہوا۔ ہندوستان میں 1857ء کی جنگ آزادی سے تحریک آزادی کا عملاً" آغاز ہو چکا تھا' جس نے بعد میں سیاسی جدوجہد کی صورت اختیار کر لی۔ اسی طرح 1914ء میں پہلی جنگ عظیم نے برصغیر کی فضا کو بڑی حد تک مکدر کر رکھا تھا۔ بنا بریں گوئٹے اور اقبال کے سیاسی ماحول میں بھی ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے۔ دونوں شاعر ادب برائے ادب کے مخالف اور ادب برائے زندگی کے حامی تھے اور ادب کو انسانیت کی خدمت اور زندگی کی تعمیر نو کا ذریعہ سمجھتے رہے' تاہم دونوں میں کچھ اختلاف کے پہلو بھی ہیں۔ خود اقبال نے "پیام مشرق" میں اپنا اور گوئٹے کا موازنہ کرتے ہوئے موافق و مخالف پہلوؤں کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

پیر مغرب شاعر المانوی
آں قتیل شیوہ ہائے پہلوی

بست نقش شاہدان شوخ و شنگ
داد مشرق را پیامے از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغام شرق
ماہ تابے ریختم بر شام شرق
تا شناسائے خودم خودبین نیم
با تو گویم او کہ بود و من کیم
او ز افرنگی جوانان مثل برق
شعلہ من از دم پیران شرق
او چمن زادے چمن پروردۂ
من دمیدم از زمین مردۂ
او چو بلبل در چمن "فردوس گوش"
من بصحرا چوں جرس گرم خروش
ہر دو دانائے ضمیر کائنات
ہر دو پیغام حیات اندر ممات
ہر دو خنجر صبح خند' آئینہ فام
او برہنہ من ہنوز اندر نیام
ہر دو گوہر ارجمند و تابدار
زادۂ دریائے ناپیدا کنار
او زشوخی در تہ قلزم تپید
تا گریبان صدف را بر درید
من بہ آغوش صدف تا بم ہنوز
در ضمیر بحر نایابم ہنوز(22)

اقبال اور گوئٹے میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اقبال احیائے اسلام کے حامی ہونے کے ساتھ ساتھ عالمی بھائی چارے کے داعی بھی ہیں' جبکہ گوئٹے مشرق دوستی کے باوجود اپنے روایتی تعصب اور نسلی برتری سے نجات حاصل نہیں کر سکا۔ وہ لکھتا ہے :

"مسلمانوں کی طرف سے کافروں کی توہین اور ہماری قوم کے غلاموں کے ساتھ ان کا ناروا سلوک اس قابل ہے کہ ہم ان سے نفرت کریں اور انہیں تختہ دار پر لٹکا دیں۔"(23)

ایک اور جگہ کہتا ہے :

"کاش ادب عالیہ کی بنیادیں یونانی اور رومن لٹریچر کی سطح ہی پر کھڑی کر دی جاتیں۔ چینی' ہندی اور قدیم مصری ادبیات بجز استعجاب انگیز ہونے کے اور کچھ نہیں۔ دنیا کو ان سے روشناس کرانا قابل قدر ہے' لیکن ان سے ہمارے اخلاقی نظام اور فنون لطیفہ کے کلچر کو کسی قسم کی استعانت نہیں مل سکتی۔"(24)

گوئٹے کو مغربی شعرا میں یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس نے تقریباً ایک صدی پیشتر قدیم ادبیات مشرق کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کا اثر بھی قبول کیا۔ اس کے دیوان کے متعلق جرمن اسرائیلی شاعر Heine (1856ء) رقمطراز ہے :

"یہ ایک گلدستہ عقیدت ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے.... اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے سے حرارت کا متلاشی ہے۔"(25)

اقبال نے "پیام مشرق" کے دیباچے میں تفصیل سے اس دیوان کی تخلیق کے پس منظر اور ان حالات پر روشنی ڈالی ہے جو آلمانوی ادبیات میں تحریک مشرقی کے آغاز کا باعث بنے اور جس کے زیر اثر گوئٹے نے مشرقی ادبیات سے استفادے کی طرح ڈالی۔ مشرقی شعرا میں سے گوئٹے' خواجہ حافظ' شیخ سعدی اور فردوسی کا احسان مند تھا۔ فارسی ادب میں گہرے انہماک کے سبب اپنی تہذیبی قدروں کو نظر انداز کر کے وہ ایرانی تہذیب کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے فارسیت کے شوق میں فارسی اصطلاحات مثلاً مغنی نامہ' ساقی نامہ' عشق نامہ' تیمور نامہ' حکمت نامہ وغیرہ استعمال کی ہیں۔ اس کے باوجود وہ کسی فارسی شاعر کا مقلد نہیں۔ اس نے مشرقی شعرا و حکما کا مطالعہ ضرور کیا' لیکن وہ اپنی مغربیت سے کسی لحہ دستکش نہیں ہوا۔ اس نے صرف انہی مشرقی حقائق کی طرف توجہ کی' جنہیں اس کی مغربی فطرت جذب کر سکتی تھی۔ اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تمدن اور فلسفہ کے لحاظ سے مغرب ہر طرح مشرق پر فوقیت رکھتا ہے لہٰذا مغرب ہی دنیا کی امامت اور قیادت کے منصب پر فائز

ہونے کے لائق ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال ایسے سلیم الطبع اور روشن فکر مسلمان دانشور کے لئے مشرق و مغرب کی تقسیم اور کسی ایک خطہ ارض پر بے جا فخر ایک بے معنی سی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "پیام مشرق" کے سرورق پر "للہ المشرق والمغرب"(26) (مشرق و مغرب اللہ ہی کے لئے ہے) تحریر ہے' جو ان کے نقطہ نظر کی وسعت کی ترجمانی کر رہا ہے۔ تاہم تاریخی اعتبار سے مشرق ہی کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس کی وسعتوں میں خدا کے برگزیدہ بندوں نے اخلاقی تعلیم اور باطنی تربیت کی تعمیری کوششیں کیں' جن کے اثرات اقصائے عالم میں پھیلے اور پھر مشرقی دنیا نے علم و ادب کے میدان میں بھی ایک طویل مدت تک بے مثال خدمات انجام دیں۔ زوال کے عارضی سائے مشرق کے روشن کردار کو انسانی نگاہوں سے زیادہ دیر تک اوجھل نہیں رکھ سکتے۔

اقبال اور مغرب

اقبال نے "پیام مشرق" لکھ کر مغرب کے غرور و تکبر پر ضرب لگائی اور مشرق کی زندگی اور ہوشمندی کا ثبوت مہیا کیا۔ علامہ کے اس کارنامے کی صحیح قدر و قیمت متعین کرنے کے لئے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ مشرقی دنیا کے دور زوال کے آغاز سے لے کر زمانہ بیداری تک صرف اقبال کی ذات ہی ہے' جس نے مغرب کے مزعومہ علمی تفوق کی قلعی کھولی' تہذیبی و سیاسی استعمار کو للکارا اور اہل مشرق کے احساس کمتری کے خاتمے کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس سے آگے بڑھ کر انہوں نے مغربی تہذیب کی "ست بنیادی" کو واضح کیا' جس کے پیش نظر صرف مادی غلبہ کا حصول ہے اور اس کے لئے اس نے جو غیر اخلاقی ہتھکنڈے اختیار کئے ہیں' وہ خود اس کے اپنے وجود بلکہ پوری دنیا کے امن کے لئے تباہی کا پیش خیمہ ہیں۔ اقبال نے یہ بھی واضح کیا کہ مغرب کے برعکس مشرق نے انسانیت کو ہمیشہ باطنی تربیت اور تہذیب نفس کی راہ دکھائی' جس کے بغیر اس کا ارتقاء کی منازل طے کرنا مضر اور مہلک ثابت ہو گا۔ علامہ اقبال اس نتیجے پر محض کتابی معلومات کے ذریعے نہیں پہنچے بلکہ انہوں نے تین سالہ قیام یورپ (1905ء - 1908ء) میں اپنے گہرے مشاہدے اور افکار مغرب کے وسیع مطالعے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا اور اس دور کے اردو کلام میں واضح اشارے کئے۔ بہرحال پہلی جنگ عظیم (1914ء تا 1918ء) عالم انسانیت کے حق میں قیامت صغریٰ ثابت

ہوئی۔ اس نے پرانی دنیا کے نظام کو بڑی حد تک تباہ کر دیا اور بے لگام خودی کے نقصانات بھی آشکارا کر دیئے۔

لہٰذا قدرتی طور پر اقبال نے پرانی تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت کی گہرائیوں میں ایک نئے آدم کی تخلیق اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا کی تعمیر کے آغاز کا شعور حاصل کیا اور یہ ضروری خیال کیا کہ اقوام مشرق کو نئے دور کے اس اہم تقاضے سے روشناس کرائیں۔ "پیام مشرق" کے دیباچے میں اقبال لکھتے ہیں:

> "مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے، مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کرنا چاہئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی، جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی، جب تک اس کا وہ وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن **ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم** کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنے فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔"(27)

یہاں اگر یہ ذکر کر دیا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ "پیام مشرق" کا دیباچہ اقبال کی نثر کا بہترین نمونہ ہے۔ اقبال نے اپنی منظوم کتابوں میں سے صرف تین کتابوں کے دیباچے تحریر کئے ہیں، جن میں سے دو کتابوں ("اسرار خودی" اور "رموز بے خودی") کے دیباچے حذف کر دیئے گئے ہیں لیکن "پیام مشرق" کا دیباچہ برقرار رہا۔ اس سے دیباچے میں پیش کئے گئے خیالات کی دوامی قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے۔ خیال رہے کہ یہ دیباچہ لکھنے سے پہلے اقبال نے ضروری باتیں اشارات کی صورت میں انگریزی میں لکھی تھیں۔(28)

پیشکش

دیباچہ کے بعد جس حصہ کتاب پر ہماری نظر پڑتی ہے، وہ پیش کش ہے۔ اقبال نے "پیام مشرق" کو امان اللہ خان فرمانروائے افغانستان کے حضور پیش کیا ہے، جنہوں نے 1919ء میں امیر حبیب اللہ خان کے قتل کے بعد عنان اقتدار سنبھالی تھی۔ ان کی تخت نشینی

کے فوراً بعد برطانوی ہند کی شمال مغربی سرحد کے دونوں اطراف فوج کی نقل و حرکت شروع ہو گئی، جس کا نتیجہ تیسری افغان جنگ کی صورت میں برآمد ہوا۔ انگریزوں نے اگرچہ درۂ خیبر اور چمن میں کامیابیاں حاصل کیں، لیکن افغان سپہ سالار جنرل نادر خان نے برطانوی افواج کو ٹل کے مقام پر شکست دی۔ آخرکار انگریزوں نے 1919ء میں راولپنڈی میں افغان حکومت کے ساتھ صلح کا معاہدہ کیا، جس کی رو سے انگریزوں نے افغانستان کی آزاد حیثیت کو تسلیم کر لیا، کیونکہ اس معاہدہ میں امیر افغانستان کی حیثیت برابر کے فریق کی تھی، اس لئے غلام ہندوستان کے مسلمان باشندوں کو افغان بھائیوں کی جدوجہد آزادی سے خاص تعلق خاطر پیدا ہوا اور انہوں نے قدرتی طور پر امیر افغانستان کی ذات سے بہت سی توقعات وابستہ کر لیں۔ علامہ اقبال بھی حالات زمانہ کی ان لہروں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، لہٰذا انہوں نے امیر امان اللہ خان کے نام کتاب کا انتساب کیا اور تمہید کتاب میں "بحضور اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان فرمان روائے دولت مستقلہ خلد اللہ ملکہ و اجلالہ" کے عنوان سے دلی جذبات کو منظوم کیا۔ بظاہر اقبال نے یہ پیشکش ایک حکمران کے حضور کی ہے، لیکن دیباچے میں اس کی غرض و غایت کے متعلق لکھتے ہیں:

"اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالا تر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو، قابل احترام ہے۔ اسی بنا پر میں نے ان چند اوراق کو اعلیٰ حضرت فرمانروائے افغانستان کے نام نامی سے منسوب کیا ہے کہ وہ اپنی فطری ذہانت سے اس نکتے سے بخوبی آگاہ معلوم ہوتے ہیں اور افغانوں کی تربیت انہیں خاص طور پر مدنظر ہے۔ اس عظیم الشان کام میں خدا تعالیٰ ان کا حامی و ناصر ہو۔"(29)

پیشکش کے تحت اقبال نے اپنا اور گوئٹے کا موازنہ کیا ہے۔ انہوں نے گوئٹے کی عظمت کا اعتراف اور اپنے جوہر ذاتی مگر اہل وطن کی قدر ناشناسی کا گلہ کیا ہے۔ ان اشعار میں اقبال نے مشرق کی مظلومیت کی داستان بیان کی ہے۔ ترکی، ایران اور مصر کے مسلمانوں کی مجبوری اور بے بسی کی طرف اشارہ کیا ہے اور ہندی مسلمانوں کی غفلت شعاری کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ زوال سے نجات پانے کے لئے علم اشیا اور سیاسی شان و شکوہ کی بازیافت کا مشورہ

دیتے ہیں۔ فرمانروائے افغانستان کو عظیم اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قبائے خسروی میں فقر و درویشی اپنانے کی تلقین کرتے ہیں اور ملت میں جذبہ عشق رسولؐ کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

خیال رہے کہ یہ محض رسمی قسم کی پیشکش نہیں ہے۔ یہ ایک طرح سے اس آرزو کا اظہار ہے کہ کاش وہ ایک آزاد اور خود مختار ملک و قوم میں پیدا ہوتے اور ان کی قوم خود شناسی سے بہرہ ور ہوتی۔ اس پیشکش سے اقبال نے بالواسطہ طور پر مغرب کی استعماری روش کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے۔ ان اشعار کی اہمیت اس پس منظر میں بڑھ جاتی ہے کہ جب 1923ء میں اقبال کو سر کا خطاب ملا تو بعض لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اب اقبال بھی سرکاری ہو گئے ہیں، لیکن ان اشعار میں ایک خودمختار مسلم مملکت کے حکمران کو جن محبت آمیز الفاظ میں خطاب کیا ہے، ان سے یہ امر بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال "سر" ہونے کے باوجود اسلامی اتحاد، ملی آزادی کے حصول اور غیر ملکی آقاؤں کے تسلط کے استیصال کے مقصد سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔

کتاب کے حصے

پیام مشرق کے چار حصے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(1) لالہ طور: یہ حصہ 163 رباعیات پر مشتمل ہے جو اقبال نے بابا طاہر عریاں کی پیروی میں کہی ہیں۔ (ملاحظہ کیجئے گفتار اقبال ص 343)- بابا طاہر عریاں (گیارہویں صدی عیسوی) فارسی کا بہت بڑا شاعر تھا۔ اس کی رباعیات رباعی کے مخصوص وزن (بحر ہزج مثمن مربع الاجزا) پر نہیں ہیں، اس لئے بعض نقادوں نے اقبال کی رباعیات کو بھی دوبیتیاں اور قطعات شمار کیا ہے۔ (30) یہ سوال اقبال کی زندگی میں بھی اٹھا تھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی کے نام اپنے مکتوب محررہ 5 جون 1933ء میں لکھا تھا:

> "....ان کو رباعیات کہنا غلط نہیں۔ بابا طاہر عریاں کی رباعیات جو اس بحر میں ہیں، رباعیات ہی کہلاتی ہیں۔ ان میں قطعات بھی داخل ہیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ یہ رباعیات رباعی کے مقررہ اوزان میں نہیں ہیں مگر اس کا (اس میں) کچھ مضائقہ نہیں۔" (31)

ان رباعیات میں اقبال نے عشق، عظمت انسانی، قوت تخلیق، خطرپسندی، اخوت اسلامی وغیرہ موضوعات پر پر لطف اور دلکش اسلوب میں طبع آزمائی کی ہے۔ ایک رباعی میں خطر جوئی و خطرپسندی کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں:

سکندر باخضر خوش نکتہ گفت
شریک سوز و ساز بحر و برشو
تو ایں جنگ از کنار عرصہ بینی
بہ میر اندر نبرد و زندہ ترشو(32)

(2) **افکار**: یہ کتاب کا ضخیم ترین حصہ ہے اور 51 نظموں پر مشتمل ہے۔ بعض نظموں مثلاً فصل بہار، کرمک شب تاب اور حدی (نغمہ ساربان حجاز) وغیرہ میں اقبال نے ہیئت کے نئے تجربے کئے ہیں۔ اس حصے میں اقبال نے انداز بدل بدل کر اپنے بلند اور عمیق فلسفیانہ خیالات کو پیش کیا ہے۔ عظمت آدم، تسخیر فطرت، عقل و خرد، زندگی و عمل، تخلیق و ارتقا وغیرہ اس حصہ کے اہم موضوعات ہیں۔ بعض نظموں میں اقبال نے فطرت کے اپنے افکار کی وضاحت کی ہے۔ بوئے گل، فصل بہار، نسیم صبح، کرمک شب تاب اسی قسم کی نظمیں ہیں۔ ان میں اقبال کی عظمت فن کا مکمل اظہار ہوتا ہے۔ "حکمت فرنگ" میں اقبال نے مغربی تہذیب کی ہلاکت آفرینی پر نظر ڈالی ہے۔ اسی حصے میں کشمیر کی غلامی و محکومی پر اظہار افسوس کیا ہے۔ "افکار" اپنی تین نظموں کی بدولت یقیناً بہت زیادہ اہم قرار پایا ہے، جو یہ ہیں :(1) تسخیر فطرت (2) جوئے آب (3) حور و شاعر

"تسخیر فطرت" کا موضوع کائنات میں انسان کا مقام اور خیر و شر کی آویزش ہے۔ "تسخیر فطرت" کے علاوہ اقبال نے "بال جبریل" کی دو نظموں "فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں" اور "روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" میں بھی اسی سے ملتے جلتے موضوع کو چھیڑا ہے۔ جہاں تک "تسخیر فطرت" کا تعلق ہے، یہ اقبال کی عظیم نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ نظم کا بنیادی خیال قدیم روایات سے ماخوذ ہے، لیکن اس کی تفصیل اور انداز پیشکش اقبال کے تخیل کا کرشمہ ہے۔ اس طویل نظم کے پانچ حصے ہیں۔ پہلے حصے کا عنوان ہے "میلاد آدم" جس میں اقبال نے انسان کی فطری صلاحیتوں کی طرف بلیغ اشارے کئے ہیں۔ نظم کا دوسرا حصہ "انکار ابلیس" کا عنوان لئے ہوئے ہے۔ اس میں ابلیس نے اپنے

آپ کو خاکی انسان اور نوری فرشتوں پر ترجیح دیتے ہوئے یہ ظاہر کیا ہے کہ حیات و کائنات کی ساری رونقیں اور ہنگامے اسی کے دم سے ہیں۔ یہاں اقبال نے ابلیس کی صفات کے پیش نظر جو لہجہ اختیار کیا ہے' وہ ابلیس کے حال کے عین مطابق ہے۔ تیسرے حصے کا عنوان "اغوائے آدم" ہے۔ اس میں ابلیس آدم کو بتاتا ہے کہ جنت سے دنیا کی زندگی بہتر ہے۔ حیات دوام کا راز وصل کی بجائے فراق اور سکون کی بجائے اضطراب میں مضمر ہے۔ آدم پر اس کا اثر ہوتا ہے اور وہ بہشت سے باہر آ جاتا ہے۔ آدم دنیائے رنگ و بو کو دیکھ کر مسرت کا اظہار کرتا ہے' اس کائنات کا تنوع اسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور اسے اپنے سامنے جدوجہد کا وسیع میدان نظر آتا ہے۔ آدم کے ان احساسات و جذبات کو اقبال نے نظم کے چوتھے حصے "آدم از بہشت بیروں آمدہ می گوید" میں بیان کیا ہے۔ پانچویں حصے کا عنوان ہے "صبح قیامت"۔ اس میں آدم دنیا کی زندگی میں اپنے ماحول کی تفصیل بیان کرتا ہے اور ابلیس پر اپنی برتری ثابت کر دیتا ہے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے بقول "یہ نظم پانچ ابواب پر مشتمل ایک ڈراما ہے' جس میں تخلیق آدم' انکار ابلیس' ترغیب گناہ اور جلوس آدم کو انتہائی تحیر انگیز عمل کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔"(33)

"جوئے آب" گوئٹے کی مشہور نظم موسوم بہ "نغمہ محمدؐ" (Mahomets Gesang) کا نہایت آزاد ترجمہ ہے۔ اس نظم کے بارے میں "پیام مشرق" کے حاشیہ میں لکھا گیا ہے کہ "اس نظم میں جو دیوان مغربی سے بہت پہلے لکھی گئی' اس آلمانی شاعر نے زندگی کے اسلامی تخیل کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ اصل میں یہ ایک مجوزہ اسلامی ڈرامے کا جزو تھی' جس کی تکمیل اس سے نہ ہو سکی۔ اس ترجمے سے صرف گوئٹے کا نقطہ نگاہ دکھانا مقصود ہے۔"(34)

اس نظم کے بارے میں خود گوئٹے لکھتا ہے:

"اس ڈرامے کے خاکے نے میرے دماغ کو اپنی طرف بہت دیر لگائے رکھا کیونکہ میں حسب عادت لکھنے سے پہلے اس خیال کو نشو و نما پانے کا موقع دے رہا تھا کہ فطانت ایک اعلیٰ کردار اور قوی دماغ کے ساتھ بنی نوع آدم پر جس حد تک اثر انداز ہو سکتی ہے اور وہ جن جن فوائد و نقصانات کی متحمل ہو سکتی ہے' کو منتہائی طریق پر ظاہر کروں۔"(35)

دیرینہ ارادے اور طویل غور و فکر کے باوجود گوئٹے اس ڈرامے کو پایہ تکمیل تک نہ

پہنچا سکا' لیکن یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ موجودہ صورت میں بھی یہ نظم نعت رسولؐ میں ممتاز اور منفرد مقام رکھتی ہے۔ عالمی ادب اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ "اس نظم میں جوئے آب ہی کی روانی' تندی اور نغمہ آفرین کیفیت ہے اور علامہ اقبال نے گوئٹے کی فکر کو صوتیاتی تاثر' آہنگ اور جوش و خروش کے جس سحر آگیں تانے بانے میں پیش کیا ہے اس نے اس نظم کو لازوال حسن و شکوہ بخش دیا ہے۔" (36)

"جوئے آب" کو پروفیسر محمد مجیب مرحوم' شیخ الجامعہ' جامعہ ملیہ دہلی نے "محمد کا نغمہ لاہوتی" کے عنوان سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ نظم کا اردو روپ اور اقبال کی فارسی نظم "جوئے آب" درج ذیل ہیں۔ اقبال نے گوئٹے کی نظم کا تمام و کمال ترجمہ نہیں کیا' بلکہ اس کے تاثر کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے:

گوئٹے کی نظم "محمدؐ کا نغمۂ لاہوتی"

اس چشمے کو دیکھو
جو ستاروں کی کرنوں کی طرح ہنستا ہوا
صاف شفاف چٹانوں میں سے نکلا
بچپن میں اسے
قدسیوں نے اس دنیا میں پالا
جو بادلوں کے پرے ہے
شباب کی تازگی اور جوش لئے ہوئے
وہ اک خرام ناز کے ساتھ
بادلوں سے نکلتا ہے اور چٹانوں کے بیچ میں
جھاڑیوں سے گذر کر مرمریں چٹانوں پر گرتا ہے
اور پھر مسرت کے نعرے لگاتا
آسمان کی طرف اچھلتا ہے
وہ چوٹیوں کی درمیان دروں میں سے
ایک رنگین پتھر سے دوسرے رنگین پتھر کی طرف لپکتا ہے

اس کے قدم کو شروع ہی سے
رہنمائی کی صفت عطا ہوئی ہے
اور وہ اپنے بھائی بندوں کو اپنے ساتھ
بہا کر لے جاتا ہے
نیچے وادی میں جہاں اس کا قدم پڑتا ہے
پھول کھلنے لگتے ہیں
اور اس کے دم سے سبزہ زاروں میں جان پڑتی ہے
لیکن اسے نہ سایہ دار وادی روک سکتی ہے
نہ وہ پھول
جو اس کے گھٹنوں سے لپٹ کر محبت بھری آنکھوں سے خوشامد کرتے ہیں
اس کا بہاؤ اسے میدان کی طرف چکراتا ہوا لے جاتا ہے
چھوٹے چشمے اس کے دامن سے لپٹ کر چلتے ہیں
اب وہ چاند کی طرح چمکتا ہوا
میدان میں پہنچتا ہے
اور میدان بھی اس کی آب و تاب سے چمک اٹھتا ہے
اب میدان کے دریا' پہاڑ اور چشمے
پکار پکار کر کہتے ہیں
بھائی! اے بھائی! ہمیں بھی اپنے رب کے پاس لے چل
ہمیں بھی اس کی بے پایاں گود میں پہنچا دے
وہ ہمارے انتظار میں گود پھیلائے ہے
اور افسوس! ہم اس کے مشتاق اس کی گود میں نہیں پہنچ پاتے
ہمیں ریگستانوں کی سوکھی ریت سوکے لیتی ہے
اوپر سے سورج ہمارے خون چوسے لیتا ہے
کوئی پہاڑی ہمارا راستہ روک کر ہمیں تالاب بنائے دیتی ہے
اے بھائی

اپنے میدان والے بھائیوں کو' اپنے پہاڑ والے بھائیوں کو
اپنے رب کے پاس لے چل
آؤ سب کے سب آؤ
اب وہ بڑی شان سے موجیں مارتا ہوا بڑھتا ہے
ساری قوم اپنے بادشاہ کے ساتھ کاندھے ملائے ہوئے چلتی ہے اور فتح کے ریلے میں وہ ملکوں پر اپنا سکہ بٹھاتا جاتا ہے
جہاں اس کا قدم پڑتا ہے شہر آباد ہو جاتے ہیں
اس کا بہاؤ کسی کے روکے نہیں رکتا۔ وہ زور و شور سے میناروں کی چمکتی چوٹیوں' مرمریں عمارتوں کے پیچھے چھوڑ کر تخلیق کے جوش میں آگے بڑھا جاتا ہے
گویا اطلس ایک دنیا کو کاندھوں پر اٹھائے ہے
اس کے سر پر ہزاروں جھنڈے لہراتے ہیں اور سرسراتے ہیں
اور یہ سب اس کی شان و شوکت کے نشان ہیں
اس طرح وہ اپنے بھائیوں' اپنے عزیزوں' اپنے بچوں کو
ان کے رب کے پاس' جو ان کے انتظار میں ہے
پہنچا دیتا ہے
اور وہ انہیں مسرت کے جوش میں گلے لگا لیتا ہے(37)

حضورؐ کو نوع انسانی کی بھلائی کی فکر جس طرح دامن گیر رہتی تھی' اس کی عمدہ تصویر گوئٹے کی نظم میں ملتی ہے۔ اس کی ایک ایک سطر سے حضورؐ سے محبت و عقیدت کا پاکیزہ جذبہ ٹپکتا ہے لیکن اقبال نے اس نظم کے تاثر کو جس اسلوب میں بیان کیا ہے' اس کی ندرت بھی یقیناً لائق داد ہے۔

اقبال کی نظم "جوئے آب"

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود
مانند کہکشاں بگریبان مرغزار
درخواب ناز بود بہ گہوارۂ سحاب

وا کرد چشم شوق به آغوش کوهسار
از سنگریزه نغمه کشاید خرام او
سیمائے او چو آئینه بے رنگ و بے غبار
زی بحر بیکرانه چه مستانه میرود
در خود یگانه از همه بیگانه میرود
در راه او بهار پریخانه آفرید
نرگس دمید و لاله دمید و سمن دمید
گل عشوه داد و گفت یکے پیش ما بایست
خندید غنچه و سر دامان او کشید
ناآشنائے جلوه فروشان سبز پوش
صحرا برید و سینه کوه و کمر درید
زی بحر بیکرانه چه مستانه میرود
در خود یگانه از همه بیگانه میرود
صد جوئے دشت و مرغ و کهستان و باغ و راغ
گفتند "اے بسیط زمیں با تو ساز گار
مارا که راه از تنک آبی نه برده ایم
از دستبرد ریگ بیاباں نگاه دار"
وا کرده سینه را به هوا هائے شرق و غرب
در بر گرفته همسفران زبون و زار
زی بحر بیکرانه چه مستانه میرود
باصد هزار گوهر یک دانه میرود
دریائے پر خروش ز بند و شکن گذشت
از تنگنائے وادی و کوه و دمن گذشت
یکساں چو سیل کرده نشیب و فراز را
از کاخ شاه و باره و کشت و چمن گذشت

بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بیقرار
در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گذشت
زی بحر بے کرانہ چہ مستانہ میرود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ میرود(38)

اب ملاحظہ کیجئے گوئٹے کی نظم "Huri--Dichter" کا اردو ترجمہ اور اقبال کی نظم "حور و شاعر" جس میں انہوں نے گوئٹے کی نظم کے مطالب کو اپنے خاص انداز میں فارسی کا جامہ پہنایا ہے۔

گوئٹے کی نظم بہت طویل ہے' اقبال نے اس نظم کے جواب میں اختصار و ایجاز سے کام لیا ہے اور گوئٹے کے مرکزی خیال کو پیش نظر رکھا ہے' اس کی تفصیلات سے اخذ نہیں کیا۔ گوئٹے کے ہاں سکون کی جستجو کا جذبہ پنہاں ہے' جبکہ اقبال کے کلام میں حرکت و عمل کو جو خاص اہمیت ہاصل ہے' اس کی بنا پر وہ حور کے سکونی حسن سے متاثر نہیں ہوتا۔ حسن کی تلاش و جستجو میں نہ اس کی نظر کو قرار ہے اور نہ دل کو سکون۔

گوئٹے کی نظم "حور و شاعر"

حور: آج میں بہشت کی نگراں ہوں۔ میں تجھے یہاں آ جانے کی اجازت کیسے دوں' تو مسلمان ہونے سے منکر ہے لیکن تو ہمارے مسلمانوں کا رشتہ دار ہے۔ اگر میدان جہاد سے آیا ہے تو اپنی قربانی کے اظہار کے لئے مجھے زخم دکھا۔ اس طرح میں شاید تجھ پہ در جنت کھول سکوں گی۔

شاعر: اس ناز و عشوے سی مجھے مصیبت میں نہ ڈال۔ براہ کرم مجھے آنے دے۔ میں نے آدمی کی زندگی گذاری ہے۔ چار و ناچار جہاد زندگی میں شریک رہا ہوں۔ تو اپنی تیز بین نگاہوں سے میرے گھائل دل کا اندازہ لگا سکتی ہے۔ میرے یہ جانکاہ زخم غم عشق کے ہاتھوں ہیں۔ مگر میں معشوق کی دلداری اور محبت دنیا میں دل سرد نہیں ہوا۔ میں حسن والوں کی ناز برداریوں اور جفاؤں کا اب بھی دلدادہ ہوں۔ مجھے آ

جانے دے اور ایسا نہ سوچ کہ تو کسی نااہل کو اجازت دے۔ مجھے اجازت دے کہ میں آ کر تیری طلائی انگشت دیکھوں اور بہشت جاوداں میں سال و ماہ کا حساب کروں۔ میری حور تیری محبت نے مجھے مضطرب کر رکھا ہے۔ میں جسارت کر کے تجھ سے پوچھتا ہوں کہ آیا تو پہلے بھی انسانوں میں رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تو کوئی "زلیخا" تھی۔ اور اس نام سے پکاری جاتی تھی۔

حور: شاعر، میں عناصر اربعہ سے پاک ہوں۔ میں "حور" ہوں۔ میں تمہاری دنیا میں کیوں آؤں؟ ہاں تم جنت میں آ سکو تو تمہاری میزبان بنوں گی۔ میں جب مومنین کی خدمت کرتی ہوں تو میرے خلوص سے فرشتوں کو حیرت ہوتی ہے اور فرشتوں کو انسانوں پر رشک ہونے لگا تھا۔ میں اس خدمت سے دل تنگ ہونے لگی تھی کہ (حضرت) محمدؐ معراج کے دوران ماورائے افلاک گئے اور واپسی پر براق روک کر یہاں توقف فرمایا۔ انہوں نے مجھے اور دوسری حوروں کو زمین والوں کا روپ اختیار کرنے کو کہا۔ ان کے حکم سے ہم نے نئی زندگی پائی اور بے خوف و خطر اہل زمین کی خدمت کرنے لگی ہیں۔ اب مسلمان یہاں آتے ہیں، تو ہمیں دیکھ کر اپنی زمینی محبوباؤں کو یاد کرتے ہیں۔ شاعر کیا تو بھی ایسا کر رہا ہے؟ میں تیری زلیخا تو نہیں ہوں مگر شاید اس سے مشابہ ہوں گی، جب ہی تو مجھے یاد کرتا ہے۔

شاعر: تو نے سچ کہا میں تیرے جمال کا عاشق اور تیری تعریف میں رطب اللسان ہوں، تو میری زلیخا ہو یا نہ ہو میں تجھ سے گذارش کروں گا کہ دروازہ کھول دے، میں شاعر ہوں اور تجھے عمدہ قصیدہ پیش کروں گا۔

حور: تو شاعری کرتا رہ، مگر یہاں کے لوگ سکون چاہتے ہیں۔ تیری شاعری ان کی نیندیں حرام کر دے گی، تو براہ کرم یہاں سے پلٹ جا۔ اب تک تو نے یہاں کتنا وقت یونہی صرف کر دیا ہے۔

شاعر: تیرے حضور میں ہوں اور وقت کا احساس کروں' زہے سال و ماہ جو یہاں گزریں۔

حور: آ ہی جا پھر---- اب دل لگا کر شعر کہہ---- ایسی غزل لکھ جو "زلیخا" کی خاطر بھی نہ لکھی ہو۔ یہاں تو ہر فکر و اندیشہ سے آزاد اور پرامن ماحول میں ہو گا۔(39)

اقبال کی نظم حور و شاعر

حور

نہ بہ بادہ میل داری نہ بہ من نظر کشائی
عجب ایں کہ تو ندانی رہ و رسم آشنائی
ہمہ ساز جستجوئے' ہمہ سوز آرزوئے
نفسے کہ می گدازی' غزلے کہ می سرائی
بنوائے آفریدی چہ جہان دلکشائے
کہ ارم بچشم آید چو طلسم سیمیائی

شاعر

دل رہرواں فریبی بہ کلام نیش دارے
مگر ایں کہ لذت او نرسد بہ نوک خارے
چہ کنم کہ فطرت من بہ مقام در نسازد
دل ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروے
تپد آں زماں دل من پے خوبتر نگارے
ز شرر ستارہ جویم' ز ستارہ آفتابے
سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
چو زبادۂ بہارے' قدحے کشیدہ خیزم

غزلے دگر سرائم بہ ہوائے نو بہارے
طلبم نہایت آں کہ نہایتے ندارد
بہ نگاہ ناشکیبے بہ دل امید وارے
دل عاشقاں بمیرد بہ بہشت جاودانے
نہ نوائے درد مندے، نہ غمے، نہ غمگسارے(40)

(3) مئے باقی: اس حصے میں 45 غزلیں ہیں۔

"مئے باقی" کا عنوان حافظ شیرازی کے اس مشہور شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے:

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلے را(41)

اقبال نے حافظ سے صرف یہ عنوان ہی مستعار نہیں لیا، حافظ کے نظریہ زندگی کے نقاد ہونے کے باوصف اس کے فن سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اس حصے کی غزلوں میں وہی رعنائی، غنائیت اور تاثیر ہے جو کلام حافظ کا طرۂ امتیاز ہے۔ "مئے باقی" کی کئی غزلیں حافظ شیرازی کی زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ بعض جگہ اقبال نے سعدی شیرازی کی پیروی بھی کی ہے۔ اس کے باوجود یہ تمام غزلیں اقبال کے اسلوب کی عکاس ہیں۔ اقبال نے غزل کی کلاسیکی روش کا بھی لحاظ رکھا ہے اور موضوعات کی وسعت و تنوع کے پیش نظر اس روش کو جدت سے آشنا بھی کیا ہے۔ رمز و ایما کے علاوہ شعری و غنائی ضروریات کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اقبال نے صنف غزل کو بلند فلسفیانہ خیالات سے بھی مالا مال کیا ہے۔ ان غزلوں میں تعمیر خودی، حب اسلام، عشق رسولؐ، حب قوم اور مغرب دشمنی وغیرہ موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ "مئے باقی" کی غزلوں کے چند اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

نقش دگر طراز دہ آدم پختہ تر بیار
لعبت خاک ساختن می نہ سزد خدائے را(42)
صورت نہ پرستم من، بت خانہ شکستم من
آں سیل سبک سیرم، ہر بند گسستم من(43)
حسرت جلوۂ آں ماہ تمامے دارم
دست بر سینہ، نظر بر لب بامے دارم(44)

می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر
رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر(45)
فرنگ گرچہ سخن با ستارہ می گوید
حذر کہ شیوۂ او رنگ جوزنی دارد(46)

(4) **نقش فرنگ**: اس حصے میں 24 نظمیں ہیں اور آغاز ایک طویل ترکیب بند بعنوان "پیام" سے ہوتا ہے۔ یہ وہ پیام ہے جو اقبال نے مغرب کو دیا ہے۔ اس نظم میں اقبال نے مغرب کے نظام فکر اور اس کے تہذیبی رویوں پر شدید تنقید کی ہے اور اسے عشق کے گنج گراں مایہ کا پتہ دیا ہے جس سے محرومی نے اسے، عقل خود بیں کے ہوالے کر دیا ہے اور وہ نہ صرف اپنے لئے بلکہ ساری دنیا کے لئے تباہی و بربادی کا باعث بن رہا ہے۔ اس نظم میں اقبال نے راز حیات کو آشکارا کرنے کے ساتھ ساتھ مشرق کی بیداری اور عروج نو کی پر اعتماد پیش گوئی کی ہے۔ یہ نظم اقبال کے فن کا عمدہ نمونہ ہے، جس میں فکر عمیق نے شوکت الفاظ کے ساتھ مل کر عجب سماں باندھ دیا ہے۔

اس حصہ کتاب میں اقبال نے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ مزدور کو پیغام بیداری دیا ہے۔ جمعیت اقوام (League of Nations) کو کفن چوروں کی انجمن قرار دے کر اہل مشرق کو اس کے دام فریب میں آنے سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے۔

اس حصے میں اقبال نے مشرق و مغرب کے بہت سے مفکرین اور شعرا پر بھی نگاہ بازگشت ڈالی ہے۔ اس ضمن میں اقبال نے نٹشے (متوفی 1900ء)، آئن سٹائن (متوفی 1955ء) لاک (متوفی 1704ء)، کانٹ (متوفی 1804ء)، برگساں (متوفی 1941ء)، آگسٹس کومٹ (متوفی 1857ء)، ٹالسٹائی (متوفی 1910ء)، کارل مارکس (متوفی 1883ء)، ہیگل (متوفی 1831ء)، براؤننگ (متوفی 1889ء)، بائرن (متوفی 1824ء)، رومی (متوفی 1273ء)، غالب (1869ء) کے افکار پر تبصرہ کیا ہے۔

بعض مقامات پر مکالموں کی صورت میں اور بعض مقامات پر کسی شخصیت کے فکر و فلسفہ کو دو مصرعوں میں پیش کر دیا ہے۔ ان کا تبصرہ و تجزیہ اس قدر بھرپور اور اس کی پیشکش اس قدر فنکارانہ ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے کہ اقبال نے

نظم "شعرا" میں براؤننگ، بائرن، غالب اور رومی کے نظریہ زندگی کو غالب کے ایک شعر کی زمین میں بادہ و ساغر کے حوالے سے کس طرح واضح کیا ہے:

براؤننگ:

بے پشت بود بادۂ سرجوش زندگی
آب از خضر بگیرم و در ساغر افگنم

بائرن:

از منت خضر نتواں کرد سینہ داغ
آب از جگر بگیرم و در ساغر افگنم

غالب:

"تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم"

رومی:

آمیزشے کجا گہر پاک او کجا
از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم(47)

براؤننگ بادۂ زندگی خضر سے لیتا ہے، بائرن اپنے جگر کے خون سے، مرزا غالب آبگینہ دل کو پگھلا کر زندگی کی شراب بناتا ہے اور رومی براہ راست تاک سے بادہ حیات کشیدہ کرتا ہے۔

خردہ

آخر میں "خردہ" کے عنوان کے تحت چند ایک متفرق اشعار و قطعات درج کئے ہیں، جن میں جدت پسندی اور خطر جوئی کی تلقین کی ہے۔ اس حصے کا ایک شعر دیکھئے:

ندارد کار با دون ہمتان عشق
تدرد مردہ را شاہیں نگیرد(48)

تبصرے

علامہ اقبال کی اس معرکہ آرا تصنیف کو برصغیر پاک و ہند کے اندر اور باہر خاص شہرت

حاصل ہوئی۔ متعدد اہل فن نے اس پر تبصرے کئے اور اس طرح اقبال کی فلسفیانہ بصیرت اور فنکارانہ مہارت کی داد دی۔

"پیام مشرق" پر تبصرہ نگاری کے سلسلے میں اولیں نام چوہدری محمد حسین کا ہمارے سامنے آتا ہے' جنہوں نے کتاب کے مسودے کو اشاعت کے لئے مرتب کیا تھا۔ انہوں نے اس وقت تبصرہ لکھا تھا' جب اس کتاب کا پہلا حصہ کاتب کے پاس پہنچ چکا تھا اور چھپنے میں ابھی دو ماہ باقی تھے۔ یہ تبصرہ پہلے "ہزار داستان" اور پھر "زمیندار" لاہور بابت 17 مارچ 1923ء (جلد 10 نمبر 63' صفحہ 1) 29 مارچ 1923ء (جلد 10' نمبر 64' صفحہ 1' 3) اور 21 مارچ 1923ء (جلد 10' نمبر 65 صفحہ 1' 3) میں بالاقساط چھپا تھا۔ (49) کتاب جب شائع ہو گئی تو اس پر سید سلیمان ندوی اور مولانا اسلام جیراجپوری ایسے بزرگوں نے بھی تبصرے لکھے۔ جہاں تک بیرون ملک کتاب کی پذیرائی کا تعلق ہے' خود اقبال نے اپنے بعض خطوط میں اس کا ذکر کیا ہے۔

خان نیاز الدین خان کے نام 20 جولائی 1923ء کے خط میں اقبال لکھتے ہیں: "پیام مشرق کے متعلق بہت سے خطوط دور و نزدیک سے آئے ہیں اور آ رہے ہیں۔ برلن سے ایک پروفیسر نے لکھا ہے کہ حیرت انگیز کتاب ہے۔ پروفیسر مہارووائٹرز (ہورو وتس) جو علی گڑھ میں عربی کے پروفیسر تھے اور اب جرمنی میں ہیں' اس پر ریویو لکھ رہے ہیں جو جرمن اخبارات میں شائع ہو گا۔ پروفیسر نکلسن نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک قابل تحسین جواب گوئٹے کے "دیوان مغربی" کا ہے اور جدید اور بجنل خیالات و افکار سے لبریز ہے۔" (50)

خان محمد نیاز الدین خان ہی کو 28 جولائی 1923ء کے خط میں تحریر کرتے ہیں:

"مجھے یقین ہے کہ فرنک فورٹ کے پروفیسر ہارووائٹرز (ہورو وتس) کا ریویو عنقریب ہندوستان آئے گا۔ اس کا (جرمنی سے) انگریزی ترجمہ کرا کے یہاں شائع کر دیا جائے گا۔" (51)

جس زمانے میں "پیام مشرق" شائع ہوئی' ایران کے ایک شاعر ڈاکٹر محمود افشار مرحوم بمبئی میں تھے۔ انہوں نے "پیام مشرق" سے متاثر ہو کر اس کی تعریف میں چند شعر کہے تھے' جو انہوں نے علامہ اقبال کی خدمت میں بھی ارسال کئے تھے۔ ان اشعار کا تذکرہ اقبال

نے سید نذیر نیازی کے نام 15 فروری 1936ء کے خط میں کیا ہے۔

اندیشہ داشتم چو ز ہندوستاں روم
سوغاتے از سفر چہ بر دوستاں برم
اقبال روی کرد و فراز آمد از درم
گلہائے نو ظہور کہ زی بوستاں برم
نغمہ سرا شوند ہمہ بلبلان پارس
زین نغز چامہ ہا کہ ز ہندوستان برم(52)

ترجمے

"پیام مشرق" کو مختلف زبانوں میں منتقل کرنے کا کام خود اقبال کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ مکاتیب اقبال کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ 1933ء میں ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی کے ایک انگریز دوست کرنل ٹیوٹ اقبال کی کتاب "بانگ درا" کی نظموں کا انگریزی ترجمہ کرنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں وہ اقبال کی اجازت اور راہنمائی کے طلبگار تھے۔ ڈاکٹر صوفی نے ان کی مدد کی غرض سے سلسلہ جنبانی کی تو اقبال نے فارسی کلام خصوصاً "زبور عجم" "پیام مشرق" اور "جاوید نامہ" کی طرف توجہ دلائی تو کرنل ٹیوٹ نے "پیام مشرق" کی رباعیات (قطعات) کے ترجمے پر آمادگی ظاہر کی۔ اقبال نے بعض شرائط کے تحت اس کی اجازت دے دی۔ ڈاکٹر صوفی کے نام اقبال کے پانچ خط ہیں اور ان میں زیادہ تر "پیام مشرق" کی رباعیات کے ترجمے کا ذکر ملتا ہے (53)

ان خطوط سے بعض دیگر تراجم کا علم بھی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صوفی کے نام 31 مارچ 1933ء کے خط میں اقبال لکھتے ہیں:

"پیام مشرق کا ترجمہ جرمن زبان میں ارلانگن یونیورسٹی کے پروفیسر ہال کر رہے ہیں" (54)- 24 مئی 1933ء کے خط میں رقم طراز ہیں:

"اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر تاثیر نے بھی چند رباعیات کا ترجمہ کیا ہے"(55)

ڈاکٹر محمد عباس علی خان لمعہ حیدر آبادی کے نام 6 جولائی 1933ء کے مکتوب میں اقبال لکھتے ہیں:

"انہوں (نکلسن) نے بعض نظمیں "پیام مشرق" کی بھی ترجمہ کی تھیں جو جرمنی کے رسالہ Islamica میں شائع ہوئی تھیں" (56)

مختلف ملکوں اور زبانوں میں "پیام مشرق" کے جو مکمل اور جزوی ترجمے ہوئے ہیں' ان کی تفصیل یہ ہے:

اردو

شیر علی خان سرخوش نے "جام مشرق ملخص پیام مشرق" کے نام سے "پیام مشرق" کے خاص حصوں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا' جو 1923ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

عبدالرحمان طارق نے "روح مشرق" کے نام سے اردو میں منظوم ترجمہ کیا' جو 1952ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

مولوی صالح محمد نے مئی 1930ء کے لگ بھگ "پیام مشرق" کی رباعیات (قطعات) کا اردو ترجمہ کیا' جو اقبال کی نظر سے بھی گذرا تھا۔

فیض احمد فیض اور حضور احمد سلیم نے منتخب حصوں کا منظوم ترجمہ کیا' جسے اقبال اکادمی نے الگ الگ جلدوں میں 1977ء میں شائع کیا۔

"لالہ طور" کا مکمل اور غزلوں اور نظموں کی خاصی تعداد کا منظوم اردو ترجمہ حکیم سروسہارنپوری نے کیا ہے' جو ابھی تک کتابی صورت میں نہیں چھپ سکا۔ تاہم اس کے متعدد حصے ملکی اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

اطالوی

پروفیسر بوسانی (A. Bausani) نے 1952ء میں "جاوید نامہ" کے منتخب حصوں کا ترجمہ Poema Celeste شائع کیا تھا۔ اس کی اشاعت دوم 1963ء میں "پیام مشرق" اور بعض دیگر مجموعوں کے بھی منتخب حصے شامل کر لئے گئے۔

انگریزی

پروفیسر اے۔ جے۔ آربری (A. J. Arberry) نے "لالہ طور" کا ترجمہ The Tulip of Sinai کے نام سے کیا ہے' جو رائل انڈین سوسائٹی لندن نے 1947ء میں

شائع کیا۔

محمد ہادی حسین نے "پیام مشرق" کا انگریزی ترجمہ کیا' جس کا پہلا ایڈیشن "A Selective Rendering of Iqbal's Payam-i-Mashriq" کے زیر عنوان شائع ہوا تھا۔ بعد میں مکمل ترجمہ A Message from the East کے نام سے اقبال اکادمی نے 1977ء میں شائع کیا' جس میں "جوئے آب" کے سوا تمام منظومات کا ترجمہ شامل ہے اور اختتام پر حواشی بھی دیئے گئے ہیں۔

عبدالرحمان طارق نے اقبال کی تمام رباعیات (مشمولہ "پیام مشرق") کو انگریزی میں منتقل کیا ہے' جسے شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے 1973ء Rubaiyat of Iqbal کے نام سے شائع کیا ہے۔

بنگالی

متعدد نظموں کا بنگالی ترجمہ پروفیسر امین الدین سابق صدر شعبہ بنگلہ اسلامیہ انٹر کالج ڈھاکہ نے کیا۔

پشتو

شیر محمد مینوش نے پشتو میں ترجمہ کیا' جسے اقبال اکادمی نے 1963ء میں شائع کیا۔

پنجابی

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے "نقش اقبال" کے عنوان سے "پیام مشرق" کی متعدد نظموں کا ترجمہ کیا' جسے اقبال اکادمی نے 1977ء میں لاہور سے شائع کیا۔

ترکی

"پیام مشرق" کا ایک ترجمہ ڈاکٹر علی گنجیلی نے کیا ہے۔

ڈاکٹر علی نہاد تارلان نے Sarktan Haber کے عنوان سے اس کو ترکی نثر میں منتقل کیا اور 1956ء میں انقرہ سے شائع کیا۔ یہ ترجمہ دوسری بار 1963ء میں استنبول سے اور اسی سال اقبال اکادمی پاکستان نے کراچی سے شائع کیا۔

جرمن

ڈاکٹر ہانز مائنکے ((Dr. Hans Meinke) نے "پیام مشرق" کے ایک حصے کا ترجمہ کر کے خوبصورت چمڑے پر خوش خط لکھوا کر اور نقش و نگار بنوا کر اقبال کی خدمت میں بطور تحفہ ارسال کیا۔ یہ ترجمہ سترہ اوراق پر مشتمل ہے اور اقبال میوزیم لاہور میں محفوظ ہے (نمبر سلسلہ ع ام 197 - 1977)

ڈاکٹر شمل (Dr. Annemarie Schimmel) نے Botschaft des Ostens کے عنوان سے جرمن میں منظوم ترجمہ کیا' جو 1963ء میں ویس باڈن (Wiesbaden) سے شائع ہوا۔

ڈیوس روسو نے کتاب کے دیباچے کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا۔

چیکو سلوواکی

ژان ماریک (Jan Marek) نے "پیام مشرق" کی منتخب نظموں کو Poselstin Vychoa کے نام سے چیکو سلوواکی زبان میں منتقل کیا' جس کا مصور ایڈیشن 1962ء میں پراگ سے شائع ہوا۔

عربی

مولانا مسعود عالم ندوی نے عربی زبان میں "پیام مشرق" کا ترجمہ "رسالہ المشرق" کے نام سے کیا۔

ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے عربی میں منظوم ترجمہ کیا' جسے مجلس اقبال کراچی نے (غالباً 1951ء میں) شائع کیا۔

فارسی

ڈاکٹر محمد ریاض نے اس کے دیباچے کا ترجمہ کیا ہے' جو ان کے مقالے "ترجمہ دیباچہ ہای آثار فارسی اقبال" میں شامل ہے' جسے اقبال اکادمی پاکستان نے "اقبال ریویو" میں شائع کیا۔

فرانسیسی

ایوا میرووچ (E. Meyerovitch) اور محمد اکاتا (M. Achena) نے مشترکہ طور پر Message de l'Orient کے عنوان سے ترجمہ کیا' جو 1956ء میں پیرس سے شائع ہوا۔

گجراتی

سید عظیم الدین منادی نے گجراتی زبان میں ترجمہ کیا' جسے اقبال اکادمی نے 1964ء میں کراچی سے شائع کیا۔

شرحیں

"پیام مشرق" کی ایک شرح پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے لکھی' جسے عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور نے 1953ء میں شائع کیا۔

شریف ارمی نے "پیام مشرق" کی منتخب نظموں کا ترجمہ و تشریح کی' جو 1976ء میں جدید بک ڈپو لاہور نے طبع کی۔

اس کے علاوہ مختلف نصابی ضرورتوں کے تحت اس کی منتخب منظومات کے متعدد ترجمے اور شرحیں شائع ہو چکی ہیں۔

حواشی

1- مکاتیب اقبال بنام گرامی' ص 136

مولانا گرامی کے نام اقبال کے خط محررہ یکم جولائی 1916ء سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے مثنوی "اسرار خودی" کا تیسرا حصہ 1916ء میں لکھنا شروع کر دیا تھا اور غالباً یہی وہ حصہ ہے جس نے بعد میں "پیام مشرق" کا نام پایا۔

2- اقبال نامہ' اول' ص 107

"پیام مشرق" شائع ہوئی تو اس میں صرف فارسی کلام شامل تھا۔ اردو کلام ممکن ہے "بانگ درا" (1924ء) میں شامل کر لیا گیا ہو۔

-3 ایضاً ص 108

-4 ایضاً ص 108

-5 ایضاً ص 2، 159

-6 ایضاً ص 159

-7 اقبال کامل، ص 17، 18

-8 مکاتیب اقبال بنام گرامی ص 227

-9 اقبال نامہ 1، ص 234

-10 اقبال نامہ 1، ص 131

کتاب میں سید سلیمان ندوی کے نام اقبال کے خط کی تاریخ 24 مئی 1922ء دی گئی ہے۔ جب کہ اصل خط میں 24 مئی 1923ء درج ہے۔ "اقبال نامہ" میں درج تاریخ مرتب یا کاتب کا سہو معلوم ہوتا ہے۔

-11 شاد اقبال، ص 147

-12 روزگار فقیر، اول، ص 215

-13 تفصیل کے لئے دیکھئے "تصانیف اقبال" ص 134 - 142

-15 بانگ درا، ص 9

یہ شعر اقبال کی نظم مرزا غالب سے لیا گیا ہے جو "بانگ درا" کے حصہ اول (...1905ء تک) میں شامل ہے۔ اسی طرح اقبال نے اپنی 1910ء کی بیاض میں بھی کئی جگہ گوئٹے کا ذکر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال قیام یورپ کے دوران گوئٹے سے متعارف ہوئے تھے اور پھر وہ مسلسل اس کے بارے میں معلومات جمع کرتے رہے۔ یہ اقبال ہی کی کوشش ہے کہ آج برصغیر خصوصاً پاکستان میں گوئٹے کی شخصیت اتنی معروف ہے۔

-16 پیام مشرق، ص الف

-17 پیام مشرق، ص 184

ویمر کے متعلق حاشیئے میں اقبال لکھتے ہیں "جرمنی میں ایک شہر ہے جہاں گوئٹے نے اپنی زندگی کا بہت سا حصہ بسر کیا اور بعد انتقال وہیں دفن ہوا۔"

-18 اقبال چوہدری محمد حسین کی نظر میں، ص 131، 132

19- پیام مشرق ص 246

اس نظم کے حاشیئے میں اقبال نے نکتہ دان المنی کی وضاحت ان لفظوں میں کی ہے۔ "نکتہ دان المنی سے مراد گوئٹے ہے جس کا ڈرامہ "فوسٹ" مشہور و معروف ہے۔ اس ڈرامے میں شاعر نے حکیم فوسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کی امکانی نشو و نما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمال فن خیال میں نہیں آ سکتا۔"

20- اقبال چوہدری محمد حسین کی نظر میں۔ ص 131-132

21- ایضاً' ص 136

22- پیام مشرق' ص 2-3

23- بحوالہ "اقبال اور گوئٹے" ص 99

24- ایضاً' ص 100

25- پیام مشرق' ص 1

26- سورۂ بقرہ۔ 115

آیت کے اصل الفاظ یوں ہیں **وللہ المشرق والمغرب**

27- پیام مشرق' ص۔ م

28- انگریزی اشارات کے لئے رجوع کیجئے' تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ' ص 443-447

29- پیام مشرق' ص - م' ن

30- ملاحظہ کیجئے پروفیسر فرمان فتح پوری کا مضمون "رباعی کیونکر؟" مشمولہ سہ ماہی مجلہ "صحیفہ" لاہور' ستمبر 1958ء

31- اقبال نامہ' 1' ص 303

32- پیام مشرق' ص 27

33- اقبال کی تیرہ نظمیں' ص 20

34- پیام مشرق' ص 151

35- اقبال اور گوئٹے' ص 96

36- اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ' ص 86

37- مجلہ گورڈونین (Gordonian) ہجرت نمبر' ص 5 - 7

-38 پیام مشرق، ص 151 - 152

-39 برکات اقبال ، ص 223 - 224

-40 پیام مشرق، ص 147 - 149

-41 دیوان حافظ، ص 9

-42 پیام مشرق، ص 192

-43 ایضاً، ص 179

-44 ایضاً، ص 195

-45 ایضاً، ص 170

-46 ایضاً، ص 194

-47 ایضاً، ص 252

-48 ایضاً، ص 263

-49 اقبال، چوہدری محمد حسین کی نظر میں، ص 125

-50 مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان، ص 46 - 47

-51 ایضاً، ص 47

-52 مکتوبات اقبال بنام سید نذیر نیازی، ص، 194- نیز دیکھئے "گفتار ادبی" از محمود افشار ج 2 ص 362- مرحوم نے اپنی مذکورہ کتاب میں اقبال کے ساتھ اس مختصر خط و کتابت کو درج کیا ہے۔ اس مضمون کا اردو ترجمہ سید عارف نوشاہی نے کیا اور بعنوان "اقبال کا ایک نادر خط" ماہنامہ فیض الاسلام راولپنڈی شمارہ جنوری 1978ء (اقبال نمبر) میں شائع ہوا۔ بعد میں اس اردو مضمون کا عکس افشار مرحوم نے مختصر تبصرے کے ساتھ اپنی کتاب "افغان نامہ" جلد سوم، مطبوعہ تہران میں بھی شامل کر دیا۔

-53 اقبال نامہ، 1، ص 99 - 303

-54 ایضاً، ص 300

-55 ایضاً، ص 302

-56 ایضاً، ص 277

کتابیات

کتب

1- اقبال نامہ، حصہ اول، شیخ عطاء اللہ ایم اے، 1944ء، شیخ محمد اشرف، لاہور

2- اقبالنامہ، حصہ دوم، شیخ عطاء اللہ ایم اے، 1951ء، شیخ محمد اشرف، لاہور

3- اقبال کی تیرہ نظمیں، اسلوب احمد انصاری، جنوری 1977ء، مجلس ترقی ادب، لاہور

4- اقبال چوہدری محمد حسین کی نظر میں، محمد حنیف شاہد، 1975ء، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

5- اقبال اور گوئٹے، محمد اشرف خان اشرف، س۔ ن۔ ملک دین محمد اینڈ سنز، لاہور

6- اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر عبدالشکور احسن، 1977ء اقبال اکادمی، پاکستان

7- برکات اقبال، ڈاکٹر محمد ریاض، س - ن، مقبول اکیڈمی، لاہور

8- بانگ درا، محمد اقبال، ستمبر 1958ء، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور

9- پیام مشرق، محمد اقبال، 1963ء، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور

10- تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، 9 نومبر 1982ء اقبال اکادمی، لاہور

11- دیوان حافظ (اردو ترجمہ و شرح) عباد اللہ اختر، 1979ء، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد

12- روزگار فقیر، اول، فقیر سید وحید الدین، اپریل، 1966ء لائن آرٹ پریس، کراچی

13- شاد اقبال، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، 1942ء، سب رس کتاب گھر، حیدر آباد دکن

14- شذرات فکر اقبال (اردو ترجمہ)، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، دسمبر 1973ء، مجلس ترقی ادب، لاہور

15- مکاتیب اقبال بنام گرامی محمد عبداللہ قریشی، اپریل 1969ء اقبال اکادمی کراچی

16- مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان، 1954ء بزم اقبال، لاہور

17- مکتوبات اقبال، سید نذیر نیازی، ستمبر 1957ء، اقبال اکادمی، کراچی

رسائل

1- سہ ماہی مجلّہ "صحیفہ" لاہور، ستمبر 1958ء

2- مجلّہ گورڈونین، راولپنڈی، ہجرت نمبر، 1982ء

(مجلہ " دانش " (اسلام آباد) ، شمارہ 8 (زمستان 1365 شمسی) ، ص 63-103 ۔ اختصار کے ساتھ بعنوان " پیام مشرق کی عالمگیر مقبولیت " در: " علم کی دستک "(اسلام آباد) اشاعت خاص بیاد علامہ اقبال ، اپریل 1993ء ، ص 69-77)

حصّہ چہارم

دیباچہ پیام مشرق (چاپ اول 1923م)	ترجمہ: ڈاکٹر محمد ریاض	671
نظری بہ دیوان شرقی	دکتر شجاع الدین شفا	679
اقبال و گوتہ	دکتر سید محمد اکرم "اکرام"	703
حافظ، گوتہ و اقبال	دکتر سید محمد اکرم "اکرام"	725

دیباچه "پیام مشرق"

(چاپ اول ۱۹۲۳ م)

محرک تالیف کتاب "پیام مشرق" "دیوان غربی" حکیم حیات گوته آلمانی است که شاعر آلمانی یهودی الاصل هائنا درباره آن می نویسد:

"این گلدستهٔ عقیدت را مغرب به مشرق عرضه کرده است ..... دیوان مزبور شاهد این معنی است که مغرب از روحانیت ضعیف و سرد خود بیزار شده، از مشرق زمین حرارتی راهمی طلبد-"

این مجموعه اشعار گوته که خود شاعر آن را "دیوان" موسوم کرده، تحت نفوذ چه عوامل قرار گرفته است؟ برای پاسخ این سوال لازم است که مختصراً به نهضتی به پرادزیم که در ادبیات آلمانی آن را "نهضت مشرقی" می نامند-

می خواستم که درین دیباچه نهضت مزبور را مشروحاً معرفی کنم ولی متاسفانه بسیاری از وسایل که برای اینکار لازم بود، در شبه قاره میسر نیامد- پال هورن مولف تاریخ ادبیات ایران دریک مقاله خود این امر را مبرهن ساخته بود که گوته تا چه اندازه مدیون شعرای ایرانی است ولی آن شماره مجله "ناردانه سود" در شبه قاره در یا آلمان بدست نیامد- پس ناگزیرم که برای این دیباچه اینک بمطالعه اسبق خود و نیز به رساله مجمل و مفید آقای چارلس (آرتر) ریمی که درباره این موضوع تالیف

کرده، اطمینان و اکتفا کرده باشم.

طبع همه گیر گوته از عنوان شباب متمائل به افکار شرقی بود. او در استراسبرگ مشغول مطالعه حقوق بود که در آن اوان به شخصیت برازنده ادبیات آلمانی آقای هردر، ملاقات دست داد و اثرات "هردر" را گوته در شرح احوال خود بیان داشته است. "هردر" فارسی بلد نبود اما چون طبع وی تحت نفوذ اخلاق قرار می گرفت او به آثار شیخ سعدی سخت علاقه مند بود و بعضی از اجزاهای "گلستان" را به آلمانی برگردانده است.(۱)هردر به سبک حافظ شیرازی علاقه زیاد نداشته و دریکی از نوشته های خود خطاب به معاصرین می فرماید:

"ما به سبک حافظ زیاد سرودیم و اینک احتیاج داریم که به پیروی سعدی شیرازی بپردازیم". ولی باوجود اینهمه علاقه مندی "هردر" بادبیات شرق، در سائر آثار منثور و منظوم وی تاثیر مشرق زمین مشهود نیست. همین طور معاصر دیگر گوته، شیلر، چون قبل از آغاز نهضت شرقی در گذشته بود، در آثاروی هم رنگ شرقی تقریبًا مفقود است بجزاینکه تمثیل "توران دخت" وی ماخوذ از افسانه دختر پادشاه اقلیم چهارم از هفت پیکر مولانای نظامی است که باین بیت آغاز می گردد:

گفت کز جملهٔ وُلایت روس　　بود شهری به نیکوئی چوعروس

در ۱۸۱۲م فان هیمر دیوان خواجه حافظ را کاملا بآلمانی برگردانده انتشار داد و بچاپ همین ترجمه ادبیات آلمانی مواجه به نهضت شرقی گردید. گوته آنگاه شصت و پنج ساله بوده و مقارن آنزمان ملت آلمان بانحطاط همه جانبه روبرو بود. گوته، بلحاظ طبع خود نمی توانست که عملا در سیاست کشور خود وارد شود. به بیزاری از زندگانی پر آشوب اروپائیان، روح بیتاب و بلند پروازوی در محیط پرامن و سکون مشرق زمین مامنی را تلاش کرد. غزلیات ترنم زای خواجه حافظ، هیجانی بزرگ را در گوته ایجاد کرد. ترجمه فان هیمر برای گوته بیش از محرکی نبود. ماخذ و مصدر بعضی از افکار گوته بم همین ترجمه است، چون بعضی از منظومات گوته بظاهر ترجمه آزاد اشعار حافظ بچشم می خورد. باستفاده از قوه

فکر دقیق خود، گوته در بعضی موارد از یکی از مصراعهای حافظ به حل معانی عمیق و مسائل دقیق و بغرنج پرداخته است. در تالیف بیل شوسکی، سوانح نگار معروف گوته، چنین می خوانیم:

"گوته در نغمه سرایی های حافظ شیراز عکس خودش را ملاحظه می کرد. او احیانا اینطور فکر میکرد که گویا این روح وی بود که در کالبد حافظ بسر برده است. مسرت زمینی، محبت آسمانی، سادگی عمیق، جوش و حرارت، وسعت مشرب، گشاده دلی و آزادی از رسوم و قیود در هر دو مشهود است. ما در هریک از موارد گوته را مثیل و شبیه حافظ می بینیم و همان طور که حافظ لسان الغیب و ترجمان اسرار است، گوته هم است. همان طور که حافظ در الفاظ ساده خود جهان معانی را منور ساخته، در بی پیرانگی اشعار گوته هم حقائق و اسرار بزرگ جلوه افروز است. هر دو مقبول و ممدوح مه و که می باشند. هر دو فاتحین بزرگ معاصر خود را تحت تاثیر قرارد اده اند، حافظ تیمور(۲) را و گوته ناپلئون را وهر دو صرف نظر از تباهی و آشوب همگانی عصری، بقوت اطمینان و استقامت درونی، ترنم ریزی قدیم خود را کما کان ادامه داده اند."

بعد از حافظ، گوته در افکار خود مدیون فردوسی، شیخ عطار و سعدی و نیز بطور کلی ادبیات اسلامی است. او دریک دو موارد غزل را بامراعات موازین قافیه و ردیف سروده است و استعاره های فارسی مانند گوهر اشعار، تیرمژگان و زلف گره گیر را بکار برده است. به تقلید بعضی از شعرای فارس، او روایت عشق با پسرها را هم گنجانده و بخش های دیوان خود را نامهای فارسی داده است چون مغنی نامه، ساقی نامه، تیمور نامه و حکمت نامه وغیر آن.

باینهمه تواردات، گوته را نمی توان مقلد هیچکدام از شعرای فارسی زبان تلقی کرد. او موقتا در لاله زار های مشرق زمین بنواسنجی پرداخته ولی مختصات اروپائی را از دست نداده است. گوته آن حقائق شرقی را مورد بررسی قرار داده بود که در طبع غربی وی قابل انجذاب بوده است. او به تصرف کلی معانی علاقه مند نبود و

اگرچه در مشرق زمین مردم به تعبیر و تبیین متصوفانه اشعار حافظ می پردازند، او باین نظر التفاتی نداشته و تنها دلباخته تغزل خواجه بود. حقائق و معارف فلسفی و کلامی مولانا جلال الدین مولوی برای وی معانی نداشت ولی بنظرم او آثار مولوی را بدقت مطالعه نکرده بود و الا کسی چون وی که به حمایت فیلسوف های وجودی هلاندی و المانوی سپونوزا و برونو بالترتیب پرداخته باشد، چطور ممکن بود که شخص بزرگ مولوی را نستاید؟ خلاصه گوته بتوسط دیوان غربی خود سعی کرده است که در ادبیات آلمانی روح مشرق را جلوه گر سازد.

درمیان شعرای بعدی که نهضت شرقی گوته را کامل تر ساخته اند اسامی پلاتون، روکرت و بودن ستات ذکر کردنی است. پلاتون برای اهداف ادبی فارسی را یاد گرفته و با رعایت موازین عروض ایرانی در مورد قافیه و ردیف، غزلیات و رباعیات را نوشته است. او قصیده ای هم برای ناپلئون سروده است. استعارات فارسی از قبیل عروس گل، زلف مشکین، و لاله عذار را او هم مانند گوته استعمال کرده و وابستگی به تغزل را نشانداده است. "روکرت" منبحر السنه سانسکرت، عربی و فارسی بود. او افکار مولانا جلال الدین مولوی را بسیار مهم تلقی می کرد و بسیاری از غزلیات وی باستقبال مولانای رومی سروده شده است. چون درالسنه شرق دست قوی داشته، مآخذ شعر عالی وی توسعد بیشتر یافته است. او از روایات و حکایات کلاسیکی ایران قبل از اسلام و نیز از معارف گلستان سعدی، کلیات امیر خسرو، مناقب العارفین افلاکی، مخزن الاسرار نظامی، منطق الطیر عطار، بهارستان جامی، عیار دانش و هفت قلزم وغیره مروارید های معانی رابیرون کشیده است. بعضی از وقائع تاریخ اسلام مانند مرگ سلطان محمود غزنوی، حمله محمود به سومنات و زندگانی سلطانه رضیه را هم بخوبی منظوم ساخته است.

بودن ستات شاعری است که (بعد از گوته) غالبا بیش از دیگران رنگ شرقی را پذیر فته و مجموعه منظومات خود را بنام قلمی میرزا شفیع انتشار داده است. این کتاب کوچک اینقدر مقبول افتاد که در مدتی کوتا چهارده بار بچاپ رسیده است. شاعر روح شرقی را باین مهارت جذب کرده که مردم آلمان منظومات وی را ترجمه

فارسی فکر می کردند، و بودن ستات از اشعار امیر معزی و انوری ابیوردی کرار استفاده کرده است.

من به معاصر معروف گوته "هائنا" عمدا اشارتی نکرده ام: میدانیم که مجموعه اشعار وی که آن را "اشعار تازه" نامگذاری کرده، دارای رنگ و بوی عجمی است و داستان محمود و فردوسی را بسیار عالی نظم کرده است، ولی بطور جمعی او به نهضت شرقی را بطه ای ندارد. بنظروی اشعار عجمیت مآب شعرای آلمانی غیر از دیوان غربی گوته فاقد اهمیت است، ولی باید از عان داشت که هائنا هم از سحر دلاویز شرقیان مصؤن نمانده است و دریک مورد او خود را ایرانی تبعید شده گمان کرده می نویسد:

"فردوسیا، سعدیا، جامیا، برادرتان در محبس حزن اسیر و برای گلهای شیراز بیقرار می باشد."

درمیان شعرای درجه دوم آلمانی، دومر (ازمقلدان حافظ)، هرمن ستال، لوشکی، ستائیگ لتز، لنت هولد وفان شاک قابل ملاحظه می باشند. فان شاک از لحاظ مراتب علم و فضل هم مهم است و منظومات وی از قبیل داستان انصاف سلطان محمود غزنوی و داستان هاروت و ماروت است و بطور کلی تحت تاثیر حکیم عمر خیام قرار دارد. ولی باید کرارا تذکر بدهم که برای ذکر مشروح نهضت شرقی در ادبیات آلمانی لازم است که بمطالعه دقیق آثار شعرای ایران و آلمان و امور مربوط بپردازیم، که برای آن فعلا فرصت و وسائل هر دو مفقود است ولی سطوری چند که بنگارش آمده امکان دارد فاضلی جوان را برای تحقیق و تدقیق درین مورد برانگیزد.

درباره ی کتاب "پیام مشرق" که تقریبًا صد سال بعد از دیوان غربی گوته بجواب آن تالیف گردید، اشارتی را لازم ندارم. خوانندگان وزین خواهند دید که من بآن معانی و حقائق دینی و اخلاقی پرداخته ام که برای تربیت باطنی افراد و ملل مفید است. صد سال پیشتر، وضع آلمان با وضعیت کنونی مشرق تاحدی مماثل و شبیه بود ولی اضطراب درونی کنونی ملل جهان، که مانمی توانیم اهمیت ویژه ای آن را

بدرستی بررسی کنیم، مقدمة الجیش انقلاب بزرگ روحانی و فرهنگی ملل است. بلای جنگ جهانی اول اروپائیان، اوضاع اسبق را مبدل ساخته و پاک سوخته است. اینک فرزانگان جهان می کوشند که از خاکستر دنیای کهن جهانی تازه را بوجود آورند و اشاراتی درین مورد را می توانید در آثار اینشین و برگسان مشاهده کنید. اهالی قاره اروپا نتائج پرخطر هدفهای، اخلاقی و اقتصادی خود شان را دیده اند و از داستان "انحطاط فرنگ" هم که از سائزنیتی، نخست وزیر اسبق اطالیه، شنیده اند، متاسفانه راهبران مرتجع آن قاره هنوز هم انقلابی را که در قلوب مردم وجود دارد، نمی بینند. از نظر ادبی هم هنوز محیط خسته و جنگ دیده اروپا برای مقاصد و اهداف ادبی سازگار نیست، ولی گمان می رود که مردمان خسته، بیشتر زیر بار اثر عجمی و شرقی نروند و الا جذبات قلب را از افکار ذهنی باز نخواهند شناخت، ویدین وسیله از قوت عمل محروم میمانند. کشور امریکا البته تمدن و فرهنگ اروپائی را به نیکوئی می سنجد و علت آن غالبًا این امر است که این کشور از اثرات روایاتی قاره اروپا آزاد است و وجدانش ابداعات و افکار تازه را هنوز بسهولت می پذیرد.

اهالی سر زمین مشرق بویژه مسلمانان بعد از غفلت صدها سال یک کمی بیدار شده ولی ملل مشرق باید این نکته را بسنجند که انقلابات ظاهری زندگانی، تحت تاثر انقلابات باطنی قرار دارد و دنیائی در محیط خارج قرار نمی گیرد مگر اینکه در قلوب مردم صورت پذیر فته باشد. در قرآن مجید این حقیقت کبری و دستور مبرم بالفاظ ساده و بلیغ اینطور بیان گردیده است:

ان الله لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسهم(۳) : (--خداوند وضع ملتی را تغییر نمی دهد مگر اینکه افراد آن ملت نفوس خود را تغیر داده باشند) این حکمت قرآنی زندگانی فردی و جمعی ملل را احاطه کرده، و من در سائر آثار فارسی خود برای تبیین همین حقیقت پرداخته و می پردازم.

هر کوششی که اینک درجهان و بویژه درمیان ممالک شرق برای منصرف ساختن دیدگاه محدود جغرافیائی افراد و ملل نیز برای تجدید یا تولید روشی

درست و استوار انسانی بکار برده شود' از بس محترم است- بنده این اوراقی چند (--کتاب پیام مشرق) را باسم گرامی اعلیحضرت پادشاه افغانستان منسوب کرده ام چون این طور بنظرمی رسد که ایشان بوسیله ذکاوت و فراست طبعی خود' به نکته مزبور پی برده و هدف خصوص ایشان تربیت ملت افغانان بدان نحو می باشد- درین کار مهم' خداوند متعال حامی و ناصر آن پادشاه باد-

در آخر بنده از دوست خودم آقای چودهری محمد حسین(۴)ام -- اسپاسگزارم که ایشان دست نویس های "پیام مشرق" را برای چاپ مرتب ساخته اند- اگر ایشان به تحمل اینگونه زحمت نمی پرداختند' چاپ و انتشار این مجموعه اشعار احتمالا دوچار تعویق و تاخیر همی گردید-

اقبال

ترجمه و تحشیه: دکتر محمد ریاض

حواشی

(۱) مترجمه در ۱۷۱۲ م

(۲) داستان ملاقات خواجه حافظ و امیر تیمور بظاهر نادرست است چون حافظ قبل از گشوده شدن شیراز بدست تیمور در گذشته بود- (پاورقی اقبال)

(۳) الرعد: ۱۳

(۴) متوفی ۱۶ ژوئیه ۱۹۵۰ م-

(در : اقبال ریویو (لاہور)' جنوری ۱۹۷۱ء' ص ۷-۱۲-ترجمه دیگر از دکتر سید محمد اکرم در : کلیات اقبال (فارسی)' اقبال اکادمی پاکستان' لاہور' "پیش گفتار" و نیز در : اقبال‌درجهان فارسی تالیف دکتر سید محمد اکرم اکرام' لاہور' ۱۹۹۹ء' ص ۱۲۷-۱۳۶)

دکتر شجاع الدین شفا

نظری به "دیوان شرق"

ادب شرق در اروپای جدید

برای اینکه معلوم شود چه عواملی گونه را با آشنائی باادبیات ایران و اداشت و در پی این آشنائی "دیوان" معروف غربی و شرقی را بوجود آورد، بهتر است نخست این نکته روشن شود که اصولا چگونه اروپای جدید باادب شرق آشنا شد.

از اواسط قرن هیجدهم بود که این نهضت آشنائی باافکار و عقاید و ادب و فلسفهٔ شرق در اروپای غربی آغاز شد. پیشقدمان این نهضت فلاسفه و متفکرینی بودند که از تمدن غرب خسته شده، بشر اروپائی قرن خود رابشری "مصنوعی" میدانستند که بقول روسو "بر اثر دوران ممتد تمدن ساختگی روحًا عوض شده و آن هم آهنگی باطنی را که بشر در اصل خلقت خود داشته از دست داده است."

این حس عصیان در فرانسه و آلمان و انگلستان تقریبًا دریکموقع بروز کرد، منتها در دو کشور آلمان و فرانسه که در آن هنگام مهد بزرگترین متفکرین و فلاسفهٔ اروپا بودند، بدو صورت مختلف تجلی کرد: فرانسویان در جستجوی "زندگانی غیر اروپائی" بیشتر بافریقا و امریکای وحشی پرداختند و آلمانها بیشتر بآسیا توجه کردند.

بر اثر این توجه سفر نامه های سیاحان بزرگ اروپائی که بآسیا و کشور های دور دست سفر کرده بودند مورد علاقه و استقبال فراوان قرار گرفت و مردم کوشیدند تا از روی یادداشتهای مارکو پولو، پیترو دلاواله، اولئاریوس، شاردن وغیره شرق افسانه ای و مرموز را بهتر بشناسند. ترجمهٔ کتاب "هزار و یکشب" که در سال ۱۷۰۸ در فرانسه بچاپ رسیده بود دراین هنگام چندین بار تجدید چاپ شد و برهمین زمینه آشنائی تدریجا داستانهای کوچک و رمانها و نمایشنامه ها و اشعار و کتابهای مختلف در باره شرق انتشار یافت که "نامه های ایرانی" منتسکیو "صادق" ولتر در فرانسه و "عبدالله" و "المنصور" تیک در آلمان از معروفترین آنهاست.

بدین ترتیب اندک اندک نه فقط "شرق" یک منبع الهام نویسندگان و متفکرین غرب شد، بلکه دامنه این نهضت بجائی رسید که نخستین پیشوایان مکتب رمانتیسم که آنروز هاتازه بکار پرداخته بودند شرق را تنها منبع شایسته ادب رمانتیک شمردند. فردریک شلگل (Schlegel) آلمانی در سال ۱۸۰۰ در "رویای" خود ترجمهٔ چندین قطعه از "شاهنامه فردوسی" را انتشار داد و در مقدمه آنها نوشت که: "برای آنکه سرچشمهٔ واقعی رمانتیسم را بیابیم و از آن سیراب شویم باید بمشرق زمین سفر کنیم". نوالیس (Novalis) شاعر و متفکر معروف آلمانی در قطعه "سرود شب" خود در همین زمینه اظهار داشت: "خرد و دور اندیشی حکیمانه را تنها در شرق میتوان یافت". درهمین هنگام بود که شینگ (Schelling) شاعر و فیلسوف آلمانی نیز این عقیده را که هیاهوی بسیار پدید آورد ابراز کرد: "مسیحیت تنها یکی از شعب کوچک فلسفه وسیع و عالی شرق است که پیش از آن مذاهب بسیار بزرگ و گاه عالیتری بصورت آئین های هندو و ایرانی بوجود آورده بود" تیک (Tieck) که فوقا از اثر معروفش "المنصور" ذکری بمیان آمد، درهمین موردیکبار گفته بود. "رمانتیسم باید وطن اید آل و سرچشمهٔ زندهٔ الهام خود را در شرق زمین جستجو کند، زیرا فقط در آنجا میتوان آن صفای طبیعی و جامعهٔ بشری بی آلایش و منبب واقعی را که رمانتیسم مشتاقانه در پی

آنست یافت."

شلگل که چنانکه گفته شدقسمتهائی از شاهنامه را برای نخستین بار بزبان آلمانی ترجمه کرده بود چندین سال در پاریس بایکی از دانشمندان زبان و ادبیات هندی و ایرانی کارکرد و زبانهای سانسکریت و پهلوی رافراگرفت و در سال ۱۸۰۸ کتاب بزرگی از نتیجهٔ مطالعات چندین سالهٔ خود دربارهٔ زبان و حکمت شرق انتشار دادکه پایهٔ کلیهٔ تحقیقات علمی مربوط بشرق در آلمان آنروزشد. درست درهمین موقع بود که مستشرق و دانشمند معروف فرانسوی سیلوستر دوساسی (Silvestre de Sacy) که گوته دیوان خود را بدوهدیه کرده است فن "شرق شناسی" را در فرانسه بنیاد نهاد و مطالعات او یکی از منابع اساسی این علم شد که بخصوص گوته از آن فایدهٔ بسیار برد. در انگلستان ساوثی و بایرن و بسیاری دیگر بتفصیل از شرق سخن گفتند و مخصوصًا بایرن چنان از "غرب متمدن مبتذل و احمق" ابراز تنفر کرد که زاد و بوم خویش را ترک گفت و روبعثمانی و یونان برد و در همانجا نیز چشم از زندگانی فروبست.

نخستین تحقیقات علمی دربارهٔ وحدت نژادی اروپائیان آریائی باملل ایران و هند وجدائی این خانواده از نژاد های سامی از همین زمان آغاز شد، که بحث آن از موضوع سخن ما خارج است.

گوته و شرق

در چریان چنین نهضت و تحول فکری بود که گوته باشرق و افکار و عقاید و مخصوصًا فلسفه و ادب آن آشنا شد.

نخستین آشنائی گوته بامشرق زمین از راه "تورات" و "قرآن" صورت گرفت. تورات طبعاجزء کتابهای درسی گوته بود که وی درخانه و مدرسه آنرا شناخت. "قرآن" را نیز گوته از روی ترجمه ای از آن خواند که مگرلین (Megerlin) در فرانکفورت بزبان آلمانی انتشار داده بود. بسیاری از قطعات "دیوان" از قبیل

"اصحاب کهف" و "حوری و شاعر" و "خدای ابراهیمؑ و محمدؐ" وغیره براساس همان اطلاعاتی سروده شده که گوته از خواندن قرآن بدست آورده است. بعدها گوته طرح درامی بنام "محمدؐ" نیز ریخت که در ملاقات معروف خود با ناپلئون در سال ۱۸۰۸ بتفصیل از آن گفتگو کرد، و ناپلئون که در این ملاقات پیمبر اسلام را ببزرگی ستوده بود از تراژدی محمد ولتر که بقول او این "فاتح بزرگ" را باستهزا گرفته بود جداً بد گفت.

مرحله بعدی آشنائی گوته باشرق مطالعهٔ ترجمه آلمانی سفر نامه "داپر" (Dapper) پزشک هلندی بود که در قرن هفدهم بهندوستان سفر کرده بود و از روی این کتاب بود که گوته با آئین های باستانی هند و آشناشد و درمیان افسانه های بیشمار از ارباب انواع این سرزمین داستان "هنومان" بوزینهٔ اساطیری و تناسخ ویشنو را بصورت راما که منجر بتصرف سیلان توسط راما بکمک هنومان گردید و رامارادر عشق سیتای زیبا کامیاب کرد سخت پسندید، چنانکه از این افسانهٔ هندی درامی بساخت. ولی اند کی بعدوی دست از اساطیر هندی بشست، زیرا بقول خودش (درکتاب حقیقت و مجاز) "این صورتهای غول پیکر و غیر عادی و ناموزون نمیتوانستند عطش شاعرانهٔ او راکه همه جا در طلب تناسب و هم آهنگی و جمال بود فرونشانند."

از ادبیات هندو گوته رو بسوی ادبیات غرب کرد، و براهنمائی "هردر" (Herder) یکی از طرفداران برجستهٔ ادب و فلسفهٔ شرق (که بسیاری از آثار ادبی مشرق زمین را به آلمانی ترجمه کرد و مجمعی دو "وایمار" برای ترویج مسلک شرق شناسی خود فراهم آورد) با آثار ادبی بزرک زمان جاهلیت عرب "المعلقات" آشناشد. اند کی بعد ترجمهٔ انگلیسی این اشعار که در سال ۱۷۸۳ در لندن منتشر شده بود بدست او رسید و گوته در صدد بر آمد که بنوبهٔ خویش آنها را بشعر آلمانی در آورد. حتی قسمتی از این کار را انجام داد، ولی بعداً از اتمام آن انصراف یافت و نسخهٔ خطی وی فقط چند سال بیش در کاغذ های گوته بدست آمد. گوته در "شرح و حواشی" دیوان بتفصیل از "معلقات" نام برده و ترجمهٔ قسمتی مختصر از

آنها را نیز بعنوان نمونه آورده است.

* * * * *

آشنائی گوته با ادب ایران از سال ۱۷۹۲ آغاز شد. درین زمان وی ۴۳ سال داشت و در سراسر آلمان و اروپا مشهور بود. نخستین کتابی که او را با ادب ایران آشنا کرد "گلستان سعدی" بود که توسط "هردر" فوق الذکر ترجمه شده و انتشار یافته بود. ولی باید گفت که اثر سعدی در گوته تأثیر عمیق نبخشید ووی آنرا فقط بعنوان نمونه ای از ادب و حکمت شرق خواند و پسندید و بعدها در دیوان خویش از بسیاری از قطعات آن الهام گرفت.

در ۱۸۰۸ ترجمه "لیلی و مجنون" جامی توسط هارتمان (Hartmann) ادیب و شرق شناس آلمانی انتشار یافت و سال بعد از آن هامر (Hammer) مترجم معروف اتریشی قطعه ای بنام "شیرین" از منابع مختلف ایرانی منجمله "خسرو و شیرین" نظامی ترجمه و منتشر کرد که گوته هر دو را خواند و ستود، و بعد هادر دیوان خود از آنها استفاده برد. همین هامر بود که بعد ها بترجمه "دیوان حافظ" پرداخت و آن را در سال ۱۸۱۴ انتشار داد.

در سالهای بعد گوته ارتباط خویش را بامشرق زمین کم و بیش محفوظ داشت، ولی هنوز اثری که تأثیری خاص و استثنائی در وی کند نیافته بود. لا جرم دامنه سفر معنوی خود را در مشرق توسعه داد و از سرزمینهای فلسطین و عربستان و ایران و هندوستان آهنگ چین کرد که برای اروپای آنزمان کشوری بسیار مرموز و افسانه ای بود، و گوته راه این "سفر روحانی" را که در آن "بعد منزل" نبود براهنمائی مارکوپولو سیاح و نیزی که در قرون وسطی از اروپا بایران و چین و هندوستان و سیلان و جاوه و ماداگاسکار سفر کرده بود در پیش گرفت. هدف گوته از این سفر خیالی بدنیای شرق و سرزمینهای دور و نزدیک آن این بود که هر قدر ممکنست اروپای مشوش و آشفتهٔ عصر خود و انقلاب های پیاپی آنرا فراموش کند و آن اضطراب و نگرانی را که درست مثل دورهٔ ما اندک اندک صورت یکنوع بیماری عمومی بخود گرفته بود حتی المقدور از یاد ببرد. همچنانکه دوست وی "کنهل"

طی نامه ای بدو نوشته بود که: "من از دست آشفتگی و هرج و مرجی که اکنون در همه جا حکمفرما میبینم بدامن ادبیات هندی پناه برده ام که آرامش عمیق و روح جدائی آن از جهان و پریشانیهای آن دلم را آرام میکند" گوته نیز به لوئیز اشنیدلر یکی از خانمهای دوست خود درین زمان چنین نوشت: "شرق در واقع تریاکی است که من در این دو ران پر جنجال بر ای تخدیر روح خویش بکار میبرم" و سالها بعد در "خاطرات" خود در همین باره چنین اظها داشت: "میخواستم بهر قیمت هست از دنیای واقع که برایم سخت نامطبوع بود و جسم و روحم را شکنجه میداد بگریزم و بدنیائی افسانه ای پناه برم که کمال مطلوب من بود و در آن میتوانستم تا آن حد که یارا دارم از زیبائی و آرامش محیط بهره مند شوم و لذت برم"

باهمین طرز فکر بود که گوته مجموعه ای از کتابهای مربوط بمشرق زمین منجمله اثر معروف "هاید" را دربارهٔ مذہب ایرانیان باستان فراهم آورد و همه را بدقت خواند، و از مطالبی که بدین ترتیب آموخت اطلاعات وسیع مربوط به آئین زرتشتی و کیش ایرانیان کهن بود که گوته سخت بدان دلبسته شد، چنانکه بعدها کتابی از دیوان شرقی خود را بنام "پارسی نامه" و قسمت مهمی از "شرح و حواشی" دیوان را بتجلیل این آئین اختصاص داد، و بطوری که خواهد آمد خود باطنا یکنوع آئین "مهر پرستی" برای خویش برگزید.

گوته و اسلام

درهمین زمان گوته از دوراه غیر منتظره باشرق و اسلام نزدیک شد. از یکطرف سربازان و ایمار که در "ارتش بزرگ" ناپلئون خدمت میکردند و بدین سمت در جنگ اسپانیا شرکت جسته بود نداز این سرزمین نسخه ای خطی از چند سورهٔ آخر قرآن برایش ارمغان آوردند که طبعا یادگار دوران حکومت مسلمین در اسپانیا بود و گوته که باعلاقهٔ بسیار این هدیهٔ نفیس را پذیرفته بود مدتی کوشید تا خطوط آنرا تقلید کند و از روی آن باخط عربی آشنا شود، چنانکه هنوز خطوطی که وی از

روی این نسخه نوشته در موزهٔ مخصوص او باقی است.

از طرف دیگر، پس از باز گشت ناپلئون از روسیه و سقوط وی که منجر بسر ازیر شدن دسته های بیشمار سپاهیان روسیه بار و پا شد، یک دسته از سربازان باشغر وایمار را اشغال کردند. این سربازان که آئین اسلام داشتند از سر زمینهای دور دست آسیای مرکزی جز وحشیگری و جهل و خشونت برای آلمان متمدن ارمغانی نیاوردند، و بدین ترتیب نخستین تماس بادنیای اسلام گوته را سخت بوحشت افگند. با این همه وی از حضور این میهمانان ناخوانده این استفاده را کرد که بارسوم اسلامی از قبیل اذان و نماز جماعت و روزه و غیره آشنا شود. سر بازان باشغری کلیسای بزرگ شهر را بصورت مسجد در آوردند تا روزی پنج باردر آن نماز گذارند و وعاظ برسر منبرش بوعظ پردازند، ولی از هیچگونه ستمگری نیز فرونگذاشتند. برای گوته این سر بازان وحشی خشن و خون آشام مظهر لشکریان تیمورشدند که بقول خوداو در چند قرن پیش بصورت قهر خدا بایران و سایر کشور های متمدن عصر خویش هجوم آورده و همه جا را در آتش کین سوخته و ویران کرده بودند. گوته بعدها در "تیمور نامه" خود در کتاب "دیوان" این آیات خشم خدا را که دریادداشتهای خصوصی خویش از آنان بعنوان مظاهر "استبداد بیحد و حصر و خشونت و جنگ و انهدام" نام میبرد توصیف کرد و در نامه ای بیکی از دوستان خود چنین نوشت : "با بدبختی فرانسه اکنون روسیه بصورت کشوری بزرگ در آمده است که از این پس باروح وحشیگری و استبداد و خشونت فطری خود اروپای متمدن و فرهنگ و هنر و مدنیت بشری آنراپیوسته تهدید خواهد کرد."

باید گفت که میهمانان ناخوانده باشخص گوته باحترام رفتار کردند و حتی اورا چندمرتبه درمراسم مذهبی خود اجازهٔ حضور دادند و یکبار نیز رئیشان بوی تیر و کمانی بیادگار بخشیدکه گوته دربارهٔ آن در دفتر خود چنین نوشت : "خیال دارم وقتیکه (انشاء الله) خداوند این میهمانان عزیز را بکشور خودشان باز گرداند این تیر و کمان را بر دیوار اطاق خویش نصب کنم."

گوته و حافظ

تا این زمان، یعنی تا سال ۱۸۱۴، "شرق" برایی گوته گریز گاهی بمنظور فرار از آشفتگی و هرج و مرج اروپا و نارا حتی روحی همهٔ مردم این سرزمین بیش نبود. گوته و بسیاری از متفکرین و ادبای اروپا مخصوصاً آلمان رو بسوی مشرق زمین برده بودند تا مگر در عالم خیال کشور خویش و عصر خویش را ترک کنند و بسرزمینی که بوی صفا و آرامش روحانی میدهد قدم گذارند.

در این دوره خستگی روحی و آشفتگی اجتماعی در اروپا بحد اعلای خود رسیده بود. مردم همه فرسوده و نگران و افسرده بودند و مثل امروز هیچ کس از فردای خویش خبر نداشت. توده های اروپائی که انقلاب کبیر فرانسه و جنگهای آن ایشانرا از خواب کهن برانگیخته بود، بطور مبهم احساس میکردند که در آستانه تحول اجتماعی بسیار بزرگی بسر میبرند، ولی این احساس برای ایشان چیزی جز آن نارا حتی واضطراب که لازمهٔ این قبیل دور انهای حد فاصل مراحل مختلف تمدن بشری است همراه نداشت. متفکرین طبعا ازین اضطراب روحی بیش از توده ها سهم داشتند و همین روح خستگی و فرسودگی بود که در عالم ادب یکی از عوامل بزرک پیدایش رمانتیسم و قهر مانان حساس و نومید و افسرده آن گردید.

چنانکه گفته شد تا این هنگام مشرق زمین و ادب و فلسفهٔ آن برای گوته و بسیاری از دیگر متفکرین اروپائی بمنزلهٔ "تریاک" یا "گریز گاهی" بیش نبود. گوته که در این زمان درمنتهای اشتهار خویش بود و گذشته از احراز برزگترین مقامات سیاسی و اجتماعی از شهرت و افتخاری فراوان در همه اروپا بهره داشت، مشرق زمین و تجلیات هنر و فرهنک آنرا بیشتر بعنوان "منفی" تلقی میکرد و از آن چیزی بجز وسیله دوری از حقائق مادی نامطبوع دنیای غرب نمیخواست.

ولی دوران این کناره روی و سفر خیالی سطحی و آسان او بدیار شرق در سال ۱۸۱۴، در آن حین که گوته و اروپا یکی از آشفته ترین سالهای عمر خویش را

میگذرانیدند بپایان رسید و دوران تازه ای برای گوته آغاز شد، زیرا درین سال بود که "کوتا" کتابفروشی که ناشر آثار گوته بود برای وی دو جلد کتاب فرستاد که تازه توسط "هامر" از زبان فارسی ترجمه شده و در شهر وین دراتریش بچاپ رسیده بود- عنوان کتاب "دیوان غزلیات محمد شمس الدین حافظ شاعر ایرانی" بود-(۱)

گوته این کتاب تازه را باميل و اشتیاق پذیرفت و مثل سایر آثار ادب شرق بخواندن آن پرداخت- ولی هنوز صفحه ای چند از آن نخوانده بود که بی اختیار "فریاد تحسین برداشت" و خواندن کتاب را از سر آغاز کرد، زیرا بقول خود ناگهان دریافت که "بااثری مواجه شده که تا آنروز نظیر آنرا ندیده است".

روز هفتم ژوئن ۱۸۱۴ که گوته برای نخستین بار در دفتر خاطرات خود نام حافظ را بردر زندگانی وی روزی بسیار بزرک بود، زیرا گوته درین روز آن "جام چم" را که سالها دل از او میطلبید یافت یعنی ره بدیوان حافظ برد که قول نیچه "اعجاز واقعی هنر بشری" است، و این اعجاز ادب شرق اورا دیوانه خود کرد-

حافظ برای گوته دنیائی تازه، روحی تازه، شوق و حالی تازه بارمغان آورد- او را باروح واقعی شرق، باجمال فلسفه و ذوق و حکمت ایران آشنا کرد- آن شرابی را در پیمانهٔ شاعر آلمانی ریخت که بتعبیر زیبای نیچه "سرمست کننده خردمندان جهان است"- گوته خود در وصف این جاذبهٔ عجیب مینویسد : "ناگهان با عطر آسمانی شرق و نسیم روح پرور ابدیت که از دشتها و بیابانهای ایران میوزید آشنا شدم و مرد خارق العاده ایرا شناختم که شخصیت عجیبش مرا سراپا مجذوب خویش کرد-"

گوته حافظ را خواند و از ورای ترجمهٔ هامر که غالبا نارسا و گاه نیز غلط بود بهتر از همهٔ معاصران خود و بیش از بسیاری از هموطنان حافظ بعظمت روح لسان الغیب ما پی برد، زیرا روح خود او باحافظ بسیار نزدیک بود- او نیز مثل حافظ جمال پرست و حقیقت دوست بود و همچون او تا روز آخر زندگی راستودو آنچه را که روزگار بدو داده بود با نظر قبول و رضا پذیرفت(۱۰) و نیز همیشه کوشید تا مثل حافظ بروح و معنی هر چیز بنگرد و در هر آنچه زیبا است جمال یزدانی ببیند و ستایش کند- هامر در مقدمهٔ حافظ خود نوشته بود : "در دوران زندگانی حافظ

پیوسته وضع سرزمین پارس دستخوش انقلاب بود- امیران و پادشاهان پیابی برسر کار آمدند و از سرکار رفتند و در هر آمدن و رفتن سیل خون روان ساختند، با اینهمه حافظ آرامش طبع و حسن خلق خویش را از دست نداد و همچنان نغمهٔ بلبل و عطر گل و نشهٔ شراب و زیبائی عشق را ستود و از تکریم جمال در هر صورت که آنرا متجلی دید فرو نشست-"

گوته درین تصویر عینا قیافهٔ خود را منعکس دید، زیرا او نیز بقول خود "مثل شاعر شیراز تا روزگار کهنسالی جوانی و زیبائی و نور و خورشید را ستوده و در عطر گل و نغمهٔ بلبل و شور عشق جمال خدا را نگریسته بود-"

در عین حال او نیز همچو حافظ در دورانی که از هر سو سیل خون روان بود هرگز آرامش فیلسفوفانهٔ خویش را از دست نداد و حتی پیش از آنکه باحافظ شیراز آشنا شود، این پند اورا بکار بست که :

بگوشه ای بنشین سر خوش و تماشا کن
ز حادثات زمانی رخ شکر دهنی

و چنانکه در یکی از قطعات "رنج نامه" و ساقی نامهٔ دیوان خود اعتراف میکند، راز دل از ریاکاران و خود پرستان پوشیده داشت و باجام می خلوت گزید بمصداق آنکه:

بروز واقعه غم با شراب باید گفت
که اعتماد بکس نیست در چنین زمنی

یک وجه شباهت دیگر بین حافظ و گوته که شاعر بزرگ آلمانی بتکرار از آن نام میبرد مبارزه با ریاکاران دین است- گوته نیز مثل حافظ پیوسة از تنگ نظری سالوسان روحانی نما درتنگ بود و با آنان میستیزید- این نکته مخصوصا در "رنج نامه" دیوان وی خوب پیداست-

در تابستان ۱۸۱۴ گوته در از همه بروی خود بست برای آنکه تنها با حافظ شیراز خلوت کند- گوئی زبان حال او این سخن سعدی بود که:

مادر خلوت بروی خلق ببستیم

از همه باز آمدیم و باتونشستیم
هر چه نه پیوند باربود بریدیم
هرچه نه پیمان دوست بود شکستیم

در همهٔ این مدت گوئه سراپا غرقه در یای حکمت و سخن حافظ بود- هر غزل او را یکبار و دوبار و ده بار خواند- تا آن حد که نه تنها باروح و فکر حافظ بلکه با طرز بیان وی نیز آشناشد، و چنان با استعارات و تشبیهات او خو گرفت که بعد ها در بسیاری از قطعات دیوان سخن وی را با همان صورت اصلی تکرار کرد، بی اینکه گاه خود بدین نکته متوجه باشد-

اواخر تابستان بود که در دفتر خاطرات خود نوشت:

"دارم دیوانه میشوم- اگر برای تسکین هیجان خود دست بغزلسرائی نزنم، نفوذ عجیب این شخصیت خارق العاده را که ناگهان پادر زندگانی من نهاده تحمل نمیتوانم کرد-"

ازین زمان بود که اندک اندک بسرودن قطعات و اشعاری پرداخت که خود در آغاز قصد جمع آوری آنها را نداشت، ولی بعد که تعداد شان رو بفزونی نهاد، فکر ایجادیک "دیوان آلمانی" در سر شاعر پدید آمد و از آن پس وی بگرد آوری این قطعات همت گماشت-

هنگام سفر به درهٔ راین گوته بدین فکر افتاد که در عالم تصور بکشور حافظ سفر کند و دیوان خویش را ارمغان این "سفر روحانی" قرار دهد- از آن پس وی خود را مسافر دیار شرق پنداشت و قسمت اعظم قطعات "دیوان" را با این تصور سرود که با "کاروانهای مشک و ابریشم" سفر میکند و "ازکوره راههای ناهموار" بسوی شیراز میرود و بگوش خویش میشنود که "راهنمای سفر ترانه شور انگیز حافظ میخواند-" خودش در این باره میگوید: "آهنگ سفر شیراز کردم تا این شهر را منزلگه ثابت خویش قرار دهم و از آنجا چون اتابکان و امیران فارس که هر چند یکبار بعزم سفر های جنگی رو باطراف میکردند، گاه بگاه راه سفر های کوچک در پیش گیرم و باز بشیراز خود برگردم-"

قطعات مختلف دیوان هریک باقتضا و مناسبت حوادثی کوچک یا بزرگ سروده شده که طبعا همه این حوادث در خاک آلمان میگذرد، ولی گوته غالبشان را وقایع سفر خیالی خویش بسر زمین حافظ میشمارد تا بتواند در وصف آنها آنچنان سخن گوید که حافظ شیراز یا مسافری که از دیار غرب رو بایران آورده است درین مورد سخن میتواند گفت.

پس از آنکه باقطعه "هفت خفته" (یا اصحاب کهف) تعداد قطعات کتاب به پنجاه رسید، گوته در صدد بر آمد که مجموع آنها رابرسم شعرای ایران "دیوان" نام بگذارد، و با این نظر بعنوان مقدمه دیوان قطعهٔ "هجرت" را ساخت تا آنرا نمایندهٔ "هجرت" خویش بسوی مشرق زمین قرار دهد. در این زمان بود که وی برای نخستین بار (۱۴ دسامبر ۱۸۱۴) در دفتر خاطرات خود از "دیوان آلمانی" نام برد و نوشت که: "میخواهم این دیوان را بصورت آئینهٔ دنیا یا جام جهان نما در آوردم و در آن شرق و غرب را در کنار هم به بینندگان نشان دهم." اند کی بعد در همین مورد نوشت که: "باختن جام جمی مشغولم که با آن علی رغم زاهدان ریائی دنیای ابدیت راعیان خواهم دید و ره بدان بهشت جاودان که خاص شاعران غزلسراست خواهم برد تا در آنجا در کنار حافظ شیراز مسکن گزینم."

دیوانِ شرقی

در سال ۱۸۱۵ قطر دیوان بر اثر اقامت پنج هفته گوته در درهٔ رود رن در خانهٔ یکی از دوستانش بنام ویلمر افزوده شد، زیرا گوته این مدت را درکنار کسی گذرانید که دلش را پیرانه سر باعشق و شیدائی دوران جوانی آشنا کرد و شاعر سالخورده و نامی آلمان را وا داشت تادلدار خویش را "زلیخا" خواند و مفصلترین و شایدهم شیواترین کتاب "دیوان" خود را بخاطر او بسراید. تفصیل این عشق و ماجرای شاعرانه را ما بطور خلاصه در حاشیهٔ زلیخا نامه آورده ایم.

روز ۱۶ مه ۱۸۱۵ گوته به "کوتا" ناشر آثار خود درباره "دیوان" چنین نوشت: "این کتاب را نه فقط بامراجعهٔ دائم بدیوان محمد شمس الدین حافظ شاعر ایرانی تنظیم کرده ام، بلکه در سرودن قطعات آن سایر آثار ادب شرق را از معلقات و قرآن

گرفته تا اشعار جامی شاعر ایرانی در نظر داشته ام حتی گاه بآثار شعرای ترک نیز متوجه بوده ام" .... و در نامه دیگر درهمین باره چنین گفت : "آرزو و هدف من اینست که با این اثر شرق را باغرب و گذشته را با حال و ایرانی را با آلمانی نزدیک کنم و طرز فکر و عادات و آداب مردم این دو سر زمین را با هم آشنا سازم"

اند کی بعد درششم اکتوبر ۱۸۱۵، گوته در دفتر یادداشت خود نوشت : "دیوان را بکتابهای مختلف تقسیم کردم" در تمام طول سال ۱۸۱۶ وی همچنان بتکمیل این اثر مشغول بود و پس از اتمام "دیوان" در سال ۱۸۱۸ بتنظیم و تدوین شرح ها و حواشی آن که از خود کتاب مفصلتر است پرداخت. نخستین چاپ دیوان در ۱۸۱۹ و چاپ دوم آن در ۱۸۲۰ انتشار یافت و با موفقیتی عظیم مواجه گردید. روزنامه ها و نقادان ادب آنرا "یکی از عالیترین آثار حکمت گوته" دانستند و موسیقی دانان بزرگ آلمانی بسیاری از قطعات آنرا بموزیک در آوردند.

در سال ۱۸۳۶ پس از مرگ گوته، چندین قطعهٔ تازه در یادداشتهای خطی او یافت شد که مربوط به "دیوان" بودولی گوته، قسمتی از آنهارا بعد از نشر دیوان سروده و قسمتی دیگر را نیز که قبلا سروده شده بود عمدا منتشر نکرده بود (از قبیل قطعهٔ معروفی که در آن به "صلیب" و موضوع تثلیث در دین مسیح حمله میکند). قطعهٔ شیوا و دلپسندی که در آن گوته حافظ راکشتی بزرگ و خود را تخته پاره ای ناچیز میشمارد و میگوید : "حافظ، چگونه میتوان با تو لاف همسری زد؟" از همان قطعاتی است که بعد از مرک وی بدیوان افزوده شد. برخی ازین قطعات نیز بعداً از سایر آثار گوته ضمیمه "دیوان شرقی" که بیشتر با آنها مناسبت داشته شده است.

"دیوان غربی و شرقی" که خود گوته بدان نام عربی "الدیوان الشرقی للمؤلف الغربی" داده بود از بدو انتشار خود تا کنون یکی از عالیترین آثار تغزلی زبان آلمانی شناخته شده و بعنوان یک شاهکار ادبی شهرت و اهمیت جهانی یافته است. "دیوان شرقی" تاکنون بغالب زبانهای مهم جهان ترجمه شده و گاه بهر زبان چندین بار تجدید ترجمه و تجدید چاپ شده است.

چند نکته دربارهٔ "دیوان"

دربارهٔ "دیوان" گوته نخست باید گفت که این اثر در حقیقت پایهٔ اساسی فلسفهٔ اجتماعی بزرگی است که گوته طرفدار و مدافع آن بود، بدینمعنی که در آن زمان که دورهٔ آغاز تعصبات ملی و پیدایش "ناسیونالیسم" در اروپا بود، گوته این مرحله را پشت سر گذاشته و طرفداری از اصل بشریت میکرد که بعقیدهٔ او پیدایش یک ادب جهانی (Weltliteratur) مقدمه و لازمهٔ آن بشمار میرفت. گوته در این راه با اختلاف فرهنگ و تمدن و طرز فکر و عادات و رسوم و مذهب و سایر جدائیهای ملل مختلف جهان مواجه بود، با این وصف در سراسر دیوان از تذکر این نکته ننشست که "شرق و غرب از هم جدانیستند و باید خواه و ناخواه بهم نزدیک شوند" زیرا این نکته اساس فلسفهٔ "بشری و جهانی" او بود. گوته در ایجاد این "ادب جهانی" بجز سه رشتهٔ بزرگ ادب اروپا یعنی ادب فرانسه و آلمان و انگلستان، شرکت ادب اسپانیا و ایتالیا و نیز ادب قرون وسطی را لازم میشمرد، و مهمتر از آن پیوسته تاکید میکرد که "باید در را کاملا گشود تا بزرگترین شعرای شرق یعنی حافظ و سعدی نیز دراین بزم شرکت جویند." وی بار ها از مردان نیک اندیش و آزاد فکر جهان دعوت کرد که خود را در چهار دیواری "ملیت" زندانی نکنند، بلکه بکوشند تا روح خویش را بدان حد که "جمال پرستی بشری" اقتضا میکند بالا برند و ادبی بوجود آورند که سه هزار سال پیشرفت ذوق و هنر بشری را شامل شود.

نکتهٔ برجسته دیگر در دیوان گوته مبارزهٔ او باتعصبات خشک اجتماعی و مذهبی است. گوته که هنگام سرودن قطعات دیوان دوران کمال پختگی و رشد فکری خود را میگذرانید در این اثر خود کوشیده است تامثل حافظ با این نوع تعصبات خشک ستیزد، بجای حکومت تعصب از حکومت "منطق و احساسات عالی بشری" دفاع کند. در این باره دو نکته در دیوان بسیار جلب توجه میکند: یکی این نظر گوته که برای هر کس داشتن یک "اعتقاد" معین کافی است و صورت ظاهر این اعتقاد هیچ اهمیت ندارد، چنانکه در تأیید این نظر میگوید: "اگر معنی

اسلام سپردن کارها بدست خداوند و تسلیم در برابر ارادهٔ اوست، ما همه مسلمان هستیم و مسلمان نیز میمیریم" و در قطعهٔ دیگر که انتشار آنرا در دوران حیات خود صلاح ندید، به معشوقهٔ خویش ماریان یا "زلیخا" که صلیبی از سینه آویخته بود بالحنی عتاب آمیز میگوید : "این نشان ناخوشایند دو گانگی خداوند را که دیدارش مایه آزردن منست کنار بگذار!"

نکتهٔ دوم توجه و علاقهٔ خاص گوته به آئین "مهر پرستی" ایرانیان باستان است. گوته هم در متن کتاب "پارسی نامه" و هم مخصوصا در "شرح و توضیحات" دیوان باستایشی خاص از علاقهٔ پارسیان به مهر درخشان که "مظهر فروزان حیات و پاکی و زیبائی و صفا است" سخن میگوید و تاکید میکند که "در همهٔ عمر باختلاف و کشاکش بین دو دنیای نور و صفا و نظم و کوشش از یکطرف و تاریکی و آلودگی و توحش و جهل از طرف دیگر توجه داشتم."

در تاریخ ۱۱ مارس ۱۸۳۲ یعنی اندکی پیش از مرگ، گوته به اکرمان (Eckermann) دوست صمیمی خودش چنین اعتراف میکند : "درنهاد من همیشه یک حس بارز مهر پرستی مخمر بوده هر بار که خورشید را دیدم باهمان ستایش و احترامی بدان نگریستم که نسبت بشخصیت مسیح در خود احساس میکنم، زیرا خورشید نیرومندترین و عالیترین مظهر جمال ازلی خداوندی است که خاک نشینان میتواند دید. من باستایش خورشید و نور قدرت خلاقه خداوند را میستایم که توسط مهر فروزان بما و جملهٔ حیوانات و نباتات روی زمین نیروی زندگی و حرکت عطا میکند." همین ستایش مشتاقانهٔ خورشید و روشنائی بود که گوته را واداشت تادر آخرین لحظه زندگانی خود برخلاف رسم دیرین کلیسا، سراغ "نور" بگیرد و حیات خویش را با این جملهٔ تاریخی پایان دهد : "پنجره را بگشائید تا نور بیشتر بتابد. باز هم. بازهم".

شاید بتوان گفت که ازین حیث نیز ارتباط بسیار نزدیکی بین گوته و حافظ وجود داشت، زیرا این روح علاقه بمهر و مهر پرستان در اشعار حافظ شیراز کاملا نمودار است (رجوع بتحقیق جامعی که دوست دانشمندم آقای یکتائی در مقدمهٔ

حافظ خود درین باره کرده اند)۔

* * * * *

"دیوان غربی و شرقی" شامل دوازده "کتاب" است که گوته همهٔ آنها را باسامی فارسی یا شرقی که در ایران معمول است نامیده۔ این اسامی طبق تقدم و تاخر کتابها در دیوان چنین است: مغنی نامه، حافظ نامه، عشق نامه، تفکیر نامه، رنج نامه، حکمت نامه، تیمور نامه، زلیخا نامه، ساقی نامه، مثل نامه، پارسی نامه، خلد نامه۔

در ترجمهٔ حاضر دیوان، چهار کتاب "حکمت نامه، تفکیر نامه، رنج نامه و مثل نامه" که شبیه هم و از نوع هم هستند در یکجادر آخر کتاب قرار داده شده اند۔ قطعاتی که بعد از مرگ گوته از روی یادداشتهای خطی با سایر آثار او ضمیمهٔ دیوان گشته نیز هریک بکتابی که مربوط بدانست در ترجمه منضم شده تا از تقسیم بندی زیادی و بیفایده دوری شده باشد۔ در چاپ مجموعهٔ آثار گوته در وایمار که توسط "بورداخ" تدوین شده و کاملترین کلکسیون آثار گوته است در مورد قطعات اضافی دیوان عیناً بهمین ترتیب رفتار شده است۔

گذشته از متن دیوان که منظوم است، این کتاب شامل قسمتی است بنام "توضیحات و اطلاعات برای روشن شدن دیوان غربی و شرقی"(۲) که به نثر نوشته شده و بسیار مفصل است، چنانکه بیش از نیمی از تمام دیوان را شامل میشود و از اندازهٔ متن منظوم دیوان کاملا تجاوز میکند۔

این قسمت که جزء دوم "دیوان" بشمار میرودر حقیقت کتاب جداگانه ایست شامل خلاصهٔ تحقیقات ممتد گوته در بارهٔ شرق مخصوصا ایران۔ گوته در این تحقیق و مطالعه دقیق، تاریخ ایران را از قدیمترین ازمنه تا دورهٔ خود نقل میکند وطی این تاریخچه مفصل، جریان تشکیل امپراتوری ایران باستان و پیدایش آئین مهر پرستی و حکومت ساسانیان و حمله اعراب و دوران خلفا و سقوط امپراتوری آنان و رستاخیز ایران و حکومت غزنویان و سلاجقه و مغول و تحولات ادبی و فرهنگی و فکری ایرانیان را شرح میدهد و بعد بمطالعه مفصل در اطراف ادب ایران میپردازد، آنگاه پس از نقل تاریخچه مختصر زندگانی هفت تن شاعر بزرگ ایرانی:

فردوسی، انوری، نظامی، مولوی، سعدی، حافظ و جامی و نظری کلی بادب ایران از دورهٔ جامی تا دوران قاچاریه، باز مطالعه ای اجمالی در وضع ادب و فرهنک ایران در طول قرون میکند- درین قسمت، طی بحث مشروحی دربارهٔ ذوق هنری ملت ایران چنین مینویسد:

".... این خصائص عالی (صفاتی که قبلا برای شعرای بزرک ایران ذکر شده) تنها مال شعرای این کشور نیست، بلکه میتوان گفت که اصولا همه افراد ملت ایران باذوق و نکته سنج و نکته دان و هوشمندند- تاریخ گذشته و داستانهای ملی این کشور خوب نشان میدهد که چگونه گاه شعر یا سخنی دلپذیر که فی البداهه گفته شده، خشم پادشاهی مقتدر رافرو نشانده و جان عده بسیاری را خریده است- ذوق و شوری که خلاق واقعی شعر و هنر است در روح این ملت بحد اعلا وجود دارد، چنانکه بهرام گور و معشوقه اش دلارام، باهمین شوق و هیجان سخن موزون را در زبان فارسی آفریدند- تاریخ شعر ایران پر از نمونه های ذوق و جمال پرستی مردم این سرزمین است".... "اگر در نظر آوریم که انوشیروان ساسانی در زمانی که هنوز محمد در عربستان نخستین سالهای زندگانی خویش را میگذرانید، با مخارج هنگفت هیئتی را بهندوستان فرستاد تا از آنجا افسانه های بید پای و بازی شطرنج را بایران ارمغان آورند روشن میشود که چگونه از دیر باز مظاهر فکر و هنر و ادب در ایران مقامی ارجمند داشته است- این داستانهای بید پای چنانکه از قسمتهای کوچکی از آنها که در اروپا ترجمه شده برمیآید، مجموعه ایست از حکمت و خرد و تجربه که در قالب قصص شیرین در آمده و در آن آزادانه دربارهٔ زندگانی و زشت و زیبای آن قضاوت شده است-"

در مورد "حواشی و اطلاعات مربوط بدیوان غربی و شرقی" نقادان ادب بطور کلی اظهار داشته اند که این نخستین تحقیق کلی و عالمانه ایست که دربارهٔ سیر تحول و تکامل جامعه و فرهنک و ادب ایرانی از ازمنه باستانی تا دوران گوته صورت گرفته، و مسلما جامعتر از آن تا اول قرن نوزدهم یعنی زمان انتشار دیوان تنظیم نشده بود- ازین لحاظ شایسته است که قسمت "شرح و حواشی" دیوان نه بعنوان یک

مکمل، بلکه اصولا بصورت یک اثر مستقل و مجزا مورد مطالعه و استفاده قرار گیرد.

قسمت دیگر ازین "شرح و حواشی" مربوط بیهودیان و اعراب و مطالعه در تورات و اطلاعات دقیق و مهمی است که گوته در نتیجه سالها کوشش و تحقیق دربارهٔ خط سیر و سفر قوم اسرائیل در صحرا بدست آورده است.

یک قسمت دیگر این "حواشی و اطلاعات" شرح سفر سیاحانی است که از قرون وسطی ببعد از اروپا بشرق رفته و سفر نامه هائی از خود بیادگار نهاده اند که گوته خلاصه آنها را نقل کرده. در این قسمت مخصوصا گوته از مارکوپولو، مونته ویلا، پیترو دلاواله، اولئاریوس، تاورنیه، شاردن و دیز نام میبرد و ادبای شرق شناس معاصر خویش مخصوصاها مرو سیلوستر دوساسی رابگرمی میستاید.

یکی دیگر از قسمتهای "شرح و حواشی" دیوان، بحث دراطراف "دیوان آینده" است، زیرا گوته که دیوان خود را خیلی ناقص میپنداشت عقیده داشت که باید در آینده هر کدام از کتابها و فصول "دیوان" بسیار کاملتر و مفصلتر شود تا "جام جهان نمائی" که واقعا دلخواه اوست پدید آید، حتی در مقدمه فصل "دیوان آینده" در "شرح و حواشی" مینویسد که: "اگر برف پیری برسرم ننشسته بود اصلا از چاپ دیوان ناقص کنونی صرفنظر میکردم تا بعد آنرا بصورتی کامل و مفصل انتشار دهم، اما بهتر آن دیدم که برخلاف حافظ وظیفه جمع آوری اشعار خویش را بدیگران نگذارم و خودم آنها را گرد آورم."

اما گوته مکمل دیوان خود را هر گز انتشار نداد، زیرا چنانکه در سال ۱۸۲۷ پس از شنیدن قطعه موزیکی مربوط بیکی از قطعات دیوان بدوست خودش "اکرمان" اظهار داشت: "از آن روحی که دیوان را پدید آورد و هیجانی که خاص آن دوره از زندگانی او بود دیگر چیزی برایش باقی نمانده بود."

بدین ترتیب دیوان گوته منحصر بهمین مجموعه ای شد که خود یکی از عالیترین آثار هنر گوته و ادب اروپاست، و "هاینه" شاعر بزرگ آلمانی در وصف آن گفته است که: "از دریای نیمروز و غروب آفتاب زیباتر و لطیفتر است."

حواشی

۱- ترجمه دیوان حافظ که هامر بچاپ رساند، نخستین ترجمه کامل حافظ در اروپا بود، ولی قبل از آن بزبانهای مختلف لاتینی، فرانسه، انگلیسی، آلمانی وغیره، قسمتهای متعدد از دیوان حافظ در کتابها و مجلات یا بصورت جداگانه چاپ شده بود.

هامر (J. von Hammer) چندین سال در سفارت اتریش در عثمانی کار میکرد و در آنجا بود که زبان و ادبیات فارسی را بخوبی آموخت و به حافظ ارادت یافت. برای آنکه معلوم شود غیر از کتاب وی چاپهای اروپائی دیوان حافظ بچه صورت و کجا انتشار یافته، درج فهرست زیر بیفایده نیست:

چاپهای حافظ در اروپا بزبان فارسی

۱- نخستین چاپ اروپائی دیوان حافظ بزبان فارسی، در سال ۱۸۵۴ در لا بپتسیک توسط Hermann Brockhaus انتشار یافت و این چاپ عنوان "Die Lieder des Hafiz, Leipzig را داشت.

جلد اول این کتاب شامل مقدمه ای بزبان آلمانی درباره حافظ و دیوان و ۸۰ غزل حافظ بزبان فارسی و جلد دوم شامل بقیه غزلهای حافظ بود.

۲- در فاصلهٔ بین ۱۸۵۴ و ۱۸۶۴ Rosenzweig در شهر وین نسخه کاملتری از دیوان حافظ در سه جلد چاپ کرد که علاوه برمتن فارسی غزلیات ترجمه آنها را بشعر آلمانی ضمیمه داشت و عنوان آن چنین بود:

Der Diwan des Grossen Lyrischen Dichters Hafiz. Wien.

۳- در ۱۸۸۱ در کلکته چاپ فارسی و انگلیسی دیوان حافظ توسط H. S. Jarrett Major از روی دو نسخه خطی قدیمی بدون تاریخ انتشار یافت که ۴۴ غزل از چاپهای سابق فارسی حافظ در هندوستان زیاد تر داشت.

ترجمه های منثور و منظوم حافظ در اروپا

نخستین ترجمه دیوان حافظ در خارج از ایران، در قرن دهم هجری در ترکیه

(عثمانی) صورت گرفت' و همچنانکه افتخار ترجمه خیام با فیتزجرالد است' افتخار معرفی حافظ بدنیای خارج از ایران نیز متعلق به "سودی" ادیب و شاعر وزبانشناس ترک است که ترجمه او که همراه متن فارسی غزلیات حافظ انتشار یافت اساس چاپهای فارسی حافظ در آلمان و اتریش و ترکیه و مصر و هندوستان گردید. خود سودی افندی اهل بوسنی بود ولی بادبیات فارسی فوق العاده علاقه داشت' و بدین جهت گذشته از دیوان حافظ گلستان و بوستان سعدی و مثنوی مولانا جلال الدین رومی را بترکی ترجمه کرد. ترجمه حافظ او درسه جلد مفصل و شامل شرح و تفصیل کامل غزلیات و قصاند و رباعیات حافظ است.

در اروپا ترجمه های بسیار از جزء یا کل دیوان حافظ شده ' فهرست قسمتی از این ترجمه ها بدینقرار است:

بزبان لاتینی

۱- F. Meniski در Linguarum Orientalium چاپ وین' سال ۱۶۸۰ (درین کتاب غزل اول و چند غزل دیگر حافظ بنثر لاتین ترجمه شده).

۲- T. Hyde در Syntagma Dissertationum چاپ آکسفرد ۱۷۶۷ (غزل "الا یا ایها الساقی" به نثر لاتینی)

۳- Reviski در Specimen Poeseos Persicae (ترجمه هفده غزل اول دیوان بنثر لاتینی)

۴- W. Jones در جلد دوم آثار خود (ترجمه هفده غزل حافظ بنثر لاتینی).

بزبان آلمانی

آلمان نخستین کشور اروپائی بود که در آن دیوان کامل حافظ ترجمه شد' زیرا بقول شیلر "آلمان عصر جدید روح و هنر خود را در شرق و آثار شرقی جستجو کرده" چندین شاعر آلمانی قرن هیجدهم منجمله Lessing , Wieland, Klinger قطعاتی از آثار شرقی مخصوصا دیوان حافظ را از روی ترجمه Herder بنظم آلمانی در آوردند' ولی ترجمه

"هردر" بعلت آنکه خود او فارسی نمیدانست خیلی ناقص بود.

ترجمه های کاملتر حافظ از زبان فارسی' بدینقرار است:

۱- ترجمه Wahl از بعضی از قصائد و غزلهای حافظ' بنام

Neue Arabische Anthologie: Leipzig 1797

۲- ترجمه von Hammer نخستین ترجمه کامل دیوان حافظ در اروپا چاپ وین' سال ۱۸۱۲ (این همان ترجمه ایست که گوته از روی آن باحافظ آشنائی یافت و نیچه و بسیاری دیگر از بزرگان آلمان و اروپا نیز توسط آن حافظ را شناختند).

۳- F. Rueckert ترجمه مثنوی مولوی و بعضی از غزلهای حافظ بشعر آلمانی.

۴- Platen ترجمه عده ای از غزلهای حافظ بشعر آلمانی بارعایت بحور و قوافی و اوزان فارسی بنام:

Nachbildungen aus dem Diwan des Hafis

(این اثر عالی ادبی فقط ۴۵ سال بعد از مرگ مؤلف' یعنی در سال ۱۸۸۰ انتشار یافت).

۵- Kozenzweig - Schwannau ترجمه کامل دیوان حافظ بنظم آلمانی باحفظ وزن و قافیه شعر فارسی' بانضمام اصل فارسی دیوان در سه جلد' چاپ وین' در سالهای ۱۸۵۶ تا ۱۸۶۴

۶- G. F. Daumer ترجمه قسمتی از غزلهای حافظ هامبورک سال ۱۸۴۶ و نورنبرک سال ۱۸۵۴

۷- Nesselmann منتخبات اشعار حافظ - ترجمه بشعر آلمانی تحت عنوان

Der Diwan des Schems - eddin Muhammad Hafis چاپ برلین سال ۱۸۵۶

۸- Bodenstedt منتخبات اشعار حافظ ترجمه به نثر آلمانی چاپ برلین سال ۱۸۸۷

۹- Hans Bethge منتخب غزلیات حافظ.

Nachdichtungen der Lieder des Hafis چاپ لایپتسیک ۱۹۱۰

بزبان فرانسه

۱- J. Carpentier رباعیات حافظ و خیام:

Roubayyat de Hafiz et d' Omar Khayyam پاریس ۱۹۲۱

۲ـ Charles Devilles ترجمه کامل دیوان حافظ :

Les Ghazels de Hafiz پاریس ۱۹۲۲

۳ـ A. Guy ترجمه قسمتی از غزلهای حافظ بشعر فرانسه با حفظ وزن و شکل فارسی :

Hafiz : Les Poèmes érotiques ou Ghazels de

Chams ed Din Mohammed Hafiz en Calque rhytmique

et avec rime à la Persane پاریس ۱۹۲۷

بزبان انگلیسی

۱ـ Richardson در Specimen of Persian Poetry لندن ۱۷۷۴

۲ـ J. Notts قسمتی از غزلهای حافظ بشعر انگلیسی-

Select Odes of Hafiz, rendered into English verse.

لندن ۱۷۸۷ـ

۳ـ W. Ouseley در Persian Miscellanies لندن ۱۷۹۵

۴ـ Poems of Hafiz : J. Hindley لندن ۱۸۰۰ـ

۵ـ H. Bicknell منتخباتی از دیوان حافظ :

Selections From the Diwan لندن ۱۸۷۵

۶ـ W. H. Lowe دو از ده غزل حافظ :

Twelve Odes of Hafiz کیمبریج ۱۸۷۸ـ

۷ـ S. Robinson صد غزل از حافظ ترجمه بنثر انگلیسی :

A Century of Ghazals In Prose لندن ۱۸۷۸ـ

۸ـ Gertrude Bell تنها خانمی که دیوان حافظ را ترجمه کرد :

Poems From the Diwan of Hafiz لندن ۸۹۷ـ

۹ـ Walter Leaf : قسمتهائی از دیوان حافظ :

Versions From Hafiz لندن ۱۸۹۸ـ

۱۰ـ Richard le Gallenne غزلیات حافظ:

Odes From the Diwan of Hafiz نیویورک ۱۹۰۳ـ لندن ۱۹۰۵

کامل ترین ترجمه دیوان حافظ بنثر انگلیسی ترجمه ایست که توسط W. H. Wilberforce Clarke صورت گرفته و در سال ۱۸۹۱ انتشار یافته و از آن پس غالبا تجدید چاپ شده است. درین کتاب مخصوصا تصوف و عرفان حافظ و اصول صوفیگری بتفصیل مورد بحث قرار گرفته.

ترجمه کامل حافظ بنظم انگلیسی ترجمه John Payneاست که در سه جلد تحت این عنوان در سال ۱۹۰۱ منتشر شده:

Hafiz: Poems, now first completely done into English verse from the Persian, in accordance with the Original forms, London 1907 - 3 vols.

دیوان حافظ گذشته از زبانهای فوق در اروپا بزبانهای روسی، ایتالیائی، سوئدی نیز ترجمه شده و شاید ترجمه های دیگر از آن نیز موجود باشد که اطلاعی از آن هار در دست من نیست.

۲ـ Noten und Abhandlungen zu besserem Bestaendnis des West-oestlicher Diwans.

(یوان شرقی گوته، ترجمه دکتر شجاع الدین شفا، مطبوعه تهران ۱۳۲۸ ش)

دکتر سید محمد اکرم "اکرام"

اقبال و گوته

این دو شاعر بزرگ شرق و غرب اگرچه در دو زمان متفاوت زندگی می کردند و از لحاظ نژاد و دین مختلف بودند- باوجود این در بعضی اندیشه های هر دو اشتراک عجیبی ملاحظه می شود و دلیل بارز آن "پیام مشرق" اثر ارزندهٔ اقبال است که وی آن را در جواب "دیوان غربی" گوته نگاشت و از افکار بزرگ او استفادهٔ شایانی کرد و گفت:

صبا به گلشن ویمر سلام ما برسان
که چشم نکته وران خاک آن دیار افروخت(۱)

اقبال دربارهٔ هدف تألیف "پیام مشرق" در مقدمهٔ آن که به زبان اردو است، می نویسد: "منظور از تألیف کتاب نشان دادن حقایق اخلاقی، مذهبی و ملی است که متعلق به تربیت معنوی افراد و ملل می باشد- بین اوضاع آلمان صد سال پیش و شرق کنونی شباهتی وجود دارد- اضطراب درونی ملل جهان که اهمیتش برای ما به سبب این که خود مان مستقیمًا در جریان آن قرار داریم محسوس نیست، مقدمهٔ یک انقلاب بزرگ روحانی و فرهنگی است- جنگ بزرگ اروپا محشری بود که سیستم دنیای قدیم را از هر جهت نابود ساخت و اکنون از خاکستر فرهنگ و تمدن آن طبیعت در اعماق حیات آدم نوی و برای اقامت او جهان نوی را می سازد که نقشهٔ

مبهم آن در نوشته های حکیم اینشتاین و برگسون ملاحظه می شود- اروپا نتائج بیم ناک هدف علمی و اخلاقی و اقتصادی خود را به چشم خود دیده است...

"شرق و بخصوص شرق اسلامی پس از خواب سنگین قرن ها چشم باز کرده است- ملل خاور باید بدانند که زندگی پیرامون خود نمی تواند هیچ گونه انقلابی را برپا سازد مگر این که نخست در درون خودش دگرگونی بوجود آورد و دنیای خارجی نمی تواند پدیدار شود مگر اساس آن اول در ضمیر آدم ها ریخته شود- این اصل قطعی طبیعت که قرآن آن را با کلمات روشن و بلیغ "ان الله لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسهم" بیان کرده است' شامل هر در جنبه فردی و اجتماعی حیات می باشد-"(۳)

اقبال و گوته هر دو از حوادث تاریخی ادوار خود شدیداً متأثر شدند- زمان گوته زمانی آشفته و پراضطراب بود- بویژه پس از شکست ناپلئون و سقوط فرانسه اروپا دو چار وحشت عجیبی گردید- لشکریان روسیه بعضی از کشور های اروپا از جمله آلمان را اشغال نموده و تمدن' فرهنگ' سیاست و اقتصاد آن را به شدت تهدید نمودند- این وضع و خیم و هرج و مرج پی گیر هر کس را نگران ساخت و گوته را هم به وحشت انداخت- او طی نامه ای نوشت:

"با بدبختی فرانسه اکنون روسیه بصورت کشوری بزرگ در آمده است که از این پس با روح وحشیگری و استبداد و خشونت فطری خود اروپای متمدن و فرهنگ و هنر و مدنیت بشری آن را پیوسته تهدید خواهد کرد-"(۴)

این اضطراب بزرگ و نگرانی شدید اثراتی عمیق در ذهن گوته گذاشت- درست همین طور' صد سال بعد دوران اقبال نیز دوران استعمار' اضطراب' آشوب و خونریزی بود- بخصوص از سال ۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ یعنی دوران جنگ جهانی اول سراسر دورهٔ جهانسوزی و آدم کشی بود و می بینیم که اقبال جواب گوته "پیام مشرق" را در همین روز های وحشت انگیز می نوشت- طی نامه ای به سال ۱۹۱۹ به

سید سلیمان ندوی چنین مرقوم داشت:

"در حال حاضر من جواب دیوان یک شاعر غربی را نویسم که نصف آن تمام شده است۔" (۴)

از این عبارت معلوم می شود که اقبال کتاب خود را در دوران جنگ جهانی آغاز کرده بود۔ انگیزهٔ "پیام مشرق" تنها دیوان غربی گوته نبود بلکه هم آهنگی اوضاع وخیم نیز محرکی بود که اقبال و گوته با آن یکسان مواجه شده بودند۔ این اوضاع هر دو شاعر حساس را به وحشت انداخته و آن ها را در غم نوع انسان مبتلا ساخته بود۔

گوته و اقبال هر دو بر علیه تعصب ملی کور کورانه و ناسیونالیسم سخت قیام کردند، زیرا یکی از ریشه های مهم اختلافات همین ناسیونالیسم است که جهان بشری را بر بنای نسب و رنگ و زبان و فرهنگ تقسیم و رشتهٔ وحدت انسانی را پاره پاره کرده است۔ گوته در دیوان خود کوشش بزرگی در راه نابود ساختن تعصبات ملی و تلفیق دادن ملل مختلف کرده است۔ او می خواست همه ملل جهان اختلافات جزئی فرهنگ، عادات، زبان، نژاد و رسوم را فراموش نموده به اصل بشریت بگرایند۔ او بدین منظور تاکید می کرد که باید دایرهٔ ادب را از هر گونه محدودیت پاک کرده و آن را گسترش داد تا جهانی گردد۔ می گوید:

"باید در را کاملاً گشود تا بزرگ ترین شعرای شرق یعنی حافظ و سعدی نیز در این بزم شرکت جویند۔" (۵) در رد تعصبات ملی می گوید:

"شرق و غرب مال خداوند است و شمال و جنوب نیز۔" (۶)

دربارهٔ مقصود و هدف سرودن دیوان شرقی می نویسد: "می خواهم این دیوان را به صورت آئینهٔ دنیا یا جام جهان نما در آورم و در آن شرق و غرب را در کنار هم به بینندگان نشان دهم۔" (۷) باز در این باره می گوید: "آرزو و هدف من این است که با این اثر شرق را با غرب و گذشته را با حال و ایرانی را با آلمانی نزدیک کنم و طرز فکر و آداب مردم این دو سرزمین را باهم آشنا سازم۔" (۸)

قسمت عمدهٔ افکار اقبال نیز شامل جهادی است که بر علیه نظریه های پست

ناسیونالیسم کرده و در کلیهٔ آثار خود احترام آدم را شرط آدمیت و مقصود فرهنگ قرار داده است- سر آغاز "پیام مشرق" این آیه قرآن است: "وللّه المشرق والمغرب" او طی خطابه ای می گوید:

"وحدت معتبر تنها یکی است و آن وحدت فرزندان انسان است که از نژاد و زبان و رنگ فراتر قرار می گیرد- تا وقتی که طوق لعنتی این دموکراسی لسمی و این ناسیونالیسم ناپاک و این امپریالیسم حقیر از هم گسیخته نشود و تا وقتی که انسان از روی عمل خویش مومن به "الخلق عیال اللّه" نگردد و تا وقتی که عقاید پست وطن پرستی جغرافیائی و رنگ و نژاد از بین نرود، انسان مطلقا در دنیا زندگی آبرومندانه ای نخواهد داشت و الفاظ گرانمایهٔ برادری و استقلال و مساوات نام های بی مسمّی خواهد بود- "(۹)

او تعصبات وطن پرستی را که یکی از موجبات فساد و اختلاف بنی آدم است نکوهش می کند و می گوید:

آن چنان قطع اخوت کرده اند
بر وطن تعمیر ملت کرده اند
تا وطن را شمع محفل ساختند
نوع انسان را قبایل ساختند
مردمی اندر جهان افسانه شد
آدمی از آدمی بیگانه شد
روح از تن رفت و هفت اندام ماند
آدمیت گم شد و اقوام ماند(۱۰)

اقبال عقیده دارد که حتی کفر و دین را باید دو حالت معنوی و درونی تلقی کرد و احترام آدم را چه در حالت کفر و چه در حالت ایمان باید ملحوظ داشت:

آدمیت احترام آدمی
با خبر شو از مقام آدمی
آدمی از ربط و ضبط تن به تن

برطریق دوستی گامی بزن
بندهٔ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق
کفر و دین را گیر در پهنای دل
دل اگر بگریزد از دل وای دل(۱۱)

او تمام برتری های رنگی، نژادی، ملی و لسانی را باطل کرده و انسان را بر اصل انسانیت دعوت اتحاد می نماید و می گوید:

هنوز از بند آب و گل نرستی
تو گوئی رومی و افگانیم من
من اول آدم بی رنگ و بویم
ازان پس هندی و تورانیم من(۱۲)

اقبال و گوته تعصبات قشری مذهبی را یکسره مردود می شمارند و همواره مبلغ و مفسر وجدان و حقیقت می باشند. هر دو شاعر متفکر اسلام را دین جهانی و جاودانی می شناسند. گوته در رد تعصبات غربی ها سعی بلیغ نموده و در دیوان خود در موارد بسیار بزرگی دین اسلام و ابدیت آن را می ستاید و می گوید: "اگر معنی اسلام سپردن کارها به دست خداوند و تسلیم در برابر ارادهٔ اوست، ما همه مسلمان هستیم و مسلمان نیز می میریم."(۱۳)

گوته در منظومه ای به نام "نغمهٔ محمدؐ" اسلام را دینی کامل و متحرک شمرده که دامن آن از هر گونه غبار کهنگی پاک است و استعداد آن را دارد که در هر زمان خواسته های جامعه اش را بر آورد. گوته در این منظومه تمام مذاهب و ادیان را در مقابل اسلام محدود و ناقص گفته است. اسلام به عقیدهٔ او دینی است که سنن و رسوم بیهودهٔ اقوام قدیم را مردود شناخته و امتیاز های نژادی، لسانی، اقتصادی و ملی را از بین برده جهان بشریت را از اصول مساوات و استقلال برخوردار می سازد. می گوید:

" آن جویبار را نگاه کنید که مانند شعاع ستاره ای روشن از صخره های صاف

بر آمده است- در کودکی قدسیان آن را ماورای ابرها در آغوش خود پرورش دادند-

"جوان و تازه رقص کنان از ابرها بیرون آمده و بر صخره های مرمر افتاده دوباره با آوای خوش به سوی آسمان می رود-

"در دره' او هر جا که پا می نهد گل ها می رویند و سبزه زارها از دم او زندگی می یابند- اما نه دره سرسبز می تواند نگهداردش و نه گل هائی که به زانویش می آویزند و با نگاه محبت آمیز او را خوش آمد می گویند-

"آب های باریک در او می آمیزند و از این پس با شکوه و جلال می گذرد و میدان نیز از آب و تاب او درخشان می شود-

"رودها و جوی ها با همهمهٔ شادی می گویند: برادر! برادر! ما برادران خود را نیز همراه خود پیش خدای خود ببر- ما را نیز به آغوش اقیانوس بی پایان برسان- حیف که ما مشتاقان نتوانیم به آغوش او برسیم- ریگ های تشنهٔ ریگزار و اشعهٔ گرم خورشید خون زندگی ما را می خشکاند- کوهی راه ما را بسته و به صورت دریا چه ای در می آورد- برادر! برادران دشت و برادران کوهساران خود را همراه خود پیش خدای خود ببر-

"بیائید همه بیائید- اکنون او باشکوهی خاص موج زنان پیش می رود و در کشور ها سکهٔ خود را رواج می بخشد- هر جا که پا می نهد شهر ها آباد می شوند-

"جریان آن را کسی نمی تواند متوقف سازد- باشور و هیجان از مناره های منور و کاخ های مرمر می گذرد- هزاران پرچم به اهتزاز آمده قدرت آن را گواهی می دهند' و او با برادران خود و تمام گنج و فرزندان خود نعره زنان به سوی آغوش خدای منتظر خود می رود-" (۱۴)

اقبال این منظومه را به عنوان "جوی آب" ترجمه کرده تا نظر شاعر آلمانی را دربارهٔ اسلام نشان دهد- متن زیبای آن نیز در ذیل درج می گردد:

بنگر که جوی آب چه مستانه می رود
مانند کهکشان بگریبان مرغزار

در خواب ناز بود به گهوارهٔ سحاب
وا کرد چشم شوق به آغوش کوهسار
از سنگریزه نغمه کشاید خرام او
سیمای او چو آئنه بی رنگ و بی غبار
زی بحر بیکرانه چه مستانه می رود
در خود یگانه از همه بیگانه می رود
در راه او بهار پریخانه آفرید
نرگس دمید و لاله دمید و سمن دمید
گل عشوه داد و گفت یکی پیش ما بایست
خندید غنچه و سر دامان او کشید
نا آشنای جلوه فروشان سبز پوش
صحرا برید و سینهٔ کوه و کمر درید
زی بحر بیکرانه چه مستانه می رود
در خود یگانه از همه بیگانه می رود
صد جوی دشت و مرغ و کهستان و باغ و راغ
گفتند : "ای بسیط زمین با تو سازگار
ما را که راه از تنک آبی نبرده ایم
از دستبرد ریگ بیابان نگاه دار
وا کرد سینه را به هوا های شرق و غرب
در بر گرفته همسفران زبون و زار
زی بحر بیکرانه چه مستانه می رود
با صد هزار گوهر یک دانه می رود
دریای پر خروش ز بند و شکن گذشت
از تنگنای وادی و کوه و دمن گذشت
یکسان چو سیل کرده نشیب و فراز را

از کاخ شاه و باره و کشت و چمن گذشت
بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بیقرار
در هر زمان بتازه رسید از کهن گذشت
زی بحر بیکرانه چه مستانه می رود
در خود یگانه از همه بیگانه می رود(۱۵)

اقبال نیز اسلام را تنها دینی می شناسد که دین انسانیت است و می تواند جامعهٔ انسانی را در زندگی مادی و معنوی کاملاً رهبری نماید و اقوام و ملل مختلف جهان را متحد ساخته پیش ببرد- او طی خطابه ای می گوید:

"اگر هدف جهان بشری برقراری امن و صلح جوامع مختلف انسانی باشد و بتواند هیئت های اجتماعی موجود را دگرگون نموده یک سازمان وسیع اجتماعی ایجاد کند، بجز نظام اسلام نظام دیگری نمی تواند در دامنهٔ اندیشه جای گزین گردد، زیرا از روی آنچه من از قرآن درک کرده ام اسلام تنها فراخوانندهٔ اصلاح اخلاقی بشر نیست، بلکه در زندگی اجتماعی بشر خواهان یک انقلاب تدریجی و در عین حال اساسی نیز می باشد که هدف ملی و نژادی آن را یکسر تغییر داده و در ضمیر انسانیت صرف را تولید می نماید- تاریخ ادیان علناً گواهی می دهد که در ادوار قدیم دین ملی بود چنان که دین یونانی ها و هندی ها، سپس نژادی گردید چنان که دین یهودی ها- مسیحیت تعلیم داد که دین انفرادی و شخصی است و در نتیجهٔ آن در قارهٔ بدبخت اروپا بحثی بدین مضمون شروع شد که دین نام عقاید شخصی است، بنا براین متضمن زندگی اجتماعی بشر فقط دولت است- این اسلام بود که نوع بشر را نخستین بار پیامی به این شرح داد که دین نه ملی است و نه شخصی، بلکه صرفاً انسانی است و هدف آن باوصف کلیهٔ امتیاز های طبیعی این است که جهان بشریت را متحد و منظم سازد- "(۱۶)

گوته و اقبال هر دو به جاودانگی بشر ایمان دارند و معتقدند که زندگی همواره جویای راه های تکامل است و بعد از مرگ نیز بسوی ابدیت می رود- سیل حیات از

موانع متوقف نمی گردد بلکه آن ها را به وسیلهٔ کوشش و عمل از بین برده و تندتر و سریع تر پیش می رود- به عبارت دیگر حیات مدیون اضداد است و تکامل آن بدون اضداد و موانع امکان پذیر نیست' چه نور بدون ظلمت و خیر بدون شر متمایز نمی گردد- از این جهت گوته و اقبال هر دو وجود شیطان را در پیشرفت و تکامل حیات انسانی لازم و نقش او را فوق العاده مهم می دانند- بدون شیطان زیبائی فطرت انسان و ممکنات وجود او آشکار نمی شود- این فکر را گوته در نمایشنامهٔ خود "فاؤست" بنحوی بسیار زیبا جلوه گر ساخته است- وقتی که فاؤست شیطان را ملامت می کند' او در پاسخ می گوید:

"ای فرزند مجبور زمین!تو بدون کمک من چگونه می توانستی زندگی کنی؟ و سوز و ساز و شور و هیجان که برای زندگی لازم است از کجا می آوردی؟ اگر من نبودم تو از جهان فرار می کردی و خسته و مانده به غار ها پناه می بردی و یا مانند جغدی روی سنگ لرزجی می نشستی- "(۱۷)

اقبال در اغلب آثار خود وجود شیطان را که دشمن سرسخت انسان است- در پیشرفت زندگی سنوده است و بدون شر و شور او زندگی را شایسته نمی داند و می گوید:

مزی اندر جهانی کور ذوقی که یزدان دارد و شیطان ندارد

و باز در این بیت زیبا:

موسیٰ و فرعون و شبیرؓ و یزید این دو قوت از حیات آید پدید(۱۸)

در منظومهٔ "تسخیر فطرت" می گوید- وقتی که خدا آدم را از خاک آفرید برای بزرگداشت او فرشتگان را فرمان داد تا به آدم سجده کنند- ابلیس انکار کرد و اهمیت نقش خود را در ارتقای ذات انسان چنین بیان کرد:

نوری نادان نیم' سجده به آدم برم
او به نهاد است خاک' من به نژاد آذرم
می تپد از سوز من' خون رگ کائنات
من به دو صرصرم' من غو تندرم

پیکر انجم ز تو، گردش انجم ز من
جان به جهان اندرم، زندگی مضمرم
تو به بدن جان دهی شور به جان من دهم
تو به سکون رهزنی، من به تپش رهبرم
من ز تنک مایگان گدیه نکردم سجود
قاهر بی دوزخم، داور بی محشرم
آدمی خاکی نهاد، دون نظر و کم سواد
زاد در آغوش تو، پیر شود در برم(۱۹۳)

گوته معتقد است که زندگی بعد از مرگ نیز همواره پیش می رود و رشته او قطع نمی گردد. زندگی از خوب جویای خوب تر است و هر گز به مقامی قانع نمی شود. مانند راهروی است که منزلی را نمی شناسد و پویای راه ابدیت است. گوته این اندیشه را در منظومه ای به نام "حور و شاعر" بیان داشته و اقبال آن را ترجمه کرده است. شاعر به بهشت جاودان داخل می شود ولی در آن جا به حور و جام شراب وغیره اعتنائی نمی کند. حور از او می پرسد که چرا به من که با این همه زیبائی و جمال در اختیار تو هستم توجهی نمی کنی؟ شاعر در پاسخ می گوید:

چه کنم که فطرت من به مقام در نسازد
دل ناصبور دارم چو صبا به لاله زاری
چو نظر قرار گیرد به نگار خوبروئی
تپد آن زمان دل من پی خوب تر نگاری
ز شرر ستاره جویم، ز ستاره آفتابی
سر منزلی ندارم که بمیرم از قراری
چو ز بادهٔ بهاری قدحی کشیده خیزم
غزلی دگر سرایم به هوای نوبهاری
طلبم نهایت آن که نهایتی ندارد
به نگاه ناشکیبی، به دل امیدواری

دل عاشقان بمیرد به بهشت جاودانی
نه نوای دردمندی نه غمی نه غمگساری(۲۰)

غالب دهلوی نیز دربارهٔ زندگی تقریباً همین نظر را دارد. او زندگی را که در آن مانع و مزاحمی نباشد نمی پذیرد. از این رو بهشت جاودانی را برای خود زندان وحشت ناکی تصور کرده ازان خواهان نجات است. می گوید:

در آن پاک میخانهٔ بی خروش
چه گنجایش شورش نای و نوش
سیه مستی ابر و باران کجا؟
خزان چون نباشد بهاران کجا؟
چه منت نهد ناشناسا نگار؟
چه لذت دهد وصل بی انتظار؟
گریزد دم بوسه اینش کجا؟
فریبد به سوگند دینش کجا؟
برد حکم و نبود لبش تلخ گوی
دهد کام و نبود دلش کام جوی
نظر بازی و ذوق دیدار کو؟
به فردوس روزن به دیوار کو؟
به بند امید استواری فرست
به غالب خط رستگاری فرست(۲۱)

اقبال در نتیجهٔ این همفکری، غالب را در منظومه ای(۲۲) همنوای گونه قلمداد کرده است، زیرا هر دو شاعر مسیر حیات را در حالت کنونی آن دوست دارند و موانع و مخاطرات را در راه ارتقا و تکامل لازم می دانند.

گونه و اقبال هر دو از محیط غرب که سراسر آن بر مادیت پی ریزی شده و از روحانیت اثری نداشته متنفر بودند. می دانیم که انقلاب فرانسه اثرات بسیار

مفیدی در زندگی مردم اروپا گذاشت و نیروی عجیبی برای پیشرفت به آن ملل بخشید. اما در عین حال توجه مردم که یکسره به اصول مادی متمرکز شده بود از روحانیت سلب گردید و تمام جامعهٔ اروپا به صورت ماشینی در آمد و حیثیت فرد که آلتی از آن ماشین بیش نبود سخت مجروح شد. این امر در نظر یک متفکر بزرگ و شاعر حساس مانند گوته یک تباهی درونی بشر بود. جامعهٔ آن روزی که برمادیت مبتنی بود برای گوته نمی توانست تحمل پذیر باشد. از این جهت از آثارش ملاحظه می شود که روحیهٔ او سخت آزرده و جویای گریز گاهی در جهان [illegible] از طرف دیگر رمان او از لحاظ سیاسی و اجتماعی بسیار آشفته بود. بنابر این گونه از هرج و مرج و آشفتگی اوضاع و تعصبات و ریاکاری مردم متنفر و بیزار و در جستجوی آرامش عمیقی بود، اما محیط مشوش اروپا نمی توانست این آرامش روحی را به او بدهد. بنابر این متوجه شرق گردید و در این مورد گفت:

"شرق در واقع تریاکی است که من در این دوران پرجنجال برای تخدیر روح خویش بکار می برم." (۲۳)

گوته از محیط مکدر و مسموم اروپا به ستوه آمده و به سرزمین های روشن و روح پرور شرق پناه فکری برد. هاینه یک شاعر اسرائیلی می نویسد:

"دیوان غربی شاهد آن است که غرب از روحانیت ضعیف و سرد خود بیزار گشته جویای حرارت از سینهٔ شرق می باشد." (۲۴)

گوته دیوان شرقی خود را به عنوان "هجرت" آغاز نموده و می گوید: "شمال و غرب و جنوب پریشان و آشفته اند. تاج ها درهم می شکنند و امپراتوری ها می لرزند. بیا از این دوزخ بگریز و آهنگ شرق دلپذیر کن، تا در آن جانسیم روحانیت بر تو وزد و در بزم عشق و می، آواز و آب خضر جوانت کند...

"بیامن نیز رهسپار دیار شرقم تا در آن جا با شبانان در آمیزم و همراه کاروان های مشک و ابریشم سفر کنم.

"ای حافظ در این سفر دور و دراز، در کوره راه های پرنشیب و فراز، همه جا نغمه های آسمانی تو رفیق راه و تسلی بخش دل ماست..." (۲۵)

گوته خود را یک شاعر ایرانی تصور کرده که به آلمان تبعید شده است. می گوید: "ای فردوسی، ای جامی، ای سعدی، برادر شمادر زندان غم اسیر و برای گل های شیراز بی قرار ستم" (۲۶)

اقبال بزرگ ترین شاعر عصر حاضر است که برضد مادی گری جهاد کرد. همان طور که منفی بافی های تصوف را مورد انتقاد قرار داد، تمایلات ماده پرستی غرب را نیز مردود و مطرود دانست. بیشتر آثار او از انتقاد بر تمدن غرب مشحون است. فرنگ زیرکی را دارد ولی عشق را نمی شناسد فقط به ظاهر توجه دارد، باطن را نمی بیند. ایمان، عرفان، عفت، صفا و عشق برای فرنگ لغاتی نامفهوم اند.

درقسمت آخر "پیام مشرق" بخشی از غزل های مسلسل به عنوان "پیام" است که در آن اقبال وجدان و معنویت را در زندگی ناگزیر دانسته و عشق را درمان درد های روح انسان بیان کرده است. به دانای فرنگ می گوید:

از من ای باد صبا گوی به دانای فرنگ
عقل تا بال گشود است گرفتار تر است
برق را این به جگرمی زند آن رام کند
عشق از عقل فسون پیشه جگردار تر است
چشم جز رنگ گل و لاله نبیند ورنه
آنچه در پردهٔ رنگ است، پدیدار تر است
عجب آن نیست که اعجاز مسیحا داری
عجب این است که بیمار تو بیمارتر است
دانش اندوخته ای دل ز کف انداخته ای
آه زان نقد گرانمایه که درباخته ای
حکمت و فلسفه کاری است که پایانش نیست
سیلی عشق و محبت به دبستانش نیست
بیشتر راه دل مردم بیدار زند
فتنه ای نیست که در چشم سخندانش نیست

دل ز ناز خنک او به تپیدن نرسد
لذتی در خلش غمزهٔ پنهانش نیست
دشت و کهسار نوردید و غزالی نگرفت
طوف گلشن زد و یک گل به گریبانش نیست
چاره این است که از عشق گشادی طلبیم
پیش او سجده گناریم و مرادی طلبیم
عقل چون پای درین راه خم اندر خم زد
شعله در آب دوانید و جهان برهم زد
کیمیا سازی او ریگ روان را زر کرد
بر دل سوخته اکسیر محبت کم زد
وای بر سادگی ما که فسونش خوردیم
رهزنی بود، کمین کرد و ره آدم زد
هنرش خاک برآورد ز تهذیب فرنگ
باز آن خاک به چشم پسر مریم زد
شرری کاشتن و شعله درودن تاکی
عقده بر دل زدن و باز گشودن تاکی(۲۷)

اقبال و گوته هر دو شدیداً تحت تأثیر ادبیات فارسی قرار گرفته اند. گوته نسبت به حافظ عشق و علاقهٔ عجیبی داشته و سخن او را همچون ابدیت بزرگ دانسته است. در سال ۱۸۱۴ وقتی ترجمهٔ دیوان حافظ بوسیلهٔ هامر به دستش رسید، از مطالعهٔ آن حالت فوق العاده ای در او ایجاد شد و به قول خودش:

"بااثری مواجه شده که تا آن روز نظیر آن ندیده است." (۲۸) باز دربارهٔ آن می نویسد: "ناگهان با عطر آسمانی شرق و نسیم روح پرور ابدیت که از دشت ها و بیابان های ایران می وزید آشنا شدم و مرد خارق العاده ای را شناختم که شخصیت عجیبش مرا سراپا مجذوب خویش کرد." (۲۹)

تأثیر حافظ در گوته را باید از جهات مختلف بررسی نمود. اگر به دور نمای

آشفتهٔ سیاسی و اجتماعی عصر هر دو شاعر بزرگ و پریشانی ها و نابسامانی های ملل آن ها نگاه کنیم می بینم که هر دو از قتل، غارت، وحشیگری، ریاکاری، دروغ، فساد و فتنه آزرده و متنفر شده گوشه ای آرام می جستند- حافظ در این غزل شیوا:

دو یار زیرک و از بادهٔ کهن دو منی
فراغتی و کتابی و گوشهٔ چمنی
من این مقام بدنیا و آخرت ندهم
اگرچه در پیم افتند هردم انجمنی
هر آن که کنج قناعت به گنج دنیا داد
فروخت یوسف مصری به کمترین ثمنی
بیا که رونق این کارخانه کم نشود
بزهد همچو توئی یا بفسق همچو منی
ز تند باد حوادث نمی توان دیدن
درین چمن که گلی بوده است یا سمنی
ببین در آینهٔ جام نقش بندی غیب
که کس بیاد ندارد چنین عجب زمنی
ازین سموم که بر طرف بوستان بگذشت
عجب که بوی گلی هست و رنگ نسترنی
مزاج دهر تبه شد درین بلا حافظ
کجاست فکر حکیمی و رای برهمنی[۳۰]

اگرچه مانند عصر حافظ و گوته، عصر اقبال نیز بسیار وحشت ناک بود، اما او به اقتضای روحیهٔ خود گوشه ای را نجست بلکه با دوران خود به مبارزه پرداخت و تا واپسین نفس از پا ننشست- او یکی از مجموعه های شعر اردوی خود را تحت عنوان "ضرب کلیم" یعنی اعلامیهٔ جنگ بر علیه عصر حاضر" نوشت- یکی از

مشخصات سبک شعر اقبال همین مبارزه جوئی و سخت کوشی است که او را از اغلب شعرا ممتاز می سازد- مثلاً جائی که می گوید:

با جهان نا مساعد ساختن
هست در میدان سپر انداختن
مرد خودداری که باشد پخته کار
با مزاج او بسازد روزگار
گر نسازد با مزاج او جهان
می شود جنگ آزما با آسمان
بر کند بنیاد موجودات را
می دهد ترکیب نو ذرات را
گردش ایام را برهم زند
چرخ نیلی فام را برهم زند
می کند از قوت خود آشکار
روزگار نو که باشد سازگار
در جهان نتوان اگر مردانه زیست
همچو مردان جان سپردن زندگی است[۳۱]

گوته می خواست آهنگ شرق کند و شهر زیبای شیراز را منزلگه خویش سازد- در نتیجهٔ همین احساسات، با کمال عشق و علاقه دیوان خود را که یکی از شاهکار های ادبیات آلمانی است نگاشت و آن را با مراجعهٔ دائم به دیوان حافظ تنظیم نمود- بیل شوسکی می گوید: "گوته در ترانه های حافظ عکس خود را می دید و گاهی چنان احساس می کرد که شاید روح او در پیکر حافظ آمده و در سرزمین شرق زندگی می کرده است-"(۳۲)

اقبال اگرچه افکار حافظ را نپذیرفت، اما سخت تحت تأثیر هنر او قرار گرفت تا آن جا که گفت: "وقتی که ذوق من به هیجان می آید روح حافظ در من حلول

می کند و من خودم حافظ می شوم." (۳۳)

در نتیجهٔ تأثیر سبک حافظ می بینیم که اقبال بسیاری از غزل های خود را به پیروی از حافظ و در جواب او سروده است. تعداد این گونه غزلیات حتی بیشتر از غزل هائی است که او به استقبال مرشد معنوی خود مولانا جلال الدین سروده است. در "پیام مشرق" تحت عنوان "می باقی" غزل هائی ملاحظه می شود که از لحاظ زبان و بیان و سایر مختصات لفظی و هنری به غزل های لسان الغیب بسیار نزدیک اند. و اقبال این لزوم را جهت آن داشته است که او "پیام مشرق" را در جواب گوته که عاشق و شیفتهٔ حافظ بود می سرود. بنابراین اقبال سبک حافظ را در این جواب کاملاً رعایت کرده است. خود ترکیب "می باقی" نیز مقتبس از این شعر معروف حافظ است:

بده ساقی می باقی که در جنت نخواهی یافت
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلّی را (۳۴)

اقبال نوای خودش را از شهر حافظ سر داده و چنین گفته است:

تنم گلی ز خیابان جنت کشمیر
دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است (۳۵)

همان طور که گوته می خواست دیوان ارزشمند خود را به صورت جام جهان نمائی در آورد و تعصبات نژادی، لسانی و فرهنگی ملل مختلف را از بین برده آن ها را بهم نزدیک سازد، اقبال نیز در "پیام مشرق" در قسمت نقش فرنگ چنین کوششی را بنحوی زیبا بعمل آورده و بعضی از شاعران و متفکران بزرگ شرق و غرب را در مجالس فکری نزدیک بهم نشانده است. مثلاً در این قطعهٔ شعر مولوی و گوته را در بهشت در حال گفتگو نشان داده است و نیز این که هر دو توافق فکری دارند:

نکته دان المنی را در ارم
صحبتی افتاد با پیر عجم

شاعری کو همچو آن عالی جناب
نیست پیغمبر ولے دارد کتاب
خواند بر دانائے اسرار قدیم
قصهٔ پیمان ابلیس و حکیم
گفت رومی: ای سخن را جان نگار
تو ملک صید سنی و یزدان شکار
فکر تو در کنج دل خلوت گزید
این جهان کهنه را باز آفرید
سوز و ساز جان به پیکر دیده ای
در صدف تعمیر گوهر دیده ای
هر کسی از رمز عشق آگاه نیست
هر کسی شایان این درگاه نیست
"داند آن کو نیکبخت و محرم است
زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است"(۳۶)

همچنین اشعاری به عنوان "شعرا" مجلسی است که شامل برونینگ و بایرون و غالب و مولوی می باشد- در این اشعار نظریات هر چهار شاعر بزرگ را دربارهٔ زندگی با کمال ایجاز بیان می کند:

برونینگ:

بی پشت بود بادهٔ سرجوش زندگی
آب از خضر بگیرم و در ساغر افگنم

بایرون:

از منت خضر نتوان کرد سینه داغ
آب از جگر بگیرم و در ساغر افگنم

غالب:

تا باده تلخ تر شود و سینه ریش تر

بگذارم آبگینه و در ساغر افگنم

رومی:

آمیزشی کجا' گهر پاک او کجا
از تاک باده گیرم و در ساغر افگنم(۳۷)

اقبال این گونه قطعات متعدد سروده و در ضمن بیان اندیشه های متفکران مختلف سعی کرده است آن ها را بهم نزدیک سازد و در نتیجه مانند گوته یک ادب جهانی به وجود بیاورد و ملل گوناگون را از تنگنای تعصبات ملی و لجهٔ ناسیونالیسم بیرون کشد. تلاش هائی که جهت اتحاد بنی نوع آدم اقبال و گوته انجام داده اند الحق کوشش هائی بزرگی برای نجات جهانیان است.

اقبال خود را با گوته مقایسه کرده و می گوید:

او ز افرنگی جوانان مثل برق
شعلهٔ من از دم پیران شرق
او چمن زادی' چمن پرورده ای
من دمیدم از زمین مرده ای
او چو بلبل در چمن "فردوس گوش"
من بصحرا چون جرس گرم خروش
هر دو دانای ضمیر کائنات
هر دو پیغام حیات اندر ممات
هر دو خنجر صبح خند' آئینه فام
او برهنه' من هنوز اندر نیام
هر دو گوهر ارجمند و تاب دار
زادهٔ دریای ناپیدا کنار
او ز شوخی در ته قلزم تپید
تا گریبان صدف را بر درید
من به آغوش صدف تابم هنوز

حواشی

۱- پیام مشرق، لاهور، ۱۹۴۶ء، ص ۱۸۴۔

۲- ایضاً مقدمہ صفحہ ک، م۔

۳- دیوان شرقی گوئٹہ ترجمہ دکتر شجاع الدین شفا، تہران ۱۳۲۸ ھ ش، ص ۱۷ ۔

۴- اقبالنامہ، جلد اول لاہور، ص ۱۰۷ ۔

۵- دیوان شرقی، ص ۲۷۔

۶- ایضاً ص ۴۰ ۔

۷- ایضاً ص ۲۵ ۔

۸- ایضاً ص ۲۶ ۔

۹- اقبال در راہ مولوی، سید محمد اکرم، لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۲۴۴ ۔

۱۰- رموز بیخودی، لاہور ۱۹۶۴ء، ص ۱۳۳ ۔

۱۱- جاوید نامہ، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۲۴۲ ۔

۱۲- پیام مشرق، ص ۹۱ ۔

۱۳- دیوان شرقی ص ۲۸ ۔

۱۴- Iqbal Review, Karachi, April 1969, pp. 18-19

۱۵- پیام مشرق، ص ۱۵۱ - ۱۵۲ ۔

۱۶- اقبال در راہ مولوی، ص ۲۴۷، ۲۴۸ ۔

۱۷- فاؤست، گوئٹہ، ترجمہ فضل حمید بہاولپور ۱۹۶۴ء، مقدمہ

۱۸- اسرار و رموز، لاہور ۱۹۶۴ء، ص ۱۲۷ ۔

۱۹- پیام مشرق، ص ۹۷، ۹۸ ۔

۲۰- پیام مشرق، ص ۱۴۸ ، ۱۴۹ ۔

۲۱- کلیات غالب، لاہور ۱۹۶۵ء، ص ۱۶۳، ۱۶۴ ۔

۲۲- رک: بانگ درا، لاهور ۱۹۷۴ء، ص ۲۶ -

۲۳- دیوان شرقی، ص ۱۵ -

۲۴- پیام مشرق، صفحه الف-

۲۵- دیوان شرقی، ص ۳۸، ۳۹ -

۲۶- پیام مشرق، مقدمه صفحه ی-

۲۷- ایضاً، ص ۲۲۵ - ۲۲۸ -

۲۸- دیوان شرقی، ص ۱۹ -

۲۹- ایضاً ص ۲۱ -

۳۰- دیوان حافظ، تهران ۱۳۳۷، ص ۳۳۶، ۳۳۷ -

۳۱- اسرار و رموز، لاهور ۱۹۶۴ء، ص ۵۵ -

۳۲- پیام مشرق، مقدمه صفحه ۵۵ -

۳۳- اقبالنامه، جلد دوم، لاهور، ص ۱۰۶ -

۳۴- دیوان حافظ، ص ۱۹ -

۳۵- پیام مشرق، ص ۲۱۴

۳۶- ایضاً، ص ۲۴۶، ۲۴۷

۳۷- ایضاً ص ۲۵۲ -

۳۸- ایضاً، ص ۲۷۲ -

(در : یاد نامهٔ اقبال- بمناسبت یکصدمین زاد روز شاعر و فیلسوف مشرق علامه محمد اقبال- بکوشش بهاء الدین اورنگ، لاہور : خانه فرہنگ ایران، ۱۳۵۷ ش/۱۹۷۸ عیسوی، ص ۱۰۳ - ۱۲۱)

دکتر سید محمد اکرم "اکرام"

حافظ، گوته و اقبال

از سخنان اقبال این نکته روشن می شود که او مسائل دینی، عرفانی، سیاسی، فلسفی و ادبی را دقیقاً مطالعه کرد و اندیشه های خود را روی تجربه ها و مشاهده ها پی ریزی نمود- او سر گذشت ملل شرق و غرب را با دقت نظر بررسی کرد- از حکیمان غرب درس فلسفه را یاد گرفت و از مرشد ان شرق اسرار حققیت را آموخت- می گوید:

خرد افزود مرا درس حکیمان فرنگ
سینه افروخت مرا صحبت صاحب نظران[1]

اقبال اگرچه دقایق دانش و حکمت را از هر مکتب جهان تحصیل کرد اما او تنها حکمت هائی را قبول کرد که مطابق تعلیمات قرآنی می باشد- او بسیاری از متفکران، فقیهان، صوفیان، مورخان، ادبیان و شاعران را درهمین میزان معتبر سنجید- بعضی از این دانشمندان و شاعران را مورد توجه خاص قرار داد- از میان این ها یکی حافظ شیرازی است که اقبال نوای خود را از شهر زیبای او شیراز سر داده و می گوید:

تنم گلی ز خیابان جنت کشمیر

دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است(۲)

شاعر معروف دیگر که مورد علاقه او قرار گرفته گوته، دانشمند آلمانی است که اقبال اورا "حکیم حیات" نام داد و احتراما به او سلام فرستاد:

صبا به گلشن ویمر سلام ما برسان
که چشم نکته وران خاک آن دیار افروخت(۳)

گوته و اقبال هر دو شیفته شعر حافظ می باشند و غزل های زیبای او را سر مشق هنر خود قرار می دهند. اقبال می نویسد:

"انگیزه کتاب او پیام مشرق "دیوان غربی" حکیم حیات گوته است"(۴)

اقبال دربارهٔ سبب تألیف دیوان غربی گوته می نویسد:

"سرود های حافظ در تخیلات گوته هیجان بزرگی برپا ساخت که نهایتا موجب پدید آمدن اثری پایدار و استوار به نام "دیوان غربی" گردید."

از دو عبارت فوق معلوم می شود که سرودهای حافظ سبب تألیف "دیوان غربی" گوته شد و سپس دیوان غربی سبب تالیف "پیام مشرق" اقبال گردید.(۵)

بنا براین حافظ باعث تألیف دو اثر مهم ادبی در غرب و شرق شد. اقبال باوجود اختلاف های فکری با حافظ تحت تأثیر هنر اعجاز آور او قرار گرفت و نوشت:

"وقتی که من از حافظ استقبال می کنم روح حافظ در کالبد من حلول می کند."(۶)

باز در جایی در باره هنر شعر حافظ نوشت:

"حافظ در الفاظ زیبائی که مثل گوهر های آبدار می باشند لطافت گلبانگ معنوی بلبل را ضبط کرده است."(۷)

گوته مداح بزرگ شعر حافظ است. اقبال در این مورد از قول بیل شوسکی که نویسنده شرح حال گوته می باشد چنین نقل کرده است:

"گوته تصویر خود را در نغمه بلبل شیراز دیده است. گاه گاه چنان حس می کرد که شاید روح او در کالبد حافظ حلول نموده و در سرزمین شرق زندگی کرده است. همان انبساط زمینی، همان عشق آسمانی، همان

سادگی، همان عمق، همان جنب و جوش، همان بزرگ منشی، همان گشاده دلی و همان آزادی از قیود و رسوم در او وجود دارد. الغرض ما از هر جهت او را نظیر حافظ می بینیم. همان طور که حافظ لسان الغیب و ترجمان الاسرار است، گوته هم هست و همان طور که در کلمات ساده حافظ یک جهان معنی پنهان است، در بی تکلفی شعر گوته نیز حقایق و اسرار به چشم می خورد. هر دو شاعر درمیان طبقه غنی و فقیر محبوبیتی پیدا کردند، هر دو توانستند فاتحان بزرگ عصر خود را تحت تأثیر قرار دهند یعنی حافظ توانست تیمور را و گوته موفق شد ناپلئون را تحت تأثیر قرار دهد. هر دو علیرغم فساد و تباهی دوران خویش موفق به حفظ آرامش روحی خود تا آن جا بودند که توانستند به نغمه سرائی سابقشان ادامه دهند." (۸)

در "پیام مشرق" اقبال تعدادی از غزل هارا در جواب غزلهای زیبای حافظ سرود که از لحاظ بیان نزدیک به سبک حافظ می باشند. یکی از مختصات عمده حافظ این است که او مطالب عشق حقیقی را با مطالب عشق مجازی به نحوی تلفیق داده است که اهل تحقیق تاکنون نتوانستند بدانند که معشوق حافظ آیا معشوق حقیقی است یا مجازی. به همین جهت حافظ درمیان رندان میکده ها به همان اندازه محبوبیت دارد که در خانقاههای صوفیان مورد توجه است.

اقبال درس فلسفه می داد و عاشقی و رزید، او بعضی اندیشه هایی را ابراز کرد که مخصوص خود اوست و از این رو اشعار اقبال از لحاظ معنی با شعر حافظ مختلف می باشد، مثلاً به پیروی این غزل حافظ که مطلعش به قرار ذیل است:

تا که از طارم میخانه نشان خواهد بود
سر ما خاک ره پیر مغان خواهد بود(۹)

اقبال می گوید:

زندگی جوی روان است و روان خواهد بود
این می کهنه جوان است و جوان خواهد بود(۱۰)

اقبال در "پیام مشرق" غزل هایی سروده است که از لحاظ قافیه و ردیف به استقبال حافظ می باشد- این التزام را بدان سبب رعایت داشته که او گوته را که شیفته شعر حافظ بود جواب می نوشت (۱۱) گوته شاعر زبان آلمانی است و در زبان و ادبیات آلمانی صنف سخنی مانند غزل با قافیه و ردیف و استعارات و تشبیهات وجود ندارد، معذ الک گوته برای ابراز احترام و ارادت نسبت به حافظ غزل هایی به زبان آلمانی ساخته که در آنها مثل غزل فارسی قوافی را نیز رعایت کرده است(۱۲) به قول اقبال:

"در یکی دو مورد هم غزلیاتی با رعایت ردیف و قافیه نوشته و استعاره های فارسی مانند گوهر اشعار، تیر مژگان و زلف گره گیر به کار برده است-" (۱۳)

حافظ، گوته و اقبال اگرچه درسه دورهٔ مختلف زندگی کردند اما در ادوار آنها از لحاظ حوادث تاریخی مشابهتی زیاده دیده می شود- دورهٔ حافظ یعنی قرن هشتم هجری دورهٔ پر آشوب و آشفته ای بود- در فارس هیچ حکومت محکم و استواری نبود- جنگ های پیگیر ایران و سپس حمله وحشیانه تیمور سراسر کشور را به خونریزی و بدبختی کشید- شهرها ویران و تخت و تاج موجب نفرت و عبرت گردید، چنان که حافظ گفت:

شکوه تاج سلطانی که بیم جان در و درج است
کلاهی دلکش است اما به درد سر نمی ارزد(۱۴)

زمان گوته یعنی قرن سیزدهم هجری (اوایل قرن نوزدهم میلادی) نیز زمانی بسیار آشفته و وحشت ناکی بود- بخصوص پس از شکست ناپلئون و سقوط فرانسه هرج و مرج زیادی در اروپا رخ داد و سربازان روسی شهر هارا پامال کردند-

صد سال بعد در قرن چهار دهم هجری (اوایل قرن بیستم میلادی) دوران اقبال نیز هلاکت انگیز و ویرانگر بود- استعمار غرب و به ویژه جنگ جهانی اول همه جارا تباه کرد و انسان بی ارزش شد، همان طور که حافظ و گوته در ادوار خود به تنهائی نغمه سرائی کردند اقبال نیز در دوران جنگ جهانی اول مشغول سرودن منظومه

های "پیام مشرق" بود- چنان که در سال ۱۹۱۹م طی نامه یی به سید سلیمان ندوی نوشت:

"من در حال حاضر جواب یک شاعر غربی رامی نویسم که نصف آن تمام شده است-"(۱۵)

این عبارت می رساند که اقبال نوشتن "پیام مشرق" را درست در دوران جنگ جهانی اول شروع کرده بود-

حافظ از اوضاع و خیم عصر خود و قتل و خونریزی مداوم در کشور به ستوه آمده بود- از دست این اوضاع و خیم حتی می خواست از شیراز زیبای خود در جائی دور برود، چنان که گفت:

بیا حافظ که تا خود را به ملکی دیگر اندازیم(۱۶) و نیز این بیت:

آب و هوای فارس عجب شعله پرور است
کو همرهی که خیمه ازین خاک برکنم

حافظ در آن زمان آشفته از شیراز جایی نرفت و به شهر خویش ماند و جهان گذران را تماشا کرد- دل حساس او به پریشانی مردم و بی سرو سامانی کشور خود می سوخت اما با گفتن چنین شعر ساکت می ماند:

رموز مملکت خویش خسروان دانند
گدای گوشه نشینی تو حافظا مخروش(۱۷)

مانند حافظ، گوته نیز از دست ابنای اوضاع زمان پریشان و بیزار بود و خواست جایی دور برود- در این مورد اقبال می نویسد:

"روح بی تاب و بلند پرواز او از هرج و مرج عمومی-" اروپا بیزار شده آشیانه ای در هوای امن و سکون شرق پیدا کرده بود-(۱۸)

گوته در عالم خیال از اروپا آهنگ شرق کرد- چنان که او "دیوان شرقی" را با قطعه شعری به عنوان "هجرت" آغاز کرد و نوشت:

"شمال و غرب و جنوب پریشان و آشفته اند، تاج ها درهم می شکنند و امپراتوری ها می لرزند- بیا از این دوزخ بگریز و آهنگ شرق

دلپذیر کن تا در آن جانسیم روحانیت بر تو وزد و در بزم عشق و می و آواز و آب خضر جوانت کند....."

"بیا من نیز رهسپار این سفرم تا در صفای شرق آسمانی طومار قرون گذشته را در نوردم و آن قدر در دور زمان واپس روم تابه روزگاری رسم که در آن مردمان جهان قوانین آسمانی را با کلمات زمینی از خداوندان فرامی گرفتند.

"بیا من نیز رهسپار دیار شرقم تا در آن جا با شبانان در آمیزم و همراه کاروان های مشک و ابریشم سفر کنم.

"ای حافظ' در این سفر دور و دراز و در کوره راه های پر نشیب و فراز همه جا نغمه های آسمانی تو رفیق راه و تسلی بخش دل ماست. مگر نه راهنمای ما هر شامگاهان با صدائی دلکش بیتی چند از غزلهای شور انگیز تو می خواند تا اختران آسمان را بیدار کند و رهزنان کوه و دشت را بترساند".

"ای حافظ مقدس آرزو دارم که همه جا در سفر و حضر در گرمابه و میخانه با تو باشم و در آن هنگام که دلدار نقاب از رخ برمی کشد و با عطر گیسوان پر شکنش مشام جان را معطر می کند تنها به تو اندیشم تا در وصف جمال دلفریبش از سخنت الهام گیرم و ازین وصف حوریان بهشت را به رشک افگنم" (۱۹)

از این منظومه روشن می شود که گوته از اروپای مشوش و پریشان جویای گریز گاهی بود. به نظر او شرق با آن همه افسانه های عشق و محبت و مهر و مروت که نظامی ها و جامی ها و حافظ ها سرودند بهترین جائی بود که دل او می توانست در آن جا با دلآرامی زیبا آرامشی پیدا کند. او طی نامه ای نوشت:

"شرق در واقع تریاکی است که من در این دوران پر جنجال برای تخدیر روح خویش بکار می برم." (۲۰)

حافظ در دوران او ضاع آشفته عصر خود گوشه ای آرام در چمنی می جوید و در آن می نشیند و دیگران راهم در آن گوشه دعوت می نماید و در این باب می فرماید:

دو یار زیرک و از بادهٔ کهن دو منی

فراغتی و کتابی و گوشه چمنی
من این مقام به دنیا و آخرت ندهم
اگرچه در پیم افتند هر دم انجمنی
هر آن که کنج قناعت به گنج دنیا داد
فروخت یوسف مصری به کمترین ثمنی
بیا که رونق این کار خانه کم نشود
به زهد همچو توئی یا به فسق همچو منی
زتند باد حوادث نمی توان دیدن
درین چمن که گلی بوده است یا سمنی
ببین در آینه جام نقشبندی غیب
که کس به یاد ندارد چنین عجب زمنی
ازین سموم که بر طرف بوستان بگذشت
عجب که بوی گلی هست و رنگ نسترنی
مزاج دهر تبه شد درین بلا حافظ
کجاست فکر حکیمی و رای برهمنی(۲۱)

اگرچه مانند عصر حافظ و گوته عصر اقبال نیز بسیار وحشت ناک بود اما او به اقتضای روحیه ستیزه جوی خود گوشه ای نجست بلکه با دوران سرکش خود به مبارزه پرداخت و تا واپسین نفس از پاننشست- او با نیروهای طاغوتی عصر خود به جنگ پرداخت و بدین منظور یکی از مجموعه های اشعار اردوی خود را "ضرب کلیم" نام گذاشت و زیر آن نوشت: یعنی "اعلان جنگ علیه عصر حاضر"

اقبال اندیشه های مبارزانه خود را چنین بیان کرد:

با جهان نامساعد ساختن
هست در میدان سپر انداختن
مرد خود داری که باشد پخته کار
با مزاج او بسازد روزگار

گر نسازد با مزاج او جهان
می شود جنگ آزما با آسمان
برکند بنیاد موجودات را
می دهد ترکیب نو ذرات را
گردش ایام را برهم زند
چرخ نیلی فام را برهم زند
می کند از قوت خود آشکار
روزگار نو که باشد سازگار
در جهان نتوان اگر مردانه زیست
همچو مردان جان سپردن زندگیست(۲۲)

اقبال "اسرار خودی" را که نخستین اثر اوست با این شعر مولوی شروع کرد:

زین همرهان سست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزو ست(۲۳)

و خود راه شبیر رضی الله عنه را پیش گرفت و گفت:

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست
با من میا که مسلک شبیرم آرزوست(۲۴)

او با اشعار هیجان انگیز و حیات آفرین خود در قالب مرده مردم روح انقلاب دمید و آن ها را بری مبارزه علیه هر نوع جبر و استبداد آماده ساخت و می بینیم که روی اساس همین تعلیمات دینی اقبال بزرگ ترین کشور اسلامی در شبه قاره به وجود آمد. نظرات اسلامی روح پرور اقبال از مرزهای شبه قاره گذشته و به کشورهای همجوار نیز موثر شد و راههائی را برای انقلاب اسلامی هموار ساخت.

در قرن هشتم هجری (قرن چهاردهم میلادی) حمله های خونریز تیمور جهان را خراب کرد و مردم را کشت. حافظ در این زمان قحط الرجال می گفت عالمی نو باید ساخت و آدمی نو باید به وجود آورد تا کاروان زندگی بتواند سفر خود را ادامه دهد:

آدم خاکی بدین عالم نمی آید به دست
عالمی دیگر بباید ساخت و زنو آدمی(۲۵)

در ست مانند حافظ، اقبال با در نظر داشتن آدم کشی های بی حساب در جنگ جهانی اول در مقدمه "پیام مشرق" نوشت:

"جنگ عظیم اروپا محشری بوده که نظام دنیای قدیم را تقریبًا از هر جهت برباد داده است و حالا طبیعت در اعماق زندگی از خاکستر آن تهذیب و تمدن آدمی نو و برای اقامت او عالمی نو می سازد"۔(۲۶)

یکی از انگیزه های مهم نگارش "پیام مشرق" او ضاعی بود که گوته و اقبال تقریبًا یکسان با آن ها مواجه و از حوادث تاریخی خود شدیداً متاثر شدند۔ زمان گوته زمانی آشفته و پر اضطراب بود، به ویژه پس از شکست ناپلئون و سقوط فرانسه اروپا دوچار وحشت عجیبی گردید۔ لشکریان روسیه بعضی از کشور های اروپا از جمله آلمان را اشغال نموده و سیاست و اقتصاد آن را به شدت تهدید نمودند۔ این وضع خراب اروپا گوته را به وحشت انداخت۔ او طی نامه ای نوشت:

"با بدبختی فرانسه اکنون روسیه به صورت کشوری بزرگ در آمده است که از این پس با روح وحشیگری و استبداد و خشونت فطری خود اروپای متمدن و فرهنگ و هنر و مدنیت بشری آن را پیوسته تهدید خواهد کرد۔"(۲۷)

گوته و اقبال هر دو از اوضاع خطرناک نگران شدند۔ بنا بر این برای نزدیک ساختن ملل مختلف به همدیگر قدم برداشتند۔ آنها علیه تعصبات کور کورانه ملی و ناسیونالیسم قیام کردند زیرا یکی از ریشه های مهم اختلافات همین حس ناسیونالیسم است که جهان بشری را بر بنای نسب و رنگ و زبان و زمین تقسیم و وحدت آن را پاره پاره کرده است۔

گوته در دیوان خود کوشش بزرگی در راه نابود ساختن تعصبات ملی و تلفیق دادن ملل مختلف کرده است۔ او می خواست همه ملل جهان اختلافات جزئی فرهنگ، عادات و زبان را فراموش کرده به اصل بشریت بگرایند۔ او بدین منظور

تاکید کرد که باید دائره ادب را گسترش داد تا جهانی گردد- او گفت:

"باید در را کاملاً گشود تا بزرگ ترین شعر ای شرق یعنی حافظ و سعدی نیز در این بزم شرکت جویند-" (۲۸) و باز در رد تعصبات ملی گفت:

"شرق و غرب مال خداوند است و شمال و جنوب نیز-" (۲۹)

درباره مقصود و هدف سرودن دیوان شرقی نوشت:

"می خواهم این دیوان را به صورت آئینه دنیا یا جام جهان نما در آورم و در آن شرق و غرب را در کنار هم به بینند گان نشان دهم-" (۳۰) باز در این باره گفت:

" آرزو و هدف من این است که با این اثر شرق را با غرب و گذشته را با حال و ایرانی را با آلمانی نزدیک کنم و طرز فکر و آداب مردم این هر دو سرزمین را باهم آشنا سازم" (۳۱)

قسمت عمده افکار اقبال نیز شامل جهادی است که او علیه نظریه های پست ناسیونالیسم کرد و در کلیه آثار خود احترام آدم را شرط آدمیت و مقصود کمال فرهنگ قرار داد- او طی خطابه ای گفت:

"وحدت معتبر تنها یکی است و آن وحدت فرزندان انسان است که از نژاد و زبان و رنگ فراتر قرار می گیرد- تاوقتی که طوق لعنتی این دمو کراسی اسمی و این ناسیونالیسم ناپاک و این امپریالیسم حقیر از هم گسیخته نشود و تا وقتی که انسان از روی عمل خویش مومن به "الخلق عیال الله" نگردد و تاوقتی که عقاید پست وطن پرستی جغرافیائی و رنگ و نژاد از بین نرود انسان مطلقاً در دنیا زندگی آبرو مندانه ای نخواهد داشت و الفاظ گران مایه برادری و استقلال و مساوات نام های بی مسمی خواهد بود-" (۳۲)

او تعصبات وطن پرستی را که یکی از موجبات فساد و اختلاف بنی آدم است نکوهش می کند و می گوید:

آن چنان قطع اخوت کرده اند
بر وطن تعمیر ملت کرده اند

تا وطن را شمع محفل ساختند
نوع انسان را قبایل ساختند
مردمی اندر جهان افسانه است
آدمی از آدمی بیگانه است
روح از تن رفت و هفت اندام ماند
آدمیت گم شد و اقوام ماند(۳۳)

اقبال عقیده دارد که حتی کفر و دین را باید دو حالت معنوی تلقی کرد و احترام آدم را چه در حالت ایمان و چه در حالت کفر باید رعایت کرد- می گوید:

آدمیت احترام آدمی
با خبر شو از مقام آدمی
آدمی از ربط و ضبط تن به تن
بر طریق دوستی گامی بزن
بندهٔ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق(۳۴)

او تمام برتری های نژادی، رنگی و ملی و لسانی را باطل قلمداد کرده و انسان را صرفاً بر اصل انسانیت دعوت اتحاد می نماید و می گوید:

هنوز از بند آب و گل نرستی
تو گوئی رومی و افغانیم من
من اول آدم بی رنگ و بویم
ازان پس هندی و تورانیم من(۳۵)

حافظ و اقبال شعرای مسلمان و مبلغ تعلیمات دینی و اخلاقی اسلام می باشند- حافظ اغلب مسائل صوفیانه و حکیمانه را بیان می کند- در صورتی که اقبال بیشتر به مسائل ملی و اجتماعی عصر خود توجه دارد- او سعی می کند عظمت و اصالت فرهنگ اسلامی را شرح دهد و حقیقت آن را بر جهانیان آشکار

سازد- گوته اگرچه مسلمان نیست ولی دین اسلام را به دیده تحسین می نگرد و به عظمت و جاودانگی آن ایمان دارد- می شود گفت که حافظ، گوته و اقبال هر سه شاعر تعصبات قشری مذهبی را مردود می شمارند و همواره مبلغ و مفسر وجدان و حقیقت می باشند- گوته در دیوان خود در موارد بسیار بزرگی دین اسلام و ابدیت آن را می ستاید، جائی که میگوید:

"اگر معنی اسلام سپردن کار ها به دست خداوند و تسلیم در برابر اراده او ست، ما همه مسلمان هستیم و مسلمان نیز می میریم- "(۳۶)

گوته در منظومه ای به نام "نغمه محمدً" اسلام را دینی کامل و متحرک شمرده که دامن آن از هر گونه غبار کهنگی و فرسودگی پاک است و استعداد کامل آن را دارد که در هر زمان خواسته های جدید جامعه را بر آورد- گوته در این منظومه تمام مذاهب و ادیان را در مقابل اسلام محدود و ضعیف گفته است- اسلام به عقیده او دینی است که سنن و رسوم بیهوده اقوام قدیم را مردود شناخته و امتیاز های نژادی و لسانی و اقتصادی را از بین برده جهان بشریت را از اصول مساوات و استقلال برخور دار می سازد- او می گوید:

"آن جویبار را نگاه کنید که مانند شعاع ستاره ای روشن از صخره های صاف بر آمده است- در کودکی قدسیان آن را ماورای ابرها در آغوش خود پرورش دادند-"

"جوان و تازه رقص کنان از ابرها بیرون آمده و بر صخره های مرمر افتاده دوباره با آوای خویش به سوی آسمان می رود-"

"در دره او هر جا که پامی نهد گل ها می رویند و سبزه زار ها از دم او زندگی می یابند- اما نه دره سبز می تواند نگهداردش و نه گل هائی که به زانویش می آویزند و با نگاه محبت آمیز او را خوش آمد می گویند-"

"آب های باریک در او می آمیزند و از این پس با شکوه و جلال می گذرد و میدان نیز از آب و تاب او درخشان می شود-

"رودها و جوی ها با همهمه شادی می گویند: برادر! برادر! ما برادران خود را

نیز همراه خود پیش خدای خود ببر- ما را نیز به آغوش اقیانوس بی پایان برسان- خیف که ما مشتاقان نتوانیم به آغوش او برسیم- ریگ های تشنه ریگزار و اشعه گرم خورشید خون زندگی مارا می خشکاند- کوهی راه مارا بسته و به صورت دریا چه ای در می آورد-

برادر! برادران دشت ها و برادران کوهسار راهمراه خود پیش خدای خود ببر-"

"بیائید همه بیائید- اکنون او باشکوهی خاص موج زنان پیش می رود و در کشور ها سکه خود را رواج می بخشد هر جا که پامی نهد شهرها آباد می شوند-"

"جریان آن را کسی نمی تواند متوقف سازد- باشور و هیجان از مناره های منور و کاخ های مرمر می گذرد- هزاران پرچم به اهتزاز آمده قدرت آن را گواهی می دهند و او با برادران خود و تمام گنج و فرزندان خود نعره زنان به سوی آغوش خدای منتظر خود می رود-" (۳۷)

اقبال این منظومه را به عنوان "جوی آب" ترجمه کرده تا نظر شاعر آلمانی را درباره شوکت دین اسلام نشان دهد- متن زیبای آن نیز در ذیل درج می گردد:

بنگر که جوی آب چه مستانه می رود
مانند کهکشان به گریبان مرغزار
در خواب ناز بود به گهواره سحاب
وا کرد چشم شوق به آغوش کوهسار
از سنگریزه نغمه کشاید خرام او
سیمای او چو آینه بی رنگ و بی غبار
زی بحر بیکرانه چه مستانه می رود
در خود یگانه از همه بیگانه می رود
در راه او بهار پریخانه آفرید
نرگس دمید و لاله دمید و سمن دمید
گل عشوه داد و گفت یکی پیش ما بایست

خندید غنچه و سردامان او کشید
نا آشنای جلوه فروشان سبز پوش
صحرا برید و سینه کوه و کمر درید
زی بحر بیکرانه چه مستانه می رود
در خود یگانه از همه بیگانه می رود
صد جوی دشت و مرغ و کهستان و باغ و راغ
گفتند "ای بسیط زمین با تو سازگار
مارا که راه از تنک آبی نبرده ایم
از دستبرد ریگ بیابان نگاه دار"
وا کرده سینه را به هوا های شرق و غرب
در بر گرفته همسفران زبون و زار
زی بحر بیکرانه چه مستانه می رود
با صد هزار گوهر یکدانه می رود
دریای پرخروش ز بند و شکن گذشت
از تنگنای وادی و کوه و دمن گذشت
یکسان چو سیل کرده نشیب و فراز را
از کاخ شاه و باره و کشت و چمن گذشت
بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بیقرار
در هر زمان به تازه رسید از کهن گذشت
زی بحر بیکرانه چه مستانه می رود
در خود یگانه از همه بیگانه می رود(۳۸)

اقبال اسلام را تنها دینی می شناسد که دین انسانیت است و می تواند جامعه انسانی را در زندگی مادی و معنوی کاملاً رهبری نماید و اقوام و ملل مختلف جهان را متحد ساخته پیش ببرد- او طی خطابه ای گفت:

"اگر هدف جهان بشری برقراری امن و صلح جوامع مختلف انسانی

باشد و بتواند هیئت های اجتماعی موجود را دگر گون نموده یک سازمان وسیع اجتماعی ایجاد کند، بجز نظام اسلام نظام دیگری نمی تواند در دامنه اندیشه جای گزین گردد. زیرا از روی آنچه من از قرآن درک کرده ام اسلام تنها فرخواننده اصلاح اخلاقی بشر نیست، بلکه در زندگی اجتماعی بشر خواهان یک انقلاب تدریجی و درعین حال اساسی نیز می باشد که هدف ملی و نژادی آن رایکسر تغییر داده و در ضمیر انسانیت صرف را تولید می نماید، تاریخ ادیان گواهی می دهد که در ادوار قدیم دین ملی بود چنان که دین یونانی ها و هندی ها، سپس نژادی گردید چنان که دین یهودی ها. مسیحیت تعلیم داد که دین انفرادی و شخصی است و در نتیجه آن در قاره بد بخت اروپا بحثی بدین مضمون شروع شد که دین نام عقائد شخصی است. بنا بر این متضمن زندگی اجتماعی بشر فقط دولت است. این اسلام بود که نوع بشر را نخستین بار پیامی به این شرح داد که دین نه ملی است و نه شخصی بلکه صرفاً انسانی است و هدف آن با وصف کلیهٔ امتیاز های طبیعی این است که جهان بشریت را متحد و منظم سازد." (۳۹)

حافظ شاعری است که شاید از همه بیشتر خواهان صلح و آشتی و عشق و محبت در بین انسان ها است. او نه تنها حاضر نیست قصه جنگ های سکندر و دارا را مانند شعرای دیگر بنویسد بلکه از خواندن آنها نیز اعراض می کند و می گوید:

ما قصه سکندر و دارا نخوانده ایم
از ما به جز حکایت مهر و فامپرس(۴۰)

به عقیده حافظ آزردن دیگران به اندازه ای گناه بزرگ است که گناه های دیگر در مقابل آن به حساب نمی آیند. چون در شریعت او محبت اصل ایمان است بنا بر این رنجیدن مردم کفر است. می گوید:

وفا کنیم و ملامت کشیم و خوش باشیم
که در شریعت ما کافری است رنجیدن(۴۱)

روحانیون قشری که در مردم به نام مذهب تفرقه می اندازند و موجب فتنه و فساد در جامعه می شوند شایسته اتباع نیستند، زیرا آنها پی به حقیقت نبرده و فقط راه افسانه رفته اند:

جنگ هفتاد و دو ملت همه را عذر بنه

چون ندیدند حقیقت ره افسانه زدند(۴۲)

حافظ نگهداشتن خاطر مردم را لازم می داند- در این باب توصیه می کند و می گوید:

چنان بزی که اگر خاک ره شدی کس را
غبار خاطری از رهگذار ما نرسد(۴۳)

او همیشه یک عهد و یک میثاق دارد و آن میثاق او دوستی و مهر است و بس:

از دم صبح ازل تا آخر شام ابد
دوستی و مهر بریک عهد و یک میثاق بود(۴۴)

حافظ اگرچه درباره اسلام از حیث دین اجتماعی بحثی به میان نیاورده، اما در اشعار او جنبهٔ بشر دوستی و مبانی اخلاقی به تمام و کمال دیده می شود- او به کسانی که محیط اسلامی را از ریاکاری و سخت گیری و تعصب و تکبر و خشونت در هم می زنند شدیداً انتقاد می کند ولو این که آن ها فقیه و صوفی و شیخ و محتسب و قاضی و مفتی و واعظ و حافظ باشند، زیرا آنهارا:

چون نیک بنگری همه تزویر می کنند

و این شعر زیبای او!

این حدیثم چه خوش آمد که سحر گه می گفت
بر در میکده ای با دف و نی ترسائی
گر مسلمانی ازین است که حافظ دارد
وای گر از پس امروز بود فردائی(۴۵)

اقبال نیز به این گروه ریاکارا انتقاد ها کرده است- مثلاً جائی که می گوید:

ازان پیش بتان رقصیدم و زنار بربستم
که شیخ شهر مرد با خدا گردد زتکفیرم(۳۴)

و در این اشعار:

شیخ در عشق بتان اسلام باخت
رشته تسبیح از زنار ساخت
واعظ ما چشم بر بتخانه دوخت
مفتی دین مبین فتوی فروخت(۳۷)

حافظ، گوته و اقبال هر سه به جاودانگی بشر ایمان دارند و معتقدند که زندگی همواره جویای راه های تکامل است و بعد از مرگ نیز به سوی ابدیت می رود- سیل حیات از موانع متوقف نمی گردد، بلکه آن هارا به وسیله کوشش و کار از بین برده و سریع تر پیش می رود- به عبارت دیگر زندگی مدیون اضداد است و تکامل آن بدون اضداد و موانع امکان پذیر نیست- چه نور بدون ظلمت و خیر بدون شر متمایز نمی گردد- از این جهت حافظ و گوته و بخصوص اقبال وجود ضد را در پیشرفت حیات انسانی لازم می دانند- حافظ به طرزی زیبامی گوید:

در خلاف آمد عادت بطلب کام که من
کسب جمعیت ازان زلف پریشان کردم(۳۸)

گوته عقیده دارد که بدون شیطان زیبائی فطرت انسان و ممکنات وجود او آشکار نمی شود- او این نظریه را در نمایشنامه خود "فاؤست" به نحوی زیبا جلوه گر ساخته است- وقتی که فاؤست شیطان را ملامت می کند، او در پاسخ می گوید:

"ای فرزند مجبور زمین، تو بدون کمک من چگونه می توانستی زندگی کنی و سوز و ساز و شور و هیجان که برای زندگی لازم است از کجامی آوردی؟ اگر من نبودم تو از جهان فرار می کردی و خسته و مانده به غار ها پناه می بردی و یا مانند جغدی روی سنگ لرزجی می نشستی(۳۹)."

اقبال در اغلب آثار خود وجود شیطان را که دشمن سر سخت انسان است در

پیشرفت زندگی ستوده است و بدون شر و شور او زندگی را قابل تعریف نمی داند و می گوید:

مزی اندر جهانی کور ذوقی
که یزدان دارد و شیطان ندارد(۵۰)

باز در این بیت زیبا:

موسی و فرعون و شبیر و یزید
این دو قوت از حیات آمد پدید(۵۱)

اقبال در منظومه "تسخیر فطرت" می گوید: وقتی که خدا آدم را از خاک آفرید برای بزرگداشت او فرشتگان را فرمان داد تا آدم را سجده کنند- ابلیس انکار کرد و به خدا خطاب کرده نقش خود را در تکامل ذات انسان چنین بیان کرد:

نوری نادان نیم سجده به آدم برم
او به نهاد است خاک من به نژاد آذرم
می تپد از سوز من خون رگ کائنات
من به دو صرصرم، من به غو تندرم
پیکر انجم ز تو گردش انجم زمن
جان به جهان اندرم زندگی مضمرم
من ز تنک مایگان گدیه نکردم سجود
قاهر بی دو زخم داور بی محشرم
آدم خاکی نهاد دون نظر و کم سواد
زاد در آغوش تو پیر شود در برم(۵۲)

گوته و اقبال هر دو تحت تأثیر ادبیات فارسی قرار گرفتند- همان طور که مولوی اقبال را شیفته و شیدای خود ساخت- حافظ، گوته را مجذوب و مسحور خویش کرد- چنان که گوته در سال ۱۸۱۴ م وقتی که ترجمه دیوان حافظ که توسط هامر صورت گرفته بود به دستش رسید، درباره تأثیر شعر حافظ نوشت:

"ناگهان با عطر آسمانی شرق و نسیم روح پرور ابدیت که از دشت ها

و بیابان های ایران می وزید آشنا شدم و مرد خارق العاده ای را شناختم که شخصیت عجیبش مرا سراپا مجذوب خویش کرد۔"(۵۳)

او خطاب به حافظ گفت:

"ای حافظ' سخن تو همچون ابدیت بزرگ است زیرا آن را آغاز و انجامی نیست۔"(۵۴)

اقبال نیز به حافظ و سعدی و سایر شعرای نامدار فارسی توجهی خاص نموده و حکمت و عرفان آنان را مکرر بیان کرده است۔ همان طور که گوته شعرای بزرگ مشرق زمین چون نظامی و مولوی و سعدی و حافظ را یاد آور شده و خواسته است دیوان ارزشمند خود را به صورت جام جهان نما در آورد و به وسیله آن غرب را باشرق نزدیک سازد' اقبال نیز در "پیام مشرق" چنین کوششی را به نحوی زیبا به عمل آورده و بعضی از شاعران و متفکران معروف شرق و غرب را در مجالس فکری نزدیک هم نشانده است۔ مثلاً در این قطعه شعر مولوی و گوته را در بهشت در حال گفتگو نشان داده است:

نکته دان المنی را در ارم
صحبتی افتاد با پیر عجم
شاعری کو همچو آن عالی جناب
نیست پیغمبر ولی دارد کتاب
خواند بر دانای اسرار قدیم
قصه پیمان ابلیس و حکیم
گفت رومی: ای سخن را جان نگار
تو ملک صید سنی و یزدان شکار
فکر تو در کنج دل خلوت گزید
این جهان کهنه را باز آفرید
سوز و ساز جان به پیکر دیده ای
در صدف تعمیر گوهر دیده ای

هر کسی از رمز عشق آگاه نیست
هر کسی شایان این درگاه نیست
"داند آن کو نیکبخت و محرم است
زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است" (۵۵)

همچنین با سرودن اشعاری به عنوان "شعرا" مجلسی تشکیل داده که شامل برونینگ و بایرون و غالب و مولوی می باشد- در این اشعار نظرات هر چهار شاعر فوق الذکر را درباره زندگی با کمال ایجاز بیان می کند بدین شرح:

برونینگ:

بی پشت بود باده سرجوش زندگی
آب از خضر بگیرم و در ساغر افگنم

بایرون:

از منت خضر نتوان کرد سینه داغ
آب از جگر بگیرم و در ساغر افگنم

غالب:

"تا باده تلخ تر شود و سینه ریش تر
بگدازم آبگینه و در ساغر افگنم"

رومی:

آمیزشی کجا' گهر پاک او کجا
از تاک باده گیرم و در ساغر افگنم(۵۶)

اقبال این گونه اشعار زیاد سروده و در ضمن بیان اندیشه های متفکران مختلف سعی کرده است آنها را بهم نزدیک سازد و در نتیجه مانند گوته یک ادب جهانی به وجود بیاورد و ملل گوناگون را از تنگنای تعصب ملی و لجه ناسیونالیسم بیرون کشد- تلاش هائی که جهت اتحاد بنی نوع آدم اقبال و حافظ و گوته انجام داده اند الحق شایسته توجه و تحسین برای تشکیل یک جامعه جهانی پر امن است- اقبال به همین جهت بر ضد مادی گری جهاد کرد- همان طور که او منفی بافی های تصوف

غیر اسلامی را مورد انتقاد قرار داد تمایلات ماده پرستی غرب را نیز مردود دانست. بیشتر آثار او از انتقاد بر تمدن غرب مشحون است. به نظر او فرنگ زیرکی دارد ولی عشق را نمی شناسد. ایمان، عرفان، عفت، صفا و حیا برای فرنگ لغاتی نامفهوم اند.

در قسمت آخر "پیام مشرق" بخشی از غزل هائی به عنوان "پیام" است که در آن اقبال وجدان و معنویت را در زندگی ناگزیر دانسته و عشق را درمان درد های روح انسان گفته است.

به دانای فرنگ می گوید:

از من ای باد صبا گوی به دانای فرنگ
عقل تا بال گشود است گرفتار تر است
برق را این به جگر می زند آن رام کند
عشق از عقل فسون پیشه جگردار تر است
چشم جز رنگ گل و لاله نبیند ورنه
آنچه در پردهٔ رنگ است پدیدار تر است
عجب آن نیست که اعجاز مسیحا داری
عجب این است که بیمار تو بیمار تر است
دانش اندوخته ای دل زکف انداخته ای
آه زان نقد گران مایه که در باخته ای
عقل چون پای درین راه خم اندر خم زد
شعله در آب دوانید و جهان برهم زد
کیمیا سازی او ریگ روان را زر کرد
بر دل سوخته اکسیر محبت کم زد
وای بر سادگی ما که فسونش خوردیم
رهزنی بود کمین کرد و ره آدم زد
هنرش خاک بر آورد ز تهذیب فرنگ

باز آن خاک به چشم پسر مریم زد
شرری کاشتن و شعله درودن تاکی
عقده بر دل زدن و باز گشودن تاکی(۵۷)

چنان که از "دیوان شرقی" برمی آید- گوته به حقانیت اسلام و رسالت حضرت ختمی مرتبت علیه الصلوة والسلام یقین دارد، قرآن را کتاب خدا می شناسد، به ادبیات دل انگیز فارسی و بخصوص شعر جاودانی حافظ عشق می ورزد و آن را مانند ابدیت بزرگ قرار می دهد، دشت های پر نور و معطر شرق را دوست دارد- به وسیله سرودهای خود سعی می کند فاصله بین آلمان و ایران از بین برود- نیز آرزو دارد ملل مختلف غرب و شرق نزدیک هم بیایند و تعصبات ملی و مذهبی خود را برای همیشه رها کنند- وقتی که ناپلئون به دیدن گوته رفت، گوته ضمن گفتگو و ولتیر را که تراژدی حضرت پیغمبر علیه السلام نوشته بود مورد اعتراض و نکوهش قرار داد- از این شرق شناسی و اسلام دوستی گوته معلوم می شود که او نمی خواست که دیگر جنگی بین غرب و شرق در گیرد و مسیحی ها و مسلمان هاهمدیگر رابکشند چنان که در جنگ های صلیبی کشته بودند- اما جهانان بزودی دیدند که همان ملت هایی که گوته به آن ها درس صلح و آشتی و عشق و محبت می داد، کوره های جنگ را روشن کردند و ملیون ها نفر را باکمال تعصب مذهبی و ملی کشتند و سوزاندند و در حال حاضر نیز می بینیم که در کشور بوسنی که در قلب "اروپای متمدن" قرار دارد آدم کشی و شهر سوزی را به نام مذهب جایز و حتی لازم قرار داده اند- اداره هائی که محافظ حقوق بشری در جهان شمرده می شوند بر این قتل بی دریغ صدها هزار نفر بیچاره سکوت ورزیده اند- این امر می رساند که سخنان شاعر بزرگ آلمانی که اقبال او را به نام "حکیم حیات" می خواند مورد توجه مردم آلمان و یا کشور های دیگر غرب قرار نگرفته است- در صورتی که تأثیر شعر حافظ در اخلاق و رفتار ملت حق شناس ایران و نفوذ گفتار اقبال در روحیه ملت مسلمان پاکستان بخوبی مشهود است-

این که سخنان پر مغز گوته تأثیری در مردم نگذاشته علتش این است که تمدن

غرب به طور کلی روی اساس مادیت و حکمت بی دین فیلسوفانی مانند میکیاولی و نیچه پی ریزی شده است- بنا بر این افراد آن جامعه حاضر نیستند ارزش های اخلاقی و معنوی را در زندگی بپذیرند- اما بر عکس آن در شرق جوامع ایران و پاکستان چون روی اساس دین اسلام استوارند لذا مردم مسلمان این دو ملت تعلیمات عرفانی حافظ و اندیشه های اسلامی اقبال را دوست دارند و به ترویج و تعمیم آن می کوشند-

از منظومه "نقش فرنگ" اشعار ذیل درج می شود:

حکمت و فلسفه کاری است که پایا نش نیست
سیلی عشق و محبت به دبستانش نیست
بیشتر راه دل مردم بیدار زند
فتنه ای نیست که در چشم سخندانش نیست
دل زناز خنک او به تپیدن نرسد
لذتی در خلش غمزهٔ پنهانش نیست
دشت و کهسار نور دید و غزالی نگرفت
طوف گلشن زد و یک گل به گریبانش نیست
چاره این است که از عشق گشادی طلبیم
پیش او سجده گزاریم و مرادی طلبیم
زندگی جوی روان است و روان خواهد بود
این می کهنه جوان است و جوان خواهد بود
آنچه بود است و نباید زمیان خواهد رفت
آنچه بایست و نبود است همان خواهد بود
عشق از لذت دیدار سراپا نظر است
حسن مشتاق نمود است و عیان خواهد بود
آن زمینی که برو گریه خونین زده ام
اشک من در جگرش لعل گران خواهد بود

"مژده صبح درین تیره شبانم دادند
شمع کشتند و زخورشید نشانم دادند"(۵۸)

پی‌نوشت‌ها

۱- پیام مشرق، کلیات مولانا اقبال لاهوری، تهران ۱۳۴۳، ص ۲۴۴

۲- ایضاً ص ۲۵۵ -

۳- پیام مشرق، کلیات اقبال فارسی، لاهور، ص ۱۸۹

۴- پیام مشرق، کلیات مولانا اقبال، تهران، ص ۲۴۷

۵- پیام مشرق، دیباچه، کلیات فارسی، لاهور ص ۱۸۹

۶- ایضاً، ص ۱۹۰-

۷- اقبالنامه، جلد دوم، لاهور، ص ۱۰۶

۸- شذرات اقبال، دکتر جاوید اقبال، لاهور ۱۹۷۳ م، ص ۱۶۷

۹- پیام مشرق، کلیات اقبال (فارسی)، ص ۱۹۱

۱۰- دیوان حافظ، امیر کبیر، تهران، ص ۱۵۳

۱۱- پیام مشرق، کلیات مولانا اقبال، تهران، ص ۲۶۰

۱۲- برای توضیح این مطلب رجوع شود به اقبال در راه مولوی، صفحات ۱۰۴ تا ۱۰۹

۱۳- رک : دیوان شرقی گوته، ترجمه دکتر شجاع الدین شفا، بین صفحات ۴۰، ۴۱ عکس خط گوته

۱۴- دیوان حافظ، ص ۱۱۷

۱۵- اقبال نامه، جلد اول، لاهور، ص ۱۰۷

۱۶- دیوان حافظ، ص ۲۶۷

۱۷- دیوان حافظ، ص ۲۰۶

۱۸- پیام مشرق، کلیات اقبال، ص ۱۹۰

۱۹- گوته، دیوان شرقی، ص ۳۸ تا ۴۰

۲۰- ایضاً، ص ۱۵

۲۱- دیوان حافظ، ص ۳۳۷

۲۲- اسرار خودی، کلیات مولانا اقبال، تهران، ص ۳۵

۲۳- کلیات شمس، تهران، ۱۳۴۴، جزء اول، ص ۲۵۵

۲۴- پیام مشرق، کلیات مولانا اقبال، ص ۲۴۸

۲۵- دیوان حافظ، ص ۳۳۱

۲۶- پیام مشرق، کلیات اقبال، فارسی، لاهور، ۱۹۹۰، ص ۱۹۴

۲۷- گونه، دیوان شرقی، تهران ۱۳۳۸، ص ۱۷

۲۸- دیوان شرقی، ص ۷

۲۹- ایضاً، ص ۴۰

۳۰- ایضاً، ص ۲۵

۳۱- ایضاً، ص ۲۶

۳۲- اقبال در راه مولوی، سید محمد اکرم، لاهور، ۱۹۷۰، ص ۲۴۴

۳۳- رموز بیخودی، لاهور، ۱۹۶۴، ص ۱۳۳

۳۴- جاوید نامه، لاهور، ۱۹۵۹، ص ۲۴۲

۳۵- پیام مشرق، ص ۹۱

۳۶- دیوان شرقی، ص ۲۸

۳۷- Iqbal Review : Karachi, April 1969, p. 18-19

۳۸- پیام مشرق، ص ۱۵۱ - ۱۵۲

۳۹- اقبال در راه مولوی، ص ۲۴۷، ۲۴۸

۴۰- دیوان حافظ، ۱۹۸۴، اسلام آباد، ص ۲۴۶

۴۱- ایضاً، ص ۳۵۰

۴۲- ایضاً، ص ۱۵۰

۴۳- ایضاً، ص ۱۲۶

۴۴- ایضاً، ص ۱۳۲

۴۵- ایضاً، ص ۳۹۹

۴۶- زبور عجم، کلیات مولانا اقبال، تهران، ص ۱۴۷

۴۷- اسرار خودی، ص ۴۸، ۴۹

۴۸- دیوان حافظ، تهران، ص ۲۲۹

۴۹- گوته، فاؤست، ترجمه فضل حمید، بهاولپور، ۱۹۶۴، مقدمه

۵۰- پیام مشرق، کلیات اقبال، تهران، ص ۲۳۸

۵۱- رموز بیخودی، ص ۱۲۷

۵۲- پیام مشرق، ص ۹۷-۹۸

۵۳- دیوان شرقی، ص ۲۱

۵۴- ایضاً، ص ۵۲

۵۵- پیام مشرق، کلیات اقبال، تهران، ص ۲۶۶

۵۶- ایضاً، ص ۲۵۲

۵۷- ایضاً، ص ۲۲۵، ۲۲۸

۵۸- پیام مشرق، کلیات مولانا اقبال، ص ۲۵۸، ۲۶۰

(اقبالیات (فارسی)، شماره نهم (۱۹۹۳/۱۳۷۱ش، اقبال اکادمی پاکستان لاهور، ص ۸-۳۴- به عنوان دیگر "اقبال با حافظ و گوته" در: اقبال و جهان فارسی تالیف دکتر سید محمد اکرم اکرام، لاهور: شعبه اقبالیات، دانش گاه پنجاب، لاهور، ۱۹۹۹، ص ۱۵-۵۳)



جناب محمد اکرم چغتائی دور حاضر کے اہل تحقیق میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کے موضوعات کا دائرہ خاصا وسیع ہے، جس میں اردو زبان و ادب کے ابتدائی آثار، انیسویں صدی کے نصف اول کے پوشیدہ علمی وادبی خزینے، اقبالیات اور بعض جرمن مستشرقین کے اہم مطالعات شامل ہیں۔ وہ متعدد مشرقی اور مغربی زبانیں جانتے ہیں اور اس سے ان کی تحقیقات میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے مشرق و مغرب کے مصادر تحقیق سے بیک وقت استفادہ کر کے انہیں قریب تر لانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے ایسے ہی مطالعات کا ایک حصہ وہ عظیم منصوبہ ہے، جو انہوں نے گوئٹے کے ڈھائی سو سالہ جشن ولادت (منعقدہ 1999ء) کے موقع پر پیش کیا تھا۔ قبل ازیں اس سلسلے کی تین کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ گوئٹے، اقبال اور مشرق (انگریزی 1999ء) گوئٹے اور اقبال (انگریزی، جرمن 2000ء) اور گوئٹے بطور سائنس دان (اردو 2000ء)۔

جناب اکرم چغتائی پنجاب یونیورسٹی (لاہور) سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد یہیں کے شعبہ تاریخ ادبیات سے منسلک ہو گئے۔ چند سالوں بعد وفاقی وزارت تعلیم کے ادارے مرکزی اردو بورڈ (حال اردو سائنس بورڈ لاہور) میں ملازمت اختیار کر لی اور اب اسی ادارے کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

جناب محمد اکرم چغتائی تحقیقات کے حوالے سے یورپ بالخصوص جرمنی کے کتاب خانوں وغیرہ کو گھنگال چکے ہیں اور وہاں کی کئی کانفرنسوں میں شریک رہے ہیں۔ جرمنی، اسٹریا اور فرانس کی حکومتوں نے انہیں تحقیق و تدقیق کے لیے اعلیٰ وظائف دیئے اور ان کی جرمن مستشرقین سے متعلق تحقیقات کے پیش نظر انہیں آسٹریا کے صدر کی جانب سے خصوصی ایوارڈ بھی پیش کیا گیا (1998ء)۔